وفاء الوفا

باخبار دار المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد 1 اور 2

تالیف

الشیخ العلامۃ نور الدین علی بن احمد السمہودی
المتوفی ۹۱۱ھ

مترجم
شاہ محمد چشتی

نظرِ ثانی
محمد محسن

ادارہ پیغام القرآن
۴۰۔ اردو بازار، لاہور Ph:042-7323241

نام کتاب .... وفاء الوفاء (حصہ اوّل اور دوم)

مصنف .... الشیخ علامہ نور الدین علی بن احمد السمھودی

مترجم .... شاہ محمد چشتی

ترتیب ونظر ثانی .... محمد محسن

اہتمام اشاعت .... محسن فقری

سال اشاعت .... اپریل 2008ء

پروف ریڈنگ .... شاہ محمد چشتی

کمپوزنگ .... ہجویری کمپوزرز اینڈ ڈیزائنرز (0321-4553105)

پرنٹرز .... اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز

قیمت .... دو جلد سیٹ =/1700 روپے

فہرست (حصہ اوّل)

فہرست ﴿ حصہ دوم ﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرصۂ دراز سے دل میں مخفی ایک امید برآنے پر ادارہ کو انتہائی خوشی حاصل ہو رہی ہے وفاء الوفاء شریف ایک مشہور عالم کتاب ہے جس کے ترجمہ کی ہم شدید ضرورت محسوس کرتے تھے' اللہ کا خاص کرم اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت کاملہ کے بل بوتے پر شاہ محمد چشتی صاحب نے اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب ہر محبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کارآمد ہو گئی ہے۔

ترجمے میں آپ مضمون کی دشواری محسوس نہیں کریں گے۔ ان شاء اللہ ہر چیز آسانی سے سمجھ آتی چلی جائے گی۔

قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ مطالعہ کے بعد مصنف، مترجم اور ادارہ کے لئے خلوص دل سے دُعائیں فرمائیں۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ نایاب و اہم کتب کے ترجمے باحسن وجوہ پیش کرتے رہیں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

حالات کی قلمبندی کے لئے ہم حضرت صاحبزادہ مفتی محمد محبّ اللہ نوری قادری سجادہ نشین آستانہ عالیہ نوریہ قادریہ بصیر پور ضلع اوکاڑہ کے نہایت سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے قیمتی ترین اوقات میں سے ہماری درخواست پر وقت نکالا ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد محسن

۲۰ فروری ۲۰۰۸ء بروز بدھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کائنات ارضی میں مذہبی لحاظ سے بڑے مقدس خطے موجود ہیں جن میں روئے زمین کی مسجدیں' انبیاء علیہم السلام' اولیاء' اغواث و اقطاب اور صالحین کے مزارات' درس گاہیں' دینی نشریاتی ادارے وغیرہ اس سرزمین کے وہ قطعات ہیں جنہیں امانتِ الٰہیہ کی خدمت کا موقع میسر ہے لیکن ایک قطعہ زمین ایسا ہے جسے ہر لحاظ سے وہ شرف حاصل ہیں جن کا مقابلہ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

اسی پاکیزہ خطے کے بارے میں ہمارے صوفیاء' علماء' محدثین' ائمہ حضرات اپنے اپنے علم و تحقیق کے مطابق واقفیت بہم پہنچاتے چلے آئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز بھی جاری ہے بلکہ جاری ہی رہے گا۔ انہی خوش بخت حضرات میں ایک نام علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی نور اللہ مرقدہ (۹۱۱ھ) کا بھی ہے جنہیں سرزمین مدینہ اور شہر مدینہ پر کام کرنے کا موقع ملا' اس شہر پر کام کرنا ایک وہبی معاملہ سمجھئے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آسکا بلکہ آ بھی نہیں سکے گا۔ اسے اپنے عطاء شدہ حصے کے مطابق وہی انجام دے گا جس کا خمیر اس منور زمین سے کوئی نسبت رکھتا ہوگا۔

میرے یقین کے مطابق اس سلسلے میں امام سمہودی رحمہ اللہ کو بھی ایک خاص حصہ ملا ہوا ہے جو ان کی اس تصنیف کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا صاف دکھائی دیتا ہے۔ امام سمہودی نور اللہ مرقدہٗ نے قلم برداشتہ معلومات کا جو خزانہ اس میں درج کر دیا ہے وہ ان کے عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر دلیل ناطق ہے' امکانی حد تک انہوں نے اس میں کوئی کمی رہنے نہیں دی' اس تصنیف کے دوران آپ عالم قرآن و مفسر' محدث' تاریخ دان' ماہر علوم' جغرافیہ دان' ریاضی دان' ماہر ارضیات و فلکیات' محقق و ادیب اور سمندر جیسا دل رکھتے دکھائی دیتے ہیں آپ نے ہر چیز کو نہایت سلیقے سے اس میں شامل کیا ہے چنانچہ قیامت تک کے لئے یہ کتاب محبوب کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس پاکیزہ و محبوب قطعہ کے بارے میں نادر معلومات فراہم کرتی رہے گی۔

اس کتاب کا چوتھا حصہ اہل علم خصوصاً محدثین کے لئے نہایت فائدہ مند ہے کہ اس سے احادیث کے اندر مندرج الفاظ کی وضاحت موجود ہے جن کے بغیر احادیث کو کماحقہ سمجھنا نہایت دشوار ہے۔

اعتذار

نہایت ادق مضمون کا ترجمہ اور پیش آمدہ مشکلات کسی بھی مترجم سے مخفی نہیں ہیں دراصل اس کے لئے وسیع

ترین ذخیرۂ کتب اور احباب کی جمعیت درکار ہے لیکن میں پیارے محمد محسن برادران کی سچی طلب کو ٹال نہیں سکا چنانچہ بتائید ایزدی شب و روز کی اپنی سی سعی کر کے اسے مکمل کر دیا ہے جس پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شکر گزار ہوں گا۔

اس ترجمہ کی ہر کمی اپنے ذمہ لیتا ہوں لیکن مبنی برخلوص سعی پر ملنے والا اجر اپنے شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی قدس سرہٗ اپنے کریم اساتذہ فقیہ اعظم پاکستان مفتی ابوالخیر محمد نور اللہ نعیمی، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد حسین نعیمی نور اللہ مرقدہما، زیرک ترین اور خزانہ علمی سے لبریز استاد علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ اور شیخ المحدثین حضرت سید ابوالبرکات نور اللہ مرقدہ کی ارواح کو نذر کرتا ہوں۔

علامہ سمہودی رحمہ اللہ کے مقدور بھر حالات کی دستیابی، حب مدینہ سے سرشار حضرت صاحبزادہ مفتی محمد محب اللہ نوری قادری مدظلہ کے حصے میں آئی ہے جن کی نگارشات سے ایک زمانہ مستفید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا ایک ایک لفظ قبول فرمائے۔ آمین

عزیز محمد محسن اور فقری برادران روایتی محبت سے وفاء الوفاء شریف کا ترجمہ چھاپ رہے ہیں۔ مولا تعالیٰ انہیں ایسے لازوال کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایک دور افتادہ غلام شیخ الاسلام پیر سیال رحمہ اللہ
شاہ محمد چشتی انصاری خوشنویس، قصور

مؤرخ مدینہ منورہ

امام نور الدین سمہودی

تحریر......صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری

سرکار ابد قرار ﷺ کی محبت اصل ایمان، مغز ایمان، روح ایمان اور جان ایمان ہے--- اس محبت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کے دیار سے محبت رکھی جائے--- زمین کا وہ خطہ جس پر آپ ﷺ کے قدم لگے، وہ جگہ جسے آپ ﷺ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا اور وہ شہر جس میں آپ ﷺ اقامت گزیں ہوئے، ہمیشہ اہل نسبت، اہل محبت، اہل ایمان کی محبتوں کا مرکز ومحور اور عقیدتوں کا مرجع رہا ہے---

مدینہ منورہ سے اہلِ ایمان کی محبت حقیقی وفطری ہے کہ یہ شہر مرکز ومصدر ایمان ہے--- اہلِ ایمان کا حقیقی و اصلی وطن ہے:

- وَ الَّذِیۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الۡاِیۡمَانَ---[الحشر، ۹:۵۹]

''اور جنھوں نے اس دار (شہر مدینہ) اور ایمان کو اپنا مستقر اور وطن بنا لیا''---

کا فرمان ربانی اس پر شاہد ہے---

اس ''محبت نگر'' میں حاضری کی تڑپ کس مومن کو نہیں ہوتی؟--- وہ لوگ کتنے خوش بخت ہیں، جنھوں نے اپنا گھربار، وطن و دیار چھوڑ کر مدینہ منورہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی--- وہ مدینہ کی موت سے سرفراز ہوگئے اور اسی ''جنت ارضی'' نے انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں محفوظ کر لیا--- ایسے ہی رشک زمانہ لوگوں میں سے علامہ سمہودی علیہ الرحمہ بھی تھے، جنھیں اوّلین مفصل، مربوط، مستند اور معتبر تاریخِ مدینہ لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی---

نام ونسب

آپ کا اسم گرامی علی، کنیت ابو الحسن تھی، جب کہ دینی خدمات کی بنا پر آپ کو نور الدین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے--- آپ حسنی سید تھے---

ابن العماد حنبلی نے آپ کا نسب نامہ اس طرح لکھا ہے:

نور الدین ابو الحسن علی بن القاضی عفیف الدین عبد اللہ بن احمد بن علی بن عیسیٰ بن محمد بن عیسیٰ بن محمد بن عیسیٰ بن جلال الدین ابی العلیاء بن ابی الفضل جعفر بن علی بن ابی الطاہر بن الحسن بن احمد بن محمد بن الحسن بن محمد بن حسن بن محمد

بن اسحٰق بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن الحسن المثنیٰ ابن الحسن الاکبر بن علی بن ابی طالب الحسنی ---

(شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۰)

عام طور پر آپ کو جد اعلیٰ سے منسوب کر کے نور الدین علی بن احمد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے---

ولادت

آپ کی ولادت مصر کے قریہ ''سمہود'' میں صفر الخیر ۸۴۴ھ میں ہوئی--- اسی مناسبت سے آپ کو سمہودی کہا جاتا ہے---

تعلیم و تربیت

آپ نے بیش تر تعلیم گھر میں حاصل کی اور اپنے والد گرامی قاضی عفیف الدین عبد اللہ بن احمد الحسنی سے قرآن کریم حفظ کیا، قراءت و کتابت سیکھی--- شیخ جلال الدین محلی کی شرح منہاج، جمع الجوامع، شرح البهجة اور الفيه ابن مالك وغیرہ کتب پڑھنے کے بعد صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا سماع کیا، تب آپ کی عمر چودہ سال تھی--- والد انھیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے قاہرہ منتقل ہو گئے، جہاں جلیل القدر علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا اور یوں آپ کی علمی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو گیا اور آپ نے جید عالم، فقیہ، محدث اور مورخ کی حیثیت سے نام پایا---

(مقدمه جواهر العقدين فی فضل الشرفين، صفحہ۷)

اساتذہ

والد گرامی سے تعلیم پانے کے بعد قاہرہ میں آپ نے شمس الجوجری سے فقہ، اصول فقہ اور ادب عربی کی تعلیم حاصل کی--- شیخ جلال الدین محلی سے ان کی تصانیف شرح المنهاج اور شرح الجوامع پڑھیں، پھر شیخ شرف الدین ابو زکریا یحییٰ المناوی کی صحبت اختیار کی اور ان سے بہت سے علوم وفنون میں مہارت حاصل کی--- متعدد مرتبہ صحیح بخاری کا سماع کیا، صحیح مسلم اور تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا، علاوہ ازیں شیخ عبد الکریم القشیری کی تصوف میں شہرۂ آفاق تصنیف ''الرسالة القشيرية'' کا درس لیا--- شیخ مناوی نے آپ کو تدریس کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنے دست مبارک سے خرقۂ تصوف پہنایا---

دیار مصر میں احناف کے قاضی ابو السعادات محمد بن سعید حنفی سے ''عمدة الاحكام'' کی قراءت کی اور تدریس کی اجازت حاصل کی---(مرجع سابق، صفحہ۸)

علاوہ ازیں علامہ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی سے ان کی تصانیف کا سماع کیا---

(الضوء اللامع، جلد۵، صفحہ۲۴۶)

مدینہ منورہ میں قیام

۸۷۳ھ میں جب کہ آپ کی عمر ۲۹/ برس تھی، قاہرہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے--- حجاز مقدس ہمیشہ علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اور یہاں دنیا بھر کے علماء و شیوخ بکثرت حاضری دیتے ہیں، چناں چہ علامہ سمہودی کو یہاں متعدد اساطین علم و فضل سے استفادہ کا موقع میسر آیا--- خصوصاً مدینہ منورہ میں شیخ شہاب الاشبیطی اور شیخ ابوالفرج المراغی سے بہت زیادہ استفادہ کیا--- اسی طرح مکہ مکرمہ میں کمالیہ بنت نجم مرجانی اور ان کے بھائی کمال اور نجم عمر بن فہد وغیرہ مشائخ سے سماع کیا--- (شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۱)

درس و تدریس

قیام مدینہ منورہ میں آپ نے جہاں متعدد مشائخ سے استفادہ کیا، وہیں درس و تدریس کا شغل بھی اختیار کیا، اس اثنا میں آپ سے کثیر طلبہ مستفیذ ہوئے--- علامہ ابن العماد، شیخ سخاوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قَلَّ اَن یکونَ اَحدٌ مِن اَھلِھا لَمْ یَقْرَأ علیہ--- (شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۱)

''اہل مدینہ میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے، جنھوں نے آپ کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو''---

حرم نبوی میں حاضری

حرم نبوی شریف میں آپ بکثرت حاضر رہتے تھے--- مسجد نبوی ہی کے ایک حجرے میں آپ نے ڈیرا لگایا ہوا تھا، یہاں ان کی اپنی لائبریری تھی، جس میں تین سو کے لگ بھگ نادر کتب کے علاوہ آپ کی اپنی بعض تصانیف کے مسودات تھے--- یہاں بیٹھ کر آپ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے--- رمضان المبارک ۸۸۶ھ کو آپ عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ گئے ہوئے تھے کہ مسجد نبوی شریف میں آگ لگ گئی، جس سے مسجد شریف کا ایک حصہ متاثر ہوا، اس سانحہ میں آپ کی لائبریری بھی نذر آتش ہوگئی--- (وفاء الوفا، جلد۲، صفحہ۶۳۳ تا ۶۳۵)

ہر چند کہ مسجد نبوی میں حاضری کا مستقل معمول تھا مگر رمضان میں تو یہ کیفیت ہوتی کہ شب و روز مسجد نبوی ہی میں قیام رہتا تھا--- مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہونے کے بعد رمضان المبارک ۸۸۶ھ کے علاوہ ہر سال رمضان المبارک کا مہینا مدینہ منورہ میں گزرتا تھا--- (وفاء الوفا، جلد۲، صفحہ۶۳۵)

مدینہ منورہ آئے تو مدینہ ہی کے ہو کر رہ گئے اور جوار رسول ﷺ کی کیف بار فضاؤں میں یوں محو ہو گئے کہ سولہ سال کا طویل عرصہ گزر گیا، بالآخر والدہ کی زیارت کے لے آپ نے پہلی بار مدینہ منورہ سے قاہرہ کا سفر کیا--- والدہ بھی شاید اپنے لخت جگر کا انتظار کر رہی تھیں، دس روز ان کی خدمت میں گزرے تھے کہ ان کا وصال ہو گیا اور آپ مدینہ منورہ واپس ہوئے--- (وفاء الوفا، جلد۲، صفحہ۶۴۱)

عظیم سعادت

علامہ سمہودی کو حضور ﷺ کے حجرہ مبارکہ کے اندر داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی--- ۸۸۱ھ میں مقصورہ شریفہ کی ایک دیوار میں دراڑ نظر آئی تو علماء و مشائخ، ماہرین تعمیر اور معززین شہر کی طویل مشاورت کے بعد طے پایا کہ دیوار کو از سر نو تعمیر کیا جائے--- ملبہ اٹھانے کے بعد جب تعمیر کا موقع آیا تو اس کام کے نگران جناب شمسی نے انھیں پیغام بھیجا کہ حجرہ مبارکہ کی زیارت کی سعادت حاصل کر لیں---

علامہ سمہودی فرماتے ہیں:

یہ سنتے ہی میں شوق و بے خودی کی کیفیت سے سرشار، کامل طہارت کے بعد حاضر ہوا، تاہم اپنے گناہوں پر سخت نادم تھا اور کسی شاعر کا یہ شعر یاد آتا:

عَصَیْتُ فَقُلْ لِیْ کَیْفَ اَلْقٰی مُحَمَّدًا
وَ وَجْهِیْ بِاَثْوَابِ الْمَعَاصِیْ مُبَرْقَعٌ

"میں نے نافرمانی کی ہے، بتاؤ اس حال میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں کیسے حاضری دوں؟--- حالاں کہ میرا چہرہ گناہوں سے اٹا ہوا ہے"---

پھر اگلا شعر زبان پر آیا تو کچھ ڈھارس بندھی:

عَسَی اللّٰهُ مِنْ اَجْلِ الْحَبِیْبِ وَ قُرْبِهٖ
یُدَارِکُنِیْ بِالْعَفْوِ فَالْعَفْوُ وَاسِعٌ

"بہت امید ہے کہ حبیب اکرم ﷺ کے طفیل اور آپ ﷺ کے قرب کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور اس کا عفو بہت وسیع اور عام ہے"---

رستہ میں یہی دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ کما حقہ ادب و تعظیم کی توفیق مرحمت فرمائے--- جوں ہی حجرہ مبارکہ میں داخل ہوا:

فَشَمَمْتُ رَائِحَةً مَا شَمَمْتُ فِیْ عُمْرِیْ رَائِحَةً اَطْیَبَ مِنْهَا---

"تو خوش بو کی ایسی مہک آئی کہ عمر بھر اس سے پاکیزہ اور اعلیٰ خوش بو کبھی نہ سونگھی تھی"---

(وفاء الوفا، جلد ۲، صفحہ ۶۲۵)

شادی

علامہ شمس الدین سخاوی (۸۳۱ - ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں کہ علامہ سمہودی نے مدینہ منورہ میں ایک شادی محمد بن عمر بن المحب کی ہمشیر سے کی، جب کہ دوسری شادی اپنے استاذ شیخ ابوالفرج المراغی کی صاحبزادی سے کی (الضوء اللامع

لاهل القرن التاسع، مطبوعہ بیروت، جلد۵، صفحہ۲۴۶) اولاد امجاد کی تفصیل نظر سے نہیں گزری---

مفتیٔ مدینہ

علامہ سمہودی نے، جیسا کہ پہلے ذکر آیا، وقت کے جید اساتذہ سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون میں کمال حاصل کیا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ شیخ ابو محمد دمیاطی الشارمساحی اور دیگر علماء و مشائخ نے آپ کو درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کی اجازت عطا کی تھی---(مقدمہ جواهر العقدین فی فضل الشرفین، صفحہ۹)

ابن العماد لکھتے ہیں:

نَزِیْلُ الْمَدِیْنَةِ الْمُنَوَّرَةِ وَ عَالِمُهَا وَ مُفْتِیْهَا وَ مُدَرِّسُهَا وَ مُؤَرِّخُهَا---

(شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۰)

"آپ مدینہ منورہ میں مقیم اور یہاں کے (بڑے) عالم، مفتی، مدرس اور مورخ تھے"---

آگے مزید لکھتے ہیں:

جمع فتاویه فی مجلد و هی مفیدة جدا---(ایضاً، صفحہ۵۱)

"آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ انتہائی مفید ہے"---

جلالت شان

حافظ سخاوی رقم طراز ہیں:

فهو امام مفنن متميز فی الاصلين و الفقه مديم العلم و الجمع و التاليف متوجه للعبادة و المباحثة و المناظرة قوی الجلادة طلق العبارة مع قوة اليقين و علی كل حال فهو فريدة فی مجموعه---(شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۱)

"آپ صاحب فن امام، قرآن و حدیث اور فقہ میں جداگانہ شان کے حامل، تصنیف و تالیف اور علم میں ہمیشہ مشغول، عبادت کے ساتھ ساتھ علمی مباحثہ و مناظرہ کی طرف متوجہ رہنے والے صاحب استقلال، فصیح اللسان، قوتِ یقین سے سرشار، غرض ہر حال میں تمام اوصاف میں یکتا و منفرد تھے"---

شعر و سخن

علامہ سمہودی شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے--- وفاء الوفاء میں حسب موقع نفیس اشعار درج کیے ہیں، جو ان کے ادبی ذوق کے آئینہ دار ہیں--- خود بھی شعر کہتے تھے، نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے:

الا ان دیـوان الـصـبـابة قـد سـبـا
بـمـا صـب مـن حـسـن الـصـناعة ان سنا
نـفـوسـا سـكـارى مـن رحـيـق شـرابـه
و الـحـاظ صـب مـن صـبـابـتـه صـبـا

(الضوء اللامع، جلد۵، صفحہ۸-۲۴۷)

تـحـكـم الـحـب مـنـى كيف اكـتـمـه
ام كيف اخـفـى الـهـوى والـلامع يظهره
اهـوى لـقـاؤه و يهـوى سـيـدى تـلـفـى
مـا كـل مـا يـتـمـنـى الـمـرء يـدركـه

(النور السافر عن اخبار القرن العاشر، صفحہ۶۰)

وصال

کم و بیش اڑتیس (۳۸) سال مدینہ منورہ میں اقامت پذیر رہنے اور بھرپور علمی زندگی بسر کرنے کے بعد ۶۷ر برس کی عمر میں بروز جمعرات، ۱۸ر ذیقعدہ ۹۱۱ھ کو مدینہ منورہ میں وصال فرمایا (شذرات الذہب، جلد۸، صفحہ۵۱) اور امام دارالہجرۃ حضرت امام مالک قدس سرہ العزیز کی قبر اطہر کے قریب مدفون ہوئے---(جذب القلوب، صفحہ۷)

تصانیف

حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ اور دیگر علوم میں آپ نے متعدد علمی کتابیں تصنیف کیں:

۱ اقتفاء الوفا بأخبار دار المصطفٰى
۲ وفاء الوفا بأخبار دار المصطفٰى
۳ خلاصة الوفا بأخبار دار المصطفٰى
۴ الأقوال المسفرة عن دلائل الآخرة
۵ اكمال المواهب
۶ أمنية المعتنين بروضة الطالبين
۷ الأنوار السنية فى اجوبة أسئلة اليمنية
۸ أيضاح البيان لما أراده الحجة "من ليس فى الامكان أبدع مما كان"
۹ جواهر العقدين فى فضل الشرفين

۱۰ حاشية على ايضاح النووى فى المناسك

۱۱ درر السموط رسالة فى شروط الوضوء

۱۲ شفاء الأسواق لحكم ما يكثر بيعه فى الأسواق

۱۳ طيب الكلام بفوائد الإسلام

۱۴ عقد الفريد فى احكام التقليد

۱۵ الغماز على اللماز ، فى الأحاديث الموضوعة

۱۶ الفتاوىٰ

۱۷ اللؤلؤ المنثور فى نصيحة ولاة الأمور

۱۸ المحرر فى تعيين الطلاق

۱۹ مسألة فرش البسط المنقوشة ، ردا على نازعة

۲۰ مواهب الكريم الفتاح فى المسبوق المشتغل بالاستفتاح

(مقدمه جواهر العقدين، صفحہ ۱۰-۹)

دکتور عبد اللہ بن عبد الرحیم عسیلان نے اپنی تصنیف "المدينة المنورة فى آثار المؤلفين و الباحثين قديمًا و حديثًا" میں چند مزید تصانیف کا تذکرہ کیا ہے:

۲۱ دفع التعرض و الانكار بسط روضة المختار

۲۲ ذروة الوفا باخبار المصطفٰى

۲۳ كشف الجلباب و الحجاب عن القدوة فى الشباك و الرحاب

۲۴ النصيحة الواجبة القبول فى بيان موضع منبر الرسول

۲۵ الوفا بما يجب لحضرة المصطفٰى (المدينة المنورة، صفحہ ۸۶ تا ۱۷۹)

مؤخر الذکر تصنیف کا تذکرہ علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء (جلد۲، صفحہ ۶۰۱) میں خود بھی کیا ہے---

کچھ اس کتاب کے بارے میں

امام سمہودی نے انتہائی اشتیاق اور عقیدت و محبت کے ساتھ تاریخِ مدینہ منورہ رقم کرنے کا اہم کارنامہ سرانجام دیا--- اس سلسلے میں آپ نے تین کتابیں تصنیف کیں، اوّلاً ایک ضخیم کتاب "اقتضاء الوفاء باخبار دار المصطفٰى" کے نام سے تحریر فرمائی، جس میں آپ نے اس سے پہلے تاریخِ مدینہ پر لکھی جانے والی کتب کی تلخیص کے ساتھ موضوع کی مناسبت سے مفید مباحث کو بڑی تفصیل سے بیان کیا--- اس کا بیش تر حصہ لکھا گیا، مگر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی--- اسی

اثنا میں ایک ایسے شخص نے آپ کو اس کتاب کی تلخیص کی فرمائش کی، جس کے بارے میں [illegible] لکھتے ہیں:

طاعته غنم، و مخالفته غُرم---

"جس کے حکم کی تعمیل باعثِ غنیمت اور مخالفت سراسر خسارہ ہے"---

چناں چہ آپ نے قدرے اختصار اور بعض ضروری اور مفید اضافوں کے ساتھ پیش نظر کتاب "**وفاء الوفاء، باخبار دار المصطفٰی**" تصنیف فرمائی---(وفاء الوفاء، جلد۱، صفحہ۱-۲)

یہ کتاب ۲۴ر جمادی الآخرہ ۸۸۶ھ کو مدینہ منورہ میں مکمل ہوئی اور اسی سال شوال المکرّم میں کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر اس کی تبییض کا کام کیا---(وفاء الوفاء، جلد۴، صفحہ۱۴۲۲)

ازاں بعد ۸۹۳ھ میں وفاء الوفاء کی تلخیص کی اور اس کا نام "**خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفٰی**" رکھا۔
(جذبُ القلوب، صفحہ۸)

شیخ عبد الحق محقق دہلوی لکھتے ہیں:

"عالم، کامل، اوحد العلماء الاعلام، عالمِ مدینہ خیر الانام سید نور الدین علی بن السید الشریف عفیف الدین عبد اللہ بن احمد الحسنی السمہودی المدنی رحمہ اللہ رحمۃ الابرار کی تصنیف **وفاء الوفاء** تواریخ مدینہ میں عمدہ ترین کتاب ہے--- یہ کتاب نہایت نافع ہے، جس میں آپ نے مدینہ منورہ کے حالات و واقعات اور اس میں پیش آمدہ حوادث کو بیان کیا ہے، احادیث و آثار نقل کی ہیں اور روایات میں اختلاف کی عمدہ پیرائے میں توجیہ و تطبیق کی ہے"---(جذبُ القلوب، صفحہ۷-۸)

وفاء الوفاء چار جلدوں میں ہے، یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ علامہ سمہودی فرماتے ہیں:

"ابواب کی یہ تعداد نیک فالی کے لیے ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب میرے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دے اور اپنی بے کراں نعمتوں سے سرفراز فرما دے"---

(وفاء الوفاء، جلد۱، صفحہ۸)

پہلا باب:

اسمائے مدینہ منورہ کے بارے میں---

دوسرا باب:

فضائل مدینہ طیبہ، اس میں سولہ فصلیں ہیں---

تیسرا باب:

گزشتہ زمانوں میں ساکنین مدینہ اور حضور ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے احوال، اس میں بارہ

فصلیں ہیں---

چوتھا باب:

مدینہ منورہ کی مساجد، حجراتِ مبارکہ، بازار اور دیگر عمارات، یہ باب ۱۴۷ فصلوں پر مشتمل ہے---

پانچواں باب:

عید گاہیں اور جہاں جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھائی اور مدینہ منورہ کے قبرستان شہداءِ اُحد کی فضیلت، اس میں سات فصلیں ہیں---

چھٹا باب:

آبارِ مبارکہ (کنویں) اور آپ ﷺ سے منسوب دیگر مقامات، اس میں پانچ فصلیں ہیں---

ساتواں باب:

مدینہ منورہ کی وادیاں، چراگاہیں اور پہاڑ--- یہ آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے---

آٹھواں باب:

زیارتِ مصطفیٰ ﷺ--- یہ باب سب سے اہم اور کتاب کا مغز اور لبِ لُباب ہے--- اس میں چار فصلیں ہیں، جن میں زیارت کے بارے میں احادیث مبارکہ اور دیگر دلائل، اہمیت و فضیلت، حیاتُ النبی ﷺ، زیارتِ نبوی ﷺ کی نیت سے سفر کرنے کا جواز و استحباب، توسل، شفاعت، مواجہہ عالیہ کی طرف منہ کر کے سلام پیش کرنے اور دعا و توسل کے لیے مواجہہ عالیہ کی جانب متوجہ ہونے کے استحباب اور آدابِ زیارت وغیرہ موضوعات پر ایمان افروز اور روح پرور گفتگو کی ہے---

غرض یہ کتاب اہلِ محبت کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے، اس مستند تاریخِ مدینہ کا فاضل جلیل عالم نبیل حضرت علامہ شاہ محمد چشتی نے عمدہ و فاضلانہ ترجمہ کیا ہے--- وہ پہلے رسالہ قشیریہ، الادب المفرد اور معجزات النبی وغیرہ کتب کا ترجمہ کر کے اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں--- امید کہ اس ترجمہ کو بھی خواص و عوام بنظر استحسان دیکھیں گے--- فاضل مترجم اور ناشر کتاب محترم محمد محسن صاحب لائق صد تبریک ہیں کہ انھیں اس اہم کتاب کی اشاعت کی سعادت میسر آئی--- اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور سعادتِ دارین سے نوازے---

آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللّٰہ تعالٰی و سلم علیہ

و علی آلہ و صحبہ اجمعین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ترجمہ اُردو **وفاء الوفاء شریف** (علامہ سمہودی رحمہ اللہ)

مختصر تعارفِ مصنف رحمہ اللہ

آپ کا اسمِ گرامی نور الدین ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن احمد حسنی شافعی سمہودی رحمہ اللہ تھا، مسلّم امام تھے، مدینہ منورہ کے مؤرخ اور مفتی تھے۔

مصر کے شہر سمہود میں پیدا ہوئے، سالِ ولادت ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) تھا، قاہرہ میں پرورش پائی اور ۸۷۹ھ کو مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔

آپ کی کئی ایک تصانیف میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ﷺ (جس کا ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے)۔

۲۔ خلاصہ الوفاء، اسی مذکور کتاب کا خلاصہ ہے۔

۳۔ جواہر العقدین، اس میں علم دین اور نسب کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۔ الفتاویٰ، آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۵۔ الغماز علی اللماز، حدیث پاک کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔

۶۔ درّ السموط، وضو کے شرائط کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔

۷۔ الانوار السنیّہ فی اجوبۃ الاسئلہ الیمنیّہ۔

۸۔ العقد الفرید فی احکام التقلید وغیرہ۔

۹۱۱ھ (۱۵۰۶ء) کو مدینہ منورہ میں حضرت کا وصال ہو جاتا ہے۔

(اعلام الزرکلی ج ۴، ص ۳۰۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تقدیم

ہر مخلوق پروردگارِ عالم جل جلالہ کی حمد و ثناء کر رہی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پوری اولاد میں سے سربلند حضرت محمد بن عبد اللہ ﷺ و رضی اللہ عنہ' آپ کی آلِ پاک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر صلوٰۃ و سلام ہر لمحہ بھیجا جاتا رہے۔

اما بعد

یہ کتاب شہرِ رسول اکرم ﷺ یعنی مدینہ منورہ کی تاریخ پر مشتمل ہے' علامہ سمہودی رحمہ اللہ نے اسے اپنی ایک اور کتاب ''اقتضاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ﷺ'' کا اختصار کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اختصار کرتے وقت اس میں چند ایک تبدیلیاں کی ہیں جیسا کہ آپ نے اس کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے' تفصیل مقدمہ میں بیان کر دی ہے۔

اب جبکہ ہم اسے دار الکتب العلمیہ کی طرف سے دوبارہ چھاپنے چلے ہیں تو بتاتے چلیں کہ ہم نے اس پر کچھ زیادہ حواشی نہیں دئے' صرف ضروری حواشی دے دئے ہیں' مشکل الفاظ کے معانی دئے ہیں' آیات کے حوالے لکھے ہیں' مختصر طور پر کچھ وضاحتیں بیان کی ہیں اور کچھ عنوان درج کر دئے ہیں۔

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کا صلہ کثیر نیکیوں کی صورت میں عطا فرمائے گا اور قارئین کتاب کے لئے اسے مفید بنا دے گا کیونکہ وہ ہر پسندیدہ شے پر قدرت رکھتا ہے۔ کتاب کی ابتداء اور اس کی تکمیل پر ہم حمد و ثناءِ الٰہی بجا لاتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس نیک کام میں صرف اللہ تعالیٰ سے امداد کے خواستگار ہیں' اللہ تعالیٰ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ' آپ کی آل پاک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہمیشہ رحمتوں کی بارش برساتا رہے۔

خطبۂ مؤلّف

اللہ تعالیٰ کی گوناگوں بے شمار نعمتوں پر حمد و ثناء ہے' پھر سارے انبیاء میں سے بزرگ تو ہمارے سردار' آپ کی آل' اصحاب اور تمام برگزیدہ بندوں پر درود و سلام پیش ہے۔

ابھی میری کتاب ''اقتفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰے ﷺ'' مختلف مراحل سے گذر رہی تھی' میں اس میں مدینہ پاک کے ہر گوشہ سے متعلق معلومات اکٹھی کر رہا تھا' اس بارے میں جہاں جہاں سے بھی کچھ ملا' اسے اختصاراً اکٹھا کر رہا تھا اور ان میں کچھ نئی چیزیں شامل کرتا جا رہا تھا' طرح طرح کی مشکلات اور مصروفیات میں گھرا ہوا تھا کہ ان حالات میں ایک میرے ایک ایسے مہربان نے اس کتاب سے قبل اسی میں سے ایک مختصر کتاب تیار کرنے پر زور دیا جن کا حکم میں ٹال نہیں سکتا تھا بلکہ ان کا انکار میرے لئے ایک جرم سے کم نہ تھا چنانچہ ان کے بے پناہ شوق اور دلچسپی کی وجہ سے میں نے حامی بھر لی' پھر میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ قارئین کے سامنے کچھ ایسے امور پیش کر دوں جو دوسری مختصر بلکہ تفصیلی کتابوں میں بھی نہیں پائے جاتے خصوصاً وہ امور جن کا تعلق حضور ﷺ کے حجرۂ مقدسہ اور اس سے متعلق ضروری باتوں سے تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا' یقینی معلومات میرے پاس تھیں' ہمارے دور میں اس کی کچھ تعمیر ہوئی تھی جیسے ہم اسے اس کے مقام پر بیان کریں گے اور بتائیں گے کہ حجرۂ شریفہ کے گرنے والے حصوں کو کیسے بنایا گیا تھا اور حجرۂ مقدسہ کا احاطہ کرنے والی دیواروں کو کیسے چنا گیا تھا' مجھے اس نئی تعمیر میں خدمت کا موقع ملا تھا' تاہم حجرۂ مقدسہ کے گراتے وقت قریب نہ تھا' اس کی پیائش کا مجھے پتہ چل گیا' تربت شریف کی خوشبوؤں سے بہرہ ور ہوا' اس کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بنایا' مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر تربت کہاں کہاں موجود ہے' اس موقع پر دل شرمساری اور ہیبت میں ڈوب گیا اور گویا اس پر پردہ سا پڑ گیا کیونکہ اس مقام اور اس کے احوال جاننے کے لئے بنیادی طور پر دلوں میں محبت ڈال دی گئی ہے' مجھ پر یہ حالت یونہی طاری ہوئی جیسے ایک فدائی عاشق پر طاری ہو سکتی ہے' ایک شاعر نے ایسی حالت کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

''اس زمین میں بسیرا کرنے والے کے بارے میں مجھے کچھ لکھنے دو لیکن جو کچھ لکھنا ہے' میری

آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے لکھو میں ان مقامات کو آنکھوں سے نہیں بلکہ کانوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

مجھے حیاتی کی قسم اس مقام کا احترام' اسے تحریر میں لانا اور محفوظ کر لینا دین کا اہم ترین کام ہے' اسے دیکھنا' ایمان و یقین میں زیادتی کا سبب ہے کیونکہ اس سے دارِ ایمان کے معروف مقامات کی معرفت حاصل ہوتی ہے' وہ علامات ملتی ہیں جو شیطان کو رسوا کر دیتی ہیں اور اس کی کھلی نشانیاں موجود ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب نیک شخصیات کے اس شہر سے محبت رکھنے والوں کے لئے' یہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے تحفہ ثابت ہوگی' میں نے اسے تیار کرنے اور سنوارنے کے لئے انتہائی محنت سے کام لیا ہے' میں امید رکھتا ہوں کہ یہ میرے گناہوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ثابت ہوگی اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں ضرور قبول ہوگی۔ میں نے اس کا نام "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ ﷺ" رکھا ہے اور اسے کچھ ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔

وضاحتِ ابوابِ کتاب

پہلا باب

اس میں شہر مدینہ منورہ کے نام دئے گئے ہیں۔

دوسرا باب

اس میں فضائلِ مدینہ کا ذکر ہے' یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی بنیاد کب اور کیسے پڑی' یہ کیسے حالات سے گذرا اور اس سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ اس میں سولہ فصلیں ہیں۔

فصل نمبر ۱:

اس میں دیگر شہروں پر اس کی افضلیت کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۲:

اس میں یہاں کی رہائش کا شوق پیدا کیا گیا ہے' یہاں آنے والی تنگدستی اور مشکلات پر صبر کی تلقین کی گئی ہے' یہ بتایا گیا ہے کہ مدینہ گندگی اور گناہوں کو دور کرتا ہے' اہلِ مدینہ کے خلاف برے ارادے رکھنے والوں' یہاں برا کام کرنے والوں اور برے لوگوں کو ٹھکانہ دینے والوں کو ڈانٹا گیا ہے۔

فصل نمبر ۳:

اس میں اہلِ مدینہ کی حفاظت اور عزت کرنے کے بارے میں برانگیختہ کیا گیا ہے' یہاں مرنے کا شوق پیدا کیا گیا ہے اور اسے اخروی ٹھکانہ بنانے کو کہا گیا ہے۔

فصل نمبر ۴:

مدینہ طیبہ کے بارے میں نیز اہلِ مدینہ کے لئے حضور ﷺ کی دعاؤں کا ذکر ہے' یہاں کی وباء کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آپ نے اس کے کسی اور جگہ پر چلے جانے کی دعا فرمائی تھی۔(چنانچہ وباء یہاں سے چلی گئی تھی)۔

فصل نمبر ۵:

یہ بتایا ہے کہ دجال یہاں داخل نہ ہو سکے گا اور نہ ہی یہاں طاعون کی وباء آ سکے گی۔

فصل نمبر ۶:

اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہاں کی مٹی اور کھجور باعثِ شفاء ہیں۔

فصل نمبر ۷:

اس میں مدینہ منورہ کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۸:

اس میں صحیح احادیث کے ذریعے مدینہ منورہ کا قابلِ احترام ہونا بتایا گیا ہے۔

فصل نمبر ۹:

عَیر اور ثَور نامی دو پہاڑیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بناء پر حرم نبوی کی حد بندی پر روشنی پڑتی ہے۔

فصل نمبر ۱۰:

اس میں ایسی احادیث مذکور ہیں جن کی بناء پر حرم نبوی کے مزید احترام پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک حد تک اس کے درخت وغیرہ نہ کاٹے جائیں۔

فصل نمبر ۱۱:

اس میں مدینہ طیبہ کی حد بندی کے بارے میں الفاظ حدیث اور ان کی وضاحت کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۱۲:

یہ بتایا گیا ہے کہ حد بندی کی اس مقدار کو قابلِ احترام کیوں قرار دیا گیا ہے۔

فصل نمبر ۱۳:

حرم مدینہ منورہ کے بارے میں احکام کیا ہیں۔

فصل نمبر ۱۴:

شہر مدینہ کی ابتداء کیسے ہوئی اور اس میں کیا کچھ ہوگا۔

فصل نمبر ۱۵:

اس میں اس واقعہ کا بیان ہے جب لوگ یہاں سے نکل جائیں گے اور اسے چھوڑ دیں گے۔

فصل نمبر ۱۶:

اس میں اس آگ کا ذکر ہے جس سے حضور ﷺ نے ڈرایا تھا چنانچہ وہ یہاں ظاہر ہوئی اور حرم شریف کے قریب پہنچ کر بجھ گئی۔

تیسرا باب

اس باب میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو شروع سے یہاں مقیم چلے آئے پھر حضور ﷺ کی یہاں تشریف آوری کا ذکر ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ نے ہجرت کے بعد یہاں کیا کچھ کیا تھا۔ اس باب میں بارہ فصلیں ہیں:

پہلی فصل :

طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد یہاں کون آباد ہوئے' یہودی یہاں کیونکر آئے اور ان کے مکانوں کا ذکر ہے۔

دوسری فصل :

انصار یہاں کیونکر آباد ہوئے؟

تیسری فصل :

ان کا نسب نامہ کیا تھا؟

چوتھی فصل :

انصارِ مدینہ' یہودیوں پر کیسے غالب ہوئے اور تبع (حمیری) کے ساتھ ان کا معاملہ کیا تھا۔

پانچویں فصل:

یہودیوں کو ذلیل کر کے نکالا گیا تو ان کے مکانات کس جگہ تھے' نہاں قلعے بنائے اور کونسی جنگیں کیں؟

چھٹی فصل:

یہود و نصاریٰ کے درمیان ''حربِ بعاث'' نامی جنگ کا ذکر ہے۔

ساتویں فصل:

حضور ﷺ کی تشریف آوری سے انصار' کب مستفید ہوئے اور کب بیعتِ عقبہٗ صغریٰ کی تھی۔

آٹھویں فصل:

بیعتِ عقبہٗ ثانیہ کب ہوئی اور اس کے نتائج کیا مرتب ہوئے؟

نویں فصل:

حضور ﷺ کے مدینہ میں ہجرت کا بیان ہے۔

دسویں فصل:

سرزمین مدینہ میں حضور ﷺ کی تشریف آوری اور مسجد قباء کی بنیاد۔

گیارہویں فصل:

شہر مدینہ میں آپ کا داخلہ' حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں رہائش کا ذکر ہے اور اس گھر کی کیفیت بتائی گئی ہے نیز مہاجرین و انصار میں رشتۂ اخوت کا ذکر کیا گیا ہے۔

بارہویں فصل:

یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں کیا کچھ کیا تھا۔

چوتھا باب

اس باب میں ان امور کا ذکر ہے جو آپ کی عظیم القدر مسجد سے تعلق رکھتے ہیں' مبارک حجروں اور مکانات سے تعلق رکھتے ہیں جن کے گرد گھر اور محل بنے تھے' بازار مدینہ کا ذکر ہے' مہاجرین کے مکانات بیان ہوئے ہیں اور ان کے گرد حفاظتی دیوار بتائی گئی ہے۔اس باب میں سینتیس (۳۷) فصلیں ہیں:

پہلی فصل :

اس میں حضورﷺ کے اپنی مبارک مسجد کے لئے جگہ لینے کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کیونکر بنائی گئی۔

دوسری فصل :

اس میں بتایا گیا ہے کہ مسجد کی لمبائی اور چوڑائی کتنے کتنے ہاتھ تھی اور پھر آج کی مسجد کا فرق بتایا گیا ہے (یہ نویں ہجری کے آخر کی بات ہے)۔

تیسری فصل :

اس میں یہ بتایا ہے کہ حضورﷺ قبلہ بدلنے سے قبل اور بعد' مسجد میں کہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے پھر قبلہ کی تبدیلی کا ذکر ہے۔

چوتھی فصل :

اس میں کھجور کے اس تنے کا ذکر ہے جس سے حضورﷺ تکیہ لگاتے تھے پھر منبر بنا دیئے جانے کا واقعہ مذکور ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں کیا کچھ ہوا۔

پانچویں فصل :

اس میں مسجد نبوی کی فضیلت کا ذکر ہے۔

چھٹی فصل :

اس میں منبر شریف اور روضۂ انور کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

ساتویں فصل :

اس میں مسجد شریف کے ستونوں کا ذکر ہے۔

آٹھویں فصل :

اس میں مقامِ صُفّہ اور اہلِ صفہ کا ذکر ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے لئے مسجد میں کھجور کے گچھے کیونکر لٹکائے جاتے تھے۔ (سایہ کے لئے)۔

نویں فصل :

اس میں آپ کے ان حجروں کا ذکر ہے جو مغربی جانب کے علاوہ مسجد کو گھیرے ہوئے تھے۔

دسویں فصل :

اس میں حضور ﷺ کی صاحبزادہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ مبارکہ کا ذکر ہے۔

گیارہویں فصل :

اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے دروازے بند کر دئے جائیں نیز اس حجرہ کا ذکر ہے جسے بند کرنے کا حکم نہیں فرمایا تھا۔

بارہویں فصل :

اس میں مسجد کی اس توسیع کا ذکر ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔

تیرہویں فصل :

اس کمرہ کا ذکر جو آپ نے مسجد کے ساتھ بنایا تھا اور پھر مسجد میں شعر پڑھنے اور آواز بلند کرنے سے روک دیا تھا۔

چودہویں فصل :

اس میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسجد میں توسیع کا ذکر ہے۔

پندرہویں فصل :

اس میں اس حفاظتی کمرے کا ذکر ہے جو مسجد کی ایک جانب بنایا گیا تھا۔

سولہوین فصل :

مسجد میں ولید کے حکم سے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی توسیع کا ذکر ہے۔

سترہویں فصل :

مسجد شریف میں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی طرف سے بنوائے گئے محراب' برجیوں' میناروں کا ذکر ہے اور آپ نے مسجد میں محافظ مقرر کیا کہ کسی کو مسجد میں جنازہ نہ پڑھانے دے۔

اٹھارہویں فصل :

اس میں خلیفہ کی توسیع مسجد کا ذکر ہے۔

انیسویں فصل :

اس میں اس ابتدائی حجرۂ مقدسہ کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی قبر انور سمیت قبروں کو گھیرے ہوئے تھا۔

بیسویں فصل :

حجرۂ مبارک کی دوبارہ تعمیر اور اس کے گرد دیوار کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکیسویں فصل :

اس میں تینوں قبورِ مبارکہ کی ترتیب کا ذکر ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر شریف کے لئے وہاں جگہ خالی رکھی گئی ہے، فرشتے روضۂ انور کے گرد گھیرا ڈالنے آتے ہیں، تعظیم کرتے ہیں اور یہ کہ آپ کے مزار شریف کے صدقے بارش مانگی جاتی ہے۔

بائیسویں فصل :

حجرۂ مبارک اور اس کے گرد بنی دیوار کا ذکر ہے لیکن جو کچھ ہم نے دیکھا وہ ویسا نہیں تھا جسے لوگوں نے بیان کر رکھا تھا۔

تیئیسویں فصل :

حجرہ شریف کی ایک اور مرتبہ تعمیر، اس وقت اس میں کسی کو کسی طریقے سے داخل کیا گیا تھا پھر وہ سوراخ پتھر سے بند کر دیا گیا۔

چوبیسویں فصل :

اس میں اس صندوق کا ذکر ہے جو آپ کے سرہانے رکھا رہتا تھا پھر آپ کے چہرۂ انور کی نشاندہی کے لئے چاندی کے کیل کا ذکر ہے، یہ ذکر ہے کہ جبریل کہاں حاضری دیتے تھے، حجرۂ مبارکہ پر پردہ ڈالنے اور اسے سجانے کا ذکر کیا ہے۔

پچیسویں فصل :

مسجد میں قندیلوں اور انہیں لٹکانے کے مقامات کا ذکر ہے۔

چھبیسویں فصل :

قدیم دور میں اس آگ کا ذکر جس نے سب آرائشوں، مسجد اور چھت وغیرہ کو جلا دیا تھا پھر از سرِ نو تعمیر ہوئی۔

ستائیسویں فصل :

حجرۂ مبارکہ کے امتیاز کے لئے اس پر نیلگوں گنبد بنایا گیا۔

اٹھائیسویں فصل :

اس میں اس جدید عمارت کا ذکر جو ہمارے دور میں موجود ہے' یہ ایسے بنی کہ ہمارے ذہنوں میں بھی نہ تھی' آگ لگنے کے بعد کیا کچھ ہوا' وجودِ مطہر کس مقام میں موجود ہے' مزارات کی ترتیب کیسی ہے اور اس وقت حجرۂ مبارکہ کی صورتِ حال کیا ہے۔

انتیسویں فصل :

پہلی عمارت کو ہمارے دور میں جب آگ لگ گئی' تو کیا کچھ ہوا؟ اسے آئندہ فصلوں میں میں نے اشارۃً بتا دیا ہے کیونکہ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب میں اس کتاب کا مسودہ تیار کر چکا تھا' ''خاتمہ'' میں میں نے حضرت نور الدین زنگی شہید کی اس خندق کا ذکر کیا ہے جو اس نے حجرۂ مبارک کے گرد کھدوا کر اس میں ڈھال کر قلعی بھر دی تھی۔

تیسویں فصل :

اس میں مسجد کے فرش پر کنکر بچھانے اور اس سے قبل صحابہ کے مسجد میں تھوکنے کا بیان' مسجد میں خوشبو لگانے اور دھونی دینے کا ذکر ہے اور پھر اس کے حکم کا بیان ہے۔

اکتیسویں فصل :

اس میں برآمدوں' ستونوں' سوراخوں' پانی پلانے والوں اور اس کے ذخیرہ کرنے کا بیان ہے۔

بتیسویں فصل :

اس میں مسجد شریف کے دروازوں اور روشن دانوں کا ذکر ہے جو انہیں دوسرے گھروں سے نمایاں کرتے تھے۔

تینتیسویں فصل :

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے لئے روشن دانوں کا ذکر۔

چونتیسویں فصل :

مسجد کے گرد مکانوں کا بیان ہے۔

پینتیسویں فصل :

خالی جگہیں اور ان کے گرد مہاجرین کے گھر۔

چھتیسویں فصل :

مدینہ منورہ کے بازاروں کا ذکر۔

سینتیسویں فصل :

مہاجر قبیلوں کے مکانات اور ان کے گرد دیوار۔

پانچواں باب

اس باب میں عیدوں وغیرہ کے موقع پر آپ کے مصلّٰی کا بیان ہے' مدینہ پاک کی ان مساجد کا ذکر ہے جہاں حضورعلیہ تشریف لے گئے' مدینہ پاک کی قبروں کی عظمت اور وہاں کون کون دفن ہیں' اُحد پہاڑ کی فضیلت کیا ہے اور وہاں کے شہداء کی عظمت کیا ہے۔اس میں سات فصلیں ہیں:

پہلی فصل :

عیدوں کے موقع پر حضورعلیہ کی جائے نماز کونسی جگہ ہوتی تھی؟

دوسری فصل :

مسجد قباء اور مسجد ضرار کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری فصل :

ہمارے دور میں موجود باقی مسجدیں جن کے بارے میں صحیح طور پر معلوم ہے کہ کہاں کہاں ہیں؟

چوتھی فصل :

ان مسجدوں کا ذکر جن کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ یہاں تھیں لیکن جگہ کا علم نہ ہو سکا۔

پانچویں فصل :

قبرستان مدینہ کی عظمت بتائی گئی ہے۔

چھٹی فصل :

اس میں بتایا گیا ہے کہ صحابہ کرام اور آلِ بیت رضی اللہ عنہم میں سے جنت البقیع میں کون کس جگہ دفن ہے اور

ان کی علامات بتائی گئی ہیں۔

ساتویں فصل :

اُحد پہاڑ اور اس پر شہید ہونے والوں کی فضیلت بیان کر دی گئی ہے۔

چھٹا باب

اس باب میں شہر مدینہ کے مبارک کنوؤں کا بیان ہے، چشموں، درختوں اور قابلِ تقسیم مال کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کے قبضہ میں آ گیا تھا پھر ان مسجدوں کا ذکر ہے جن میں سفر کے دوران یا جنگ کے موقع پر آپ نے نمازیں پڑھی تھیں۔اس میں پانچ فصلیں ہیں:

فصل نمبر ۱:

۔ اس میں مدینہ کے مبارک کنوؤں کا ذکر ہے، آخر میں اس کنوئیں کا بیان ہے جو حضور ﷺ کے نام سے منسوب ہے اور وہ اب تک موجود ہے۔

فصل نمبر ۲:

آپ کے صدقات کا ذکر اور جو ان درختوں کا ذکر ہے آپ نے اپنے دستِ اقدس سے لگائے تھے۔

فصل نمبر ۳:

مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان حضور ﷺ کے راستے میں آنے والی آپ سے منسوب مساجد کا ذکر۔

فصل نمبر ۴:

دوسری مساجد کا ذکر جو ہمارے وقت کے حاجیوں کے راستے میں واقع ہیں، جہاں سے لوگ پیدل چل کر جاتے ہیں اور پھر راستے کے قریب واقع مساجد کا ذکر۔

فصل نمبر ۵:

ان کے علاوہ ایسی مساجد کا بیان جو غزوات اور آپ کے سفر سے تعلق رکھتی ہیں۔

ساتواں باب

سرزمین مدینہ طیبہ میں موجود وادیوں اور چراگاہوں کا ذکر، بستیوں اور پہاڑوں کا ذکر، ان پر کون حکمران تھے، ان بستیوں کے قریبی مقامات کون سے تھے؟ کون سے کنوئیں اور وادیاں مشہور تھیں اور وہ کن مقامات پر تھے۔اس میں آٹھ فصلیں ہیں:

فصل نمبر ۱:

وادیٔ عقیق کی فضیلت' اس کا پھیلاؤ اور حد بندی کا ذکر۔

فصل نمبر ۲:

یہ وادیٔ الگ طور پر کہاں ہے' اس پر محلات کہاں بنے ہیں اور ان کا کس ذریعے سے پتہ چلا؟

فصل نمبر ۳:

اس کا پھیلاؤ اور اس کے محلات کا ذکر' اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اور وادی کے بارے میں اشعار۔

فصل نمبر ۴:

اس میں اُبھرے ہوئے مقامات کا ذکر ہے' یہ بتایا گیا ہے کہ درخت کہاں پائے جاتے ہیں' شرید پہاڑی کا ذکر ہے اور اس کے قریب پہاڑیوں کا ذکر ہے۔اس فصل میں ایک ''خاتمہ'' ہے جس میں ''عقیق'' میں سے نکلنے والی وادیوں کا ذکر ہے اور ان پر موجود کنوؤں کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۵:

اس فصل میں مدینہ منورہ کی باقی وادیوں کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۶:

اس میں چراگاہوں کا ذکر ہے' یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کن کی تھیں پھر ''نقیع'' کے مقام پر حضور ﷺ کی چراگاہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل نمبر ۷:

مدینہ منورہ کی بستیوں' ان کی چوڑائی' ان کے نگرانوں کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اردگرد کیا کچھ تھا' پھر ندی نالوں کا ذکر ہے' پہاڑوں اور ٹیلوں کا بیان ہے' وہاں کے مشہور کنوؤں اور وادیوں کا ذکر ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک کا مقام بتایا گیا ہے' مسجدیں بتائی گئی ہیں' ٹیلے ذکر کئے گئے ہیں اور غزوات کا ذکر موجود ہے پھر مدینہ منورہ کی ہر طرف موجود اشیاء وضاحت سے بیان کی گئی ہیں' وہاں کے حاکموں کا ذکر موجود ہے۔ہر چیز کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کر دیا گیا ہے۔

آٹھواں باب

اس میں روضۂ انور کی زیارت کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں چار فصلیں ہیں:

فصل نمبر ۱:

اس میں ان احادیث کا ذکر ہے جو واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ یہ زیارت جائز ہے۔

فصل نمبر ۲:

اس میں کچھ اور دلائل سے یہ زیارت ثابت کی گئی ہے پھر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شریعت کا تاکیدی حکم ہے جو واجب کے پلّے کا ہے بلکہ کچھ علماء نے تو اس زیارت پر واجب ہی کا لفظ بولا ہے' پھر یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں' یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کسی بھی طرح سے زیارت کی نیت کر کے سفر کرنا جائز ہے' اس زیارت کی نذر مانی جا سکتی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آپ پر سلام پیش کرنے کا اجر و ثواب ملتا ہے۔

فصل نمبر ۳:

اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کی زیارت کا ارادہ لے کر حاضری دینے والا بارگاہِ الٰہی میں آپ کا وسیلہ پیش کر سکتا ہے اور آپ کی شفاعت کا سوال کر سکتا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ آپ پر سلام کے وقت' وسیلہ بناتے وقت اور آپ کے ہاں دعا کرتے وقت حضور ﷺ اس شخص کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

فصل نمبر ۴:

حضور ﷺ کے روضۂ انور کی زیارت اور قرب کا کیا طریقہ ہونا چاہیے' مدینہ منورہ کی مسجدوں اور آثار و علامات اسلام کو بطور تبرک سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ان آٹھ بابوں میں سے اس باب کا حق تو یہ تھا کہ اسے سب سے پہلے لایا جاتا لیکن چونکہ یہ اس کتاب کا گویا نتیجہ ہے' باقی ابواب اس کے لئے ابتدائی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں تو میں اسے آخر میں ذکر کر رہا ہوں تاکہ کتاب کو اس کستوری کی خوشبو میں مکمل کروں' اسی باب میں تمام کتاب کا نچوڑ آ گیا ہے۔ ایسا میں نے اس امید پر کیا ہے کہ ان آٹھ ابواب کے صدقے میں میرے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ مجھ پر عظیم احسان فرمائے گا۔ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے تعلق نہیں رکھتا' اسی سے کوتاہیوں کی معافی مانگتا ہوں کیونکہ وہی میرے لئے کافی اور بہترین کارساز ہے۔

پہلا باب

شہر مبارک کے کئی ایک نام

یاد رکھیے کہ کسی چیز کے بہت سے نام ہونا اس بات کی دلیل ہوتے ہیں کہ وہ چیز اعلیٰ درجہ کی ہے' میں نے آج تک اس شہر مقدس جتنے نام کسی اور شہر کے نہیں دیکھے' میں نے خوب محنت سے اتنے نام ڈھونڈ نکالے ہیں کہ اس سلسلہ میں میں سب سے ماہر' ہمارے مشائخ کے شیخ حضرت علامہ مجد شیرازی لغوی رحمہ اللہ سے بھی بڑھ گیا ہوں یعنی انہوں نے تیس نام پیش کیے تھے' میں انہیں اس طور پر لکھ رہا ہوں کہ ہر ایک کو ان کا پتہ چل سکے (کل نام ۹۴ پیش کر رہا ہوں) میں انہیں حروف تہجی کی ترتیب سے لکھ رہا ہوں:

اُثْرِبُ

اُثْـرِبُ پہلا نام ہے جو مَسْـجِدُ کے وزن پر ہے' ہمزہ پر زبر' ثاء پر جزم' راء پر زیر اور آخر میں باء ہے' یہ نام آگے آنے والے ایک نام "یثرب" ہی کا دوسرا نام ہے جیسے اَلْـمُـلْـمُ کی جگہ یَـلْـمُـلْـمُ بولا جاتا ہے کہتے ہیں کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد مختلف شہروں میں پھیل گئی تو چونکہ اس مقام پر رہائش کرنے والے کا نام اثرب یا یثرب تھا لہٰذا مدینہ الرسول ﷺ کا یہ نام پڑ گیا۔

مدینہ کس مقام کو کہتے ہیں' اختلاف

اب اس میں اختلاف کہ آیا یثرب اس پوری جانب کا نام ہے جس میں مدینہ منورہ بھی موجود ہے؟ یا یہ مدینہ منورہ ہی کا نام ہے؟ یا پھر اس یثرب کے ایک مخصوص حصے کو مدینہ کہتے ہیں؟ پہلا قول حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہے' دوسرا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے' امام زمخشری نے اسی کو اپنایا ہے اور تیسرا قول حضرت امام مالک کے ایک شاگرد حضرت محمد بن الحسن رحمہ اللہ کا ہے جنہیں ابن زبالہ کہتے ہیں۔

یثرب نامی اس بستی ہی سے وہ تمام بستیاں وجود میں آئی تھیں جو "قناۃ" سے "جرف" اور "برنی" سے "زبالہ" تک کے درمیانی علاقے میں موجود تھیں۔

جمال مطری نے ابن زبالہ کی بات نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں تین سو یہودی موجود تھے جو لوہے وغیرہ کی ڈھلائی کا کام کرتے تھے۔

ابن زبالہ نے جو لکھا ہے وہ غلط ہے' انہوں نے دیگر بستیوں اور یثرب کو الگ الگ شمار کیا ہے جبکہ جمال مطری نے انہیں ایک ہی سمجھ لیا۔ انہوں نے ابن زبالہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: "وہ یعنی یثرب آج کل اسی نام سے مشہور

ہے جہاں کھجور کے بہت سے درخت موجود ہیں جو اہلِ مدینہ کی ملکیت ہیں اور فقراء وغیرہ کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔اس کی غربی جانب سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا مزار وشہادت گاہ ہے' مشرقی جانب (جو''برکۃ'' کے نام سے مشہور ہے) عین الازرق نامی عام استعمال کا چشمہ ہے جہاں سے شامی لوگ حج پر آتے جاتے وقت پانی پیتے ہیں اور حاجی لوگ انہیں چشمہ ہائے حمزہ کہتے ہیں۔

یہ مقام آج تک یثرب ہی کے نام سے مشہور ہے۔بسا اوقات اسے''اَلْکَـــادِب'' بھی کہتے ہیں' مناسک حج بیان کرتے ہوئے برہان بن فرحون نے یہی نام ذکر کیا ہے' آپ چاہیں تو اسے (مدینہ کا) ایک الگ نام بھی شمار کر سکتے ہیں۔

جمال مطری یثرب کے بارے میں لکھتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہاں قبیلہ اوس کی ایک بڑی شاخ' بنو حارثہ کے مکانات تھے اور احزاب کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان انہی کے بارے میں نازل ہوا تھا:

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۝ (سورۂ احزاب:۱۳)

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا: اے مدینہ والو! یہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں' تم گھروں کو واپس چلو۔''

اسی بناء پر انہوں نے تیسرے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ قریش اور ان کے ساتھی یومِ احزاب پر بلکہ مطری کے مطابق یومِ احد پر بھی''اومہ'' اور اس کے قرب میں اُترے تھے جہاں قبیلہ اوس کی شاخ بنو حارثہ کے مکانات تھے نیز خزرج قبیلہ کی شاخ بنو سلمہ کے مکانات بھی تھے اور یہ دونوں ہی میدانِ جنگ میں حضور ﷺ کے حامی تھے' یہی وجہ تھی کہ انہیں اپنے اہلِ خانہ اور گھروں کے بارے میں اُحد کے دن دشمنوں سے فکر لاحق تھی لہٰذا ان کے بارے میں یہ فرمان نازل ہو گیا:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۝ (سورۂ آل عمران:۱۲۲)

''جب تم میں کے دو گروہوں کا ارادہ ہوا کہ نامردی کر جائیں اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے۔''

اس پر ان میں سے عقلمند لوگ کہنے لگے کہ اَب ہم یہاں ٹھہرنے پر فکر مند نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ذمہ داری لے لی ہے اور نبی کریم ﷺ کی برکت نیز ان کے صدق نیت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو دور کر دیا ہے۔

کہتے ہیں' بنو حارثہ کو''اے اہلِ مدینہ! یہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔'' کہنے والے اوس بن قیظی اور اس کے ساتھی تھے۔ کچھ نے اور نام بتایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس تیسرے قول کو حافظ عمر بن شبہ نمیری نے بھی ترجیح دی ہے چنانچہ ابو غسان کہتے ہیں:

''دورِ جاہلیت کے موقع پر مدینہ منورہ کی اس جانب' زبالہ نامی بازار تھا' جسے یثرب کہا جاتا تھا۔''

پھر (میں کہتا ہوں کہ) اس میں شک نہیں کہ یثرب کا لفظ''مدینہ'' پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کہ صحیح بخاری شریف

میں یہ ثابت ہے اور اس پر اتنے دلائل موجود ہیں کہ انہیں یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں' عنقریب دوسرے باب کی چوتھی فصل میں ایسا مضمون آ رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعمیر اور اس میں کسی کی رہائش سے پہلے ہی اس کا نام مدینہ رکھ دیا تھا' اب تین مختلف اقوال کی بناء پر یا تو یوں سمجھ لیں کہ مدینہ اسی ''مدینہ منورہ'' ہی کا نام ہے (بقول ابن عباس) یا یوں سمجھیں کہ اس کے کچھ حصے کا نام پورے خطے کو دیدیا گیا ہے (بقول ابو عبید) یا یوں سمجھ لیں کہ کل خطہ بول کر اس کا ایک حصہ ''مدینہ'' مراد لے لیا گیا ہے۔

مدینہ طیبہ کو ''یثرب'' کہنے کی ممانعت

ابن زبالہ اور ابن شبہ نے کہا ہے کہ مدینہ کو یثرب کہنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرما دیا ہوا ہے چنانچہ تاریخ بخاری میں ایک حدیث ملتی ہے کہ:

''جو مدینہ کو ایک بار ''یثرب'' کہہ دے' اس پر لازم ہے کہ مدینہ مدینہ دس مرتبہ کہے۔'' (تاکہ یثرب کہنے کی تلافی ہو سکے)۔

حضرت امام احمد اور ابو یعلیٰ نے بھی ایک حدیث لکھی ہے کہ:

''جو شخص مدینہ کو یثرب کہہ بیٹھے' اس پر لازم ہے کہ اللہ سے معافی مانگے کیونکہ اس کا نام تو ''طابہ'' رکھ دیا گیا ہے۔''

اس روایت کے سب راوی بڑے مضبوط ہیں۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''تین مرتبہ اللہ سے معافی مانگے۔''

چنانچہ اسی بناء پر حضرت عیسیٰ بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے۔'' جو مدینہ کو یثرب کہہ دے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک غلطی لکھ دی جاتی ہے۔''

کچھ علماء نے لکھا ہے کہ اسے یثرب کہنا نہایت بری بات ہے۔

رہی یہ بات کہ اسے قرآنِ کریم میں یثرب کہا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تو منافقین کا قول دہرایا گیا ہے۔

یثرب کہنے سے ممانعت کیوں؟

اس میں کراہت یا تو اس بناء پر ہے کہ یثرب کا لفظ ''ثَرَبٌ'' سے نکلا ہے جس کا معنیٰ فساد ہوتا ہے یا اس لئے کہ تثریب سے لیا گیا ہے یعنی گناہ پر پکڑ کرنا تو یہ ایک ناپسندیدہ کام ہے یا پھر اس لئے کہ یہ نام ایک کافر شخص یثرب کے نام پر رکھا گیا ہے۔

پھر اس کراہت کے بارے میں بھی جھگڑا ہے کیونکہ حدیث ہجرت میں صحیحین کے اندر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد

ملتا ہے کہ ''میرا خیال تو یمامہ اور ہجر مقامات کی طرف گیا تھا لیکن دیکھا تو وہ شہر یثرب تھا۔'' پھر مسلم شریف میں ہے:

''میں کھجوروں والی زمین کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ یثرب تھا۔''

اس کے علاوہ دیگر احادیث میں بھی یہی کچھ ملتا ہے۔اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ نام نبی کریم ﷺ سے پہلے موجود تھا۔

اَرْضُ اللّٰه

دوسرا نام ''ارض اللہ'' ہے چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے:

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا٥ (سورۂ نسا:۹۷)

''کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔''

حضرت مقاتل اور ثعلبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس ارض اللہ سے مراد مدینہ منورہ ہے اس زمین کے اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں بہت عظمت پائی جاتی ہے جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اَرْضُ الْهِجْرَة

تیسرا نام ''ارض الہجرت'' ہے جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ''مدینہ اسلام کا مرکز ہے۔''(جو ہجرت کرنے پر بنا تھا)

اَكَّالَةُ الْبُلْدَان

چوتھا نام ''اکالۃ البلدان'' (شہروں پر غالب) ہے کیونکہ یہ تمام شہروں پر غالب تھا' اردگرد کے تمام شہروں سے بلند تھا' یہاں کے لوگوں نے فتوحات حاصل کیں' مالِ غنیمت حاصل کئے اور خوب کھایا۔

اَكَّالَةُ الْقُرٰى

پانچواں نام ''اکالۃ القریٰ'' ہے' صحیحین میں حدیث ملتی ہے:'' مجھے اس بستی کی طرف چلے جانے کا حکم ملا جو سب بستیوں کو کھا جانے والی ہے۔''

یہ نام ماننے والوں کو اس حدیث پاک سے پتہ چل رہا ہے کہ مدینہ کا یہ نام پہلے ہی سے پڑ چکا تھا اور یہ نام غلبہ کے لحاظ سے ہے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ شہر اور بستی میں واضح فرق ہوتا ہے۔(کہ گاؤں اور بستی ہوتے ہوئے بھی غالب آ گئی)۔

اِيْمَان

چھٹا نام ''ایمان'' ہے' اللہ تعالیٰ نے انصارِ مدینہ کو سراہتے ہوئے فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ○

"اور جنہوں نے پہلے سے اس شہر اور ایمان میں گھر بنا لیا' دوست رکھتے ہیں' انہیں جو ان کی طرف ہجرت کر کے گئے۔"

حضرت ابن زبالہ کی سند کے مطابق حضرت عثمان بن عبد الرحمٰن اور حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما دونوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کا نام "دار" اور "ایمان" رکھا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں،" کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام "ایمان" رکھا کیونکہ ایمان یہیں سے پھیلا اور آخر کار یہیں آ جائے گا۔"

حضرت احمد دینوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "المجالسہ" میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ: "فرشتۂ ایمان نے کہا کہ میں مدینہ میں ٹھہروں گا' اس پر فرشتۂ حیاء نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

چنانچہ اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایمان اور حیاء حقیقۃً رسول اللہ ﷺ ہی کے شہر میں موجود ہیں اور پھر عنقریب ایک حدیث میں آ رہا ہے کہ:

"ایمان جلد ہی سمٹ کر مدینہ کی طرف آ جائے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ میں واپس چلا جاتا ہے۔"

اَلْبَارَّۃ اور اَلْبَرَّۃ

ساتواں نام "بارّہ" اور آٹھواں "برّہ" ہے۔ اسے یوں سمجھو جیسے تم یہ کہہ دو: اِمْرَءَۃٌ بَارَّۃٌ اور بَرَّۃٌ یعنی بہت نیکیاں کرنے والی عورت' وجہ یہ ہے کہ خصوصاً اس شہر والوں کو بہت نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور عموماً پوری دنیا کو بھی یہیں سے نیکیاں حاصل ہوتی ہیں کیونکہ الٰہی راز یہیں موجود ہیں' انوار یہیں چمکتے ہیں' خوشگوار زندگی یہیں کی ہے اور یہیں برکات نبویہ حاصل ہوتی ہیں۔

اَلْبُحْرَۃ اور اَلْبُحَیْرَۃ

نواں نام "البحرہ" اور دسواں "البحیرہ" ہے' دوسرا پہلے کی تصغیر ہے

اَلْبَحِیْرَۃ

اَلْبَحِیْرَۃ گیارہواں نام ہے۔ یہ تینوں نام "منتخب کراع" سے نقل کئے گئے ہیں جبکہ پہلے دو نام "معظم یا قوت" سے لئے گئے ہیں۔

بحر کا لفظ بولنا' فراخی اور کشادگی کا معنیٰ دیتا ہے اور یوں بھی کہا جاتا ہے کہ هٰذِهٖ بَحْرَتُنَا یعنی یہ ہماری زمین اور

ہمارا شہر ہے۔ مدینہ کے یہ نام اس لئے پڑے کہ وہ ایک وسیع جگہ پر آباد ہوا۔ صحیح حدیث میں ابنِ اُبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت سعد کا قول ملتا ہے' فرمایا:

''اس بحیرہ کے لوگوں نے مشورہ کیا کہ ابن ابی بن سلول کو تاج پہنا دیں۔''

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ ''مشارق'' میں فرماتے ہیں کہ ''بحرہ'' نبی کریم ﷺ کا شہر ہے' اسے بحرہ اور بُحَیْرَۃ کہتے ہیں' باء پر پیش پڑھیں تو اسمِ تصغیر ہے اور زبر پڑھیں تو تو اسمِ تصغیر نہیں بنتا' یہاں یہی مذکور ہے۔ یہ لفظ ''بحر'' بھی بولا جاتا ہے' یہ قرآن میں آیا ہے اور ہر بستی ہی بحرہ ہوتی ہے۔''

اَلْبَلَاط

بارھواں نام اَلْبَلَاط ہے' یہ ابن خالویہ کی کتاب سے لیا گیا ہے' لغت میں اس کا معنیٰ وہ کنکر ہیں جو اس زمین پر بچھائے جاتے ہیں جو ہموار ہو اور چٹیل ہو' مدینہ کا یہ نام اس لئے ہے کہ کنکر وہاں بہت ہوتے ہیں یا اس لئے کہ اس میں ایسے مقامات ہیں جہاں کنکر پائے جاتے ہیں جیسے' چوتھے باب میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔

اَلْبَلَد

تیرھواں نام ''البلد'' ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (سورۂ بلد:۱)

''مجھے اس شہر کی قسم۔''

حضرت واسطی رحمہ اللہ نے حضرت عیاض سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یعنی آپ کے لئے اللہ تعالیٰ قسم یاد فرماتا ہے' زندگی میں تو اس لئے کہ آپ کو اس نے اس مدینہ میں مرتبہ دے رکھا تھا اور وصال پر اس لئے کہ اسے آپ کی وجہ سے برکت حاصل ہو گئی ہے۔''

کچھ علماء کہتے ہیں کہ ''بلد'' سے مراد مکہ ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں اور جن علماء نے اسے مکہ کے ناموں میں شمار کیا ہے' ان کے پاس آپ ہی کا قول دلیل ہے اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اسی معنیٰ کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ بلد' قریہ سے بڑا وسیع ہوتا ہے۔

بَيْتُ الرَّسُوْل

چودھواں نام ''بیت الرسول'' ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۝ (سورۂ انفال:۵)

''جس طرح اے محبوب تمہیں تمہارے ربّ نے تمہارے گھر سے حق کے ساتھ برآمد کیا۔''

مفسرین کرام کہتے ہیں بیعلک سے مراد مدینہ منورہ ہے کیونکہ وہ آپ کی جائے ہجرت ہے' آپ کا مستقل ٹھکانہ ہے' اسے حضور ﷺ کے ساتھ وہی خصوصیت حاصل ہے جو ایک گھر کو اپنے اندر ٹھہرنے والے سے ہوتی ہے یا یہ مطلب ہے کہ آپ کا وہاں گھر ہے۔

تندد

پندرھواں نام تندد ہے۔

تندر

سولہواں نام تندر ہے۔ان دونوں ناموں کی دلیل یندد اور یندر ناموں میں آرہی ہے' حضرت مجد رحمہ اللہ نے یندر کے علاوہ باقی شمار نہیں کئے۔

اَلْجَابِرَہ

سترھواں نام ''الجابرۃ'' ہے کیونکہ یہ نام اس حدیث میں شمار ہوا ہے کہ ''مدینہ کے دس نام ہیں۔'' یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ مدینہ شکستہ دلوں کا سہارا ہے' محتاجوں کو غنی کرتا ہے' یہ انسان کو اپنی برکتیں دیکھنے پر مجبور کرتا ہے نیز اپنی نشانیاں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور شہروں والوں کو اسلام پر مجبور کر دیتا ہے۔

جَبَّار

اٹھارھواں نام ''جبار'' ہے جیسے حَذَام ہوتا ہے۔گذشتہ حدیث میں ابن شبہ نے اسے ''جابرۃ'' کی جگہ روایت کیا ہے۔

الجبارہ

انیسواں نام ''جبارہ'' ہے' اسے کتاب اخبار النواحی والوں نے تورات میں سے مجبورہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جَزِيرَةُ الْعَرَب

بیسواں نام ''جزیرۃ العرب'' ہے۔حضرت ابن زبالہ فرماتے ہیں' ابن شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جزیرۃ العرب' مدینہ طیبہ ہے' آگے جا کر اس حدیث میں اس کا ذکر آ رہا ہے' بتاتے ہیں' میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مدینہ سے نکلا تو آپ نے ادھر نظر اُٹھا کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ (مدینہ) کو شرک سے بچا رکھا ہے۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ کو شرک سے بچا رکھا ہے۔

حضرت ہروی' حضرت مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس حدیث سے مراد خاص طور پر

مدینہ منورہ ہے: ''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔'' اور حضرت مالک سے صحیح طور پر یہی ثابت ہے کہ جزیرہ سے مراد ملک حجاز ہے جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔

اَلْجُنَّةُ الْحَصِيْنَة

اکیسواں نام ''الجنۃ الحصینہ'' ہے' جیم پر پیش ہے' اس کا معنی بچانا ہوتا ہے۔

یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی نے غزوۂ اُحد پر حضورﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ اَنَـا فِـىْ جُنَّةٍ حَصِيْنَةٍ ''میں مضبوط حفاظت میں ہوں' مشرکین سے کہہ دو کہ آئیں' ہم ان سے جنگ کے لئے تیار ہیں۔'' اس سے آپ کی مراد مدینہ تھی۔

حضرت احمد نے صحیح راویوں کی روایت پر ایک حدیث بتائی کہ: ''میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مضبوط زرہ میں ہوں اور دیکھا کہ گائے ذبح کی جا رہی ہے۔'' چنانچہ میں نے مضبوط زرہ کی تعبیر مدینہ سے کی (کہ اس سے مراد مدینہ ہے) سیرت کی کتابوں میں یہی معنی بتایا گیا ہے۔

اَلْحَبِيْبَة

بائیسواں نام ''حبیبہ'' ہے کیونکہ حضورﷺ کو اس سے محبت تھی' آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔ ''الٰہی مدینہ سے ہمارا پیار ایسا کر دے جیسا مکہ سے ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دے۔'' اس سے زیادہ وضاحت ''محبوبہ'' نام میں آ رہی ہے۔

اَلْحَرَم

تیئیسواں نام ''حرم'' ہے یعنی عزت والا کے معنی میں ہے کیونکہ اللہ نے اسے عزت دی ہے' مسلم شریف کی حدیث میں ہے: ''مدینہ حرم ہے''، ایک اور روایت میں ہے کہ ''یہ امن والا حرم ہے۔''

حَرَمُ رَسُوْلِ اللّٰهِ

چوبیسواں نام ''حرم رسول اللہ'' ہے کیونکہ آپ ہی نے اسے عزت بخشی تھی۔ حدیثِ پاک میں ہے:

''جس نے میرے اہلِ حرم کو خوفزدہ کیا' اللہ اسے خوف زدہ فرمائے گا۔'' حضرت ابن زبالہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مذکور ہے کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حرم مکہ اور میرا حرم مدینہ ہے۔''

حَسَنَة

پچیسواں نام ''حَسَنَہ'' ہے' یہ لفظ سَيِّئَه (بری چیز) کے مقابلے میں بولا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ (سورۂ نحل: ۴۱)

"ضرور ہم انہیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے اچھا ٹھکانا دیں گے اور وہ مدینہ ہے اور کچھ حضرات کہتے ہیں کہ حَسَنَہ مدینہ منورہ کا نام ہے کیونکہ یہ ظاہری اور باطنی طور پر (ظاہری و باطنی طور پر) بہتر ہی بہتر ہے۔

اَلْخَیِّرَة

چھبیسواں نام "الخیرہ" ہے یاء پر شدّ ہے جیسے "سَیِّرَہ" ہے۔

اَلْخَیْرَة

ستائیسواں نام اَلْخَیْرَہ ہے یہ پہلے لفظ ہی کی طرح ہے البتہ یاء پر شد نہیں ہے جیسے تم لوگ کہا کرتے ہو رَجُلٌ خَیِّرٌ وَ خَیْرٌ یعنی آدمی بھلا ہے اور کہتے ہو اِمْرَأَۃٌ خَیِّرَۃٌ وَ خَیْرَۃٌ عورت بھلی ہے شدّ اور بغیر شدّ کے یہ الفاظ بولا کرتے ہو اس کا معنیٰ ہوگا بہت بھلائی والا اور اگر اس معنیٰ میں زیادتی بتانا ہو تو تمہیں کہنا ہوگا فُلَانٌ خَیْرُ النَّاسِ یعنی فلاں شخص سب لوگوں سے بھلا ہے۔ مدینہ منورہ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ وَ الْمَدِیْنَۃُ خَیْرٌ لَّھُمْ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ یعنی کاش انہیں پتہ چل سکے مدینہ تو ان کے لئے بہت ہی بہتر ہے اور پھر آگے یہ حدیث بھی آ رہی ہے کہ "مدینہ مکہ سے بہت بہتر ہے۔"

اَلدَّار

اٹھائیسواں نام "الدار" ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ ○ (سورۂ حشر:۹)

"اور جنہوں نے پہلے سے اس شہر اور ایمان میں گھر بنا لیا۔"

جیسے مدینہ منورہ کے نام "ایمان" میں بیان ہو چکا ہے یہ نام اس لئے پڑا کہ اس میں امن پایا جاتا ہے یہاں قرار آ جاتا ہے اور اس میں مکانات اور صحن وغیرہ سب کچھ ہے۔

دَارُ الْاَبْرَار

انتیسواں نام "دار الابرار" ہے۔ (یعنی نیک لوگوں کا گھر)۔

دَارُ الْاَخْیَار

تیسواں نام "دَارُ الْاَخْیَــــار" ہے کیونکہ یہ حضرت محمد مصطفیٰ و مختار ﷺ، مہاجرین اور انصار کا گھر ہے اور یوں بھی اس کا نام ہے کہ یہ یہاں سے شریر لوگوں کو نکال دیتا ہے اور اگر اگر کوئی شریر یہاں رہائش رکھتا ہے تو حقیقۃً یہ اس کا

ٹھکانہ نہیں ہوتا اور حدیث کی رُو سے بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ دفن کے ساتھ ہی اسے یہاں سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔

دَارُ الْإِیْمَان

اکتیسواں نام "دار الایمان" ہے جیسے اس حدیث پاک میں ہے کہ اَلْمَدِیْنَۃُ قُبَّۃُ الْاِسْلَامِ وَ دَارُالْاِیْمَانِ کہ مدینہ طیبہ مرکز اسلام اور ایمان کا گھر ہے کیونکہ ایمان یہیں سے شروع ہو کر ہر طرف پھیلا ہے' پھر عنقریب یہ حدیث آ رہی ہے کہ "ایمان مدینہ کی طرف یونہی سمٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ میں سمٹ جاتا ہے۔

دَارُ السُّنَّۃ اور ایسے دیگر نام

بتیسواں نام دارُ السُّنَّہ ہے (سنتِ رسول کا گھر)۔

دَارُ السَّلَامَۃ

تینتیسواں نام دَارُ السَّلَامَۃ (سلامتی کا گھر)۔

دَارُ الْفَتْح

چونتیسواں نام دَارُ الْفَتْح (فتح ملنے کا مرکز)۔

دَارُ الْھِجْرَۃ

پینتیسواں نام دَارُ الْھِجْرَۃ (ہجرت کا مقام)۔

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں قول ملتا ہے۔ "تم کو مدینہ پہنچنا ہو گا کیونکہ یہ دار الہجرۃ اور دار السنہ ہے۔" اس میں کشمیہنی کی طرف سے اضافہ ہے کہ "دار السلامہ" ہے چنانچہ اسی مقام سے مکہ اور دیگر تمام شہر فتح ہوئے' انصار بہت تعداد میں یہاں موجود تھے' یہی وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ اور صالح مہاجرین ہجرت کر کے پہنچے تھے اور یہیں سے ہر طرف سنتِ مصطفےٰ ﷺ پھیلی تھی۔

ذَاتُ الْحُجَر

چھتیسواں نام "ذات الحجر" ہے کیونکہ یہاں حجرے وغیرہ تعمیر کئے گئے تھے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار مدینہ کی مدح میں فرمایا تھا: "ہماری اور ان انصار قبیلہ کی مثال نہیں ملتی البتہ طفیل غنوی نے کہا تھا:" وہ ہمیں ملال میں ڈالنے سے انکاری ہیں اور اگر ہماری ماں ان سے ملے جو ہم سے مل جاتے ہیں تو ملال میں آ جائے گی' وہ ہمارے نفسوں میں رچ بس گئے ہیں اور حجروں میں داخل ہو گئے ہیں جو خیموں کی طرح سائیہ دار ہیں۔"

ذَاتُ الْحِرَار

سینتیسواں نام ''ذات الحرار'' ہے کیونکہ مدینہ کے علاقے میں پتھریلے مقامات بہت پائے جاتے ہیں چنانچہ خنافر بن تو اُم حمیری کاہن کے قصہ میں جب جن کے دین اسلام کا بتایا تو خنافر نے کہا تھا یہ دین میں کہاں تلاش کروں؟ تو اس نے کہا کہ ''ذات الاحرین سے اور واہنی طرف کے گروہ سے جہاں پانی اور مٹی موجود ہے' میں نے کہا کہ اس کی وضاحت کر دو تو اس نے کہا: یثرب چلے جاؤ جو کھجوروں اور پتھروں والی جگہ ہے۔ اسمعی کہتے ہیں کہ احرون اور حرار اسی لفظ حرۃ کی جمع ہیں۔

ذَاتُ النَّخْل

اڑتیسواں نام ''ذات النخل'' ہے' اس نام کو اور ذات الحجر کو شاعروں نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے' میں نے بھی انہی کے مطلع پر یہ اشعار کہے ہیں:

'' میرے دل کی خواہشات بھی ذات النخل اور ذات الحجرات سے وابستہ ہیں دل دو شہروں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے چنانچہ شوق کے شعلوں کی وجہ سے آگ میں بھی جدا نہیں ہو سکا۔''

ہجرت کے بارے احادیث میں ہے: ''مجھے میری ہجرت کا مقام دکھایا گیا جہاں کھجور کے درخت تھے اور پتھریلی جگہ'' پھر عمران بن عامر کاہن اپنی قوم کے شہروں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے: ''جو یہ ارادہ رکھتا ہے کہ کیچڑ میں دھنسے مکانات دیکھے اور بے آباد جگہ دیکھے تو اسے حرہ میں جانا چاہئے جہاں کھجور کے درخت ہیں۔''

اَلسَّلَقَة

انتالیسواں نام ''السلقہ'' ہے' اسے ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن امین اِقشری نے ان ناموں میں ذکر کیا ہے جو انہوں نے توریت سے لئے ہیں' ہم نے اسے پوری طرح سنبھالا نہیں' یہ احتمال ہے کہ اس کے لام پر زبر اور زیر ہو البتہ لفظ سَلَقٌ دو زبر سے تو اس کا معنی پہاڑوں کے درمیان ایسی برابر زمین ہوتا ہے جو بنجر ہو۔ اسی میں سے سَلَقْتُ الْبِيْضَ بولا جاتا ہے یعنی میں نے انڈے اُبالے پھر مِسلاق اس خطیب کو کہتے ہیں جو فصیح و بلیغ ہو نیز زبان دراز عورت کو بھی بسا اوقات سَلِقہ (لام کو زیر دے کر) کہا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ کو سلقہ کہنے کی وجہ یا تو اس کی فراخی اور پہاڑوں سے دوری ہے' یا اس میں آنے والی مشقتوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے یا شدت گرمی کی وجہ سے کہا جاتا ہے یا یہاں موجود بخار کی وجہ سے کہتے تھے یا اس بناء پر یہ نام رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کے رہنے والوں کو تمام دیگر شہروں پر غالب کر رکھا ہے چنانچہ انہیں فتح کرتے چلے گئے۔

سَيِّدَةُ الْبُلْدَان

چالیسواں نام ''سیدۃ البلدان'' ہے' اسے ابونعیم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعًا ذکر کیا ہے' فرماتے ہیں۔ يَاطَيْبَةَ يَا سَيِّدَةَ الْبُلْدَانِ۔

اَلشَّافِيَة

اکتالیسواں نام ''الشافیہ'' ہے کیونکہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ''یہاں کی مٹی میں ہر بیماری سے شفاء رکھ دی گئی ہے۔'' اور پھر کوڑھ اور پھلبھری تک امراض کا ذکر کیا' بخدا ہم نے بہت لوگوں کو اس کی مٹی کی وجہ سے کوڑھ سے شفایاب ہوتے دیکھا ہے اور شدید بخار میں اس کی مٹی شفاء کا کام دیتی ہے اور یہ بات مشہور ہے جیسے کہ آگے آ رہا ہے۔شافیہ اسے یوں بھی کہتے ہیں کہ اس کی کھجور سے بھی شفاء ہو جاتی ہے۔ابن مسدی نے لکھا ہے کہ مدینہ طیبہ کے نام مبارک لکھ کر بخار والے کے گلے میں لٹکانے سے بھی شفاء ہوتی ہے' آگے آ رہا ہے کہ مدینہ طیبہ گناہوں کو دور کر دیتا ہے تو پھر یہ بیماریاں کیونکر دور نہ کرے گا۔

طَابَة اور طَيْبَة

بیالیسواں نام ''طابہ'' ہے۔

طَيْبَه

تینتالیسواں نام ''طیبہ'' ہے۔

طَيِّبَه

چوالیسواں نام ''طیّبہ'' ہے' یاء پر شدّ ہے۔

طَائِب

پینتالیسواں نام ''طائِب'' ہے جیسے کَاتِب کا وزن ہے۔یہ چاروں الفاظ ایک اور نام مُطَيَّبَة سمیت لفظًا و معنًا ایک جیسے ہیں' صیغے اور مصدر کا فرق ہے پھر صحیح حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طَابَہ رکھا ہے' ایک اور روایت میں آتا ہے' مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مدینہ کا نام طابۃ رکھ دوں۔

ابن شبہ وغیرہ کہتے ہیں کہ لوگ اسے یثرب کہا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام طیبہ رکھ دیا۔حدیث پاک میں یہ بھی ہے کہ ''مدینہ کے دس نام ہیں' یہ مدینہ ہے' طیبہ ہے اور طابہ ہے۔'' صاحبِ نواحی نے طیبہ کی جگہ طابہ کا لفظ بولا ہے۔حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں، بخدا تورات میں اس کے نام طیبۃ اور طابہ آئے ہیں اور پھر

مطیبۃ نام بھی تورات ہی سے لیا گیا ہے' یونہی طابۃ اور طیبۃ بھی لیا گیا ہے۔مدینہ کے یہ نام یا تو طیب کے لفظ سے ملتے ہیں جس کا معنیٰ پاکیزہ ہوتا ہے یعنی شرک جیسی پلیدی سے پاک کرتا ہے' یا پھر اس لفظ سے ملتا ہے بِرِیحٍ طَیِّبَۃٍ یا اس لئے کہ اس میں حضورِ انور ﷺ کا خوشبودار جسم انور رکھا ہوا ہے یا اس لئے کہ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جو گندگی نکال باہر کرتا ہے اور پاک صاف کر دیتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ طِیْب (یاء پر جزم) سے لیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر امر پاکیزہ ہے اور اس کی ہوا پاکیزہ ہے' خوشبو لئے ہوئے ہے چنانچہ ابنِ مطال لکھتے ہیں کہ جو بھی اس میں رہائش رکھتا ہے' وہ اس کی مٹی اور دیواروں سے خاص قسم کی خوشبو دار ہوا محسوس کرتا ہے۔

حضرتِ اشبیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔''مدینہ پاک کی مٹی میں خاص خوشبو ہے' وہ ایسی نہیں جیسے اور خوشبوئیں ہوتی ہیں' یہ تو عجیب سے بھی عجیب ترین خوشبو ہوتی ہے۔

حضرت یاقوت حموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں' مدینہ طیبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہوا میں ایک خوشبو ہے' اس کی بارش سے ایسی خوشبو آتی ہے جو دنیا بھر کی کسی اور شے میں موجود نہیں ہے حضرت عبد اللہ عطار رحمہ اللہ نے کیا خوب لکھا ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے وہاں کی ہوا میں خوشبو موجود ہے' اس کے سامنے کستوری' کافور اور تازہ عُود کی خوشبو کیا حیثیت رکھتی ہے؟''

طِبَاب

چھیالیسواں نام ''ظباب'' ہے' اسے یاقوت حموی نے لکھا ہے لیکن حرکات نہیں بتائیں چنانچہ یا تو ظاء پر زیر ہے یا زبر ہے' پہلی صورت میں اس کا معنیٰ ہے زمین کا ایک مستطیل ٹکڑا اور دوسری صورت میں یہ لفظ ظَبَب و ظَبِظَب سے لیا گیا ہے۔یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا جسم گرم ہو جائے اور ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب بھی اس میں کوئی داخل ہوتا ' جسم گرم ہو جاتا (بخار ہو جاتا)' یہ بات حضرت مجد نے لکھی ہے۔

اَلْعَاصِمَہ

سینتالیسواں نام ''العاصمہ'' ہے۔یہ نام اس وجہ سے ہے کہ مدینہ نے مہاجرین کو تحفظ دیا تھا اور انہیں مشرکین کی تکالیف سے بچایا تھا اور پہلے بھی ایسا نام گذر چکا ہے الجُنّۃ الحصینہ پھر یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا معنیٰ ''معصومہ'' والا ہو کیونکہ قدیم دور میں اس نے حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد علیہما السلام کے لشکروں سے یہاں کے جابر لوگوں کو اس وقت پناہ دی تھی جب وہ یہاں آئے تھے' پھر بعد میں اس نے رحمتِ عالم ﷺ کو پناہ دی اور پھر امن والا حرم بن گیا' اس میں دجال داخل نہ ہو سکے گا اور نہ طاعون ہی کی وباء آ سکے گی اور جو اس کے بارے میں برا ارادہ کرے گا' اسے

برباد کردے گا۔

اَلْعَذْرَاء

اڑتالیسواں نام "العذراء" ہے پہلے حرف پر نقطہ نہیں دوسرا نقطہ والا ہے یہ نام بھی تورات سے لیا گیا ہے۔ یہ نام اس لئے ہے کہ قدیم زمانہ میں کوئی جابر شخص بھی اسے زیر نہیں کر سکا اور آخر کار اس کے حقیقی مالک سرور عالم ﷺ کا دور آ پہنچا یہ شہر مشکلات والا تھا کوئی یہاں [illegible] نہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کنواری لڑکی کو بھی "عذراء" کہتے ہیں (کیونکہ وہ شوہر سے محفوظ ہوتی ہے)۔

اَلْعَرَّاء

انچاسواں نام "العراء" ہے اس کا معنیٰ بھی عذراء والا ہے لغت والے کنواری لڑکی کو عرّاء کہتے ہیں کیونکہ وہ اس اونٹنی کی طرح ہوتی ہے جس کی کوہان یا تو ابھی ابھری ہی نہیں ہوتی یا پھر چھوٹی ہوتی ہے یونہی کنواری لڑکی کے پستان بھی یا تو چھوٹے ہوتے ہیں یا پھر ہوتے ہی نہیں چنانچہ مدینہ طیبہ کا یہ نام اسی وجہ سے پڑا کہ اس میں بھی عمارتیں آسمان کو چھونے والی نہیں بنیں۔ (بدقسمتی سے موجود سعودی حکومت اس بات کو پیش نظر نہیں رکھ سکی علماءِ عالم کو اس طرف توجہ دینی چاہئے کیونکہ حکمرانوں کے حق میں یہ اچھا شگون نہ ہوگا ۱۲ چشتی)۔

اَلْعَرُوْض

پچاسواں نام "العروض" ہے جیسے لفظ "صبُور" ہوتا ہے کہتے ہیں یہ مدینہ اور اس کے اردگرد کا نام ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں باقی جگہیں نیچی ہیں اور اس میں کئی وادیاں ہیں۔ خلیل کہتے ہیں کہ عَروض پہاڑ کی چوڑائی میں راستہ ہوتا ہے جب کوئی مدینہ میں آتا ہے تو یہ اس کی آبرو بنتا ہے کیونکہ یہ نجد میں واقع ہے اور پورا نجد زمین کے طویل خطِ مستقیم پر واقع ہے اور مدینہ ایک جانب پر واقع ہے اور نجد ہی میں موجود ہے۔ (نجد اونچا اور بلند علاقہ)۔

اَلْغَرَّاء

نام نمبر ۵۱ "الغرّاء" ہے یہ لفظ "اَغَــرّ" سے مؤنث کا صیغہ ہے یہ لفظ سفید پیشانی والے گھوڑے کے لئے بولا جاتا ہے پھر "غُرّہ" ہر شے کا بہتر حصہ ہوتا ہے انسان کا غرہ اس کا چہرہ ہوتا ہے اَغَرّ ہر شے کا سفید حصہ ہوتا ہے اسے بھی اَغَر کہتے ہیں جس کے چہرے کا کچھ حصہ چھوڑ کر باقی سارے پر داڑھی اُگ آئے دنوں میں گرم ترین دن کو کہتے ہیں نیک بندے کو بھی کہتے ہیں پھر "غراء" خوشبودار ایک بوٹی ہوتی ہے پورے قبیلے میں بڑی عورت کو بھی کہتے ہیں چنانچہ مدینہ کو غرّاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ہر نشان عظمت والا ہے اس کی بزرگی مسلم ہے اسے شہرت حاصل ہے اس کا نور ہر ایک کو منور کر رہا ہے اس میں سفید پتھر ہے آب و ہوا خوشبودار ہے کھجوریں بہت ہیں یہ تمام بستیوں سے عظیم ہے اس

میں رہنے والے نیک ہیں اور ان کا مرتبہ بلند ہے۔

غَلَبَة

نام نمبر۵۲ ''غلبہ'' ہے جس کا معنیٰ غالب ہونا ہے کیونکہ یہ تمام شہروں میں غالب رہا ہے' یہ دورِ جاہلیت کا نام ہے۔ابنِ زبالہ بتاتے ہیں کہ مجھے داؤد بن مسکین انصاری نے اپنے بزرگوں سے سن کر بتایا' وہ کہتے تھے کہ دورِ جاہلیت میں یثرب کو ''غلبہ'' کہتے تھے' یہودی لوگ قومِ عمالقہ پر حملہ آور ہوئے تو غالب ہوئے' پھر اوس اور خزرج یہودیوں پر حملہ آور ہوئے تو غالب ہوئے' عجمی لوگ مہاجرین پر چڑھ آئے تو غالب ہوئے۔ابنِ زبالہ کے جس نسخے کو میں نے دیکھا ہے' اس میں یونہی لکھا ہے پھر اس کتاب کے راوی ''مجد'' نے حضرت زبیر بن بکار سے نقل کیا تو بتایا کہ مہاجرین' اوس و خزرج پر چڑھ آئے تو انہیں غلبہ حاصل ہوا۔

اَلْفَاضِحَة

نام نمبر۵۳ ''فاضحہ'' ہے' اسے کسی نے کراع سے نقل کیا ہے' یہ لفظ کیوں استعمال ہوا؟ یہ آگے اس مقام پر آ رہا ہے جہاں یہ بتایا جائے گا کہ مدینہ گندگی دور کر دیتا ہے بایں معنیٰ کہ یہ تمیز پیدا کر دیتا ہے اور وہاں کے رہنے والے کو نمایاں کر دیتا ہے' یہاں کوئی شخص اپنا گندہ عقیدہ چھپا نہیں سکتا' نہ ہی کوئی اور شے چھپا سکتا ہے' مدینہ سب کچھ ظاہر کر دیتا ہے اور ایسے شخص کو رسوا کر دیتا ہے جبکہ یہ خاصیت کسی اور شہر میں نہیں ہے' ہم نے پوری طرح اس کا مشاہدہ کیا ہے اور بہت دفعہ کیا ہے۔

اَلْقَاصِمَة

نام نمبر۵۴ ''القاصمہ'' ہے' یہ بھی تورات سے لیا گیا ہے' یہ نام اس لئے پڑا کہ جس جابر نے بھی مدینہ کے خلاف برا ارادہ کیا' اس نے اسے چُور کر کے رکھ دیا' جو بھی سرکش یہاں آیا' اسے برباد کیا اور جس نے بھی اس کے خلاف ارادۂ بد کیا' اسے اللہ نے ذلیل کر دیا۔

قُبَّةُ الاسلام

نام نمبر۵۵ ''قبۃ الاسلام'' ہے کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''مدینہ مرکزِ اسلام ہے۔''

قَرْيَةُ الْاَنْصَار

نام نمبر۵۶ ''قریۃ الاسلام'' ہے۔ابنِ سیدہ کہتے ہیں کہ قریہ (قاف پر زبر اور زیر) بڑے شہر کو کہتے ہیں' یہ لفظ قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ سے لیا گیا ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب حوض میں پانی جمع ہو جائے (یعنی میں نے

حوض میں پانی جمع کیا)۔ ابو ھلال عسکری ہر چھوٹے اور بڑے شہر کو قریہ کہہ دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں، عنقریب لفظِ مدینہ کے معنٰے میں آگے آ رہا ہے کہ مدینہ قریہ سے کچھ زیادتی والا ہوتا ہے جبکہ یہ ''مصر'' سے چھوٹا ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔

لفظِ انصار کا واحد ناصر ہے، ان لوگوں کو انصار اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی، انہیں اپنے پاس ٹھہرایا اور مہاجرین کو جگہ دی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سراہتے ہوئے فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ اٰوَوا وَّ نَصَرُوْا۝

''اور وہ جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام انصار رکھ دیا جبکہ اس سے قبل انہیں اوس وخزرج کہا جاتا تھا۔ حدیث پاک میں غیلان بن جریر سے ہے وہ کہتے ہیں، میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا: ''انصار کے لفظ کے بارے میں تو بتاؤ، یہ نام تم نے خود رکھ لیا تھا یا اللہ نے تمہارا یہ نام رکھا تھا؟ انہوں نے کہا، یہ نام تو اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا۔''

آگے ایک حدیث میں آ رہا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو شرک سے پاک رکھا ہے۔'' آپ (کتاب کے قاری چاہیں تو اسے یہ ایک اور نام شمار کر سکتے ہیں۔

قَرْیَةُ رَسُوْلِ اللّٰه

نام نمبر ۵۷ ''قریۃ رسول اللہ'' ہے کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ اللہ اسے دجال سے بچائے گا۔'' حدیث میں ہے: ''دجال چلتا ہوا مدینہ کے قریب پہنچے گا، اسے یہاں آنے کی اجازت نہ ہو گی لہٰذا وہ کہے گا، یہ اس شخص کا شہر ہے۔'' مطلب یہ کہ نبی کریم ﷺ کا شہر ہے۔

قَلْبُ الْاِیْمَان

نام نمبر ۵۸ ''قلب الایمان'' ہے، اسے ابن جوزی نے ''الوفاء'' کے اندر اس حدیث کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ ''مدینہ اسلام کا قبہ یعنی مرکز ہے۔''

اَلْمُؤْمِنَة

نام نمبر ۶۰ ''المؤمنہ'' ہے۔ اسے مؤمنہ کہنے کی دو وجوہ ہیں، یا تو اس لئے مؤمنہ کہا جاتا ہے کہ عقل والوں کی طرح اس نے بھی حقیقۃً اللہ کی تصدیق کر رکھی ہے، یہ بات بعید از قیاس بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ جمادات میں ایسی قوت رکھ دے جس کی بناء پر وہ سچا اور جھوٹا کہنے کے قابل ہوں چنانچہ حضور ﷺ کی ہتھیلی میں پکڑی کنکریوں سے تسبیح سنی گئی تھی، یا پھر اہل حجاز اسے اس لئے مؤمنہ کہتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگوں نے حضور ﷺ کی تصدیق کی تھی، یہیں سے ایمان پھیلا

اور پھر مدینہ میں مؤمن کے صفات پائے جاتے ہیں' یہ نفع و برکت دیتا ہے' نقصان نہیں کرتا اور مسکین نہیں بناتا' یا اس بناء پر اسے مومنہ کہتے ہیں کہ یہ اپنے اندر رہنے والوں کو دشمنوں محفوظ رکھتا ہے' دجال سے بچائے گا اور طاعون سے حفاظت کرتا رہے گا۔ پھر ابن زبالہ نے حلفیہ کہا کہ اس کی مٹی ایمان لانے والی ہے' یہ بھی کہا کہ یہ نام تورات میں لکھا ہوا ہے۔

اَلْمُبَارَکَہ

نام نمبر ۶۰ "المبارکہ" ہے کیونکہ اللہ تعالٰی نے رسول اللہ ﷺ کی دُعا کی برکت سے اسے سرفراز فرمایا ہے' حدیث پاک میں ہے۔ "الٰہی مکہ کے مقابلے میں مدینہ کو دوگنا برکت عطا فرما۔" ایسی اور بھی احادیث بہت ہیں اور ایسی دُعاؤں کی برکت صاف نظر آ رہی ہے۔

مُبَوَّأُ الْحَلَالِ وَ الْحَرَام

اکسٹھواں نام "مبوأ الحلال و الحرام" ہے۔ اسے طبرانی نے حدیث پاک "المدینہ قبۃ الاسلام" کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ تَبَوُّءْ کا مطلب ہوتا ہے برقرار ہونا اور مستقل ہو جانا' مدینہ پاک کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں باتیں یہاں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کے کچھ دوسرے نسخوں میں یہ لفظ مَثْـوٰی آیا ہے۔ پہلا تو میں نے حافظ ابوالفتح مراغی رحمہ اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے (مدینہ پاک ہی سے ساری دنیا کو حلال و حرام کا پتہ چلا ہے' حلال و حرام بتانے کا یہی ٹھکانہ تھا۔

مُبِیْنُ الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ

باسٹھواں نام "مبین الحلال و الحرام" ہے' اسے ابن جوزی اور سید ابو العباس قرافی رحمہما اللہ نے حدیث پاک "مدینہ مرکزِ اسلام" کے تحت لکھا ہے' یہاں "مبوّأ" کے بدلے میں لفظ "مبین" آیا ہے' یہ نام اس لئے پڑا کہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں سے لوگوں کو حلال و حرام بتانے کی ابتداء ہوئی تھی۔

اَلْمَحْبُوْرَۃ

تریسٹھواں نام "المجبورہ" ہے۔ ابنِ جوزی وغیرہ نے اسے حدیث (کہ مدینہ منورہ کے دس نام ہیں) کے تحت لکھا ہے اور پہلی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ مدینہ پاک کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اللہ تعالٰی نے حضور ﷺ (جو اس کے نبی اور نامور ہیں) کی وجہ سے اسے آپ کی زندگی سے بھرپور رکھا اور پھر وصال کے بعد آپ کا جسم انور اسی میں محفوظ فرمایا جبکہ قبل ازیں آپ نے اس سے بخار کو نکال باہر کیا تھا' اس کی جگہ تندرستی نے لے لی' آپ نے یہاں رہائش رکھنے کا شوق دلایا' یہاں کے پیمانوں مُدّ اور صاع میں برکتیں ہی برکتیں ہیں چنانچہ یہی وہ ہے جس کی وجہ سے مدینہ پاک خوش و خرم ہے اور ان عظیم نعمتوں سے مالا مال ہے' اس کا دامنِ فخر ہر مقام پر سایہ کئے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِبَّةُ

چونسٹھواں نام ''المحبہ'' ہے (محبت رکھنے والا) یہ نام بھی پہلی کتابوں سے لیا گیا ہے۔

اَلْمُحَبَّبَةُ

پینسٹھواں نام ''المحببہ'' ہے' اس میں پہلے نام کے مقابلہ میں ایک باء زیادہ ہے۔

اَلْمَحْبُوْبَةُ

چھیاسٹھواں نام ''المحبوبہ'' ہے' یہ بھی پہلی کتابوں سے لیا گیا ہے' یہ اور اس سے پہلے والے تین نام ''حبیبہ'' سمیت ایک ہی مادہ سے نکلے ہوئے ہیں (حُبّ سے)۔ یہ نام اس لئے پڑا کہ رسول اکرم ﷺ کو اس شہر سے محبت تھی اور آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی تھی پھر ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر اللہ کو سب شہروں سے محبوب ہے اور پھر اس بات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی حیات و وصال کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند فرما لیا چنانچہ یہ شہرِ انور اللہ' اس کے محبوب رسول اور سب مومنوں کا محبوب بن چکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو یاد کرنے سے دلوں کو سکون ملتا ہے اور اس کے رازوں کا مشاہدہ کرنے سے دل اس کے گرویدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اَلْمَحْبُوْرَةُ

ستاسٹھواں نام ''المحبورہ'' ہے' یہ حَبَر کے لفظ سے بنا ہے جس کا معنیٰ خوشی ہوتا ہے' یونہی حبر' حبور اور حبرہ ہے جیسے ''حبورہ'' میں بیان ہو چکا' یا یہ لفظ حبرۃ سے ہے جس کا معنیٰ نعمت ہوتا ہے' یہ حبرہ بھی بہت سی خوبیاں جمع ہونے کا معنیٰ دیتا ہے پھر محبار اس زمین کو کہتے ہیں جس میں جلدی سے نبات اُگے اور اس میں فائدے ہی فائدے ہوں۔

اَلْمُحَرَّمَةُ

اٹھاسٹھواں نام ''المحرمہ'' ہے (عزت والا) اس کی عزت و حرمت آگے آ رہی ہے۔

اَلْمَحْفُوْفَةُ

انسٹھواں نام ''المحفوفہ'' ہے (حفاظت میں لیا ہوا یا بھرپور) اسے محفوفہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ برکتوں سے بھرپور ہے' آسمانی فرشتوں سے بھرپور رہتا ہے' یہاں کسی سے خوف اور ڈر نہیں رہتا' فرشتے یہاں ہر راستے اور پہاڑی گھاٹیوں پر پہرہ دے رہے ہیں جو اسے طاعون اور دجال سے بچائے رکھیں گے' آگے حدیث آ رہی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ''مدینہ اور مکہ فرشتوں کی حفاظت میں ہیں' ان کے ہر راستے پر فرشتے موجود ہیں جو دجال اور طاعون کو کبھی یہاں داخل نہ ہونے دیں گے۔

اَلْمَحْفُوْظَة

سترواں نام "المحفوظہ" ہے۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دجال اور طاعون وغیرہ سے محفوظ کر رکھا ہے' ایک حدیث پاک میں ہے کہ "چار بستیاں محفوظ قرار دیدی گئی ہیں۔" اور اس میں مدینہ کا ذکر بھی موجود ہے پھر مفضل جندی کی روایت کردہ ایک اور حدیث جسے ہم نے فضائل مدینہ میں لکھا ہے' یہ ہے کہ: "مدینہ پر فرشتوں کی سخت حفاظت ہے' اس کے ہر راستے پر فرشتہ موجود ہے جو اس کی حفاظت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔آپ چاہیں تو مدینہ طیبہ کو "محروسہ" نام بھی دے سکتے ہیں۔

اَلْمُخْتَارَه

اکہترواں نام "المختارہ" ہے' یہ نام اس بناء پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حیات و وصالِ محبوب ﷺ کے لئے پسند فرما رکھا ہے۔

مُدْخَلُ صِدْقٍ

بہترواں نام "مدخل صدق" ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ○ (سورۂ اسرا:۸۰)

"اور یوں عرض کرو کہ اے میرے ربّ مجھے سچی طرح داخل کر۔" (مُدْخل صدق میں داخل کر)۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ "مدخل صدق" سے مراد مدینہ منورہ ہے اور مخرج صدق سے مراد مکہ مکرمہ ہے اور پھر اس آیت میں سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا سے مراد انصارِ مدینہ ہیں۔یہ روایت حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی ہے' اس کی تائید میں امام ترمذی نے اس آیت کا شانِ نزول بتاتے ہوئے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

اَلْمَدِیْنَه

تہترواں نام "المدینۃ" ہے۔

مَدِیْنَةُ الرَّسُوْل

چوہترواں نام "مدینۃ الرسول" ہے' لفظِ مدینہ یا تو مَدَنَ بِالْمَکَانِ سے لیا گیا ہے' یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی مکان میں ٹھہر جائے یا پھر یہ دَانَ کے لفظ سے نکلا ہے جس کا معنی اطاعت و فرمانبرداری کا ہے' اس لحاظ سے میم اس میں زائد ہے' مدینہ اس لئے کہتے ہیں کہ بادشاہ شہروں میں ٹھہرا کرتا ہے تو وہاں اس کی عزت کا بندوبست ہوتا ہے (یہ دونوں کام حضور ﷺ کے لئے ہوئے تھے) یا پھر (دَانَ کی بناء پر) اس لئے مدینہ کہتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی

اطاعت ہوتی ہے۔

مدینہ (لغوی طور پر) بہت سارے گھروں کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو آبادی اور عمارتوں کی کثرت کی بناء پر "قریہ" بڑھ کر ہوتا ہے لیکن "مصر" کی حد تک نہیں پہنچتا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر "مصر" کو مدینہ کہہ لیتے ہیں۔ لفظ مدینہ اگرچہ بہت سے مقامات پر بولا جاتا ہے لیکن یہ مدینۂ رسول اللہ ﷺ کا نام بن چکا ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور شہر کا علم اور نام نہیں بنایا گیا' اس کی حیثیت یہ ہو چکی ہے کہ جب بھی یہ بولا جاتا ہے تو مدینۂ رسول ہی مراد ہوتا ہے اور مدینہ پاک کے بارے میں یہ لفظ بطور معرفہ ہی بولتے ہیں۔

مدینہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اس میں رہائش رکھی' آپ اور آپ کی اُمت کے سامنے تمام اُمتیں اور گروہ ختم ہو گئے۔

لفظِ مدینہ نکرہ ہوتے ہوئے ہر شہر پر بولا جا سکتا ہے' دیگر کسی بھی شہر میں رہنے والے کو نسبت کے موقع پر "مَدِینِی" کہتے ہیں لیکن مدینہ رسول اللہ ﷺ میں رہنے والے کو فرق ظاہر کرنے کے لئے "مدنی" کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر آیا ہے اور تورات سے لیا گیا ہے۔

اَلْمَرْحُوْمَةُ

پچھتر واں نام "المرحومہ" ہے' یہ بھی تورات سے لیا گیا ہے' اسے مرحومہ اس بناء پر کہتے ہیں کہ یہاں دنیا کی طرف رحمت بنا کر بھیجے جانے والے کا گھر ہے نیز ارحم الراحمین کی طرف سے رحمتوں کے نزول کا مقام ہے اور پہلا وہ شہر ہے جسے حضور سید المرسلین ﷺ کی رحمت نصیب ہوئی۔

اَلْمَرْزُوْقَةُ

چھہتر واں نام "المرزوقہ" ہے۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اسے ساری مخلوق میں سے افضل کی تشریف آوری بطور روزی نصیب ہوئی اور آپ نے اس میں قیام فرمایا۔ یا اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں بسنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی روزی عطا فرمائی' آسمانوں سے روزی دی اور ان کے پاؤں تلے سے دی' اگر کوئی شخص بے رخی کی بناء پر یہاں سے نکل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر شخص یہاں بھیج دیتا ہے جیسے کہ حدیث سے ثابت ہے۔

مَسْجِدُ الْاَقْصٰی

ستترواں نام "مسجد الاقصیٰ" ہے' علامہ تادلی نے صاحب مطالع سے اسے اپنی منسک میں لیا ہے۔

اَلْمِسْكِيْنَةُ

اٹھہتر واں نام "المسکینہ" ہے' یہ تورات سے لیا گیا ہے اور اس حدیث میں آتا ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ

"مدینہ کے دس نام ہیں۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مرفوع حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مدینہ سے فرمایا:

"اے طیبہ! اے طابہ! اے مسکینہ! خزانوں کو پسند نہ کر اور اپنی اجاجیر (بلند سطح) بستیوں پر بلند کر دے۔"

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہیں یہ لفظ تورات میں ملا تھا۔ اجاجیر سطحوں کو کہتے ہیں۔ مسکنت کا اصل معنیٰ عاجزی کرنا ہوتا ہے۔ مدینہ کا یہ نام اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کے لئے ہر ایک کے دل میں خشوع وخضوع پیدا فرما رکھا ہے' یا اس بناء پر یہ نام رکھا گیا کہ یہ مسکینوں کی رہائش گاہ ہے' اس میں خضوع وخشوع والا ہر شخص رہ سکتا ہے' حدیث پاک میں آتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں: الٰہی! مجھے حالتِ مسکینی میں رکھ' اسی حالت میں موت دینا اور حشر کو مسکینوں میں اُٹھانا۔

اَلْمُسْلِمَۃ

اناسیواں نام "المسلمہ" ہے' مؤمنہ کے وزن پر ہے' پہلے ہم اسے بتا چکے ہیں۔ لفظِ اسلام عجز وانکسار اور اللہ کا ہو رہنے کے لئے بولا جاتا ہے' مدینہ کو مسلمہ یا تو اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تابعداری اور اللہ کا ہو رہنے کی صورت بتائی ہے یا اس بناء پر کہتے ہیں کہ عاجزی وانکساری یہاں رہنے والوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہوتی ہے کیونکہ ان کا یہ شہر قرآن کی بناء پر فتح ہوا' تلوار اور تیر سے نہیں پھر اس لئے بھی کہ یہاں کے لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ہو گئے' ان کی مدد کے لئے وقف ہو گئے اور ان کے منہ مانگے کو پورا کر دکھایا۔

مَضْجَعُ الرَّسُوْل

اَسّی واں نام "مضجع الرسول" ہے۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ جیسے عنقریب آگے آ رہا ہے کہ یہاں کے رہنے والے لوگوں کو حفاظت اور عزت حضور ﷺ کے اس فرمان سے ملی ہے کہ: "مدینہ میری ہجرت کا مقام ہے اور زمین میں میرے لیٹنے کا مقام ہے۔"

اَلْمُطَیَّبَۃ

اکاسیواں نام "المطیّبہ" ہے۔ طیبہ کے ذکر میں ایسے الفاظ کی وضاحت گذر چکی ہے۔

اَلْمُقَدَّسَۃ

بیاسیواں نام "المقدسہ" ہے (پاکیزہ) کیونکہ اس شہر کو شرک اور گندگی کے پاک کر دیا گیا ہے پھر اس لئے بھی یہ نام رکھا گیا کہ اس نام کی برکت کے باعث گناہوں اور کوتاہیوں سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

اَلْمَقَرّ

تراسی واں نام "المقر" ہے۔ جیسا کہ میں نے ایک لغت میں دیکھا یہ لفظ قرار سے لیا گیا ہے' عنقریب مدینہ منورہ کے لئے آپ کی دعا میں یہ لفظ آ رہا ہے' فرمایا تھا: "الٰہی! مدینہ میں میرے لئے قرار و چین پیدا فرما اور اچھی روزی کا بندوبست فرما۔"

اَلْمَكْتَان

چوراسی واں نام "المکتان" ہے' سعد بن سرح نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرے کے بارے میں کہا تھا:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ معاملہ (محاصرہ) طول پکڑتا جا رہا ہے جبکہ مکّتان (مدینہ) میں ہمارے مددگار بھی کم ہیں۔"

نصر بن حجاج کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مدینہ پاک سے معزول کر دیا کیونکہ ان کا حُسن دیکھ کر ایک عورت ان کے حق میں شعر پڑھ رہی تھی تو اس پر اس نے لکھ بھیجا:

"میرے بارے میں آپ کا گمان ایک حقیقت ہے چنانچہ اس کے بعد میرے پاس یہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں لہٰذا میں ہم نشین سے بات نہیں کر سکتا۔
مجھے تہمت کے بغیر معزول کر دیا گیا حالانکہ میرا مقام مکّتین (مدینہ) میں تھا۔"

ظاہر یہ ہے کہ مکّتین سے یہاں مراد مدینہ طیبہ ہے' کیونکہ نصر بن حجاج اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں کے واقعات مدینہ ہی میں ہوئے تھے۔ مدینہ پر یہ لفظ اس لئے بولا گیا کہ اہلِ مکہ یا ان کا اکثر حصہ یہاں آ پہنچا تھا اور وہ لوگ اہلِ مدینہ میں گھل مل گئے تھے۔

برھان قیراطی نے مکّتین کا لفظ مکہ کے ناموں میں شمار کیا ہے۔ تقی فاسی کہتے ہیں کہ شاید برھان نے یہ لفظ ورقہ بن نوفل کے اس قول سے لیا تھا:

بِبَطْنِ الْمَكَّتَيْنِ عَلٰى دَجَائِیْ

حضرت سہیلی کہتے ہیں کہ انہوں نے مکہ کا لفظ تثنیہ بنا کر استعمال کیا حالانکہ یہ واحد ہے' وجہ اس کی یہ ہے کہ مکہ کی ایک حیثیت باطنی ہے اور ایک ظاہری' عرب لوگوں کا یوں لفظ بولنے کا مقصد ہر شہر کی دو یہی جانبیں بیان کرتا ہوتا ہے یا وہ اعلیٰ اور نیچے والا حصہ بیان کیا کرتے ہیں لہٰذا اس مقصد کی خاطر وہ تثنیہ کا لفظ لاتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں تثنیہ کا لفظ تغلیبی طور پر لاتے ہوں اور اس سے مراد مکہ اور مدینہ لیتے ہوں جیسے ہم نے اسے دلیل بنایا ہے تو اس صورت میں ان کا اسے مدینہ کے لئے بطور دلیل پیش کرنا بے مقصد ہو جائیگا۔

اَلْمَكِينَة

پچاسی واں نام "المکینہ" ہے (عزت و مرتبہ والا ہونا) یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اسے نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔

مُهَاجَرُ الرَّسُوْل

چھیاسی واں نام "مہاجر الرسول" ﷺ ہے' یہ نام آپ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے کہ اَلْمَدِيْنَةُ مُهَاجَرِيْ (مدینہ میری جائے ہجرت ہے)۔

اَلْمُوَفِّيَة

ستاسی واں نام "الموفّیہ" ہے' یہ یعنی فاء کی شدّ کے ساتھ "توفیہ" سے نکلا ہے لفظ "توفیہ" مصدر سے فاء کی شدّ کے ساتھ بنا' اسے شدّ کے بغیر مُوْفِيَةٌ بھی پڑھا جا سکتا ہے (اِیْفَاء سے) کیونکہ "توفیہ" اور "ایفاء" کا معنٰی ایک ہی ہوتا ہے' مدینہ کا یہ نام اس بناء پر ہے کہ یہ اپنے یہاں آنے والوں کا حق پورا پورا دیا کرتا ہے اور یہ یہاں حاضری دینے والوں کو ظاہری و باطنی طور پر نوازا کرتا ہے یا اس لئے یہ نام پڑا کہ اس میں رہنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالٰی سے جو عہد کئے تھے' انہیں پورا کر دکھایا۔

اَلنَّاجِيَةُ

اٹھاسی واں نام "الناجیہ" ہے۔ یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی خلاصی حاصل کر لیتا ہے یا جلدی دکھاتا ہے یا نجی اس وقت بولتے ہیں جب کوئی اکیلا سرگوشی کیا کرتا ہے یا دو شخص آپس میں سرگوشی کرتے ہیں یا یہ لفظ نَجْوَة سے لیا گیا ہے جس کا معنٰی بلند زمین ہوتا ہے۔ مدینہ کا یہ نام اس بناء پر ہے کہ اسے اللہ تعالٰی نے سرکشوں سے نجات بخشی ہے' طاعون اور دجال سے نجات عطا فرمائی ہے یا اس بناء پر کہتے ہیں کہ اس میں تیزی سے نیکیاں ہوتی ہیں اور اشرف المخلوقات کو نیکیاں دینے میں آگے آگے ہوتا ہے اور پھر یوں بھی یہ نام رکھا گیا ہے کہ پوری مخلوق میں اسے بلند شان حاصل ہے اور یہ کسی کی محنت کا اجر نہیں رہنے دیتا۔

نَبْلَاء

نواسی واں نام "نبلاء" ہے۔ یہ کراع سے نقل کیا گیا ہے' میرا خیال ہے کہ اس کے نون پر زبر اور حرف باء پر جزم ہے اور آخر میں مَدّ ہے' نُبل سے بنا ہے جس کا معنٰی فضیلت اور پاکیزگی ہوتا ہے چنانچہ خوبصورت عورت کے بارے میں عرب کہتے ہیں اِمْرَأَةٌ نَبِيْلَةٌ۔ وہ حسن میں وہ حسین ہے یعنی بیّنۃ النّبالہ ہے اور جب کھجور پھل والی ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں اَنْبَلَ النَّخْل' پھر نُبْلَة کا لفظ ثواب' جزاء اور عطیہ پر بولا جاتا ہے۔

اَلنَّحْو

نام نمبر ۹۰ ''النحو '' ہے۔ مدینہ طیبہ کا یہ نام یا تو اس میں شدید گرمی کی وجہ سے بولا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے نَحَرَ الظَّهِيرَةَ (دوپہر کو خوب گرمی پڑی) اور اسی گرمی کی بناء پر مکہ بھی اس کے ساتھ شامل ہے (وہاں بھی سخت گرمی ہے) یا یہ لفظِ ''نَحْو '' ابتداء اور اصل کے معنی دیتا ہے کیونکہ یہ دونوں شہر اسلام کی بنیاد اور اصل ہیں۔

اَلْهَذْرَاء

نام نمبر ۹۱ ''الهذراء'' ہے' ابن نجار نے یہ نام ''عذراء'' کی بجائے تورات سے لیا ہے اور پھر بہت سے مطری جیسے لوگوں نے اسے لے لیا ہے چنانچہ ہم نے بھی اسے درج کر دیا ہے حالانکہ جیسے ہم بیان کر چکے ہیں' اسے ساقط کر دینا چاہیے' ہم نے اسے اس کلام میں روایت کیا جو اسے ذال سے پڑھتا ہے۔ مدینہ پاک کا یہ نام شدید گرمی ہونے کی بناء پر رکھا گیا کیونکہ عرب شدید گرم دن کو يَوْمٌ هَاذِرٌ کہتے ہیں یا اس لئے کہ یہاں پانی بکثرت مل جاتا ہے یا اس کے بازاروں میں قدرے بلند آواز آتی ہے چنانچہ عرب اس شخص کے بارے میں هَذَرَ فِيْ كَلَامِهٖ کہتے ہیں جو بہت بولے اور هَذَر بہت ردّی چیز کو کہتے ہیں (اور یہ بلند آواز وہاں اچھی نہیں لگتی) اور یہ بھی احتمال ہے هَذَرَ الْحَمَام سے لیا گیا ہو (دال کے ساتھ) (کبوتر آواز نکالے تو بولتے ہیں یا) پانی چلنے اور انڈیلے جانے پر آواز آتی ہے۔ هَذَرَ الْعُشْب اس وقت کہتے ہیں جب گھاس لمبی ہو جائے اور پھر بہت سی نباتات اُگنے پر زمین کو اَرْضٌ هَاذِرَة کہتے ہیں۔

يَثْرِب

نام نمبر ۹۲ ''یثرب'' ہے' یہ اَثْرِب ہی کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اور یہ لفظ شاعر کے اس شعر میں یوں نہیں ہے:

وعدت وكان الخلف منك سجيّة   مواعيد عرقوب اخاه بيثرب

'' تم نے عرقوب والا وعدہ کر دیا حالانکہ وعدہ خلافی تمہاری عادت ہے' اس کے بھائی۔ عرقوب سے جو یثرب میں ہے۔''

کیونکہ ''مجد'' بتاتے ہیں کہ سب کے نزدیک تاء دو مرتبہ ہے اور اس کی راء پر زبر ہے' مجد کہتے ہیں کہ یہ حضر موت کا ایک شہر ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ وعدوں والا عرقوب وہیں رہتا تھا اور پھر مجد' اس بات کو صحیح مانتے ہیں کہ یہ شخص مدینۃ النبی ﷺ کے قدیم یہودیوں میں سے تھا۔ مشارق عیاض میں لکھا ہے کہ اس شعر میں جو یثرب کا لفظ ہے وہ اسی طرح ہے جیسے مدینہ منورہ کا نام یثرب ہے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ یمامہ کا ایک شہر ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ لفظ یتترب ہے' راء پر زبر ہے اور یہ اس بستی کا نام ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تیم قبیلہ کی شاخ بنو سعد کے شہروں میں سے ایک قریہ کا نام ہے جیسے شعر میں موجود ''عرقوب'' میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ اہلِ مدینہ کے اوس

قبیلہ سے تھا اور کچھ کہتے ہیں کہ اہل یمامہ کے عمالقہ میں سے تھا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مذکورہ بنو سعد میں سے تھا' رہا ھند بنت عتبہ کا یہ قول:

لَنَهْبِطَنَّ يَثْرِبَهْ بِغَارَةٍ مُنْشَعِبَهْ

"ہم یثرب میں اتریں گے' اس غار میں جو بَل کھاتی ہے۔"

تو ظاہر یہ ہے کہ یہاں ھاء سکتہ کی وجہ سے آئی ہے لہٰذا یہ کوئی دوسرا نام نہیں ہے۔

یُنْدَدُ

نام نمبر ۹۳ "یُنْدَدُ" ہے' اسے کراع نے یاء اور دو دال کے ساتھ ذکر کیا ہے' یہ لفظ یا تو نَدّ سے ہے جو ایک مشہور خوشبو ہوتی ہے' بعض عنبر کو کہتے ہیں یا یہ نـــد سے ہے جس کا معنٰی بلند ٹیلا ہوتا ہے یا یہ ناد سے لیا گیا ہے جس کا مطلب رزق ہوتا ہے۔

یُنْدَر

نام نمبر ۹۴ "یندر" ہے' پہلے نام میں آخری دال کو راء سے بدل کر یندر پڑھا جاتا ہے' یہ نام "مجد" نے دوسرے ناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے اور مزید ابھی تک اس پر کچھ نہیں کہا گیا جیسے عنقریب میں ذکر کروں گا کہ یہ لفظ کیسے بناء کیونکہ حدیث پاک میں یونہی آیا ہے کہ "مدینہ پاک کے دس نام ہیں جو پہلی کتابوں میں ہیں' بعض جگہ یہ لفظ تُنْدَد ہے تاء اور دو دال کے ساتھ اور کہیں یونہی ہے' آخری دال کو راء سے بدلا گیا ہے چنانچہ اس رد و بدل کے نتیجے میں چار نام بنتے ہیں' دو مقامات پر یاء لگانے سے اور دو میں تاء لگانے سے۔

مجد کہتے ہیں کہ یہ سب معاملہ گڑبڑ ہے' صحیح لفظ یندد ہے یاء اور دو دال کے ساتھ لیکن اس پر اعتراض ہوتا ہے کیونکہ زرکشی نے مدینہ پاک کے نام لکھتے وقت ان چاروں میں سے دو کو جمع کر لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں کو بکری نے ذکر کیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ آخری دو بھی یونہی ہیں اور حدیث "مدینہ کے دس نام ہیں۔" کو ابن شبہ نے عبد العزیز بن عمران سے روایت کیا ہے لیکن صرف آٹھ نام لکھے ہیں پھر اپنی سند سے بھی بذریعہ عبد اللہ بن جعفر بن ابو طالب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام "دار اور ایـمـان" رکھا ہے۔ کہا ہے کہ پہلی حدیث میں آٹھ نام آئے ہیں اور اس میں دو نام آ گئے ہیں اور یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ دو ملا کر دس بنتے ہیں یا نہیں۔

ابن زبالہ نے بھی یونہی روایت کی ہے البتہ نو نام ذکر کئے ہیں اور پھر "دار" کا نام بڑھایا ہے جبکہ دسواں ساقط کر دیا ہے۔

ابن زبالہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عبد العزیز بن محمد درا وردی نے کہا: "مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تورات میں مدینہ کے چالیس نام ہیں۔" واللہ اعلم۔

دوسرا باب

اس باب میں فضائلِ مدینہ کا ذکر ہے' یہ بتایا گیا ہے کہ مدینہ کی ابتداء کیسے ہوئی اور کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچا' اسی سرزمین سے خوفناک آگ کیسے اُٹھی اور حرم شریف کے قریب پہنچ کر بجھ گئی۔اس میں سولہ فصلیں ہیں۔

فصل نمبر ۱

دوسرے شہروں پر فضیلت مدینہ' مکہ و مدینہ میں سے افضل کون؟

اس بات پر علماء کا اجماع ہو چکا ہے کہ جو مٹی سرور کونین ﷺ کے جسمِ اطہر کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ کعبہ تک سے بھی افضل ہے' اس کے بعد علماء کا یہ اجماع ہے کہ مکہ اور مدینہ تمام دوسرے شہروں سے افضل ہیں لیکن اختلاف اس میں ضرور ہے کہ دونوں میں سے کونسا شہرِ افضل ہے چنانچہ حضرت عمر بن خطاب' ان کے لڑکے عبد اللہ' مالک بن انس اور اکثر اہلِ مدینہ علماء' مدینہ منورہ کو افضل کہتے ہیں' اس شخص نے یہ بہت اچھا کہا جنھوں نے بتایا کہ اختلاف تو مکہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں ہے' یہ بات یقینی ہے کہ اس مٹی کے علاوہ جو جسمِ اطہر سے لگی ہوئی ہے' مکہ' مدینہ شہر سے افضل ہے اور یہ بات اجماع سے ثابت ہے۔جسمِ انور کے ساتھ لگی مٹی کے بارے افضیلت پر اجماع قاضی عیاض نے بیان کیا ہے اور ان سے قبل قاضی ابو الولید باجی یہ اجماع نقل کر چکے ہیں جیسا کہ خطیب ابن جملہ نے لکھا ہے' یونہی ابو الیمن بن عساکر وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور یہ تصریح کر دی ہے کہ مدینہ' کعبہ شریف سے افضل ہے بلکہ علامہ تاج سبکی نے تو ابن عقیل حنبلی کے ذریعے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زمین کا وہ ٹکڑا عرش سے بھی اعلیٰ ہے۔

تاج فاکہی لکھتے ہیں: کہتے ہیں' اس بات میں کوئی اختلاف نہیں زمین کا جو ٹکڑا آپ کے اعضاءِ مبارکہ کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ زمین کے ہر ٹکڑے سے افضل ہے حتیٰ کہ کعبہ والی زمین سے بھی افضل ہے۔پھر کہا: میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ وہ ٹکڑا آسمان کے ہر ٹکڑے سے بھی افضل ہے اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں' جہاں تک میرا یقین ہے کہ اگر یہ معاملہ علماء کے سامنے رکھا جائے تو اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرے گا۔یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آسمانوں کو آپ کے مبارک قدموں سے لگنے کا شرف حاصل ہے بلکہ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ زمین کے تمام قطع آسمانوں کے ہر قطع سے افضل ہیں تو یہ شرف بعید نہیں کیونکہ حضور ﷺ زمین میں آرام فرما ہیں بلکہ میرے نزدیک تو بات یقیناً یونہی ہے۔

زمین افضل یا آسمان؟

میں کہتا ہوں کہ ابن عماد نے شیخ تاج الدین (امامِ فاضلیہ) سے نقل کرتے ہوئے' زمین کی آسمان پر فضیلت پر

بحث کرتے ہوئے تصریح کی ہے اور کہا ہے: ''اکثر علماء کہتے ہیں کہ زمین افضل ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام زمین سے پیدا کیے گئے' اسی میں انہوں نے اللہ کی عبادت کی اور اسی میں دفن ہو گئے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یقینی اور درست بات' جس پر جمہور علماء کا اتفاق ہے' یہ ہے کہ آسمان' زمینوں سے افضل ہیں۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ زمین زیادہ شرف رکھتی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے زندگیاں اسی پر گذاریں اور اسی میں دفن ہوئے۔ یہ بات ضعیف ہے۔

میں کہتا ہوں شاید انہوں نے اس دوسری وجہ کو ضعیف اس لئے کہا ہے کہ کلام تو زمین کے بارے میں ہو رہی ہے لہٰذا اس کے کچھ حصے کو فضیلت دینے سے پوری زمین کی افضیلت ثابت نہیں ہو سکتی پھر انہوں نے اس بات کو بھی ضعیف قرار دیا ہے کہ ارواحِ انبیاء تو آسمانوں میں رہتی ہیں اور یہ جسموں سے افضل ہوتی ہیں۔

اس کے جواب میں ہم اپنی یہ تحقیق انشاء اللہ پیش کریں گے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

ہمارے شیخ محقق بن امام کاملیہ نے سورۂ صف کی تفسیر میں کہا ہے کہ:

''حق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ٹھکانے اور ان کی روحیں زمین و آسمان سب سے افضل ہیں' اختلاف تو ان کے مقامات اور ارواح سے الگ میں ہے جیسے شیخ الاسلام بلقینی نے اس کی تائید کی ہے۔''

علامہ زرکشی کہتے ہیں کہ اعضاءِ مبارکہ سے لگی مٹی کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ وہ ان کے وجود مبارک کو چھو رہی ہے اور ساتھ ملی ہوئی ہے' یہی وجہ ہے کہ بے وضو شخص کے لئے قرآنی جلد کو چھونا حرام کیا گیا ہے۔

مکہ افضل یا مدینہ' ایک مرتبہ پھر دہرایئے

علامہ قرافی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یہ مفہوم ایک عالم کے ذہن میں نہ آ سکا تو اس نے آپ کے جسمِ انور سے لگی مٹی کی فضیلت پر اجماع کے بیان کا انکار کر دیا اور کہا: فضیلت تو اعمال پر ڈھیروں ثواب ملنے سے ثابت ہوتی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر پر کوئی عمل کرنا تو حرام ہے۔ علامہ قرافی کہتے ہیں کہ اس عالم نے یہ نہیں جانا کہ فضیلت کے اسباب' ثواب سے عام ہوتے ہیں اور فضیلت پر ہونے والا اجماع اسبابِ تفضیل کی وجہ سے ہے نہ کہ ثواب کی کثرت سے۔ پھر اس عالم پر یہ الزام بھی آتا ہے کہ قرآنی جلد بھی (بلکہ خود قرآن) اور چیز سے افضل نہ ہو کیونکہ اس میں بھی تو عمل ممکن نہیں اور یہ بات تو اجماع کی سخت خلاف ورزی ہے۔

میں کہتا ہوں' یہ جو انہوں نے کہا کہ جسم سے ملنے والی زمین افضل ہے' ہم اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن اس میں کثرتِ ثواب کی بناء پر عدمِ تفضیل مطلقاً تسلیم نہیں جیسے ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے۔

عزّ بن عبد السلام کا تبصرہ

اس مسئلہ میں بنیادی اشکالی ابن عبد السلام کی طرف سے ہوا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے ''امالی'' میں لکھا ہے کہ مکہ کی مدینہ پر افضلیت یا مدینہ کی مکہ پر افضلیت کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں شہروں میں عمل کرنے کا ثواب اللہ تعالیٰ دوسرے شہروں میں عمل کرنے سے زیادہ دیتا ہے لہٰذا قاضی عیاض کے اس قول پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ ''امت کا اس پر اجماع ہے حضور ﷺ کی قبر مبارک والی جگہ افضل ہے۔'' کیونکہ اس صورت میں یہ ممکن نہیں کہ اس جگہ میں کوئی اللہ کی عبادت کر سکے۔

علامہ تقی سبکی رحمہ اللہ کا بیان

علامہ تقی سبکی لکھتے ہیں کہ میں نے بہت سے علماء کو دیکھا ہے جو اس اجماع کے نقل میں شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے قاضی القضاۃ علامہ سروجی حنفی نے بتایا کہ میں نے اپنے مذہب کی پچاس کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن کسی نے یہ بحث نہیں چھیڑی (کہ دونوں شہروں میں سے کون سا افضل ہے) علامہ سبکی کہتے ہیں البتہ میں نے ابن عبد السلام کے اس بحث چھیڑنے سے معلوم کیا ہے کہ تمام زمانے اور تمام مقامات ایک جیسے ہوتے ہیں البتہ ان میں فضیلت اس کام کی وجہ سے آتی ہے جو ان میں واقع ہوتا ہے' ان صفات کی بناء پر فضیلت نہیں ہوتی جو زمانے اور جگہ میں پائی جاتی ہے' یہ فضیلت اس طرف لوٹتی ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کو اس میں کرنے کی توفیق دے رکھی ہے نیز ان سے مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ زمانہ اور جگہ میں فضیلت اللہ کی عطاء سے ان کو ملتی ہے جو ان دونوں میں عمل کرتے ہیں۔ حضرت سبکی کہتے ہیں:
میں کہتا ہوں' کبھی تو فضیلت اسی بناء پر ہوتی ہے اور کبھی کسی اور وجہ سے ہوتی ہے اگرچہ ان میں کوئی بھی عمل کیا جائے کیونکہ قبر انور پر رحمت و رضوان اور فرشتے نازل ہوتے ہیں کیونکہ اللہ کو اس قبر اور اس میں تشریف فرما سے اس قدر محبت ہے جو سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی جبکہ یہ محبت کسی اور مقام کو حاصل نہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ مقام سب سے افضل نہ ہو حالانکہ اس میں ہم کوئی بھی عمل نہیں کر سکتے لہٰذا یہ ایسا معنٰی ہے کہ اس میں اعمال کا ضعیف ہونا نہیں پایا جاتا' علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ ان کے قول کے اعتبار سے' ہر ایک وہیں دفن ہوتا ہے جہاں سے اسے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ مزار انور میں اعمال کا اجر اس لحاظ سے دوگنا ہے کہ نبی کریم ﷺ زندہ ہیں اور آپ کے اعمال ہر ایک سے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں تو اجر کا یہ اضافہ ہمارے اعمال سے خصوصیت نہیں رکھتا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات بڑی نفیس ہے' علاوہ ازیں میں کہتا ہوں کہ آپ کے مزار شریف پر اُترنے والی رحمتیں اور برکتیں ایسی ہیں جن کا فیض پوری اُمت کو پہنچتا ہے اور یہ بے انتہاء ہیں کیونکہ آپ کے مراتب میں ہر وقت ترقی جاری رہتی ہے اور امت کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ فضیلت میں بہت بڑھ کر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی امت سب سے بہتر ہے کہ اس کے نبی سب نبیوں سے افضل ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے قبر انور نہایت فیض بخش ہوتے ہوئے سب

مقامات سے افضل نہ ہو تم دیکھتے نہیں کہ خانہ کعبہ ان لوگوں کے قول کے مطابق جو اس میں عمل کرنے سے منع کرتے ہیں ہمارے عمل کی جگہ نہیں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کے گرداگرد مسجد اس کعبہ سے افضل ہو کیونکہ وہ مسجد تو عمل کرنے کی جگہ ہے حالانکہ بھلائی کا سبب تو خانہ کعبہ ہی ہوتا ہے اور پھر ہر ایک جانتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی امت کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ فرمائے رکھتا ہے حالانکہ آپ تو اسی قبرِ انور ہی میں ہیں یہی وہ جگہ ہے جہاں امت کے لئے آپ کی طرف سے نہایت درجہ شفاعت ہوتی ہے اور آپ ان کی امداد فرماتے ہیں حدیثِ پاک میں بھی یہ بات آ چکی ہے کہ فرمایا: "میری وفات تمہارے حق میں بہت بہتر ہو گی" پھر اس کی وضاحت بھی بیان ہوئی کہ "تمہارے اعمال میرے سامنے لائے جاتے ہیں میں تمہارے اچھے اعمال دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں اور نامناسب دیکھ کر اللہ سے تمہارے لئے بخشش کی دُعا کرتا ہوں۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ میں اللہ سے تمہارے گناہ ہاتھوں میں لینے کی درخواست کرتا ہوں (کہ انہیں بخش دے) اس کے اور بھی دلائل ہیں جو اس کی تقویت کا باعث ہیں عنقریب باب نمبر ۸ میں آگے آ رہا ہے کہ اس آیت میں مذکور آپ کی خدمت اقدس میں حاضری روضۂ انور پر حاضری ہی سے حاصل ہو جاتی ہے آیۂ مبارکہ یہ ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ○

"اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں۔"

اس میں لوگوں کو کا آپ کی خدمت میں آنا قبر انوار پر حاضری سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا حضور ﷺ کی زیارت اور آپ کا قرب سب سے افضل عبادت ہے آپ کے قریب دعائیں قبول کی جاتی ہیں مطالبے پورے ہو جاتے ہیں چنانچہ ان کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سبب بنا دیا ہے اس لئے کہ یہ جگہ جنت کے باغوں میں ایک باغ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ سب باغوں سے افضل ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت کے اندر تم میں سے کسی کا قوس کے دونوں کناروں جتنے فاصلے پر ہونا دنیا اور اشیاء دنیا سے بہت بہتر ہے۔

حضرت حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی "نوادر" میں فرمایا: میں نے حضرت زبیر بن بکار رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے کہ اہلِ مدینہ میں سے ایک شخص نے ایک کتاب لکھی اور ادھر اہلِ مکہ سے بھی ایک نے کتاب لکھ دی ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے شہر کی فضیلت بیان کرتا رہا ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ دوسرے پر غالب آ جائے آخرکار ایک خصوصیت کی بناء پر مدنی شخص مکی پر غالب آ گیا اور وہ مکی عاجز پڑ گیا مدنی کا کہنا یہ تھا کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ مر کر ہر شخص اسی مٹی میں دفن ہوتا ہے جس سے اس کی پیدائش ہوئی ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ رسول پاک ﷺ مدینہ کی مٹی ہی سے پیدا ہوئے ہیں تو پھر پتہ چل گیا کہ اس مٹی کو ساری زمین پر واضح طور پر فضیلت حاصل ہے۔

انسان اسی مٹی سے پیدا ہوتا ہے جس میں اسے دفن ہونا ہوتا ہے

میں کہتا ہوں' یہ بات کہ ''آدمی اسی مٹی سے پیدا ہوتا ہے جس میں دفن ہوتا ہے۔'' اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حاکم نے مستدرک میں درج کی ہے' اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوسعید نے اس پر دلائل صحیحہ قائم ہیں' انہوں نے بتایا: نبی کریم ﷺ ایک قبر کے قریب سے گذر رہے تھے کہ پوچھا: یہ قبر کس کی ہے؟ ہمراہیوں نے عرض کی یا رسول اللہ! فلاں حبشی کی ہے۔ فرمایا: لا الٰہ الا اللّٰہ! زمین و آسمان سے تعلق رکھ کر اسی مٹی کی طرف اسے کھینچ لیا گیا ہے جہاں سے پیدا ہوا تھا' حکیم ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ نے ''الوفاء'' میں حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے سنداً بیان کیا ہے' فرماتے ہیں کہ: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو جبریل علیہ السلام کو حکم دیا جس کے نتیجے میں وہ آپ کی قبر مبارک والی جگہ سے سفید مٹھی بھر مٹی لے آئے جسے تسنیم کے پانی سے گوندھا گیا تھا' پھر اسے جنت کی نہروں میں باری باری ڈبویا گیا' اسے آسمانوں اور زمینوں میں گھمایا گیا تو فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہی حضرت محمد ﷺ کی پہچان کر لی۔ آگے اس کے فضائل میں مزید بیان آ رہا ہے۔

آدمی وہاں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اسے موت آنی ہوتی ہے

حضرت حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے حدیثِ پاک ''جب اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دیتا ہے کہ آدمی فلاں زمین میں فوت ہو تو اس کے دل میں وہاں کی کوئی غرض رکھ دیتا ہے۔'' ذکر کر کے فرمایا' کہ اس کی موت وہاں اس لئے ہوتی ہے کہ وہ زمین کے اسی ٹکڑے سے پیدا کیا گیا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ بھی فرما رہا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ○ (سورۂ طٰہٰ:۵۵)

''اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے۔''

حضرت ترمذی فرماتے ہیں کہ آدمی کو وہیں لوٹایا جاتا ہے جہاں سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ حضرت ترمذی لکھتے ہیں' یہ روایت ملتی ہے کہ اس وقت زمین بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑائی جب حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی لی گئی' اس پر اللہ نے اسے فرمایا کہ جلد یہ مٹی تمہارے پاس واپس کر دوں گا چنانچہ جب ان کا وصال ہوا تو اسی مٹی میں دفن کئے گئے جہاں سے آپ کی وہ مٹی لی گئی تھی۔

تخلیقِ رسول اللہ اور ابوبکر و عمر ایک مٹی سے

حضرت یزید جریری رحمہ اللہ کہتے ہیں' میں نے ابنِ سیرین رحمہ اللہ سے سنا' فرمایا: اگر میں قسم کھا کر یہ بات کہوں تو سچی ہو گی اور اس میں شک نہیں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ایک ہی مٹی سے پیدا فرمایا تھا اور پھر اسی مٹی کی طرف لوٹا دیا۔

حضرت ابنِ جوزی رحمہ اللہ ''الوفاء'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بتاتے ہیں' فرمایا:

''جب حضور علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو صحابہ میں اختلاف پیدا ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کریں' حضرت علی نے کہا کہ زمین میں کوئی ایسا زمینی ٹکڑا نہیں جو اس ٹکڑے سے بہتر ہو جس میں آپ کا وصال ہوا ہے۔ حضرت یحییٰ کی روایت ہے کہ دفن کے بارے میں اختلاف ہونے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: جہاں اللہ نے آپ کی روح قبض فرمائی ہے' اس کے علاوہ کسی اور جگہ میں آپ کو دفن نہیں کیا جائے گا چنانچہ اس پر سب صحابہ راضی ہو گئے۔''

میں کہتا ہوں کہ ابن جوزی کے قول کے ذریعے قبرِ انور کی فضیلت پر گذشتہ اجماع کی نقل سے سند ملتی ہے کیونکہ سب صحابہ اس پر خاموش ہو گئے تھے اور آپ کو وہیں دفن کرنے پر تیار ہو گئے تھے اور جب لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے صاحبِ رسول اللہ! آپ کو کہاں دفن کیا جائے؟ تو آپ نے فرمایا: اسی زمین میں' جہاں آپ کا وصال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ ترین زمین ہی پر آپ کی روح قبض فرمائی ہے یہ روایت حضرت ترمذی نے اپنے ''شمائل'' میں ذکر کی ہے اور نسائی نے ''کبریٰ'' میں ذکر کی ہے' اس کی سند صحیح ہے۔ اسی کو حضرت ابویعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے' آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں نے رسول اللہ علیہ السلام سے سنا' فرمایا: کوئی نبی اپنی پسندیدہ جگہ کے بغیر وصال نہیں فرماتا۔''

میں کہتا ہوں کہ زمین کا وہ قطعہ جو آپ کو پسند ہے' اللہ کو بھی پسند ہوتا ہے کیونکہ آپ کی کسی شے سے محبت' اللہ کی محبت کے تابع ہوتی ہے ہاں بفرضِ محال اگر نبی کی اس شے سے محبت خواہش نفس کی بناء پر ہو تو ایسا نہیں ہوتا اور جو چیز اللہ اور اس کے نبی کو پسند ہو' وہ کیوں کر افضل نہ ہو گی' یہی وجہ ہے کہ مکہ پر مدینہ کی افضلیت اس صحیح حدیث سے لی گئی ہے جس میں رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''الٰہی! مدینہ ہمیں مکہ سے بھی زیادہ محبوب بنا دے۔'' بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے جیسے اسے روایت کیا گیا ہے اور یہ آپ کی دعوت کی قبولیت ہی تھی کہ آپ کا چوپایہ اس وقت حرکت کرنے رگ جاتا جب محبت سے آپ اُسے دیکھتے۔

حضرت حاکم نے اپنی مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے: ''الٰہی! تو نے میری پسندیدہ سرزمین سے مجھے نکالا ہے تو پھر اپنی پسندیدہ جگہ میں ٹھکانہ دے۔'' حضرت حاکم کے ایک طریقے کے مطابق آپ نے یہ بات مکہ سے نکلتے وقت فرمائی تھی۔

کہتے ہیں' اگر یہ روایت تسلیم کر لی جائے تو مقصد یہ ہو گا کہ مجھے مکہ کے بعد اپنی پسند کا ٹھکانہ دیدے۔'' کیونکہ حدیثِ پاک میں ہے کہ ''مکہ اللہ کے شہروں میں سب سے بہتر ہے۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ ''یہ اللہ کی پسندیدہ سرزمین ہے۔'' اور اس لئے بھی کہ مسجد مکہ کے لئے مدینہ کے مقابلے میں دوگنا اجر ہے جیسے آگے آ رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مکہ کے مقابلے میں مدینہ سے زیادہ محبت کی دعا

فرمائی تھی' پھر ہم نے آپ کی دعا قبول ہونے کا اشارہ کیا تھا اور یہ بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے لئے کسی شے کو اس وقت تک محبوب نہیں بناتا جب تک وہ خود اسے اپنی محبوب نہ بنا لے لہٰذا اس حدیث کی صحت کی بھی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی اس سے مراد وہ کچھ ہے جو ظاہر کے خلاف ہے اور جو کچھ ذکر کیا گیا ہے' اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ ظاہر کے خلاف پر سند بن سکے کیونکہ اس کے ذریعے حضورﷺ نے اس گھر کا ارادہ فرمایا جس میں آپ نے ہجرت کرنا تھی چنانچہ اللہ سے دعا فرمائی کہ اس گھر کو ایسا بنا دے جو خود اسے محبوب ہو۔ اللہ کی اس سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں خیر و برکت رکھ دے اور اپنے محبوب کے لئے تعظیم کا سامان کر دے اور یہ چیز اس میں' پہلے نہ ہوتے ہوئے نئے سرے سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

رہا حضورﷺ کا یہ فرمان کہ: ''مکہ اللہ کے شہروں میں سب سے بہترین اور اسے محبوب ہے۔'' تو یہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ابتداءِ اسلام تھی اور ابھی تک مدینہ پاک کو یہ عظمت نہیں دی گئی تھی پھر جب آپ طویل عرصہ تک یہاں ٹھہرے' اللہ نے آپ کا دین غالب فرما دیا اور جیسے کہ آگے آ رہا ہے مدینہ منورہ کو نت نئے ایسے فضائل عطا فرمائے جن کا اثر مکہ تک بھی پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اسی مدینہ کی برکت سے مکہ اور دیگر اسلامی شہروں پر فتح نصیب فرمائی چنانچہ اللہ نے اسے بہتریوں سے نوازا اور اس کی برکت کی بناء پر دوسرے شہروں میں برکتیں رکھ دیں جس سے پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے حق میں آپ کی دعا قبول فرمائی تھی چنانچہ اس کے بعد یہ سرزمین اللہ کی بہترین زمین بن گئی اور اسے محبوب لگی' یہی وجہ تھی کہ آپ مکہ فتح کر لینے کے بعد وہاں واپس تشریف نہیں لے گئے۔

سوال: اگر کوئی یہ کہے کہ آپ مکہ میں اس لئے واپس نہیں آئے کہ اللہ نے مدینہ میں آپ کے لئے ٹھہرنا لازم کر دیا تھا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ مدینہ کا قیام تو صرف اس بناء پر لازم کیا گیا کہ وہ سب سے افضل تھا اور حضورﷺ کو پیارا لگتا تھا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپ نے لوگوں کو اپنی اقتداء کا شوق دلایا اور یہاں ٹھہرنے پر ابھارتے رہے' اسی لئے فرمایا: ''مدینہ ان لوگوں کے لئے بہترین جگہ تھی بشرطیکہ انہیں اس بات کا علم ہو جاتا۔''

سوال: اگر یہ کہا جائے' علامہ تقی فاسی نے تو کہا ہے: ''ہمارے کچھ ہم عصروں کا خیال ہے کہ حضورﷺ نے اپنا یہ فرمان کہ ''مکہ اللہ کے سب شہروں سے بہتر ہے۔'' اس وقت فرمایا تھا جب آپ ہجرت کے لئے مکہ سے نکل آئے تھے۔'' تو یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اسی حدیث کے دوسرے طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یہ فرمان اس وقت کیا تھا جب آپ سواری پر مکہ سے باہر ایک ٹیلہ پر تشریف لے گئے تھے' حالانکہ ہجرت کرتے وقت آپ اس صورت سے نہیں نکلے تھے کیونکہ احادیث یہ بتاتی ہیں کہ آپ مکہ سے چھپ کر نکلے تھے اور اگر آپ سوار ہو کر مذکورہ مقام پر تشریف لے جاتے' جسے عوام ''غَــزْوَہ'' کہتے تھے تو آپ کے اس سفر کا ہر ایک کو پتہ چل جاتا۔

جواب: حضرت ابن زبالہ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے نکلنے کا حکم فرمایا تو آپ نے عرض کی تھی۔ ''اے اللہ! جیسے تو نے مجھے یہاں سے نکالا ہے۔'' (الحدیث) اور پھر ابن حبان کی روایت میں ہجرت کی حدیث بتاتی ہے کہ ''دونوں سوار ہوئے یعنی آپ اور حضرت ابوبکرؓ غار پر پہنچے (غار ثور) اور اس میں چھپ گئے۔'' اور ہجرت کی دوسری احادیث میں آ رہا ہے کہ آپ رات کے وقت غار کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور ان کفار کے گروہ کے سروں پر خاک ڈال آئے تھے جو آپ کی تاک میں جمع تھے' آپ نے ان سے چھپنے کے لئے سورۃ یٰسین کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں تو وہ آپ کو دیکھ نہ سکے چنانچہ ایسی صورت حال (ان سے پوشیدگی) میں یہ بات ماننے سے انکار ممکن نہیں کہ آپ اس مقام پر سوار ہوں۔

رہی یہ بات کہ مسجد مکہ کو دوگنا فضیلت حاصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فضیلت صرف دوگنا ثواب ہی سے ثابت نہیں ہوا کرتی کیونکہ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ عرفات کی طرف جاتے ہوئے پانچ نمازیں ادا کرنا اور قربانی کے دن منٰی میں نماز ظہر پڑھنا' مسجد مکہ میں نماز پڑھنے سے بھی بہتر ہے اگرچہ مسجد مکہ میں ادائیگی پر دوگنا ثواب تھا کیونکہ اتباع کرتے ہوئے وہ کچھ ملتا ہے جو اس سے بڑھ جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے' باوجودیکہ آپ مدینہ پاک کی فضیلت کے قائل تھے' یہ فرمایا تھا کہ مسجد مکہ میں دوگنا اجر ہے' مقصد یہ ہے مدینہ (جس پر مکہ کو فضیلت حاصل ہے) کو وہ مرتبہ حاصل ہے جو اس مکہ (جس کا ثواب دوگنا ہے) کو حاصل نہیں۔

اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو آگے آ رہا ہے کہ یہ دوگنا پن فرضوں اور نفلوں میں کو شامل ہوتا ہے حالانکہ نفل گھر میں پڑھنا افضلیت رکھتے ہیں علاوہ ازیں اگر دوگنا اجر بتانے والی حدیث میں مسجد حرام سے صرف کعبہ مراد ہو (جیسے اس کی طرف اشارہ آ رہا ہے) تو جواب یہ ہے کہ یہ بات مدینہ کے علاوہ دوسری مسجدوں کے بارے میں ہے جبکہ نبی کریم ﷺ مدینہ کے بارے میں دعا فرما چکے ہیں کہ اسے مکہ سے دوگنی برکت ملے اور اس برکت کے ساتھ دینی و دنیوی دو برکتیں حاصل ہوتی ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ قلیل عدد میں برکت ہوتی ہے تو وہ کثیر سے بھی زیادہ نفع بخش ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ طیبہ کو بہت سی برکتیں حاصل ہیں کیونکہ اس کی کثرت برکات کے لئے آپ کی دعائیں ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کر دیا ہے' فضیلت کعبہ اس کے آڑے نہیں آتی کیونکہ کلام اس کے علاوہ میں ہو رہی ہے' یہی وجہ ہے کہ حضرت مالک نے مؤطا میں لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عیاش مخزومی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ: ''تم اس بات کے قائل ہو کہ مکہ پاک مدینہ منورہ سے افضل ہے؟'' اس پر عبداللہ نے عرض کی تھی کہ یہ اللہ کی طرف سے حرمت و امن کی جگہ ہے اور یہاں بیت اللہ شریف موجود ہے! حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ میں حرمِ خدا اور بیت اللہ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا' دوبارہ پوچھا: تم ہی ہو جو مکہ کو مدینہ سے افضل قرار دیتے ہو؟ حضرت عبداللہ نے پھر وہی عرض کی کہ یہ اللہ کا حرم ہے' جائے امن ہے اور یہاں بیت اللہ ہے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ میں حرمِ خدا اور

بیت اللہ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا اور پھر وہاں سے چلے گئے' ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ابن عباس پر اظہار ناراضگی فرمایا اور وہاں سے چلے گئے۔

پھر فضیلت مدینہ پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا کہ مکہ میں حج کے مقامات (عرفات' مزدلفہ' منٰی وغیرہ) کیونکہ ان مقامات کی عظمت کعبہ سے تعلق رکھتی ہے اور پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ مکہ میں عمرہ کے عوض اللہ تعالیٰ نے مسجد قباء جانے پر ثوابِ عمرہ کا اجر رکھا ہے جیسے کہ آگے آ رہا ہے بلکہ حج کا اجر بھی رکھا ہے جیسے حدیث مرفوع آ رہی ہے کہ: ''جو صرف میری مسجد میں نماز کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا اور یہاں نماز پڑھ لی تو اس کا اجر حج جتنا ملے گا۔'' اور یہ تو عظیم حج ہوا کیونکہ یہ ایک آسان کام ہے اور دن میں کئی مرتبہ کیا جا سکتا ہے جبکہ حج تو بار بار نہیں کی جا سکتی اور اسی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد کعبہ میں دوگنا اجر صرف اسی کے لئے ہے جو خلوصِ دل سے نماز کا ارادہ کرے۔

پھر فضیلت مدینہ پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا کہ حضور ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد مدینہ پاک سے زیادہ عرصہ تک یہاں قیام فرمایا تھا (جیسے کہ اس میں اختلاف موجود ہے) کیونکہ مدینہ پاک میں آپ کا قیام دینِ الٰہی کے غلبے اور عظمت کا سبب بنا تھا' شریعت وہیں جاری ہوئی' اکثر فرائض وہیں لاگو ہوئے' دین الٰہی وہیں کمال کو پہنچا اور قیامت تک کے لئے حضور ﷺ نے اسی کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔

پھر ہر کوئی جانتا ہے کہ مدینہ سے حضور ﷺ کی محبت ایسی تھی جو مکہ کے لئے ثابت نہیں' وہاں کے قیام پر تو آپ لوگوں کو ابھارتے رہے اور وہاں فوت ہونے کا شوق دلاتے رہے' وہاں کی تکالیف اور سختیوں پر صبر کرنے کی تلقین فرماتے رہے جیسے عنقریب آگے آپ کو پتہ چل جائے گا' یہ حدیث بھی آ رہی ہے کہ فرمایا تھا: ''الٰہی ہماری آرزوئیں مکہ سے متعلق نہ رہیں۔'' اور یہ حدیث بھی ہے کہ: ''میری قبر کے لئے روئے زمین پر ایسی کوئی جگہ نہیں جو مدینہ سے افضل دکھائی دیتی ہو۔'' آپ کا اشارہ مدینہ کی طرف تھا اور تین مرتبہ فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس بات کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ ہم بھی اسی چیز سے محبت رکھیں جس سے رسول اللہ ﷺ محبت فرماتے تھے' ہم بھی اسی شے کو عظمت دیں جسے حضور ﷺ نے عظیم جانا اور پھر جب موتِ مدینہ کی فضیلت ثابت ہو گئی تو وہاں قیام کرنے والوں کی عظمت کھل کر سامنے آ گئی کیونکہ آپ کا بھی یہی طریقہ تھا چنانچہ طبرانی نے کبیر میں اور مفضل جندی نے فضائلِ مدینہ وغیرہ میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت لکھی ہے' آپ نے بتایا: میں اس بات کا گواہ ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ مدینہ' مکہ سے بہت افضل ہے۔

بخاری و مسلم میں بھی یہ حدیث آئی ہے' آپ نے فرمایا تھا کہ ''ایمان سمٹ کر مدینہ منورہ کی طرف یوں آ جائے گا جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ کر چلا جاتا ہے چنانچہ ہم ہر مسلمان کو دیکھ رہے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت کی وجہ سے مدینہ کو کھنچا چلا جاتا ہے' اس میں زمانہ کی قید نہیں کیونکہ آپ کے دور میں علم سیکھنے کے لئے لوگ وہاں کھنچے آتے تھے' صحابہ و تابعین کے دور میں ان کی اقتداء کے لئے آتے تھے اور ان کے بعد آپ کی زیارت کے لئے چلے آتے ہیں' آپ

کے شہر کی فضیلت کے لئے آتے ہیں' آپ کے نشانات دیکھ کر تبرک حاصل کرتے ہیں اور آپ کی طرح یہاں رہائش کے لئے آتے جاتے ہیں۔

ہم نے فضائل مدینہ میں حضرت جندی کی حدیث بیان کی کہ: ''جلدی ہی ایمان سمٹ کر مدینہ کی طرف آجائے گا جیسے سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ جاتا ہے۔'' مقصد یہ کہ ایمان یہیں ملے گا' ابنِ زبالہ نے یہ حدیث لکھی کہ: ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو سکے گی جب تک ایمان مدینہ میں ویسے جمع نہ ہوگا جیسے سیلاب گھاس پھوس کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔''

پھر اسماءِ مدینہ میں حدیثِ بخاری و مسلم گذر چکی ہے کہ: ''مجھے اس قریہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا جو تمام بستیوں کو کھا لے گی' لوگ تو اسے یثرب کہتے ہیں لیکن وہ مدینہ ہے۔''

ابن منذر کہتے ہیں' اس کے بستیوں کو کھا جانے میں احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد مدینہ کا سب شہروں پر غلبہ ہو' مطلب یہ ہے کہ عظیم المرتبہ مدینہ کے سامنے سارے فضائل گھل جاتے ہیں گویا معدوم ہو جاتے ہیں اور یہ بات مکہ کا نام ''اُمّ القرٰی'' رکھنے سے بہتر ہے کیو۔

قاضی عبد الوہاب نے بھی اس پیدا شدہ احتمال پر یقین کیا ہے' پھر حضرت بزاز نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حدیث روایت کی ہے' آپ نے فرمایا: ''شیطان اس بات سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں کہ میرے اس شہر میں کوئی ان کی عبادت کرے گا۔'' یعنی مدینہ میں اور جزیرۃ العرب میں لیکن وہ اُبھارتے رہیں گے۔'' اس بات کی اصل مسلم شریف میں حضرت جابر سے روایت شدہ حدیث ہے۔

حضرت ابو یعلی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے' آپ نے بتایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مدینہ منورہ سے چلا' آپ نے مجھ پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ کو شرک سے بچا لیا ہے۔'' ایک اور روایت میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس قریہ کو شرک سے پاک کر دیا ہے بشرطیکہ نجومی اسے گمراہ نہ کر دیں' فرمایا: اللہ بارش نازل فرماتا ہے تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم پر فلاں فلاں وجہ سے بارش ہوئی ہے۔'' اور پھر اسماءِ مدینہ کے بیان میں آ چکا ہے کہ مدینہ کا نام مؤمنہ اور مسلمہ ہے' اس کا ظاہری معنٰی لینے میں کوئی روکاوٹ نہیں کیونکہ یہ چیز مدینہ کی فضیلت میں داخل ہے اور خصوصاً اس لئے بھی یہ فضیلت میں شامل ہے کہ حضور ﷺ اسی مٹی سے پیدا ہوئے۔

حضرت ابوبکر ابہری مالکی رحمہ اللہ نے مدینہ کی مکہ پر فضیلت کے لئے اس چیز کو دلیل بنایا ہے جو اشارۃً گذر چکی کہ نبی کریم ﷺ خاکِ مدینہ سے پیدا ہوئے تھے' وہ افضل البشر تھے تو آپ کی مٹی ہر قسم کی مٹی سے افضل ہو گی۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آپ کی مٹی کے ہر قسم کی مٹی سے افضل ہونے میں کوئی جھگڑا نہیں' جھگڑا تو صرف اس بات میں ہے کہ کیا اس سے یہ بھی لازم آ جاتا ہے کہ مدینہ' مکہ سے افضل ہو جائے کیونکہ جو شے کسی شے سے تعلق رکھتی ہے تو اس شے میں فضیلت موجود ہونے کی بناء پر تعلق رکھنے والی چیز کو بھی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ جو

چیز مدینہ سے لگاؤ رکھتی ہے وہ یقیناً مکہ سے افضل ہو گی' یہ صرف اتفاقیہ بات نہیں' متقدمین علماء نے بھی یہی جواب دیا ہے لیکن یہ جواب محلِ نظر ہے۔انتہیٰ (عبارتِ ابن حجر ختم)۔

مین کہتا ہوں کہ ابنِ حجر نے محل نظر ہونے کی وجہ بیان نہیں کی' شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز اصل ہوتے ہوئے اپنی اصلیت کی قوت کی بناء پر افضل ہوتی ہے وہ اپنے ساتھ والی چیز کو اس تعلق کی بناء پر فضیلت دیتی ہے اور وہ یہاں تعلق والی شے سے متعلق میں نہیں پائی جاتی' آپ دیکھتے نہیں قرآن کی جلد کو قرآن سے تعلق کی بناء پر تو فضیلت حاصل ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ فضیلت جلد سے تعلق رکھنے والی چیز میں پائی جائے' علاوہ ازیں مدینہ پاک کی فضیلت اس بناء پر ہے کہ حضور ﷺ اس کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ بات مدینہ سے تعلق رکھنے والی کسی اور شے میں نہیں پائی جاتی۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲

مدینہ کی تکالیف پر صبر کرنے والے کو خوشخبری

حضور ﷺ نے یہاں قیام کرنے والوں' اس دوران آنے والی مصیبتوں اور مشقتوں پر صبر کرنے والوں کو بشارت دی اور بتایا کہ یہ گندگیوں اور گناہوں کو دور کرتا ہے پھر ان لوگوں کو عذابِ الٰہی کی اطلاع دی جو مدینہ منورہ اور اہلِ مدینہ کے ساتھ برا ارادہ کرے' نامناسب کام کی بنیاد رکھے یا ایسے شخص کو پناہ دے۔

صحیحین میں ہمیں یہ حدیث ملتی ہے کہ ''جو مدینہ میں پہنچنے والی مصیبت اور سختی پر صبر سے کام لے تو قیامت کے دن میں خود اللہ کے ہاں اس کے تکلیف جھیلنے کی گواہی دوں گا یا فرمایا کہ میں اس کی شفاعت کروں گا۔''

صحیح مسلم شریف میں حضرت مہری کے غلام' سعید بتاتے ہیں کہ وہ شدید گرمی کی راتوں میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس گئے' ان کے ساتھ مدینہ سے جلا وطنی کا مشورہ کیا' وہاں کی مہنگائی اور کثرتِ اولاد کی شکایت کی اور انہیں بتایا کہ وہ مدینہ کی ان تکالیف پر صبر نہیں کر پا رہے۔انہوں نے فرمایا: افسوس ہے! میں تمہیں یہاں سے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے یہ سن رکھا ہے کہ:

''جو شخص یہاں کی تکالیف اور مشقتوں پر صبر کرے گا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا فرمایا کہ میں اس کی تکالیف کی گواہی دوں گا۔''

ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ حضرت ابوسعید نے فرمایا تھا: ''ایسا نہ کرو بلکہ مدینہ ہی میں رہو۔''

مسلم شریف' مؤطا اور ترمذی شریف میں حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت یحنس رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ وہ فتنہ کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاں بیٹھے تھے' آپ کی ایک لونڈی نے آپ کو سلام کہا اور کہنے لگی: اے ابوعبدالرحمٰن! ہمیں تو سخت تنگی کی سامنا ہے' میں چاہتی ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤں۔انہوں

نے فرمایا: اری بے سمجھ یہیں رہو۔ ترمذی شریف میں اس کی بجائے یہ الفاظ ہیں' اری بے سمجھ! صبر سے کام لو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا ہے' فرماتے تھے: ''جو شخص مدینہ کی تکالیف اور سختیوں پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کی گواہی دوں گا یا فرمایا کہ شفاعت کروں گا۔''

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ روایت میں ''شفاعت کروں گا یا شہادت دوں گا۔'' کا تردد کیوں ہے (ایک ہی بات کیوں نہیں فرمائی؟) اور اس شفاعت کا مطلب کیا ہے حالانکہ آپ تو سب اُمت (بلکہ اُمتوں) کی شفاعت فرمائیں گے؟

جواب: میں کہتا ہوں' اس کا جواب حضرت عیاض رحمہ اللہ نے دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ایک شیخ نے لفظ ''او'' راوی کی طرف سے شک کی بناء پر ذکر کیا ہے حالانکہ ظاہراً ایسا نہیں ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ لفظِ ''او'' حضور ﷺ نے خود فرمایا تھا' اب یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو ایسے ہی بتا دیا گیا تھا یا پھر ''او'' کا لفظ تقسیم کے لئے لیں گے چنانچہ حضور ﷺ گناہگاروں کی تو شفاعت فرمائیں گے (اگر وہ گنہگار ہونگے) اور اطاعت گذاروں کی گواہی دیں گے یا اس کا مطلب یہ لیں گے کہ آپ ایسے لوگوں کی تو شہادت دیں گے جو آپ کی زندگی مبارک میں فوت ہوں گے اور ایسے لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے جو آپ کے بعد فوت ہوں گے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ یہ شفاعت یا شہادت' قیامت میں گنہگاروں کی عام شفاعت اور اعمال والوں کی شفاعت کے علاوہ ہوگی اور شہادت اس کے علاوہ ہوگی جو آپ تمام امتوں کے بارے میں دیں گے چنانچہ آپ کی یہ شفاعت وشہادت ان تکالیف جھیلنے والوں کے لئے خصوصی شان بن جائیگی۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ ''او''، ''واو'' کے معنٰی میں ہو (یعنی میں تکالیف جھیلنے والوں کی شفاعت بھی کروں گا اور ان کی شہادت بھی دوں گا)۔

میں کہتا ہوں کہ اس معنٰی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جسے بزاز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' آپ نے یہ الفاظ فرمائے تھے: ''جو شخص مدینہ کے مصائب اور سختی پر صبر کرے گا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت بھی کروں گا اور اس کی شہادت بھی دوں گا۔'' ابن النجار نے حدیث کے الفاظ یوں دیئے ہیں کہ ''میں اس کی شفاعت کروں گا اور قیامت کے دن اس کی شہادت دوں گا۔''

مفضل جندی نے فضائلِ مدینہ میں اس کی سند حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی کی ہے' الفاظ یہ ہیں ''جو شخص مصائب مدینہ پر صبر کرے گا' ایک روایت میں فرمایا: ''اس کی گرمی پر صبر کرے گا تو میں اس کی شفاعت کروں گا اور اس کی شہادت دوں گا۔''

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ''جب ہم لفظِ ''او'' شک کے معنٰی میں لیں تو اب شہادت کا لفظ لینے سے شہادت سے مراد وہ زائد شہادت ہوگی جو آپ عام اُمتوں پر دیں گے اور جو ان کے لئے آپ کی طرف

ذخیرہ شدہ ہوگی اور اگر لفظ شفاعت کو لیں تو اس سے مراد عام لوگوں کے علاوہ شفاعت ہوگی جو اہلِ مدینہ کے لئے خاص ہوگی' اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے گا' حساب و کتاب میں نرمی برتے گا یا انہیں طرح طرح کے اعزاز و انعامات سے نواز دیگا مثلاً انہیں عرش کے سائے میں رکھے گا یا انہیں آرام و راحت دے گا انہیں منبروں پر بٹھایا جائے گا: جلد ہی جنت میں پہنچا دیا جائے گا یا ایسی ہی خصوصی عزتیں دے گا۔

میں کہتا ہوں' یہ بھی احتمال ہے کہ حضور علیہ السلام کی شفاعت و شہادتِ خاصہ کی بناء پر اللہ انہیں ایسے انعامات سے سرفراز فرما دے کیونکہ آپ کا مرتبہ عظیم ہے اور کرم وسیع ہے اور پھر ہمسائے کے بارے میں آپ کی طرف سے وصیت کی تاکید اس معنٰی کی تائید کرتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی طرف سے انہیں حالتِ اسلام میں موت کی بشارت ہو کیونکہ آپ کی شفاعت اور یہ شہادت صرف اہلِ اسلام کے ساتھ خاص ہیں اور یہ ان کے لئے بہت بڑا انعام ہوگا۔ آٹھویں باب کی ابتداء میں اس معنٰی کی طرف اشارہ آ رہا ہے۔

پھر مؤطا اور بخاری و مسلم میں حدیث ہے: ''یمن فتح ہوگا تو ایسی قوم آئیگی جو تیزی سے مال مویشی ہانکیں گے اور یہ لوگ اپنے اہل وعیال اور اطاعت گذاروں کو ساتھ لے چلیں گے حالانکہ اگر انہیں معلوم ہو سکے تو مدینہ ان کے لئے بہتر ہوگا۔'' (الحدیث)۔

مدینہ کھوٹ اور میل دور کر دیتا ہے

مسلم شریف میں ہے: ''لوگوں پر ایک ایسا دور آئے گا کہ آدمی اپنے چچا زاد یا قریبی سے کہے گا آؤ کہیں خوشحالی تلاش کریں حالانکہ اگر انہیں پتہ چل سکے تو مدینہ ہی ان کے لئے بہتر ہوگا' اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہاں سے اگر کوئی اظہارِ نفرت کر کے چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اس سے اچھے کو لے آئے گا' لو سنو! مدینہ طیبہ ایک بھٹھی کی طرح کا ہے جو میل کچیل صاف کر دیتا ہے' قیامت تب تک قائم نہ ہوگی جب تک مدینہ شریر لوگوں کو وہاں سے نکال نہیں دے گا جیسے بھٹھی لوہے کا میل صاف کر دیتی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے ''مجھے اس قریہ کی طرف ہجرت کا کہا گیا ہے جسے لوگ یثرب کہتے ہیں حالانکہ اس کا نام تو مدینہ ہے' یہ لوگوں کی صفائی یوں کر دے گا جیسے بھٹھی لوہے کے میل کو صاف کر دیتی ہے۔''

ابن زبالہ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ ''مدینہ آدمیوں کی میل کچیل صاف کر دیتا ہے' ایک اور روایت میں ہے کہ ''اہلِ مدینہ کی میل اتارتا ہے جیسے بھٹھی لوہے کا میل اتار دیتی ہے۔'' بخاری شریف میں یہ حدیث ہے کہ ''یہ طیبہ ہے' گناہوں کی میل ایسے اتار دیتا ہے جیسے لوہے کی بھٹھی لوہے کی میل اتار دیتی ہے۔''

بخاری و مسلم شریف میں ایک اعرابی کا قصہ موجود ہے کہ وہ صبح کے وقت بحالتِ بخار حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ

''میری بیعت توڑ لو''، آپ نے انہیں مانا تو وہ چلا گیا' اس پر آپ نے فرمایا: ''مدینہ بھٹی جیسا ہے جو کھوٹے کو نکالتا اور پاک صاف سے خلوص برتتا ہے۔''

اس حدیث میں اَقِلْنِیْ بَیْعَتِیْ کے الفاظ آئے ہیں کہ ''میری بیعت توڑ لو'' جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے کیا عہد توڑ لو کہ میں اپنے وطن کو چلا جاؤں' شائد اس نے مدینہ میں قیام کے معاہدہ پر ہجرت کی تھی۔ حدیث میں الفاظ ہیں تَنْفِیْ خَبَثَھَا اس میں احتمال یہ ہے کہ کھوٹے کے لئے اس میں جھڑک ہو اور مدینہ سے دور کرنے کا مفہوم ہو' اس اعرابی کا یہ قصہ اس معاملے میں ظاہر ہے' ابن عبد البر نے اسے حضور ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن علامہ نووی کے مطابق اس زمانہ سے تخصیص نہیں ہے چنانچہ صحیح بخاری میں آیا ہے۔ ''قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہو گی جب تک مدینہ' شریر لوگوں کو نکال باہر نہیں کریگا۔'' یعنی جب دجال کا ظہور ہوگا۔ عنقریب پانچویں فصل میں احمد وغیرہ کی حدیث میں ان لوگوں کے مدینہ سے نکلنے کا قصہ آئے گا جو منافق ہوں گے اور دجال سے جا ملیں گے۔ پھر فرمایا کہ وہ خلاصی کا دن ہوگا اور ایسا دن ہوگا جس میں مدینہ گندگی اور میل نکال باہر کرے گا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے نکلتے وقت ڈرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا تھا ''کیا تمہیں یہ خوف ہے کہ ہم ان میں سے ہیں جنہیں مدینہ نکال باہر کرتا ہے۔'' کیونکہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مدینہ پاک کو ان لوگوں سے پاک کر دیا تھا جو وہاں دینِ اسلام کے مخالف تھے اور وہاں کے منافقوں کو ہلاک کر دیا تھا اور یہی وہ لوگ تھے جو کامل طور پر کھوٹے تھے' اور جو ان کے علاوہ آخر تک خبیث اور گناہگار تھے' انہیں وہاں سے ہانک کر دور بھگا دینا یوں ہوتا تھا کہ فرشتے انہیں ہانک کر کسی اور سرزمین کی طرف لے جاتے تھے جیسے القشیری نے کہا: حضور ﷺ کے فرمان تنفی خبثھا و تنفی الذنوب میں مضاف حذف ہے مطلب یہ ہے کہ مدینہ اہلِ خبث اور اہلِ ذنوب (گناہ) کو نکال باہر کرتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مدینہ کامل خبیث لوگوں کو نکالتا ہے' ایسے لوگ نہایت بدبخت اور کافر ہوتے ہیں' اہلِ سعادت اور اہلِ اسلام نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ پہلی قسم نہ تو شفاعت کے لائق ہے اور نہ ہی بخشش کے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں مرنے والے سے شفاعت کا وعدہ کر رکھا ہے لہٰذا لازم ہے کہ قسمِ اوّل کو یہاں سے نکال دے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ شر سے لوگوں کو خلاصی دیتا ہے اور لذات دنیویہ کی طرف جانے نہیں دیتا کیونکہ یہاں مشکلات اور سختی ہوتی ہے' اس معنٰی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے۔'' یہ طیبہ ہے جو گناہوں کو دور کر دیتا ہے۔'' اور مدینہ کا گناہوں سے بچانا اپنے ظاہری معنٰی پر ہوگا بالخصوص ایسے میں جبکہ اس میں دوگنا تک اجر دیا جاتا ہے' طرح طرح کا ثواب ملتا ہے اور مسلسل رحمتیں ہوتی رہتی ہیں (تو انسان گناہ کے قریب کیونکر جا سکے گا) اور اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ

''بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

علاوہ ازیں ان اہلِ مدینہ کے لئے خصوصی شفاعت وشہادت کا انعام ہے اور برکتیں ہی برکتیں ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مدینہ ایسے شخص کو چھپا نہیں رہنے دیتا جس میں میل ہو بلکہ اس کی منافقت ظاہر ہو کر رہتی ہے جیسا کہ مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ آج تک میں نے واضح طور پر یہ معنٰی بیان کرتے کسی کو نہیں دیکھا' میرے ذہن میں یہ معنٰی عرصۂ دراز سے محفوظ چلا آتا ہے اور صحیح بخاری میں غزوۂ احد کے متعلق واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے' واقعہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ احد کی طرف چلے تو آپ کے ساتھ چلنے والے کچھ لوگ واپس مڑ آئے' یہ منافق تھے' اس پر آپ نے فرمایا کہ "مدینہ لوہار کی بھٹھی کی طرح ہے۔" اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ کا نام فَاضِحَہ (رسوا کرنے والا) ہے جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔

جہاں تک بہت سی احادیث اور اس شہرِ منور کے حالات کا تعلق ہے' مجھے تو یہی معلوم ہوا ہے کہ یہ چاروں طرح سے میل دور کرتا رہتا ہے۔

اہلِ مدینہ سے ارادۂ بد کرنے والوں کو ڈانٹ

صحیح مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں ہے کہ "جو بھی اہلِ مدینہ کے ساتھ ارادۂ بد کرتا ہے' اللہ تعالٰی آگ میں اسے یوں پگھلائے گا جیسے سیسہ پگھلاتا ہے یا پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔"

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں موجود لفظ "فِی النَّارِ" ان احادیث سے اشکال دور کر دیتا ہے جن میں یہ لفظ موجود نہیں' یہ لفظ بتاتا ہے کہ یہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔

قاضی فرماتے ہیں' اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص حیاتِ نبی کریم ﷺ میں اہل مدینہ سے ارادۂ بد کرتا تھا تو مسلمانوں کے لئے اللہ کافی تھا اور اس کا فکر یوں گھل جاتا تھا جیسے سیسہ (قلعی یا سکہ) پگھل جایا کرتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے' اس کا مقصد یہ ہو کہ جو شخص مدینہ کے قریب تباہی اور دھوکا دہی کے لئے ہوتا ہے تو اسے کامیابی نہیں ہوتی البتہ کھل کر ایسا کرے تو کامیابی ممکن ہے۔

قاضی فرماتے ہیں کہ الفاظِ حدیث آگے پیچھے ہو سکتے ہیں' معنٰی یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰی ایسے شخص کو یوں پگھلا دے گا جیسے سیسہ آگ میں پگھل جاتا ہے اور ایسا اس شخص سے ہوگا جو دنیا میں اس سے برا ارادہ کرے گا چنانچہ اللہ تعالٰی اسے ڈھیل نہیں دے گا اور نہ ہی کامیاب ہونے دے گا بلکہ جلد ہی ان کی پکڑ فرمائے گا جیسے دور بنو امیہ میں مسلم بن عقبہ کا کام تمام ہو گیا تھا کہ وہ مدینہ سے واپسی پر ہلاک کر دیا گیا' پھر اس کے بعد ہی یزید بن معاویہ ہلاک ہوا جس نے اسے بھیجا تھا اور دیگر لوگ ہلاک ہوئے جنہوں نے افعالِ بد کئے تھے۔ انتہٰی۔

یہ آخری احتمال سب سے راجح ہے کیونکہ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں کہ جس سے پتہ چلتا ہو کہ اس کا ارادۂ بد پورا نہ ہوگا بلکہ اسے ہلاک کرنے کا وعدہ ہے اور مدینہ طیبہ کی ہمارے اس دور تک یہی حالت چلی آ رہی ہے کہ جب

بھی کسی عیاش جھوٹے نے مدینہ پاک سے ارادۂ بد کیا تو اسے وہاں سے نکالنے کا الٰہی فیصلہ ہو گیا اور ان کے کثیر سرکشوں کو مختصر مدت میں اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس بارے میں احادیث سے مراد دونوں طرح پگھلانے کو جمع کر دیا گیا ہے چنانچہ دنیا میں پگھلانا تو یہ ہے کہ انہیں ہلاک کر دیتا ہے اور آخرت میں پگھلانے کا مقصد یہ ہے کہ انہیں آگ میں پگھلا دے گا' اس مذکورہ حدیث میں دوسرا معنٰی مراد ہے اور اس کے علاوہ حدیثوں میں اول (ہلاک کرنا) معنٰی مراد ہے چنانچہ دیکھئے: احمد کی روایت میں یہ جملہ ہے کہ مَنْ اَرَادَھَا بِسُوْءٍ یعنی جو مدینہ سے برا ارادہ رکھتا ہے اَذَابَهُ اللّٰهُ كَمَا يَذُوْبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ کہ اللہ تعالیٰ اسے ایسے پگھلا دیتا ہے جیسے پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔ یونہی مسلم شریف میں ہے اور پھر فضائلِ مدینہ میں علامہ جندی سے حدیث میں ہے۔ ''جس جابر نے بھی مدینہ پاک سے برا ارادہ رکھ لیا' اللہ تعالیٰ اسے یوں پگھلا دیتا ہے جیسے نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔'' پھر مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''جو بھی اس شہر کے بارے میں ارادۂ بد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے یوں پگھلا دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔'' مسلم ہی کی ایک اور روایت ہے۔ ''جو اس شہر کے بارے میں حملے یا برائی کا ارادہ کرتا ہے۔'' اور پھر بزاز نے بہتر سند سے حدیث بتائی ہے کہ ''الٰہی! اہلِ مدینہ کی طرف سے تو ان دشمنوں کے حملے کو سختی سے روک دے' جو بھی اس سے برا ارادہ کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ اسے ایسے پگھلا دیتا ہے جیسے پانی میں نمک حل ہو جاتا ہے۔

بخاری شریف میں یہ حدیث ہے: ''جو بھی اہلِ مدینہ سے کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گا وہ ایسے پگھل جائے گا جیسے پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔''

حضرت ابنِ زبالہ نے حضرت سعید بن میسب رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بتائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف نظر اُٹھائی اور ہاتھ اُٹھا دیئے جس میں آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی' پھر فرمایا: ''اے اللہ! جو بھی اہلِ مدینہ پر ظلم کرے' اسے جلد ہلاک فرما دینا۔''

حضرت طبرانی نے اوسط میں یہ حدیث دی ہے: ''اے اللہ! جو بھی اہلِ مدینہ پر ظلم کرے اور انہیں ڈراتے تو تو بھی اسے خوفزدہ فرما' اس پر اللہ' اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہو' اس سے مال اور بدلہ قبول نہیں کیا جائیگا۔''

ان کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے۔'' جو اہلِ مدینہ کو خوفزدہ کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن خوفزدہ فرمائے گا اور اس سے سخت ناراض ہوگا' اس سے مال اور بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔''

امام نسائی نے یہ حدیث لکھی ہے: ''جو بھی اہلِ مدینہ پر ظلم کرتے ہوئے انہیں خوفزدہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے خوفزدہ کر دے گا اور اس پر اللہ کی لعنت ہو گی۔'' یونہی ابنِ حبان کی روایت ہے۔

حضرت احمد نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ''فتنہ برپا کرنے والوں میں سے

ایک امیر مدینہ میں آیا' حضرت جابر کی بینائی ختم ہو چکی تھی' آپ سے کہا گیا' کتنا اچھا ہو کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں' آپ اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان نکل گئے اور ایک طرف ہو کر کہا: ''وہ شخص برباد ہو جس نے رسول اللہ ﷺ کو خوفزدہ کیا۔'' اس پر آپ کے دونوں یا ایک بیٹے نے کہا' اے باپ! یہ رسول اللہ ﷺ کو خوفزدہ کیسے کر سکتا ہے' وہ تو وصال فرما چکے؟ انہوں نے کہا' میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' فرماتے تھے: ''جو شخص اہلِ مدینہ کو خوفزدہ کرے تو گویا اس نے پہلو میں موجود میرے دل کو خوفزدہ کیا۔''

بسر بن ارطاۃ کی مدینہ پر چڑھائی

میں کہتا ہوں' ظاہر یہ ہے کہ اوپر جس امیر کا ذکر ہوا' وہ بسر بن ارطاۃ تھا علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ ابن عبد البر کی روایت میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم مقرر کرنے کے بعد بسر بن ارطاۃ کو لشکر دے کر بھیجا' وہ مدینہ پہنچا' ان دنوں مدینہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے امیر تھے۔ حضرت ابو ایوب بھاگے اور حضرت علی کے پاس پہنچے' بسر مدینہ میں داخل ہوا اور اہلِ مدینہ سے کہنے لگا' اگر امیر المؤمنین نے مجھ سے عہد نہ لیا ہوتا تو میں اس کے ہر ذی شعور کو قتل کر دیتا۔ اس کے بعد اہلِ مدینہ کو حکم دیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں پھر بنو سلمہ کو پیغام بھیجا کہ تمہارے لئے میرے ہاں نہ تو امن ہے اور نہ ہی تمہاری بیعت لونگا جب تک تم جابر بن عبد اللہ کو میرے پاس نہیں لے آتے' حضرت جابر کو پتہ چل گیا' وہ چلے اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ زوجۂ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے' عرض کی' آپ کی رائے کیا ہے کیونکہ لگتا ہے یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے' یہ گمراہی کی بیعت ہو گی۔ انہوں نے کہا: میرا مشورہ یہ ہے کہ تم بیعت کر لو کیونکہ میں بھی عمر بن ابو سلمہ کو بیعت کا کہہ چکی ہوں چنانچہ حضرت جابر آئے اور بسر سے بیعت کر لی' بسر نے مدینہ میں کچھ گھر گرائے اور چلتا بنا۔

ایک اور روایت جو پانچویں فصل میں آ رہی ہے' اس میں ہے کہ اس دن اہلِ مدینہ بھاگے اور بنو سلیم کے حرہ (پتھریلی زمین) میں داخل ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

طبرانی کی کبیر میں حدیث ہے کہ ''جو شخص اہلِ مدینہ کو تکلیف دے گا' اللہ تعالیٰ اسے تکلیف دے گا۔'' علاوہ ازیں اس پر اللہ' فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہو گی اور اس سے مال اور بدلہ میں کچھ دینا قبول نہیں کیا جائے گا۔''

ابن نجار رحمہ اللہ نے یہ حدیث لکھی ہے: ''جو ظالمانہ طور پر اہلِ مدینہ کو خوفزدہ کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے خوفزدہ کرے گا' اس پر اللہ' اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہو گی' اللہ تعالیٰ اس سے نہ تو مال قبول کرے گا اور نہ ہی بدلہ۔'' اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث ملتی ہیں۔

اس شخص کو ڈانٹ جو مدینہ میں برا کام کر دکھائے

صحیحین میں مدینہ کے احترام کی احادیث میں ہے کہ" جو اس میں نیا کام کر دکھائے یا ایسے کرنے والے کو ٹھکانہ مہیا کرے تو اس پر اللہ' فرشتوں اور تمام لوگوں کی طرف سے لعنت ہو گی' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے نہ تو مال قبول کرے گا اور نہ بدلہ۔" بخاری کے الفاظ ہیں کہ اس سے مال اور بدلہ قبول نہ ہو گا۔

کہتے ہیں کہ (حدیث میں موجود لفظ) "صرف" کا مطلب فریضہ ہے اور "عدل" سے مراد عبادت اور یہ جمہور علماء سے نقل کیا گیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کا الٹ مراد ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ "صرف" توبہ کو کہتے ہیں اور "عدل" سے مراد فدیہ ہے۔ معنی یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو اس کے فرض قبول کرے گا نہ نوافل اور نہ ہی اس کی توبہ پر راضی ہو گا' نہ ہی اسے فدیہ دینے کے لئے کچھ ملے گا خواہ یہودی ہو یا نصرانی جبکہ دوسرے گناہگاروں سے ایسا نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے پھر اس لعنت کا مطلب ہے اللہ کی رحمت سے بہت زیادہ دوری اور ابتداء ہی میں جنت سے پچھاڑ دیا جائیگا کیونکہ یہ بھی تو کفار کو لعنت کرنے کی طرح ہے۔

حضرت قاضی کہتے ہیں حدیث میں موجود الفاظ مَنْ اَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا کا مطلب ہے کہ جس نے اس میں گناہ کا کام کیا یا گناہ کرنے والے کو پناہ دی' اسے گلے لگایا اور اس کی حمایت کی۔ 'اوی کا لفظ مد کے ساتھ بھی ہے اور بغیر مد بھی۔ قاضی کہتے ہیں' اس سے لوگوں نے یہ دلیل لی ہے کہ یہ کام کبیرہ گناہ ہے کیونکہ لعنت' کبیرہ گناہوں ہی پر ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مدینہ میں صغیرہ گناہ کسی دوسرے مقام پر کئے گئے کبیرہ گناہ جیسا ہوتا ہے کیونکہ اسے گناہ تو کہہ دیا گیا بلکہ علامہ زرکشی نے حضرت مالک سے جو نقل کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث مذکور مکروہ کام کو بھی شامل ہو جیسے ہم نے اصل میں بیان کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کے سامنے برا کام کرنا وہ حیثیت نہیں رکھتا جو مملکت کے کسی اور حصے میں ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضور ﷺ کی بارگاہ میں ادب نصیب فرمائے' ہم پر احسان فرمائے اور کرم فرمائے۔

تیسری فصل

اس میں اہل مدینہ کی حفاظت اور انکی عزت پر زور اور وہاں مرنے کا شوق دلایا گیا ہے

اہلِ مدینہ کی حفاظت کے لئے وصیتِ نبوی ﷺ

ابن النجار کی کتاب سے ہمیں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ یہ حدیث ملتی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مدینہ میری ہجرت کا مقام ہے' اسی میں میری جائے دفن ہے اور یہیں سے مجھے اُٹھنا ہے' میری امت پر

لازم ہے کہ میرے پڑوسیوں کی حفاظت کریں جب تک وہ کبیرہ گناہوں سے بچے رہیں۔ جو ان کی حفاظت کرے گا' میں قیامت کے دن اس کا گواہ بنوں گا یا شفاعت کروں گا اور جو ان کی حفاظت نہیں کرے گا' اسے دوزخ کی پیپ پلائی جائے گی۔''

علامہ مزنی سے پوچھا گیا کہ حدیث میں لفظ ''طینۃ الخبال'' کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اہلِ دوزخ کو ملنے والی پیپ ہوگی۔

قاضی ابوالحسن علی ہاشمی اپنی فوائد میں روایت لیتے ہیں کہ حضرت خارجہ کے والد زید رضی اللہ عنہما نے بتایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ میری جائے ہجرت اور آخری ٹھکانہ ہے' وہیں سے میں نکلوں گا لہٰذا میری اُمت پر لازم ہے کہ میرے ہمسائیوں کی حفاظت کرے' جو میری اس نصیحت کو یاد رکھے گا' میں قیامت کے دن اس کی گواہی دوں گا اور جو اس وصیت کو ضائع کر دے گا' اسے اللہ تعالیٰ جہنمیوں کی پیپ پر وارد کرے گا۔'' پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! یہ حوضِ خبال کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ اہلِ جہنم کی پیپ کا حوض ہے۔

ابن زبالہ نے حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو میری جائے ہجرت بنایا ہے' وہیں میرا آخری ٹھکانہ ہے اور اسی سے میں اٹھایا جاؤنگا لہٰذا میری امت پر لازم ہے کہ میرے پڑوسیوں کی حفاظت کریں جب تک وہ کبیرہ گناہوں سے بچتے رہیں تو جس نے ان کے بارے میں میری عزت کا خیال رکھا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور جو ان کے بارے میں میری حرمت کا خیال نہیں کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے اہلِ جہنم کی پیپ کے حوض میں ڈال دے گا۔

انہی سے یہ روایت ہے کہ ''مدینہ میری ہجرت کا مقام ہے' یہیں میری وفات ہو گی اور یہیں سے مجھے حشر میں جانا ہو گا لہٰذا میری اُمت پر لازم ہے کہ جب تک میرے ہمسائے کبیرہ گناہ نہ کریں تب تک اُن کی حفاظت کریں اور جو ان کے بارے میں میری عزت کا خیال رکھے گا' میں قیامت کے دن اس کا گواہ بنوں گا یا شفاعت کروں گا۔''

حضرت عیاض رحمہ اللہ کی مدارک میں ہے' حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت مالک سے سنا' کہتے تھے کہ میں سلطان مہدی کے پاس گیا تو وہ کہنے لگا: مجھے کوئی وصیت کیجئے' میں نے کہا کہ تجھے ایک اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے اہلِ شہر اور ہمسائیوں سے مہربانی کرنا کیونکہ ہمیں یہ حدیث ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''مدینہ میری ہجرت کا مقام ہے' یہیں سے میں اٹھوں گا اور میری قبر یہیں ہو گی' یہاں رہنے والے میرے ہمسائے ہیں تو میری امت پر لازم ہے کہ میرے ہمسائیوں کی حفاظت کریں لہٰذا جو میری وجہ سے ان کی حفاظت کرے گا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کا گواہ بنوں گا اور جو میرے ہمسائیوں کے بارے میں میری وصیت کو یاد نہیں رکھے گا' اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی پیپ کے حوض سے پلائے گا۔

حضرت مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے' مدینہ میں قبر کھودی جا رہی

تھی' ایک آدمی نے قبر میں جھانکا اور کہنے لگا: مؤمن کا ٹھکانا برا ہے۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے بہت بری بات کہی ہے۔وہ آدمی بولا' میرا ارادہ وہ نہیں (جو آپ نے خیال فرمایا) میں نے راہِ خدا میں قتل ہونے کے متعلق عرض کیا ہے۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ راہِ خدا میں قتل ہو جانے کی تو مثال ہی نہیں ملتی' اس مدینہ جیسی روئے زمین پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مجھے اپنی قبر بنانا پسند ہو۔'' تین مرتبہ فرمایا۔

اخبارِ مکہ میں ابن شبہ کے مطابق حضرت سعید بن ابو ہند نے بتایا' میرے والد بتاتے تھے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو یہ دعا کی: ''اے اللہ! جب تک ہم مکہ سے نکل نہیں جاتے' یہاں ہمیں کوئی غرض نہ پڑے۔''

حضرت مالک' امام بخاری اور رزین عبدری رحمھم اللہ کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی: ''الٰہی! مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب فرما اور میری موت تیرے رسولِ پاک ﷺ کے شہر میں ہو۔'' حضرت رزین کہتے ہیں کہ یہ حضرت عمر کی بڑی دعا تھی۔

اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ انسان اسی مٹی میں دفن ہوتا ہے جس سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ' آپ کے اکثر اور افضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ پاک کی مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔پھر یہ حدیث بھی موجود ہے: ''جو مدینہ میں فوت ہو گا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا۔'' علامہ بیہقی نے یہ حدیث ان الفاظ سے بتائی ہے: ''جو مدینہ میں فوت ہو جانے کی ہمت رکھتا ہے' اسے وہیں مرنا چاہیئے کیونکہ جو مدینہ میں فوت ہو گا' میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کا گواہ بنوں گا۔''

ترمذی شریف' ابن حبان' ابن ماجہ' بیہقی اور عبد الحق نے یہ صحیح حدیث لکھی ہے: ''جس میں یہ استطاعت ہو کہ مدینہ میں مر سکے تو اسے یہیں مرنے کا سامان کرنا چاہیئے کیونکہ میں یہاں مرنے والے کی شفاعت کروں گا۔'' ابن ماجہ نے ''میں اس کی گواہی دوں گا'' کے الفاظ لکھے ہیں۔طبرانی نے کبیر میں سندِ حسن سے یہ روایت کی کہ جس میں ہمت ہو کہ مدینہ میں فوت ہو سکے تو اسے یہیں مرنے کی خواہش کرنی چاہیئے کیونکہ یہاں جو بھی مرے گا' میں اس کا قیامت کے دن گواہ ہوں گا یا شفاعت کروں گا۔یہی روایت ابنِ رزین نے کی ہے البتہ یہ الفاظ بڑھائے ہیں کہ: ''سب سے پہلے زمین پھٹے گی تو میں باہر نکلوں گا' پھر ابوبکر اور پھر عمر نکلیں گے پھر میں اہلِ بقیع کے پاس جاؤں تو وہ نکل پڑیں گے پھر میں اہلِ مکہ کی انتظار کروں گا اور یوں میرا حشر اہلِ حرمین کے مابین ہو گا۔'' ابن النجار کی روایت میں الفاظ یوں ہیں: ''چنانچہ میں نکلوں گا' ابوبکر و عمر نکلیں گے اور بقیع کی طرف جائیں گے تو وہ نکل آئیں گے پھر اہلِ مکہ کا حشر ہو گا۔'' طبرانی کی حدیث یہ ہے: ''میں سب سے پہلے اپنی اُمت میں سے اہلِ مدینہ کی شفاعت کروں گا' پھر اہلِ مکہ کی اور پھر اہلِ طائف کی۔''

بہرحال مدینہ میں موت کی ترغیب اس سے زیادہ کسی اور حدیث میں نہیں ملتی اور یہ موقع یہاں کی رہائش ہی سے بن سکتا ہے چنانچہ یہاں رہائش کی ترغیب بھی پائی جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چل رہا ہے کہ یہ فضیلت کسی اور مقام میں

نہیں ہے۔ پہلے اکابر کی یہاں رہائش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہیں مرنے کی کوشش میں رہتے تھے پھر اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کے دور میں یہاں کی رہائش اور زیادہ افضل تھی۔

ابن شبہ نے اخبار مکہ میں حضرت اسماعیل بن سالم رحمہ اللہ سے روایت کی' انہوں نے بتایا کہ میں نے عامر سے اس فتویٰ کے بارے میں دریافت کیا جو حبیب بن ابی ثابت نے دیا تھا' اس پر کہنے لگے: کیا حبیب اپنے آپ کو فتویٰ نہیں دیتے کیونکہ جب وہ مکہ میں داخل ہوئے تو وہ جنگل سا تھا' مجھے تو یہی بات پسند ہے کہ مکہ میں اُتروں کیونکہ یہ وہ بستی ہے جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی تھی۔

حضرت شعبی رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مکہ میں قیام کو مکروہ جانتے تھے' وہ فرماتے تھے کہ "یہ اعرابی آبادی ہے جہاں سے حضور ﷺ نے ہجرت فرمائی تھی۔" پھر کہا کیا حبیب اپنے آپ سے نہیں پوچھتے کیونکہ وہ مکہ کے پڑوس میں اس وقت رہے جب یہ جنگل سا تھا۔

حضرت عبد الرزاق نے اپنی "مصنف" میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ یہاں حج کر کے واپس چلے جاتے' پھر واپس آتے' عمرہ کرتے اور واپس چلے جاتے' یہاں رُکتے نہیں تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اب تک میں ایسی کوئی روایت نہیں دیکھ سکا جس میں مدینہ شریف کے اندر رہائش کی کراہت لکھی ہو جبکہ مکہ کے بارے میں یہ ثابت ہے البتہ حضرت نووی کی شرح مسلم میں اس کے خلاف روایت ملتی ہے' شاید انہوں نے مدینہ پاک کو مکہ پر قیاس کیا تھا کیونکہ اس کراہت کی علّت مدینہ میں یوں موجود ہے کہ یہاں بھی تھک جانے' احترام نہ رکھ سکنے اور گناہ کے امکان کی صورت موجود ہے کیونکہ یہاں گناہ کرنا بہت بُرا ہے چنانچہ اسی لئے انہوں نے کہا: بہتر یہ ہے کہ ان دونوں مقامات پر رہائش کو مستحب کہا جائے اور یہ بھی اس وقت تک کہ گمانِ غالب میں مذکور کوتاہیوں میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو (ورنہ رہائش مستحب بھی نہ ہوگی)۔

حضرت نووی رحمہ اللہ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ زرکشی کہتے ہیں کہ بظاہر مدینہ کے بارے میں خلاف کمزور سا ہے یعنی اس لئے کہ ہم پہلے اس میں رہائش کی ترغیب ذکر کر چکے ہیں اور اس لئے بھی کہ جو بھی مکہ میں ٹھہرنا مکروہ جانتا ہے وہ یہی دلیل پیش کرتا ہے صحابہ کرام نے یہاں کا پڑوس نہیں کیا تھا' مدینہ میں ایسا نہیں کیونکہ وہ مدینہ میں قیام کی حرص رکھا کرتے تھے چنانچہ طبرانی کی اوسط میں یہ حدیث دیکھئے: "جو تین دن تک مدینہ سے غائب رہ کر واپس آتا ہے' اس کے دل میں ظلم کے اثرات ہوتے ہیں۔" ابن ابی خثیمہ نے یہ حدیث لکھی ہے: "جس کا مدینہ میں کوئی اصل نہ ہو' اسے وہیں رہنا چاہئے اور جس کے پاس کوئی ایسی صورت نہیں اسے بنا لینی چاہئے خواہ ایک کھجور ہی کی ہو۔" ابن اثیر کہتے ہیں کہ قَصَرَة درخت کی جڑ کو کہتے ہیں یعنی خواہ اس کے پاس ایک کھجور ہی کا بہانہ ہو' اس کا معنیٰ گردن بھی ہے' خطابی نے کہا کہ اس کا معنیٰ کھجور ہے اور حسن نے یہ آیت پڑھ دی: اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (بے شک دوزخ چنگاریاں اڑاتی ہے جیسے محل) اور اس کی تفسیر کھجور کی گردن سے کی ہے۔ طبرانی نے کبیر میں فليجعل له بها اصلا تحریر

کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ''لوگوں پر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ جس کی یہاں اصل نہیں ہو گی تو وہ یہاں سے خارج سمجھا جائے گا اور وہ کہیں باہر چلا جائے گا۔ابن شبہ نے بھی یونہی کہا پھر زہری سے یہ روایت لی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی جائیداد مکہ میں نہ بناؤ بلکہ مدینہ میں بناؤ جو مقام ہجرت ہے کیونکہ انسان وہیں ہوتا ہے جہاں اس کی جائیداد ہو۔'' پھر انہوں نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت لکھی ہے کہ: ''روحاء سے پرے جائیداد نہ بناؤ' ہجرت کے بعد واپس (مکہ) جانے کی کوشش نہ کرو' اپنی بیٹیاں ان سے نہ بیاہو جو فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے اور ان کی شادیاں ہم عمروں سے کرو یعنی جو عمر میں برابر ہوں' تقریباً ۳۳ سال کے۔

ان ساری روایات میں مدینہ کی رہائش پر زور دیا گیا ہے اور مکہ سے اس کی افضیلت بتائی گئی ہے جبکہ مدینہ پاک اس لائق بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی رہائش کے لئے اسی کو پسند کیا ہے' اس میں رہنے والوں کو آپ کا ساتھی اور مددگار بنایا ہے حالانکہ ان کے وطن کئی تھے اور اگر حضور ﷺ یہاں نہ ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ''دیر تک پڑوسی کے بارے میں جبریل مجھے کہتے رہے۔'' پڑوسی کے بارے میں کوئی تخصیص نہیں (کہ بندے کا ہو یا جگہ کا) اور ظلم کے باوجود کوئی پڑوسی بننے سے محروم نہیں ہوتا چنانچہ اسی لئے میں نے مکہ کے مقابلے مدینہ کی رہائش کو افضل کہا ہے حالانکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مکہ دوگنا اجر رکھتا ہے' وجہ یہ ہے کہ فضیلت صرف دوگنا ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی' مکہ کے لئے عدد کی زیادتی ہے لیکن مدینہ میں برکت اور مدد دوگنا ہے پھر مکہ کو بیت اللہ کی ہمسائیگی حاصل ہے اور مدینہ کو اللہ کے حبیب اور اس کے ہاں سب سے کریم کا پڑوس حاصل ہے جو وجودِ کائنات کے اصل راز ہیں اور ایسے مبارک ہیں کہ جن کی برکت ہر موجود کو حاصل ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے مدارک میں یہ واقعہ لکھا ہے' مصعب کے مطابق جب خلیفہ مہدی مدینہ میں آئے تو حضرت مالک رحمہ اللہ وغیرہ نامور لوگوں نے کئی میل آگے جا کر اس کا استقبال کیا' خلیفہ حضرت مالک کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے' گلے ملے' سلام کہا اور ساتھ چلنے لگے۔حضرت مالک نے خلیفہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اے امیر المؤمنین! تم مدینہ میں داخل ہوا چاہتے ہو' لوگ تمہارے دائیں بائیں ہوں گے' یہ لوگ مہاجرین و انصار کی اولاد ہیں' ان سے سلام لینا کیونکہ پوری روئے زمین میں کوئی ان سے بہتر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شہر مدینہ جیسا ہے۔

خلیفہ نے پوچھا: اے ابو عبد اللہ! یہ بات آپ نے کس سے سن کر کہی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ قبرِ محمد ﷺ ان کے پاس ہے اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں لہٰذا ان کی فضیلت سمجھ میں آ جانی چاہئے چنانچہ خلیفہ مہدی نے آپ کے حکم کے مطابق کیا۔اس سے پتہ چلتا ہے امام مالک رحمہ اللہ نے یہ اشارہ کیا کہ فضیلت کا اصل دارو مدار قبرِ محمد ﷺ پر ہے کیونکہ وہ مدینہ میں ہے اور اہلِ مدینہ اس کے ہمسائے ہیں۔

فصل نمبر ٤

نبی کریم ﷺ کی مدینہ اور اہلِ مدینہ کے لئے کچھ دعائیں؛ ایک سابق وباء کا ذکر جو یہاں سے اور مقام پر چلی گئی اور آپ کی مدینہ سے محبت کا ذکر۔

بخاری و مسلم میں ہمیں یہ روایت ملتی ہے کہ حضور ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی محبت ایسی بھر دے جیسی مکہ سے ہے یا اس سے بھی زیادہ بھر دے۔'' رزین عبدری اور جندی نے حدیث کے لفظ ''او'' کی بجائے ''و'' لکھی ہے حالانکہ اس روایت میں لفظِ ''او'' ''بَـل'' کے معنٰی میں ہے اور پھر نبی کریم ﷺ سے محبت مدینہ میں ایسی صحیح حدیث ملتی ہے جو مکہ کے بارے میں نہیں ملتی چنانچہ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں یہ حدیث ہے: ''جب رسول اکرم ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینہ کی دیواریں دیکھتے ہی سواری کی رفتار کم کر دیتے اور اگر اونٹ پر ہوتے تو محبت کی بناء پر اسے حرکت دیتے۔'' ابن زبالہ کی روایت میں ہے کہ مدینہ میں داخل ہو کر ایسا کرتے۔ انہی سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ جب مکہ سے واپس آتے اور اثایہ پر ہوتے تو اپنے کندھوں سے چادر اتار دیتے اور فرماتے: ''یہ طیبہ کی خوشبوئیں آ رہی ہیں اور پھر حبِّ مدینہ کی دعائیں آپ نے بار بار کیں جیسے کہ آگے آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ دعا تو پہلی ہی قبول ہو چکی ہوتی تھی؛ بار بار دعا کا مطلب محبت میں اضافہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

حضرت محاملی وغیرہ نے کتاب الدعاء میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینہ کے قریب پہنچ کر بالکل آہستہ چلتے اور فرماتے: ''اے اللہ! مدینہ میں ہمیں سکون عطا فرما اور اچھی روزی دے۔''

حضور ﷺ کی طرف سے مدینہ کے لئے دُعائے برکت

بخاری و مسلم میں یہ حدیث ہے: ''اے اللہ! مدینہ کی برکت مکہ کے مقابلہ میں دوگنی کر دے۔'' مسلم شریف میں ہے ''اے اللہ! ہماری کھجوروں میں برکت دے، ہمارے شہر میں برکت فرما، ہمارے پیمانے صاع اور مُدّ میں برکت فرما، الٰہی! حضرت ابراہیم علیہ السلام تو تیرے خاص بندے، خلیل اور نبی تھے جبکہ میں بھی تیرا بندہ اور نبی ہوں، انہوں نے تجھ سے مکہ کے بارے میں دعا کی تھی اور میں مدینہ کے بارے میں تجھ سے اسی چیز کو دوگنا کرنے کی دعا کرتا ہوں۔'' مسلم شریف ہی میں یہ دعا بھی ہے: ''الٰہی! ہمارے شہر میں برکت فرما، ہمارے صاع اور مدّ میں برکت فرما، الٰہی! ہمارے شہر میں برکت فرما، الٰہی! ایک برکت کی بجائے دو برکتیں عطا فرما۔'' مسلم شریف اور ترمذی میں یہ حدیث ملتی ہے: ''جب بھی اہلِ مدینہ نیا پھل دیکھتے، لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں آتے، آپ اسے ہاتھ میں لے کر فرماتے: ''الٰہی! ہماری کھجوروں میں برکت ڈال دے، ہمارے شہر میں برکت فرما، ہمارے صاع اور مدّ میں برکت نازل فرما دے۔''

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ مدینہ سال بعد جب بھی نیا پھل لے کر حاضر ہوتے تو ہر سال ہی آپ

یہی دعا فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی شریف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہے کہ ''ایک مرتبہ ہم حضور ﷺ کے ہمراہ چلے' جب حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کے ''حرۃ السقیاء'' (کنواں) پر پہنچے تو فرمایا کہ وضو کے لئے پانی لاؤ' آپ نے وضو فرمایا' پھر قبلہ رو ہو کر یہ دعا کی: ''اے اللہ! حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے اور خلیل تھے' انہوں نے اہلِ مکہ کے لئے برکت کی دعا کی تھی' میں بھی تمہارا بندہ اور رسول ہوں' میں اہلِ مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ تو ان کے مدّ اور صاع میں اہلِ مکہ سے دوگنا برکت فرما دے' ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں ہو جائیں۔

اسے ابنِ شبہ نے اخبارِ مکہ میں یونہی لکھا ہے البتہ انہوں نے کہا کہ: ''جب ہم حرہ کے مقام پر کنوئیں کے قریب پہنچے جو حضرت سعد بن ابو وقاص کی ملکیت تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا' پانی لاؤ' آپ نے وضو فرمایا اور قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی' پھر پوری حدیث نقل کر دی۔

طبرانی نے اوسط میں عمدہ سند لکھی ہے' راوی فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے' حضرت سعد بن ابو وقاص کے کنوئیں پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الٰہی! حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے اور نبی تھے' انہوں نے تجھ سے اہلِ مکہ کے لئے برکت کی دعا کی تھی جبکہ میں محمد تیرا خاص بندہ اور رسول ہوں' میں تجھ سے اہلِ مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ تو ان کے صاع اور مدّ میں بالکل ایسی ہی برکت فرما دے جیسی اہل مکہ کے لئے فرمائی تھی اور ان کی ایک برکت کے مقابلہ میں یہاں دو برکتیں فرما دے۔

جو نسخۂ کتاب ہمارے سامنے ہے' اس میں یونہی لکھا ہے لیکن شائد یہاں مِثْلَیْ کا لفظ ہے جیسے پہلی روایت میں آ چکا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مکہ کی برکت کے مقابلہ میں آپ نے مدینہ کے لئے مکہ کے مقابلے میں چھ گنا کی دُعا فرمائی تھی۔

ابن زبالہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کی ایک جانب تشریف لے گئے' میں بھی ساتھ تھا' آپ نے قبلہ کی طرف رُخ فرمایا اور ہاتھ اٹھا دئے' میں آپ کی بغلوں کی سفیدی کندھوں کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ آپ نے یوں دعا فرمائی: ''اے اللہ! حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے نبی اور خلیل تھے جنہوں نے تجھ سے اہلِ مکہ کے لئے دعا کی تھی اور میں بھی تو تیرا نبی اور رسول ہی ہوں' میں اہلِ مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں' الٰہی ان کے مدّ اور صاع میں برکت فرما' ان کے کثیر و قلیل میں برکت فرما دے' یہ بَرکت اہلِ مکہ کے مقابلے میں دوگنا ہونی چاہئے' الٰہی یہ برکت ادھر سے بھی آئیں اور ادھر سے بھی آئیں اور پوری روئے زمین کی جہتوں کی طرف اشارہ فرمایا' (پھر عرض کی) اے اللہ! جو اہلِ مدینہ کے خلاف برا ارادہ کرے تو اسے یوں ڈھال دے جیسے نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔

حضرت طبرانی کی اوسط میں ہے' حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر پڑھائی اور پھر صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر یوں دعا کی: ''اے اللہ! ہمارے شہر میں برکت فرما' ہمارے مد اور صاع میں برکت فرما (الحدیث) کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ نے ایسی ہی روایت کی ہے۔

حضرت احمد اور بزاز رحمہما اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی' کہتے ہیں' میں نے سنا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے شام کی طرف رُخ فرمایا اور یوں دعا کی: ''الٰہی ان کے دل ادھر پھیر دے۔'' پھر عراق کی طرف متوجہ ہو کر بھی یونہی دعا فرمائی پھر آسمان کی ہر سمت دیکھتے ہوئے یہ دعا کی کہ: ''اے اللہ! ہمیں روئے زمین کے پھل عطا فرما' ہمارے مد اور صاع میں برکت فرما۔''

حضرت قاضی عیاض نے اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں برکت سے مراد بڑھنا اضافہ ہونا ہے اور یہ برکت سدا رہنے کی دعا فرمائی چنانچہ علماء کہتے ہیں' احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد دینی برکت ہو اور یہ زکوٰۃ اور کفارات کی مقدار سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ دنیوی برکت کے لئے ہو اور مراد یہ ہو کہ پیائش اور ناپ تول کی چیزیں یہاں اتنی ہوں کہ اتنی کہیں اور نہ ہوں یا پھر کثرت سے مراد غلہ وغیرہ کی کثرت ہو کیونکہ سب کچھ میں حضور ﷺ کی قبولیتِ دعا دکھائی دیتی ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں' ظاہر یہ ہے کہ برکت سے مراد خود مدینہ میں تولی جانے والی چیز میں برکت ہے اور وہ یوں کہ یہاں ان لوگوں کو مدّ پورے مل جائیں جو کہیں اور نہ مل سکیں۔ میں کہتا ہوں کہ تولی جانے والی اشیاء میں یہی ظاہر ہے اور اس مدینہ سے باہر دعا عموم پر ہو اور سب دینی و دنیوی امور کو شامل ہو۔

حضرت جندی کے فضائلِ مدینہ سے ہمیں اس حدیث کا پتہ چلتا ہے' آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت ڈال دے جیسے مکہ کے بارے میں ڈال رکھی ہے بلکہ زیادہ ہی ہو' مدینہ ہمارے لئے صحیح ہو' ہمارے لئے اس کے مدّ اور صاع میں برکت دے اور اس میں سے بخار کو نکال کر جحفہ کی طرف بھیج دے۔''

حضرت احمد نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت بتائی کہ ''نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کے کنوئیں پر نماز پڑھی' یہیں کچھ گھر بھی موجود تھے' پھر یوں دعا کی: ''اے اللہ! حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے خلیل' بندے اور نبی تھے جنہوں نے تجھ سے اہلِ مکہ کے لئے دعا کی تھی اور میں محمد بھی تیرا بندہ اور رسول ہوں' تجھ سے اہلِ مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں اور اس سے دوگنا زیادہ مانگتا ہوں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ والوں کے لئے مانگا تھا' میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے مدّ' صاع اور پھلوں میں برکت عطا فرما' الٰہی! مدینہ ہمارے لئے ویسے ہی محبوب بنادے جیسے مکہ بنایا تھا اور اس میں مَوجود وباء کو خم (جحفہ کے قریب مقام) کی طرف لے جا۔''

حضرت ابنِ زبالہ نے یہ حدیث بیان کی کہ ''جب نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ کے صحابہ کو بخار آنے لگا'' پھر اسی میں ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے' ہاتھ اُٹھائے اور دعا کی کہ ''الٰہی! یہ وباء کہیں اور بھیج دے۔'' صبح ہوئی تو بتایا کہ رات کو میرے پاس بخار آیا' یکا یک نظر پڑی تو وہ سیاہ رنگ کی بڑھیا تھی' وہ لانے والے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی' اس نے کہا: یہ بخار ہے' آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اسے خم کی طرف لے جاؤ۔

وباء کو منتقل کرنے کی دُعاء

مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہے، فرماتی ہیں کہ: "ہم مدینہ میں پہنچے یہ زمین وباء والی تھی، چنانچہ حضرت ابوبکر بیمار ہوئے اور پھر حضرت بلال بھی بیمار پڑ گئے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یوں بیمار ہوتے دیکھا تو یہ دعا فرمائی: "اے اللہ! ہمارے لئے مدینہ ایسا محبوب بنا دے جیسے مکہ کو بنایا تھا یا پھر اس سے بھی زیادہ، ہمارے لئے اسے مفید فرما دے، اس کے صاع اور مدّ میں ہمارے لئے برکت فرما دے اور اس میں کا بخار جحفہ کی طرف بھیج دے۔"

یہی روایت بخاری شریف میں ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ "جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ آئے تو حضرت ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما کو بخار آ گیا، حضرت ابوبکر اس موقع پر کہا کرتے:

"ہر شخص اپنے اہل و عیال میں خوش و خرم ہوتا ہے جبکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب ہوتی ہے۔"

حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی بخار تھمنے پر بلند آواز سے کہا کرتے:

"سنو! اگر میری عقل کام کرتی ہے تو میں کہتا ہوں، کیا ایسی وادی میں میں پھر بھی کبھی رات گذاروں گا جس کے اردگرد اذخر اور جلیل نامی بوٹیاں ہونگی اور کیا میں مجنّہ کے چلنے والے پانیوں میں دوبارہ داخل ہوسکوں گا اور دوبارہ مجھے شامہ اور طفیل دکھائی دیں گے؟"

(پھر فرماتے) اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت فرما کیونکہ انہوں نے ہماری سر زمین سے نکال کر ہمیں وباء والی زمین کی طرف بھیج دیا ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے یوں دعا فرمائی: "اے اللہ! مدینہ ہمیں یونہی محبوب کر دے جیسے مکہ ہمیں محبوب ہے بلکہ مکہ سے بھی بڑھ کر محبوب بنا دے، الٰہی ہمارے صاع اور مدّ میں برکت عطا فرما، مدینہ ہمارے لئے صحیح ثابت ہو اور اس میں کا بخار جحفہ کی طرف بھیج دے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم مدینہ پہنچے تو یہ پوری سر زمین سے زیادہ وباء والی تھی، وادیٔ بطحان میں گندا اور بدبودار پانی بہتا تھا۔ مؤطا میں اسے کچھ زیادتی کے ساتھ بیان کیا ہے، عامر بن فہیرہ نے کہتے تھے:

"میں نے اسے چکھنے سے پہلے موت کو چکھا ہے کیونکہ بزدل کو اوپر سے اچک لیا جاتا ہے۔"

ابنِ اسحٰق نے اسے اور زیادہ کر کے روایت کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو بخار کی وجہ سے یہ سر زمین سب سے زیادہ اثر پذیر تھی چنانچہ اس نے آپ کے صحابہ کو گھیر لیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی وجہ سے اسے یہاں سے کسی اور طرف بھیج دیا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر' عامر بن فہیرہ اور حضرت ابوبکر کے غلام بلال بھی ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں تھے' سب کو شدید بخار تھا' میں ان کی بیمار پرسی کے لئے ان کے پاس گئی' پردے کا حکم ابھی نہیں اترا تھا' انہیں سخت ترین بخار تھا' میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب گئی' پوچھا: آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ نے کل امری مصبّح والا شعر پڑھ دیا میں نے خیال کیا کہ میرے والد نہیں جانتے کہ کیا فرما رہے ہیں پھر میں عامر بن فہیرہ کے نزدیک گئی اور پوچھا' عامر تمہارا کیا حال ہے؟ تو اس نے لقد وجدت الموت والے دو شعر پڑھ دئے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ عامر اپنے کہے کے بارے میں نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ حضرت بلال سے بخار ٹل جاتا تو صحن میں بیٹھتے یہ شعر پڑھتے الالیت شعری الخ۔

ابن زبالہ یہ روایت ان الفاظ میں بیان کرتے: "جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو ان کے صحابہ کو بخار نے آ لیا' آپ حضرت ابوبکر کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ سوتے جاگتے بے تکی باتیں کر رہے تھے' آپ کو دیکھ کر عرض کی' یا رسول اللہ اور پھر یہ شعر پڑھا لقد لقیت الموت الخ آپ وہاں سے نکلے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچے' وہ بھی یونہی کہہ رہے تھے اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھ رہے تھے الالیت شعری الخ پھر حضرت احمد بن جحش رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے' وہ بھی بخار میں گرفتار تھے' آپ نے دیکھ کر پڑھا:

> "اے وادیٔ مکہ! تم پر قربان جائیں' یہاں بھی میری عیادت کرنے والے بہت ہیں' یہ ایسی سرزمین ہے کہ جہاں میری میخیں گڑی ہوئی ہیں اور ایسی ہے کہ جہاں میرے اہل و عیال رہتے ہیں اور پھر یہ ایسی سرزمین ہے کہ جہاں چلنے کے لئے مجھے کسی راہنما کی ضرورت نہیں۔"

یہ دیکھ کر حضور ﷺ وہاں سے چلے آئے اور دعا فرمائی کہ یہ وباء مدینہ سے جحفہ کے قریب مقام خم میں منتقل کر دی جائے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ حضرت ابوبکر اور ان کے دونوں غلاموں کے پاس جائیں' انہوں نے واپس آ کر آپ کو صورت حال بتائی' آپ کو یہ بات اچھی نہ لگی پھر آپ مدینہ کے بازار "بقیع نخل" کی طرف تشریف لے گئے' اس میں کھڑے ہوئے' چہرہ قبلہ کی طرف کیا اور اللہ سے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر عرض کی: "اے اللہ! مدینہ ہمارا محبوب بنا دے جیسے مکہ کو بنایا ہے یا اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے' الٰہی اہلِ مدینہ کے بازار میں برکت فرما' ان کے صاع اور مدّ میں برکت رکھ دے' الٰہی! مدینہ میں پائی جانے والی وباء کو مہیعہ کی طرف بھیج دے۔"

وضاحت لغات:

رفع عقیرتہ کا معنٰی ہے: انہوں نے اپنی آواز بلند کی' بوادٍ' اسے بفخ بھی کہا گیا ہے' یہ وادیٔ زاھر ہے' جلیل ایک گھاس ہے۔ مِـجَـنَّـة میم کی زیر اور زبر سے' مکہ کی نچلی طرف ایک بازار کا نام۔ اصمعی اسے مـرّ الظھـران کہتے

ہیں۔ شامہ و طفیل' یہ دو پہاڑ ہیں جو مجنہ کی بالائی طرف ہیں' یہ بات ابن الاثیر کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شابہ بھی نام ہے حجازی پہاڑ کا' ان دونوں کے بارے میں طبری کہتے ہیں کہ یہ دونوں پہاڑ ہیں جو مکہ سے کچھ مراحل پر یمن کو جاتے ہوئے آتے ہیں اور خطابی کہتے ہیں کہ یہ دو چشمے ہیں۔ ان کے قول بطوقہ کا معنٰی ہے اپنی طاقت سے۔ بروقہ کا معنٰی اس کے سینگ کے ساتھ۔ مھیعہ' یہ جحفہ ہی کا نام ہے جو مشہور میقاتوں میں سے ایک ہے اور خمّ اسی جحفہ کے پاس ہے۔ حضور ﷺ نے بخار کو یہاں بھیجنے کی دعا اس لئے فرمائی تھی کیونکہ یہ شرک کا گڑھ تھا چنانچہ بعد ازیں سب سے زیادہ بخار اسی مقام پر رہا' کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس چشمہ کے پانی پینے سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ جو بھی اس سے پانی پی لیتا' اسے بخار آنے لگتا۔

حضرت بیہقی نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا ہشام بن عروہ سے روایت کی' انہوں نے اپنے والد عروہ سے سنی۔ اس میں ہشام کہتے ہیں کہ بچہ جحفہ میں پیدا ہوتا' وہ ابھی سمجھ دار بھی نہ ہونے پاتا کہ بخار اسے آ لیتا۔

خطابی کہتے ہیں اہل جحفہ یہودی تھے' کہتے ہیں کہ ایسا کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا جسے بخار نہ ہوا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نبوت کی علامات میں سے ایک علامت تھی کیونکہ جحفہ اسی دن سے وباء والا چلا آتا ہے' جو بھی اس سے پانی پیتا' بخار میں گھر جاتا۔

بطحان جیسا کہ آگے آ رہا ہے' مدینہ کی وادیوں میں سے ایک وادی کا نام ہے۔ ماء عاجن وہ پانی جس کے ذائقہ اور رنگ تبدیل ہو چکے ہوں۔

مدینہ کی وباء قدیم دورِ جاہلیت میں آئی

محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ مدینہ میں آنے والی وباء شدید تھی' ابن اسحٰق نے ہشام بن عروہ سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ مدینہ کی وباء دورِ جاہلیت میں مشہور تھی' جب بھی کوئی شخص یہاں داخل ہوتا اور اس کا ارادہ ہوتا کہ اس سے بچا رہے تو اس سے کہا جاتا کہ گدھے جیسی آواز نکالو چنانچہ وہ گدھے کی سی آواز نکالتا۔

دلائل نبوت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث ملتی ہے: فرمایا: "رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو یہ زمین اللہ کی ساری زندگی میں سے وباء زدہ تھی' اس کی وادی بطحان میں گندہ پانی تھا۔ ہشام کہتے ہیں کہ اس میں موجود وباء دور جاہلیت میں مشہور تھی اور چونکہ یہ وادی وباء والی تھی' اس لئے جب بھی کوئی وہاں آتا تو اسے کہا جاتا کہ گدھے جیسی آواز نکالو چنانچہ جب وہ یہ آواز نکالتا تو یہ وباء اس کو نقصان نہ دیتی' ایک شاعر جب مدینہ میں آیا تو اس نے یہ شعر پڑھا:

"مجھے اپنی حیاتی کی قسم! اگر وباء کے خوف سے میں دس مرتبہ گدھے کی سی آواز نکالوں تو رونے دھونے والا شمار ہوں گا۔"

ثنیۃ الوداع

ابن شبہ نے حضرت عامر بن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی' عامر کہتے ہیں کہ مدینہ میں داخل ہونے والا صرف ایک ہی راستے سے داخل ہوا کرتا تھا جسے ثنیۃ الوداع کہتے تھے' اگر وہ مسلسل دس مرتبہ گدھے جیسی دس مرتبہ آواز نہ نکالتا تو وہاں سے نکلنے بھی نہ پاتا کہ مرجایا کرتا اور جب ثنیہ پر ٹھہر جاتا تو اسے کہا جاتا کہ اب یہ امانت ہے (ہوسکتا ہے مرجائے) چنانچہ اس کا نام "ثنیۃ الوداع" رکھ دیا گیا۔ پھر یہاں عروہ بن ورد عبسی آیا' اسے کہا گیا کہ دس مرتبہ گدھے کی سی آواز نکالو لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا' یہ شعر پڑھ دیا:

"مجھے زندگی کی قسم! اگر میں وباء کے خوف سے دس مرتبہ گدھے جیسی آواز نکالوں تو رونے دھونے والوں میں شمار ہوں گا۔"

پھر وہ مدینہ میں داخل ہوا اور کہنے لگا: اے گروہ یہود! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ دس مرتبہ گدھے جیسی آواز نکالا کرتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ جب بھی باہر سے یہاں کوئی آکر دس مرتبہ آواز نہیں نکالتا تو مرجایا کرتا ہے اور جو بھی ثنیۃ الوداع کے علاوہ کسی اور راستے سے یہاں آتا ہے وہ دن بدن کمزور ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ جب عروہ نے دس مرتبہ یہ آواز نہ نکالی تو لوگوں نے بھی اسے چھوڑ دیا اور ہر طرف سے یہاں آنے لگے۔

وباء کا یہاں سے چلے جانا حضور ﷺ کا معجزہ تھا

وباء کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دینا بہت بڑا معجزہ تھا کیونکہ تمام طبیب مل کر بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ بخاری شریف میں حدیث پاک ہے' حضور ﷺ نے فرمایا:

"میں نے سیاہ رنگ کی ایک عورت دیکھی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے' وہ مدینہ سے نکلی اور مہیعہ کو چلی گئی' میں نے اس سے یہ سمجھا کہ وباء مدینہ سے منتقل ہو کر مہیعہ کو چلی گئی ہے۔"

طبرانی کی اوسط میں بھی ایسی ہی حدیث ہے۔ ابن زبالہ کی کتاب میں ہے کہ "ایک دن حضور ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا' لگتا تھا کہ مکہ کے کسی راستے کی طرف سے آیا ہے' حضور ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے کسی کو دیکھا ہے؟ اس نے عرض کی' نہیں' البتہ ایک ننگی سیاہ عورت دیکھی ہے جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بخار تھا اور اب یہ کبھی بھی دوبارہ یہاں نہیں آسکے گا۔"

اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ہے کہ "اے اللہ! مدینہ کو ہمارا محبوب بنا دے اور اس میں موجود وباء کو مہیعہ کی طرف بھیج دے اور جو اثر باقی رہ جائے تو اسے مشعط کے پہاڑ کے دامن میں دبا دے۔ اسی میں ایک اور حدیث ہے کہ: "اگر مدینہ میں کہیں وباء ہوگی تو وہ مشعط پہاڑ کے سائے میں ہوگی۔"

حضرت "مجد" کہتے ہیں کہ یہ مشعط مدینہ میں ایک پہاڑ ہے یا کسی جگہ کا نام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن زبالہ سے منزلوں کے ذکر میں آ رہا ہے کہ بنو حدیلہ نے دو ٹیلے بنائے تھے جن میں سے ایک کو "مشعط" کہتے تھے' یہ مسجد بنو حدیلہ کی غربی جانب تھا' اسی جگہ میں ایک گھر بنا ہوا ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ نبیہ اس میں آئے تھے۔ پھر ابن زبالہ نے اس کے بعد یہ مذکور حدیث ذکر کی' جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسی کو مشعط کہتے ہیں۔ اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ہے کہ "بخار سے بری سب سے اہم علاقہ بنو قریظہ کی پتھریلی زمین اور عریض کے درمیان ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدرے بخار مدینہ میں موجود ہے اور وہ بخار جو جڑھ سے اکھیڑ دیا گیا' جس کی شدت' وبائی صورت' غلبہ اور کثرت نہ رہی' یہ اس بخار کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلے اسے مکمل طور پر نکال دیا گیا ہو' پھر تھوڑا سا رہنے دیا گیا کہ لوگ اس کے اجر سے محروم نہ رہ جائیں جیسے حافظ ابن حجر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جسے احمد نے صحیح رجال کے ساتھ' ابو یعلیٰ' ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ "بخار نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت مانگی' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا' یہ کون ہے؟ تو اس نے عرض کی "امِ ملدم" (بخار کی کنیت ہے) آپ نے اسے اہلِ قباء کی طرف بھیج دیا چنانچہ انہیں اس قدر بخار ہوا کہ اللہ ہی جانے' وہ لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور بخار کی شکایت کی' آپ نے فرمایا: کیا چاہتے ہو؟ چاہو تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں' یہ تمہیں چھوڑ جائے گا اور چاہو تو یہ تمہیں پاک صاف کرتا رہے گا۔ انہوں نے عرض کی' کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟ فرمایا' ہاں۔ انہوں نے عرض کی کہ پھر اسے رہنے دیجئے۔

طبرانی نے بھی ایسی ہی روایت ذکر کی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ آپ نے انہیں فرمایا تھا' "اگر چاہو تو اسے رہنے دو' اس سے تمہارے بقیہ گناہ گر جائیں گے' انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ اسے رہنے دیجئے۔

حضرت احمد نے ایک حدیث نقل کی ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: "میرے پاس جبریل بخار اور طاعون لے کر حاضر ہوئے' میں نے بخار کو مدینہ میں رکھ لیا لیکن طاعون شام کی طرف بھیج دی چنانچہ یہ طاعون میری امت کے لئے شہادت کا باعث ہے اور ان کے لئے رحمت بن جاتی ہے جبکہ کافروں کے لئے یہ ایک موذی مرض ہوتی ہے۔

ذہن میں تو یہ بات آتی ہے کہ یہ معاملہ اس وقت ہوا تھا جب مکمل طور پر بخار کو یہاں سے منتقل کر دیا گیا تھا لیکن ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ہمراہ صحابہ کی مختصر تعداد تھی چنانچہ آپ نے بخار کا یہاں رہنا پسند کر لیا کیونکہ طاعون کے مقابلے میں اس سے موت کم واقع ہوتی ہے کیونکہ اس پر بڑا اجر ملتا ہے چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ صحابہ کی تعداد زیادہ ہو سکے اور جب آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا تو آپ نے بخار کو جحفہ کی طرف منتقل کرنے کی دعا فرما دی چنانچہ ایسا ہوا کہ جو شخص طاعون کی وجہ سے ملنے والی شہادت سے رہ جاتا تو بسا اوقات اسے راہِ خدا میں قتل کے ذریعے شہادت مل جاتی اور جسے یہ شہادت بھی نہ ملتی تو اسے وہ بخار آ لیتا جو مومن کے لئے جہنم میں قدرے ملنے والی سزا کا بدل ہے پھر یہ مدینہ طیبہ میں جاری رہا یعنی جب مسلمان بہت سارے ہو گئے تو یہ

جاری رہا تاکہ دوسرے لوگوں سے تمیز ہو سکے (کہ دوسرے مخالفین اسلام کو بخار نہیں آتا)۔ انتہٰی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آخر میں بخار کا کچھ حصہ یہاں مدینے میں رہ گیا تھا اور ہمارے زمانہ میں مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ بخار یہاں سے کلی طور پر نہیں گیا لیکن جس بخار کی بات پہلے ہو چکی تو مدینہ پاک مکمل طور پر ویسے بخار سے اب بھی محفوظ ہے جیسے آگے آ رہا ہے لیکن طاعون کبھی بھی یہاں نہیں آ سکی۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے اللہ سے اپنی امت کے لئے دعا کی کہ انہیں بکھرنے نہ دے اور کوئی ان میں سے دوسرے کو تکلیف نہ دے سکے تو اللہ نے آپ کو اس سے روک دیا چنانچہ آپ نے اپنی دعا میں عرض کی: تو چاہتا ہے تو بخار دیدے یا طاعون۔ اس میں آپ نے بخار کے اس مقام میں آنے کی دعا فرمائی جہاں طاعون داخل نہیں ہوتی جیسے ہم اگلی فصل میں اشارہ کریں گے چنانچہ اب جو بخار مدینہ میں آتا ہے' وہ وباء شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ حضور ﷺ کی دعا کی وجہ سے رحمت ہوتا ہے جیسے ہم آگے وضاحت کریں گے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۵

مدینہ پاک دجال اور طاعون سے محفوظ ہے' اس کی حفاظت کی جا رہی ہے

صحیحین اور دوسری کتابوں میں ہمیں یہ حدیث ملتی ہے کہ "مدینہ کے راستوں پر فرشتے مقرر ہیں جو مدینہ کی حفاظت کر رہے ہیں' اس میں نہ تو طاعون داخل ہوسکتی ہے اور نہ ہی دجال داخل ہو سکے گا۔ صحیحین ہی میں یہ حدیث بھی ہے: "کوئی ایسا شہر نہیں جسے میں دجال عنقریب گھس نہ جائے' صرف مکہ اور مدینہ ایسے ہیں جن میں نہیں گھسے گا' ان کی طرف آنے والا کوئی راستہ ایسا نہیں جن پر فرشتے صف در صف کھڑے حفاظت نہ کر رہے ہوں چنانچہ وہ شور اور بنجر زمین میں ٹھہرے گا چنانچہ مدینہ طیبہ تین مرتبہ لوگوں کو (زلزلہ کی وجہ سے) ہلا کر رکھ دے گا' اس کے پاس ہر منافق اور کافر پہنچے گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وہ جرف کی شور زمین میں اترے گا تو ہر کافر اور منافق اس کے پاس چلا جائے گا۔

پھر بخاری شریف میں ایک حدیث ہے کہ "مسیح دجال کا رعب مدینہ پر نہیں چھائے گا' ان دنوں مدینہ کے سات دروازے ہوں گے جن میں سے ہر ایک پر دو فرشتے مقرر ہوں گے۔ مسلم شریف میں یہ حدیث ہے کہ: "مسیح دجال مشرق کی طرف سے آئے گا' ارادہ مدینہ میں داخل ہونے کا ہوگا' احد کی پچھلی طرف ٹھہرے گا پھر فرشتے اس کا رُخ شام کی طرف کر دیں گے چنانچہ وہاں جا کر وہ ہلاک ہو جائے گا۔

پھر بخاری و مسلم میں ایسے نیک شخص کا قصہ موجود ہے جو سب لوگوں سے نیک ہوگا یا نیک لوگوں میں شمار ہوگا' وہ مدینہ سے دجال کے پاس جائے گا' وہ اس وقت شور والی زمین میں ہوگا' یہ شخص دجال سے کہے گا: تم ہی وہ دجال ہو

جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ہمیں بتا چکے ہیں۔ آگے طویل حدیث بیان کی۔

حضرت معمر رضی اللہ عنہ ابو حاتم کی روایت میں بتاتے ہیں' علماء کا خیال ہے یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔

امام احمد اور طبرانی نے ''اوسط'' میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی' وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقام حرہ کے پست مقامات میں سے ایک پست مقام کی طرف نگاہ فرمائی' ہم آپ کے ساتھ ہی تھے' آپ نے فرمایا: مدینہ کی سرزمین کتنی اچھی ہے' جب دجال نکلے گا تو اس کے ہر راستے پر فرشتہ مقرر ہوگا چنانچہ وہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ جب ایسا ہوگا تو مدینہ پاک میں تین مرتبہ لوگ ہل کر رہ جائیں گے چنانچہ کوئی منافق مرد اور عورت ایسی نہ ہوگی جو اس دجال کی طرف چلے نہ جائیں' اس کی طرف جانے والوں کی اکثریت عورتوں کی ہوگی' یہ دن خلاصی کا ہوگا' یہ ایسا دن ہوگا کہ مدینہ پاک میل کو ایسے دور کر دے گا جیسے لوہے کی بھٹی لوہے کی میل اتار دیتی ہے' اس کے ہمراہ ستر ہزار یہودی ہوں گے ہر آدمی پر ایک چادر ہوگی اور خوبصورت تلوار لئے ہوگا' وہ اپنا خیمہ اس تلوار سے اس جگہ گاڑے گا جہاں پانی جمع ہوں گے۔ آگے طویل حدیث ذکر کی۔

امام طبرانی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ''اے اہلِ مدینہ! خلاصی کے دن کو یاد کرو' لوگوں نے پوچھا کہ یومِ خلاص کیا ہے؟ تو کہا کہ دجال آئے گا اور ذباب کے مقام پر ٹھہرے گا چنانچہ مدینہ کا کوئی مشرک مرد وعورت' کافر مرد و عورت' منافق مرد وعورت اور فاسق مرد وعورت ایسا نہیں ہوگا جو اس کے پاس چلا نہ جائے گا چنانچہ مومن لوگ خلاصی پا لیں گے اور یہ خلاصی کا دن ہوگا۔

امام احمد نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' یوم الخلاص' جانتے ہو کہ یوم الخلاص کونسا ہے؟ تین مرتبہ فرمایا۔ آپ سے عرض کی گئی کہ یوم الخلاص کونسا دن ہوگا؟ آپ نے فرمایا دجال آئے گا' احد پر چڑھ جائے گا اور اپنے ساتھیوں سے کہے گا: کیا تم اس سفید محل کو دیکھ رہے ہو؟ یہ احمد کی مسجد ہے' پھر مدینہ کی طرف جانے کا ارادہ کرے گا تو ہر راستہ پر فرشتہ کو چوکس کھڑا دیکھے گا چنانچہ جرف کی شور زمین میں ٹھہرے گا اور وہاں اپنا خیمہ گاڑ دے گا' ادھر مدینہ میں تین مرتبہ زلزلہ پیدا ہوگا جس کے نتیجے میں کوئی منافق مرد وعورت اور فاسق مرد وعورت ایسا نہ رہے گا جو اس کی طرف چلا نہ جائے گا چنانچہ یہی یوم الخلاص ہوگا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احمد اور حاکم دونوں نے حضرت محجن بن ادرع سے مرفوع حدیث بتائی کہ ''دجال آئے گا اور احد پہاڑ پر چڑھ جائے گا' ہر طرف نظر دوڑائے گا' مدینہ کی طرف نظر اٹھائے گا تو اپنے ساتھیوں سے کہے گا' تم اس سفید محل کو نہیں دیکھ رہے؟ یہ احمد کی مسجد ہے' پھر مدینہ میں آنا چاہے گا تو دیکھے گا کہ ہر راستے پر ایک فرشتہ تلوار تانے کھڑا ہوگا' حدیث کے باقی الفاظ وہی ہیں البتہ آخر میں انہوں نے کہا کہ ''مدینہ کی خلاصی ہو جائے گی چنانچہ یہی یوم الخلاص ہوگا۔''

''رواق'' کا معنیٰ خیمہ ہے۔ابن ماجہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرتے ہیں: ''دجال طریق احمر (سرخ راستہ) کے پاس شور زمین کے آخر میں ہوگا۔

امام احمد کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ ''دجال اس شور زمین میں راستے پر قیام کرے گا۔''

عتیق المدینہ میں جو زبیر بن بکار کی تصنیف ہے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ سوار ہو کر اس مقام کی طرف چلے جہاں چشموں کا پانی اکٹھا ہوتا تھا' آپ نے اس دوران فرمایا: کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ دجال مدینہ کے کس مقام پر ٹھہرے گا اور پھر فرمایا کہ یہیں ٹھہرے گا' وہ مدینہ جانے کا ارادہ کرے گا لیکن ہمت نہ ہوگی' وہ دیکھے گا کہ ہر راستے پر فرشتے بولتے ہونگے اور ہر پہاڑی راستے پر ایک فرشتہ تلوار لئے کھڑا ہوگا' مدینہ میں نہ تو دجال داخل ہو سکے گا اور نہ ہی طاعون' مدینہ میں زلزلہ آئیگا اور اس کا اثر دجال کے ساتھیوں پر بھی ہوگا چنانچہ کوئی منافق مرد و عورت ایسا نہ ہوگا جو نکل کر اس کے پاس نہ چلا جائے' ان میں اکثر عورتیں ہوں گی' کوئی آدمی اپنا حصہ لینے سے عاجز نہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی احادیث میں موجود الفاظ فترجف المدینة کا مطلب یہ ہے کہ زلزلہ کی وجہ سے ایسا ہوگا۔اب ان سابق روایات سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مسیح دجال کا رعب مدینہ منورہ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

رھھ یعنی زلزلہ کا مقصد یہ ہوگا کہ دجال کے آنے کی خبر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کو اس کے مقابلے کی طاقت نہیں چنانچہ اس وقت منافق اور فاسق اس کی طرف جانے کی جلدی کریں گے۔

طبرانی کی اوسط میں حدیث ہے کہ: ''دجال' مدینہ کے برابر آ کھڑا ہوگا' سب سے پہلے اس کی طرف عورتیں اور لونڈیاں جائیں گی اور اس کی اتباع کریں گی اور پھر احمد اور طبرانی کی روایت کردہ حدیث میں ہے' الفاظ طبرانی کے ہیں' وہ دجال کی پہچان بتاتے ہیں کہ ''پھر وہ دجال چلتا ہوا مدینہ کے پاس پہنچے گا' یہاں جانے کی اسے اجازت نہ ہوگی لہٰذا وہ کہے گا کہ یہ اس شخص کی بستی ہے پھر وہاں سے چلے گا اور شام میں پہنچے گا' اللہ تعالیٰ اسے ''افیق'' کی گھاٹی میں ہلاک کر دے گا۔

ابو یعلیٰ نے جساسہ کی مشہور حدیث بیان کی جس میں یہ بھی ہے کہ: ''وہ (دجال) مسیح ہوگا' اس کے لئے چالیس دن میں ساری زمین کی سیر ممکن ہوگی' صرف طیبہ میں نہیں جا سکے گا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ طیبہ' مدینہ ہی ہے' اس کے ہر دروازے پر ایک فرشتہ تلوار تانے کھڑا ہوگا جو اسے اندر طیبہ میں آنے سے روکے گا اور ایسے ہی مکہ میں ہوگا۔'' پھر بخاری و ترمذی شریف میں یہ حدیث ملتی ہے: ''مدینہ میں دجال آنے کی کوشش کریگا' وہ دیکھے گا کہ فرشتے اس کی نگرانی کر رہے ہوں گے لہٰذا وہ دجال مدینہ کے قریب نہ جا سکے گا اور نہ ہی طاعون اندر داخل ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔''

حضرت احمد اور ابن شبہ نے یہ حدیث نقل کی کہ: ''مکہ اور مدینہ کو فرشتے گھیرے ہوں گے ان کے ہر راستے پر

فرشتہ ہو گا' ان میں نہ تو دجال داخل ہو سکے گا اور نہ ہی انشاء اللہ طاعون داخل ہو گی۔"

حضرت امام احمد اور طبرانی وغیرہ نے یہ حدیث روایت کی کہ: "رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایسے آدمی کا ذکر ہوا جو ایک سبزہ والی زمین سے نکلے گا' وہ جب مدینہ کے کسی راستے میں ہو گا تو اسے وباء گھیر لے گی' لوگ گھبرا جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ وہ مدینہ کے راستوں میں سے نہیں آ سکے گا۔" "نقاب" چھوٹے بڑے راستوں کو کہتے ہیں اس کا واحد لفظ نِقب ہے' نون پر زیر ہے۔

اس سے پہلی روایت میں فلا یقربها الدجال ولا الطاعون کے الفاظ سے گنجائش نکلتی ہے کہ طاعون مدینہ میں داخل ہو سکے گی حالانکہ دوسری احادیث میں سے یقین حاصل ہوتا ہے کہ نہیں داخل ہو گی' صحیح بھی یہی ہے کہ مدینہ محفوظ رہے گا جیسے کہ مشاہدہ میں آ چکا ہے اور پھر دجال کو طاعون کے ساتھ ملانا' ایک اشکال پیدا کرتا ہے' طاعون تو باعثِ شہادت و رحمت ہے تو اسے ان دونوں صفات سے خالی کیسے کیا جا سکتا ہے۔

اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے۔

ا۔ ایک یہ ہے کہ طاعون کا اس طرح ہونا (کہ شہادت اور صحت کا سبب بنے) اس کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ یہ چیز اس کے آنے پر مرتب ہوتی اور حاصل ہوتی ہیں اور اس کی تفسیر اس روایتِ احمد سے ملتی ہے کہ بوخزا عدائکم من الجن (کہ جن دشمن چبھوتے ہیں) اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کافر جن اور شیطان چبھونے سے روک دئے گئے ہیں جیسے کہ دجال کو مدینہ سے روک دیا گیا ہے' تم دیکھتے نہیں کہ کافر کا مسلمان کو قتل کرنا شہادت بنتا ہے اور اگر کہیں ثابت ہو جائے کہ کافر مسلمان پر غالب نہیں ہو سکے تو یہ بڑے شرف کی بات ہو گی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ رحمت کے اسباب صرف طاعون ہی میں نہیں پائے جاتے' اس کے بدلے حضور ﷺ نے بخار کا ذکر کیا ہے' جب دونوں اکٹھے ہوں تو آپ نے بخار کو پسند کر رکھا ہے جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے (کہ طاعون نہ ہو تو بخار ہی سہی) کیونکہ یہ مومن کو پاک صاف کرتا ہے اور دوزخ میں پائی جانے والی آگ کا بدل ہے' پھر طاعون تو کسی سال میں آئی ہوتی ہے جبکہ بخار تو کسی بھی وقت آ سکتا ہے لہٰذا دونوں ایک جیسے نہیں اور انہیں برابر قرار دینا قابلِ اعتراض ہے کیونکہ رحمت کے اسباب زیادہ ہونے کی تو ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اگرچہ طاعون میں رحمت و شہادت حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے اسباب کئی ہو سکتے ہیں جیسے کچھ گناہ ہو جانا' پھر امام احمد نے شرجلیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہے کہ طاعون تمہارے ربّ کی طرف سے رحمت ہوتی ہے' یہ تمہارے نبی کی دعا کا نتیجہ ہے اور اس کے ذریعے تم سے قبل صالحین کی موت واقع ہو چکی ہے۔

پھر اس کا نبی کی دعاء کا نتیجہ ہونا تو اس کی تفسیر امام احمد نے حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے کی

ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی کہ چھ چیزوں کی وجہ سے ان کی امت ہلاک نہ ہو' یہ دعا قبول کر لی گئی' آپ نے دعا کی تھی کہ باہر سے کوئی دشمن اہلِ مدینہ پر غالب نہ ہو سکے' یہ دعا قبول کر لی گئی پھر آپ نے دعا کی تھی کہ یہ گروہوں میں نہ بٹ جائیں کہ ایک دوسرے کو تکالیف دیتے پھریں' اللہ نے اس دعا کی قبولیت روک دی جس پر آپ نے دعا کی تھی کہ بخار یا طاعون میں سے ایک کو روک دے' تین مرتبہ عرض کی تھی' طاعون میں ایک طرح کا مواخذہ اور پکڑ ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اس کی دعا اس وجہ سے کی تھی کہ ان کے ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کی جگہ لے سکے اور ان کی ہلاکت ایسے سبب سے ہو جس کی وجہ سے وہ بے فرمان نہ ہوں بلکہ ثواب حاصل کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے شہر کی طاعون سے حفاظت فرمائی جو انتقام پر مشتمل ہوتی ہے' یہ بات اس کے نبی کی عزت کی وجہ سے تھی اور اس کی بجائے ان کے لئے جسموں کو کمزور کر دینے والا بخار اس چیز کا بدل بنا دیا جو وہ ایک دوسرے کو تکلیف دیتا ہے نیز اسے ان کی پاکیزگی کا سبب بھی بنا دیا چنانچہ آپ کا یہ فرمان ''فَحُمّٰی اِذًا'' اس مقام کے لئے ہے جہاں طاعون داخل نہ ہوتی ہو بلکہ اس سے بچا لیا جس کا سبب آپ کا پڑوسی ہونا تھا اور آپ کا فرمان اَوْطَاعُوْنًا اس مقام کے لئے ہے جہاں سے بچا نہیں جا سکتا اور وہ سارے شہر ہیں۔

یہ ہے وہ مفہوم جو ان احادیث کو سمجھنے کے بعد میرے سامنے آیا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ مدینہ میں ہونے والا بخار فضیلت و عظمت والا ہے کیونکہ یہ ہمارے نبی ﷺ کی دعا کا نتیجہ ہے اور ہمارے ربّ کی رحمت بھی ہے جو ہمارے نبی کریم ﷺ کی دعا کے نتیجے میں لازماً ہونا ہوتی ہے اور یہ بھی وجہ ہے کہ یہ طاعون کے مقابلے میں ہے جو ان کے غیر کے لئے رحمت ہوتی ہے لہٰذا بخار ان اہلِ مدینہ کے لئے رحمت ہو گا چنانچہ یہ بخار وبائی نہیں ہے جو مدینہ پاک سے جا چکا تھا۔

۴۔ (یہ جواب حافظ ابنِ حجر نے قرطبی سے نقل کیا ہے) وہ یہ ہے: معنی یہ ہے کہ طاعون مدینہ میں اس طرح داخل نہ ہو سکے گی جیسے دوسرے مقامات پر داخل ہوتی ہے جیسے طاعونِ عمواس۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی طرح طاعون یہاں داخل ہو سکتی ہے حالانکہ ایسا ممکن نہیں' دیکھئے ابن قتیبہ اور ان کی پیروی کرنے والے بہت سے علماء نے جن میں آخری علامہ نووی ہیں' بڑے اعتماد سے یہ بات کہی ہے کہ طاعون مدینہ طیبہ میں بالکل داخل نہیں ہو گی اور نہ ہی مکہ میں' لیکن ایک جماعت علماء نے نقل کیا ہے کہ یہ ۷۴۹ھ میں مکہ کے اندر داخل ہو گئی تھی البتہ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکی' کسی بھی عالم نے ذکر نہیں کیا کہ یہ مدینہ میں داخل ہوئی تھی۔ پھر ابن حجر نے پہلی حدیث نقل کی جس میں مکہ کا ذکر بھی موجود ہے اور پھر کہا: اس بنیاد پر وہ طاعون جو مکہ میں داخل ہوئی تھی وہ ویسی طاعون نہ تھی جیسا کہ نقل کرنے والے کا گمان ہے بلکہ یہ ایک وباء تھی جو طاعون سے عام ہے' یا پہلے گذر جانے والا قرطبی کا جواب دیا جائے گا' انہوں نے فرمایا تھا: شائد انہوں نے اپنے جواب کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ طاعون وہ ہے جو آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی اور اس سے

بہت سارے لوگ مر گئے تھے' حالانکہ ایسا ہے نہیں کیونکہ صحیح بخاری میں ابو الاسود کا قول ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ: میں مدینہ پہنچا تو اہلِ مدینہ تیزی سے مر رہے تھے' یہ واقعہ مدینہ میں ہوا' یہ وباء تھی لیکن اسے طاعون کہنا درست نہیں' کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ ان احادیث میں اس طاعون سے مراد وہ ہے جو جن کے دخل سے رونما ہوئی' جس کی وجہ سے اس نے جسم میں خون کا دباؤ بڑھا دیا تو وہ مر گئے' ایسی طاعون ہرگز مدینہ میں داخل نہیں ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ زرکشی نے حضرت قرطبی سے نقل کرکے بتایا ہے کہ انہوں نے طاعون کی تفسیر عام پھیل جانے والی موت سے کی ہے لہٰذا زرکشی کا یہ قول اس بات میں صریح اور واضح ہے کہ ان کی مراد وہی ہے جو حافظ ابن حجر نے اس سے سمجھی ہے' اسے ان کا وہ قول رد کرتا ہے جو پہلی حدیث میں گذرا کہ: جب دجال مدینہ کے قریب راستہ میں ہوگا تو اسے وباء گھیرے گی جو لوگوں کو خوفزدہ کر دے گی کیونکہ اس میں وباء سے مراد وہ طاعون ہے جو اپنی علامات کے ذریعے ان کے ہاں جانی پہچانی ہے ورنہ صرف ایک شخص کی موت نہ تو خوفزدہ کرتی ہے اور نہ ہی اسے عام موت کہا جا سکتا ہے اور یہ بات بعید ہے کہ عام موت کو تنہا شہادت بنا دیا جائے جبکہ بعض اولیاء نے اطلاع دی ہے اور پھر کچھ اولیاء نے طاعون کے کئی سالوں میں جنات کو بیداری میں خود دیکھا کہ لوگوں کو طاعون میں پھنساتے تھے بلکہ یونہی خواب میں میں نے بھی انہیں ایسی چھیڑ خانی کرتے دیکھا تھا' میں نے دیکھا کہ میرے اور ان کے درمیان ایک پردہ سا تھا چنانچہ اس سال اللہ نے مجھے اس سے بچائے رکھا علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مقصد وہی ہے جسے علامہ قرطبی ذکر کر رہے ہیں تو پھر یہ گذشتہ اعتراض ویسے ہی باقی ہے' کیونکہ اس صورت میں یہ اعتراض ہوگا کہ اگر طاعون رحمت ہے تو مدینہ میں بڑھ چڑھ کر کیوں نہیں آتی لہٰذا حق بات وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے اور جیسا کہ بعض علماء کہتے ہیں' یہ بات آپؐ کے عظیم اور مسلسل معجزات میں سے ہے جو آپ کی علاماتِ نبوت میں سے ہے کیونکہ تمام طبیب مل کر بھی کسی شہر سے کبھی بھی طاعون کو نہیں نکال سکے جبکہ عرصۂ دراز گذرنے کے باوجود مدینہ پاک میں طاعون داخل ہونے سے رک چکی حالانکہ حجاز کے دوسرے علاقوں میں یہ آتی رہتی ہے مثلاً ینبع' جدّہ' فرع' صفراء اور خیف وغیرہ مدینہ کے قریبی علاقوں میں یہ حملہ کر چکی ہے لیکن ہمارے مشاہدے کے مطابق ۸۸۱ھ کے بعد تک یہاں داخل نہیں ہو سکی کیونکہ اس وقت یہ مدینہ کے قریبی علاقوں میں اکثر آئی تھی اور سب سے زیادہ جدّہ میں پہنچی تھی البتہ مکہ میں اس کے داخلے میں اختلاف ہے اور جیسا کہ ہم نے تحقیق کی' وہاں بہت سے لوگ مر گئے تھے' تاہم مدینہ میں بخار بہت ہوا لیکن کچھ زیادہ لوگ نہیں مرے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مدینہ منورہ مکمل طور پر اس کے حملے سے محفوظ ہی رہا' یہ اللہ کا محض احسان ہے۔

فصل نمبر ۶

مدینہ کی مٹی اور کھجور شفاء کا باعث ہیں

ہمیں کتاب ابن بخار اور ابن جوزی کی الوفاء میں ایک حدیث ملتی ہے کہ: ''مدینہ کریمہ کی خاک' کوڑھ سے شفاء کا سبب بنتی ہے۔'' پھر ابن اثیر کی جامع الاصول میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ جب تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو تبوک میں شمولیت سے رہ جانے والے کچھ صحابہ آپ سے ملے' انہوں نے گرد اڑائی تو حضور ﷺ کے ایک ساتھی نے اپنی ناک ڈھانپ لی' آپ نے ان کے ناک سے کپڑا ہٹا دیا اور پھر فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' مدینہ کی خاک میں ہر بیماری کے لئے شفاء موجود ہے۔''

خاکِ مدینہ باعثِ شفاء ہے

حضرت ابن رزین رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے ذریعے ایسی ہی روایت کی ہے البتہ یہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا: ''حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک آگے کر کے اس صحابی کے چہرے سے روکاوٹ دور کر دی اور فرمایا: کیا تمہیں علم نہیں کہ مدینہ کی عجوہ کھجور ہر بیماری سے شفاء کا سبب بنتی ہے اور خاکِ مدینہ کوڑھ دور کر دیتی ہے؟'' اسی کو ابن زبالہ نے صیفی بن ابو عامر رضی اللہ عنہ سے مختصر الفاظ میں ذکر کیا ہے' اس میں یہ الفاظ ہیں:

''مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ ''خاک مدینہ باعثِ امن ہے اور کوڑھ سے شفاء کا باعث بنتی ہے۔''

ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''مدینہ کا غبار کوڑھ سے شفاء کا باعث بنتا ہے۔''

میں بتاتا ہوں' میں نے ایسا شخص دیکھا ہے جسے اس کے غبار کے سبب کوڑھ سے نجات مل گئی تھی' اسے کوڑھ نے بہت ستایا تھا' وہ قباء کے راستے میں بطحان کے مقام پر مٹی کے سفید ڈھیر پر چلے جاتے' اس میں لوٹتے اور آتے وقت کچھ مٹی ساتھ بھی لے آتے جس سے انہیں بہت افاقہ ہوا۔

ابن زبالہ نے بتایا کہ' یحیٰی بن حسن بن جعفر علوی اور ابن نجار رحمہما اللہ نے یہ روایت لکھی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ بلحارث تشریف لے گئے' وہاں لوگ ست دکھائی دیئے' فرمایا: ''تمہیں کیا ہو گیا ہے ست کیوں ہو؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہمیں اس بخار نے گھیر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا تمہیں یہ مٹی کا ڈھیر دکھائی نہیں دیتا؟ انہوں نے عرض کی کہ اسے کیا کریں؟ آپ نے فرمایا' اس کی مٹی لے کر پانی میں حل کر دو پھر تم میں سے کوئی اس پر یہ دم کر دے: ''تُرَابُ اَرْضِنَا بِرِیْقِ بَعْضِنَا شِفَاءٌ لِمَرِیْضِنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا '' (ہماری اس زمین کی مٹی ہم میں سے کسی کی تھوک سے مل کر اللہ کے

حکم سے ہمارے بیمار کے لئے شفاء بن جائے) انہوں نے ایسا ہی کیا تو بخار نے انہیں چھوڑ دیا۔"

یہ لکھنے کے بعد ابن نجار رضی اللہ عنہ نے بتایا: ابو القاسم طاہر بن یحییٰ علوی کے مطابق "صعیب" ماجشونیہ کے علاوہ بطحان کی ایک وادی ہے' وہاں ایک گڑھا ہے جس سے لوگ مٹی لیتے ہیں' جب بھی کوئی وباء میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ یہاں سے مٹی لے جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات میں نے یحییٰ کی کتاب کے اس نسخہ میں دیکھی ہے جسے ان کے بیٹے طاہر نے ان سے روایت کیا ہے۔ ماجشونیہ وہ باغ ہے جو آج کل (مصنف کے دور میں) مدشونیہ کے نام سے مشہور ہے۔

ابن نجار نے اس کے بعد لکھا ہے کہ میں نے یہ گڑھا اس دور میں دیکھا ہے' میں نے دیکھا کہ لوگ وہاں سے مٹی اٹھالے جاتے ہیں' ان لوگوں نے بتایا کہ وہ تجربہ کر چکے ہیں کہ واقعی یہ شفاء کا باعث ہے' ابن نجار کہتے ہیں کہ میں نے بھی وہاں سے مٹی اٹھالی تھی۔

میں بتاتا ہوں کہ یہ گڑھا آج تک موجود ہے جو شروع سے مشہور چلا آتا ہے' لوگ اس سے مٹی لیتے اور شفاء کی غرض سے گھروں کو لے جاتے ہیں اور پھر میں نے حرم کی جڑی بوٹی لے کر اپنے ساتھی کو علاج کے لئے بھیجی تھی۔

پھر میں نے علامہ زرکشی کو دیکھا کہ انہوں نے فرمایا: جو لوگ حرم کی مٹی کو وہاں سے لے جانے پر منع کرتے ہیں' وہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک کی خاک لے جانے سے نہیں روکتے کیونکہ پہلے اور آج کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کی یہ خاک مرگی سے شفاء کا سبب بنتی ہے۔ مجھے جب ان کی بات کا پتہ چلا تو میں نے کہا کہ صعیب کی وہ مٹی کہاں ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں؟ کیونکہ میرے نزدیک اس کی کوئی اصل نہیں۔

علامہ مجد کہتے ہیں' علماء کی ایک جماعت نے بتایا کہ انہوں نے اس مٹی کا تجربہ کیا تو یہ بات صحیح نکلی۔ حضرت مجد مزید بتاتے ہیں کہ خود میں نے سال بھر کے اپنے مریض لڑکے کو گھول کر پلائی تھی جو مسلسل بخار میں مبتلا تھا تو اسی دن اس کا بخار اتر گیا۔

ایک اور مقام پر علامہ مجد نے اس کے ذریعے شفایاب ہونے کا طریقہ لکھا ہے کہ وہ لوگ اسے پانی میں گھول کر اس سے نہاتے ہیں' یونہی صعیب کا ذکر کرتے ہوئے جمال مطری نے کہا ہے کہ: وہاں ایک گڑھا ہے جہاں سے مٹی لی جاتی ہے' اسے پانی میں گھولا جاتا ہے اور بخار سے شفاء کے لئے اس سے نہایا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں' مناسب یہ ہے کہ مٹی کو پانی میں ڈال کر اس پر اوپر والی دعا پڑھی جائے اور پھر پیا بھی جائے اور اس سے نہایا بھی جائے۔

پھر ابو مسعود بن فرات رازی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کرنے تشریف لائے' وہ مریض تھے' آپ نے پڑھا: الٰہی یہ تکلیف دور کر دے' پھر آپ نے بطحاء سے مٹھی بھر مٹی لی' اسے پانی سے بھرے پیالے میں ڈالا اور پھر حکم فرمایا کہ ان کے جسم پر ڈال دیا گیا۔

صحیحین میں ہے کہ جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا یا اسے زخم وغیرہ ہوتا تو آپ انگلی سے اسے دم کرتے' یونہی حضرت سفیان اپنی انگشتِ شہادت زمین پر رکھتے اور پھر اسے اُٹھا کر پڑھتے بسم اللّٰہ تربۃ ارضنا بریق بعضنا یشفی سقیمنا باذن ربّنا۔

یونہی ابو داؤد نے بھی روایت کی ہے' ایک روایت میں ہے کہ آپ تھوک مٹی پر ڈالتے اور پھر تربۃ ارضنا والی دعا پڑھتے۔

ابنِ زبالہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس کے پاؤں پر زخم تھا' آپ نے ایک بوریا اٹھایا' پھر اپنی انگشتِ شہادت لعاب سے تر کر کے مٹی پر رکھی اور یہ دعا پڑھی اور انگلی اس زخم پر رکھ دی تو ایسا لگا کہ وہاں کوئی زخم تھا ہی نہیں۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ دئے: تراب ارضنا شفاء لقرحنا باذن ربّنا۔

مدینہ پاک کی کھجور میں شفاء

مسلم شریف میں ہے: ''جو شخص مدینے شریف کی سات کھجوریں صبح کے وقت کھالے' اسے کوئی شے ضرر نہیں پہنچائے گی۔''

صحیحین میں ہے کہ ''جو شخص صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھایا کرے تو اس دن اسے کوئی زہر اور جادو ضرر نہیں دے سکے گا۔''

امام احمد نے یہ حدیث لکھی ہے: ''جو شخص مدینہ کی سات عجوہ کھجوریں کھالے' اسے اس دن کی شام تک کوئی شے ضرر نہیں دے گی۔'' حضرت فلیح کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا' جو رات کے وقت کھالے گا' اسے صبح تک کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ ابن زبالہ نے یہ الفاظ ذکر کئے۔ ''جو شخص سات عجوہ کھجوریں صبح کو کھائے۔'' (اس کے علاوہ مجھے معلوم نہیں کہ فرمایا: ''عالیہ سے لائی ہوئی) تو پھر اس دن اسے نہ تو زہر نقصان دے گی' نہ ہی جادو۔'' صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے: مدینہ کے بالائی حصے سے آنے والی عجوہ کھجور میں شفاء ہے یا صبح کے کھائی جائیں تو تریاق کا کام دیتی ہیں۔ حضرت احمد نے ایک حدیث لکھی ہے کہ ''یقین کر لو کہ کھمبی آنکھ کی دواء ہے اور عجوہ جنت کا پھل ہے۔ پھر نسائی' ابو داؤد طیالسی اور طبرانی نے یہ حدیث لکھی ہے کہ ''کھمبی (قومِ موسیٰ پر اترنے والا کھانا) مَــنّ ہے اور اس سے نکلنے والا پانی آنکھوں کو شفا دیتا ہے' عجوہ جنت کا پھل ہے' یہ زہر کے لئے شفاء ہے۔''

پھر ابو داؤد میں حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے کہ فرمایا: میں ایک مرض میں گرفتار ہو گیا' رسول اللہ ﷺ میری بیمار پرسی کو تشریف لائے' آپ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا جس سے میرے دل میں ٹھنڈک محسوس ہوئی' آپ نے فرمایا' تمہیں دل کی تکلیف ہے' حارث بن کلدہ کے پاس چلے جاؤ کیونکہ وہ علاج کرتا ہے چنانچہ انہوں نے کہا

کہ مدینہ پاک کی سات عجوہ کھجوریں لے کر انہیں باریک کرلو اور چبا کر کھا جاؤ۔''

ابن اثیر کہتے ہیں' ایک کھجور وَجِیئَہ ہے' یہ وہ کھجور ہے جسے دودھ میں بھگویا جاتا ہے' پھر اسے دبایا جاتا ہے اور وہ (خشک ہونے کے بعد آپس میں مل جاتی ہے۔ انہی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں کھجوریں کھانے کا حکم دیا۔

ابن عدی رضی اللہ عنہ کی کامل میں حدیث ہے کہ ''سر درد کے لئے مدینہ منورہ کی سات عجوہ کھجوریں سات دن تک روزانہ کھائیں۔''

خطابی کی غریب الحدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہے کہ آپ سر درد اور سر چکرانے کے لئے صبح نہار منہ سات عجوہ کھجوریں کھانے کا فرمایا کرتیں۔

حدیث پاک میں لفظ ''دوام اور دواز'' سے مراد سر کی تکلیف ہے (سر درد یا سر چکرانا) اسی سے تدویم الطّائر کا لفظ بنا ہے' اس پرندے کو کہتے ہیں جو گول چکر میں اُڑتا ہے۔

حضرت خطابی کہتے ہیں کہ عجوہ کا زہر اور جادو سے بچاؤ کرنا' رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت تھی کیونکہ ذاتی طور پر اس میں یہ خاصیت نہیں ہے۔

حضرت نووی کہتے ہیں کہ عجوہ کو خاص کر لینا اور سات عدد دینا ایسے امور ہیں جن کی حکمت رسول اللہ ﷺ ہی جانتے ہیں' ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں' ہمیں اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی فضیلت کا اقرار کرنا لازم ہے' اس سلسلے میں جو کچھ ماذری اور قاضی نے کہا ہے' غلط ہے' یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ کوئی اُن کی بات سے دھوکا نہ کھا سکے۔ انتہی۔

قاضی نے اس بارے میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ زمین یا ہواء کا اثر ہوتا ہے جبکہ اسی سلسلے میں ماذری کا قول ہے کہ شاید یہ خصوصیت حضور ﷺ کے زمانہ سے تھی یا اکثر ایسا ہو جاتا ہے ورنہ غالباً ہمارے دور میں اس سے شفاء ہوتے نہیں دیکھی گئی اور اگر اکثر اوقات ایسا ثابت ہو بھی جائے تو اسے یوں خیال کیا جائے گا کہ انہوں نے عام طور شفاء مراد لیا ہے۔

ابن التین نے تو اسے صرف ایک احتمال ہی کہا ہے اور ایک عجیب بات کہہ دی ہے' وہ کہتے ہیں کہ احتمال یہ ہے' کہ مدینہ میں کھجور کا ایسا درخت ہو جو مدینہ میں آج تک معلوم نہیں ہو سکا اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ خصوصیت صرف حضور ﷺ کے دَور سے تعلق رکھتی ہو۔ انتہی۔

لیکن ابن التین کا یہ احتمال رد کیا گیا کیونکہ احادیث کا اس قدر پایا جانا' علماء کا انہیں ذکر کرنا اور لوگوں کا اس بات پر اتفاق کر لینا کہ مدینہ کی عجوہ کھجور اور دیگر کھجوروں کا باعثِ برکت ہونا' حضور ﷺ کے زمانہ سے اس کی خصوصیت ثابت نہیں کرتا اور پھر اصل بھی یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں' عجوہ اس بارے میں مشہور ہے' لوگ ابتداء سے آج تک اسے

استعمال کرتے چلے آتے ہیں‘ سب لوگ یہ بات اس طرح جانتے ہیں کہ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔

حضرت داؤدی کہتے ہیں کہ یہ مدینہ کی درمیانی قسم کی کھجور ہے جیسے کہ ہم دیکھتے ہیں‘ ان کے علاوہ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ مدینہ کی بہترین کھجور ہے‘ ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ ہلکی نہیں۔

ابن اثیر کہتے ہیں کہ عجوہ کھجوروں کی ایک قسم ہے جو صیحانی سے بڑی اور سیاہی مائل ہوتی ہے اور یہ وہ کھجور ہے جسے نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

یہ آخری بات بزاز نے بھی لکھی ہے تو شاید کھجور کے وہ قلم جن کی شرط پر آپ کے آزاد کرنے کی آپ کے اہلِ خانہ سے بات ہوئی تھی اور حضور ﷺ نے اسے فقیر یا کسی اور بالائی جگہ پر گاڑ دیا تھا‘ وہ عجوہ تھی اور واقعی یہ عجوہ فُقَیر میں آج تک پائی جاتی ہے اور یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کے دست اقدس سے لگانے کی وجہ سے ایک نئی قسم تیار ہوئی ہو اور تمام کھجوریں اسی کی وجہ سے بڑھی ہوں‘ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ابن حبان حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو مدینہ کی سب کھجوروں میں سے ''عجوہ'' پسند تھی۔

ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ '' تمہاری کھجوروں میں سے بہتر برنی کھجور ہوتی ہے جو بیماری دور کرتی ہے لیکن کوئی مرض پیدا نہیں کرتی۔''

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے کہ فرمایا: وہ گھر جس میں کوئی کھجور نہیں ہوتی‘ بھوکا شمار ہوتا ہے‘ آپ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا اور اسی میں حدیث ہے کہ ایسا گھر بھوکا شمار نہیں ہوتا جس میں کھجور موجود ہو۔

طبرانی کی کبیر اور صغیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی نیا پھل پیش کیا جاتا تو اسے آنکھوں سے لگاتے اور فرماتے: اے اللہ! جیسے تم نے اوّل پھل کھانے کو دیا ہے‘ آخری بھی نصیب فرما‘ اس کے بعد آپ اپنے گھر میں موجود کسی بچے کو دے دیتے۔

کبیر کے الفاظ یہ ہیں کہ جب آپ کے پاس ابتدائی پھل لایا جاتا۔ تو اسے چومتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ الحدیث۔

حضرت ترمذی کی نوادر الحکیم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث آئی ہے‘ فرمایا جب بھی حضور ﷺ کے کوئی نیا پھل آتا تو اسے چومتے اور دائیں بائیں آنکھوں پر تین تین مرتبہ لگاتے اور پھر مذکور دعا فرماتے۔

حضرت بزاز نے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا‘ اے عائشہ! جب بھی تازہ پھل آیا کرے تو مجھے مبارک دیا کرو۔ یہ روایت غیلانیات میں ہے‘ انہی میں یہ حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تازہ کھجوروں کے دنوں میں تازہ کھجور سے افطاری فرمایا کرتے۔ اور اگر تازہ کھجور نہ ملتی تو عام کھجور سے افطاری فرماتے اور اسی سے گذارہ فرماتے‘ طاق عدد کھاتے یعنی تین‘ پانچ یا سات عدد کھاتے‘ اسی میں اور حدیث ہے کہ نہار منہ کھجور کھایا کرو کیونکہ یہ پیٹ کے کیڑے

مار دیتی ہے۔

مدنی کھجوروں کی اقسام

مدنی کھجوروں کی قسمیں بہت سی ہیں' اصل کتاب میں ہم نے ممکن حد تک انہیں جمع کرنے کی کوشش کی ہے' یہ ایک سوتیس سے کچھ زیادہ قسم کی ہیں' انہی میں سے ایک قسم ریحانی کہلاتی ہے چنانچہ ابراہیم بن محمد بن مؤید حموی نے اپنی کتاب "فضل اہل البیت" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت لکھی ہے' فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھا' آپ مدینہ کے ایک باغ میں تھے' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ آپ کے مبارک ہاتھ میں تھا' حضرت جابر کہتے ہیں' ہم ایک کھجور کے پاس گئے' وہ کھجور کا درخت زور سے بولا: یہ نبیوں کے سردار محمد ﷺ ہیں اور یہ علی ہیں جو اللہ کے اولیاء کے سردار ہیں جو پاکیزہ اماموں کے باپ ہیں۔اس کے بعد ہم ایک اور درخت کے پاس گئے تو وہ بھی زور سے بولا یہ اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں اور یہ اللہ کی تلوار' علی ہیں' یہ سن کر حضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف دیکھا اور فرمایا' اے علی! کھجور کے اس درخت کا نام صیحانی رکھ دو چنانچہ اس دن سے اس کا نام صیحانی (چلّانے والا) پڑ گیا۔یہ وہ سبب تھا جس کی وجہ سے اس کھجور کی قسم کا نام صیحانی رکھا گیا کیونکہ یہ تمام درخت اسی سے پیدا ہوئے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے اس باغ کا نام صیحانی رکھا ہو' آج کل مدینہ میں "جفاف" ایک مقام ہے جو صیحانی کے نام سے معروف ہے۔

فصل نمبر ۷

سرزمین مدینہ کی خصوصیات کا ذکر

یہ خصوصیات حد و حساب سے باہر ہیں' اب میں انہیں ذکر کر رہا ہوں ان میں میں نے مکہ کی کچھ خصوصیات بھی شامل کر دی ہیں چنانچہ بتوفیق الٰہی بیان کر رہا ہوں:

خصوصیت نمبر ۱:

پہلی خصوصیت وہ ہے جس کا ذکر میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ اسی مبارک مٹی سے پیدا ہوئے تھے' یونہی حضرت ابوبکر و عمر اور اکثر صحابہ کرام اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم بھی اسی مٹی سے پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل و میکائیل علیہما السلام کو بھیجا کہ اس زمین سے مٹھی بھر مٹی لے آئیں لیکن زمین نے اس سے انکار کر دیا اور آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو بھیجا تو اس نے مٹھی بھر لی' ابلیس نے زمین پر گشت کی تھی' اس کا کچھ حصہ دو قدموں کے درمیان تھا اور کچھ وہ حصہ تھا جہاں اس کے قدم پڑے تھے

چنانچہ نفسِ انسانی اس زمین سے بنا تھا جو اس کے قدموں کو لگ چکی تھی' یہی وجہ ہے کہ نفس انسانی شر کا مرکز ہے اور وہ مٹی جہاں ابلیس کے قدم نہیں لگ سکے' وہ انبیاء و اولیاء کی پیدائش کی مٹی بنی۔ یہ بات عوارف میں ہے اور حضورﷺ سا نگینہ اس مٹی سے بنا جہاں سے حضرت عزرائیل علیہ السلام نے مٹی اٹھائی' وہ مقام اللہ کی نظر میں تھا جسے ابلیس کا قدم نہیں لگا تھا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے فرمایا کہ:

اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ○ (سورۂ فصلت:۱۱)

''دونوں حاضر ہو' خوشی سے' جانا خوشی لے۔''

تو زمین کے اس حصے نے حکم مانا جہاں کعبہ موجود ہے اور آسمان کے اس کی سیدھ والے حصے نے اطاعت کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ حضورﷺ کی اصل پیدائش زمین کے عین درمیان یعنی کعبہ سے ہوئی' یہ چیز بتاتی ہے کہ زمین میں سے اس فرمان کا جواب سب سے پہلے آپ جیسے موتی نے دیا تھا اور کعبہ سے زمین کی ابتداء ہوئی چنانچہ حضورﷺ ہر چیز کی اصل قرار پا گئے۔

عوارف میں اس کے بعد لکھا ہے کہ کسی شخص کی مٹی وہیں سے لی جاتی ہے جہاں اس نے دفن ہونا ہوتا ہے چنانچہ آپ کی جائے دفن یہاں ہونا چاہئے تھی لیکن کہتے ہیں کہ جب پانی کی موجیں اُٹھ رہی تھیں تو اس نے جھاگ اردگرد پھیلا دی چنانچہ حضورﷺ کا موتی اس مقام پر آ ٹھہرا جہاں حضورﷺ کی قبرِ انور ہے چنانچہ آپ مکی بھی ہوئے اور مدنی بھی۔

میں کہتا ہوں کہ ابتداء میں فضیلت مکہ کو حاصل ہوئی اور پھر آپ کے قیام اور مزار کی وجہ سے مدینہ کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

فضیلت نمبر۲:

چونکہ زمین مدینہ وہ مقام ہے جس پر اجماع ہے کہ وہ سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے جیسے پہلے تحقیق گزر چکی ہے۔

فضیلت نمبر۳:

یہاں ساری امت سے زیادہ فضیلت والے اور بہت سے وہ صحابہ دفن ہیں جو بہترین دور پا گئے تھے۔

فضیلت نمبر۴:

اس زمین نے انہیں اپنے اندر سمایا ہوا ہے جو ان شہداء سے بھی افضل ہیں جنہوں نے حضورﷺ کے سامنے ذاتِ الٰہیہ کے لئے جانیں نچھاور کر دیں چنانچہ آپ ان کے گواہ ہوں گے۔

قاضی عیاض نے مدارک میں اور ابن جوزی نے اپنے منسک میں نقل کیا ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ فضیلتِ مدینہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ یہ مقام ہجرت ہے' سنت کا گھر ہے' اس میں شہداء ہیں اور اس میں وہ لوگ دفن ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بہتر ہیں۔

فضیلت نمبر ۵:

اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ساری مخلوق میں سے افضل اور اپنے کے ہاں سب سے زیادہ باوقار (ﷺ) کی رہائش گاہ بنایا اور پھر ان کا آخری ٹھکانہ یہیں بنا۔

فضیلت نمبر ۶:

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی امداد اور ٹھہرانے کے لئے ان لوگوں کا انتخاب کیا جو اس شہر میں رہتے تھے۔

فضیلت نمبر ۷:

سب شہر تلوار چلا کر فتح کئے گئے لیکن یہ شہر قرآن کی برکت سے فتح ہوا جیسے حضرت امام مالک سے روایت ملتی ہے۔

فضیلت نمبر ۸:

اسی شہر کی بدولت سارے اسلامی شہر فتح ہوئے اور مکہ بھی تو اسی شہر کے بل بوتے پر فتح ہوا اور اللہ نے اسے اپنے صحیح دین کا مظہر بنا دیا۔

فضیلت نمبر ۹:

جیسا کہ قاضی عیاض نے علماء کا اس بات پر اتفاق ذکر کیا ہے کہ فتح مکہ سے قبل اسی کی طرف ہجرت واجب قرار دی گئی تھی اور لوگوں پر واجب کر دیا گیا کہ یہاں نبی کریم ﷺ کی مدد کے لئے ٹھہریں اور آپ ان کی غمخواری کر سکیں۔ قاضی بتاتے ہیں کہ جو فتح مکہ سے پہلے ہجرت کر گئے' جمہور علماء انہیں فتح مکہ کے بعد یہاں قیام کرنے سے منع کرتے ہیں' انہیں حج کے کام سرانجام دینے کے بعد صرف تین دن تک یہاں ٹھہرنے کی اجازت تھی۔

خصوصیت نمبر ۱۰:

قیامت کے دن اس امت میں سے فضیلت والے لوگ یہیں سے اٹھیں گے جیسے کہ قاضی عیاض نے حضرت مالک سے روایت کرتے ہوئے مدارک میں لکھا ہے جہاں انہوں نے فضائل مدینہ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بات حضرت امام مالک نے اپنی طرف سے نہیں فرمائی تھی۔

خصوصیت نمبر ۱۱:

اسے یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس کے نام مؤمنہ اور مُسْلِمَۃ رکھے گئے حضور ﷺ کی قبر انور کا نام بھی مؤمنہ ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایمان کی صفت اور صلاحیت پیدا فرما دی ہو۔

خصوصیت نمبر ۱۲:

اس زمین کی (مکہ کی) نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوئی:

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً ○ (سورۃ النساء:۹)

"کیا اللہ کی زمین (مدینہ) کشادہ نہ تھی۔"

جیسے کہ مدینہ کے ناموں میں گذر چکا حالانکہ زمین کا ذکر کرتے ہوئے اسے اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ارض اللہ سے مراد مکہ ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ ○ (سورۃ انفال:۲۶)

"اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے ملک میں دبے ہوئے۔"

فضیلت نمبر ۱۳:

اللہ تعالیٰ نے اس زمین کی نسبت ان الفاظ کے ذریعے اپنے رسول کی طرف فرمائی:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ○ (سورۃ انفال:۵)

"جس طرح اے محبوب! تمہیں تمہارے ربّ نے تمہارے گھر سے حق کے ساتھ برآمد کیا۔"

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

فضیلت نمبر ۱۴:

اللہ تعالیٰ نے اس شہر کا نام لے کر قسم کا ذکر فرمایا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ○

"مجھے اس شہر کی قسم۔"

جیسے ناموں کے ذکر میں گذر چکا ہے یعنی میں آپ کے لئے اس شہر کی قسم کا ذکر کرتا ہوں جسے آپ کی وجہ سے عظمت حاصل ہے۔یہاں "لا" حرف زائد ہے (اس کا کوئی معنیٰ نہیں) صرف تاکید کے لئے آیا ہے چنانچہ حضرت حسن اور اعمش کی قراءت میں لَاُقْسِمُ ہے۔

فضیلت نمبر ۱۵:

اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں ابتداءً اسی شہر کا ذکر کیا ہے چنانچہ:

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۝

"اے میرے ربّ مجھے سچی طرح داخل کر اور سچی طرح باہر لے جا۔"

چنانچہ مدخل صدق سے مراد مدینہ طیبہ ہے اور مخرج (نکلنے کی جگہ) مکہ ہے جیسے کہ گذر چکا حالانکہ جس ترتیب سے یہ واقعہ (ہجرت) ہوا تھا' اس لحاظ سے' پہلے نکلنے کی جگہ کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔ اگر یہ سوال ہو کہ اسے مقدم تو اس لئے کیا گیا ہے کہ داخل ہونے کا اہتمام ہو سکے تو ہم کہیں گے کہ اس کے اہتمام ہی میں عظمت موجود ہے۔

فضیلت نمبر ۱۶:

تورات میں اس کے نام مرحومہ وغیرہ آئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اسی مقام کے بارے میں خطاب فرمایا تھا۔

فضیلت نمبر ۱۷:

حضور ﷺ نے اسے اپنا ایسا محبوب بنانے کی دعا فرمائی جیسے مکہ سے محبت تھی بلکہ اس کی محبت میں زیادتی کی دعا کی پھر اس کو حَبِیْبَہ وغیرہ نام رکھے جیسے کہ گذر چکا' علاوہ ازیں آپ نے یہ دعا بھی فرمائی کہ آپ کو یہیں ٹھہرایا اور اچھی روزی کی دُعا فرمائی۔

فضیلت نمبر ۱۸:

اسے یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ آپ جب مدینہ کی دیواریں دیکھتے تو اپنے چوپائے کو متحرک کرتے اور بوجھ ہلکا کرتے اور جب مکہ سے آتے اور اثایہ پہنچتے تو اپنے دونوں کندھوں سے چادر اتار لیتے اور فرماتے کہ کتنی بہترین خوشبوئیں آ رہی ہیں۔

فضیلت نمبر ۱۹:

آپ اس کے لئے برکت وغیرہ کی دُعا کا اہتمام فرماتے۔

فضیلت نمبر ۲۰:

سب انبیاء سے افضل ﷺ کی زبان سے اس کی عزت افزائی کے الفاظ نکلے تھے۔

فضیلت نمبر ۲۱:

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی مسجد کی اپنے ہاتھوں سے بنیاد رکھی اور خود کام کرتے رہے' آپ کے ساتھ اُمت کے بہترین لوگ پہلے مہاجرین اور اوّل انصار شامل رہے۔

فضیلت نمبر ۲۲:

مدینہ ہی کی مسجد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں یہ آیت اُتری:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ

''وہ مسجد کہ پہلے ہی دن سے جس کی بنیاد پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے' وہ اس قابل ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔''

فضیلت نمبر ۲۳:

اسے یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر اور آپ کے منبر کے درمیان جنت کی کیاری موجود ہے' ایک روایت میں یہ ہے: کہ میرے منبر اور حجروں کے درمیان جنت کی کیاری موجود ہے اور آگے یہ بیان آ رہا ہے کہ یہ فرمان (جنت کی کیاری) پوری مسجد نبوی کو شامل ہے جیسے کہ مسجد شریف کی حدود میں یہ معاملہ لوگوں میں مشہور ہے' اسی لئے کچھ علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ مسجد وہ ہے جس کے بغیر جنت کا کوئی اور ٹکڑا زمین پر موجود نہیں۔

فضیلت نمبر ۲۴:

اسے یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپ کا منبر شریف جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے اور منبر کے پائے جنت میں جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ایک اور روایت میں ہے کہ ''میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہے۔''

فضیلت نمبر ۲۵:

آپ کی مسجد میں جیسا کہ آگے آ رہا ہے' عمل کرنے کا اجر کئی گنا تک ملتا ہے۔

فضیلت نمبر ۲۶:

اسی کی مسجد کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ ''جو شخص میری اس مسجد میں چالیس نمازیں پڑھ لے گا' اسے جہنم' عذاب الٰہی اور منافق ہونے سے محفوظ کر دیا جائے گا۔طبرانی نے اسے اوسط میں لکھا ہے۔

فضیلت نمبر ۲۷:

آگے آ رہا ہے کہ جو شخص پاکیزہ ہو کر اس مسجد میں نماز کے علاوہ کوئی دوسرا ارادہ لے کر نہیں جاتا تو اس کے

لئے حج کا ثواب لکھا جائے گا اور نکلنے والا جب گھر سے نکل کر اس کی طرف آئے گا تو اس کے ایک قدم رکھنے پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک قدم کی بناء پر ایک گناہ مٹا دیا جائے گا۔

فضیلت نمبر ۲۸:

اسی کی مسجد قباء میں آنا ایک عمرے کے برابر ہے جیسے آگے آ رہا ہے۔

فضیلت نمبر ۲۹:

اسی کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ: مدینہ میں ماہِ رمضان کے روزے رکھنا یوں ہے جیسے کسی اور شہر میں ایک ہزار مہینے کے روزے رکھے پھر مدینہ میں جمعہ کی ایک نماز دوسری جگہوں پر ہزار نمازوں سے افضل ہے غرض نیکی کا ہر کام یہاں ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے جیسے مکہ کے بارے میں کہا گیا ہے اور علامہ ابوسلیمان داؤد شاذلی رحمہ اللہ نے الانتصار میں یہی صراحۃ کہا ہے پھر میں نے ''اِحیاء'' میں دیکھا' فرمایا: اعمال کا ثواب مدینہ میں دوگنا ہو جاتا ہے جیسے آپ کی اس حدیث میں ہے: صلوٰۃ فی مسجدی۔ پھر اسی نے فرمایا کہ یونہی ہر عمل کا ثواب ہزار گنا ہوتا ہے۔

ابن رفعہ نے ''مطلب'' میں کہا ہے: بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں روزہ رکھنا نماز سے افضل ہوتا ہے اور مکہ میں نماز پڑھنا روزہ سے افضل ہوتا ہے کیونکہ اس میں نماز روزہ کے نزول کا لحاظ رکھا گیا ہے (کیونکہ نماز مکہ میں فرض ہوئی اور روزہ مدینہ میں) انتہی۔

میں کہتا ہوں کہ اس سبب کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ عبادت جو مدینہ میں شروع ہوئی تو یہ مکہ سے افضلیت والی ہو گی۔ تم چاہو تو اسے بھی خصوصیتِ مدینہ شمار کر سکتے ہو۔

فضیلت نمبر ۳۰:

اس کی خصوصیت میں یہ حدیث ہے کہ جو شخص میری اس میں سے اذان کی آواز سن کر بلا ضرورت باہر نکل جاتا ہے اور واپس نہیں آتا' وہ منافق ہوتا ہے۔

فضیلت نمبر ۳۱:

مسجد میں مدینہ تعلیم اور تعلم کی تاکید کی گئی ہے جیسے آگے آ رہا ہے۔

فضیلت نمبر ۳۲:

اسے خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا بہت زیادہ ادب کیا جائے اور اس میں آواز پست رکھی جائے کیونکہ حاضری دینے والا شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ہوتا ہے جو سارے رسولوں کے سردار ہیں۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ یہاں تھوم وغیرہ لے کر نہ جاؤ کیونکہ یہ مسجد فرشتے کی وحی کا مقام ہے۔

فضیلت نمبر۳۳:

اس کے محراب میں تردد کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بالکل صحیح سمت میں ہے چنانچہ اس کے دائیں بائیں ہونے کا وہم نہ کرے' ہاں مسلمانوں کے دوسرے محرابوں میں ایسا وہم ہوسکتا ہے۔مقصد آپ کا مصلّٰی ہے۔حضرت رافعی کہتے ہیں کہ وہ تمام مسجدیں اسی حکم میں داخل ہیں جن میں آپ نے نماز پڑھی تھی' کیونکہ ان کے محراب اسی وقت درست ہو گئے تھے۔میں کہتا ہوں کہ اس کے بغیر محراب کا رُخ معلوم کرنا مشکل ہے۔

فضیلت نمبر۳۴:

خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ کے منبر اور مسجد مصلّٰی کے درمیان جنت کی ایک کیاری ہے' یہ جگہ اس شہر میں سے بڑی جانب ہے۔

فضیلت نمبر ۳۵:

یہ بھی خصوصیت ہے کہ اسی میں اُحد کے بارے حدیث ملتی ہے: اُحدؑ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر موجود ہے پھر یہ حدیث بھی اس کی خصوصیت بنتی ہے کہ: اُحد ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔

فضیلت نمبر ۳۶:

یہ حدیث بھی خصوصیت بتاتی ہے کہ بطحان (وادی) جنت کے ایک دروازے پر ہے۔

فضیلت نمبر۳۷:

وادی عقیق کو وادیٔ مبارک کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضورﷺ کو اس سے محبت تھی۔ایک اور روایت میں ہے کہ اس سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ ہم سے محبت رکھتی ہے۔

فضیلت نمبر ۳۸:

اسی شہر میں ٹھہرنے کے لئے آپ نے اُمت کو اُبھارا۔

فضیلت نمبر ۳۹:

یہ زور دیا کہ یہاں اپنی جائیداد رکھو۔

فضیلت نمبر۴۰:

یہاں مرنے کی ترغیب دی پھر آپ نے یہاں ٹھہرنے پر شفاعت' شہادت یا دونوں کا وعدہ فرمایا۔

فضیلت نمبر ۴۱:

حضور ﷺ نے یہاں وصال کی حرص رکھی۔

فضیلت نمبر ۴۲:

اہلِ مدینہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی شفاعت سب سے پہلے ہو گی علاوہ ازیں انہیں خصوصی شفاعت اور عزت ملے گی۔

فضیلت نمبر ۴۳:

یہاں فوت ہونے والوں کو امن و امان سے اٹھایا جائے گا جیسے آگے آ رہا ہے۔

فضیلت نمبر ۴۴:

اس میں موجود بقیع سے ستر ہزار لوگ چاند کی طرح چمکتے اٹھیں گے اور جنت میں بے حساب و کتاب داخل ہوں گے اور اتنے ہی لوگ بنو سلمہ کے قبرستان سے اُٹھائے جائیں گے' بقیع کے قبرستان پر فرشتے مقرر ہیں' یہ جب بھر جاتا ہے' وہ اسے کناروں سے پکڑ کر جنت میں ڈال دیتے ہیں۔

فضیلت نمبر ۴۵:

پہلے اہلِ مدینہ کو سب لوگوں سے پہلے قبروں سے اٹھایا جائے گا۔

فضیلت نمبر ۴۶:

اسے یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس کی تکالیف اور مشقتوں پر صبر کرنے والوں کی یا تو آپ گواہی دیں گے یا ان کی شفاعت فرمائیں گے۔

فضیلت نمبر ۴۷:

آپ کی قبرِ انور کی زیارت کرنے والے کے لئے آپ کی شفاعت واجب ہو گی۔

فضیلت نمبر ۴۸:

مدینہ منورہ میں قبرِ انور کے قریب دُعا قبول ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسطوانہ جات پر دُعا قبول ہوتی ہے' پھر منبر کے قریب' بقیع میں دارِ عقیل کے گوشے پر' بدھ کے دن نمازِ ظہر کے بعد مسجد فتح میں پھر ''مسجدِ الاجابہ'' میں' ''مسجد سقیا'' میں اور آتے وقت مصلّٰے (جائے نماز) میں' عید کے دن ''برکت السوق'' میں' احجارِ زیت اور سوق میں کیونکہ قبولیت دُعا کے مقامات میں آگے آ رہا ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس بارے میں روایات ملتی ہیں۔

فضیلت نمبر ۴۹:

یہ ایسا شہر ہے جو یہاں سے میل کو دور کر دیتا ہے۔

فضیلت نمبر ۵۰:

یہ ایسا شہر ہے کہ گناہ ایسے دور کرتا ہے جیسے آگ چاندی کی میل اُتار دیتی ہے۔

فضیلت نمبر ۵۱:

جو لوگ اہلِ مدینہ منورہ پر ظلم کرتے یا انہیں ڈراتے ہیں ان کے لئے شدید ڈانٹ ہے۔

فضیلت نمبر ۵۲:

جو مدینہ اور اہلِ مدینہ سے برا ارادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے یوں ڈھال دیتا ہے جیسے پانی میں نمک پگھل جاتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ اسے دوزخ میں پگھلا دے گا۔

ارادۂ بد کرنے والے کو ڈانٹ کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اس معاملے میں برابر ہیں اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ ○ (سورۂ حج:۲۵)

''اور جو اس میں کسی زیادتی کا ناحق ارادہ کرے۔''

اور مساوات کے لئے حضور ﷺ کی یہ حدیث بھی سامنے رکھیں كَمَا حَرَّمَ اِبْرَاهِيْمُ مَكَّةَ (جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کی عزت بنائی) تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فرمان: کوئی ایسا شہر نہیں جس میں کام کرنے سے پہلے صرف ارادہ کرنے پر پکڑ ہو صرف مکہ ایسا شہر ہے اور پھر آیت پڑھی تو اس قول میں اشکال پیدا ہو گا اور یہ بات بھی ہے کہ جو پختہ کئے ارادہ بغیر ارادہ ہوتا ہے اس پر پکڑ بالکل نہیں ہوتی اس پر اتفاق ہے اور وہ جو ثابت ہے جس کے ساتھ پختہ ارادہ شامل ہے تو بندہ کو اس پر پکڑ ہوتی ہے مکہ اور اس کے علاوہ صرف حرم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں جرأت سے ارادہ کرنے والے کے لئے عظیم عذاب ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت احمد نے آیت کا مفہوم بتانے کے لئے یہ حدیث لکھی ہے: ''اگر کوئی آدمی اس میں بے دینی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ اسے درد ناک عذاب چکھاتا ہے۔''

فضیلت نمبر ۵۳:

اس شخص کے لئے شدید ڈانٹ ہے جو یہاں کوئی برا کام شروع کرے یا ایسے شخص کو ٹھکانہ دے اور کسی بھی گناہ کے بارے میں وضاحت گذر چکی ہے اور یہ آچکا ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا اس بارے میں شدید ڈانٹ ہے کیونکہ یہ سب رسولوں میں سے اشرف و اعلیٰ کے ہاں ہوا ہوتا ہے اور بادشاہ کی حکومت میں بے ادبی ہے اور ایسی نہیں کہ دوسرے

حکمرانوں کی بادشاہی میں ہو۔

ایک پہلے بزرگ نے کہا کہ گناہ کرنے سے بچو' اگر کرنا ہی ہے اور ضروری ہے تو گناہ کے مقامات پر کرے نہ کہ اجر ملنے کے مقامات پر تاکہ کہیں تم پر بوجھ نہ بڑھ جائے یا جلد کوئی سزا نہ وارد ہو جائے۔

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ یہ قول وہ ہے جو حرم میں گناہ کا دوہرا بوجھ بتاتا ہے حالانکہ ترجیح اس بات کو ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (سورۂ انعام:۱۶۰)

جواب: ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس جھگڑے کا حل یہ ہے کہ جو شخص دوگنے بوجھ کی بات کرتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مقدار بوجھ کے دوگنا ہونے کا ارادہ لئے ہوئے ہے یعنی اس کا بڑا ہونا دیکھتا ہے گنتی نہیں دیکھتا کیونکہ گناہ کی جزاء ایک گناہ ہی ہوتی ہے لیکن ان کی سزا مختلف لوگوں اور مختلف مقامات کی بناء پر ایک جیسی نہیں ہوتی جیسے ہر ایک کا ڈانٹ میں اندازہ ہر ایک کے حال کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ برائی کی جزاء اس جیسی ہی ہوتی ہے اور ایک جیسا ہونے میں رعایت اس چیز کی ہوتی ہے جو اس کے ساتھ ملی ہو یعنی وہ چیز جو برائی کا ارتکاب کرنے والے کی جرأت پر دلالت کرے اور ایک ہی لکھی جائے۔ واللہ اعلم۔

فضیلت نمبر ۵۴:

ایسے لوگوں کے لئے ڈانٹ ہے جو اس میں رہنے والوں کی عزت نہیں کرتا حالانکہ ان کی عزت کرنا اور ان کی حفاظت اُمت پر لازم ہے' حضور ﷺ تو ان لوگوں کی شفاعت کریں گے یا ان کی گواہی دیں گے جو اہلِ مدینہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

فضیلت نمبر ۵۵:

ایسے لوگوں کے بارے میں حدیث موجود ہے "جو اہلِ مدینہ کو ڈرائے تو گویا اس نے میرے دل کو خوف دلانے کی کوشش کی۔"

فضیلت نمبر ۵۶:

یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ "جو مدینہ منورہ سے تین دن مسلسل غائب ہو جائے' جب واپس آئے گا تو اس کا دل ظلم کی طرف مائل ہو گا۔" نیز یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ "جو شخص اس سے منہ موڑ کر نکل جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں یہاں اس سے کسی بہتر کو لے آئے گا۔"

محب طبری کہتے ہیں' اس میں بتایا جا رہا ہے کہ مدینہ سے نکلنا بری بات ہے اور کچھ اس طرف ہیں کہ یہ بات حضور ﷺ کی مبارک زندگی سے مخصوص تھی' رہا آپ کی وفات کے بعد تو بہت سے عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہاں سے

چلے گئے تھے لیکن دوسرے علماء کہتے ہیں کہ بات ہمیشہ کے لئے یونہی ہے۔

طبری کہتے ہیں کہ یہ مفہوم لفظوں کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے ہاں یہ بات مدینہ کو وطن بنا لینے سے مخصوص ہے ایسا شخص مراد نہیں جو ایک مدت تک یہاں ٹھہرنے کی نیت کرے اور پھر اپنے وطن کو چلا جائے۔

فضیلت نمبر ۵۷:

اسے اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز بخشا ہوا ہے کہ وباء کو یہاں سے نکال دیا تھا اور بخار کو کسی اور جگہ بھیج دیا تھا۔

فضیلت نمبر ۵۸:

اس کی مٹی سے شفاء حاصل ہوتی ہے اور دوسری خصوصیت اس کے پھلوں کے بارے میں بیان ہو چکی۔

فضیلت نمبر ۵۹:

اسے طاعون کے حملے سے بچا لیا گیا ہے۔

فضیلت نمبر ۶۰:

یہ دجال سے محفوظ ہے اور یہیں سے دجال کی طرف جانے کے لئے ایک شخص نکلے گا جو سب لوگوں سے بہتر ہو گا' وہ دجال سے کہے گا' میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی دجال ہے اور یہ بھی خصوصیت ہے کہ آخر میں دجال اس پر غالب نہ ہو سکے گا' اسی وجہ سے مدینہ' مکہ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ سید المرسلین ﷺ مدینہ منورہ میں موجود ہیں جو بندوں پر اللہ کی واضح دلیل ہیں۔

فضیلت نمبر ۶۱:

حدیث طبرانی میں یہ خصوصیت ملتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ مدینہ کی زیارت کرے۔''

فضیلت نمبر ۶۲:

مدینہ ہی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں حضور ﷺ سلام کہنے والے کا سلام خود سنتے ہیں اور اپنی قبر شریف کے قریب درود پڑھنے والے کا درود بھی سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں۔

فضیلت نمبر ۶۳:

اس شہرِ مقدس کو ایمان اور حیاء کا مرکز ہونے کی خصوصیت حاصل ہے۔

فضیلت نمبر ۶۴:

آخر کار ایمان یہاں کھنچ آئے گا۔ (کہیں اور نہیں رہے گا)۔

فضیلت نمبر ۶۵:

فرشتے نہایت مضبوطی سے اسے سنبھالے ہوئے ہیں اور اس پر پہرہ دے رہے ہیں۔

فضیلت نمبر ۶۶:

اس شہرِ انور کو یہ خصوصیت ملی کہ اس اُمت کی خاطر یہاں سب سے پہلے عام مسلمانوں کے لئے مسجد بنائی گئی۔

فضیلت نمبر ۶۷:

یہاں کی مسجد کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب انبیاء کی مسجدوں میں سے آخری نبی کی یہ آخری مسجد ہے، یہی وہ مسجد ہے جس کی طرف نیت کر کے سواری لے جانے کی اجازت ملی اور پھر سب سے زیادہ قابلِ زیارت یہی ہے جیسے آگے آرہا ہے۔

فضیلت نمبر ۶۸:

یہیں بہت سی مسجدیں اور قابلِ زیارت چیزیں نیز تاریخی نشانات موجود ہیں بلکہ ان کا باعثِ برکت ہونا ہی اس بات کا پتہ دے رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مالک رحمہ اللہ سے کہا گیا: آپ مکہ اور مدینہ میں سے کونسی جگہ قیام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا، یہیں (مدینہ میں)، اور ایسا کیوں نہ ہو، یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں جس پر حضور ﷺ گذرے نہ ہوں، جبریلِ امین علیہ السلام لحہ سے بھی پہلے اللہ کے ہاں سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں۔

فضیلت نمبر ۶۹:

یہاں سے بہتر خوشبو دنیا میں کہیں اور نہیں پائی جاتی جیسے بتایا جاچکا۔

فضیلت نمبر ۷۰:

یہیں کی زندگی سب سے بہترین زندگی ہے، جیسے پہلے گذرا۔

فضیلت نمبر ۷۱:

جو بھی شخص حضور ﷺ کے مزارِ انور کو نقص نکالنے کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ قابلِ سزا قرار پاتا ہے چنانچہ حضرت امام مالک نے مزارِ انور کو ناقص کہنے والے کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ اسے تین درّے لگائے جائیں اور قید کر دیا

جائے۔ آپ یہاں کا نہایت احترام کرتے' فرماتے' ایسے شخص کی گردن اُڑانی چاہئے کیونکہ یہ اس قبرِ مبارک کو کمتر جانتا ہے جہاں رسول اکرم ﷺ دفن ہیں۔

فضیلت نمبر ۷۲:

جو آپ کے منبر شریف کے قریب غلط قسم کھائے اسے شدید طور پر ڈانٹا گیا ہے۔

فضیلت نمبر ۷۳:

یہاں بہتر یہ ہے کہ ایک راستے سے مسجد میں آؤ اور دوسرے راستے سے باہر جاؤ جیسے مسجدِ معرّس میں بیان ہو گا۔

فضیلت نمبر ۷۴:

بہتر یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرو۔

فضیلت نمبر ۷۵:

بہتر یہ ہے کہ مدینہ میں دعائیں کرتا رہے اور اللہ سے یہاں کی موت مانگتا رہے۔

فضیلت نمبر ۷۶:

یہ شہر مبارک ہمیشہ کے لئے دار الاسلام بن چکا ہے کیونکہ حدیث پاک میں ہے: شیطان اس بات سے نہایت مایوس ہو چکے ہیں کہ یہاں ان کی عبادت ہو سکے گی۔

فضیلت نمبر ۷۷:

سب اسلامی شہروں میں سے آخر میں یہاں کی حالت تبدیل ہو گی جیسے ترمذی میں ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں: اسلام میں جس شہر کے اندر سب سے آخر میں بے چینی پیدا ہو گی' وہ مدینہ ہے۔

فضیلت نمبر ۷۸:

اس شہر کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ سب سے طویل سفر پر میقات اسی شہر والوں کا ہے کہ انہیں (لمبا سفر کرنے پر) زیادہ اجر مل سکے۔

فضیلت نمبر ۷۹:

پہلے کچھ علماء حضرات یہ کہتے تھے کہ مکہ سے پہلے مدینہ کا سفر شروع کرو۔ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے' واضح طور پر اسے ابن ابی شیبہ نے اپنی ''مصنف'' میں بیان کیا ہے چنانچہ انہوں نے علقمہ اسود اور عمرو بن میمون کے بارے میں بتایا

کہ وہ اپنا سفر مدینہ سے شروع کیا کرتے تھے' یونہی بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ طیبہ ہی سے ابتداء کیا کرتے تھے۔

امام احمد کے بیٹے نے آپ ہی روایت کرتے ہوئے "مناسکِ کبیر" میں لکھا ہے کہ مکہ سے پہلے مدینہ کی طرف سفر کرنے والے کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟ چنانچہ انہوں نے عبدالرحمٰن بن یزید' عطاء اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے فرمایا تھا:

"جب بھی تمہارا سفر کا ارادہ ہو تو مدینہ کی بجائے مکہ کی طرف کرو اور جب حج کے سب کام پورے کرلو تو ارادہ بننے پر مدینہ جا سکتے ہو۔"

حضرت ابراہیم نخعی اور مجاہد رحمہما اللہ سے ہے کہ: "جب تم حج وعمرہ کے لئے ارادہ کرلو تو ہر شے کو اس کے بعد کرو۔" اس کے بعد بتایا کہ بہت سارے صحابہ کرام جب حج پر جانے کا ارادہ کرتے تو ابتداء مدینہ انور سے کیا کرتے' ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم وہیں سے احرام باندھنا چاہتے ہیں جہاں سے حضور ﷺ نے باندھا تھا۔ میرے نزدیک اس بات کو اوّلیت حاصل ہے کیونکہ مدینہ کا میقات بہرحال افضل شمار ہوتا ہے اور یہ عظمت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب پہلے مدینہ طیبہ پہنچے' مزید برآں اس میں روضۂ انور اور دیگر مقامات کی زیارت پہلے حاصل ہو جائے گی اور شائد یہی وہ بات ہے جس کی بناء پر تابعین حضرات پہلے مدینہ کی طرف سفر کرتے رہے جیسے علامہ سبکی نے فرمایا۔

علامہ زرکشی نے علامہ عبدی مالکی کے بارے میں بتایا کہ وہ فرمایا کرتے تھے: "نبی کریم ﷺ کی قبر انور کی طرف زیارت کے لئے جانا' کعبہ شریف اور بیت المقدس کی طرف سفر کرنے سے افضل ہے۔" انتہٰی۔

علماء کا اختلاف (افضل ہونے میں) صرف اس صورت میں ہے جب مدینہ منورہ راستے میں نہ ہو کیونکہ جو حضرات مکہ کا سفر پہلے کرنا چاہتے ہیں' ان کا مقصد فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت موفق بن قدامہ بتاتے ہیں کہ امام احمد نے فرمایا تھا: "جس نے پہلے حج نہیں کیا (شام کے راستے کے علاوہ) تو وہ مدینہ کی طرف نہ جائے کیونکہ میرے سامنے یہ بات رہتی ہے کہ کہیں اسے کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے لہٰذا اسے مختصر راستے سے مکہ کو جانا چاہئے' کسی اور طرف مصروف نہ ہو۔"

امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرہ میں کسی اور کام کی طرف توجہ کر سکتا ہے کیونکہ جب بھی اسے وقت ملا' عمرہ کر سکتا ہے تاہم حج کا تو ایک مقرر وقت ہے اور جب یہ شخص حج سے فارغ ہو گا تو اس کے پاس مدینہ میں حاضری کے لئے کھلا وقت ہو گا' جب چاہے' حاضری دے لے۔

میں کہتا ہوں کہ (مکہ کو پہلے جانا چاہئے) وہ تو فرض ادا کرنے کا خواہش مند ہے' اسی بناء پر امام سبکی نے اپنی فصول میں بتایا کہ صالح اور ابو طالب یہ بات نقل کرتے ہیں کہ: "جب کوئی شخص فرض حج کرنے جائے تو مدینہ کی طرف نہ جائے کیونکہ اگر اسے موت آ جاتی ہے تو راہِ حج میں موت مل جائے گی' ہاں اگر نفلی حج پر جا رہا ہے تو مدینہ سے ابتداء کر

سکتا ہے۔" انتہٰی علاوہ ازیں حضرت ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو اس مسئلہ میں واضح طور پر فرماتے ہیں کہ "بہتر یہ ہے کہ پہلے مکہ کی طرف سفر کرے (یعنی فریضۂ حج کے لئے)۔"

فضیلت نمبر ۸۰:

اہلِ مدینہ کو رمضان المبارک میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ یہاں ۳۶ رکعتیں (عشاء کی) ادا کرتے ہیں جیسے کہ شافعی حضرات کے نزدیک مشہور ہے چنانچہ امام رافعی اور نووی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اہلِ مدینہ کو میں نے دیکھا کہ انتالیس رکعت پڑھا کرتے ہیں جن میں سے تین وتر ہوتے ہیں۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ یہ بات اہلِ مدینہ کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہے کیونکہ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ حضور ﷺ کی جائے ہجرت اور مزار پاک کے قریب رہتے ہیں۔

علامہ رافعی فرماتے ہیں، اہل مدینہ کے اس کام کا سبب یہ ہے کہ بیس رکعتوں میں پانچ مرتبہ ترویحہ (آرام) ہوتا ہے، ادھر اہلِ مکہ ہر دو ترویحہ کے درمیان طواف کے سات چکر لگا کر اکیلے اکیلے طواف کے دو دو نفل ادا کرتے تھے اور وہ فرض وتراویح کے درمیان طواف نہیں کرتے تھے، نہ ہی تراویح اور وتروں کے درمیان ایسا کرتے چنانچہ اہلِ مدینہ نے ارادہ کر لیا کہ فضیلت میں اہلِ مکہ کے برابر ہونا چاہئے چنانچہ انہوں نے ہر طواف کی جگہ دو رکعت نفل کا ترویحہ کرنا شروع کر دیا چنانچہ چار مرتبہ ترویحہ سے سولہ رکعات مزید پڑھتے (یعنی ہر دو تراویح کے ساتھ دو نفل پڑھتے اور چار تراویح کے بعد اکٹھے چار نفل پڑھ لیتے) انتہٰی۔ امام شافعی کا یہ سبب علامہ رویانی نے بحر میں نقل کیا ہے۔

حضرت قاضی ابو الطیب کہتے ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل مدینہ کے علاوہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اہلِ مکہ سے آگے بڑھنے اور ان سے مقابلہ کی کوشش کریں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے سارے اسلامی شہروں پر فضیلت دے رکھی ہے۔ انتہٰی۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس بہتر کام میں حسد موجود ہے جسے غبطہ (رشک) کہتے ہیں جیسے راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لئے کچھ پاس نہ ہونے پر مہاجرین نے انصار مدینہ پر حسد (غبطہ) کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بہت مالدار لوگ زیادہ اجر لے گئے ہیں۔" چنانچہ اہلِ مدینہ نے نفلوں کی یہ تعداد اجتہاد کر کے بڑھا دی تھی کہ اہلِ مکہ سے مل سکیں حالانکہ یہ دونوں شہر فضیلت میں برابر کے شریک ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فضیلت کے بارے میں ان دونوں کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے اور علماء نے اہلِ مدینہ کے لئے بھی ایسی چیزیں مقرر کر دی ہیں جن کا ثواب اہلِ مکہ کے حج وعمرہ کے برابر مل سکے اور یوں اہل مدینہ کو جائے ہجرت و مزار شریف کی بناء پر امتیازی حیثیت مل سکے۔ چنانچہ یہاں مقیم ہونے کی بناء پر انہوں نے ان کے لئے ایسے طریقے نکالے کہ انہیں یہ فضیلت بڑھ چڑھ کر مل سکے اور اگر یہ کام ان کے لئے

شروع نہ کر دئے جاتے تو شاید وہ زیادہ نیکیوں کی تلاش میں مکہ کی طرف منتقل ہو جاتے باوجودیکہ مدینہ میں ٹھہرنا مطلوب تھا اور چونکہ دوسرے لوگوں کو یہ فضیلت حاصل نہیں تو وہ اہلِ مکہ کی برابری کیسے کر سکتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے یہ چیزیں (زیادہ نفل وغیرہ) شریعت نہیں بن سکیں' پھر امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اہلِ مدینہ کا کسی بات پر اجماع دلیل ہوتا ہے چنانچہ مدینہ میں یہ تعداد اب تک یونہی چلی آ رہی ہے البتہ یہ بات ہے کہ اہلِ مدینہ عشاء کے بعد بیس رکعت پڑھتے آ رہے ہیں اور پھر رات کے آخری حصے میں دوبارہ آتے ہیں اور پھر سولہ رکعت پڑھتے ہیں البتہ یوں کرنے سے انہیں وتر کے بارے دشواری پیش آتی تھی جسے میں نے کتاب ''مصابیح القیام فی شہر الصیام'' میں بتا دیا ہے' میں نے ان لوگوں کو ایسا طریقہ بتایا تھا جس کی بناء پر اس وتر کے مسئلہ کا ازالہ ہوتا تھا چنانچہ انہوں نے کچھ عرصہ تک ایسے کیا بھی تھا پھر نفسانی خواہشات کچھ لوگوں کے دل میں سما گئیں تو معاملہ پھر ویسا ہی ہو گیا۔

فضیلت نمبر ۸۱:

یہاں مکہ کے مقابلہ میں برکت زیادہ ہوتی ہے' ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مکہ کے مقابلہ میں یہاں چھ گنا زیادہ برکت حاصل ہوتی ہے پھر احادیث میں واضح طور پر ملتا ہے کہ ''یہاں مکہ کی برکت کے مقابلہ میں دوگنا زیادہ برکت ہوتی ہے۔'' اور کچھ احادیث میں ہے کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کو اتنی ہی برکت ملتی ہے لیکن ہر برکت کے ساتھ دو برکتیں مزید ملتی ہیں۔

فضیلت نمبر ۸۲:

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اہلِ مدینہ کے اجماع کے مقابلہ میں خبرِ واحد آ جاتی ہے تو اس اجماع کو اولیت حاصل ہوتی ہے' اسی وجہ سے انہوں نے خیارِ مجلس کی حدیث روایت کرتے [illegible] ئے کہا کہ اس کی حد ہمیں معلوم نہیں اور نہ ہی ایسا کوئی عمل سامنے ہے کیونکہ اہلِ مدینہ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ وحی اترنے کی جگہ پر رہتے ہیں نیز ناسخ و منسوخ احکام جانتے ہیں' ایسی بناء پر اہلِ مدینہ کی مخالفت کرنا یہ بتاتا ہے کہ انہیں نسخ [illegible] بناء پر یا دلیل راجح پر عمل ترک کر دینا چاہئے' البتہ محققین علماء کا قول یہ ہے کسی زمین کا اس مسئلہ میں دخل نہیں ہوتا' ان کے پاس حضرت امام مالک کے ہمعصر ابن ابی ذئب بطور دلیل موجود ہیں جنہوں نے اس حدیث کی مخالفت کی تھی اور خوب کی تھی کیونکہ عصمت (معصوم ہونا) صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب تمام اُمت کا اجماع ہو' رہا امام مالک کا کلام تو انہوں نے یہ خصوصیت اہلِ مدینہ کے اس دور کے عمل کرنے والے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

فضیلت نمبر ۸۳:

نسائی' بزاز اور حاکم کی حدیث ہے' الفاظ حاکم کے ہیں: ''عنقریب لوگ تلاش میں نکلیں گے لیکن انہیں عالمِ مدینہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہ مل سکے گا۔'' ابن عیینہ رحمہ اللہ کہتے تھے کہ ہمارے خیال میں یہ عالم حضرت مالک بن انس

رحمہ اللہ تھے۔

علامہ زرکشی کہتے ہیں کہ جو کچھ ابن عیینہ نے سفیان سے نقل کیا ہے' یہ محلِ نظر ہے کیونکہ صحیح ابن حبان میں ہے کہ حضرت اسحٰق بن موسیٰ کہتے تھے: مجھے ابن جریج کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے خیال میں تو یہ عالم حضرت مالک بنؒ انس رحمہ اللہ ہیں' چنانچہ میں نے سفیان بن عیینہ کے پاس اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا' عالم وہ ہیں جو اللہ کا خوف رکھتے ہیں لیکن ہم ایک عمری شخص (اولادِ عمر) کے علاوہ اللہ سے زیادہ ڈرنے والا کسی کو نہیں جانتے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ شرح المصابیح میں بتاتے ہیں کہ یہ شخص حضرت عبد اللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم تھے' یہ نہایت نیک لوگوں میں سے تھے اور مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ جنگل میں رہنے والے لوگوں کی خبر گیری کرتے اور اپنی وعظ و نصیحت کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جنگل کو نکل جاتے۔

حضرت امام ترمذی نے ایک حدیث بتائی جس پر ابن حزم نے بحث کی اور کہا کہ یہ حدیث امام مالک کو بڑا عالم متعین نہیں کرتی کیونکہ ان کے دور میں ایسے حضرات موجود تھے جن میں سے کسی ایک پر بھی امام مالک فضیلت نہیں رکھتے تھے بلکہ خود مدینہ میں بھی ان سے بڑھ کر شخصیت حضرت سعید بن مسیلب رضی اللہ عنہ موجود تھے لہٰذا یہ حدیث اس حدیث سے بہتر درجہ کی ہے پھر ابن عیینہ ہی کا یہ قول بھی ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ کون سب سے بڑا عالم ہے؟ تو لوگ کہیں گے کہ سفیان ثوری۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر اس وقت سے تعلق رکھتی ہے جب قیامت کا قرب ہوگا' ایمان مدینہ کی طرف سمٹ جائے گا چنانچہ مکہ و مدینہ کے علاوہ دجال ہر مقام پر غالب آ جائے گا اور پھر آج تک اس طرح کی صورت پیدا نہیں ہوئی کیونکہ فتنہ مدینہ پاک سے بالکل الگ ہو چکی اور دنیا میں ہر طرف پھیل گئی۔ انتہی۔

فضیلت نمبر ۸۴:

یہاں سے حرم کے پتھر اور خاک کسی اور جگہ لے جانا حرام ہے۔

فضیلت نمبر ۸۵:

اگر کوئی شخص مسجد نبوی کو خوشبو لگانے کی منت مانتا ہے اور یونہی مسجد اقصیٰ کی تو اس میں امام الحرمین نے تردد کا اظہار کیا ہے کیونکہ اگر ہم تعظیم پیش نظر رکھتے ہیں تو پھر ان دونوں مسجدوں کو کعبہ سے ملائیں گے اور اگر کعبہ کی امتیازی حیثیت کو دیکھتے ہیں تو انہیں کر سکتے' پھر علامہ غزالی نے جو کلام باب النذر کے آخر میں کیا ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ خصوصیت دونوں مسجدوں کو حاصل ہو' ان دو کے علاوہ کسی اور میں نہ پائی جائے لیکن امام الحرمین نے اسے سب میں جاری رکھا ہے اور جہاں یہ صورت حال ملاحظہ میں آئے تو لائق و مناسب یہ ہے کہ یہ اس صورت پر موقوف نہ ہو جب وہ

قبر انور کو خوشبو لگانے کی منت مانے۔

فضیلت نمبر ۸۶:

اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ کی قبر انور کی زیارت کی منت مانے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسے پورا کرے اور آپ کے علاوہ کسی اور کی قبر کی نذر مانے تو اس میں دو صورتیں ہیں۔

فضیلت نمبر ۸۷:

آپ کی مسجد شریف' مسجد اقصیٰ کے قائم مقام ہے جیسے وہ مسجد حرام کے ہم مرتبہ ہے' یہ اس صورت میں جب وہ نذر مانے کہ نماز یا اعتکاف مسجد اقصیٰ میں کرے گا کیونکہ صحیح ترین بات یہ ہے کہ اسے پورا کرے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد مدینہ میں پوری کر لے کیونکہ اس کی فضیلت زیادہ ہے اور اگر ان دونوں کی مسجد مدینہ میں منت مانے تو یہ اس کے لئے مناسب نہ ہوگا کہ اسے مسجد اقصیٰ میں پورا کرے البتہ مسجد حرام میں پوری کر سکتا ہے۔

فضیلت نمبر ۸۸:

جو شخص مسجد مدینہ میں آنے کی نذر مان لیتا ہے تو اسے اس نذر کی خاطر حضور ﷺ کے مزارِ انور کی زیارت کافی ہو جاتی ہے جیسے شیخ ابوعلی نے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لازماً مسجد میں آنا ہوگا جیسے امام شافعی اور بویطی کہتے ہیں علاوہ ازیں لازم یہ ہے کہ اس کے قرب کو مسجد میں آنے سے ملائے کیونکہ اس کے لئے آنا لازم ہے اور حضرت شیخ ابوعلی نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت بڑی عبادتوں میں سے ہے' امام الحرمین نے اس میں توقف اس لئے کیا ہے کہ یہ معاملہ مسجد اور اس کی تعظیم سے تعلق نہیں رکھتا چنانچہ فرمایا: قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر وہ شخص مسجد میں صدقہ کرے یا وہاں روزہ رکھے تو کافی ہے۔ یہ محلِ نظر ہے۔ علاوہ ازیں صحیح تو وہ ہے جو انہوں نے مختصر میں واضح طور پر لکھا ہے کہ یہاں آنا لازم نہیں اگرچہ یہ لازم ہونا راجح دلیل ہے جبکہ حضرت رافعی نے لزوم پر بنا رکھتے ہوئے نماز یا اعتکاف ملانے کو ترجیح دی ہے' یونہی ہوگا اگر کوئی شخص مسجد اقصیٰ میں آنے کی نذر مانے کیونکہ جب چل کر جانے میں فضیلت نہیں تو یہ نذر اس عمل کی طرف پھر جائے گی جس میں عبادت کا ارادہ ہے چنانچہ اس سے شیخ ابوعلی کے قول کو ترجیح ملے گی کیونکہ مسجد مدینہ میں آنے پر نماز' اعتکاف اور زیادہ کا قصد کیا جا سکتا ہے' کہیں اور نہیں۔

فضیلت نمبر ۸۹:

حضرت ابن المنذر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص مسجدِ رسول اور مسجد حرام کی طرف چلنے کی نذر مانتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اسے پورا کرے کیونکہ ایک عبادت ہے اور جو یہ نذر مانتا ہے کہ بیت المقدس کو چل کر جائے گا تو اسے اختیار ہوگا' چاہے تو مسجدِ اقصیٰ کی طرف چل کر پہنچے اور چاہے تو مسجد حرام کی طرف چلا جائے کیونکہ یہ

حدیث موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے عرض کی تھی کہ اگر آپ کے ہاتھوں مکہ کی فتح ہو جاتی ہے تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔ اس پر آپ نے تین مرتبہ فرمایا تھا کہ یہیں پڑھ لینا۔ انتہی۔

فضیلت نمبر ۹۰:

فضیلت مدینہ بیان کرتے ہوئے احادیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: "یہاں جنگ کی خاطر ہتھیار نہ اُٹھائے جائیں۔"

فضیلت نمبر ۹۱:

اسی مدینہ کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اگر یہاں کسی کی کوئی شے گم ہو جائے تو اسے اُٹھایا نہ جائے۔"

فضیلت نمبر ۹۲:

جب مدینہ کے شکار اور درخت کاٹنے کی ضمانت دے دیں تو پھر صحیح یہ ہے کہ شکاری کو ویسے ہی سلب کیا جائے جیسے کافروں کے مقتول کو سلب کیا جاتا ہے اور یہ بدلہ دینے کی بجائے زیادہ ڈانٹ ہے۔

فضیلت نمبر ۹۳:

علاج کے لئے اس کی مٹی کہیں لے جانا جائز ہے۔

فضیلت نمبر ۹۴:

یہیں پر وہ آگ ظاہر ہوئی جس کے بارے میں حضور ﷺ نے اطلاع دی تھی کیونکہ یہ ڈرانے کے لئے ہو گی لہٰذا اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ "نذیر" (ڈر سنانے والے) ﷺ کے شہر سے تعلق رکھتی ہے اور جب یہ حرم تک پہنچی تو صاحب حرم کی رحمت کے سبب بجھ گئی جیسے آگے آ رہا ہے۔

فضیلت نمبر ۹۵:

حضور ﷺ نے اس کے بازار میں دعائے برکت فرمائی تھی۔

فضیلت نمبر ۹۶:

عنقریب آگے کے بیان میں آئے گا کہ اسے ہٹانے والا ایسا ہو گا جیسے راہِ خدا میں جہاد کرنے والا۔

فضیلت نمبر ۹۷:

اس میں غلہ کو مہنگا بیچنے کے لئے روکنے والا ایسا ہو گا جیسے کتاب اللہ میں بے دین ہوتا ہے۔

فضیلت نمبر ۹۸:

''بیر غرس'' میں آ رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھی کہ آپ جنت کے ایک کنوئیں پر ہیں' صبح دیکھا تو آپ ''بیر غرس'' پر تھے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی خواب حق ہوتی ہے۔

فضیلت نمبر ۹۹:

مدینہ کے پھلوں کی خصوصیات بیان ہو چکی ہیں جن میں یہ ہے کہ اس کی کھجور عجوہ جنت کی ہے چنانچہ مدینہ میں کچھ جنت کی زمین ہے' کچھ جنت کے پانی اور پھل ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۸

عزت وحرمتِ مدینہ کے بارے میں احادیث' یہ بہت سی ہیں

صحیحین میں احادیث ملتی ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث روایت ہے: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو عزت بخشی اور اس کے لئے دعا فرمائی۔'' ایک حدیث میں ہے کہ اہل مدینہ کے لئے دُعا فرمائی اور میں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح مدینہ کو قابل عزت قرار دیتا ہوں۔

بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری زبان کے ذریعے مدینہ کے اردگرد کو عزت بخشی۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بنو حارثہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: اے بنو حارثہ! میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ حرم (مکہ) سے نکال دئے گئے ہو' پھر دوبارہ متوجہ ہوئے اور فرمایا: بلکہ اب بھی تم حرم (مدینہ) ہی میں ہو۔ عنقریب ان کے گھروں کا بیان آ رہا ہے' وہاں یہ بھی ہے کہ اگر تم مدینہ میں بکریوں کو چرتا دیکھو تو ان پر سختی نہ کرو' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کا اردگرد حرمت والا ہے۔ مسلم شریف میں یوں ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے دو پہاڑی علاقوں کے درمیان والے حصے کو عزت سے سرفراز فرمایا چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں مدینہ کے اردگرد بکریاں چرتے دیکھتا ہوں تو انہیں روکتا نہیں اور آپ نے مدینہ کے اردگرد بارہ میل کے علاقے کو چراگاہ قرار دیا۔

مسلم شریف میں بھی حضرت عاصم الاحول سے ہے: فرمایا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا حضور ﷺ نے مدینہ کو قابل عزت قرار دیا ہے؟ انہوں نے بتایا' ہاں یہ قابل عزت ہے' اس کا سبزہ (گھاس وغیرہ) نہ کاٹا جائے اور جو ایسا کرے گا' اس پر اللہ' فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہے۔

اسی میں رافع بن خدیج کی یہ حدیث ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور میں مدینہ کو حرم بنا

رہا ہوں۔

اسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت شدہ حدیث ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور میں نے مدینہ کے اردگرد کو حرم قرار دیا' اس کا سبزہ نہ کاٹا جائے اور نہ ہی اس کا شکار کیا جائے۔

اسی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت شدہ حدیث ہے' فرمایا: اے اللہ! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو عزت بخشی اور اسے حرام بنا دیا' میں مدینہ کو عزت دیتا اور اسے حرام بناتا ہوں بایں طور کہ یہاں کسی کا خون نہ بہایا جائے گا' نہ یہاں جنگ کے لئے ہتھیار اُٹھائے جائیں گے اور نہ ہی چارہ حاصل کرنے کے بغیر یہاں کے درخت جھاڑے جائیں گے۔

اسی میں حدیثِ انس بھی موجود ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: اے اللہ! میں مدینہ کے دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو حرم بناتا ہوں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں پہاڑوں سے مراد جبل عیر اور ثور ہیں اور پچھلی حدیث میں انہی دو کا ذکر ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تحریم مکہ کی نسبت' اس بات کی دلیل ہے جس کی طرف ایک جماعتِ علماء کا رجحان ہے کہ یہ مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ ہر نبی کے لئے حلال رہا (قتل وغیرہ کرنا جائز رہا) اور جب آپ آئے تو حرام کر دیا گیا۔علماء کی دوسری جماعت (جو اکثر ہیں) کے خیال میں کہ یہ سرزمین اس وقت سے حرم چلی آئی جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا اور پھر اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ظاہر فرما دیا۔یہ ایسا قول ہے کہ اس میں سب احادیث سما جاتی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ کے احکام قدیم ہیں' کیونکہ یہ اللہ کے مخلوق سے خطاب ہیں' اس میں حادث تو وہ تعلقات ہیں جو مخلوق سے متعلق ہیں جن پر شہری احکام لاگو ہیں اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ان کی حرمت ظاہر ہوئی تو یہ پہلا حکم تھا جس کا تعلق ان لوگوں سے ہوا جن پر شریعت کے احکام لاگو ہوئے لہٰذا اس دوسرے گروہ کا یہ کہنا کہ یہ تحریم اس وقت سے چلی آتی ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا' اس وقت تکلیفی تعلق موجود ہی نہ تھا۔

ہاں یہ جائز ہے' اس کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حرمت اپنے فرشتوں کو اس دن بتا دی ہو جب آسمان و زمین پیدا فرمائے اور مخلوق کی تکلیف کا تعلق بعد میں کیا ہو اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ظاہر فرما دیا ہو اور پہلا قول اس کا انکار بھی نہیں کرتا (روکاوٹ نہیں بنتا) بلکہ اسے تسلیم کرتا ہے' یہ اچھا ہے اور اس کے ذریعے تمام احادیث پر عمل ہو جاتا ہے۔

یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا تحریم مدینہ کا خطاب بھی قدیم ہے اور اس کا لیٹ ہونا بھی تکلیف کی بنا پر ہے جیسے حضور ﷺ نے ظاہر فرما دیا تھا' اس میں اس کے مرتبے کا نقصان نہیں بلکہ اس کے مرتبہ کے کامل

ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس محفوظ رکھا اور پھر حضورﷺ کی زبان سے جاری فرما دیا جو سب رسولوں سے اشرف و اعلیٰ ہیں' مزید برآں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تحریم مکہ کے معنٰی میں دو احتمال ہیں' ایک یہ کہ وہ بحکمِ الٰہی حرام ہوا (آپ کا دخل نہیں) اور دوسرا یہ کہ انہوں نے دعا کی' جسے قبول فرما کر اللہ ہی نے اسے حرام قرار دے دیا۔ کچھ لوگوں نے یہی احتمال مدینہ پاک کے بارے میں بھی بتائے ہیں۔

حدیث میں الفاظ ہیں "مابین لابعیها" اس کا مطلب ہے' دو پہاڑی (پتھریلا) علاقوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں' مدینہ منورہ ان دونوں کے درمیان ہے حالانکہ مدینہ کے قبلہ اور شام کی طرف بھی پتھریلا علاقہ موجود ہے لیکن یہ دونوں علاقے مشرق و مغرب میں شمار ہوتے ہیں کیونکہ انہی دونوں سلسلوں سے متصل ہیں' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہﷺ نے ان دونوں کو انہی میں شامل فرمایا اور لا بتیھا ہی میں ذکر فرما دیا جیسے علامہ طبری نے لکھا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ (مشرقی و غربی) علاقے حرم کی سرحد شمار ہوتے ہیں جو مشرق و مغرب میں واقع ہیں' ان دونوں کے پہاڑوں کے درمیان شمالی اور جنوبی حد کا بیان ہے۔ مابین لا بتیھا سے مراد خود دونوں مکمل علاقے اور ان کا درمیانی علاقہ ہے اور مقصد تحریمِ مدینہ اور لَابَتَین ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کلام نووی کی تائید یہ بات کرتی ہے کہ شرقی و غربی پتھریلے علاقے دو پہاڑوں میں سے ایک کے عین سامنے ہیں جن کا بیان آگے آ رہا ہے اور بنو حارثہ کے مکانات کلامِ مطری کے مطابق غربی پتھریلے علاقے کی سیدھ میں تھے جیسے ہم اثرب کی وضاحت کرتے ہوئے پہلے باب میں حضرت نووی سے بتا چکے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ان کے مکانات شرقی پہاڑی علاقے میں تھے جو "عریض" اور اس کے قریبی علاقے سے ملتا ہے کیونکہ اسماعیلی نے یہی پہلی حدیث ان الفاظ سے ذکر کی ہے: "پھر آپ بنو حارثہ کی طرف آئے جو حرّہ کی جانب تھے' اس "حرّہ" سے مراد مدینہ کی اونچی جگہ ہے' عنقریب ان کے گھروں کے بیان میں وہ کچھ آ رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس "حرّہ" سے مراد شرقی ہے' وہ جگہ نہیں جسے علامہ مطری نے دو حرّوں میں سے ایک کی سند میں بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر علامہ نووی کے قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو علامہ بیہقی نے دونوں شہروں کے تعارف میں حدیثِ صحیفہ دی ہے جو حضرت علی سے روایت شدہ ہے' الفاظ یہ ہیں کہ: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام فرمایا اور میں مدینہ کو حرام بنا رہا ہوں جو دو حرّوں اور پانی کے تالابوں کے درمیان میں واقع ہے جس کا سبزہ نہ کاٹا جائے' اور نہ ہی اس میں سے شکار کو بھگایا جائے اور گم کرنے والے کو دینے کی نیت کئے بغیر کسی کی گری ہوئی چیز نہ اُٹھائی جائے' نہ ہی اس کے درخت کاٹے جائیں ہاں آدمی اپنے اونٹ کو چارہ دے سکتا ہے اور نہ ہی کسی سے لڑنے کے لئے ہتھیار اُٹھائے جائیں۔" (الحدیث) حضرت امام احمد نے بھی یہی روایت کی ہے' یہ حدیث صحیح ہے۔ مدینہ کے علاقے میں یہ

تالاب تین ہیں جیسے آگے آ رہا ہے' ایک وہ ہے جو مغرب کی طرف حرّۂ غربیہ سے ملتا ہے اور دوسرا حرّہ جمام (تالاب) اور مدینہ کے درمیان ہے۔

حضرت امام مسلم نے صحیفہ والی حدیث ان الفاظ سے ذکر کی ہے: ''مدینہ' جبل عیر اور ثور تک کے درمیان حرم ہے۔'' جبکہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں ''مدینہ' عیر اور فلاں جگہ کے درمیان حرم ہے۔'' ابو داؤد نے یہ الفاظ لئے ہیں۔ ''مدینہ' عایر اور ثور کے درمیان حرم ہے۔'' پھر اس میں زیادتی کرتے ہوئے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی گھاس وغیرہ نہ کاٹی جائے' شکار کو نہ بھگایا جائے اور گری چیز' اس کے مالک کو دینے کی نیت کے بغیر نہ اُٹھائی جائے' کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ یہاں جنگ کے لئے ہتھیار اُٹھائے اور نہ ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ یہاں کے درخت کاٹے ہاں اپنے اونٹ کو چارہ دینے کے لئے ایسا کرسکتا ہے۔''

علامہ طبرانی نے بھی اسے ذکر کیا ہے' ان کے مختصر الفاظ یہ ہیں: ''حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاں گئے تو انہوں نے اپنی تلوار منگوائی جس میں سے عربی میں لکھی ایک تحریر نکالی اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب اللہ کے بغیر کچھ نہیں چھوڑا جسے اللہ نے ان پر اتارا تھا اور میرے پاس کچھ اور پہنچایا گیا' دیکھا گیا تو اس میں یہ لکھا تھا: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم محمد رسول اللّٰہ! ہر نبی کا ایک حرم تھا اور میرا حرم مدینہ ہے۔

فصل نمبر ۹

جبلِ عیر اور ثور کا بیان

مدینہ کے دو پہاڑوں سے مراد یہی دو پہاڑ ہیں جیسے گزر چکا۔

جبلِ عیر کہاں ہے؟

جبل عیر: اس کے عین پر زبر اور یاء پر جزم ہے' یہ گدھے کا ہم معنٰی ہے' اسے عایر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا پہاڑ ہے جو مدینہ کے قبلہ میں ذوالحلیفہ کے قریب ہے جو مدینہ کا میقات ہے۔

جبلِ ثور کہاں ہے؟

ثور بمعنٰی بیل ہے' یہ احد کے پیچھے ایک چھوٹا پہاڑ ہے' ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے کیونکہ یہ بڑے بڑے علماء سے پوشیدہ ہے چنانچہ انہیں حدیث میں اشکال پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں ثور نامی کوئی پہاڑ نہیں' وہ تو صرف مکہ میں ہے' اسی لئے بخاری شریف میں یہ لفظ من عایر الی کذا ہی کے الفاظ آئے ہیں اور کچھ روایات میں من عیر الی کذا آتا ہے لیکن انہوں نے اس کی انتہاء بیان نہیں کی' ان کا خیال ہے کہ شاید یہ وہم ہے لہٰذا اسے حذف کر دیا ہے پھر

کچھ راویوں نے ثور والی جگہ سفید چھوڑ دی ہے تا کہ وہم واضح ہو سکے۔

مدینہ میں جبلِ ثور ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف

علامہ مازری رحمہ اللہ کہتے ہیں: "کچھ اہلِ علم نے یہ نقل کیا ہے کہ یہاں "ثور" کا ذکر راوی کا وہم ہے کیونکہ یہ تو مکہ میں ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ احد کی طرف ہے۔

ابو عبید القاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ: عیر اور ثور مدینہ میں دو پہاڑ ہیں لیکن اہلِ مدینہ ثور نامی پہاڑ کے بارے میں نہیں جانتے' وہ کہتے ہیں کہ یہ مکہ میں ہے لہٰذا ہم حدیث کو دیکھیں گے اس کا اصل یوں ہوگا: ما بین عیر الی احد۔

میں کہتا ہوں کہ یونہی طبرانی نے اسے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: "عیر اور احد کے درمیان والی جگہ حرام ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے حرم قرار دیا ہے۔"

حضرت حازمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح روایت یہ ہے "عیر اور احد کے درمیان" کچھ کہتے ہیں الی ثور یعنی ثور تک' اور یہ لفظ بے مقصد ہے۔" کچھ حضرات نے تکلف سے کام لیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ الی بمعنی مع ہے' گویا کہ اس نے مدینہ کو مکہ کی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ وہ ویسے ہی حرام ہے جیسے مکہ کیونکہ جبلِ ثور مکہ میں ہے۔

حضرت موفق بن قدامہ کہتے ہیں' احتمال یہ ہے کہ تحریم اس مقدار کی ہے جو ثور اور عیر کے درمیان ہے جو مکہ میں ہیں' یا نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی دونوں اطراف میں موجود دونوں پہاڑوں کو جلدی سے عیر اور ثور فرما دیا۔ انتہی۔

اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ جبل عیر کے مدینہ میں ہونے کا بھی انکار کر رہے ہیں۔

علامہ زرکشی رحمہ اللہ کہتے ہیں' قاضی عیاض نقل کرتے ہیں کہ مدینہ یا اس کے قریبی علاقے میں ایسا کوئی پہاڑ نہیں جسے ان دونوں میں سے کوئی نام دیا گیا ہو یعنی عیر اور ثور کا۔

معجم میں حضرت یاقوت کہتے ہیں کہ یہ وہم ہے کیونکہ عیر مدینہ میں ایک مشہور پہاڑ ہے۔ ابن السید کہتے ہیں کہ عیر مدینہ کے قریب ایک پہاڑ ہے۔ قاضی عیاض کی "مشارق" میں عبارت یہ ہے کہ عیر اور عایر جن کا حرمِ مدینہ میں ذکر آتا ہے' اکثر روایات میں عیر ہے اور حدیثِ علی میں عایر ہے۔ حضرت زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ یہ مدینہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ ان کے چچا مصعب کہتے ہیں کہ مدینہ میں عیر اور ثور نامی کوئی مشہور پہاڑ نہیں انتہی۔

مطالع میں کہا: بخاری کے اکثر راویوں نے عیر کا ذکر کیا ہے' رہا ثور تو اس کی جگہ بعض نے کذا کا لفظ لکھا ہے اور بعض نے اس کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ اس رکاوٹ میں اصل مصعب زبیری کا یہ قول ہے کہ مدینہ میں عیر اور ثور کچھ نہیں' دوسروں نے عیر کو تو تسلیم کیا ہے لیکن ثور کے انکار پر ان سے موافقت کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عیر کے بدلے "فصل البقاع" میں مصعب زبیری سے آ رہا ہے جس سے پتہ چلے گا کہ وہ عیر کو مانتے ہیں' اور عیر کی شہرت علماء میں ڈھکی چھپی نہیں' البتہ ثور کے بارے میں اجنبیت ہے۔

علامہ نووی کہتے ہیں' احتمال یہ ہے کہ ثور یہاں پر کوئی پہاڑ تھا' یا تو وہ احد ہے یا کوئی اور لیکن پھر اس کا نام پوشیدہ ہو گیا۔

صاحبِ ''البیان والا نتصار'' نے کہا کہ یہ روایت لفظِ ثور سے صحیح ہے لہٰذا عدم عرفان کی بناء پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ راوی کا وہم ہے کیونکہ مقامات کے نام بدلتے رہتے ہیں یا بھول جاتے ہیں اور پھر انہیں جاننے والا کوئی بھی نہیں ہوتا چنانچہ مکہ میں میں نے وادئ مُحَسّر جیسے حج کے کئی مقامات کے بارے میں پوچھا لیکن مجھے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ لوگوں کا وہاں آنا جانا رہتا ہے تو پھر ان کے علاوہ کوئی کیا جانے؟ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شے کے دو نام ہوتے ہیں' ایک مشہور ہو جاتا ہے اور دوسرا کوئی جانتا ہی نہیں ہوتا۔

حضرت مجد کہتے ہیں: معلوم نہیں ان علماء کی طرف سے اس پہاڑ کے بارے حدیث میں وہم ثابت کرنے میں جلد بازی کیوں ہو گئی اور وہ بھی یوں کہ اہل مدینہ ایسے پہاڑ کا نام نہیں جانتے جو ثور کے نام سے مشہور ہے' پھر آپ نے وہ طریقے بتائے جن کی بناء پر نام تبدیل ہوتے یا بھول جایا کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں: ''آخر میں نے مدینہ کے فقہاء اور امراء وغیرہ سے فدك کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہے تو سب کا جواب یہ تھا کہ ان کے علاقے میں ایسا کوئی مقام نہیں ہے حالانکہ یہ شہر حکومتِ عباسیہ کے آخر عہد تک اشراف اور خلفاء کے قبضے میں رہا اور یہ لوگ وہاں آتے جاتے رہے تو پھر یہ لوگ ایک چھوٹے سے پہاڑ کو کیا جانیں جس سے کسی بڑے معاملے کا تعلق نہیں اور وہ مدینہ کے اہلِ علم میں جانا پہچانا ہے اور پہلے حافظِ حدیث شروع سے اس کی پہچان نقل کرتے رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ بیہقی نے اس کی پہچان کے لئے ابو عبید کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ: ''اہلِ مدینہ ایسا کوئی پہاڑ نہیں جانتے جس کا نام ثور ہو۔ آپ نے مزید کہا: مجھے ابو عبیدہ سے پتہ چلا ہے کہ انہوں نے ''کتاب الجبال'' میں لکھا ہے کہ مجھے اس بات کا پتہ چلا ہے کہ مدینہ میں ایک پہاڑ ہے جسے ثور کہا جاتا ہے۔ انتھٰی۔

علامہ مجد نے عَیر کا تعارف کراتے ہوئے نصر سے روایت کی' وہ کہتے ہیں: ''عیر ایک پہاڑ ہے جو ''شعب الجوز'' نامی مشہور گھاٹی کے مقابل ہے اور ثور پہاڑ احد کے پاس ہے انتھٰی۔

ان روایت سے پتہ چلا کہ جو ہمارے زمانے میں نیز ہم سے پہلے مدینہ میں جبلِ ثور کے پائے جانے کی زمانہ قدیم سے پہچان موجود ہے اگرچہ کچھ لوگوں سے یہ پوشیدہ ہے۔ مجھے تو ثور کے بارے میں بہت سے خاص لوگوں نے بتایا ہے بلکہ احد کی پچھلی طرف دکھایا بھی ہے پھر بہت سے لوگوں نے' محدث ابو محمد عفیف الدین عبد السلام بن مرزوع بصری جو مدینہ پاک میں مقیم تھے' سے نقل کی ہے کہ انہوں نے اس پہاڑ کو کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ جب وہ مدینہ کے حکمران کی طرف سے عراق کو گئے تو ان کے ساتھ راہنما بھی موجود تھا جو آپ کو مقامات اور پہاڑوں کے بارے میں بتاتا چلا جاتا تھا۔ چنانچہ جب یہ دونوں احد کے پاس پہنچے تو یکا یک احد کے پاس ایک چھوٹا سا پہاڑ نظر آیا' انہوں نے اس راہنما سے پوچھا کہ اس پہاڑ کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا کہ اسے ثور کہتے ہیں۔

محبّ طبری کہتے ہیں کہ مجھے ایک ٹھوس اور سچے عالم دین' حرمِ رسول کے پڑوسی عبد السلام بصری نے بتایا کہ احد کے مقابلے میں' بائیں جانب پیچھے ایک پہلو پر چھوٹا پہاڑ ہے جسے ثور کہتے ہیں' پھر بتایا کہ جان پہچان والے عرب کے کئی لوگوں سے میں نے بار بار یہ پوچھا کہ وہ کون سی زمین ہے اور اس میں کون کون سے پہاڑ ہیں؟ تو ان میں سے ہر ایک نے بتایا کہ اس پہاڑ کا نام ثور ہے۔

علامہ طبری کہتے ہیں' یوں ہمیں معلوم ہو گیا کہ حدیث میں جس ثور پہاڑ کا ذکر ہے' وہ صحیح ہے لیکن اکابر علماء کو اس کا علم نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ مشہور نہیں اور وہ اس کے بارے میں بحث نہیں کرتے۔

حضرت جمال مطری نے اپنی تاریخ میں ان لوگوں کا رد کیا ہے جو ثور کے پائے جانے کا انکار کرتے ہیں' انہوں نے بتایا کہ یہ احد کے پیچھے شمالی جانب گول چھوٹا پہاڑ ہے جسے اہلِ مدینہ شروع سے اب تک جانتے ہیں۔

حضرت علامہ اقشہری رحمہ اللہ کہتے ہیں ہم نے کوشش کی اور اہلِ مدینہ سے اس پہاڑ کے بارے میں پوچھا جسے ثور کہا جاتا ہے' آخر ہمیں پتہ چلا کہ یہ ایک چھوٹے پہاڑ کا نام ہے جو احد پہاڑ کی پچھلی طرف ہے جسے مدینہ کے قدیم لوگ جانتے ہیں' نئے واقف نہیں چنانچہ جو جانتے ہیں' وہ ناواقفوں پر دلیل ہیں۔

ابو العباس ابنِ تیمیہ کہتے ہیں کہ "عَیـر" میقات کے نزدیک ایک پہاڑ ہے جو گدھے کی شکل کا ہے اور ثور' احد کے پاس پہاڑ کا نام ہے' یہ پہاڑ مکہ کے ثور پہاڑ کے علاوہ ہے۔

مصابیح کے ایک شارح نے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تو اس کے چھ ٹکڑے ہو گئے' تین تو مکہ میں آ پڑے جن کے نام "حراء' ثبیـــر اور ثور ہیں اور تین مدینہ میں جا گرے پڑے جن کے نام "عیر' ثور اور رضویٰ" ہیں' ثور تو بیل کی شکل کا ہونے کی وجہ سے نام پڑا' یہ سرخی مائل ہے' جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ احد حرم کا پہاڑ ہے' ثور پہاڑ کی حد شام کی طرف سے اتنی ہی ہے جتنی دور قبلہ کی طرف عَیـر واقع ہے' یہ اس صورت میں ہے جب اس روایت کو لیا جائے جس میں ثور کی بجائے احد پہاڑ کا ذکر ہے کیونکہ اس میں اس پر زیادتی پائی جاتی ہے' اسے یوں سمجھئے جیسے ایک فرد کا ذکر دیا ہو اور وہ عموم حکم عموم کو شامل ہو جس کی تخصیص نہیں ہو سکتی اور اس میں زائد فائدہ بھی ہے کیونکہ اس طرح شرقاً غرباً احد پہاڑ کے سامنے والے حصے بھی شامل ہو جاتے ہیں اور وہ جو دو شرحوں اور روضہ وغیرہ میں حد بندی لاَیتعین نیز عَیـر و اُحد کی بناء پر آئی ہے تو اس کی بناء اس پر ہے جو گذر چکا کہ روایت صحیحہ "احد" والی ہے کیونکہ ثور کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔

فصل نمبر ۱۰

اس میں وہ احادیث مذکور ہیں جن کی بناء پر حرم کی حدود اس سے زیادہ ہیں

حدیث مسلم میں یہ فرمان کہ "مدینہ کے اردگرد بارہ میل کی مسافت حد مقرر کر دی۔" اس سے حرم کا پتہ چلتا ہے کہ اس اندازے میں ہے کیونکہ مدینہ کے اردگرد حرم ہی حرم ہے اور نبی کریم ﷺ کا محفوظ خطہ جو حرم کے گرد تھا' حرم میں داخل نہیں جیسے آگے آ رہا ہے۔ علامہ سبکی کہتے ہیں کہ سنن ابو داؤد میں حرم مدینہ کی حد بندی ہر طرف سے تقریباً بارہ بارہ میل ہے اور جو کچھ ابو داؤد میں حضرت عدی بن ثابت رضی اللہ عنہ کا روایت شدہ میں نے دیکھا ہے' وہ یوں ہے: "رسول اللہ ﷺ کی مقرر کردہ حد' مدینہ کے اردگرد ہر طرف تقریباً بارہ بارہ میل ہے' جس کے درخت جھاڑنے اور کاٹنے کی اجازت نہیں' ہاں یہاں اونٹ چرائے جا سکتے ہیں۔

ابن زبالہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مدینہ کا حرم ہر طرف سے تقریباً بارہ بارہ میل مقرر فرمایا' نیز مَسَــــدّ ' منجدہ اور الفاضح کا سامان بنانے کے لئے لکڑی کاٹنے کی اجازت دی۔" (یہ ان درختوں کا ذکر ہے جن سے استعمال میں آنے والی چیزیں بنتی ہیں مثلاً سامان لادنے والی چرخی' روئی وغیرہ دھننے کا آلہ اور جانوروں کو ہانکنے کا ڈنڈا وغیرہ)۔

حضرت مفضل جندی نے حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی' انہوں نے اس شخص کا واقعہ بتاتے ہوئے کہا جو عقیق میں درخت کو کاٹ رہا تھا یا جھاڑ رہا تھا کہ: "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' فرمایا: جو شخص ایسے آدمی کو دیکھے جو مدینہ کی حد' بارہ بارہ میل کی مسافت میں مدینہ کا درخت کاٹ رہا ہو تو اس کا سامان لے لو چنانچہ اب میں وہ سامان واپس نہیں کروں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ملا ہے۔"

بزاز نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی' آپ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کا حرم ہر طرف بارہ میل مقرر فرمایا۔"

طبرانی کی "اوسط" میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے اردگرد بارہ میل کی مسافت میں درخت کاٹنے حرام قرار دیئے ہیں' آپ نے مجھے بھیجا کہ حرم کے نشان لگا دوں چنانچہ میں نے ذات الجیش کی بالائی طرف' شریب پر اور مخیض کے اوپر والے حصے میں نشان لگا دیئے۔"

ابن النجار نے یہ الفاظ لکھے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے اردگرد بارہ بارہ میل کا علاقہ حرم قرار دیا پھر مجھے ان حدوں پر نشان لگانے کے لئے بھیجا تو میں نے حرم کے ان مقامات پر نشان لگا دیئے: "ذات الجلیس کی بالائی

جانب' مشیرب' مجتمر کی بالائی جانب اور تیم پر" ابن زبالہ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ: "مگر آپ نے مجتمر کا اوپر والا حصہ حد میں سے نکال دیا' تیم کو ثیب سے بدل دیا۔" پھر یہ زیادتی فرمائی: حفیاء پر علامت لگاؤ اور ذوالعشیرہ پر۔"

ابن النجار ہی نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ اور وغیرہ کے درمیانی درختوں کی حفاظت کا حکم فرمایا: مدینہ ہی سے ثنیۃ المحدث' تحیض کے بالائی حصے' ثنیۃ الحفیاء ' مضرب القبہ اور ذات الجیش کے درمیانی حصے میں موجود درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا لیکن ضروری سامان بنانے کے لئے درختوں کی لکڑی کاٹنے کی اجازت فرما دی۔" مثلاً چرخی اور جانور ہانکنے کیلئے ڈنڈا وغیرہ)۔

حضرت سلمان بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت بھی بتاتی کہ نبی کریم ﷺ مضرب القبہ میں ٹھہرے اور فرمایا: میرے اور مدینہ کے درمیان کا علاقہ محفوظ ہے' یہاں سے کچھ بھی کاٹا نہ جائے گا۔ صحابہ نے "مسد" کی اجازت مانگی تو آپ نے اجازت دے دی۔

نیز آپ نے حضرت ابوبکر بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے حفاظت کے سلسلے میں حد بتائی کہ "مضرب القبہ" تک ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک حد کا نام ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جو چیز ان گھاٹیوں سے آ کر اُگ آئے تو وہ کاٹنی حرام ہے یونہی اسے جھاڑنا بھی حرام ہے ہاں چڑیاں کھائیں' مسد بنانا ہو یا حفاظتی ڈنڈا تو اس کی اجازت ہے۔

حضرت حسن بن رافع نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں پوچھا اور کہا' ہمارے پاس بکریاں اور غلام ہیں' ہم اور وہ ثریر پر ہوتے ہیں' غلام اپنی بکریوں کے لئے یہ پھل جھاڑتے ہیں۔ اس پر حضرت جابر نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے محفوظ کردہ درختوں کو نہ کاٹو اور نہ ہی تراشو البتہ ہلا کر پتے جھاڑ لیا کرو۔ اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسد کاٹنے سے منع فرمایا۔

ابن زبالہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بتایا کہ مجھے میری پھوپھی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسد کی اجازت کے لئے بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی پھوپھی کو میری طرف سے سلام کہو اور ان سے کہو کہ اگر میں نے تمہیں مسد کے بارے میں اجازت دے دی تو تم پرنالے بنانے کی اجازت مانگو گے اور اگر میں نے پرنالہ بنانے کی اجازت دے دی تو تم لوگ ڈنڈا بنانے کی اجازت مانگو گے پھر فرمایا میری محفوظ کردہ جگہ وہاں تک ہے جہاں بنو فزارہ میری اونٹنیاں لے کر پہنچتے ہیں۔

فصل نمبر ۱۱

ان الفاظ کا بیان جو احادیث میں مدینہ کی حد بندی میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کا مقصد

(۱) ذات الجیش

ابن زبالہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ذات الجیش" خیرہ، پہاڑی کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے راستے میں ہے۔ علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ مقام "بیداء" کے درمیان ہے اور بیداء وہی مقام ہے کہ جب حجاج کرام ذوالحلیفہ سے چلتے ہیں تو مغرب کی طرف چڑھتے وقت سامنے ہوتا ہے اور یہ کھلے راستے پر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس بات کی تائید حضرت یاقوت کے اس قول سے ہوتی ہے کہ: ذات الجیش مدینہ میں عقیق کے مقام پر وادی ہے۔ انہوں نے اسے قریب بتانے کے لئے یہ کہا ہے یا اس لئے کہا ہے کہ مدینہ سے سیلابی پانی اسی گھاٹی میں آتا ہے جیسے آگے بیان ہوگا پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے جو نالہ عقیق میں آتا ہے، اُسے بھی ذات الجیش کہہ دیتے ہیں اگرچہ وہ اس سے دور ہے۔

ابو عبداللہ محمد بن احمد اسدی مکہ و مدینہ کے درمیان اس راستے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "ذوالحلیفہ سے خیرہ تک چھ میل کی مسافت ہے، یہاں اونٹ چرائے جاتے ہیں، یہاں پاکیزہ پانی اور حوض موجود ہے، یہ کنواں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کھدوایا تھا، یہاں کچھ گھر بھی ہیں اور مسجد بھی۔ الخ۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خیرہ کی گھاٹی کنوئیں کے بعد ہے، شاید یہ وہ پہاڑی گھاٹی ہے جسے آج کل "مفرح" کہتے ہیں اور پھر وہاں وادیٔ تربان سے پہلے ایک گھاٹی ہے جسے سہان کہتے ہیں جس پر مذکورہ صفات سچے آتے ہیں اور یہ اس قول کے مطابق ہے جو کسی ۔ ۔ ۔ کہا ہے کہ "ذات الجیش، ذوالحلیفہ اور تربان کے درمیان ایک وادی ہے چنانچہ اس وادی کو ذات الجیش کہا جس میں یہ مو ۔ ۔ ہے پھر حضرت عیاض کا قول ہے کہ ذات الجیش مدینہ سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے، یہ طبرانی کی ذکر شدہ روایت سے ظاہر ہے لیکن یہ اس کے مخالف ہے جو حد بندی بارہ میل کی بتائی گئی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی خاطر آپ ٹھہرے رہے تھے، آیتِ تیمم یہیں اتری تھی لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تردید ثابت ہے، فرمایا تھا: "جب ہم بیداء یا ذات الجیش میں تھے۔" معلوم ہوتا ہے کہ گویا دو جگہیں قریب قریب ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں الگ الگ مقام ہیں۔

ابو علی ہجری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ”ذات الجیش“ ضیرہ کے سامنے مکہ کی طرف جانے والے کی دائیں جانب ایک شاخ ہے' پھر کہا کہ ضیر کا اگلا حصہ اور صلصلین' ابو عاصیہ کے کنوئیں میں آ گرتے ہیں اور پھر ذات الجیش میں آ جاتے ہیں اور اس کا پچھلا حصہ بطحاء میں گرتا ہے پھر وہ بطحاء دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا وادیٔ عقیق میں جا گرتا ہے اور ذات الجیش ابو کبیر کی وادی میں چلا جاتا ہے اور یہ مسجد حرم نیز معرس سے اوپر ہے اور مغربی عظیم پہاڑ کا کنارہ ہے جو ذات الجیش میں جا پڑتا ہے جبکہ اس کی دوسری طرف بطحاء میں چلی جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ”اعظم“ جسے ”عظم“ بھی کہا جاتا ہے یہ آج کل مکہ کی سرحد پر ایک مشہور پہاڑ ہے۔علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ ذات الجیش سے شام کی طرف ہے جس پر ہجری کا گذشتہ بیان گواہ ہے۔

شریب

ان کا قول ”شریب“ ظاہر تو یہ ہے کہ یہ لفظ ”مُشَیْرِب“ ہے جو ”مشرب“ کی تصغیر ہے جیسے دوسری روایت میں ہے اور یہ مقام ذات الجیش کی شامی جانب کے پہاڑوں میں ہے' اس کے اور خلائق ضبوعہ کے درمیان واقع ہے جو ”یُلَیْل“ کا ایک مقام ہے۔

اشراف مخیض

لفظ مخیض استعمال ہوا ہے جس کا معنی دودھ ہے' یہ شام کے راستے میں مخیض نامی پہاڑ ہیں۔(ابن زبالہ) علامہ ہجری کہتے ہیں کہ ”مخیض ایک وادی کا نام ہے جو مدینہ سے شام کے راستے میں ”اضم“ میں جا گرتی ہے۔انتہٰی تو گویا مخیض کا لفظ پہاڑوں اور وادیوں پر بولا جاتا ہے۔مطری کہتے ہیں کہ جبلِ مخیض وہی ہے جو شام سے آنے والوں کے راستے سے دائیں جانب موجود ہے۔اسے عیونِ حمزہ کہتے ہیں۔

اَشْرافُ الْمُجْهَتَر

ابن النجار نے یونہی روایت کیا ہے' مطری نے بھی انہی کی پیروی کی ہے لیکن دونوں نے وضاحت نہیں لکھی۔علامہ مجد کہتے ہیں کہ یہ لفظ یونہی ”جیم“ اور ”هاء“ پر زبر سے آیا ہے' اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ مدینہ میں ایک جگہ کا نام ہے اور اگر ایسا نہیں تو احتمال ہے کہ یہ لفظ ”محیصر“ کی شکل بگاڑ کر بنا ہو' یہ ”مِحْصَر“ کی تصغیر ہے جو مدینہ کے قرب میں ایک جگہ ہے۔میں کہتا ہوں یہ بات ذہن کے قریب ہے کہ یہ مخیض کی بدلی ہوئی صورت ہے کیونکہ یہ روایات میں مخیض کی جگہ آتا ہے۔

الحفیاء

اسے ابن زبالہ نے ذکر کیا ہے' یہ مقام جنگل میں ہے' مدینہ سے شام کی طرف جاتے ہوئے آتا ہے۔ہجری

کہتے ہیں کہ ''غابہ'' کے قدرے پیچھے ہے اور آگے آ رہا ہے کہ اس کے اور مدینہ کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہے۔

ذُو الْعُشَیْرَہ

گنتی کے لفظ عَشَرَۃٌ کی تصغیر ہے۔ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یہ حفیاء کی شرقی جانب واقع ہے اور علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ حفیاء میں سوراخ کا نام ہے۔

ثَیّب

ابن زبالہ کا جونسخہ میں نے دیکھا ہے اس میں پہلا لفظ ثاء زبر والا' دوسرا یاء زیر والا اور مشدّد ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ مدینہ کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے اور زبیر ابن بکار بھی یہی کہتے ہیں' یونہی میں نے ابن ہشام کی ''تہذیب'' میں اصل معتمد میں قلم سے لکھا دیکھا ہے کیونکہ انہوں نے غزوۂ السویق کے ذکر میں ذکر کیا ہے کہ: ''ابو سفیان نکلے اور پہاڑ کے دامن میں اُترے جسے ''ثیّب'' کہا جاتا ہے' مدینہ سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ہے' یونہی ابو علی ہجری کے نزدیک عتیق میں ہے البتہ انہوں نے اسکے پیچھے کہا ہے کہ ثَیْئَبُ تَیْعَبُ کی طرح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یاء ساکن کے بعد ہمزہ آتا ہے اور اس پر دلیل بستیوں کے ناموں میں آگے آ رہی ہے' اس کا بیان عباس بن مرداس کے شعر میں ''شظاۃ'' کے لفظ کے تعارف میں ہے' پھر ابن شبہ کی کتاب میں حضرت سلمہ کی آئندہ حدیث میں ساتویں باب کی ابتداء میں ہے: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! شکار دور ہے اور میں ''تیب'' کی طرف پہاڑ کے دامن میں اس کے شکار کو جاتا ہوں۔'' یہاں میں نے ہمزہ کے بغیر' قلم سے لکھا دیکھا ہے۔لیکن اس جگہ یاء کی بجائے تاء ہے۔ابن نجار کی کتاب میں یہ لفظ تیم ہے جسے مطری نے بھی لیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مدینہ کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے جو آج کل اسی نام سے مشہور ہے۔علامہ مجد کہتے ہیں کہ اسے بدل دیا گیا ہے' اصل میں یہ یعیب ہے جو تاب کا فعل مضارع ہے یعنی واپس لوٹا۔

وَعیرہ

واؤ پر زبر ہے اور یہ لفظ وعورۃ سے لیا گیا ہے جس کا معنٰی زمین کا سخت ہونا ہے' ثور کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے' یہ ثور سے بڑا اور احد سے چھوٹا ہے۔

ثنیۃ المحدث

اس لفظ کے بارے میں مدینہ کے کسی مؤرخ نے بھی کچھ نہیں لکھا' تعجب ہے کہ علامہ مجد نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ انہوں نے اپنی کتاب میں حدیث بھی لکھی ہے۔

مِضْرَبُ الْقُبَّہ

علامہ مجد نے مطری ہی کی طرح کہا ہے کہ آج کل اسے کوئی نہیں جانتا' نہ ہی یہ معلوم ہے کہ یہ کس طرف تھا' کہتے ہیں' ظاہر یہ ہے کہ یہ مدینہ کے مغرب میں ذات الجیش اور مخیض کے درمیان کسی مقام میں تھا۔
میں کہتا ہوں: ابوعلی ہجری بتاتے ہیں کہ ''مضرب القبہ'' اعظم پہاڑ اور شام کے درمیان مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

ثریر

اس ثریر کے بارے میں علامہ مجد سمیت کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

غزوۃ ذی قرد

اس گذشتہ فرمان: **من حیث استاقت بنو فزارہ لقاحی** میں آ چکا ہے کہ آپ کی اونٹنیاں غابہ اور اس کے اردگرد چرتی تھیں' ذی قرد کے دن ان پر عیینہ بن حصن فزاری نے ڈاکہ ڈالا' اتفاق یہ ہوا کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے گھوڑوں پر جا کر ان سے چھین لیں' جنگ کی اور ان پر تیر برسائے چنانچہ اس کا نام غزوۂ ذی قرد پڑ گیا کیونکہ یہ جگہ وہ تھی جہاد جنگ ہوئی تھی۔
ان مکانوں کی حد بندی یہ بتاتی ہے کہ سارا حرم بارہ میل کا علاقہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابن زبالہ نے اس سے قبل یہ کہا ہے: ''اور یہ سارا کچھ بتاتا ہے کہ حرم ہر طرف بارہ میل ہے۔ انتہٰی۔ اسی قول پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس حدیث مسلم کے قول کی بنیاد ہے کہ حضورﷺ نے مدینہ کے گردا گرد بارہ میل کا علاقہ حد بنایا کیونکہ یہی ''برید'' کہلاتا ہے یعنی مدینہ کے قبلہ کی طرف چھ میل اور چھ میل شام کی طرف اور یونہی مشرق و مغرب کی طرف اور ایسے ہی یہ حدیث ہے کہ حد حرم مدینہ کے ہر طرف بارہ میل ہے یعنی قبلہ سے شمال تک بارہ میل ہے اور مشرق سے مغرب تک بارہ میل ہے' اسی پیمائش کو حضرت مالک رحمہ اللہ نے لیا ہے لیکن انہوں نے درختوں اور شکار والے حرم میں فرق بیان کیا ہے چنانچہ برید کو درختوں والا حرم لکھا ہے جبکہ دو پتھریلی زمین کے درمیان شکار کا حرم بتایا ہے۔
قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ''اکمال'' میں لکھا' ابن حبیب کہتے ہیں کہ دو پتھریلے مقامات کے درمیانی علاقے کو حرام قرار دینا شکار کے لئے مخصوص ہے البتہ درختوں کا کاٹنا تو مدینہ کے تمام مقامات میں چھ چھ میل کا علاقہ ہے۔
حضرت ابن زبالہ نے حضرت مالک سے نقل کیا ہے' انہوں نے فرمایا: حرم دو ہیں' پرندوں اور جانوروں کا حرم حرۂ واقم (مشرقی) سے حرۂ عقیق (غربی حرہ) تک ہے اور درختوں والا حرم دونوں طرف چھ چھ میل ہے۔ علامہ برھان بن فرحون کہتے ہیں کہ شکار والا حرم مدینہ کے چاروں حرّوں کے درمیان ہے' انہوں نے ان دو حرّوں کو چار کہہ دیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں پتھریلے چاروں اطراف تک پھیل گئے ہیں کیونکہ شرقی اور غربی حرہ' شمال اور قبلہ کی طرف مائل ہیں'

ہمارے اصحاب نے حرم کی حد بندی میں ''برید'' پر اعتماد نہیں کیا حالانکہ اس میں کچھ زیادتی پائی جاتی ہے کیونکہ اس حد بندی کے دلائل قوی نہیں ہیں' ہمارے اصحاب نے اس حد بندی پر اعتماد کیا ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے یعنی دو پہاڑ اور دو پتھریلے علاقے' علاوہ ازیں تحریم کی احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ درختوں اور شکار کے حرم میں فرق نہ ہو خواہ یہ حرم چھ میل ہو یا اس سے کم البتہ برید کی احادیث میں وہ بات ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ درختوں والی ہے حالانکہ ابن زبالہ (کمزور راوی) نے بشیر مازنی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ دونوں پتھریلی زمینوں کے درمیان (مدینہ) کو حرام فرما رہے تھے' حضرت ابوہریرہ وغیرہ نے بھی یہی کچھ بتایا' ان کی ایک روایت ہے: کچھ ایسے پرندے ہیں جن کا شکار کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسلم کی یہ حدیث: ''آپ نے دو پتھریلی زمینوں کے درمیان (مدینہ) کو حرم قرار دیا اور مدینہ کے گرد بارہ میل کے علاقے کو حفاظتی حد فرمایا'' بتاتی ہے کہ حرم میں فرق ہے تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ ہم اسے نہیں مانتے کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ حمٰی سے مراد حرم ہے تو گویا آپ نے فرمایا: آپ نے مدینہ طیبہ کے گرد بارہ میل حرم بنا دیا کیونکہ اس میں یہ تو نہیں کہ آپ نے اسے درختوں کا حمٰی (محفوظ جگہ) قرار دے دیا ہو۔

برید' فرسخ اور میل کی مقدار

تتمہ: ''برید'' چار فرسخ کا ہوتا ہے' فرسخ تین میل کا اور میل ساڑھے تین ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے اور یہی صحیح ہے' اسی کو ابن عبدالبر وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے اور یہ مسافتیں حرمِ مکی وغیرہ کی مسافتوں کے موافق ہیں۔ رہا ذراع یعنی ہاتھ تو یہ طبرانی اور نووی وغیرہ کے مطابق چوبیس انگل کا ہوتا ہے اور ہر انگلی کی پیمائش ملا کر رکھے ہوئے جَو کے چھ دانوں جتنی ہوتی ہے' نووی قلعی نے اسے تین جو کی مقدار کہہ کر غلطی کی ہے اور اس مذکور ہاتھ کی مقدار لوہے سے بنے اس ہاتھ سے آٹھواں حصہ کم ہے جو پیمائش کرنے والے مصر میں آج کل استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہ خود میں نے اور میرے علاوہ اوروں نے اس کا اندازہ لگایا ہوا ہے۔ علامہ تقی فاسی نے تاریخ مکہ مکرمہ میں اسی کا اعتبار کیا ہے۔ میری اس کتاب میں جہاں بھی اس کا ذکر آئے گا اندازہ یہی ہوگا۔

کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ میل چھ ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے' علامہ نووی سے اسی کو لیا ہے لیکن یہ بات بعید ہے۔ شائد اس کا قائل وہی شخص ہے جو ہاتھ میں موجود انگلی کی پیمائش صرف تین جو بتاتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ میل دو ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے لیکن صحیح وہی ہے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۲

حرام قرار دئے ہوئے اس رقبہ کی تخصیص میں حکمت کیا ہے

یہ رقبہ کیوں خاص کیا گیا؟

یاد رکھئے کہ اس رقبہ کو حرام قرار دینے میں جو کچھ سمجھ آتا ہے' یہ ہے کہ اس سے مدینہ طیبہ کو شرف دیا جا رہا تھا اور اس کی عظمت بیان کی گئی تھی کیونکہ ساری مخلوق میں سے افضل ﷺ اس میں آرام فرما ہیں' آپ کے انوار و برکات اسی زمین سے پھیلے ہیں اور پھر اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر بیت اللہ کو حرم قرار دیا ہے کہ اس کی تعظیم کا پتہ چل سکے تو اسی طرح اپنے حبیب اور پوری مخلوق میں سے باوقار کے لئے وہ مقام تجویز فرمایا ہے جو حرم ہے اور جس میں آپ آرام فرما ہیں تاکہ آپ کے احکام چلتے رہیں اور لوگ برکتیں حاصل کرتے رہیں۔ اس مقام میں وہ خیر و برکت' اور انوار میں جو ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور جلد یا دیر سے یہاں ایسی سلامتی پائی جاتی ہے جو کہیں اور نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو حارثہ کو یہاں ٹھہرنے پر ابھارا تھا جیسے آپ نے فرمایا تھا: اے بنو حارثہ! تم حرم سے نکلے ہو' پھر دوبارہ متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم حرم ہی میں ہو۔ یہ اس لئے فرمایا کہ یہاں ٹھہرنے میں جو خصوصیت ہے' وہ کہیں اور نہیں ہے۔

رہی اس رقبہ کی خصوصیت تو شاید اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے اس میں حکم ربانی کا مشاہدہ فرما لیا تھا اور کوئی روحانی راز کی بات تھی جسے اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی حدود میں پھیلا دیا گیا تھا چنانچہ مشاہدہ کرنے والے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے حرم اور اہلِ حرم کی ان حدود میں انوار کو بکھرے دیکھا ہے' اس کے اسی حرم میں وہ مقام موجود ہیں جہاں سے یہ انوار نکلتے ہیں اور یہ سارے حرم میں یونہی ہے چنانچہ ظاہری احکام ان باطنی حقیقتوں کی بناء پر لاگو ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آگ جس کا ذکر آ رہا ہے' جب اس حرم کی طرف بڑھی تو بجھ گئی تھی یا پھر ان حدود کا مقرر کرنا اللہ کی مرضی اور ایسی وحی ربانی کی بناء پر ہے جسے ہم نہیں جانتے کیونکہ بشری عقلیں نبوت سے پھوٹنے والے احکام کے معانی کو سمجھنے سے عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کو سمجھنے کی توفیق دے۔

اس رقبہ کی یہ حد بندی کیوں ہے؟

حرم مکہ کی حد بندی میں ایسی اشیاء کا ذکر ہے جن جیسی مدینہ میں بھی ہونا ممکن ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر گرا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے بہت سے فرشتے بھیجے جنہیں حکم ہوا کہ مکہ کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لو۔ وہ حرم کے نشانوں پر آپ کی حفاظت کے لئے کھڑے ہو گئے اور یوں یہ حرم بن گیا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے موقع پر حجرِ اسود کعبہ میں لگایا تو وہ ہر طرف سے چمک اُٹھا چنانچہ جہاں تک اس کی روشنی پہنچی' اللہ تعالیٰ نے اسے حرم قرار دے دیا (یہ پتھر جنت سے آیا تھا)۔

کچھ حضرات یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ جنت سے یا قوت لے کر زمین پر اُتر جاؤ' وہ اُترے اور حضرت آدم علیہ السلام کے سر سے لگایا جس سے ان کے بال بکھر گئے چنانچہ جہاں تک ان کی روشنی پہنچی' حرم بن گیا' یہ اسی کی جنس سے تھا۔ اس وقت احتمال یہ ہے کہ حضورﷺ اور آپ کے شہر کی حفاظت پر مقرر فرشتے ان حدود پر کھڑے ہوں چنانچہ وہاں تک حرم ہو گیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ جس انمول موتی سے آپ کو پیدا کیا گیا' وہ آپ کی قبرِ انور کی جگہ سے لیا گیا تھا جو بندہ کے باغ کا سب سے عظیم حصہ ہے اور آپ کی مبارک مسجد بھی جنت کے باغ پر ہے' تو وہاں سے انوار نکل کر اس مقام تک پھیل گئے ہوں جس کی انتہاء اللہ ہی جانتا ہے لیکن دیکھنے والوں کی آنکھوں کی ایک حد مقرر ہے چنانچہ جہاں تک آنکھوں نے دیکھا' وہاں تک کا علاقہ حرم بن گیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جب آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے ہوں' یہ روشنی پھیلی ہو اور مشاہدہ کرنے پر یہاں تک پہنچی دکھائی دی ہو' آگے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول مبارک آ رہا ہے جس میں آپ کی یہاں تشریف آوری کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ فرمایا: اس دن جیسا میں نے کوئی دن نہیں دیکھا' بخدا مدینہ کی ہر شے روشن ہو گئی تھی' واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۲

حرم شریف کے احکام' اس میں بہت سے مسائل ہیں

یہاں کا شکار اور درخت کاٹنا حرام ہے

۱۔ حضرت امام شافعی' امام مالک اور امام احمد نے حرمِ مدینہ کا شکار کرنے اور درخت کاٹنے پر اتفاق کیا ہے کہ یہ حرام ہے جبکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے کوئی شے یہاں حرام نہیں' احادیث صحیحہ واضح طور پر اس کی دلیل ہیں جن میں سے کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اور اگر آپ کا یہ فرمان نہ ہوتا۔ "جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا تھا۔" تو کافی تھا کیونکہ اسے ہر اس چیز کے لئے دلیل بنایا جا سکتا تھا جس میں حرمین کے الگ الگ ہونے پر دلیل قائم نہ ہو۔

حضرت ابو داؤد رحمہ اللہ نے بتایا کہ حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے آدمی کو پکڑ لیا جو مدینہ کے اس حرم میں شکار کر رہا تھا جسے نبی کریمﷺ نے حرام کیا لہٰذا اس کے کپڑے چھین لئے چنانچہ اس کے مالک آئے اور اس بارے میں گفتگو کی جس پر آپ نے کہا کہ رسول اللہﷺ نے اس جگہ کو حرم قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "جو یہاں کسی کو شکار کرتے پکڑ لے تو اس کا سامان چھین لے۔" لہٰذا میں تمہیں وہ روزی واپس نہیں کروں گا جو حضورﷺ نے مجھے دے دی ہے' ہاں چاہو تو میں تمہیں اس کی قیمت دے دیتا ہوں۔" اور ایسی ہی حدیث درخت کاٹنے کے بارے میں بھی

آ رہی ہے۔

مؤطا میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے ایسے غلام دیکھے جنہوں نے ایک لومڑی کو ایک طرف بند کر رکھا تھا چنانچہ آپ نے انہیں بھگا دیا۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ نے اس وقت فرمایا تھا: ''کیا رسول اللہ ﷺ کے حرم میں ایسا ہو رہا ہے۔''

مؤطا ہی میں یہ روایت بھی ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ میرے پاس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تشریف لائے' میں اس وقت ''اسواف'' میں تھا اور میں نے ایک شکاری پرندہ پکڑ رکھا تھا' حضرت زید نے مجھ سے پکڑ کر اسے چھوڑ دیا۔ یہی روایت امام طبرانی نے بھی کی ہے' الفاظ یوں ہیں: ''حضرت شرجلیل بن سعید رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے ایک شکاری پرندہ ''اسواف'' میں پکڑا تھا' مجھ سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے پکڑا اور چھوڑ دیا اور فرمایا: تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو پتھریلے ٹکڑوں کے درمیانی مقام کو حرم قرار دیا ہے۔''

ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت ہمارے پاس اس وقت آئے' جب ہم اپنے باغ میں تھے' ہمارے پاس ایک جانور تھا جسے کھڑا کر دیا وہ چیخا اور ہم نے اسے چھوڑ دیا' کہنے لگے: تم جانتے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کا شکار حرام کر دیا ہے؟

حضرت شرجلیل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضرت زید بن ثابت ہمارے پاس باغ میں آئے' ہم ابھی بچے تھے' ہم نے جانور کے لئے جال لگا رکھا تھا' انہوں نے ہمیں بھگا دیا' روکا اور کہا: رسول اللہ ﷺ اس مدینہ کا شکار کرنا حرام کیا ہے۔''

ابن زبالہ نے یوں بیان کیا ہے: میں اسواف میں بنی زید بن ثابت کے ہاں تھا' انہوں نے ایک شکاری پرندہ پکڑا' ابھی وہ ان کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ سب سے پہلے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آ گئے' انہوں نے جانور مجھے پکڑا دیا اور بھاگ گئے' اتنے میں حضرت زید آ گئے' انہوں نے مجھ سے پکڑ کر چھوڑ دیا اور پھر میری گدی میں تھپڑ لگایا اور کہنے لگے' تمہاری ماں نہ رہے' تم جانتے نہیں' اور پھر باقی حدیث بیان کی۔

امام طبرانی نے حضرت زید بن ثابت کے غلام حاجب سے روایت کی اور کہا: میرے پاس حضرت زید بن ثابت آئے' میں اس وقت اَسواف میں تھا اور ایک شکاری جانور کا شکار کر رکھا تھا' انہوں نے پیچھے سے میرے کان پکڑے اور فرمایا: تم یہاں شکار کرتے ہوتے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے دو پتھریلی جگہوں کے درمیان شکار حرام کر رکھا ہے؟

لفظِ نُہَسْ' صُرَد کی طرح ہے اور اس کی طرح کا ہوتا ہے لیکن مرد نہیں ہوتا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ جنگلی کبوتر ہوتا ہے۔

طبرانی میں ہیثمی کا قول ہے' کہا: میں اعواب سوین پر چڑیوں کا شکار کرتا تھا کہ مجھے عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا' میں نے چڑیا پکڑی تھی' انہوں نے مجھ سے چھینی اور چھوڑ دی اور کہا اے بیٹے! رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کو

حرم بنایا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم نے کہا کہ میں نے قبیلہ جانور کے ذریعہ ایک جانور کا شکار کیا' اسی دوران مجھے ابو عبدالرحمٰن ملے' میرا کان مروڑا پھر مجھ سے وہ جانور پکڑا اور چھوڑ دیا' فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مدینے کا شکار کرنا حرام قرار دیا ہے۔

ابو داؤد میں حضرت سعد کے غلام سے روایت ہے کہ حضرت سعد نے مدینہ کے کچھ لڑکے دیکھے جو مدینے کے درخت کاٹ رہے تھے' آپ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ان کا سامان قبضے میں لے لیا اور ان کے مالکوں سے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ اس بات سے منع فرما رہے تھے کہ مدینے کے درختوں سے کچھ کاٹا جائے پھر فرمایا: جو ایسا کرے گا تو اسے پکڑنے والے کو اس کا سامان دے دیا جائے گا۔

حضرت امام مسلم کی روایت یہ ہے: حضرت سعید عقیق میں اپنے محل کی طرف روانہ ہوئے' راستے میں دیکھا کہ ایک شخص درخت کاٹ رہا تھا یا جھاڑ رہا تھا' آپ نے اس سے سامان چھین لیا چنانچہ جب حضرت سعد آئے تو اس کے مالکوں نے آپ سے بات کی کہ انہیں غلام کا سامان واپس کر دیں جو انہوں نے اس سے چھین لیا تھا۔آپ نے فرمایا: اللہ معاف کرے' میں وہ سامان واپس نہیں کر سکتا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے انعام میں دیا ہے۔

حضرت مفضل جندی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: حضرت سعد اپنے محل کی طرف سوار ہو کر گئے جو عقیق میں تھا' ایک آدمی کو دیکھا جو درخت کاٹ رہا تھا۔آپ نے اس کا سامان پکڑ لیا۔پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی' الفاظ یہ ہیں: حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک انسان کو عقیق میں درخت کاٹتے دیکھا یا وہ جھاڑ رہا تھا چنانچہ انہوں نے اس کا کلہاڑا وغیرہ پکڑ لیا' وہ غلام اپنے مالکوں کے پاس گیا اور واقعہ بتایا' وہ سوار ہو کر حضرت سعد کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ یہ ہمارا غلام ہے لہٰذا اس کا سامان واپس کر دو۔آپ نے کہا' میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا ہے' پھر وہ کچھ کہا جو دسویں فصل میں ہم ذکر کر چکے ہیں اور آخر میں کہا: میں وہ سامان واپس نہیں کروں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمایا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے عاصیہ سلمیہ کی ایک لونڈی دیکھی جو گھاس پھوس کاٹ رہی تھی' آپ نے اسے مارا اور اس کا کپڑا چھین لیا پھر اس سے کلہاڑا بھی لے لیا۔عاصیہ سلمیہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئیں اور حضرت سعد کی شکایت کی۔انہوں نے حضرت سعد سے کہا کہ سامان واپس کر دو' اے ابو اسحاق! انہوں نے کہا نہیں' بخدا میں اسے واپس نہیں کروں گا' یہ غنیمت کا مال ہے جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا ہے' میں نے انہیں فرماتے سنا تھا کہ جو بھی قابلِ حفاظت شے کو کاٹتا دکھائی دے' اسے مارو اور اس کا سامان چھین لو چنانچہ آپ اس کلہاڑے سے آخری دم تک لکڑیاں کاٹنے کا کام لیتے رہے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے عاصیہ سلمیہ کی ایک لونڈی کو پکڑ لیا جو عقیق

کے مقام پر درخت کاٹ رہی تھی چنانچہ اس کا سامان چھین لیا۔ آگے اسی طرح بیان کر دیا نیز حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حرم مدینہ سے تازہ درخت وغیرہ کاٹنے والے کا سامان، غنیمت بنا لینے کی اجازت دی۔

علامہ جندی نے عبد الکریم بن ابو المخارق کی روایت لکھی، انہوں نے بتایا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ کے ایک جانب تشریف لے گئے، کسی کے غلام کو باغ میں دیکھا تو فرمایا: کیا تمہارے پاس کوئی لکڑیاں کاٹنے آتا ہے؟ اس نے عرض کی ہاں، حضرت عمر نے فرمایا: اگر تم کسی کو دیکھ لو تو اس کا کلہاڑا اور رسّی وغیرہ پکڑ لو۔ غلام نے پوچھا: کپڑے بھی پکڑ لوں؟ آپ نے انکار کیا۔

آپ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدامہ بن مظعون نے فرمایا: میں تمہیں ان لکڑیاں کاٹنے والوں پر مقرر کرتا ہوں چنانچہ جو حدودِ مدینہ میں لکڑیاں کاٹتا نظر آئے، اس کا کلہاڑا اور رسّی وغیرہ تم سے لینا، اس نے پوچھا: اس کے دونوں کپڑے بھی؟ اس پر آپ نے فرمایا: اتنا ہی کافی ہے۔

حرمِ مدینہ میں درخت وغیرہ کاٹنے کو حرام کہنے والے حضرات ضمانت کے لحاظ سے جزاء کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں چنانچہ امامِ احمد سے اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بھی دو روایتوں کی طرح دو قول ہیں، دونوں حضرات کا بعد والا نیا قول تو یہ ہے کہ ضمان (تاوان) نہیں لیا جائے گا، امام مالک کا بھی یہی قول ہے کیونکہ یہ حج کے افعال کا مقام نہیں ہے لہٰذا یہ ایسے ہو گا کہ جیسے چراگاہ کے مقام ہوتے ہیں یا طائف کی وادیٔ وج ہے لیکن دونوں حضرات کا قدیم قول یہ ہے کہ ان سے تاوان لیا جائے گا، یہی صحیح ہے جیسے امام نووی وغیرہ نے کہا ہے اور جیسے حضرت سعد کی گذشتہ حدیث آ چکی ہے اور اس کا جواب مشکل ہے چنانچہ اس بنیاد پر صحیح ترین بات یہ ہے کہ شکار کرنے والے اور درخت، گھاس کاٹنے والے کا سامان چھین لیا جائے گا جیسے مقتول کافر کا سامان چھین لیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا گھوڑا اور ہتھیار بھی چھین لیا جاتا ہے، کچھ حضرات صرف کپڑا چھیننے کا کہتے ہیں اور پھر صحیح یہ ہے کہ چھینا ہوا یہ سامان چھیننے والے کا ہو گا لیکن دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ فقراءِ مدینہ کو دے دیا جائے جیسے مکہ کے شکار کا تاوان اور بدلہ مکہ کے فقراء کو دیا جاتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سامان بیت المال میں رکھ دیا جائے اور ان کا استعمال ویسے ہی ہو گا جیسے مصلحت کے لئے رکھے گئے تیروں کا ہوتا ہے۔

حضرت شیخ ابو محمد کہتے ہیں کہ جس سے سامان چھین لیا جائے، اسے چادر دے دی جائے تاکہ وہ اپنا جسم ڈھانک سکے اور جب اس کو جسم ڈھانکنے کے لئے کوئی کپڑا مل جائے تو اس سے واپس لے لے۔ رویانی کہتے ہیں کہ کپڑا اسی کے پاس رہنے دیا جائے، امام نووی نے بھی اسی کو درست کہا ہے۔

امام رافعی کہتے ہیں کہ جو بات حدیث اور کلامِ ائمہ سے ذہن میں فوراً آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ شکار کرے اس وقت اس سے سامان چھینا جائے، اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ سامان اس وقت چھینے جب نقصان ہو جائے۔ علامہ غزالی

نے "وسیط" میں لکھا ہے کہ جب تک کوئی شکار نہ کر لے یا شکار کے لئے کتا وغیرہ نہ چھوڑ دے اس وقت تک نہ چھینا جائے اور چیز کے برباد ہونے تک تاخیر کا احتمال ہوتا ہے۔ انتہی پھر اس معاملے میں شکار کا فرق نہیں اور نہ ہی درخت کے بارے میں کوئی فرق ہے (کہ کیسا ہو) کیونکہ چھینا گویا ایسے ہوتا ہے جیسے کاٹنے والے کو سزا دے دی۔

علامہ سراج بلقینی کہتے ہیں کہ اگر درخت کاٹنے یا شکار کرنے والا غلام ہے تو کیا اس کے کپڑے چھین لئے جائیں گے جیسے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں گذرا؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ جہاں تک میری نظر کام کرتی ہے غلام سے کچھ نہ چھینا جائے کیونکہ وہ تو کسی شے کا مالک ہوتا ہی نہیں اور یونہی اگر شکار کرنے والے پر اجرت کے کپڑے ہوں یا کسی سے مانگ رکھے ہوں تو وہ بھی نہیں چھینے جائیں گے کیونکہ میں نے ایسا کوئی نہیں دیکھا جس کا یہ قول ہو انتہی۔

میں کہتا ہوں، تحقیق یہ ہے کہ یہاں تفصیل ہے، دیکھا جائے گا، اسے اس کے آقا یا قائمقام نے حکم دیا ہے یا نہیں دیا؟ حضرت سعد والا معاملہ پہلی صورت میں شمار ہوگا (وہاں آقا کا حکم تھا) اور پھر اگر شکاری یا لکڑیاں کاٹنے والے پر چھینے ہوئے کپڑے ہوں گے تو وہ بلا خلاف نہیں چھینے جائینگے جیسے شرح المہذب میں ہے اور انہوں نے اسے وہاں نقل کیا ہے جہاں دریا سے پکڑی چیزوں کا ذکر کیا ہے پھر کہا کہ مانگ کر لی ہوئی چیز کا حکم بھی یہی ہے اور اگر اس نے کسی کو شکار کرتے نہیں دیکھا تو ظاہر ہے پکڑنے والا لازماً وہ سامان، امام کے نائب کو پہنچا دے اور اگر شکاری نے کسی کے پاس شکار کا ذکر کر دیا اور اس نے سن لیا تو کیا اس صورت میں جائز ہے کہ اس کا سامان چھین لے؟ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ نہ چھینے۔ انتہی اور اگر حرم میں شکار داخل ہو جائے تو اس لازم نہیں کہ اسے چھوڑ دے، بالاتفاق اسے ذبح کر سکتا ہے، حرم مکہ بھی ہمارے نزدیک یونہی ہے۔

حضرت بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام مکہ میں آتے تو وہاں پنجروں میں بند جنگلی کبوتر اور چکور دیکھتے۔ یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسے اس حدیث کا واقعہ ہے: اے ابو عمیر! تمہارے ساتھ بلبل نے کیا کیا؟" یا یہ واقعہ مدینہ کے حرم بننے سے پہلے کا ہے کیونکہ یہ ہجرت کی ابتداء میں ہوا تھا جبکہ مدینہ کو حرم حضور ﷺ کے خیبر سے واپس آنے پر بنایا گیا تھا جسے ابن حجر نے واضح کیا ہے۔

حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مدینہ کا شکار حرام نہ ہونے پر ابو عمیر کے واقعہ کو دلیل بنایا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حرم مکہ میں باہر سے داخل کئے جانے والے شکار کو چھوڑ دینا لازم ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ مدینہ کا شکار حرام کیا ہوتا تو ابو عمیر کے ہاتھ میں وہ شکار نہ رہنے دیتے۔ (ہماری طرف سے) اس کا جواب گذر چکا ہے۔

علامہ بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں شکار وغیرہ کو حرام نہ کہنے والوں کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مقصد مدینہ کی خوبصورتی اور حسن کو برقرار رکھنا تھا کہ اسے وطن بنایا جا سکے اور یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے ٹیلوں کو گرانے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے ٹیلے گرانے سے منع فرمایا اور

فرمایا تھا کہ یہ مدینہ کی زینت ہیں' چنانچہ یہ نہی تنزیہ کے لئے ہے۔

علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک نہی تحریم کے لئے ہوتی ہے جب تک نہی تنزیہ کا کوئی ثبوت نہیں۔آپ نے کہا کہ مخالف' اس حدیث ابوسلمہ سے استدلال کرتے ہیں:''دیکھو اگر تم عقیق میں جا کر شکار کرتے تو جاتے وقت میں بھی تمہارے ساتھ چلتا اور واپس آتے وقت تجھ سے ملاقات کرتا کیونکہ مجھے عقیق سے محبت ہے۔''

علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور جیسے احادیث سے واقفیت کا دعویٰ ہے اسے حرمتِ مدینہ بتانے والی صحیح احادیث کے ذریعے اس حدیث ضعیف کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مقام جہاں حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا نے شکار کیا تھا' مدینہ کی حدود سے باہر ہو اور وہ مقام جہاں حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے غلام کو درخت کاٹتے دیکھا تھا' حرم میں داخل ہو چنانچہ اس صورت کے لحاظ سے دونوں حدیثیں ایک دوسرے کا مقابلہ نہیں کرتیں اور اگر اختلاف ہو تو حضرت سعد کی روایت پر عمل ہوگا کیونکہ اس کے راوی مضبوط اور حدیث صحیح ہے' حضرت سلمہ کی حدیث پر نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث سعد کے باوجود یہ معاملہ نہیں کیونکہ درخت کاٹنے کا معاملہ عقیق میں واقع ہوا تھا اور آپ کا عقیق کی طرف سوار ہو کر جانا یہ نہیں بتاتا کہ درخت وہاں کاٹا ہو بلکہ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ یہ کاٹنا حرم سے باہر واقع ہوا تھا علاوہ ازیں عقیق کا جو حصہ ذوالحلیفہ سے ملتا ہے' ہمارے نزدیک وہ حرم نہیں کیونکہ وہ دو پتھریلی زمینوں (لابتین) سے باہر ہے اور مالکی حضرات اگرچہ برید (بارہ میل) کا اعتبار کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک شکار کا حرم لابتین کے درمیان ہی ہے جیسے بتایا جا چکا حالانکہ عقیق' نقیع تک پھیلا ہوا ہے لہٰذا اس عقیق کا کچھ حصہ بہرحال باہر ہے چنانچہ علامہ بیہقی نے جو کچھ کہا ہے' وہ صحیح ہے' رہا سعد کا محل تو وہ وہاں کے محلات میں اندر کی طرف حرم میں داخل ہے کیونکہ وہ حرۂ غربیہ میں ہے' اسے غور سے دیکھو اور پھر حدیث سلمہ میں احتمال یہ ہے کہ مدینہ کو حرم بنانے سے پہلے کی ہو۔واللہ اعلم۔

حرم سے کیا کچھ خارج شمار ہوتا ہے؟

حضرت علامہ مطری نے ابن النجار کی پیروی کرتے ہوئے کجاوہ اور ضرورت کی چیزیں بنانے کے لئے حرم کے درخت کاٹنے کو جائز قرار دیا ہے یونہی وہ گھاس وغیرہ کاٹنے کا جواز بتاتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے' مکہ کے لئے اجازت نہیں دی' دونوں کا قول ایک جیسا ہے' ان سے پہلے حنبلی حضرات میں سے ابن جوزی نے جائز لکھا ہے چنانچہ حج کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''مدینہ' اس میں مکہ سے الگ حکم رکھتا ہے کہ کیا مدینہ سے اس صورت میں درخت کاٹنے کی اجازت ہے جب ضرورت کی چیزیں بنانا ہوں' مثلاً کجاوہ وغیرہ انتہی۔

ان سب حضرات نے جواز کا مسئلہ دسویں فصل میں مذکور ان احادیث سے نکالا ہے جن میں ایسے مسائل کے

بارے میں گنجائش موجود ہے پھر ابن زبالہ کی یہ حدیث بھی موجود ہے کہ:

"یا رسول اللہ! ہم کام کاج والے لوگ ہیں ہم دور جانے سے مجبور ہیں لہٰذا ہمیں پائے بنانے چارپائی چوکھٹ بنانے اور مسواک کے لئے لکڑی کاٹنے کی اجازت عطا فرما دیں اس کے علاوہ کوئی شے کاٹی نہیں جائے گی نہ ہی جھاڑی جائے گی۔"

پہلے تو اس بارے میں کلام کرنا ہے کہ سند کے لحاظ سے استدلال کی صورت کیا ہے حالانکہ ہم ان احادیث کی ممنوعہ چیزوں میں اس کی ممانعت لکھ چکے ہیں خصوصاً ہم نے حدیث طبرانی لکھی ہے کیونکہ اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: رسول اللہ ﷺ کی حفاظتی چیزوں کو نہ تو جھاڑا جائے اور نہ کاٹا جائے بس آرام سے ہلایا جائے۔ اور پھر فرمایا: اے جابر! رسول اللہ ﷺ کونپلیں کاٹنے سے منع فرماتے ہیں اور جو ہمارے شافعی حضرات کے کلام میں غور کرتے ہیں انہیں اس سے صرف یہ سمجھ آتا ہے کہ اس معاملے میں دونوں حرم برابر ہیں کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ چوپائیوں کے لئے حرم مکہ کی گھاس پھوس کاٹنا جائز ہے پھر علامہ نووی نے بھی اس حدیث مسلم "اس کے درخت چارے کے بغیر نہ جھاڑے جائیں۔" پر کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس سے پتہ چلتا ہے کہ درختوں کے پتے چارہ کے لئے جھاڑنا جائز ہیں البتہ ٹہنیاں کاٹنا حرام ہے انتہٰی پھر آپ کے علاوہ اوروں نے بھی مکہ کے درختوں کے بارے میں لکھا ہے کہ درختوں کے پتے جھاڑنا جائز ہے البتہ اتنا زور سے نہ ہلائیں کہ ٹہنیاں کٹ جائیں اور پھر شرح المہذب میں بھی ہے: درختوں کے پتے اور چھوٹی ٹہنیاں مسواک وغیرہ کے لئے جھاڑے جا سکتے ہیں۔ انتہٰی چنانچہ ثابت ہوا کہ دونوں حرم اس معاملے میں برابر ہیں۔

علامہ غزالی نے بسیط اور وسیط میں حرم مکہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: اگر درختوں سے اس ضرورت کے لئے کچھ کاٹا جائے جس کے لئے اذخر (ایک نرم بوٹی) کام آتی ہے جیسے چھتوں وغیرہ پر ڈالنا تو اس میں دواء کے لئے اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ جائز ہے صاحب حاوی کبیر نے بھی ان کی پیروی کی ہے چنانچہ انہوں نے ضرورت کے لئے کاٹنے کی کھلی چھٹی دی ہے صرف دوائی کے لئے جائز نہیں کہا۔ بہت کم لوگ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے ذریعے علامہ مطری نے کچھ چیزوں کے حرم میں کرنے کا جواز نکالا ہے لیکن دونوں حرموں کو برابر جانا ہے۔

قاضی عیاض کہتے ہیں مہلّب نے کہا کہ "نبی کریم ﷺ نے جب مسجد تعمیر فرمائی تو مدینہ سے کھجور کا درخت کٹوا دیا تھا اور یہ بات بتاتی ہے کہ نہی اس صورت میں نہیں جب کسی عمارت یا اصلاح کے لئے درخت کاٹے جائیں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہاں کے درخت کسی عمارت یا سائے وغیرہ کے لئے کاٹے جا سکتے ہیں اور پھر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نہی کا مقصد صرف یہ ہے کہ دیکھنے والے کو وہ درخت خرابی پیدا کرتا نظر نہ آئے مدینہ کی تروتازگی متاثر نہ ہو اور اس کی سبزہ زاری میں فرق نہ آئے۔ انتہٰی۔

ایک ایسی ہی روایت ابن زبالہ نے لکھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سبزہ زار کی طرف دیکھتے ہوئے بنو حارثہ

سے فرمایا تھا: ''یہ سبزہ زار اور چراگاہ میں تمہیں اس صورت میں دیتا ہوں کہ جو شخص بھی یہاں سے درخت کاٹے' اس کی جگہ اور لگا دیا کرے۔'' ابن زبالہ ضعیف شخص ہیں اور نبی کریم ﷺ نے صرف کھجور کا درخت کاٹا تھا جسے آدمی لگاتے رہتے ہیں اور اس میں اختلاف موجود ہے' مالکی اور حنفی حضرات اس طرف گئے ہیں کہ یہ درخت تو مدینہ ہی نہیں' مکہ میں بھی کاٹا جاتا ہے' ایک قول ہمارا بھی یہی ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسے ان درختوں میں شامل کیا جائے جو خود بخود اُگتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے' ہوسکتا کہ یہ واقعہ مدینہ کو حرم بنانے سے پہلے کا ہو یا یہ کہ آپ نے اسے کسی عمارت جیسی ضرورت کے تحت کاٹا ہو کیونکہ سامنے جواز ہی آتا ہے جیسے اس سے قبل امام غزالی سے گذر چکا' اہلِ مدینہ اس سے گھروں کی چھتیں ڈالتے رہے اور وہ کھجوریں کاٹ کر ڈالتے تھے۔

علامہ واقدی نے ''الحرم المکی'' میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے عمارت کے لئے حرم مکہ کے درخت کاٹنے کی رخصت دی ہے' علاوہ ازیں ماوردی نے اجازت ان درختوں کے بارے میں دی ہے جسے لوگ خود لگاتے ہیں چنانچہ اس اختلاف کا نتیجہ اس مقام پر نظر آئے گا جہاں حرم کی بنجر زمین میں یہ درخت ہوگا لیکن اگر اس نے اپنی ملک والی زمین میں لگایا ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا (وہ کاٹا جاسکتا ہے) انتہی۔

رہا درختوں کے علاوہ کسی اور چیز کا کاٹنا' جیسے مثلاً گندم اور سبزیاں وغیرہ تو انہیں کاٹنے میں کوئی اختلاف نہیں' یونہی جو چیزیں غذا بنتی ہیں اور جنہیں انسان خود کاشت کرتا ہے جیسے خرفہ وغیرہ (انہیں بھی کاٹا جا سکتا ہے) کیونکہ یہ زراعت میں شامل ہیں۔ انہیں روکی ہوئی چیزوں میں سے نکالنے کے لئے محبّ طبری نے ''شرح التنبیہ'' میں وضاحت کر دی ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کیونکہ جب یہ چیزیں مویشیوں کے لئے کاٹی جاسکتی ہیں تو پھر انسان بہر صورت ان کے لئے زیادہ حقدار ہوگا۔

تیسری بات' یہ جو انہوں نے ذکر کیا ہے کہ دوائی وغیرہ کے لئے اسے کاٹ سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے حاصل کیا جاسکتا ہے' اور اس غرض سے پاس رکھا بھی جاسکتا ہے خواہ یہ اس کام نہ بھی آسکیں' البتہ ''روضہ'' کی یہ عبارت موجود ہے: ''اگرچہ دواء کے لئے حرم کی کسی جڑی بوٹی کی ضرورت پڑے۔'' اور شرح المہذب میں ہے کہ چارے کے لئے حرم کی نباتات کاٹی جاسکتی ہیں اور اگر کاٹی ہوئی کو بیچنا چاہے تو جائز نہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دواء بھی یونہی ہے۔ باقی ماوردی نے جو کچھ کہا ہے اس سے بالکل جواز نکلتا ہے اور یہ ظاہر ہے کیونکہ سناءِ مکی کو کاٹنے پر کوئی انکار نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں بے ارادہ قتل پر دیت اور قصاص لازماً ہوگا

حرم مدینہ میں بے ارادہ قتل ہو جانے پر مکہ کی طرح قاتل پر دیت اور قصاص سختی سے لازم ہوتا ہے' صحیح بخاری کی ایک وجہ اس کے خلاف ہے اور یہ مسئلہ آپ کے اس قول میں عمومیت کی وجہ سے نکلتا ہے: جیسے حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام فرمایا تھا" اور سراج بلقینی نے صحیح کی اسی وجہ کو پسند کیا ہے' وہ کہتے ہیں: کیونکہ اس میں اس کا اختلاف ایسے ہی ہے جیسے مکہ میں شکار کی ضمان ہوتی ہے جبکہ نووی کے نزدیک یہاں کے شکار کی ضمان شکار کو ختم کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے' اس کی ایک وجہ ہے کہ آپ کے قول میں عمومیت ہے' مکہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ کافر کو یہاں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے' کسی صورت میں وہ یہاں داخل نہیں ہوسکتا البتہ مدینہ میں امام یا اس کے نائب کی اجازت سے کسی مصلحت کی بناء پر داخل ہوسکتا ہے۔مکہ سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو یہاں سے نکالا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی کہ کسی بھی طور پر وہ یہاں داخل نہیں ہو سکتے' مقصد رسول اللہ ﷺ کی عظمت بیان کرنا تھا۔

علامہ رویانی نے مکہ اور مدینہ میں اس لحاظ سے برابری کو اچھا جانا ہے کہ جو بھی کافران دونوں مقامات میں سے کسی جگہ مر جائے تو اسے یہاں سے نکال کر کہیں باہر دفن کیا جائے اور مکہ سے اس حکم کی خصوصیت وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

حرمِ مدینہ میں گری پڑی چیز کا حکم

ہمارے (شافعیہ) اصحاب میں سے صاحب "الانتصار" نے گری پڑی چیز کے حکم کے بارے میں حرمِ مکہ و مدینہ اس بات میں برابر سمجھا ہے کہ اس کا مالک بننا حلال نہیں بلکہ کبھی اسے حفاظت میں بھی نہ لے لیکن دارمی کہتے ہیں کہ حرمِ مدینہ کی گری چیز کا حکم حرمِ ملہ کی گری چیز سے نہ ملایا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ دلیل کی بناء پر تو اوّل قول صحیح ہے کیونکہ اس کے بارے فصل نمبر ۸ میں واضح احادیث آ چکی ہیں اگر ہمارے اصحاب نے اسے مکہ ہی خاص کیا ہے۔

حرمِ مدینہ کے اندر باہم جنگ کرنا

گذشتہ احادیث میں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: "لڑائی کے لئے یہاں ہتھیار نہ اُٹھائے جائیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی وہی اختلاف سامنے آئے گا جو حرمِ مکہ کے بارے میں آ چکا کہ جو جائز لڑائی کسی اور مقام پر ہوسکتی ہے وہ یہاں نہ ہونے پائے جیسے مثلاً باغیوں کو قتل کرنا بلکہ ان کو اتنا تنگ کیا جائے کہ یہاں سے نکل جائیں یا توبہ کر لیں جیسے کہ بہت سارے علماء یہی نظریہ رکھتے ہیں لیکن جو یہ کہتے ہیں کہ ان سے جنگ کر کے قتل کیا جائے کیونکہ یہ لڑائی حقوق اللہ میں سے ایک حق ہے اور حرم میں اس حق کی حفاظت اور ضروری ہے جبکہ حرم کسی گنہگار کو پناہ دیتا ہی نہیں۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ مکہ میں کسی کو ہتھیار اُٹھانے کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ یہاں جنگ کرنے سے روکا گیا ہے لہٰذا ہتھیار نہ اُٹھائے کہ یہ جنگ کا سبب ہے' پھر حضور ﷺ کا قول مبارک بھی ہے: "کسی کو مکہ

میں ہتھیار اُٹھانا حلال نہیں۔ (مسلم)۔

حرم کے پتھروں سے استنجاء کا حکم

حضرت ماوردی رحمہ اللہ نے دو وجوہ بیان کئے ہیں جن کی بناء پر حرم کے پتھروں سے استنجاء کرنا جائز ہے کہا کہ ظاہر مذہب یہ بتاتا ہے کہ اس سے فرض ثابت ہو جاتا ہے لیکن گناہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ اسے اس شخص کے مطابق سمجھا جائے گا جس نے حرم سے پتھر اُٹھایا کہ حرم سے باہر جا کر مثلاً اس سے استنجاء کرے ورنہ یہ مشکل ہے کیونکہ حرم پیشاب کرنے کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں چنانچہ پتھر سے استنجاء کرنا بھی ایسا ہی ہے۔

ماوردی نے سونے اور ریشم سے فرضِ استنجاء ساقط ہونے میں جو دو وجہیں نقل کی ہیں ان کا ذکر کرنے کے بعد شرحِ مہذب کی عبادت یوں ہے: ''ماوردی نے ان دو وجوہ کو حرم کے پتھر سے استنجاء کرنے کے بارے استعمال کیا ہے۔انتہی اور واقعی یہ احتمال موجود ہے کیونکہ ہم اسے ثابت کر چکے ہیں چنانچہ علامہ نووی نے حرم کی مٹی سے بنے ہوئے برتنوں میں کھانا ناجائز قرار دیا ہے جیسے علامہ دمیری نے لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اسے اس شخص کے لئے منع لکھا ہے جو یہ پتھر حرم سے باہر لے جائے اور یہ بات پوشیدہ نہیں۔

حرمِ مدینہ کی مٹی کہیں لے جانے کا حکم

حضرت نووی رحمہ اللہ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ حرمِ مدنی کی مٹی اور پتھر کہیں لے جانے حرام ہیں کیونکہ حرم مکی میں موجود اختلاف کو اس سلسلے میں کافی سمجھا ہے اور اس میں حرام کرنے کو صحیح قرار دیا ہے لیکن علامہ رافعی نے اسے مکروہ کہا ہے جیسے کہ اس کراہت کو نووی نے بہت سے بلکہ بہت زیادہ لوگوں سے نقل کیا ہے اور قاضی ابو الطیب نے بھی اسے امام شافعی کی قدیم نص سے نقل کیا ہے اور ان کی نص سے جامع کبیر میں حرام ہونا نقل کیا ہے' انہوں نے ''ام'' میں حرم مدینہ کے پتھر اور مٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس میں کوئی بہتری نہیں کہ یہاں سے کوئی شے حرم کے باہر لے جائی جائے کیونکہ اس کی حرمت کی بناء پر دوسرے شہر اس سے جدا شمار ہوتے ہیں لہٰذا میں (واللہ اعلم) نہیں دیکھتا کہ کسی کے لئے یہ جائز ہو کہ اسے اس مقام سے کہیں اور لے جائے جو اس سے جداگانہ ہیں کیونکہ اس طرح یہ اسی غیر کی طرح ہو جائے گا۔''

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس و حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اس کام کا مکروہ ہونا لکھا ہے چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بہت سے اہل علم کہتے ہیں' یہ مناسب نہیں کہ کوئی شخص حرم سے کوئی شے باہر لے جائے۔''

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابو یوسف کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے فرمایا: میں نے اس بارے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابو یوسف فرماتے ہیں' ہمیں ایک شیخ نے حضرت علی بن عبد اللہ بن عباس کے غلام رزین سے سن کر بتایا کہ حضرت علی نے انہیں یہ لکھا: مجھے مروہ پہاڑی کے سفید پتھر کا ایک ٹکڑا بھیجو جسے میں سجدہ گاہ کے لئے رکھ کر اس پر سجدہ کیا کروں۔"

قاضی ابو الطیب نے حضرت شافعی کی طرف سے بتایا: انہوں نے کہا کہ اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو اجازت دی گئی تھی' انہوں نے برام نامی پتھر مکہ سے خریدنے کو دلیل بنایا حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ برام حرم کا پتھر نہیں بلکہ حرم سے دو تین دن کی مسافت سے لایا جاتا تھا۔

شرح المہذب میں اصحاب کا اس بات پر اتفاق لکھا ہے کہ حرم سے باہر کا پتھر اور مٹی حرم کی طرف نہ لائی جائے کہ اسے وہ عزت ملے جو اس میں موجود نہ تھی پھر کہا: اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ مکروہ ہے حالانکہ "روضہ اور مناسک" میں اسے مکروہ لکھا ہے' لگتا ہے کہ اس کراہت کا معنٰی انہوں نے خلاف الاولیٰ لیا ہے (یعنی صرف بہتر کے خلاف ہے)۔

صاحب بیان کا یہ قول: "شیخ ابو اسحاق کہتے ہیں کہ حرم سے باہر کی مٹی اور پتھروں میں سے کچھ بھی لے کر حرم میں جانا جائز نہیں۔" بتاتا ہے کہ یہ مباح نہیں ہے یعنی اس کا مکروہ ہونا' نہ ہونا برابر ہے جیسے ایسا کئی مقامات پر ہوا ہے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا لبنان اور طور سیناء جیسے پہاڑوں جو حرم سے نہ تھے' یا تو اس لئے تھا کہ بیت اللہ بنانا' حرم کی حرمت نہیں کیونکہ حرم کو حرام قرار دینے کا حکم معلق رہا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ظاہر ہوا' یا اس لئے کہ ان کی شریعت کا تقاضا تھا' بایں ہمہ ظاہراً حرم کے باہر کا پتھر نقل کرنا کسی ایسی مصلحت کی بناء پر مستثنٰی ہے جو حالات پر موقوف ہے۔

رہی اہل سیرت کی یہ بات کہ لوگ نبی کریم ﷺ کے مزار شریف کی مٹی لیا کرتے تھے تو اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آگے دیوار بنا دینے کا حکم فرمایا چنانچہ دیوار بنا دی گئی' تو یہ دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اس کام کرنے والے کا کوئی پتہ نہیں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ وہ شخص ان لوگوں میں شامل ہے جنہیں دلیل نہیں بنایا جا سکتا جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دیوار بنوانا ایک روک ہے علاوہ ازیں اس روایت میں یہ چیز نہیں کہ وہ مٹی حرم سے باہر لے جانے کے لئے لی جاتی تھی۔

ابو المعلی سبعی (یونہی خلیل مالکی اور تادلی مالکی) نے اس بارے میں نووی کا کلام نقل کیا ہے کہ حرم کی مٹی کا نقل کرنا منع ہے اور اسے برقرار رکھا ہے تو ظاہر یہ ہے کہ یہ ان کے قواعد پر جاری ہے کیونکہ اس سے ذرائع کی بندش ہے۔

پھر بتوں کی عبادت کے سبب میں کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ حرم سے اپنے ساتھ تبرک حاصل کرنے کے لئے پتھر لے جاتے تھے' برھان بن فرحون کئی امور کی وجہ سے شبہ میں پڑ گئے جن میں سے ایک وہ ہے جس کے

جواب کی طرف اشارہ پہلے گذر چکا ہے اور ایک زمزم کے پانی کو دوسری جگہ لے جانے اور حضور ﷺ کو بطور ہدیہ پیش کرنے پر اجماع پایا جاتا ہے یہ حضرت سہیل بن عمرو نے آپ کی طرف بھیجا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آبِ زمزم ایک شخص کے لئے خوراک ہے اور ایک کے لئے بیماری سے شفاء کا باعث ہے اور کبھی ایسے نہیں بھی ہوتا تو یہ خوشبودار گھاس کے حکم میں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ امام شافعی نے فرمایا: "رہا آبِ زمزم تو میں اسے لے جانے کو مکروہ نہیں سمجھتا اور پانی ایسی شے بھی نہیں جو لے جائی جائے اور دوبارہ نہ آ سکے انتہی باوجودیکہ پتھروں کے بارے میں جو ممانعت گذر چکی' اس جیسی توقع پانی میں نہیں ہے کیونکہ پانی کو لے جانے کا مقصد تو پینا ہے اور یہ ظاہر ہے لیکن پتھر اور اس جیسی چیز میں یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ اس میں تو تبرک حاصل کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے حکم نہیں ہے لہٰذا میں کہتا ہوں کہ جو شخص حرم میں موجود تنگ سر والے کوزے کی ٹھیکریاں کسی ضرورت کے لئے اُٹھا لے جائے تو یہ اس کے لئے جائز ہوگا اور جس نے مطلقاً منع کیا ہے اس کا کلام تبرک پر محمول کیا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں اور جب حرم کی گھاس بطور دواء لینا جائز ہو گیا تو یہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا اور جب سونے اور چاندی کے برتنوں کی ضرورت انہیں استعمال کرنے کو جائز قرار دیتی ہے تو اس کا جواز بدرجۂ اولیٰ ہوگا اور اگر آئندہ کسی وقت میں پائی جانے والی ضرورت کے تحت اسے لے جانے کا ارادہ کیا جا سکتا ہے تو دواء وغیرہ کے لئے اسے حرم سے نکالنا بھی مناسب ہے جیسے حرم کی جڑی بوٹیاں دواء وغیرہ کے لئے لے جانے کا معاملہ پہلے گذر چکا اور اس کی مٹی کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس کے بارے میں پہلے مٹی کا استثناء ہم بیان کر چکے ہیں کیونکہ اس میں دواء کے طور پر استعمال کا بیان ہے اور یہ بھی پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علامہ زرکشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر شریف کی مٹی کا بھی اس سے الگ حکم بیان کیا ہے کیونکہ لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسے مرگی کے علاج کے لئے لے جانا جائز ہے اور پھر برھان بن فرحون نے امام عالم ابومحمد عبدالسلام بن ابراہیم بن و مصال حاحانی کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے کہا: "میں نے حضرت الشیخ عالم ابومحمد صالح ھزمیری کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا' صالح بن عبدالحلیم فرماتے ہیں' میں نے ابومحمد عبدالسلام بن یزید صنہاجی سے سنا' فرماتے تھے کہ میں نے احمد بن یکوت سے قبروں سے اُٹھائی جانے والی اس مٹی کے بارے میں پوچھا جسے لوگ بطور تبرک لے جاتے تھے کہ اس کا لے جانا جائز ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ جائز ہے اور لوگ شروع سے علماء شہداء اور صالحین کی قبروں سے تبرک حاصل کرتے چلے آ رہے ہیں' لوگ حضرت سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی قبرِ اطہر کو قدیم زمانے سے متبرک جانتے چلے آئے ہیں۔

یہ نقل کرنے کے بعد ابن فرحون کہتے ہیں کہ لوگ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت گاہ کے قریب والی قبر سے مٹی لے جاتے تھے اس کے دانے بناتے جو تسبیح کے دانوں جیسے ہوتے تھے چنانچہ اسی سے ابن فرحون نے مدینہ کی مٹی لے جانے کی دلیل نکالی ہے اور گذشتہ بیان کی بناء پر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ حضرت حمزہ کی قبرِ اطہر سے مٹی صرف علاج

کے لئے لے جائی جاتی تھی لہٰذا خود قبر سے نہ لے جاتے تھے بلکہ پانی بہنے کی اس جگہ سے لے جاتے تھے جس کے قریب مسجد ہے اور اگر صالحین کی قبروں والی مٹی کا بطور تبرک استعمال صحیح ہے تو اس کا لے جانا انہی کی قبر کے ساتھ خاص ہو گا' اس میں حرم کی مٹی کے مطلقاً لے جانے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ ایسا معاملہ ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اجازت نہیں دی حالانکہ بھلائی کی امید صرف اتباع کرنے پر کی جا سکتی ہے چنانچہ حنبلی حضرات بھی کہتے ہیں کہ حرم کے کنکر اور مٹی کسی اور جگہ نہیں لے جائے جا سکتے' نہ ہی حرم سے باہر کے کنکر اور مٹی یہاں لائے جاسکتے ہیں۔

امامِ احمد سے نقل ہے کہ فرمایا کہ مٹی وغیرہ کا نکال لے جانا سخت کام ہے انتہٰی جو شخص حرم کی مٹی اور اس کے پتھر نکال لے جاتا ہے' اس پر واجب ہے کہ انہیں واپس سے آئے البتہ واپس نہیں کرتا تو اس پر تاوان نہیں ہو گا چنانچہ کمال دمیری کہتے ہیں: اگر دونوں حرموں میں سے ایک کی مٹی دوسرے حرم کی طرف لے جائی جائے تو کیا حرام ہونا ساقط ہو جائے گا یا ان میں یہ فرق کیا جائے گا کہ اعلیٰ مقام والوں کی طرف لے جائی جائے یا اعلیٰ سے کم تر مقام کی طرف منتقل کی جائے؟ یہ محلِ نظر ہے' واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۴

مدینہ کی ابتداء کیسے ہوئی اور اس کا معاملہ آگے کیسے بڑھا؟

حضرت ابن لہیعہ رضی اللہ عنہ نے اپنی روایت کی سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف کرتے ہوئے یہ مرفوع حدیث بتائی: مکہ وہ شہر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عظمت دی اور اس کی عزت کو چار چاند لگا دئے' اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی بھی شے کے پیدا کرنے سے پہلے مکہ پیدا کیا گیا تو اسے فرشتوں نے گھر لیا تھا پھر اسے مدینہ سے ملا دیا پھر مدینہ کو بیت المقدس سے ملا دیا' پھر ہزار سال بعد ایک ہی بار میں پوری زمین بنادی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: زمین پانی تھی' اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی جو اس کے ساتھ ایک ہزار سال پہلے لگ کر چلی چنانچہ اس پر جھاگ دکھائی دینے لگی' اللہ تعالیٰ نے اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیا ایک حصے سے مکہ پیدا کیا' دوسرے سے مدینہ' تیسرے سے بیت المقدس اور چوتھے سے کوفہ بنا دیا۔

کبیر میں ہمیں طبرانی کی روایت ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ مدینہ کی طرف توجہ فرمائی' اس وقت تعمیر سے پہلے یہ ریت سی تھی' اس میں نہ کیچڑ تھا اور نہ ہی کوئی انسان' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے اھل یثرب! میں تم پر تین شرطیں لاگو کرتا ہوں اور تمہاری طرف ہر قسم کا پھل بھیجوں گا' تم نے بے فرمانی نہیں کرنا ہو گی' نہ ہی اپنے آپ کو اونچا دکھانا ہو گا اور نہ ہی تکبر کرنا ہو گا' اگر تم نے ایسے کیا تو تمہیں کھائی جانے والی ایسی اونٹنی کی طرح چھوڑ دوں گا جسے کھانے سے کوئی بھی منع نہ کر سکے۔

نسائی میں ہے' معراج کی حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے

پاس گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا ایک چوپایہ لایا گیا الحدیث' اسی میں اس کے آگے ہے کہ' میں اس پر سوار ہوا' جبریل میرے ساتھ تھے' میں چلا تو جبریل نے کہا: اُتر آیئے اور نماز پڑھیے' میں نے نماز پڑھی۔ جبریل نے پوچھا: آپ جانتے ہیں کہ آپ نے نماز کہاں پڑھی ہے؟ آپ نے طیبہ میں پڑھی ہے' یہ آپ کی ہجرت گاہ بنے گا۔

بزاز وطبرانی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتایا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے حضور ﷺ کو کھجوروں والی زمین کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل نے عرض کی' اُتر آیئے اور نماز پڑھیے چنانچہ آپ نے اُتر کر نماز پڑھی تو جبریل نے کہا' آپ نے یثرب میں نماز پڑھی ہے' الحدیث۔

حضرت زرین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ذریعے مرفوع حدیث بتائی کہ جب اللہ تعالیٰ نے طور سینا پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کے چھ ٹکڑے ہو گئے' ایک اور روایت میں شطایا کا لفظ ہے یعنی کئی ٹکڑے ہو گئے چنانچہ ان میں سے تین مکہ میں گرے جن کے نام ''حراء' ثبیر اور ثور'' ہے جبکہ تین ہی مدینہ میں گرے جن کے نام ''اُحد' عیر اور ورقان'' ہیں' ایک اور روایت میں ''عیر'' کی جگہ ''رضویٰ'' کا نام ہے اور رضویٰ کا ''ینبع'' میں ہونا بھی قابلِ اعتراض نہیں بنتا کیونکہ یہ بھی مدینہ کے ماتحت علاقہ ہے اور اس کے قریب ہی شمار ہوتا ہے جیسے آگے آ رہا ہے' مصابیح کی شرح کرنے والوں نے یہ تین نام دئے ہیں عیر' ثور اور رضویٰ اور عیر و ثور کو حرم کی حد بنانے میں ایک اور حکمت موجود ہے۔ آگے مدینہ میں رہائش رکھنے والوں کے بیان میں یہ بتایا جائے گا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد یہاں سب سے پہلے کس نے رہائش کی تھی۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی ''اُمّ'' میں اس حدیث کی روایت ملتی ہے: ''مجھے وہاں ٹھہرنے کا حکم ملا جہاں بارش کم ہوا کرتی تھی۔ اور یہ جگہ آسانی چشموں شام اور یمن کے درمیان ہے۔'' ابن زبالہ نے لکھا: ''چنانچہ انہوں نے مدینہ سے پانچ رات کی مسافت پر بکریاں رکھ لیں۔''

انہوں نے یہ حدیث بھی بتائی: ''اے مہاجرین کے گروہ! تم کم بارش والی زمین پر آئے ہو' یہاں مویشی کم رکھو' زراعت کیا کرو اور یہاں کنوئیں نکالو۔''

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ حدیث بھی لی ہے: ''عنقریب مدینہ میں بہت بارش ہو گی تو یہاں کے گھر لوگوں کو سایہ نہ دے سکیں گے' انہیں بالوں سے بنے گھر سایہ دیں گے۔''

یہ حدیث بھی روایت کی: ''عنقریب مدینہ پر چالیس راتیں بارش ہو گی جس پر ان کے ٹیلوں کے گھر حفاظت فراہم نہیں کر سکیں گے۔''

ابن زبالہ نے یہ روایت دی ہے: ''اے عائشہ! اس وقت کیا کرو گی جب لوگ مدینہ کو لوٹیں گے اور مدینہ اندر سے خالی انار کی طرح ہو گا۔''

مرجانی نے اپنی کتاب ''اخبار مدینہ'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث لی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہ معاملہ (دین و ایمان) جلد ہی مدینہ کی طرف واپس آنے والا ہے جیسے پہلے یہاں سے چلا تھا' ایمان صرف یہیں ہو گا۔''

حضرت امام احمد نے یہ روایت دی ہے: جلد ہی لوگ مدینہ کو لوٹیں گے تو اس کے محافظ لوگ ''سلاح'' میں ہوں گے۔ مسالحھم میں مسالح' مسلح کی جمع ہے' یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور سِلاحؑ قِطام کے وزن پر ہے' یہ خیبر کے نزدیک ایک مقام ہے' مسلم شریف میں حدیث ہے کہ: ''ان لوگوں کے گھر ''اِھَاب یا یِھَاب'' تک ہوں گے۔

حضرت امام احمد نے ایک طویل حدیث لکھی ہے کہ: ''حضور ﷺ چلے اور اھاب کنوئیں پر پہنچے اور فرمایا: جلدی مدینہ کے مکان یہاں تک ہوں گے اور ''اِھاب '' کنوئیں کے بارے میں آتا ہے کہ یہ (مدینہ) کے مغربی حَرّہ میں ہے۔

ابو یعلیٰ نے حضرت زید بن وھب رضی اللہ عنہ کی روایت بتائی' وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے حدیث بتائی رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ: ''جب مدینہ کی عمارتیں سلع پہاڑ تک پہنچ جائیں تو شام کو چلے جانا۔'' چنانچہ جب یہ عمارتیں سلع تک پہنچ گئیں تو میں شام کو چلا گیا۔

ابن زبالہ نے یہ حدیث روایت کی: ''جلد ہی دین اسلام سمٹ کر ان دو مسجدوں (مکہ و مدینہ) کی طرف آ جائے گا' قریب ہی لوگ مدینہ کی سرزمین میں ''وتد'' تک پھیل جائیں گے اور جلد ہی لوگوں کے مکانات ''یہیق'' تک آ پہنچیں گے۔'' صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ تو آپ نے زمین و آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہاں سے (یعنی انہیں اللہ رزق دے گا)۔ آٹھویں باب کے آخر میں آ رہا ہے کہ ''یہیق'' مدینہ کے قریب ایک مقام ہے۔

ابن زبالہ نے اس درخت کے بارے میں بتایا ہے جس کے نام پر مسجد ذوالحلیفہ کا نام رکھا گیا ہے اور پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی: قیامت اس وقت قائم نہ ہو سکے گی جب تک مکانات اس درخت تک نہیں پہنچ جائیں گے اور انہی سے یہ روایت کی: ''تم سیالہ اور روحاء کی شان دیکھو کہ جب لوگوں کو مدینہ تک آنے کی اجازت ہو گی تو اہلِ اردن کے مکان یہاں ہوں گے۔

کبیر میں طبرانی نے حدیث بتائی: ''تعمیر کا سلسلہ سلع پہاڑ تک ہو گا' پھر اہلِ مدینہ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ مسافر کسی طرف سفر کرے گا تو طویل عرصہ گذرنے اور عمارتوں کے نشانات مٹنے پر کہے گا کہ یہ مکان بھی کبھی آباد ہوا کرتے تھے۔

امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی: اسلامی شہروں میں سے سب آخر میں گڑ بڑا والا شہر مدینہ ہو گا۔

ابو داؤد نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ "بیت المقدس کی تعمیر کے وقت یثرب میں خرابی ہوگی، اس خرابی پر جنگ ہوگی اور اس جنگ کے بعد قسطنطنیہ فتح ہوگا اور دجال آئے گا۔"

ابو داؤد ہی نے یہ حدیث بھی لکھی ہے کہ "بڑی جنگ، فتح قسطنطنیہ اور دجال کا آنا سات مہینوں میں ہوگا۔"

ابن شبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی: اہل مدینہ کو اچھے بھلے حالات میں مدینہ سے نکال دیا جائے گا، پوچھا گیا کہ انہیں کون نکالے گا تو انہوں نے بتایا کہ برے حکمران نکالیں گے۔

اسی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس بات کرنے سے انہیں روک دیتے تھے، حضرت ابوہریرہ نے ان سے کہا، ایسا کیوں کرتے ہو؟ بخدا میں اور آپ اس وقت ایک ہی گھر میں نہ تھے جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اہلِ مدینہ کو رستے بستے نکال دیا جائے گا؟ اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: بالکل ہم اکٹھے تھے لیکن آپ نے یہ بات نہیں فرمائی تھی، آپ نے فرمایا تھا: پہلے سے زیادہ معمور ہوگا اور اگر آپ فرماتے خیر ما کانت (پہلے بہتر ہوگا) تو آپ کی بات صحیح ہوتی، اس وقت حضور ﷺ زندہ موجود تھے اور آپ کے صحابہ بھی موجود تھے۔ یہ سن کر حضرت ابوہریرہ نے کہا، بخدا واقعی یونہی ہوا تھا۔

اسی میں یہ روایت بھی ہے: "(اس وقت حال یہ ہوگا کہ) لومڑی آئے گی اور دوپہر کو منبر کے سائے میں سو جائے گی، اسے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے: اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی جب تک یہ کام نہ ہوگا کہ لومڑی آئے گی اور منبر پر بیٹھ جائے گی، اسے کوئی روکے گا نہیں۔

اسی میں شریح بن عبید رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے حضرت کعب کا یہ خط پڑھا، "اہلِ مدینہ کو ایک ایسا معاملہ گھیرے میں لے لے گا جس سے انہیں ڈر پیدا ہو جائے گا اور وہ اسے بدحالی میں چھوڑ جائیں گے اور مزید یہ کہ ریشم کے ٹکڑوں پر بلیاں پیشاب کریں گی، انہیں کسی شے کا ڈر نہ ہوگا پھر بازار میں پھریں گی تو انہیں کسی کا خوف نہ ہوگا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ "تم مدینہ کو چھوڑ جاؤ گے۔" مسلم میں ہے: تم مدینہ کو اس حالت میں چھوڑو گے کہ پھل بے کار ہوں گے، انہیں پرندے اور درندے کھائیں گے۔" اور سب سے آخر میں بنو زینہ کے دو چرواہوں کا حشر ہوگا مدینہ کا ارادہ لئے ہوں گے، اپنی بکریوں کو ڈانٹتے ہوں گے، وہاں وحشی جانور ہوں گے۔

مسلم شریف میں ہے کہ جب وہ ثنیۃ الوداع کے پاس پہنچیں گے تو منہ کے بل گر جائیں گے، پھر موطا میں ان الفاظ سے ہے: تم اچھے بھلے مدینہ چھوڑو گے تو کتا یا بھیڑیا یہاں داخل ہوگا اور مسجد کے کسی ستون کے اوپر بار بار پیشاب کرے گا۔

ابن زبالہ میں حدیث ہے: قیامت برپا نہ ہو سکے گی جب تک میری اس مسجد میں کتے، بھیڑیے اور بجو نہ بھر

جائیں گے اس حالت میں اگر کوئی وہاں سے گذرتے ہوئے نماز پڑھنے کا ارادہ کرے گا تو نہیں پڑھ سکے گا۔

ابن شبہ کی روایت سے یہ حدیث ملتی ہے: بخدا تم مدینہ کو حالتِ خیر میں چالیس سال تک جانوروں اور درندوں کے لئے چھوڑ بیٹھو گے۔

حضرت احمد کی روایت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دن احد پر چڑھے اور مدینہ کی طرف منہ کر کے فرمایا: اس بستی پر افسوس ہے لوگ اس میں سے نکلتے وقت کچا پھل چھوڑ جائیں گے۔

احمد ہی کی ایک اور روایت ہے: اہلِ مدینہ اسے چھوڑ جائیں گے تو تر و تازہ کھجوریں موجود ہوں گی لوگوں نے پوچھا انہیں کھائے گا کون؟ تو فرمایا: درندے اور جانور۔

فصل نمبر ۱۵

یہ بیان کہ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا ویسے ہو کر رہے گا

اس بات میں اختلاف ہے کہ لوگ مدینہ کب چھوڑیں گے؟ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ یہ واقعہ پہلے دور میں اس وقت ہو چکا ہے جب خلافت شام اور عراق کی طرف منتقل ہو گئی تھی یہ بھی آپ کا معجزہ تھا اس وقت دینی و دنیوی حالات ٹھیک تھے دینی تو اس لحاظ سے کہ یہاں بہت سے علماء موجود تھے اور دنیوی اس لحاظ سے کہ یہ آباد تھا اور لوگ خوشحال تھے۔

قاضی کہتے ہیں کہ اطلاعات دینے والوں نے مدینہ میں ہونے والے فتنوں میں ذکر کیا ہے کہ جب لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے تو بہت سے لوگ کوچ کر گئے تھے جبکہ پکے پکائے پھل درندوں اور جانوروں کے لئے چھوڑ گئے تھے یہ حالت ایک عرصہ تک رہی اور پھر دوبارہ لوگ یہاں پلٹ آئے۔

بدر بن فرحون نے شرح مؤطا میں لکھا انہی کے قلم سے لکھا میں نے قاضی ہی کی طرف سے نقل کیا وہ کہتے ہیں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے وہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے ڈر سنایا تھا یعنی مسجد کے ستونوں پر کتے پیشاب کریں گے۔ انتہی لیکن علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظاہر اور مناسب یہ ہے کہ لوگ مدینہ پاک کو آخری دور میں قیامت کے قریب چھوڑیں گے اور اسے مزینہ کے دو چرواہوں کا واقعہ واضح کرتا ہے کیونکہ جب ان پر قیامت آئے گی تو دونوں منہ کے بل گر پڑیں گے۔ حضرت مسلم کے الفاظ اور بھی واضح ہیں فرمایا: "پھر دو چرواہوں کا حشر ہو گا" اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ "مدینہ کے حالات سب سے آخر میں خراب ہوں گے۔"

میں کہتا ہوں کہ ابن شبہ کی گذشتہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے: "لوگ مدینہ کو چالیس سال کے لئے ویران کر جائیں گے اور وہاں کتے، بھیڑیئے وغیرہ ہوں گے۔" کیونکہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسا اب تک نہیں

ہوا' علاوہ ازیں لگتا یہ ہے کہ ایسا ایک بار سے زیادہ مرتبہ ہوا تو شائد قاضی کے فرمان کے مطابق پہلی مرتبہ یہ واقعہ ہوا ہو گا اور باقی آخری دور میں ہو گا کیونکہ ابن شبہ نے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ لوگ مدینہ سے نکل جائیں گے اور پھر اس کی طرف واپس آ جائیں گے' پھر نکلیں گے لیکن واپس نہیں آئیں گے' جب اسے چھوڑ کر جائیں گے تو اس وقت پھل پکے ہوں گے۔''

علامہ نووی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بتائی ہے کہ: ''لوگ یہاں سے نکل جائیں گے' پھر واپس آئیں گے' اسے آباد کریں گے' یہ بھرپور ہو جائے گا' مکانات بے شمار ہوں گے' لوگ پھر یہاں سے نکلیں گے اور کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

ابن شبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی' فرمایا: آخر میں دو آدمیوں کا حشر ہو گا' ایک تو جہینہ کا ہو گا اور دوسرا بنو مزینہ میں سے' وہ دونوں کہیں گے' لوگ کہاں گئے؟ چنانچہ مدینہ پہنچیں گے تو صرف لومڑی دیکھیں گے' دونوں کی طرف دو فرشتے آئیں گے' انہیں اُٹھا کر کے کھینچتے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچا دیں گے۔

علامہ نووی نے حضرت حذیفہ بن السید رضی اللہ عنہ سے روایت کی' انہوں نے کہا: سب سے آخر میں آنے والے بنو مزینہ کے دو شخص ہوں گے جو لوگوں کو تلاش کرتے ہوں گے' ان میں سے ایک' دوسرے سے کہے گا: کچھ عرصہ سے ہمیں کوئی نہیں ملا' چلو بنو فلاں شخص کی طرف چلیں چنانچہ اس کے گھر جائیں گے تو وہاں کوئی بھی نہ ہو گا' پھر وہ کہے گا کہ آؤ مدینہ کو چلتے ہیں' وہاں جائیں گے تو کوئی شخص وہاں نہیں ملے گا' دوبارہ کہے گا کہ آؤ مدینہ چلیں' دونوں جائیں گے لیکن وہاں کوئی دکھائی نہ دے گا پھر وہ کہے گا کہ آؤ بقیع غرقد میں قریش کے گھروں کو چلیں' وہ جائینگے لیکن وہاں درندے اور لومڑیاں دیکھیں گے چنانچہ وہاں سے بیت الحرام کو متوجہ کر دئے جائیں گے۔

میں کہتا ہوں' لگتا یہ ہے کہ جب وہ بیت الحرام کی طرف متوجہ ہوں گے تو وہاں پہنچنے سے پہلے ان کے پاس دو فرشتے آئیں گے۔ اس طرح یہ روایت پہلی کے مخالف نہ ہو گی اور ظاہر ہے کہ جو واقعہ قاضی نے ذکر فرمایا ہے' وہ پہلی مرتبہ نکلنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا سبب وہ واقعہ تھا جو (دورِ یزید میں) حرہ کے مقام پر رونما ہوا پھر پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث گذر چکی ہے کہ ان سے کہا گیا تھا' اے ابوہریرہ! وہاں سے ہمیں کون نکالے گا؟ انہوں نے فرمایا تھا کہ برے حکمران نکالیں گے چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے' الفاظ مسلم شریف کے ہیں اور روایت آپ ہی کی ہے' حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت کو قریش کے قبیلے والے ہلاک کریں گے۔ صحابہ نے عرض کی' یا رسول اللہ! تب ہمیں کیا حکم ہے تو فرمایا: کاش لوگ ان سے دور ہی رہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت بتائی' انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر اس وقت سے قیامت تک ہونے والا کوئی واقعہ نہیں چھوڑا جسے بیان نہ فرما دیا ہو' جس نے دھیان رکھا' اسے یاد رہا اور جو دھیان نہ رکھ سکا' اسے بھول گیا۔

آپ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے قیامت تک ہونے والا ہر واقعہ بتا دیا' میں ہر شے کے بارے میں آپ سے پوچھتا رہا البتہ یہ نہ پوچھ سکا کہ اہل مدینہ کو مدینہ سے کون نکالے گا؟ چنانچہ ترمذی نے اس بارے میں ایک حدیث بتائی ہے کہ: '' (ایسا تب ہوگا) جب میری اُمت اکڑ کر چلے گی' ہاتھ لمبے کئے ہوگی' فارس (ایران) اور روم کی لڑکیاں ان کی خدمت کرتی ہوں گی تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ ان کا دبدبہ ختم کر دے گا اور ان جیسے لوگوں پر شریر حاکم مسلط کر دے گا۔''

ابن شبہ' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' مدینہ میں جنگ ہوگی جسے ''حالقہ'' (مونڈھنے والی) کہا جائے گا' یہ مطلب نہیں کہ وہ بال مونڈھ دے گی بلکہ دین کو ختم کر دے گی چنانچہ انہیں وہاں سے نکال دیا جائے گا خواہ وہ حدودِ مدینہ میں نزدیکی مقام تک جائیں۔

انہی سے ایک اور روایت ہے کہ فرمایا: ''الٰہی! میرے جیتے جی ۶۰ھ کا سال نہ آئے اور نہ ہی بچوں کی حکومت ہو۔آپ کا اشارہ پہلے غلام حکمران (یزید) کی طرف تھا جو ۶۰ھ ہجری میں حکمران بنا چنانچہ یہی ہوا جیسے ابن حجر نے لکھا ہے کیونکہ اس وقت یزید بن معاویہ کا خلیفہ وہاں کا حکمران تھا چنانچہ آپ نے حکومتِ یزید کی طرف اشارہ فرمایا' اسی میں واقعۂ حرہ ہوا تھا' اسے حرۂ واقم اور حرۂ زہرہ کہا جاتا ہے۔

علامہ واقدی نے ''کتاب الحرہ'' میں ایوب بن بشیر معادی سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ اپنے ایک سفر پر نکلے تو حرۂ زہرہ پر پہنچ کر ٹھہر گئے اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا' یہ بات ساتھیوں کو کھٹکی انہوں نے سمجھا کہ ایسا سفر کی وجہ سے ہوا ہے چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی' یا رسول اللہ! آپ نے کسے دیکھا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے اس سفر کی وجہ سے نہیں ہوا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! تو پھر یہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ اس وادیٔ حرہ میں میری اُمت کے وہ لوگ قتل ہوں گے جو میرے صحابہ کے بعد نیک لوگ ہوں گے۔'' (تابعین)۔

انہی نے حضرت سفیان بن ابو احمد سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ جب بھی بنو عبد الاشہل کے قریب سے گذرتے تو ہاتھ سے اشارہ فرماتے اور فرماتے: ''میری اُمت کے نیک لوگ یہاں قتل ہونگے۔'' پھر حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بتایا کہ تورات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مدینے کے مشرقی حرے میں بہت سے لوگ قتل ہوں گے' قیامت کے دن ان کے چہرے خوب چمکتے ہوں گے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ''حرہ'' میں قتل ہونے والوں کا ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا: اللہ ان پر رحم فرمائے' حرۂ زہرہ میں میری اُمت کے بہترین لوگ قتل کر دئیے جائیں گے۔

علامہ بیہقی رحمہ اللہ نے ''دلائل'' میں ایوب بن بشیر کا واقعہ لکھا ہے جس کا پہلے ذکر ہوا' پھر فرمایا کہ یہ حدیث مرسل ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا اصل مفہوم پوچھا گیا:

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا○

''اور اگر ان پر موجیں مدینہ کے اطراف سے آئیں پھر ان سے کفر چاہتیں تو ضرور ان کا مانگا دے بیٹھتے۔''

اس پر ابن عباس نے فرمایا کہ' انہیں یہ کچھ دے دیا جائے گا یعنی بنو حارثہ اہل شام کو اہلِ مدینہ پر داخل کریں گے۔اسے ابن عباس کی طرف منسوب کر کے کہا یہ واقعہ ابن بشیر کی تائید کرتا ہے۔

پھر حرۂ واقم کے بیان میں ابن زبالہ کا بیان کردہ یہ واقعہ آ رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بارش ہوئی تو وہ ساتھیوں کو لے کر حرۂ واقم پہنچے تو نالیوں میں پانی بہہ رہا تھا۔حضرت کعب نے کہا' اے امیر المؤمنین! دیکھئے خدا کی قسم! ان نالیوں میں لوگوں کا خون ایسے بہے گا جیسے پانی بہہ رہا ہے۔حضرت ابن زبیر ان کے قریب ہوئے اور کہا' اے ابو اسحاق! یہ واقعہ کب ہوگا؟ انہوں نے کہا اپنے پاؤں یا ہاتھ پر بھروسہ کرنے سے بچنا۔

ابن زبالہ بھی حضرت کعب سے روایت کرتے ہیں' فرماتے ہیں: ہم نے کتاب اللہ میں مدینہ کے شرقی حرہ کا ذکر دیکھا ہے کہ وہاں بہت سے لوگ قتل ہو جائیں گے' قیامت کے دن ان کے چہرے ایسے چمکتے ہوں گے جیسے چودھویں رات کا چاند۔

واقعۂ حرّہ

علامہ قرطبی کے انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہی واقعہ ہی اہلِ مدینہ کے نکلنے کا سبب تھا جو کلامِ قاضی عیاض میں مذکور ہے کیونکہ علامہ قرطبی نے ویسا ہی یہ واقعہ لکھا ہے: وہ کہتے ہیں مدینہ جب پوری آب و تاب پر تھا تو وہاں نقص پیدا ہو گیا' ہر طرف خرابی ہوئی اور طویل فتنے شروع ہو گئے' اہلِ مدینہ مارے خوف کے وہاں سے چلے گئے' یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ مرّی کو شام سے ایک عظیم لشکر دے کر بھیجا' وہ مدینہ میں پہنچا تو قتل و غارت شروع کر دی اور مدینہ کے حرہ میں بے دریغ قتل شروع رکھا' مدینہ میں تین دن تک ہر حرام کام حلال بنا دیا چنانچہ اسی بناء پر اسے واقعۂ حرہ کہتے ہیں۔اسے حرۂ زہرہ بھی کہتے ہیں' یہ قتل و غارت مسجد مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر مشہور مقام ''واقم'' میں ہوئی تھی چنانچہ باقی مہاجرین و انصار اور تابعین حضرات قتل کر دیئے گئے' یہ ایک ہزار سات سو تھے' اس کے علاوہ ملے جلے دس ہزار لوگ بھی قتل کیئے گئے جن میں بچے اور عورتیں شامل نہیں' وہاں سات سو لوگ حفاظ قرآن شہید کیئے گئے اور قریش میں سے ۹۳ لوگ بے گناہ ظلماً شہید کر دے گئے۔

حافظ امام ابن حزم رحمہ اللہ ''المرتبۃ الرابعۃ'' میں لکھتے ہیں: چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد شریف میں گھوڑے ناچتے رہے' پھر منبر و قبرِ انور کے درمیان پیشاب اور لید کی' لوگوں کو یزید کی بیعت پر مجبور کیا اور یہ شرط رکھی گئی کہ تم اس کے غلام ہو' چاہے تو وہ تمہیں بیچ دے اور چاہے تو آزاد کر دے' یزید بن عبد اللہ بن زمعہ نے اسے قرآن و سنت کے

مطابق بیعت یاد دلائی تو اس نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا چنانچہ انہیں بے گناہ شہید کر دیا گیا۔
تاریخ والوں نے کہا ہے کہ مدینہ لوگوں سے تو خالی ہو گیا جبکہ اس کے پھل جانوروں اور کتوں وغیرہ کے کھانے کے لئے رہ گئے جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ''جب مدینہ خالی ہو گا تو کتے مسجد کے ستونوں پر پیشاب کریں گے۔'' انتہی۔

اہلِ مدینہ پر یزید بن معاویہ کی ناراضگی کا سبب

علامہ طبرانی حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے طویل واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے یزید کی بیعت ناگوار گذری' آپ نے کھلم کھلا اسے برا بھلا کہا' یہ بات یزید کو معلوم ہوگئی تو اس نے قسم ڈالی کہ اسے بیڑیاں ڈالے بغیر نہ لایا جائے ورنہ میں خود اسے منگوا لوں گا۔

اس پر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا' ہم آپ کے لئے چاندی کے تالے بنوا لیتے ہیں جن پر کپڑا ڈال کر آپ کو پہنا دیں' آپ کی یہ قسم پوری ہو جائے گی تو کیا آپ صلح کرنا پسند کریں گے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اس کی قسم پوری نہیں ہونے دے گا اور یہ شعر پڑھا:

''میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے بغیر کسی کے سامنے نہ جھکوں' چبانے والے کے سامنے پتھر ہی نرم ہو جائے تو الگ بات ہے۔''

پھر یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ مرّی کو شامی لشکر دے کر بھیجا اور کہا کہ اہلِ مدینہ کو قتل کر دیں اور جب یہاں سے فارغ ہو جائیں تو مکہ کی طرف چلے جائیں۔ کہا' جب مسلم بن عقبہ مدینے میں داخل ہوا تو اس دن باقی صحابہ کرام وہاں سے بھاگ گئے' یہ وہاں ٹھہرا رہا اور قتل و غارت جاری رکھی' پھر یہاں سے نکلا' ابھی راستے ہی میں تھا کہ مر گیا' حصین بن نمیر کندی اس کا نائب ہوا۔ پھر ابن زبیر کے محاصر کا ذکر کیا' منجنیق سے پتھر چلانے اور کعبہ کے جلانے کا ذکر کیا۔ پھر حضرت عروہ نے بتایا کہ حصین بن نمیر کو یزید بن معاویہ کی موت کا پتہ چلا تو وہ وہاں سے بھاگ گیا۔

میں کہتا ہوں' یزید کے اہلِ مدینہ کو قتل کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے امام ابنِ جوزی لکھتے ہیں: جب سال ۶۲ھ ہجری شروع ہوا تو یزید نے عثمان بن محمد بن ابو سفیان کو حاکمِ مدینہ بنا دیا' اس نے مدینہ پاک سے یزید کے پاس ایک وفد بھیجا' وفد واپس آیا تو انہوں نے برملا طور پر یزید کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا' انہوں نے بتایا' ہم ایک ایسے بے دین شخص کے ہاں سے ہو کر آئے ہیں جو شراب پیتا ہے' ناچ گانا کراتا اور کتوں سے کھیلتا ہے اور ہم اعلان کر رہے ہیں کہ اس کی بیعت ہم نے توڑ دی ہے۔ منذر نے کہا کہ مجھے اس نے ایک لاکھ درہم عطیہ دیا ہے لیکن اس بناء پر میں اسے سچا نہیں کہہ سکتا' بخدا وہ شرابخور ہے' وہ اس قدر شرابی ہے کہ نمازیں ترک کرتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے عبد اللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ سے بیعت کر لی اور امیر مدینہ عثمان بن محمد کو وہاں سے نکال دیا۔ ابنِ حنظلہ کہا کرتے تھے' اے اہلِ مدینہ! یزید کی مخالفت ہم نے یونہی نہیں کر دی' مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں آسمان سے ہم پر پتھر نہ برسنے لگیں' بخدا میرا کوئی بھی ساتھی نہ بنے تو میں اللہ کی اس آزمائش پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔

یہ واقعہ ۶۳ھ ہجری کو پیش آیا تھا اور اسی سال میں انہوں نے امیر مدینہ کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ واقدی کی ''کتاب الحرۃ'' کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

''سب سے پہلے حرہ کا واقعہ یوں شروع ہوا کہ ابن میناء نامی شخص مدینہ میں مالیات کے ٹیکس لینے پر مقرر تھا (وہاں کی آمدن بہت تھی) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہاں سے ڈیڑھ لاکھ وسق وصول کرتے اور ایک لاکھ وسق گندم کاٹا کرتے تھے پھر یزید نے عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو امیرِ مدینہ مقرر کیا' ابن میناء ساز و سامان لے کر آیا تاکہ امیر معاویہ کی طرف سے مقرر کردہ وصول کر سکے اور اس نے وصولی شروع کر دی' کسی نے اسے انکار نہیں کیا' آخر کار وہ بلحارث بن خزرج کی طرف گیا' وہاں ایک کو نگران مقرر کیا' انہوں نے کہا کہ یہ ٹیکس ناجائز ہے اور ہم پر بوجھ ہے' انہوں نے عثمان بن محمد امیر مدینہ کو اطلاع دے دی۔ اس نے بلحارث کے تین لوگوں کو پیغام بھیجا تو انہوں نے امیر کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا' اس نے ابن میناء کو اطلاع کی تو وہ ساتھیوں کو لے کر صبح ہی وہاں پہنچ گیا لیکن انہوں نے اسے منع کر دیا' وہ امیر کے پاس آیا اور کہا کہ جو انتظام کر سکتے ہو کر لو۔ اس نے اس کے ہمراہ کچھ آدمی بھیج دئے اور کہا کہ انہیں میرے پاس لے آؤ خواہ پیٹ کے بل گھسیٹ کر لانا پڑے۔

ابن میناء صبح سویرے بڑے تکبر سے ان کی طرف چلا اور جن انصار لوگوں نے انہیں انکار کیا تھا' ان سے دشمنی دکھائی' قریش نے انصار کی مدد کی اور انہیں بھگا دیا۔ معاملہ سخت ہو گیا چنانچہ ابن میناء کچھ لئے بغیر واپس آ گیا۔ عثمان بن محمد نے اس واقعہ کی اطلاع یزید کو دی اور تمام اہلِ مدینہ کے خلاف بھڑکایا۔ وہ غصے سے بھپر گیا اور کہنے لگا کہ میں ان کی طرف لشکر بھیج رہا ہوں' میں انہیں گھوڑوں کے پاؤں تلے کچل کر رکھ دوں گا۔'' انتہی۔

ابن جوزی کہتے ہیں' ابو الحسن مدائنی (ایک ٹھوس شخص) نے بتایا کہ اہلِ مدینہ منبر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یزید کی بیعت توڑ دینے کا اعلان کر دیا چنانچہ عبد اللہ بن ابو عمرو بن حفص مخزومی بولے کہ میں یزید کی بیعت ایسے توڑ رہا ہوں جیسے یہ عمامہ (پگڑی) اُتار دی ہے اور پھر پگڑی سر سے اُتار کر رکھ دی' میں یہ بیعت اس کے باوجود توڑ رہا ہوں کہ اس نے مجھے عطیہ دیا تھا لیکن یہ دشمنِ خدا شرابخور ہے۔ ایک اور شخص اُٹھے اور اعلان کیا کہ میں اس کی بیعت ایسے اُتار رہا ہوں جیسے اپنا جوتا اُتارا ہے چنانچہ یوں بہت سی پگڑیاں اور جوتے اکٹھے ہو گئے۔

بیعت توڑنے کے بعد انہوں نے عبد اللہ بن مطیع کو قریش پر امیر مقرر کر دیا جبکہ انصار پر عبد اللہ بن حنظلہ کو مقرر کیا اور پھر لوگوں نے مروان کے گھر میں موجود بنو امیہ کے لوگوں کا محاصرہ کر لیا چنانچہ مروان اور اس کے ساتھیوں نے یزید کو اطلاع دی کہ ہمیں گھیرے میں لے لیا گیا ہے اور ہمارا پانی بند کر دیا گیا ہے براہ کرم ہماری مدد کیجئے۔

یہ خط یزید کے پاس پہنچا تو اس نے مسلم بن عقبہ کو بلایا (وہ بوڑھا تھا) وہ اس کے پاس پہنچا' یزید نے اسے کہا کہ لوگوں کو (مدینہ کی طرف) لے چلو' چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ (پہلے سے جاری) مکمل عطیات اور ایک لاکھ دینار فوری طور پر وصول کرنے کے لئے حجاز کی طرف جانے کے لئے اکٹھے ہو جاؤ۔ اس اعلان پر بارہ ہزار لوگ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

یزید نے مسلم سے کہا کہ اگر تجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو حصین بن نمیر سکونی کو اپنا نائب مقرر کر دینا اور اسے کہہ دینا کہ اہلِ مدینہ کو تین مرتبہ آواز دیدے' وہ تمہاری بات مان لیں تو بہتر ورنہ انہیں قتل کر دینا اور جب ان پر غالب آ جاؤ تو ان کا مال یا ہتھیار یا کھانے پینے کا سامان تمہارے لئے لینا حلال ہو گا وہ تمہارے لشکر کے لئے کام آئے گا اور یوں جب تین دن گذر جائیں تو ہاتھ روک لینا پھر علی بن حسین کو تلاش کر کے اسے ہدایت کرنا کیونکہ وہ اس واقعہ میں ملوث نہیں۔

اہلِ مدینہ کو جب پتہ چلا کہ حصین آیا ہے تو انہوں نے بنو امیہ کے محاصرے میں موجود لوگوں پر دباؤ ڈالا اور کہا' ہمیں اللہ و رسول اللہ ﷺ کی ضمانت دو کہ ہمارے خلاف بغاوت نہیں کرو گے' ہماری جاسوسی نہیں کرو گے اور دشمن کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف نہیں اُٹھو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے ورنہ تمہاری گردنیں اُڑا دیں گے۔ بنو امیہ نے پکا وعدہ دے دیا تو اہلِ مدینہ نے انہیں مدینہ سے جانے دیا۔ وہ وہاں سے نکلے اور مسلم بن عقبہ سے جا ملے۔ مروان نے اپنا بیٹا عبد الملک مسلم کے پاس بھیجا جس نے اشارہ دیا کہ اہلِ مدینہ کی طرف حرہ کی طرف سے آؤ اور تین دن تک وہیں ان کی انتظار کرو چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔

جب تین دن گذر گئے تو مسلم نے کہا: اے اہلِ مدینہ! کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم جنگ کے لئے تیار ہیں۔ اس نے کہا' ایسا نہ کرو' یزید کی اطاعت کر لو۔ انہوں نے کہا ہم اطاعت نہیں کریں گے۔ انہوں نے خندق میں پناہ لے رکھی تھی چنانچہ مسلم کے کچھ لوگ ادھر گئے' ابن الغسل کو گھوڑے پر بٹھایا تو اس نے خندق کی راہ بتائی' وہاں سخت جنگ ہوئی۔ مسلم اپنے ساتھیوں کو اُبھار رہا تھا حالانکہ بیمار تھا چنانچہ ان دونوں لشکروں کے درمیان اس کا بستر لگا دیا گیا' اس نے کہا: اپنے امیر کی طرف سے خوب جنگ کرو۔ مسلم نے تین دن تک اپنے ساتھیوں کو کھلی چھٹی دے دی' وہ قتل کرتے جا رہے تھے' وہ مال چھین رہے تھے اور عورتوں سے بدتمیزی کر رہے تھے۔ عبد اللہ بن مطیع لڑتے رہے' لڑتے ہوئے وہ خود اور ان کے سات بیٹے قتل ہو گئے' مسلم نے ان کا سر یزید کی طرف بھیج دیا چنانچہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ خوفزدہ ہو گئے۔

علامہ واقدی کہتے ہیں کہ جب شامی لوگ قریب آ گئے تو اہلِ مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کی خندق میں مشورہ کیا پھر مدینہ کے چوفیرے انہوں نے دیوار کھڑی کرنے کا ارادہ کیا' پندرہ دن تک خندق میں کام کرتے رہے' قریش کے پاس راتج سے مسجد احزاب تک کا حصہ تھا' انصار کے پاس مسجدِ احزاب سے بنو سلمہ تک کا اور دیگر موالی کے پاس راتج سے بنو عبد الاشہل کا علاقہ تھا۔

شامی لوگ پہنچ گئے اور مقامِ ''جرف'' میں ٹھہرے پھر اپنے کچھ آدمی اہلِ مدینہ کے پاس بھیجے' مدینہ کی ہر طرف کا معائنہ کیا لیکن اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا' مدینہ کے لوگ ہتھیار پہنے ہوئے تھے' خندق کے اندر سے تیر اور پتھر برسا رہے تھے۔ مسلم' واقم کی ایک جانب بیٹھا تھا اور تباہی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مروان سے مدد مانگی' اس نے ایک شرط پر وعدہ کیا تھا جب وہ اسے وادی القریٰ میں ملا تھا چنانچہ مروان بنو حارثہ کے پاس آیا' ان کے ایک آدمی سے بات کی اور اسے لالچ دیا کہ تم ہمارے لئے راستہ کھول دو گے تو میں تمہارے بارے میں یزید کو لکھوں گا: وہ تمہاری صلہ رحمی کرے گا (اور انعام و اکرام سے نوازے گا) اس نے اپنی طرف راستہ کھول دیا اور بنو حارثہ کے لوگوں کو اندر داخل کر لیا اور بنو عبد الاشہل کی طرف بھیج دیا۔

عبد اللہ بن حنظلہ کو اس کی اطلاع ملی' وہ اس وقت دو فصیلوں کے درمیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا' پھر عبد اللہ بن مطیع آئے وہ ذباب کی جانب سے تھے پھر ابن ابو ہریرہ موالی کی طرف سے آئے' ابن ربیعہ آیا' وہ بطحان کی طرف سے تھا اور وہ سب اس جگہ اکٹھے ہو گئے جہاں سے اہلِ شام داخل ہو سکیں۔

محمود بن لبید کہتے ہیں۔ میں اس دن وہیں تھا' ہم اپنی قوم بنو حارثہ کی طرف سے آئے تھے' مروان نے جب وہ نکلا تھا تو اس سے برا معاملہ کیا تھا چنانچہ اس نے اس سے بات کی تو اس نے گھوڑ سواروں سمیت اندر جانے کی اجازت دیدی اور پھر پے در پے اندر آنے شروع ہو گئے' ہم بنو عبد الاشہل کے ہمراہ کھڑے تھے چنانچہ ہم نے شدید جنگ کی' موت ہمیں دکھائی دے رہی تھی' لوگ کثرت سے آ گئے تھے' لوگ بکھر گئے تو ہر طرف قتل و غارت ہوئی۔

واقدی یہ بھی کہتے ہیں کہ بنو حارثہ کا محل اہل شام کے امن مانگنے والوں کے لئے امان کی جگہ تھی' بنو حارثہ امن دے رہے تھے' جنگ ابھی رکنے نہ پائی کہ سب سے پہلے بنو عبد اللہ بن عبد الاشہل کا گھر لوٹ لیا گیا۔ انتہیٰ۔

جویریہ بن اسماء کہتی ہیں' میں نے اہلِ مدینہ کے بڑوں سے سنا جو آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا وقت وصال آیا تو انہوں نے یزید کو بلا کر کہا' ایک نہ ایک دن اہلِ مدینہ سے تمہارا معاملہ بگڑے گا' اگر ایسی صورت بن جائے تو مسلم بن عقبہ کو ان کی طرف بھیجنا کیونکہ میں ان کا خلوص جانتا ہوں۔

جب یزید خلیفہ بن گیا تو عبد اللہ بن حنظلہ اپنے ساتھیوں سمیت وفد لے کر آئے' یزید نے ان کی آؤ بھگت کی اور انعامات سے نوازا' وہ واپس آئے اور لوگوں کو یزید کے خلاف ابھارا' اس کے نقص بیان کئے' آپ نے اس کی بیعت توڑنے پر اُکسایا' سب نے آپ کی بات مان لی۔ یزید کو پتہ چل گیا تو اس نے مسلم بن عقبہ کو اہلِ مدینہ کی طرف بھیجا'

انہوں نے مل کر اہلِ شام کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کا اظہار کیا تو وہ خوف کھا گئے اور قتل و غارت سے باز آئے اور پھر جب لڑائی بھڑک اُٹھی تو انہوں نے عین مدینہ کے وسط میں ''تکبیر'' کی آواز سنی۔ وجہ یہ تھی کہ بنو حارثہ نے مدینہ کی ایک جانب سے شامی لوگوں کو اندر داخل کر لیا تھا جس کی وجہ سے اہلِ مدینہ نے جنگ ترک کر دی اور اپنے اہلِ وعیال کی فکر کے لئے مدینہ میں داخل ہو گئے' یوں اہلِ مدینہ شکست کھا گئے' بہت سے لوگ قتل ہو گئے اور پھر مسلم نے لوگوں سے یزید کی اس بات پر بیعت لی کہ وہ اس کے بے دام غلام ہیں' وہ ان کے جان مال اور اہلِ خانہ تک کا مالک ہے' جیسے چاہے کرے۔ انتہی۔

یعقوب بن سفیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی ہے کہ اس آیت کا مفہوم اس وقت سامنے آیا جب ۶۰ھ ہجری ابتداء دور تھا:

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا ○

یعنی جب بنو حارثہ نے اہلِ شام کو واقعۂ حرہ کے موقع پر اہلِ مدینہ کے خلاف اندر آنے دیا تھا۔ یعقوب کہتے ہیں کہ یہ واقعۂ حرہ ۶۳ھ ہجری میں واقع ہوا تھا۔ الخ۔

کہتے ہیں کہ ایک عورت نے جب مسلم بن عقبہ سے اپنے بیٹے کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میں آپ کی لونڈی ہوں اور میرا بیٹا قید میں ہے تو اس نے کہا کہ اس کا بیٹا فوراً اس کے سامنے لے آؤ چنانچہ اس کا سر قلم کر دیا اور کہا کہ اس کا سر اس عورت کو دے دو' پھر کہا' تم اتنے پر خوش نہیں ہو کہ تمہیں قتل نہیں کیا گیا اور تم اپنے بیٹے کے بارے میں بات کرنے لگی ہو؟ میں کہتا ہوں کہ مسلم کو مُسْـرِف (زیادتی کرنے والا) کہتے تھے کیونکہ اس نے بے تحاشا قتل و غارت کی تھی۔

واقدی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یزید مسرف (مسلم) کے پاس آیا' اسے اس نے بیماری کی حالت میں اس کام پر لگایا تھا' آکر کہا: اگر تم بیمار نہ ہوتے تو میں تمہیں یہاں کا والی مقرر کر دیتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم پر خلوص ہو۔ اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ یہ امارت تمہیں مجھے دینا ہو گی کیونکہ یہ سب میری کارگردگی ہے' میں نے خواب میں غرقد کا درخت دیکھا جو اپنی ٹہنیوں سمیت چیخ رہا تھا: اے عثمان! کے قاتلو! میں متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ درخت کہہ رہا ہے کہ ''مسلم بن عقبہ کے ہاتھوں'' میں اس کے قریب گیا اور اسے پکڑ لیا۔ میں نے اس خواب کی تعبیر یہ لی ہے کہ عثمان کے معاملے کا میں ہی نگران ہوں' یہ لوگ ان کے قاتل ہیں۔

یہ سن کر یزید نے کہا کہ اللہ کی برکت سے تم ان کی طرف چلے جاؤ' ان کا معاملہ تمہارے سپرد ہے' دیکھو جب تم مدینہ پہنچو تو دیکھو جو تمہیں مدینہ میں داخل ہونے سے روکے یا لڑائی کے لئے تیار ہو تو خوب تلوار چلاؤ' ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو اور تین دن تک خوب لوٹ مار کرو' زخمیوں پر وار کرو اور بھاگنے والوں کو قتل کرتے جاؤ' کسی کو نہ چھوڑو اور اگر تمہارے مقابلے پر نہ آئیں تو ابن زبیر کی طرف (مکہ) چلے جانا۔

ابن جوزی' جویریہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مسلم نے جب حرہ کے مقتولین کو دیکھا تو کہا: اگر اب بھی میں دوزخ میں داخل ہو جاؤں تو بڑا بدبخت ہونگا پھر بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنایا اور تین دن تک کچھ کھانے پینے کو نہ دیا۔ ادھر اس کے ساتھی حضرت سعید بن میتب رضی اللہ عنہ کو لے آئے' اور ان سے کہا کہ بیعت کرلو۔ انہوں نے کہا کہ میں ابوبکر وعمر کے طریقے پر (چلنے والے کی) بیعت کروں گا' مسلم نے حکم دیا کہ ان کی گردن اُڑا دی جائے لیکن اسی دوران کسی نے کہہ دیا کہ یہ دیوانہ ہے تو اس نے انہیں جانے دیا۔

حرّہ میں مقتولین کی تعداد

مدائنی نے اہلِ مدینہ کے ایک بوڑھے شخص کے حوالے سے لکھا' اس نے بتایا کہ میں نے زھری سے پوچھا حرہ کے دن کتنے لوگ قتل ہوئے تھے؟ اس نے بتایا کہ سات سو نامور قریش' انصار اور مہاجرین قتل ہوئے' یہ سردار قسم کے تھے' ان کے علاوہ عام لوگ غلام' آزاد اور عورتیں دس ہزار تھے' یہ واقعہ ذوالحجہ کے تین دن رہتے تھے کہ ۶۳ھ ہجری کو پیش آیا۔

علامہ واقدی ''کتاب الحرہ'' میں لکھتے ہیں: مجھے عبداللہ بن جعفر نے بتایا کہ میں نے زھری سے پوچھا کہ اس دن کتنے لوگ قتل ہوئے تھے' اس نے بتایا کہ معتبر اور سردار لوگ قریش' انصار اور موالی کل سات سو تھے پھر ان مقتولوں کا شمار کیا تو میں نے سمجھ لیا کہ اس دن کوئی بھی قتل سے نہیں بچا پھر زہری نے بتایا کہ نامعلوم غلام' بچوں اور عورتوں میں سے دس ہزار سے زائد لوگ قتل ہو گئے' وہ لوگ حرہ میں ذوالحجہ کے تین دن باقی تھے کہ داخل ہوئے' ۶۳ھ ہجری تھا۔

میں کہتا ہوں کہ قرطبی نے کہا: ذوالحجہ کی دو راتیں رہتی تھیں پھر اقشہری نے ابومعشر اور واقدی کے حوالے سے بتایا کہ یہ بدھ کا دن تھا اور ذوالحجہ کی دو راتیں باقی تھیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات میں نے تو واقدی کی کتاب میں نہیں دیکھی' شائد ان کے قلم سے نکل گئی ہے واللہ اعلم۔

علامہ مجد نے ذکر کیا ہے کہ شامیوں نے بچوں تک کو قید کر لیا' عورتوں کی بے حرمتی کی چنانچہ ان عورتوں سے پیدا ہونے والی اولاد کو ''اولاد الحرۃ'' کہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر نامور لوگ یزید کی بیعت کے لئے بلائے گئے تو مسلم اس بات کے علاوہ کسی اور بات پر راضی نہ تھا کہ وہ یزید کی بیعت کر لیں اور اس کی غلامی میں آ جائیں' جس نے لیت و لعل کیا' اس نے قتل کا حکم دیا۔ اسی دوران اس کے ساتھی علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو لے کر آئے تو حصین بن نمیر نے کہا: اے یمن والو! اپنے خالہ زاد کی بیعت کرو' چنانچہ اس کے ساتھ چار ہزار لوگ کھڑے ہو گئے' مسلم نے ان سے کہا' کیا تم نے اطاعت سے خلاصی کرا لی ہے؟ تو انہوں نے کہا: اگر اس کے بارے میں پوچھتے ہو تو ہم کہیں گے ہاں چنانچہ اس نے اس صورت میں بیعت کی کہ وہ یزید کا چچا زاد ہے۔ انتہٰی۔

مدائنی ہی کے مطابق محمد بن عمر نے بتایا: مروان کے غلام ذکوان نے کہا کہ مسلم نے مدینہ میں لوٹ کھسوٹ کے

بعد ایک دوائی پی اور صبح کا کھانا مانگا جس پر طبیب نے کہا' جلدی نہ کرو کیوں کہ دواء کے کامل اثر سے پہلے تم نے کھانا کھا لیا تو تمہارا جانی خطرہ ہے۔ اس نے کہا' تم پر افسوس ہے' میں زندگی چاہتا تھا تا کہ عثمان کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر مطمئن ہو جاؤں' میں نے جو کچھ سوچا تھا' وہ پا لیا ہے تو اس وقت مجھے موت سے پیاری اور کوئی شے نہیں لگتی کیونکہ پاکیزہ ہو گیا' مجھے اس بات میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے گناہوں سے پاک کر دیا ہے کیونکہ میں نے ان پلیدوں کو قتل کر دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ بات نہایت احمقانہ تھی (اللہ اسے تباہ کرے اور مزید بدبخت بنائے) کیونکہ اس سے تو وہ اور زیادہ مجرم بن گیا تھا۔

حرّہ کے دن قتل ہونے والے صحابہ کرام

حرہ کے دن ناحق قتل ہونے والے صحابہ میں سے ایک' حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل رضی اللہ عنہ تھے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ آپ کو آٹھ بیٹوں سمیت قتل کیا گیا۔ عبد اللہ بن زید قتل ہوئے جو حضورﷺ کے وضو کا طریقہ بتاتے تھے' معقل بن سنان اشجعی جو فتح مکہ میں شامل ہوئے تھے' وہ اس دن اپنی قوم کا جھنڈا تھامے ہوئے تھے' کسی نے اسی موقع پر کہا تھا:

"سنو! انصار تو قوم کے سرداروں پر روتے ہیں لیکن بہادر لوگ معقل بن یسار کو رو رہے ہیں۔"

ان مقتولوں میں محمد بن عمرو بن حزم انصاری بھی تھے' امام ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن غسیل اس دن کہہ رہے تھے:

"دور ہو وہ شخص جس نے فساد کا ارادہ کیا اور سرکشی دکھائی' میانہ روی سے ہٹ گیا اور اسباب ہدایت سے محروم رہا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسی کو دور کرتا ہے جو بے فرمان ہو۔"

اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے' ان کے ساتھ ماں کی طرف سے ان کے بھائی محمد بن ثابت بن قیس بن شماس انصاری بھی شہید ہو گئے۔ ان کے والد' بنو تمیم کے وفد آنے پر رسول اللہﷺ کی طرف سے بات چیت کرتے رہے۔

مسلم بن عقبہ' مروان بن حکم کو ہمراہ لئے مقتولین کا چکر لگا رہا تھا کہ عبد اللہ بن غسیل کے پاس سے گذرا' ان کی انگشت شہادت کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مروان نے کہا: انہوں نے مر کر بھی انگلی اٹھا رکھی ہے تو زندگی بھر کتنی مرتبہ اٹھائی ہو گی۔

محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ مروان نے عبد اللہ بن حنظلہ غسیل کو انگلی اٹھائے دیکھا' وہ خشک ہو چکی تھی' ان سے کہا اگر تم مرتے ہوئے اس سے اشارہ کر رہے ہو تو زندگی بھر کتنی مرتبہ تم نے اللہ سے دعا کی ہو گی اور گڑگڑائے ہو

گے۔اس پر ایک شامی نے کہا: اگر ایسا ہی ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو پھر تم لوگوں نے تو ہمیں اہلِ جنت کو قتل کرنے کے لئے بلایا ہے۔مروان بولا کہ انہوں نے مخالفت کی ہے اور الگ ہو گئے ہیں۔طبقات میں محمد بن سعد کہتے ہیں کہ مروان بن حکم، مسلم بن عقبہ کو اہلِ مدینہ کے خلاف بھڑکاتا رہا' یہ اس کا مددگار بن کر آیا تھا چنانچہ ان پر کامیاب ہوا اور مدینہ میں لوٹ مار ہوئی چنانچہ جب مروان یزید کے پاس گیا تو اس نے اس کا شکر ادا کیا اور اپنا قریبی بنا لیا۔

ابن جوزی حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں' فرمایا تھا کہ میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں تو بنو مروان کے خلاف بددعا کرتا ہوں۔

انہی کی روایت ہے' فرمایا: مجھے پریشان کرنے والی بات یہ تھی کہ حرہ کی راتوں میں مسجد کے نبوی اندر میرے سوا اور کوئی نہ ہوتا تھا' اہلِ شام گروہ در گروہ داخل ہوتے تو کہتے کہ اس بڈھے دیوانے کو دیکھو۔جب بھی نماز کا وقت ہو جاتا تو قبرِ انور و اطہر سے اذان کی آواز سنائی دیتی' پھر اقامت ہوتی' میں آگے بڑھ کر نماز پڑھتا اور مسجد میں میرے سوا کوئی بھی نہ ہوتا۔

ابو قرہ کی روایت ہے کہ ہشام بن حسان نے بتایا کہ حرہ کے واقعہ کے بعد ایک ہزار بے خاوند عورتوں نے بچے جنے۔

مدائنی ہی سے ہے' خالد کندی نے بتایا کہ ان کی پھوپھی ام الہیثم بنت یزید کہتی ہیں کہ میں نے ایک قریشی عورت کو طواف کرتے دیکھا کہ اتنے میں اس کے سامنے ایک سیاہ بچہ آ گیا' وہ اس سے گلے ملی اور اسے چوما۔میں نے اس سے پوچھا: اے خدا کی بندی! اس سیاہ رنگ والے سے اتنا پیار کر رہی ہو؟ اس نے کہا یہ میرا بیٹا ہے' اس کا باپ حرہ کے دن مجھ سے ہم بستر ہوا تھا۔

ابو غزیہ انصاری بتاتے ہیں کہ اہلِ مدینہ رات کو مجلس لگاتے اور دیر تک جاگتے رہتے تھے اور جب دوسرے لوگ قتل ہو گئے تو وہ بھی قتل ہوئے جن میں سے ایک شخص بچ گیا' وہ اس کی مجلس میں گیا تو کسی کو محسوس نہ ہوا' پھر دوسری رات آیا تو یونہی کیا اور تیسری رات کو آیا تو یونہی کیا اور یہ شعر پڑھا:

"سنو! بہادر چلے گئے اور مجھے پیچھے چھوڑ گئے' اب میرے لئے یہی بات غم کی ہے کہ میں بہادروں کو یاد کر رہا ہوں۔"

چنانچہ مجلس میں سے کسی نے کہا:

"ان بہادروں کا ذکر چھوڑو کیونکہ وہ چلے گئے' مرنے سے پہلے اپنے آپ کو روؤ کیونکہ ہر جماعت کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے وہ بکھر جایا کرتی ہے۔"

طبرانی میں ابو ھارون عبدی کا بیان ہے کہ میں نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کی داڑھی کے بال گرے معلوم ہوتے تھے' میں نے پوچھا: کیا داڑھی سے کھیلا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا' نہیں بلکہ یہ اہلِ شام کے ظلم کی

نشانی ہے۔وہ حرہ کے وقت گھر میں گھس آئے اور سامان لوٹتے گئے پھر ایک اور گروہ آیا' گھر میں انہیں کچھ نہیں ملا تو افسوس کرنے لگے کہ اس گھر سے کیسے خالی ہاتھ چلے جائیں چنانچہ کہنے لگے کہ اس بڈھے کو لٹا دو اور پھر ہر ایک میری ڈاڑھی سے کچھ نہ کچھ بال نوچتا گیا۔

کیا مسلم بن عقبہ جل کر مر گیا تھا؟

محمد بن سعید نے بتایا کہ یزید جب حضرت ابن زبیر کے خلاف ہو گیا اور بیعت کی خواہش کی تو مسلم بن عقبہ مری کو بلایا (اسے فالج ہو چکا تھا) کہنے لگا کہ میرے باپ امیر المؤمنین نے ایام بیماری میں مجھ سے عہد لیا تھا کہ اگر اہلِ حجاز کی طرف سے کوئی واقعہ رونما ہو تو میں تمہیں ان کی طرف بھیجوں چنانچہ وہ مسئلہ بن گیا ہے۔مسلم نے کہا' میں آپ کے حکم پر پورا اتروں گا' میرے ساتھ عہد کرو اور لشکر تیار کر دو۔چنانچہ وہ مدینہ میں وارد ہوا اور تین دن تک قتل و غارت کرتا رہا پھر لوگوں سے یزید کی اس شرط پر بیعت کرنے کو کہا کہ وہ ان کے بے دام غلام ہیں خواہ وہ تم سے اللہ کی عبادت کا کام لے یا بے فرمانی کا' انہوں نے یہ بات مان لی البتہ ایک قریشی نے' جس کی والدہ اُم ولد تھی' یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔مسلم نے اسے کہا کہ یزید سے اطاعت و گناہ کی شرط پر بیعت کرو۔اس نے کہا' میں اطاعتِ الٰہی کی شرط پر بیعت کر سکتا ہوں' اس نے اس شرط پر بیعت لینے سے انکار کر دیا اور اسے قتل کر دیا چنانچہ اس کی ماں نے قسم کھا لی کہ اگر مسلم کی زندگی یا موت میں مجھ سے ممکن ہوا تو اسے جلا دے گی۔

جب مسلم مدینہ سے نکلا تو اس کی بیماری اور بڑھ گئی چنانچہ وہ مر گیا' اس قریشی کی ماں اپنے کچھ غلام لے کر اس کی قبر پر گئی تو اس نے سرہانے کی طرف سے قبر کھودنے کو کہا' جب وہ سر تک پہنچے تو یکا یک دیکھا کہ ایک اژدھا اس کے گلے میں لپٹا ہوا ہے اور اس کا ناک پکڑے چوس رہا ہے۔وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کہنے لگے' اے بی بی' آؤ واپس چلیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف سے اس کے شر کا بدلہ دے دیا ہے' اسے بتایا تو وہ کہنے لگی: میں نے اللہ سے جو وعدہ کر رکھا ہے' اسے پورا کر کے رہوں گی۔پھر کہنے لگی کہ اس کے پاؤں کی طرف کھو دو' انہوں نے کھودا تو دیکھا کہ ایک بڑا سانپ اس کے پاؤں پر لپٹا ہوا تھا۔وہ ہٹ گئی اور دو نفل پڑھے اور عرض کی' الٰہی! تو جانتا ہے کہ اگر میں نے تیری خاطر مسلم بن عقبہ سے اظہارِ ناراضگی کیا ہے تو آج مجھے اس سے بدلہ لے لینے دے۔پھر ایک لکڑی پکڑ کر سانپ کی دم پر لگائی چنانچہ وہ سر کی پچھلی طرف سے کھسک گیا اور قبر سے نکل گیا۔اس پر اس نے اسے باہر نکالنے کو کہا اور آگ میں جلا دیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ واقدی کی کتاب الحرہ ہی میں ہے کہ جب مسلم کو "ثنیة المشلل" میں دفن کر دیا گیا تو اس وقت اُمِّ ولد لشکر کے پیچھے تھی' کوئی دو یا تین دن کے فاصلے پر' اسی دوران اسے خبر ملی تو وہ وہاں پہنچی' اس نے اس کی قبر کھو دی اور مشلّل پہاڑی پر سولی چڑھا دیا چنانچہ اسے سولی پر لٹکا ہوا دیکھنے والے نے مجھے بتایا کہ اسے یوں پتھر برسائے

جاتے تھے جیسے ابو رغال کی قبر پر۔

عبدالرحمٰن بن حارث کہتے ہیں کہ بخدا میں نے اس کی قبر کھودی تھی تاہم جب وہ عورت اس کی لحد تک پہنچی تو دیکھا کہ ایک سیاہ سانپ منہ کھولے اس کی گردن پر لپٹا ہوا تھا چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئی۔

ابن جوزی کہتے ہیں کہ جب ۶۴ھ ہجری آ گیا (اور مسلم اہلِ مدینہ کو قتل کرنے سے فارغ ہو گیا) تو مکہ کی طرف متوجہ ہوا' مدینہ پر روح بن زنباع کو اپنا نائب مقرر کر دیا پھر ابن زبیر کی طرف روانہ ہوا اور راستے ہی میں مر گیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ معاملہ عین اسی طرح ہوا جیسے حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو بھی مدینے کے معاملے میں برا ارادہ کرے گا' اللہ جلد ہی اسے ہلاک فرما دے گا۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اسے مدینے سے جاتے ہوئے ہلاک کیا' اس کے پیٹ میں زرد پانی بھر گیا چنانچہ واقعۂ حرہ کے تین دن بعد وہ ''قدید'' کے مقام پر مر گیا۔

طبری کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے تین راتوں بعد ''ھرشیٰ'' کے مقام پر مرا تھا' اس کی لاتعداد بیوقوفیوں میں سے یہ بھی تھی کہ مرتے وقت کہنے لگا: ''اے اللہ! جب سے میں نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا ہے' نیکی کا اس کے علاوہ کوئی پسندیدہ کام نہیں کیا کہ اہلِ مدینہ کو قتل کیا ہے' اگر اب بھی میں دوزخ میں چلا گیا تو یہ بڑی بدبختی ہو گی۔''

اس کے بعد حصین بن نمیر سکونی کو بلا کر کہا کہ امیر المؤمنین نے میرے بعد تمہیں امیر مقرر کیا ہے لہٰذا جلد پہنچو اور ابن زبیر کی طرف جانے میں دیر نہ کرو پھر اسے حکم دیا کہ مکہ پر حملہ کے لئے منجنیقین گاڑ دینا اور اگر اہلِ مکہ بیت اللہ کی پناہ لیں تو ان پر تیر برسانا چنانچہ اس نے ۶۴ دن تک مکہ کا محاصرہ جاری رکھا جن میں سخت لڑائی ہوتی رہی اور بیت اللہ کو ۳ ربیع الاوّل بروز ہفتہ منجنیقوں سے نشانہ بنایا گیا' ایک آدمی کے تیر کی نوک پر شعلہ لگا جسے ہوا لے گئی اور یوں بیت اللہ جل گیا۔ اسی دوران انہیں خبر ملی کہ ربیع الآخر کے چاند دیکھنے پر یزید بن معاویہ مر گیا ہے۔ واقعۂ حرہ اور اس کی موت کے درمیان صرف تین ماہ کا عرصہ گذرا تھا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ تین ماہ سے کم عرصہ گذرا تھا کیونکہ وہ ذبحہ اور ذات الجنب میں نصف ربیع الاوّل کو مرا تھا۔

اب قلعی پگھل چکی تھی' حالات تبدیل ہو چکے تھے' اہلِ مدینہ اور اہلِ حجاز' شامیوں کے مقابلے میں جرأت مند ہو گئے تھے۔ اب وہ اس قدر ذلیل تھے کہ جب بھی ان کا کوئی آدمی کسی کو اکیلا مل جاتا تو اس کے چوپائے کی لگام پکڑ کر اسے گرا دیا جاتا۔ ایسے حالات میں بنو امیہ نے ان سے کہا کہ ہمیں کسی طرح شام پہنچاؤ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور وہ لشکر شام میں چلا گیا۔

یزید کے دور میں سب سے برے یہ تین کام ہوئے تھے' واقعۂ حرہ' قتلِ حسین رضی اللہ عنہ اور بیت اللہ پر منجنیق کے ذریعے سنگ باری۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سعید بن زید (یہ دس ان اصحاب میں شامل تھے جنہیں جنت کی بشارت ملی رضی اللہ

عنہم) نے کہا تھا:

''اگر تم حرۂ واقم میں ہمیں قتل کیا ہے تو ہم اسلام پر قتل ہونے والے پہلے لوگ ہیں' ہم نے بدر میں تمہیں تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود قتل کیا تھا' اب ہمارا سامان لوٹ لیا گیا تو اس میں زیادتی ہے۔''

اگر بیت اللہ میں پناہ لینے والا صحیح سالم نجات پا گیا تو ہر وہ شخص جو تم میں سے ہمارا نائب ہوگا' بڑا ہو گا۔''

اس شعر میں ''بیت اللہ میں پناہ لینے والا'' سے مراد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہیں۔

یہ واقعۂ حرہ اس واقعہ کے علاوہ ہے جو حدیثِ بیداء میں مذکور ہے چنانچہ ابن شبہ کے مطابق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''شام کی طرف سے ایک لشکر آئے گا جو مدینہ میں داخل ہوگا' وہ قتل و غارت کریں گے' عورتوں کے پیٹ پھاڑیں گے' وہ یہ کہیں گے کہ پیٹ میں حمل ہے لہٰذا اسے ابھی قتل کر دو کہ شر ختم ہو جائے اور جب وہ ذوالحلیفہ کے قریب بیداء کے بالائی حصے پر پہنچیں گے تو انہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا' چھوٹے بڑے کا لحاظ نہ ہوگا۔''

ابوالمہزم کہتے ہیں کہ جب ابنِ ذبحہ کا لشکر آیا تو ہم نے کہا کہ شاید یہ وہی لوگ ہیں لیکن وہ یہ نہ تھے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک اطلاع کے مطابق یہ لشکر سفیانی ہوگا جسے وہ امام مہدی سے لڑنے کے لئے بھیجے گا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ جب سے حضور ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو مسجد نبوی میں ایک دن کی نماز بھی ترک نہ ہو پائی تھی' صرف تین دنوں میں ایسا ہوا تھا' جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ہوا' یومِ حرہ پڑ حضرت مالک کہتے ہیں کہ تیسرا دن میں بھول گیا۔

ابن رشد کہتے ہیں' تیسرا وہ دن جس کے بارے میں امام مالک نے کہا تھا کہ وہ بھول گئے ہیں' محمد بن عبدالحکیم کے مطابق وہ تھا جس میں ابوحمزہ خارجی نکلا تھا وہ مروان بن محمد بن مروان بن الحکم کے دَور میں نکلا' یہ بنوامیہ کا آخری خلیفہ تھا۔

ابوحمزہ کی مدینہ کو روانگی

خلیفہ بن خیاط کہتے ہیں کہ ۱۳۰ھ ہجری کی ابتداء میں ابوحمزہ مدینہ کا ارادہ لے کر چلا اور مکہ میں اپنا نائب ابراہیم بن صباح حمیری کو بنایا۔ اپنے مقدمہ (لشکر کا اگلا حصہ) پر فلح بن عقبہ سعدی کو مقرر کیا۔ اِدھر سے اہلِ مدینہ نکلے اور بروز جمعرات' صفر گذرنے میں نو دن باقی تھے' ۱۳۰ھ ہجری تھا کہ ''قدید'' کے مقام پر آمنے سامنے ہو گئے۔ فلح کی کمان میں

تیس ہزار گھوڑ سوار تھے' اہلِ مدینہ سے کہنے لگا: ہمارا راستہ چھوڑ دو' ہم ان کے پاس جانا چاہتے ہیں جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی' ہم تمہارے ساتھ لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ ان سے جنگ کرنے لگے اہلِ مدینہ شکست کھا گئے۔ ابوحمزہ ان کے پاس آیا تو علی بن حصین نے اسے کہا کہ اس قوم کی اتباع کرو اور ان کے زخمیوں کے بارے میں نرمی برتو کیونکہ ہر موقع کا حکم الگ ہوتا ہے' یہاں نرمی برتنا ہی بہتر ہے۔ اس نے کہا' میں ایسا نہیں کروں گا چنانچہ وہ مدینہ کو چلا گیا چنانچہ وہ صفر کی تیرہ راتیں باقی تھیں' پیر کا دن تھا کہ مدینہ میں داخل ہوا' اس کے مدینہ میں داخلے پر (واللہ اعلم) مسجد نبوی میں تین دن گذرنے کے باوجود کوئی بندہ نہ آیا۔ اس دن قریش کے تین سو آدمی قتل کئے گئے جبکہ آلِ زبیر میں سے بارہ آدمی مارے گئے' لوگوں نے قدید میں دلوں کو گھبرا دینے والی رونے کی ایسی آوازیں سنیں کہ کبھی نہ سنی تھیں' مدینہ میں کوئی ایسا گھر نہ تھا جس میں چیخ و پکار نہ ہوئی ہو' ایک رونے والی انہیں یوں رو رہی تھی:

"زمانے کو کیا ہو گیا اور مجھے کیا ہوا کہ "قدید" نے میرے بہادر فنا کر دئے لہٰذا اب میں باطنی طور پر
اور چپکے چپکے روتا رہوں گا اور ظاہری طور پر بھی رووں گا۔"

میں کہتا ہوں: خلیفہ بن خیاط نے ابوحمزہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اسے ذہبی نے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: عبد اللہ بن یحییٰ اعور کندی' جسے طالب الحق کہتے تھے' (حضر موت اور صنعا کے حکمران) نے مکہ کی طرف ابوحمزہ خارجی اباضی کو بھیجا (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) چنانچہ مکہ و مدینہ کا امیر عبد الواحد بن سلیمان بن عبد الملک خوفزدہ ہو گیا جس پر اہلِ مکہ نے اسے رسوا کیا۔ اس نے ابتدائی لوگوں کے ساتھ جاتے ہوئے مکہ چھوڑ دیا اور مدینہ کو روانہ ہو گیا جس کے نتیجے میں ابوحمزہ مکہ پر قابض ہو گیا اور جب وہ مکہ کا امیر بن گیا اور مقام "قدید" پر اس لشکر کے مقابلے میں آیا جسے عبد الواحد بن سلیمان نے اس سے لڑنے کے لئے بھیجا تھا تو یہاں ابوحمزہ کامیاب ہوا اور پھر مدینہ کو چل پڑا اور مدینہ میں داخل ہو گیا اور وہاں بہت سے لوگوں کو قتل کیا جن میں چالیس لوگ بنو عبد العزیٰ کے تھے۔ اس کے خلاف مروان نے لشکر تیار کیا جو وادی القریٰ میں فلج کے مقابلہ پر گیا جو ابوحمزہ کے لشکر میں مقدمہ پر تھا۔ دونوں فریق لڑے تو فلج اور اس کے بہت سے ساتھی قتل ہو گئے پھر انہوں نے مکہ میں ابوحمزہ کو جا لیا اور اسے بھی اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا پھر طالب الحق کی طرف گئے اور اسے بھی قتل کر دیا۔ انتہٰی ملخّصاً۔

میں کہتا ہوں' اس میں یہ احتمال نہیں کہ جو کچھ تاریخ دانوں کی طرف سے مدینہ سے نکلنے کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ اس کا اس واقعہ سے تعلق ہو یا اس سے قبل والے واقعۂ بسر بن ارطاۃ سے تعلق ہو کیونکہ علامہ قرطبی نے کہا: ابوعمرو شیبانی کہتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر بن ارطاۃ کو حضرت علی کے مددگاروں کو قتل کرنے کی خاطر بھیجا تو وہ چلتا ہوا مدینہ پہنچا اور حضرت عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا' اہلِ مدینہ بھاگ کھڑے ہوئے اور حرہ بنو سلیم میں جا داخل ہوئے لیکن یہ بات دور کی ہے' قریبی وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا' واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۶

اس آگ کے ظہور کے بارے میں ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے ڈرایا تھا' وہ سرزمینِ مدینہ میں دکھائی دی اور جب وہ مدینہ کے قریب پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بجھا دیا۔

اس آگ کے بارے میں احادیث

مسند احمد میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ ساتھ تھے کہ ہم نے ذوالحلیفہ دیکھا' کچھ آدمی جلدی سے مدینہ کو واپس چلے گئے لیکن حضور ﷺ رات وہیں ٹھہرے' ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔صبح ہوئی تو آپ نے چلے جانے والوں کے بارے میں پوچھا آپ کو بتایا گیا کہ وہ جلد ہی مدینہ کو چلے گئے تھے۔آپ نے فرمایا کہ ''وہ عورتوں کی خاطر جلد مدینہ کو گئے ہیں اور یوں وہ انہیں اچھی طرح سے بلا سکیں گے۔'' پھر فرمایا: معلوم نہیں کہ یمن کے وراق پہاڑ سے آگ کب دکھائی دے گی جس کی روشنی میں بصری کے بیٹھے اونٹوں کی گردنیں دن کی روشنی کی طرح دکھائی دیں گی۔

علامہ طبرانی نے حضرت حذیفہ بن اسد رضی اللہ عنہ کی حدیث کے آخر میں لکھا ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک آگ رومان (یا رکوبہ فرمایا) سے دکھائی نہ دے گی جس سے بصری کے اونٹوں کی گردنیں نظر آنے لگیں گی۔

میں کہتا ہوں کہ ''رکوبہ'' جیسے کہ آگے آرہا ہے' ورقان کے قریب ایک پہاڑی ہے' شاید وراق پہاڑ سے مراد یہی ہے' حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بکری نے رومان کا ذکر نہیں کیا اور شائد رومہ کنواں مراد ہے جو مدینہ میں ہے پھر بکری نے نقل کیا ہے کہ رکوبہ وہ شخص ہے جس نے مدینہ اور شام بنایا تھا۔عنقریب اس کا رد آرہا ہے۔

یہ آگ بخاری و مسلم میں اس حدیث کے اندر مذکور ہے ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک حجاز میں آگ دکھائی نہ دے گی۔'' بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ''سرزمینِ حجاز میں آگ نظر آئے گی جس سے بصریٰ کے اونٹوں کی گردنیں دکھائی دیں گی۔''

طبرانی نے مطابق حضرت عاصم بن عدی انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے آئندہ کے بارے میں پوچھا: آپ نے فرمایا: ''حبس سیل'' کہاں ہے؟ ہم نے عرض کی کہ معلوم نہیں کہاں ہے؟ اتنے میں میرے قریب سے بنو سلیم کا ایک آدمی گذرا تو میں نے اس سے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ ''حبس سیل'' سے' میں نے اپنا جوتا منگوایا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی' یا رسول اللہ! آپ نے ہم سے حبسِ سیل کے بارے میں پوچھا تھا تو ہم نے عرض کیا تھا کہ ہمیں معلوم نہیں' اب یہ آدمی میرے قریب سے گذرا ہے تو میں نے اس سے پوچھا ہے' اس نے بتایا ہے کہ میرے اہل و عیال وہیں ہیں۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: تمہارے اہل و

عیال کہاں ہیں؟ اس نے عرض کی کہ جس سیل میں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے اہل و عیال کو وہاں سے نکال لو کیونکہ عنقریب وہاں سے آگ نکلے گی جس سے بصریٰ میں اونٹوں کی گردنیں نظر آئیں گی۔ اور اس حدیث کو: "عنقریب آگ جبس سیل سے نکلے گی جو کم رفتار اونٹ کی طرح چلے گی' دن کو چلے گی لیکن رات کو رُک جائے گی۔" احمد اور ابو یعلیٰ نے بشیر سلمی سے روایت کیا ہے۔

مسند الفردوس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث ملتی ہے: "قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک حجاز کی وادیوں میں سے ایک وادی میں آگ نہیں چلے گی جس سے بصریٰ میں اونٹوں کی گردنیں دکھائی دیں گی۔

مدینہ جیسے حجازیہ کہلاتا ہے' یونہی یمانیہ بھی کہلاتا ہے

یہ آگ' جیسا کہ آگے ہم بیان کریں گے' مدینہ شریف میں دکھائی دی اور مدینہ کے حجازیہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں' رہا اس کا یمانیہ ہونا تو اس کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ نے واضح طور پر لکھا ہے' چنانچہ علامہ بیہقی "المعرفۃ" میں لکھتے ہیں: حضرت شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مکہ اور مدینہ یمانی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت امام شافعی نے "اُمّ" میں یہ حدیث بیان کی ہے: "تمہارے پاس اہل یمن آئیں گے جو بڑے نرم دل ہوں گے۔" پھر یہ روایت کی کہ "نبی کریم ﷺ تبوک پہاڑی کے پاس ٹھہرے اور فرمایا: جو یہاں تک ہے' وہ شام ہے اور شام کی طرف اشارہ کیا اور جو یہاں تک ہے وہ یمن ہے' اور پھر مدینہ کی طرف اشارہ کیا۔" "الام" سے میں نے انہی الفاظ میں نقل کیا ہے اور مسندِ شافعی میں الفاظ یہ ہیں: جو یہاں تک ہے وہ شام ہے اور اشارہ شام کی طرف تھا اور جو یہاں تک ہے وہ یمن ہے' اس سے مدینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کی شرح میں ابن الاثیر کہتے ہیں کہ اس سے آپ کی غرض شام اور یمن کی حدود بیان کرنا تھا' چنانچہ آپ نے مدینہ کو یمن میں شامل کیا۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ علامہ نووی نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مدینہ نہ یمانی ہے' نہ شامی بلکہ حجازی ہے۔ فرمایا کہ اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں' شائد انہیں اس بات کا علم نہ تھا۔

رہا جبس سیل' تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لفظ جبس ہے' حاء پر پیش اور باء پر جزم سے' یہ حرۂ بنو سلیم اور سوارقیہ کے درمیان ہے' یہ آگ مشرق سے سوارقیہ کے راستے کی طرف سے آئی تھی جیسے آگے آ رہا ہے۔ علامہ نصر کہتے ہیں کہ جبس سیل میں حاء پر زبر ہے یہ بنو سلیم کے دو حرّوں میں سے ایک ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل اہلِ مدینہ اسے "سدّ" کا نام دیتے ہیں جو آگے آ رہا ہے اور علامہ یا قوت کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام "سد" اس آگ سے پہلے کا رکھا ہوا ہے کیونکہ انہوں نے اسے پایا نہ تھا' اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ قناۃ کی اعلیٰ وادی سدّ کے قریب ہے جسے "شظاۃ" کہتے ہیں۔

تاریخ دانوں کے ہاں مدینہ شریف میں اس آگ کا دکھائی دینا مشہور ہے اور حد تواتر کو پہنچ چکا ہے' اس کا ظہور

اس مقصد کے لئے تھا جو آگے ہونے والا تھا یعنی اس سے مسلمانوں کو ڈرایا جائے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اسے "نذیر" ﷺ ہی کے شہر کے قریب دکھایا گیا' اس سے قبل ہولناک زلزلے آئے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا○

"اور ہم ایسی نشانیاں نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کو۔"

اور فرمایا:

ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ○

"اس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو' اے میرے بندو! تم مجھ سے ڈرو۔"

اور جب یہ آگ ظاہر ہوئی جس کی حالت آگے آ رہی ہے' اہلِ مدینہ اس سے بہت ڈر گئے اور اپنے رحمت بھرے نبی کی خدمت میں درخواست کی چنانچہ اسے شمال کی طرف پھیر دیا گیا' یوں ان کا خوف زائل ہو گیا اور اُمت میں تربت حضور ﷺ کی برکت ظاہر ہوئی۔

مدینہ میں آگ کی حکمت

شاید خصوصی طور پر یہاں آگ دکھائی دینے کا مقصد (پہلے ہم بتا چکے کہ یہ "نذیر" کے ہاں ظاہر ہوئی) اس اُمت کے لئے رحمت تھا کیونکہ اگر یہ قہر بن کر اور اپنی عظمت والی شان دکھاتے ہوئے کہیں اور دکھائی دیتی تو پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اسے کوئی نہ موڑتا اور اس سے اُمت کا نقصان بہت ہوتا چنانچہ اس مقام پر دکھائی دی جہاں ڈرانے والے موجود تھے اور جب یہ کامل ہو چکی تو رحمت اس کے مقابلے میں آئی اور اسے سرد اور سلامتی والا بنا دیا۔ اس کے علاوہ کئی اور بھید بھی تھے۔

مدینہ منورہ میں پہلا زلزلہ

مدینہ شریف میں پہلا زلزلہ اس وقت آیا جب جمادی الاولیٰ کا اخیر اور جمادی الاخریٰ آ رہا تھا' ۶۵۴ھ ہجری تھا' یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کیونکہ ہلکا سا تھا حالانکہ اس کے بعد اس کے جھٹکے کئی بار آئے اور اس میں تیزی منگل کے روز آئی جیسے کہ قطب قسطلانی نے بتایا' یہ زلزلہ اتنا عظیم اور واضح تھا کہ اسے ہر خاص و عام جان گیا تھا اور پھر جب بدھ کی رات' تین تاریخ تھی یا چار اور رات کا آخری تہائی حصہ تھا تو مدینہ میں شدید زلزلہ آیا جس سے سب لوگ خوفزدہ ہو گئے اور اس کی ہیبت کی بناء پر دل کانپ گئے یہ زلزلہ رات کے آخر تک چلتا رہا اور جمعہ تک جاری رہا' اس کی دھمک بجلی سے زیادہ تھی' زمین کانپ اٹھی اور دیواریں ہلنے لگیں' رات کے علاوہ دن ہی دن میں کوئی اٹھارہ مرتبہ حرکت جاری رہی جیسے قسطلانی نے بتایا۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ آگ حجاز کے شہر مدینہ میں دکھائی دی' اس کی ابتداء بدھ کی رات عشاء کے بعد ہوئی'

جمادی الآخرہ کی تین تاریخ تھی اور ۶۵۴ھ تھا' یہ سلسلہ جمعہ کی دوپہر تک جاری رہا اور پھر رُک گیا' یہ قریظہ میں حرہ کی ایک جانب سے شروع ہوا' یہ عظیم شہر (مدینہ) میں دکھائی دی جس کے گرد دیوار تھی اور جس پر بالا خانے اور برج وغیرہ بنے ہوئے تھے' ایسے آدمی دیکھنے میں آئے جو اسے پیچھے ہٹا رہے تھے' وہ جس پہاڑی سے گذرتی' اسے ٹکڑے کر دیتی اور پگھلا دیتی اور پھر اس سارے کچھ سے سرخ اور نیلگوں رنگ کی نہر سی جاری ہو گئی اور اس کی آواز بجلی جیسی سنائی دیتی' اپنے آگے پتھر لئے تھی اور رکب عراقی کے درمیان تک پھیلی ہوئی تھی' اس کے آگے ملبے کی دیوار عظیم پہاڑ جیسی دکھائی دیتی تھی' وہ آگے بڑھتی مدینہ کے قریب پہنچ گئی لیکن اس کے باوجود مدینہ میں ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں' اس آگ کا جوش سمندر جیسا تھا۔

میرے ایک دوست نے بتایا کہ میں نے پانچ دن کی مسافت سے اسے ہوا میں چڑھتی ہوئی دیکھا اور پھر میں نے یہ بھی سنا کہ یہ مکہ اور بصریٰ کے پہاڑوں سے دکھائی دیتی تھی۔

علامہ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تمام اہلِ شام کو اس آگ کے دکھائی دینے کا پتہ تھا۔

ابو شامہ نے قاضیٔ مدینہ سنان کی کتاب کا مشاہدہ کر کے بتایا کہ بدھ کی رات' تین جمادی الآخرہ کو رات کے آخری تہائی حصے میں مدینہ کے اندر ایک عظیم زلزلہ آیا جس سے ہم ڈر گئے اور وہ زلزلہ رات بھر جاری رہا اور پھر اس کے بعد یہ زلزلہ شب و روز میں تقریباً بارہ مرتبہ آیا (کچھ نے چودہ (۱۴) مرتبہ روزانہ لکھا ہے)۔

ابو شامہ کہتے ہیں' واللہ ایک مرتبہ زلزلہ آیا' ہم حجرہ کے گرد تھے کہ منبر کانپنے لگا اور ہمیں اس میں موجود لوہے کی جھنکار سنائی دینے لگی' علاوہ ازیں حرم شریف کی قندیلیں بھی اُلٹ پلٹ ہو گئیں۔

قاشانی نے مزید کہا: پھر تیسرے دن (جمعہ کو) ایک عظیم زلزلہ آیا' مسجد کے منبر ہلنے لگے اور چھت سے تیز آواز سنائی دی۔

علامہ قطب کہتے ہیں' پھر جمعہ کے دن دوپہر کو وہ آگ دکھائی دی اور اس کے مرکز سے فضاء میں سیاہ دھواں اُبھرتا دکھائی دیا جس نے آسمان پر ہر طرف اندھیرا کر دیا اور جب رات کی تاریکیاں چھا گئیں اور رات شروع ہو گئی تو آگ کے شعلے اُبھرتے دکھائی دئے جس سے مشرق میں ایک عظیم شہر دکھائی دیا۔

جمعہ کے دن آگ کا دکھائی دینے سے حکمت پوشیدہ بات نہیں چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ''تمہارے دنوں میں سے افضل دن جمعہ کا ہوتا ہے' اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے' اسی دن ان کا وصال ہوا' اسی میں صور پھونکی جائے گی اور اسی میں کڑک سنائی دے گی لہٰذا اس دن کثرت سے مجھ پر درود پڑھا کرو کیونکہ وہ درود میرے سامنے لایا جاتا ہے۔'' الحدیث۔

حدیثِ پاک میں یہ بھی ہے: سورج کے سبب چڑھنے والے دنوں میں سب سے بہتر دن جمعہ کا ہوتا ہے' حضرت آدم علیہ السلام اسی دن پیدا ہوئے' اسی میں زمین پر اُترے' اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی' اسی دن آپ فوت

ہوئے اور اسی دن قیامت برپا ہوگی، ہر جانور اس دن چیخ رہا ہوگا کہ اتنے میں قیامت سے ڈرتا ہوا سورج چڑھے گا البتہ جن و انسان کی کیفیت و حالت ایسی نہ ہوگی، اس میں ایک ایسی گھڑی ہوگی جسے مسلمان پائے گا تو نماز پڑھتے ہوئے اللہ سے جو دعا کرے گا، پوری ہوگی (رواہ ابو داؤد) یہ دن ایسا تھا جسے اللہ نے اس اُمت کے لئے بچا رکھا تھا، اسی دن ان کا دین مکمل کر دیا تھا چنانچہ اللہ کا ارادہ ہوا کہ اس دن لوگوں کو ڈرائے کہ انہیں اپنی طرف لے جا سکے چنانچہ یہ آگ عذاب و ناراضگی کی صورت میں دراصل رحمت تھی، اسی لئے اس سے دلوں میں خوف ہوا اور وہ دھڑکنے لگے، لوگوں نے یقین کر لیا کہ عذاب انہیں گھیر رہا ہے۔

قاضی سنان کہتے ہیں کہ میں امیر مدینہ کی طرف گیا (یہ عز الدین منیف بن شیحہ تھا) اور اس سے کہا کہ ہمیں عذاب نے گھیر رکھا ہے، بارگاہِ الٰہی میں دعا کیجئے، اس کے بندوں کی رہائی کرایئے اور اس عذاب سے انہیں بچایئے۔

قاشانی مزید کہتے ہیں کہ امیر نے ٹیکس معاف کر دیا پھر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا، رات مسجد میں گذاری یہ جمعہ اور ہفتہ کی رات تھی، تمام اہل مدینہ اس کے ہمراہ تھے حتیٰ کہ عورتیں اور بچے بھی ہمراہ تھے علاوہ ازیں باغوں میں سے ہر ایک حرم شریف میں آ گیا، لوگ عاجزانہ طور پر رو رہے تھے، سروں سے ننگے حجرہ شریف کے گرد جمع ہوئے، اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے تھے، گڑگڑاتے تھے اور اپنے نبی ﷺ کی پناہ مانگتے رہے تھے۔

علامہ قطب کہتے ہیں کہ جب امیر مدینہ نے یہ معاملہ دیکھا تو مخالفتِ اسلام سے رُک گیا، عبرت حاصل کی اور اپنے کئے گناہوں سے باز آیا توبہ کی اور سب غلام آزاد کر دیئے، ظلم سے باز آیا، اہلِ مدینہ گناہوں پر ڈٹے رہنے اور کبیرہ گناہ کرنے سے رُک گئے اور مارے ڈر کے عاجزی و استغفار کرنے لگے، ان کا امیر قلعہ سے اُترا، اس کے ساتھ قاضی سنان اور بڑے لوگ تھے، وہ حجرہ شریف پر جا کر پناہ مانگتے ہوئے اور رات بھر بچوں اور عورتوں سمیت مسجد میں رہا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو ان سے ہٹا کر شمالی کی طرف بھیج دیا اور یوں وہ اس خوف سے نجات حاصل کر گئے، وہ آگ اپنے مرکز پر چلی اور عظیم آگ کا دریا بن کر رواں ہوئی، وادیٔ احیلین میں جاری ہوئی، اہلِ مدینہ نے اسے اپنے گھروں سے دیکھا، لگتا تھا کہ گویا ان کے پاس ہے اور پھر اپنے مقام سے شمال کی طرف چلی گئی اور مؤرخین کے مطابق تین ماہ تک رہی۔

آگ کتنی مدت رہی

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے اسی آگ کے لئے الگ ایک کتاب لکھی، یہ آگ انہی کے دور میں دکھائی دی لیکن آپ چونکہ مکہ میں تھے، اسے نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی ابتداء جمعہ کے دن ہوئی، جمادی الآخرہ کی چھ تاریخ تھی اور پھر بروز ہفتہ ۲۷ رجب تک سلگتی رہی، پھر بجھ گئی اور کل ملا کر ۵۲ دن تک جاری رہی لیکن علامہ قطب نے اس کے

بعد ذکر کیا ہے کہ آگ کچھ دن تک بجھنے کے بعد پھر جاری ہو گئی۔وہ کہتے ہیں کہ کبھی یہ آگ بھڑکتی اور اور کبھی رُک جاتی تھی' ڈر لگتا رہتا کہ پھر شروع ہو جائے گی اگرچہ بجھ جایا کرتی تھی انتہی تو گویا مؤرخین نے جو کچھ لکھا ہے وہ مکمل بجھ جانے سے متعلق ہے۔یہ دیر تک جاری رہی تھی کہ خوب مشہور ہو جائے تا کہ لوگ اس سے خوفزدہ رہیں اور اس کی عظمت دیکھ کر انہیں معلوم ہو جائے کہ اسی کے بارے میں حبیب حق نے انہیں ڈرایا تھا۔

آگ کی طاقت

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے ایک پختہ شخص سے سن کر بتایا کہ امیرِ مدینہ نے اس آگ کے بارے میں خبر لینے کے لئے کئی ایک گھوڑ سوار روانہ کئے لیکن کوئی بھی اس کے قریب نہ جا سکا' لوگ پیدل چل کر اس کے پاس گئے تو انہوں نے آکر بتایا کہ اس کے شعلے آسمانوں سے باتیں کرتے تھے اور وہ اس کا اندازہ نہ لگا سکے چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ خود روانہ ہوا اور اس نے بتایا کہ وہ اس کے قریب گیا لیکن جہاں چل رہی تھی وہاں نہیں پہنچ سکا کیونکہ وہ زمین سخت گرم تھی اور پہاڑ میخوں جیسے تھے جن کے نیچے آگ چل رہی تھی اور اس سے بلند ترین شعلے اُٹھ رہے تھے' اس نے دیکھا تو وہ بلند پہاڑ نظر آتی تھی اور یوں دکھائی دیتی تھی جیسے جمع شدہ ٹیلے ہوں اور جو چل رہے ہوں' وہ سمندری موجوں کی طرح پتھروں کی جھاگ نکال رہی تھی' اس کے شعلے آسمان کی ہر طرف دکھائی دے رہے تھے اور آسمان کے ہر طرف چونکہ چمک نہ رہی تھی تو دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا سورج اور چاند کو گہن لگ گیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے روکا نہ جاتا تو وہ اپنے سامنے آنے والے حیوانات' نباتات اور پتھروں تک کو کھا جاتی۔انتہی۔

علامہ جمال مطری نے کچھ اس کے خلاف لکھا ہے کیونکہ انہوں نے کہا امیر عز الدین منیف بن شیحہ امیرِ مدینہ کے غلام علم الدین سنجر عزّی نے بتایا کہ مجھے میرے آقا عز الدین نے اس آگ دکھائی دینے کے کچھ دن بعد ایک عربی شخص کے ہمراہ گھوڑوں پر روانہ کرتے ہوئے کہا کہ اس آگ کے قریب جانا اور دیکھنا کہ کوئی اس کے بہت قریب بھی جا سکتا ہے کہ نہیں کیونکہ لوگ اتنی عظیم ہونے کی وجہ سے اس کا خوف رکھتے ہیں لہٰذا میں اور میرا ساتھی قریب جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے' ہمیں گرمی معلوم نہیں ہوئی چنانچہ میں اپنے گھوڑے سے اُترا اور پیدل چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا وہ پتھر وغیرہ کھائے جا رہی تھی' میں نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور ہاتھ لمبا کر کے اس تک پہنچا دیا' مجھے نہ ہی درد محسوس ہوئی اور نہ ہی گرمی' تیر میں پسینہ آ گیا لیکن اس کی لکڑی نہ جل سکی' پھر میں نے تیر موڑا اور اس کا پر آگ میں ڈالا تو وہ جل گیا لیکن لکڑی نہ جلی حالانکہ علامہ مطری اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ جہاں سے گزرتی' پتھر اور پہاڑ کھائے جاتی تھی لیکن درخت نہیں کھاتی تھی کیونکہ ہر مخلوق پر حضور ﷺ کی اطاعت لازم کر دی گئی ہے۔

میں کہتا ہوں' علامہ قسطلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آگ اپنے راستے پر چلتی رہی اور آخر حرہ اور وادیٔ شظاۃ سے جا ملی' جو چیز بھی قریب آتی' اسے جلا دیتی اور طاقتور ہونے کی بناء پر اپنے قریب آنے والی ہر شے کو پگھلا دیتی' خواہ

وہ سبز درخت ہوتے یا پتھر وغیرہ ہوتے' اس کی مشرقی جانب پہاڑوں کے درمیان تھی' پہاڑ سامنے آنے پر رُک گئی اور شامی جانب (حرم کی طرف) ایک پہاڑ کے ساتھ لگی تھی جسے وعیرہ کہتے تھے جو اُحد پہاڑ کی مشرقی جانب کے قریب' آگے وہ شظاۃ تک چلی گئی تھی جس کے ایک کنارے پر وادیٔ حمزہ رضی اللہ عنہ تھی پھر وہ چلتی رہی اور حرم نبی کے سامنے آ کر بجھ گئی۔

علامہ قسطلانی کہتے ہیں کہ مجھے ایک بااعتماد آدمی نے بتایا کہ اس نے حرہ کا ایک بڑا پتھر دیکھا جس کا کچھ حصہ حرم سے باہر تھا چنانچہ آگ اس کے باہر نکلے حصے تک گئی اور حرم میں واقع حصہ تک پہنچ کر بجھ گئی۔

کلام طبری کے مقابلے میں اس واقعہ پر اعتماد کر لینا بہت بہتر ہے کیونکہ مطری نے وہ آگ خود ملاحظہ نہیں کی تھی' البتہ دوسرے لوگوں نے دیکھی تھی جبکہ علامہ قطب نے اسے دیکھا تھا اور پھر اس پر ایک تصنیف بھی کی تھی' علامہ مطری یہ کتاب نہیں دیکھ سکے۔ یہ معجزہ بڑا کامل ہے کیونکہ یہ حرم نبوی شریف میں داخل نہ ہوئی تھی کیونکہ یہ ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے تھی جبکہ آپ تو نبی الرحمہ تھے۔

آگ کی روشنی

ابو شامہ نے قاضی سنان حسینی کی کتاب دیکھ کر نقل کیا کہ آگ کا یہ سیلاب وادی شظاۃ کے ساتھ چلتا ہوا احد پہاڑ کے برابر آ گیا' قریب تھا کہ یہ آگ حرۂ عریض کے قریب ہو جاتی' لوگ بہت خوفزدہ تھے پھر اس کی وہ جانب مدہم پڑ گئی جو مدینہ سے ملتی تھی اور وہ حصہ جو عریض کے ساتھ ملتا تھا اللہ کی قدرت سے بجھ گیا اور پھر لوٹ کر مشرق کی طرف آ گئی۔ یہ واقعہ علامہ قطب کی تائید کرتا ہے اور اس کی علامات آج بھی اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ مجھے آگ خود دیکھنے والی ایک عورت نے بتایا کہ وہ مدینہ کی چھتوں پر رات کے وقت اس کی روشنی میں سوت کات لیتی تھیں۔

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے کہا: آگ کی روشنی قیعان کے باطنی حصے اور قلاع کے ظاہری حصے کے برابر آ گئی تھی اور حرمِ نبوی یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس پر سورج چمک رہا ہے بلکہ مدینہ کے تمام مکان اس کی روشنی سے چمک رہے تھے' شعلے مسلسل اسے روشن کئے ہوئے تھے' سورج کی زمین پر پڑنے والی روشنی بھی رنگ تبدیل کر گئی تھی اور شعلوں کے اُٹھنے کی وجہ سے اس کی روشنی میں سرخی تھی' چاند کی روشنی کم ہونے کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ اسے گہن ہو گیا ہے۔ زیارت کے لئے جانے والے بہت سے پیدل لوگوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے تین مرحلوں سے اس روشنی کو دیکھا تھا کیونکہ یہ بہت عظیم تھی' اور کچھ دوسرے لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے سنایہ کے پہاڑوں سے اسے دیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں' ابو شامہ نے ''کتاب الشریف سنان'' میں لکھا دیکھا تھا کہ یہ آگ مکہ اور تمام جنگلوں سے دیکھی جا سکتی تھی اور اسے اہلِ ینبع نے بھی دیکھا تھا۔

ابو شامہ کہتے ہیں، مجھے ایک نہایت بااعتماد آگ دیکھنے والے نے بتایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ آگ کی روشنی میں تیماء کے مقام پر کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

علامہ مجد کہتے ہیں جب تک یہ آگ روشن رہی، سورج اور چاند یوں طلوع ہوتے رہے جیسے انہیں گہن لگا ہو۔

ابو شامہ کہتے ہیں کہ اس گرہن کا اثر ہمیں دمشق میں دکھائی دیتا تھا کیونکہ دیواروں پر چاند اور سورج کی روشنی کم سے کم دکھائی دیتی تھی، ہم اس صورت حال سے نہایت حیران تھے پھر ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس آگ کا اثر ہے۔ جو بھی شخص اس آگ کا ذکر کرتا، وہ آخر میں کہتا: اس آگ کی حالت ایسی تھی کہ اسے بیان کرنے کے لئے نہ تو انگلیوں کے پورے کام دیتے تھے اور نہ قلم، یہ حالت بیان و کلام سے باہر تھی چنانچہ اس کے دکھائی دینے سے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ظاہر ہو گیا کیونکہ وہ کچھ ظاہر ہو گیا تھا جو آپ فرما گئے تھے اور وہ یہی آگ تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ سے پہلے اور پچھلے کسی دور میں ایسی آگ نہیں دیکھی گئی۔

کیا یہ آگ بصرٰی میں دکھائی دی تھی؟

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آگ کے بصرٰی میں دیکھنے کے بارے میں آ بتائے تو اس پر گفتگو کی تو ضرورت ہی نہیں ورنہ حدیث پاک میں تو اس کا ذکر زور دار طریقے سے آ چکا ہے کہ وہ یوں دیکھی گئی تھی چنانچہ یہ ذکر ابھی آیا ہے کہ لوگوں نے اسے تیماء میں دیکھا تھا اور پھر بصرٰی تو اس سے اتنا ہی دور ہے جتنا مدینہ۔

میں کہتا ہوں، قبل ازیں قرطبی سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ بصرٰی کے پہاڑوں سے دیکھی گئی تھی پھر شیخ عماد الدین ابن کثیر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس آگ کی وجہ سے بصرٰی میں اونٹوں کی گردنیں دکھائی دینے لگی تھیں چنانچہ انہوں نے کہا: مجھے صدر الدین قاضی القضاۃ حنفی نے بتایا کہ مجھے میرے والد شیخ صفی الدین، مدرس مدرسہ بصرٰی نے بتایا کہ انہیں کئی عربوں نے جو اس وقت بصرہ میں آگ دیکھنے والے موجود تھے، اس رات کی صبح کو بتایا جب یہ آگ روشن ہوئی تھی کہ انہوں نے اس آگ کی روشنی میں اپنے اونٹوں کی گردنوں کے پہلو دیکھے تھے جس سے ثابت ہوا کہ وعدہ اسی آگ کا تھا اور دور دراز کے علاقوں میں مدینہ کی اس آگ کے ظاہر کرنے میں مقصد و حکمت یہ تھی کہ لوگوں کو ڈرایا جا سکے تاکہ مکمل طور پر لوگوں کے دلوں میں ڈر پیدا ہو جائے جیسے اہلِ مدینہ سے ہوا تھا، اور اسی سلسلہ میں کسی نے کہا تھا:

"اے ہمارے جرائم پر پردہ ڈال کر تکالیف دور فرمانے والے پروردگار! ہمیں سختیوں نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔

ہم اس بارے تمہیں بتا رہے ہیں کہ ہم میں یہ سختی اُٹھانے کی ہمت نہیں، ہمارا یہ حق ہے کہ تمہیں اس بارے میں بتائیں۔

ایسے زلزلے تھے کہ سخت پتھر بھی ڈر رہے تھے حالانکہ زلزلوں سے ڈرنا پتھر کا کام ہی نہیں ہوتا۔

یہ کیفیت سات دن تک زمین کو لرزاتی رہی اور آخر کار وہ پھٹ گئی' یہ ایسا منظر تھا کہ اسے دیکھنے کی سورج کی آنکھ میں بھی ہمت نہ تھی۔

آگ کا ایک سمندر تھا جس پر پہاڑ اس کشتی کی طرح دکھائی دیتے تھے جس کا لنگر زمین پر ہو۔

وہ ایسے بھڑکتے شعلے برسا رہی تھی جیسے محل ہوں' لگتا تھا کہ یہ گویا بارش ہے جو موٹے قطرے برسا رہی ہے۔اس کی وجہ سے پہاڑوں میں شگاف پڑ گئے' وہ گویا گرج رہی تھی اور روشنی یوں کانپ رہی تھی جیسے کھجور کی شاخیں لہراتی ہیں۔

اسی کی وجہ سے فضا میں دھوئیں کے موٹے بادل چھائے تھے اور سورج یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے گہن لگا ہو۔

اس کے شعلوں کا چاند پر یہ اثر تھا کہ چودھویں روشن رات' روشنی کے بعد اندھی ہو گئی تھی۔

اس کے شعلوں نے آسمانی برجوں کو گھیر لیا تھا اور یہ معاملہ یہاں تک ہو گیا تھا کہ زمین کو جلا رہے تھے۔

ہم تیرے پوشیدہ عظیم نام کا واسطہ دیتے ہیں کہ اگر ہمارے گناہ بڑے ہیں اور دل سخت ہیں تو تو مہربانی فرما' ہمیں نعمتیں عطا فرما اور خوب راضی ہو جا کیونکہ یہ تیرا کرم ہو گا اور رحم فرما دے کیونکہ ہر شخص خطا کار ہے' اس لئے کہ وہ تیری پہچان نہیں رکھتا۔

قوم نے یونس کو دیکھ لیا کہ جب وہ مان گئے تو تو نے ان سے عذاب اُٹھا لیا اور بے شمار نعمتیں دے دیں۔

جبکہ ہم تو تیرے اس مصطفےٰ ﷺ کے امتی ہیں اور انہی کی وجہ سے ہم اس بات کے دعویدار ہیں کہ تو ہمیں معاف فرما دے گا۔

یہ وہ رسول ہیں کہ اگر نہ ہوتے تو تیری راہ پر چلنے کے لئے ہمارے پاس کوئی واضح راہنمائی نہ ہوتی۔

لہٰذا تو رحم فرما دے اور ان پر اس وقت تک رحمتیں فرما کہ جب تک منبروں پر تیرا ذکر باقی ہے۔''

آگ کب دکھائی دینے لگی تھی؟

مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ آگ اس وادی کے سرے سے دکھائی دی جسے وادیٔ احیلیین کہتے ہیں۔علامہ بدر بن فرحون کہتے ہیں کہ یہ آگ وادیٔ احیلیین میں روشن ہوئی تھی' مدینہ کے مشرقی حصے سے شروع ہوئی' ارقیہ کا راستہ تھا جو مدینہ سے صبح تا ظہر تک کی مسافت پر تھا۔

علامہ قطب قسطلانی کہتے ہیں کہ یہ مدینہ کے مشرق سے شروع ہوئی اور مدینہ سے کچھ فاصلے پر ''قارع

الھیلاء" مرکز تھا جو قباء کی مشرقی جانب بنو قریظہ کے مکانوں کے قریب تھا' یہ مقام قریظہ اور احیلیین کے درمیان واقع تھا' اس میدان سے بھڑکی اور پھیلتی ہوئی مشرق میں واقع احیلیین کے قریبی مقام تک چلی گئی' پھر بلند ہوئی' رُخ شام کی طرف تھا' یہ چلتی ہوئی اس مقام تک پہنچی جسے "قرین الارنب" کہتے تھے اور جو اُحد کے قریب تھا۔ وہاں پہنچ کر رُک گئی' بجھی اور دوسری طرف چلی گئی۔ انتھٰی۔

اس آگ کے فائدے کیا تھے؟

تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس آگ نے شروع ہوتے ہی پتھروں اور پہاڑوں کو کھانا شروع کر دیا' یہ اس وادی میں تیز سیلاب کی طرح چلتی تھی جس کی لمبائی چار فرسخ (بارہ میل' اٹھارہ کلومیٹر)' چوڑائی چار میل اور گہرائی ڈیڑھ قد آدم جتنی تھی تقریباً (سات آٹھ فٹ)۔ یہ زمین کے اوپر چلتی تھی' اس کی تپش سے پتھریوں پگھلتے تھے جیسے سکہ اور قلعی۔ آگ کا یہ سیلاب ختم گیا تو سرخی کے بعد سیاہ رنگت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ پگھلے ہوئے پتھر وادی کے آخر میں حرہ کی انتہاء تک جمع ہوتے رہے اور آخر کار وعیرہ پہاڑ کی طرف وادیٔ شظاۃ کے وسط میں ٹوٹ پھوٹ گئے چنانچہ یہ وادی آگ سے پگھلے پتھروں کی دیوار بن جانے کی بناء پر بھر گئی یہ دیوار' دیوارِ ذوالقرنین جیسی نہ تھی' اسے کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا نہ ہی کوئی انسان اور چوپایہ اس میں چلنے کی طاقت رکھتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آگ بھیجنے کا (دیوار بن جانا) بڑا فائدہ ہوا کیونکہ رات کے وقت اس طرف بہت سارے فسادی آیا کرتے تھے کیونکہ وہاں عربوں کی کثیر تعداد موجود تھی چنانچہ مدینہ جانے میں انہیں سخت دشواری پیش آتی تھی۔

علامہ قسطلانی کہتے ہیں' مجھے بہت سے ان لوگوں نے اس بارے میں بتایا جو یہ کہتے تھے کہ اس آگ نے اصل زمین پر اس قدر پتھر چھوڑے جو اونچائی میں لمبے نیزے جتنے تھے۔

تاریخ دان کہتے ہیں کہ وادیٔ شظاۃ اسی کی وجہ سے بند ہو گئی تھی اور یہ سیلاب جب بہتا تو اس دیوار کے پیچھے آ کر بند ہو جاتا اور یوں دریا کی شکل بنا لیتا پھر لمبائی چوڑائی میں حد نگاہ تک دکھائی دیتا چنانچہ پانی کی کثرت کی بناء پر ۶۹۰ھ ہجری میں یہ نیچے سے پھٹ گئی تھی' یہ پانی وہاں پورے دو سال تک چلتا رہا۔ پہلے سال تو اس نے وادی کے دونوں کنارے بھر دئے تھے لیکن دوسرے سال یہ پانی کم ہو گیا۔ پھر دوبارہ ۷۰۰ ہجری کے پہلے عشرے میں پورا سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک چلتا رہا پھر تیسری مرتبہ ۷۳۴ ہجری کو اس میں شگاف پڑا کیونکہ اس وقت بھی حجاز میں بہت بارشیں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے پانی دیوار کی دونوں جانب بلند ہو گیا تھا اور اس کی نچلی طرف وعیرہ پہاڑ اور اردگرد سے جا لگا تھا چنانچہ ناقابلِ بیان سیلاب آیا' اگر یہ سیلاب ہاتھ بھر اونچا ہو جاتا تو پانی مدینہ تک پہنچ جاتا۔ اہلِ مدینہ بقیع کے باہر دروازے پر کھڑے ہو جاتے اور وہاں موجود ٹیلے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہتے اور اس کی ایسی آواز سنتے جو دلوں کو گھبرا دیا کرتی۔ اللہ پاک ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

آگ والے سال میں رونما ہونے والے واقعات

یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ جس سال یہ آگ دکھائی' اسی سال مسجد نبوی میں بھی آگ لگ گئی اور وہ جل گئی تھی لیکن وہ آگ اس وقت بجھ چکی تھی جیسے آگے آ رہا ہے' ادھر دجلہ میں بہت سیلاب آیا تھا جس نے بغداد کا اکثر حصہ ڈبو دیا اور وزیرِ بغداد کا گھر بھی گر گیا تھا' یہ بھی انہیں ڈرانے کے لئے تھا تا کہ کسی طرح سنور جائیں پھر اگلے ہی سال میں ایک اور بڑی مصیبت پڑی کہ تاتاریوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا' خلیفہ معتصم قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد عام مسلمانوں کو قتل کیا گیا چنانچہ یہاں تیس سے کچھ زائد دنوں تک تلوار چلتی رہی' کتب خانے نکال لئے گئے جنہیں گھوڑوں کے پاؤں تلے روند ڈالا تھا اور دیکھنے میں آیا کہ جانوروں کو چارہ ڈالنے کی جگہ تعمیر کرتے وقت کچی اینٹوں کی جگہ کتابیں استعمال کی گئیں' بغداد خالی ہو گیا اور سعید ذھلی کے مطابق بغداد کو آگ نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا' دارالخلافہ جل گیا' آگ بے شمار گھروں تک پھیل گئی' "قصور برانیہ" اور خلفاء کے قبرستان "ترب الرصافہ" کو جلا دیا' ایک قبر پر یہ شعر لکھا دیکھا گیا:

"تم بطور عبرت دیکھنا چاہتے ہو تو بنوعباس کی ان قبروں کو دیکھو جن پر قیامت گذر گئی۔ شریف عورتوں کو حلال سمجھ لیا گیا کیونکہ زندہ لوگوں کو توقتل کر دیا گیا تھا جبکہ مرے لوگوں کو جلا دیا گیا۔"

اس کے بغداد میں اکثر لوگ مر گئے اور وہ فنا ہو گیا اور اسی سال خلافتِ بنوعباس کا کام تمام کر دیا گیا یہ اللہ کی مرضی' جو چاہے' کرے۔

ایک شاعر نے آگ دکھائی دینے اور بغداد کے غرق ہو جانے کا حال بیان کیا ہے' ابو شامہ نے یہ تنبیہ کی ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی سال میں ہوئے تھے' چنانچہ کہا:

"اللہ پاک ذات ہے' مخلوق میں ایک اندازے کے مطابق اسی کی مرضی چلتی ہے' جس سال عراق (بغداد) غرق ہوا' یقیناً اسی سال حجاز کی سرزمین جل گئی تھی۔"

اس آگ سے متعلق دیگر معلومات

علامہ مجد کہتے ہیں' اس آگ اور اس سے ملتا جلتا واقعہ وہ ہے جسے ابن جبیر نے بیان کیا ہے' انہوں نے بتایا کہ میں نے ان واقعات کی اطلاع دینے والے کو دیکھا تھا جس نے بتایا کہ بحیرہ روم میں دو جزیرے ہیں جن سے آگ ہمیشہ نکلتی رہتی ہے۔ اس نے بتایا: ہم نے وہاں سے دھواں اُٹھتے دیکھا' رات کے وقت سرخ آگ دکھائی دیتی جس کی باقاعدہ زبانیں تھیں اور وہ فضا میں چڑھ جاتی۔ وہ کہتے ہیں' ہمیں بتایا گیا کہ یہ آگ دو پہاڑوں کے درمیان سے نکلتی ہے جن سے آگ کا شدید قسم کا شعلہ بلند ہوتا تھا' کئی مرتبہ اس میں پتھر پھینکا گیا تو اس نے اسے سیاہ کر کے زور سے ہوا میں پھینک دیا' اس کی گہرائی کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔

علامہ مجد نے مزید بتایا کہ جزیرہ میں ابھرا ہوا پتھر' جسے ''جبل النار'' کہتے ہیں' بھی عجیب تھا ایک سال اس سے آگ نکلی گویا ایک سیلاب تھی' وہ جہاں سے بھی گذرتی ' جلا دیتی اور آخرکار سمندر تک جا پہنچی اور پھر پانی پر تیرتی چلی جاتی اور دور جا کر بجھ جاتی۔

خالد بن سنان عبسی کا واقعہ

میں بتاتا چلوں' قریب قریب اس آگ سے ملتا جلتا ایک واقعہ وہ ہے جسے ابن شبہ نے ''اخبارِ مدینہ'' میں ذکر کیا ہے (یہ واقعہ انہوں نے خالد بن سنان عبسی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے' رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کی بیٹی آئی تو آپ نے فرمایا: یہ اس نبی کی بیٹی ہے جس کی قوم نے اسے ذلیل کر دیا تھا) چنانچہ ابن شبہ کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''سرزمینِ حجاز میں ایک آگ جلتی تھی جسے ''نار الحدثان'' (بنوعبس کی زمین میں پتھر ملا علاقہ) کہتے تھے' وہ اپنی روشنی کی وجہ سے اونٹوں کی آنکھوں کو آٹھ راتوں کی مسافت سے چندھیا دیتی تھی' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس سے ایک گردن نکلتی اور زمین پر جا کر ہر شے کو کھا جاتی ' پھر واپس اپنے مقام پر پہنچ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف خالد بن سنان کو بھیجا' اس نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس آگ کو بجھا دوں جس نے تمہیں تکلیف میں ڈال رکھا ہے لہٰذا ہر قبیلہ میں سے ایک آدمی میرے ساتھ آؤ' یہ انہیں لیکر نکلے اور آگ کے قریب جا پہنچے پھر اس کے آگے ایک لکیر کھینچ دی اور کہا خبردار! اس سے آگے کوئی نہ نکلے ورنہ یہ جلا دے گی' میرا نام نہ لے کہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر انہوں نے آگ کو مارنا شروع کر دیا' ساتھ یہ کہتے تھے کہ ''بکھر جاؤ کل هدی للّٰه مودّا'' چنانچہ وہ جہاں سے چلی تھی' وہیں پہنچ گئی' پھر وہ آگ کے پیچھے چلے اور حرہ کے درمیان اس جگہ جا پہنچے جہاں سے یہ نکل رہی تھی' چنانچہ خالد اس میں اُتر گئے۔

''درۃ الغواص'' میں ہے' دیکھا تو وہ کتوں کے پاس تھے جو اس آگ کے نیچے تھے' انہوں نے انہیں پتھر مارے اور آگ کو بھی مارا اور آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں آگ بجھا دی۔

لوگوں کے ہمراہ ان کا ایک چچا زاد تھا' اس نے کہنا شروع کر دیا کہ خالد تو ہلاک ہو گئے' اس پر خالد باہر نکلے تو ان پر دو چادریں تھیں جو پسینہ سے شرابور تھیں' انہوں نے کہا کہ ابن راعیہ مَعزی نے جھوٹ بولا تھا' بخدا میں نے اسے نکال دیا اور میرے کپڑے بھیگ گئے چنانچہ آج تک انہیں اس خالد کے ''بنی'' کہا جاتا ہے (بنو راعیہ معزیٰ)۔

ایک اور روایت ہے کہ ان کی قوم پر ''حرۃ النار'' سے خیبر کی طرف آگ آ گئی' لوگ اس آگ کے درمیان گھر گئے' وہ دونوں طرف سے آئی تھی جس سے لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ آگ حرہ کے پہاڑ کے شگاف سے نکلی تھی جسے ''حرۂ اشجع'' کہا جاتا تھا' خالد نے انہیں کہا کہ میرے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دو' آج میں اسے مکمل طور پر بجھا دوں گا چنانچہ ان کے ساتھ بھیڑ بکریوں کا چرواہا چل پڑا' وہ راعیہ کا بیٹا تھا' وہ اس مقام پر گئے جہاں سے آگ نکلی تھی۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ وہ آگ ایک کنوئیں سے نکل رہی تھی' پھر خالد نے چرواہے سے کہا' یہ میرے کپڑے پکڑے رکھو اور خود غار میں داخل ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے لوگوں میں چل کر آگ کے پاس آئے تھے اور ان سے کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے تو میرا نام لے کر آواز نہ دینا چنانچہ وہ آگ وہاں یوں نکلی جیسے سرخ گھوڑے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں۔ خالد اس کے آگے آگئے اور اسے ڈنڈے سے مارنا شروع کر دیا اور یہ الفاظ پڑھے: هَدْيًا هَدْيًا كُلٌّ نَهب مُؤدي' ابن راعیہ معزّی نے گمان کیا کہ میں گیلے کپڑوں میں نہ نکلوں گا حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ گھاٹی میں چلے گئے اور کچھ دیر کر دی' ایک شخص بولا: اگر خالد زندہ ہوتے تو لازماً نکل آتے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ہمیں اس بات سے روک رکھا ہے کہ ان کا نام لے کر آواز دیں۔ ابن راعیہ نے کہا کہ ان کا نام لے کر آواز دو' بخدا اگر وہ زندہ ہوتے تو اب تک نکل کر تمہارے پاس ہوتے۔ آخرکار انہوں نے اس کا نام لے کر آواز دی' وہ باہر نکلے تو سر تھام رکھا تھا' کہنے لگے: کیا میں نے تمہیں نام لے کر بلانے سے منع نہ کیا تھا؟ بخدا یقیناً تم نے مجھے قتل کر دیا ہے' بس مجھے اُٹھاؤ اور دفن کر دو اور جب تمہارے ہاں سے گدھے نکلیں گے تو ان کے ساتھ ایک دم کٹا گدھا ہو گا۔

ایک اور روایت میں یوں ہے: جب تم مجھے دفن کر دو اور تین دن گذر جائیں تو میری قبر پر آنا اور جب تمہارے سامنے کچھ گدھے آ جائیں اور ان کے آگے ایک گدھا ہو تو میری قبر کھول دینا کیونکہ میں کھڑا ہو جاؤں گا اور تمہیں قیامت تک ہونے والے واقعات کی خبر دے دوں گا چنانچہ وہ تین دن گذرنے پر اس کی قبر پر پہنچے اور گدھے ان کے سامنے آ گئے تو ارادہ کیا کہ قبر کھولتے ہیں لیکن ان کے گھر والوں میں سے کچھ نے اس بات سے منع کر دیا اور کہا: ہم تمہیں قبر کھودنے پر معاف نہیں کریں گے' یہ ہماری عزت کا سوال ہے' ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: یہ ہمارے لئے گالی بن جائے گی' چنانچہ انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔

ایک روایت میں خلید عبسی اپنے والد سے بیان کرتے ہیں' انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے خالد بن سنان کو اپنی قوم بنو عبس کی طرف نبی بنا کر بھیجا جنہوں نے انہیں دعوتِ اسلام دی لیکن انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ قیس بن زہیر نے کہا: اگر تم ہمارے لئے دعا کرو اور یہ حرہ ہمارے لئے آگ بہائے تو ہم تمہاری اتباع کریں گے کیونکہ تم ہمیں آگ سے ڈراتے ہو اور اگر آگ نہیں بہے گی تو ہم تمہیں جھوٹا کہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات تمہارے اور میرے درمیان ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے وضو کیا اور کہا: "اے اللہ! میری قوم مجھے جھٹلانے والی ہے' یہ میری رسالت پر ایمان نہیں لا رہے جب تک تو ان کے لئے حرہ میں آگ نہیں چلائے گا لہٰذا تو ان کے لئے یہاں آگ بہا دے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سیلاب ان کے لئے کن کھجورا کے سر کی طرح ابھرا پھر بڑا ہوا اور پورے میل میں پھیل گیا اور ان کے لئے بہہ نکلا۔ وہ کہنے لگے' اے خالد! اسے واپس کر دے کیونکہ ہم تم پر ایمان لاتے ہیں چنانچہ انہوں نے ڈنڈا پکڑا اور تین راتوں کے بعد اس کے سامنے آئے' اس میں داخل ہوئے اور ڈنڈے سے مارا پھر مارتے رہے اور واپس ہٹا

دی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ربذہ اور اس کے درمیان تین راتوں تک اونٹوں کو اس کی روشنی میں چراتے رہے۔

تمیم داری رحمۃ اللہ کی ایک کرامت

خالد کے بارے میں ابن شبہ نے ان کی قوم سے متعلق کئی اور خبریں بھی دی ہیں اور بیہقی نے دلائل النبوہ میں ''باب تمیم داری کی ظاہر ہونے والی کرامت جس میں حضور ﷺ کی عظمت اور آپ پر ایمان لانے والے لوگوں کے نام کی شان پائی جاتی ہے۔'' حضرت معاویہ بن حرمان اپنے مدینہ میں آنے کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا تھا: مومنوں میں سے بہتر کے پاس جاؤ اور اس کے پاس ٹھہرو۔ پھر بتایا: ایک دن حرہ کے مقام پر آگ دکھائی دی' حضرت عمر تمیم داری کے پاس پہنچے اور فرمایا: اس آگ کا انتظام کرو۔ انہوں نے عرض کی' اے امیر المؤمنین! میں کون ہوتا ہوں اور میری حیثیت کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اصرار کرتے رہے اور آخر کار وہ ان کے ساتھ چل پڑے' یہ کہتے ہیں کہ میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا' وہ آگ کے پاس چلے گئے۔ حضرت تمیم آگ کو ہاتھوں سے ہانکنے لگے' آخر کار وہ ایک گھاٹی میں چلی گئی' آپ بھی اس کے پیچھے داخل ہو گئے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دیکھنے والا ایسے شخص کی طرح نہیں ہوتا جس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔'' تین مرتبہ فرمایا۔

تیسرا باب

مدینہ کے قدیم باشندے، آمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، واقعاتِ ہجرت

اس کی بارہ فصلیں ہیں۔

فصل نمبر۱

طوفان نوح کے بعد یہاں کے باشندے، یہود کیونکر آئے، ان کے گھر اور عبیل کا یثرب میں داخلہ۔

حضرت کلبی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بتایا کہ کشتی نوح سے نکلنے والے لوگ بابل کی ایک طرف اُترے، یہ اسّی افراد تھے لہٰذا اس جگہ کا نام ''سوق الثمانین'' پڑ گیا۔

کہتے ہیں کہ بابل کی لمبائی دس دن کی مسافت اور بارہ فرسخ تھی۔ یہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور ان کی کثرت ہو گئی، نمروذ بن کنعان بن حام ان کا بادشاہ بن گیا، جب یہ بہت ہو گئے تو بکھر گئے اور یوں بہتر قسم کی بولیاں بولنے لگے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے مندرجہ ذیل لوگوں کو عربی زبان سکھائی:

عملیق، طسم (لوذا بن سام کے بیٹے)، عاد، عبیل (عوص بن ارم بن سام کے بیٹے)، ثمود، جدیس (جاثق بن ارم بن سام کے بیٹے)، قنطور بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام۔

چنانچہ عبیل والے تو یثرب میں ٹھہرے، یثرب، ابن عبیل کا نام تھا پھر انہیں یہاں سے نکال دیا گیا تو یہ جحفہ میں جا ٹھہرے کیونکہ یہاں سیلاب آیا تھا جو انہیں بہا کر لے گیا تھا چنانچہ اس کا نام جحفہ رکھ دیا گیا۔ انہی میں سے ایک شخص نے بہہ جانے والوں کا مرثیہ لکھا:

''جودی پہاڑ کی آنکھ عبیل پر تھی، کیا مرنے والا وہ شخص واپس آیا کرتا ہے جس کی سفیدی سیاہی سے بدل جائے؟ انہوں نے یثرب کو آباد کیا، وہاں نہ تو پلپک کا درخت تھا، نہ کوئی چیخنے والا اور نہ ہی کوہان والا تھا۔ یہاں کی نرم زمین میں انہوں نے پانی کا انتظام کیا اور کثرت سے کھجور کے درخت لگا دیئے۔''

یثرب کا پہلا رہائشی

ابو القاسم زجاجی کہتے ہیں: لوگ بکھرے تو سب سے پہلے مدینہ میں آباد ہونے والا یثرب بن قاینہ بن مہلائیل بن ارم بن عبیل بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام تھا، اسی وجہ سے اس کا نام یثرب رکھا گیا۔

عمالیق کی مدینہ میں رہائش

علامہ یاقوت حموی کہتے ہیں: مدینہ میں سب سے پہلے کھیتی باڑی کرنے والے، جس نے کھجور کے درخت لگائے،

گھر بنائے اور ٹیلے تیار کئے اور ساز و سامان تیار کیا' یہ عمالیق تھے۔ یہ لوگ عملاق بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ یہ عمالیق کئی شہروں میں پھیل چکے تھے' وہ دو بحیروں' عمان اور حجاز تا شام و مصر میں بسیرا کئے ہوئے تھے' شام کے جبابرہ اور مصر کے فراعنہ (ظالم حکمران) انہی عمالیق میں سے تھے۔ ان لوگوں کا ایک گروہ بحرین و عمان میں رہتا تھا جسے ''جاسم'' کہتے تھے' ان میں سے بنو ھف اور بنو مطرویل مدینہ میں رہتے تھے' ان سب عمالیق کا بادشاہ الارقم بن الارقم تھا جو حجاز میں رہتا تھا۔

یہودیوں کا مدینہ میں داخلہ

علامہ رزین کے مطابق ابو المنذر رشرقی کہتے ہیں کہ میں نے سلیمان بن عبد اللہ بن حنظلہ غسیل سے مدینہ کی بنیاد کے بارے میں سنا اور اس حدیث کا کچھ حصہ قریش کے ایک آدمی سے سنا جنہوں نے ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم سے سنا تھا اور چونکہ دونوں کی حدیثوں میں زیادہ تر اتفاق اور اختلاف کم تھا تو میں نے ان دونوں کو جمع کر دیا' دونوں نے بتایا: ہمیں معلوم ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حج کیا تو ان کے ہمراہ بنو اسرائیل کے کچھ لوگوں نے بھی حج کیا تھا اور جب ان کی واپسی کا پروگرام بنا تو وہ مدینہ پہنچ گئے' یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ اس نبی کا شہر ہے جن کا ذکرِ خیر تورات میں یوں آیا ہے کہ وہ خاتم النبیین ہوں گے چنانچہ ان لوگوں میں سے کچھ نے یہ مشورہ کیا کہ وہ یہیں ٹھہر جاتے ہیں لہٰذا وہ بنو قینقاع کے گاؤں میں ٹھہر گئے پھر ان کے پاس عرب کے کچھ اور لوگ آ جمع ہوئے تو یہ اپنے پہلے دین پر آ گئے چنانچہ یہ وہ لوگ تھے جو مدینہ میں سب سے پہلے ٹھہرے تھے۔ کچھ تاریخ دانوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عمالقہ کے کچھ لوگ ان سے پہلے یہاں آباد ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں یہ بات درست ہے۔

مدینہ میں مقیم لوگوں سے حضرت داؤد علیہ السلام کی جنگ

ابن زبالہ نے اہلِ مدینہ کے بوڑھوں سے سن کر یہاں سب سے پہلے ٹھہرنے والوں کے ذکر سے اپنی کتاب شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا: ''قدیم زمانے میں صعل اور فالج نامی قبیلے مدینہ میں رہا کرتے تھے جن سے حضرت داؤد علیہ السلام نے جنگ کی تھی اور ان کی ایک ہزار کنواری عورتیں لے گئے تھے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کیڑے مسلط کر دئیے جو ان کی گردنوں میں پڑے تو وہ ہلاک ہو گئے' میدانوں اور پتھریلی جگہ پر انہی کی قبریں تھیں' جرف کی طرف یہی قبریں ہیں البتہ ان میں سے ایک عورت بچ رہی جس کا نام ''زھرہ'' تھا' وہ اکیلی یہاں رہتی تھی۔ اس نے ایک آدمی سے اجرت طے کر لی اور کسی دیگر مقام پر جانے کا فیصلہ کر لیا' ابھی سوار ہونے ہی لگی تھی کہ کیڑوں نے اس پر بھی حملہ کر دیا۔ اس سے کہا گیا' لگتا ہے کہ حضرت داؤد نے تجھے بھی پکڑ لیا ہے۔ اس نے کہا: اسی کیڑے کی وجہ سے میری قوم ہلاک ہوئی تھی پھر کہا کہ کچھ جسم محفوظ رہ جاتے ہیں' مال دفن ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ زھرہ اور رانون میں ہوتا ہے۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ ان کیڑوں نے اسے ہلاک کر دیا۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ حضرت داؤد علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے اور انہی کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے رہے۔

ابن نجار نے گذشتہ اس قول: ''تاریخ دان کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم غرق ہونے پر سب سے پہلی آباد ہونے والی قوم صعل اور فالج تھیں اور پھر مختصر طور پر قصہٴ داؤد کا ذکر ہے۔'' سے مراد یہی لوگ لئے ہیں۔

ابن نجار مزید لکھتے ہیں' مدینہ کے قدیم بوڑھوں نے بتایا تھا: یہاں ایک قوم اور بھی آباد تھی جنہیں بنو حنف' بنو مطر اور بنو الازرق کہا جاتا تھا' یہ لوگ مخیض سے غراب الضائلہ اور وہاں سے احد پہاڑ کی ایک طرف قصاصین تک پھیلے ہوئے تھے' ان کے آثار وہاں اب بھی موجود ہیں۔

ابن زبالہ نے جماء امّ خالد (وادیٔ عقیق) کا ذکر کرتے ہوئے عثمان بن عبد الرحمٰن سے روایت کی' انہوں نے بتایا کہ ''جماء'' میں ایک قبر دیکھی گئی جس پر پتھر رکھا تھا اور کوئی تحریر تھی' پتھر اتارا گیا تو ایک یمنی شخص نے اسے پڑھا اس میں لکھا تھا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ کے رسول سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا رسول ہوں جسے اہلِ یثرب کی طرف بھیجا گیا تھا اور میں اس وقت شمال کی طرف تھا۔''

ابن زبالہ نے عمر بن سلیم الزرقی کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ: ہم جماء پر چڑھے تو وہاں ہم نے حضرت ارمیاء علیہ السلام کی قبر دیکھی' اس کے قریب ہی سرہانے کی طرف دو پتھر پڑے تھے جن پر کچھ لکھا تھا جو پڑھا نہیں جا رہا تھا' ہم نے انہیں اُٹھا لیا' ان میں ایک زیادہ وزنی تھا لہٰذا اسے وہیں پھینکا اور دوسرا میں نے پکڑ لیا' وہ میرے ہی پاس رہا' میں نے اہلِ تورات یہودیوں کو دکھایا لیکن انہیں سمجھ نہ آسکا' پھر اہلِ انجیل نصرانیوں کو دکھایا تو وہ بھی نہ پڑھ سکے۔ یہ پتھر میرے پاس رہا تا آنکہ اہلِ ''ماہ'' میں سے دو آدمی مدینہ میں آئے' اس بارے میں ان سے پوچھا کہ تم اہل کتاب ہو؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ میں نے وہ پتھر ان کے سامنے رکھ دیا' انہوں نے پڑھا تو لکھا تھا: ''میں اللہ کا ایک بندہ اسود ہوں' اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے مجھے قرینہ والوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔''

پھر دونوں بولے: ''ہم قدیم دور میں یہاں رہا کرتے تھے۔'' اس سلسلے میں باقی بیان ساتویں باب کی چوتھی فصل میں آ رہا ہے۔

حجاز میں عمالیق کی تباہی

ابن زبالہ' حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھتے ہیں' انہوں نے کہا کہ عمالیق شہروں میں پھیل گئے تھے پھر مکہ' مدینہ اور پورے حجاز میں پھیل گئے' یہ بڑے سرکش تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون پر غلبہ عطا فرمایا تو انہوں نے شام پر چڑھائی کی اور وہاں کے لوگوں کو ہلاک کر دیا' یہ کنعانی لوگ تھے۔

کچھ کہتے ہیں کہ انہوں نے شام کی طرف ایک لشکر روانہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا پھر دوسرا لشکر

عمالیق کے لئے حجاز بھیجا اور حکم دیا کہ کسی سمجھدار پر پہل نہ کرنا' وہ لوگ چلے گئے' اللہ نے انہیں ان پر غلبہ دیا تو انہیں قتل کر دیا اور پھر ان کے بادشاہ ارقم بن ارقم تک پہنچے تو اسے بھی قتل کر دیا نیز اس کے خوبصورت جوان بیٹے کو قید کر لیا' قتل نہ کیا۔ کہنے لگے ہمیں تو حیاء آ رہی ہے' ہم اسے اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے جاتے ہیں اور ان کی رائے معلوم کرتے ہیں' وہ اسے اپنے ساتھ لے چلے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روح مبارک لشکر پہنچنے سے پہلے ہی قبض کر لی گئی۔ جب لوگوں کو ان کے آنے کا پتہ چلا تو استقبال کو آئے اور پوچھنے پر انہوں نے فتح کی خوشخبری دی' پھر بتایا کہ ہم نے اس نوجوان کے علاوہ ان کا کوئی نہیں چھوڑا کیونکہ اس جیسا خوبصورت نوجوان ہم نے کہیں نہیں دیکھا چنانچہ اسے اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس لئے لے آئے کہ ان کی رائے معلوم کر سکیں۔

اس پر یہودیوں نے کہا کہ یہ تمہاری غلطی ہے کیونکہ تم نے اپنے نبی کے حکم عدولی کی ہے' بخدا اب تم ہمارے شہروں میں کبھی بھی داخل نہ ہو سکو گے۔ اس پر لشکر والوں نے کہا: اگر تم نے ہمیں روک دیا ہے تو ہمارے لئے اس شہر سے بہتر اور کوئی شہر نہیں جس سے تم نکل آئے ہو۔

حجاز ان دنوں درختوں سے بھرا پڑا تھا اور پانی کی کوئی کمی نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ عمالقہ کے بعد یوں یہودی حجاز میں داخل ہو گئے۔

یہودی مدینہ میں کیونکر داخل ہوئے؟

روض الانف میں الوالفرج اصفہانی کا بیان ہے کہ یہودیوں کے مدینہ میں داخلے کا سبب یہ ہوا کہ سرزمین حجاز سے عمالقہ ان پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے' یہ لوگ یثرب اور جحفہ سے لے کر مکہ تک کے علاقے میں آباد تھے چنانچہ یہودیوں (بنو اسرائیل) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت کی انہوں نے عمالقہ کی طرف لشکر بھیجا۔ اتنا لکھ کر ابو الفرج نے بھی اگلی بات اسی طرح لکھی ہے اور پھر کہا کہ اس سے بہتر واقعہ وہ ہے جسے طبری نے بیان کیا ہے کہ بنو اسرائیل کا حجاز میں آنا اس وقت ہوا جب بخت نصر نے شام میں انہیں تباہ و برباد کر دیا اور بیت المقدس میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ انتہی۔

ایک عالم سے ابن النجار نے سن کر بتایا کہ ان کے علماء تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفات دیکھتے تھے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ آپ اس سرزمین میں تشریف لائیں گے جہاں دو حرّوں کے درمیان کھجور کے بہت درخت ہوں گے چنانچہ وہ ایسے مقام کی تلاش کرنے شام سے چلے تھے اور جب تیماء کو دیکھا کہ اس میں درخت بہت ہیں تو ایک گروہ وہیں ٹھہر گیا' انہوں نے سمجھا کہ یہ خیبر ہے تو وہیں مقیم ہو گئے جبکہ ان میں سے سردار اور اچھے لوگ چلتے رہے' جب یثرب کو دیکھا کہ وہاں شور اور پتھریلی زمین ہے اور درخت بھی بہت ہیں تو کہنے لگے کہ عربی نبی ﷺ کا جائے ہجرت یہی ہو گا چنانچہ قبیلہ نضیر بطحان میں ٹھہر گئے۔ اس کے بعد ابن النجار نے قریظہ و نضیر قبیلوں کے مذینیب اور مہزور

میں آنے کا ذکر کیا ہے۔

علامہ یاقوت نے ایک یہودی عالم سے سنا' ان کے حجاز میں داخلے کا سبب یہ ہوا کہ جب شاہ روم بنو اسرائیل اور ملک شام پر غالب آ گیا تو اس نے حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے رشتہ مانگا' ان کے دین میں یہ تھا کہ یہ نصرانیوں سے شادی نہیں کیا کرتے تھے چنانچہ بنو ہارون ڈر گئے چنانچہ اس کی طرف تحفے بھیجے اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی' وہ آیا تو انہوں نے اسے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا اور پھر بھاگ نکلے' حجاز جا پہنچے اور وہیں ٹھہر گئے۔

بنو قریظہ کا خیال ہے کہ جب رومی لوگ شام پر قابض ہو گئے تو قریظہ' نضیر اور هدل شام سے بھاگے اور حجاز میں موجود بنو اسرائیل کے پاس جانے کے لئے نکل پڑے۔شاہِ روم نے ان کی تلاش میں آدمی بھیجے لیکن انہوں نے رومیوں کو ناکام کر دیا چنانچہ وہ حجاز اور شام کے درمیان ''ثمد'' جا پہنچے اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے' اسی وجہ سے اس جگہ کا نام ''ثمد الروم'' پڑ گیا' یہ نام آج بھی معروف ہے۔خدا ہی جانے کہ ان میں سے کون سی کہانی صحیح ہے۔

ایک سیرت کے عالم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے پتہ چلا کہ جب بخت نصر کے آنے سے بنو اسرائیل بہت سی تکالیف پہنچیں اور وہ ذلیل و خوار ہو کر بکھر گئے' انہیں یہ بات معلوم تھی کہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ان کی کتاب میں بڑی تعریف موجود ہے پھر یہ بھی معلوم تھا کہ وہ انہی عرب بستیوں میں سے کھجوروں والے کسی مقام میں ٹھہریں گے لہٰذا جب وہ سرزمین شام سے چلے تو شام اور یمن کے درمیان موجود عربی بستیوں کو عبور کرتے گئے' انہوں نے یثرب کی نشانیاں دیکھیں تو کچھ لوگ وہاں ٹھہر گئے' وہ یہ اُمید لئے ہوئے تھے کہ حضرت محمد ﷺ سے ان کی ملاقات ہو گی تو ان کی اتباع کریں گے اور پھرتے پھراتے اہلِ تورات بنو ہارون میں سے ایک گروہ یثرب میں ٹھہر گیا' پھر وہ باپ قسم کے لوگ فوت ہو گئے' ان کا ایمان تھا کہ حضرت محمد ﷺ یہاں تشریف لائیں گے' اس لئے یہ لوگ اپنی اولادوں کو ابھارتے رہتے تھے کہ جب وہ آ جائیں تو ان کی اتباع کرنا' آخر ان کی اولادوں میں سے لوگوں نے آپ کا دور پا لیا تو آپ کا انکار کیا حالانکہ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔انہیں حسد یہ تھا کہ انصارِ مدینہ ان سے زیادہ حضور ﷺ کے قریب ہو گئے ہیں۔

ہم ابن زبالہ کے حوالے سے پہلے بتا چکے ہیں بنو اسرائیل کا لشکر حجاز کی طرف آ کر ٹھہر گیا تھا' اس کے بعد ابن زبالہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ جہاں ٹھکانہ ملا ٹھہرتے گئے' بہت سارے لوگ ''زھرہ'' میں رُکے جب کہ ان کی جائیدادیں ''سافلہ'' میں تھیں۔(زھرہ نرم زمین کو کہتے ہیں جو ''جُوّہ'' اور ''سافلہ'' کے درمیان وہاں واقع تھی جو قف کے قریب تھی) اور ان کے اکثر لوگ ایسے مقام پر ٹھہرے تھے جسے یثرب کہتے ہیں' جہاں سیلاب کا پانی جمع ہو جایا کرتا تھا اور جو زغابہ کے ساتھ ملتا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ یثرب بڑا طویل شور والا علاقہ تھا اور اس میں کچھ ایسی پسندیدہ چیزیں تھیں جس کے لئے مختلف شہروں سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے' وہ آتے جاتے اسّی سیاہ اونٹ دیکھتے تھے اور یہ اونٹ دوسرے رنگوں والے اونٹوں

سے علیحدہ تھے۔

پھر محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ ان کے بعد بنو قریظہ' بنو ھدل وعمرو (خزرج بن صریح بن سبط بن یسع بن سعد بن لاوی بن جبر بن نحام بن عاذر بن عیرز بن طھرون بن عمران علیہ السلام کے بیٹے) نضیر بن نحام بن خزرج بن صریح وغیرہ لوگ وہاں سے نکلے اور ان کے پیچھے چلتے ہوئے دو وادیوں پر عالیہ میں اُترے جنہیں مذینیب اور مہزور کہا جاتا تھا چنانچہ بنو نضیر تو مذینیب کے مقام پر آ ٹھہرے اور یہیں اپنی جائیدادیں بنا لیں چنانچہ یہ وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے (عالیہ میں) کنوئیں کھودے اور زمینیں آباد کیں۔ محمد بن کعب مزید بتاتے ہیں کہ ان کے بعد عرب کے کچھ قبیلے ان کے پاس آباد ہو گئے اور وہیں رہے' جائیدادیں بنائیں' قلعے تیار کئے اور مکانات تعمیر کر لئے۔

ابن زبالہ اور ابن شبہ نے ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ مرفوع روایت لکھی ہے کہ:

"حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام حج کرنے تشریف لائے تو مدینہ سے ان کا گذر ہوا' دونوں ہی یہودیوں سے خوفزدہ ہوئے' چھپ کر وہاں سے نکل گئے اور اُحد پر جا ٹھہرے۔ حضرت ہارون علیہ السلام یہیں وصال فرما گئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے' قبر کھودی اور لحد تیار کر دی پھر فرمایا: اے بھائی تمہیں تو موت آ چکی۔ یہ سن کر حضرت ہارون علیہ السلام اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی لحد میں اتر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر مٹی ڈال دی۔"

میں کہتا ہوں کہ ابن شبہ کی سند میں کوئی الجھن نہیں البتہ انہوں نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے جس کا نام نہیں بتایا لیکن ابن زبالہ ان کی اس سند پر اعتماد نہیں کرتے۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہودی یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں داخل ہوئے تھے اور آپ کی حیات تک وہیں تھے' اسی لئے وہ واقعہ پیش آیا کہ وہاں سے گذرتے وقت ان سے ڈرے تھے۔ یہ بات اسی صورت میں سچی ثابت ہوتی ہے جب اس کی بنیاد گذشتہ واقعہ بنایا جائے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حج کے لئے آئے اور ان کے ساتھ بنو اسرائیل کے کچھ لوگ بھی تھے تو انہوں نے مدینہ کی اس جگہ میں حضور خاتم النبیین ﷺ کے شہر ہونے کی نشانیاں دیکھیں چنانچہ آپس میں مشورہ کیا کہ کچھ لوگ یہاں ٹھہر جائیں اور جو واقعہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے پیش آیا وہ ان کے دوسرے حج سے تعلق رکھتا ہے جو انہوں نے بعد میں کیا تھا۔

پھر روحاء کے مقام پر "عرق الظبیۃ" نامی مسجد کے بارے میں یہ حدیث ملتی ہے کہ:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام حج وعمرہ کے لئے بنو اسرائیل کے ستر ہزار لوگوں کو لے کر یہاں سے گذرے تھے۔"

ابن حجر نے اس مقام پر ایک غریب روایت عبد الملک بن یوسف کی "کتاب الانواء" کے حوالے سے لکھی ہے کہ: "بنو قریظہ کا خیال یہ تھا کہ وہ اللہ کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔" یہ صرف ایک خیال ہی ہے

کیونکہ حضرت شعیب علیہ السلام کا تعلق تو بنو جذام سے تھا جو ایک مشہور قبیلہ تھا (ابن حجر اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بات بہت دور کی ہے)۔

علاوہ ازیں ابن زبالہ نے جو کچھ لکھا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ: عربوں کے جو لوگ انصار کے آنے سے پہلے یہودیوں کے ساتھ تھے' وہ بنو انیف تھے' یہ "بلی" کا ایک قبیلہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ بنو انیف عمالقہ کے ہی بچے کھچے لوگ تھے پھر بنو مرید "بلی" ہی کا ایک قبیلہ تھا پھر بنو معاویہ بن حارث بن بہثہ بن سلیم اور بنو جذماء' یمن کا ایک قبیلہ تھا پھر یہاں کے قلعے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے لئے تھے اور ان کے وہ ہتھیار تھے جن کی بناء پر وہ دشمن سے حفاظت میں تھے۔ پھر وہ حدیث ذکر کی ہے جس میں مدینہ کے قلعے گرانے سے روکا گیا ہے۔ پھر کہا کہ قباء میں بنو انیف کا لاوہ کے کنوئیں کے قریب ایک بھدّی آواز والا شخص رہتا تھا نیز دو قلعے بھی تھے جو ماشہ اور قائم نامی زمینوں کے درمیان تھے اور کچھ قلعے عذق نامی کنوئیں کے قریب تھے۔ ان کے شاعر نے کہا تھا:

"اگر کبھی قباء بولے تو وہ بتائے گی کہ ہم تو یہاں عاد اور تبع سے بھی پہلے آباد تھے۔"

مدینہ میں یہودیوں کے باقی لوگ

یہودیوں کے جو لوگ مدینہ میں باقی رہ گئے تھے (جب ان پر اوس وخزرج نے حملہ کیا تھا) وہ کافی تھے' ان میں سے بنو قصیص اور بنو ناغصہ' قباء میں بنو انیف کے ساتھ تھے اور قباء میں یہودیوں کا ایک آدمی تھا' کہتے ہیں کہ وہ بنو نضیر میں سے تھا' اس کے کچھ قلعے تھے اور اسے "عاصم" کہتے تھے' وہ شخص ثوبہ بن حصین بن سائب بن ابولبابہ کے گھر میں رہتا تھا اور اسی جگہ وہ کنواں بھی تھا جسے قباء کہا جاتا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بنو ناغصہ' یمن کا ایک قبیلہ تھا' ان کے گھر شعبِ بنی حرام میں تھے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انہوں نے ان کو مسجد فتح کی طرف منتقل کر دیا' انہی میں بنو قریظہ بھی تھے جو ان کے اس گھر میں رہتے تھے جو آج کل ان کے نام سے مشہور ہے' ان کے بھی وہاں قلعے تھے جن میں سے ایک قلعہ زبیر بن باطا قرظی کا تھا' وہ بنو قریضہ کی مسجد میں واقع تھا پھر کعب بن اسد کا قلعہ بھی تھا۔ اسے بلحان کہتے تھے کیونکہ اس کے پاس بہت سے درخت تھے' ایک شاعر نے اسی کے بارے میں کہا تھا:

"جسے تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی چاہیے تو بلحان کے بزرگ لوگوں کے پاس آئے۔"

بنو قریظہ کے ساتھ ان کے گھر میں ان کے بھائی بنو ھدل اور بنو عمرو تھے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے' اس شخص کو ھدل اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس کا ہونٹ لٹکا ہوا تھا' اس کی اولاد میں سے ثعلبہ و اسد تھے جو سعیہ کی اولاد تھے' پھر اسد بن عبید' رفاعہ بن سموأل' سخیت اور منبّہ ھدل کے بیٹے تھے' انہی میں سے بنو نضیر تھے جو نواعم میں تھے نیز انہی میں سے کعب بن اشرف تھے' ان کے بہت سارے قلعے تھے جو فاضجہ میں واقع تھے پھر زقاق حارث کا قلعہ تھا' پھر بویلہ کا

قلعہ تھا' یہ سب۔ کچھ ابن زبالہ نے لکھا ہے اور ابن عساکر نے واقدی سے لے کر بتایا کہ انہوں نے کہا: بنونضیر کے مکان غرس کی ایک جانب پر تھے۔

میں کہتا ہوں کہ بنونضیر ''نواعم'' میں تھے جن کے مکانات اور اراضی غرس اور صافیہ کی جانب تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کی وہ زمینیں تھیں جو حقداروں میں صدقہ کی جاتی تھیں پھر ان کے کچھ مکانات ''جفاف'' میں تھے کیونکہ ''فاضجہ'' وہیں واقع تھا۔

(مصنف) میں نے نواعم کی مشرقی جانب پتھریلی زمین میں قلعوں کے آثار دیکھے ہیں اور پھر مذینیب کے پاس ایک بستی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی انہی کے مکانات پر مشتمل تھی پھر اس کے قبلہ کی طرف ''عہن'' کے مشرق میں بنوامیہ بن زید کے مکانات تھے جیسے آگے بتایا جا رہا ہے۔

انہی میں سے بنومرید تھے جو بنوخطمہ سے تھے اور ناعمہ میں ابراہیم بن ہشام تھے' ان کے بھی کچھ ٹیلے تھے جن کی وجہ سے یہ جانے جاتے تھے' اس میں ایک کنواں تھا پھر انہی میں بنوامیہ بن زید سے بنومعاویہ تھے اور انہی میں سے بنوماسکہ تھے جو مروان بن حکم کے صدقہ کی زمین کے قریب تھے' یہ زمین حضور ﷺ کی صدقات والی زمین کے قریب تھی' ان کے دو قلعے بھی تھے جو بستی میں قف کے اندر تھے' انہی میں سے بنومحمم تھے' یہ اس مکان میں تھے جسے بنومحمم کا مکان کہتے تھے' ان کے پاس زمین تھی جسے خفافہ کہا جاتا تھا جو آج بھی مشہور ہے' ان میں سے ایک آدمی نے دورِ جاہلیت کے وقت ایک آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا تھا' ہاتھ کٹے شخص نے کاٹنے والے سے کہا تھا کہ مجھے کوئی پٹی دو جس سے میں ہاتھ باندھ لوں' اس نے انکار کر دیا تھا۔

انہی میں سے بنوزعورا تھے جو حضرت ابراہیم بن نبی کریم ﷺ کی والدہ کے نزدیک والے پانی کے کمرے میں تھے' ان کے پاس والے قلعے بنوزعورا ہی کے تھے اور وہ قلعے جو حجاف کی زمین میں تھے' وہاں موجود ایک یہودی کے تھے۔ انہی قبیلوں میں بنوزید اللاّ تھے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی قوم تھی' یہ بنوغصینہ کے قریب تھے۔ انہی میں سے بنوقینقاع تھے جو بطحان کی پل کے انتہاء میں وہاں رہتے تھے جو ''عالیہ'' سے ملتا تھا' وہاں مدینے کے بازاروں میں سے ایک بازار بھی تھا' ان کے بھی دو قلعے تھے' ان کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ پل کے آخر میں تھے' تم مدینہ سے عالیہ جا رہے ہو تو یہ پل گذر کر تمہاری دائیں طرف واقع تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ بنی قینقاع حضرت عبداللہ بن سلام کا قبیلہ تھا' یہ بات ابن زبالہ کی گذشتہ روایت کے خلاف ہے لیکن حضرت ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

انہی لوگوں میں بنوحجر تھے جو پل کے قریب پانی پینے کے کمرے کے قریب تھے' ان کے بھی کچھ قلعے تھے جن

سے ان کی پہچان ہوتی تھی۔

انہی میں بنوثعلبہ اور اھل زھرہ تھے جو زھرہ میں سے تھے' یہ فطیون کا قبیلہ تھا' یہ ان کا وہ بادشاہ تھا جو مدینہ میں ان عورتوں سے حرام زدگی کرتا تھا جو ابھی تک اپنے شوہروں کے پاس نہ گئی ہوتی تھیں' ان کے بھی دو قلعے تھے جو اس چوڑے راستے پر واقع تھے جہاں سے حرہ کے نیچے اترتے تھے۔اس زھرہ کے مقام پر بہت سے یہود آباد تھے' یہ مدینہ کی بستیوں میں سب سے بڑی تھی' یہ جنگل میں رہتے تھے۔

ان میں سے وہ لوگ بھی تھے جو جَــوَّانیہ کے مقام پر رہتے تھے۔یہ جگہ اُحد کے قریب ہے اور مدینہ کے شمال میں ہے جیسے آگے آ رہا ہے (ان کے دو اور قلعے بھی تھے جو بنو حارثہ بن حارث نے لے لئے تھے' دونوں کا نام صرار اور ریان تھا' اسی لئے نہیک بن سیاف نے کہا تھا:

"شاید صرار ہی ہے کہ جس کے کنوئیں بھرے رہتے ہیں اور ریان کے بارے میں سنتے ہیں کہ اس میں پانی پینے کی جگہیں بنائی جاتی ہیں۔"

پھر بنو حذماء (جن کا پہلے ذکر ہو چکا اور یہ یمنی تھے) بنوعبد الاشہل کے قبرستان اور ابن عراک کے محل کے درمیان رہتے تھے' پھر راتج کو منتقل ہو گئے۔

انہی میں سے بنوعکوہ تھے جو بنو حارثہ کی دائیں جانب تھے اور انہی میں سے بنومرابہ تھے جو بنو حارثہ کے شام والی جانب میں رہتے تھے' ان کا بھی قلعہ تھا جسے شبعان کہتے تھے' یہ ثمغ کے مقام پر تھا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صدقہ کا مال تھا۔

انہی میں سے کچھ لوگ راتج میں رہتے تھے' یہ وہ قلعہ تھا جسے ناحیہ کہا جاتا تھا۔

انہی میں وہ لوگ بھی تھے جو شوط' عنابس' والج اور زبالہ میں رہتے تھے جو فاطمہ کے چشمے تک پھیل گیا تھا اور وہاں رسول اللہ ﷺ کی مسجد تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں پکائی جاتی تھیں' ان اھل شوط کا ایک قلعہ تھا جسے شرعی کہا جاتا تھا' یہ ذباب سے چھوٹا تھا اور بنوجشم بن حارث بن خزرج کا ہو گیا تھا' یہ بنوجشم بنوعبد الاشہل کے بھائی تھے۔پھر اہلِ زبالہ کا بھی قلعہ تھا جو قناۃ سے جا ملتا تھا اور پھر وہاں کے ایک یہودی کے بھی دو قلعے تھے جنہیں بڑا شمار کیا جاتا تھا' ان کے سامنے وہ مسجد تھی جہاں اُحد کی طرف جاتے وقت رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔پھر اہلِ زبالہ کے دو قلعے تھے جو ابو الحمراء رابض کے چھوٹے کچے ٹیلے کے پاس تھے اور یہ دونوں سے نیچے تھا۔

انہی میں سے اھل یثرب تھے' یہ وہاں کے یہودیوں سے زیادہ تھے' یہ ہلاک ہو گئے تھے اور ان میں سے کوئی بھی نہ بچا تھا۔

میں کہتا ہوں' علامہ رزین نے علامہ شرقی سے نقل کیا ہے کہ یہودی بیس سے کچھ زیادہ قبیلے تھے' اور ان کے قلعے انسٹھ تھے' پھر انصار کے آنے سے پہلے عربوں کے آنے کے موقع پر ان کے تیرہ قلعے تھے۔ابن زبالہ نے ان میں سے

بہت کے نام ذکر کیے ہیں جنہیں ہم ذکر نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے زمانہ میں ان کی پہچان نہیں رہی۔

یہ ہے اوس وخزرج کے آنے سے پہلے اور حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد مدینہ میں رہنے والوں کا تعارف' (جسے ہم نے ذکر کر دیا ہے)۔

فصل نمبر۲

مدینہ میں انصار کے ٹھہرنے کا سبب'
مآرب کا واقعہ اور سیلِ عرم غسّان

ابن زبالہ وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ مدینہ میں یہودی ہمیشہ غالب رہے اور ان کا قبضہ رہا' یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ''سیل عرم'' کا معاملہ نہ ہوا' جس کے پانی کا قصہ اللہ نے بیان فرمایا ہے یعنی قصہَ اھل مآرب۔ یہ ''مآرب'' ملک سباء کی سرزمین تھی جو اللہ تعالیٰ کے قول بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ میں مذکور ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ ملک سب سے سرسبز اور ستھرا تھا (حالت یہ تھی کہ) ایک عورت گھر سے چلتی' سر پر ہاتھ سے بنا ہوا ٹوکرا ہوتا' وہ درختوں کے درمیان چلتی تو گرنے والے پھلوں سے بھر جاتا لیکن پھر وہ سرکش ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سبا کی طرف تیرہ نبی بھیجے تا کہ انہیں اللہ کی دعوت دیں اور اس کی نعمتیں بیان کرتے چلے جائیں لیکن انہوں نے ان انبیاء کو جھٹلا دیا اور کہا کہ ہم پر تو اللہ کی کوئی رحمت نہیں ہوئی۔

علامہ مسعودی کہتے ہیں کہ ان کا طول بلد دو ماہ کی مسافت سے زیادہ تھا جسے کوئی تیز رفتار سوار طے کیا کرتا ہے اور یونہی ان کا عرض بھی اتنا ہی تھا' وہاں کی آبادی بہت تھی اور وہ لوگ متحد تھے' طاقتور تھے اور پھر ایسے تھے جیسے اللہ نے ان کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ:

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً (سورۂ سبا:۱۸)

''اور ہم نے کیے تھے ان میں اور ان شہروں میں جن میں ہم نے برکت رکھی'' یعنی شام کے شہروں میں سرِ راہ کتنے شہر۔''

یعنی وہ شہر راستوں کے ساتھ تھے جن میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے چنانچہ وہ اپنے شہروں میں امن سے رہتے تھے' عورت گھر سے چلتی تو زادِ راہ نہ لیتی' ایک شہر میں سوتی اور دوسرے میں قیلولہ (دوپہر کا سونا) کرتی اور یونہی شام پہنچ جاتی' انہوں نے کہا:

رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (سورۂ سبا:۱۹)

''اے ہمارے رب! ہمارے سفر میں دُوری ڈال۔''

کیونکہ وہ نعمتوں پر تکبر کرتے تھے اور نعمتیں کھا کھا کر اُکتا چکے تھے' اس لئے کہا اگر ہمارے پھل دور ہوتے تو ہمیں ان کے کھانے کی خواہش ہوا کرتی' انہوں نے یہ تمنا کی کہ ان کے اور شام کے درمیان جنگل بنا دے تاکہ وہاں سواریوں پر جایا کریں اور کھانے پینے کو ساتھ لے جایا کریں' اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمالی جیسے فرمایا:

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۝ (سورۂ سبا:۱۹)

''تو ہم نے انہیں کہانیاں کر دیا اور انہیں پوری پریشانی سے پراگندہ کر دیا۔''

حضرت ضحاک کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے درمیانی وقت میں ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان پر شدید بارش کا سیلاب مسلط کر دیا۔ ''عرم'' شدید بارش کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں اندھے چوہوں کو مسلط کر دیا جنہوں نے ان کی دیوار میں سوراخ کر دیا' وہ دیوار ہر طرف سے ایک فرسخ تھی (تین میل) جسے لقمان اکبر عادی نے بنایا تھا' حالانکہ اپنی طرف سے اس نے اسے زندگی بھر کے لئے بنایا تھا' یمن کے پانی وہیں جمع ہوتے اور پھر نہروں نالوں کی صورت میں شہری ضرورتوں کے مطابق بکھر جاتے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے سبأ بن یشجب بن یعرب بن قحطان نے بنایا تھا اور اس سے ستر وادیاں چلائی تھیں لیکن وہ اسے مکمل کرنے سے پہلے فوت ہو گیا' بعد میں اسے حمیر کے بادشاہوں نے مکمل کیا تھا۔ حمیر بن سبأ اور کہلان بن سبأ کی اولاد اس وقت یمن کی سردار تھی' ان کا بڑا اور آقا مدینہ کے انصار کا دادا تھا' جس کا نام عمرو مزیقیاء بن عامر ماء السماء بن حارثہ بن امریٔ القیس بن ثعلبہ بن مازن بن ازد تھا' یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسد بن غوث بن نبت' بن مالک بن زید بن کہلان بن سبأ بن یشجب بن یعرب بن قحطان تھا۔ ان کا یہی نسب ابن ہشام' ابن حزم اور ابن الکلبی نے بھی بیان کیا ہے جیسے کہ ابن عبد البر نے نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مؤرخ نے حارثہ اور امریٔ القیس کے درمیان ثعلبہ کا نام بھی دیا ہے۔

انصار کہا کرتے تھے کہ عمرو کو مزیقیاء اس وجہ سے کہتے تھے کہ وہ روزانہ دو پوشاکیں پہنتا اور پھر اس بناء پر پھاڑ دیتا کہ کوئی اور اسے نہ پہن سکے۔ اس کے باپ کو ''ماء السماء'' اس کی سخاوت کی وجہ سے کہا جاتا تھا اور اس لئے بھی کہ قحط کے موقع پر وہ بارش جیسی سخاوت کرتا تھا۔

اس عمرو مزیقیاء کا ایک بھائی تھا جو کاہن اور بے اولاد تھا' نام عمران تھا' عمرو مزیقیاء کی بیوی کا نام طریفہ تھا جو قبیلۂ حمیر سے تھی' یہ بھی کاہنہ تھی' عمرو سے اس نے تیرہ بچے جنے' ثعلبہ کو اسی نے جنم دیا تھا اور یہی وہ شخص تھا جس نے اور جس کے بھائیوں نے جرہم کو مکہ سے نکالا تھا اور یہی وہ شخص تھا جو ازد میں سے الگ ہو کر اس کے پاس رہا تھا جیسے رزین نے نقل کیا ہے۔ علامہ رزین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ثعلبہ کا والد (عمرو بن عامر) ثعلبہ کے جرہم پر غالب آنے سے قبل ہی فوت ہو گیا تھا۔ یہی ثعلبہ' اوس و خزرج کا باپ تھا۔ طریفہ نے اس سے حارثہ کو بھی جنم دیا اور جیسے کہ آگے آ رہا ہے' یہ خزاعہ کا باپ تھا' دوسرے حضرات نے اور بھی لکھا ہے۔

اس عورت نے جفنہ کو بھی جنم دیا جو غسان کا والد تھا یہ سب ماء کے نام سے بلائے جاتے رہے اور اسی کے پاس رہے' اسے غسان کہتے تھے لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ بنو مازن بن ازد بن غوث تھے۔

اس نے ایک لڑکا وداعہ بھی جنا تھا نیز ابو حارثہ' حارث' عوف' کعب' مالک اور عمران کو بھی جنم دیا تھا' ان سب کی اولاد ہوئی لیکن باقی تین کی اولاد نہ ہو سکی۔

غسّان

ابن حزم کہتے ہیں کہ غسان یہ لوگ تھے: بنو حارث' جفنہ' مالک اور کعب جو عمرو مزیقیاء کے لڑکے تھے' یہ سب غسان کے حقیقی لڑکے تھے لیکن دوسری اولاد اس سے پانی نہیں پیا تھا (یہ حقیقی نہ تھی) چنانچہ غسان نہ تھے۔ عمرو بن عامر کے مآرب میں کئی محل تھے اور اتنی اراضی تھی کہ یہ اتنا کچھ کسی اور کے پاس نہ تھا۔

سیل العرم کی پہلی اطلاع

حضرت رزین نے لکھا ہے کہ سیلِ عرم (عظیم سیلاب) کے سلسلے میں مآرب کے مقام پر سب سے پہلا کام یہ ہوا تھا کہ عمران بن عامر نے اپنے علم کہانت سے دیکھا' اس کی قوم بکھیر دی جائے گی' ان کے سفروں میں دوری پیدا کر دی جائے گی اور ان کے شہر برباد کر دیئے جائیں گے' اس نے یہ بات اپنے بھائی عمرو بن عامر سے کی' وہ شش و پنج میں پڑ گیا' اسی دوران اس کی بیوی طریفہ ایک دن سوئی ہوئی تھی کہ اس نے خواب دیکھی' بادل ان کی ساری زمین پر چھا گیا ہے' اس سے وہ کانپ اٹھی اور سخت خوف زدہ ہو گئی' لوگوں نے اسے مطمئن کیا تو وہ کہنے لگی اے عمرو بن عامر! جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا ہے' اس نے تو میری نیند حرام کر دی ہے' میں نے ایک خوفناک اور کڑک والا بادل دیکھا ہے' وہ گھبرا دینے والا تھا جس شے پر اس کا سایہ پڑتا' وہ جلا کر رکھ دیتا اور اس کے بعد سخت خوف پیدا ہو جاتا۔ لوگوں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے مطمئن کیا تو وہ پرسکون ہو گئی۔

پھر عمرو بن عامر ایک باغ میں داخل ہوا' اس کے ہمراہ دو لونڈیاں بھی تھیں' طریفہ کو پتہ چلا تو وہ اس کے پیچھے گئی' وہ گھر سے نکلی تو راستے میں اسے تین چھچھوندریں دکھائی دیں جو اپنے پاؤں کے بل کھڑی تھیں اور ہاتھ آنکھوں پر رکھے تھے۔ طریفہ نے انہیں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی' وہ چھچھوندریں چلی گئیں تو وہ تیزی سے نکلی' جب وہ اس باغ کی ندی کے قریب پہنچی جس میں عمرو موجود تھا تو پانی سے ایک کچھوا نکلا اور راستے کے عین درمیان میں زمین پر بیٹھ گیا' یہ دیکھ کر اس نے پیچھے مڑنے کا ارادہ کیا' ہاتھ ہلانا دشوار ہو گیا تھا' پھر اپنے آپ پر مٹی ڈالی اور اس کا پیشاب نکل گیا۔ یہ دیکھ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی' اسی دوران وہ کچھوا پانی میں واپس چلا گیا تو وہ چلی اور اس باغ میں داخل ہوئی جہاں عمرو بن عامر موجود تھا' سورج سر پر آ چکا تھا اور گرمی زوروں پر تھی' درختوں کے پتے ہوا کے بغیر ہی کھڑکھڑا رہے تھے۔ وہ آگے گئی اور عمرو کے پاس جا پہنچی' اس نے دیکھ کر کہا: طریفہ آ جاؤ! وہ بولی: روشنی اور اندھیرے کی قسم' زمین

و آسمان کی قسم پانی گہرا ہو گا درخت تباہ ہو جائیں گے۔ یہ سن کر عمرو نے کہا: یہ تجھے کس نے بتایا ہے؟ کہنے لگی مجھے چھچھوندروں نے بتایا ہے کہ کئی سال سختی کے ہوں گے بیٹا باپ کو مارے گا' کچھوا ہو گا جو مٹی خوب اڑائے گا اور پیشاب کرے گا۔ میں نے درخت دیکھے کہ ہوا اور بارش کے بغیر ان کے پتے ہل رہے تھے' اس نے پوچھا' تم اسے کیا خیال کرتی ہو؟ اس نے کہا' غم میں مبتلا کر دینے والی مصیبت ہے' یہ تو بڑے بڑے مصائب ہیں۔ اس نے کہا: اگر ایسا ہے تو تیرے لئے مشکلات ہیں۔ کہنے لگی ہاں لیکن اس میں عمرو کا کوئی حصہ نہیں' اس کے پاس سیلاب آئے گا۔

یہ سن کر اس نے اپنے آپ کو زمین پر دے مارا اور کہا' جو کچھ تم نے بتایا ہے' ایک بہت بڑا معاملہ ہے' اس کے بعد یہ قلیل ہو گا اور قلیل کو لے لینا چھوڑنے سے بہتر ہے۔ عمرو نے کہا: یہ جو تم بتا رہی ہو' اس کی علامت کیا ہو گی؟ اس نے کہا: جب تمہیں یہ دکھائی دے کہ چوہا دیوار میں گڑھا کھود رہا ہے اور اپنے ہاتھوں سے پتھر ہٹائے جا رہا ہے تو جان لینا کہ یہ مصیبت آ گئی ہے۔

عمرو یہ سن کر دیوار (بند) کی طرف گیا' دیکھا تو ایک چوہا اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے پتھروں کو ہلائے جا رہا تھا جنہیں ازد کے شیر جیسے پچاس آدمی بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ وہاں سے وہ طریفہ کے پاس آیا اور سارا معاملہ بتایا۔

پھر اس عمرو نے ایک خواب دیکھی کہ یہ سیلاب آ کر رہے گا اور کہا گیا کہ اس کی نشانی یہ ہو گی کہ کھجوروں کے گھاٹ میں کنکر نظر آئیں گے۔ اس نے جا کر دیکھا تو پہچان لیا کہ ایسا ہو گیا ہے' اب اس کے شہر جلد برباد ہو جائیں گے لہٰذا اس نے یہ بات چھپائے رکھی اور عہد کر لیا کہ سرزمین سبأ کی خاطر وہ اپنی ہر شے فروخت کر دے گا پھر خود اپنے لڑکوں کو لے کر یہاں سے نکل جائے گا' پھر خیال آیا کہ لوگ اسے برا جانیں گے لہٰذا کوئی حیلہ تلاش کرنے لگا چنانچہ اونٹ ذبح کرنے کو کہا تو ذبح کر دیا گیا اور بکریاں بھی ذبح کر دی گئیں' بہت کھلا لنگر پکا دیا اور تمام اہلِ مآرب کو بلا لیا' ان میں ایک یتیم بھی تھا جسے اس نے پالا تھا اور اس کی شادی کر دی تھی' اسے بلا کر رازدارانہ طور پر سمجھایا کہ جب میں لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کر دوں تو تم میرے پہلو میں آ جانا اور کسی بات میں جھگڑا شروع کر دینا' مجھے ترکی بہ ترکی جواب دیتے جانا' میں تم سے جیسا سلوک کروں' ویسے ہی میرے ساتھ تمہیں کرنا ہو گا۔

اب عمرو نے اس سے کوئی بات کی' یتیم نے اس کا ویسا ہی جواب دیا' اس پر عمرو نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گالی دی' اس یتیم نے بھی ویسے ہی کیا' اس پر عمرو چلا اُٹھا کہ ہائے ذلّت' آج عمرو کا سارا غرور چور ہو گیا' عزت نہیں رہی' اس نے قسم کھا لی کہ اسے مار دوں گا' لوگوں نے منت سماجت کرنا شروع کر دی تو آخرکار اسے معاف کر دیا پھر کہنے لگا: بخدا میں ایسے شہر میں کبھی نہیں رہونگا جس میں مجھ سے یہ سلوک ہوا ہے' میں اپنا سارا سامان بیچ کر یہاں سے کوچ کر جاؤں گا' لوگوں نے اس کے غصے کو غنیمت جان کر سارا مال خرید لیا' زمین فروخت کر دی' اسے دیکھ کر ازد قبیلہ والوں نے بھی اپنی جائیداد بیچ ڈالی۔ جب کثرت سے بیچ ہو گئی تو لوگوں نے اس بات کو بُرا جانا اور خریدنے سے رُک گئے۔

جب عمرو کے پاس اپنے مال کی قیمت جمع ہو گئی تو اس نے شدید سیلاب کے بارے میں بتا دیا لہٰذا مآرب سے

بے شمار لوگ نکل پڑے، صرف وہی رہ گئے جن کی قسمت میں مرنا لکھا تھا۔
ابن ہشام نے بھی اپنی تاریخ میں ایسا ہی واقعہ لکھا ہے، کہا کہ ازد کہنے لگے، ہم عمرو بن عامر سے پیچھے نہیں ہٹیں گے لہٰذا انہوں نے اپنے مال بیچ دئے اور وہاں سے نکل پڑے۔ کہتے ہیں کہ طریفہ، ثعلبہ کی بیوی تھی اور یہ قصہ اسی کا ہے، اسی کی وجہ سے اس نے مال بیچ دیا تھا۔
علامہ یاقوت لکھتے ہیں کہ عمرو بن عامر شدید سیلاب سے پہلے مر گیا تھا اور یہ ریاست اس کے بھائی عمران بن عامر کاہن کے ہاتھ آ گئی تھی، وہ نامرد تھا اور بے اولاد تھا اور یہی وہ شخص تھا جس کا قصہ طریفہ کاہنہ سے تعلق رکھتا ہے، ایک دن اس کے پاس آئی اور کہنے لگی: اندھیرے اور روشنی کی قسم، زمین و آسمان کی قسم! تمہاری طرف دریا جتنا پانی ضرور آئے گا، وہ تمہاری زمین کو چھوڑ دے گا تو اس پر ہوا نہ چلے گی اور باقی قصہ بتایا اور اسی نے اپنے مال بیچنے کے لئے حیلہ کیا تھا کہ بھتیجے حارثہ سے کہا، لوگ میرے پاس اکٹھے ہو جائیں تو فوراً میں تمہیں کوئی گناہ کی بات کہوں گا اور جب میں تمہارے سر پر ڈنڈا ماروں گا تو میری طرف آ کر مجھے تھپڑ مار دینا۔ اس نے کہا، یہ کیونکر ممکن ہے کہ بھتیجا اپنے چچا کو تھپڑ مار دے۔ اس نے کہا، بیٹے! یہ تمہیں کرنا ہوگا کیونکہ اس میں تمہاری اور تمہاری قوم کی بہتری ہے اور پھر یہ کہانی پوری بتائی اور کہا کہ ان کے وہاں سے نکل جانے کے بعد لمبا چوڑا سیلاب آیا، چوہوں نے دیوار خراب کر رکھی تھی، پانی کے سامنے کوئی روکاوٹ نہیں رہی تھی چنانچہ سیلاب نے بے شمار شہر غرق کر دئے، تمام زمین میں کوئی شے باقی نہیں بچی تھی، صرف وہ کچھ بچا جو پہاڑوں پر تھا اور وہ مقامات بچے جو اس سے دور تھے مثلاً ذمار، حضر موت اور عدن، علاوہ ازیں ساز و سامان اور باغ وغیرہ برباد ہو گئے، یہ سیلاب ریت لے کر آیا اور اسے بچھا دیا، سیلاب دن بھر جاری رہا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سفر کا راستہ یوں لمبا کر دیا جیسے وہ چاہتے تھے۔

عمرو بن عامر نے اپنی قوم کو شہروں کے اوصاف بتائے

علامہ رزین لکھتے ہیں کہ عمرو بن عامر کاہن نے مآرب سے نکلتے وقت اپنی قوم سے کہا، میں شہروں کی وضاحت کرتا ہوں (جہاں جہاں تمہیں جانا ہوگا) پھر کہا: جو تم میں سے دور کا ارادہ رکھتا ہے، مضبوط اونٹ پاس ہیں اور ارادہ مضبوط ہے تو وہ مضبوط عمان محل کی طرف چلا جائے چنانچہ عمان میں ازد کے ہاں رہائش کر لی، پھر کہا: تم میں سے جو دور جانا نہیں چاہتا، اونٹ اتنے مضبوط نہیں، ارادہ بھی پکا نہیں تو وہ کرود کی گھاٹیوں میں چلا جائے (یہ ہمدان کی زمین تھی) یہاں جن لوگوں نے رہائش کی وہ بنو وداعہ بن عمرو بن عامر تھے، ان کا تعلق ہمدان سے ہو گیا۔ پھر کہا: تم میں سے جو بستیوں کی طرف کا ارادہ رکھتا ہے اور کمزور اونٹ رکھتا ہے، وہ شن کے مقام ''شی'' میں چلا جائے، یہ میدان میں تھا چنانچہ یہاں ازد شنوءہ نے ٹھکانا کیا۔ پھر کہا: جو مضبوط جلد اور نظر والا ہے اور زمانے کی مشکلات پر صبر کر سکتا ہے، وہ بطن مرّ میں چلا جائے، یہاں خزاعہ چلے گئے، پھر کہا: جو پہاڑی چٹانوں کی طرف جانا چاہتا ہے، وہ پتھریلی زمین کی طرف چلا جائے

جہاں کھجوریں عام ہیں چنانچہ اوس وخزرج وہاں آباد ہو گئے۔ پھر کہا: جو تم میں سے جو شراب اور خمیر کا شوق رکھتا ہے' ریشم اور دیباج پسند کرتا ہے حکمرانی کا خیال کرتا ہے' وہ بصری اور سدیر کو چلا جائے (یہ شام کے اندر ہیں) اس میں آلِ جفنہ بن غسان جا ٹھہرے۔ پھر کہا: جو باریک کپڑے پسند کرتا ہے اور بہتر گھوڑے چاہتا ہے' رزق کے خزانے پسند کرتا ہے وہ عراق میں چلا جائے چنانچہ عراق میں جذیمۃ الابرش اور حیرہ والے غسانی چلے گئے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں عمرو بن عامر نے مدینہ میں سجع والی (ایک طرح کے الفاظ) کلام کی' الفاظ یہ تھے: جب لوگوں نے سنا تو عمرو بن عامر اپنے لڑکوں اور اپنے ازد کے ساتھیوں کو لے کر کسی جگہ ٹھہرنے کے لئے نکلا' وداعہ بن عامر ان سے الگ ہو گیا اور ہمدان میں ٹھہر گیا' عمرو پھر چل پڑا اور جب سراۃ و مکہ کے درمیان پہنچا تو ازد قبیلہ کے کچھ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور عمران بن عمرو بن عامر بھی وہیں رُک گیا' عمرو اپنے باقی لڑکوں کو لے کر چلا' بنو مازن کے ازدی لوگ بھی ہمراہ موجود تھے تو یہ لوگ ''ماء'' کے مقام پر ٹھہرے جسے غسان کہتے تھے' ان کا یہی نام مشہور ہو گیا۔ ان کے شاعر نے کہا:

''اگر تم پوچھو تو ہم ایک نیک گروہ ہیں جس کی نسبت آزد سے ہے اور پانی غسان ہے۔''

خزاعہ کا مکہ میں داخل ہونا

ابو المنذر شرقی کہتے ہیں کہ ''ماء غسان'' سے ''لُحی'' الگ ہو گیا' اس کا نام ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن حارثہ تھا' وہ مکہ میں چلا آیا اور عامر جرہمی کی لڑکی سے شادی کر لی جو قبیلۂ جرہم کا بادشاہ تھا' اس سے عمرو بن لحی پیدا ہوا جس نے دین ابراہیم علیہ السلام میں تبدیلی پیدا کر دی چنانچہ اس نے اپنے لڑکے کا نام ''خزاعہ'' رکھا کیونکہ اس کا باپ غسان سے الگ ہو گیا تھا۔

دوسرے تاریخ دانوں نے اس کی مخالفت کی ہے چنانچہ ازرقی کہتے ہیں کہ عمرو بن عامر خود اور اس کی قوم روانہ ہو گئی' وہ جس شہر میں داخل ہوتے' اس کو شکست دیتے اور ان پر غالب ہو جاتے اور یوں چلتے چلاتے مکہ جا پہنچے (وہاں کے جرہم قبیلہ نے لوگوں کو تنگ کر رکھا تھا اور بیت اللہ کے لئے صرف بنو اسماعیل کا نام آتا تھا) ثعلبہ بن عمرو بن عامر نے اہل مکہ کے پاس پیغام بھیجا کہ اے قوم! ہم اپنے شہر سے نکلے ہیں' ہم جس شہر میں بھی پہنچے ہیں لوگوں نے ہمارے لئے دروازے کھول دئیے ہیں اور ہم ان کے ساتھ مل کر رہتے آئے ہیں پھر شام اور مشرق کی طرف ہم نے اپنے جاسوس بھیج رکھے ہیں' جہاں کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ ماننے والے ہیں تو ہم ان سے مل گئے ہیں لیکن جرہم نے یہ بات نہیں مانی تو ثعلبہ نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ یہاں ہمارا ٹھہرنا ضروری ہے۔ اگر تم آنے دو گے تو میں تمہیں اچھا جانوں گا اور پانی و چراگاہ میں تم سے ہمدردی کروں گا لیکن اگر تم نے انکار کر دیا تو میں تمہارے روکنے کے باوجود یہاں ٹھہروں گا اور پھر تمہیں وہی کھانے کو ملے گا جو ہم سے زائد ہو گا اور پینے کے لئے گدلا پانی ملے گا' اگر لڑنا چاہو گے تو میں بھی لڑائی کروں گا اور اگر میں کامیاب ہو گیا تو تمہاری عورتیں گرفتار کر لوں گا' مردوں کو قتل کر دوں گا اور تم میں سے ایسا کوئی نہ

رہنے دوں گا جو حرم میں آ سکے۔

جرہم نے یہ بات نہیں مانی چنانچہ یہ تین دن تک لڑتے رہے' جرہم کو شکست ہوئی' صرف چند لوگ باقی بچے۔ ثعلبہ مکہ میں ٹھہر گیا اور سال بھر کے لئے اردگرد کا علاقہ اپنے لشکر کے سپرد کر دیا۔ یہاں انہیں بخار آنے لگا۔ اس سے قبل وہ بخار سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے طریفہ کاہنہ کو بلا بھیجا اور اس تکلیف کی شکایت کی۔ اس نے کہا' جو تکلیف تمہیں پہنچی ہے' مجھے بھی پہنچی ہے۔

اس کے بعد ازراقی نے طریفہ کے مسجع یعنی بنانے سنوارے کلام کا ذکر کیا جو اس شہر سے تعلق رکھتا تھا' یہ وہ کلام نہیں تھا جو سبأ سے بکھرتے وقت عمران بن عامر نے پڑھا تھا' اس کے بعد' جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں' اس نے ہر گروہ کے بارے میں بتایا کہ وہ کہاں کہاں ٹھہرے تھے اور یہ بھی بتایا کہ اوس وخزرج (جو حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر کی اولاد تھے' یہ انصار کہلائے) مدینہ منورہ میں ٹھہر گئے تھے۔ پھر یہ بتایا خزاعہ الگ ہو کر مکہ میں ٹھہر گئے چنانچہ ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن عامر وہیں ٹھہرا' اسی کو لحی کہتے تھے' مکہ کی حکمرانی اسے ملی۔ یہ قول بتاتا ہے کہ یہ لوگ مکہ سے بکھرے تھے اور اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ یہاں داخل ہونے والے کچھ لوگ یہاں سے بکھرے تھے۔

ثعلبہ بن عمرو کا مدینہ میں داخلہ

علامہ یاقوت حموی کہتے ہیں کہ جب یہ لوگ یمن سے روانہ ہوئے تو ثعلبہ عنقاء بن عمرو مزیقیاء بن عامر ماء السما بن حارثہ غطریف بن امرئ القیس بطریق بن ثعلبہ بہلول بن مازن راد بن غوث حجاز کی طرف چلا گیا اور ثعلبیہ و ذی قار کے درمیانی علاقے میں جا ٹھہرا' اس جگہ کا ثعلبیہ نام اسی کی وجہ سے پڑا تھا۔ وہ یہاں اپنے اہل وعیال' اولاد اور پیروکاروں سمیت ٹھہر گیا۔ یہاں اس کی اولاد ہوئی اور جب بہت سے لڑکے ہو گئے اور ہاتھ مضبوط ہو گئے تو انہیں لے کر مدینہ کو چل پڑا' یہودی پہلے سے وہاں موجود تھے' انہوں نے بھی اسے اپنا وطن بنا لیا چنانچہ یہ لوگ قریظہ' نضیر' خیبر' تیماء اور وادی القریٰ کے درمیان ٹھہرے اور اکثر مدینہ میں مقیم ہوئے۔

فصل نمبر ۳

ان کا نسب نامہ

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ یہ لوگ عمرو مزیقیاء کی طرف منسوب تھے اور عمرو قحطان کی طرف منسوب تھا۔

قحطان کا نسب نامہ

ابن رزین نے شرقی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انصار کی اصل اوس وخزرج کے لوگ ہیں اور یہ دونوں ہی ثعلبہ بن عمرو بن حارثہ بن امرئ القیس بن ثعلبہ بن مازن بن ازد بن غوث بن مالک بن زید بن کہلان بن سبأ بن یعرب

بن قحطان کی اولاد ہیں اور لگتا ہے نسخہ میں سے غوث کے بعد ''بن نبت'' کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں کیونکہ یہ نام مالک اور غوث کے درمیان آتا ہے جیسے پہلے ذکر ہو چکا۔ یمن کے تمام قبیلے اسی قحطان تک پہنچتے ہیں اور اس قحطان کے نسب میں اختلاف ہے چنانچہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ عامر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خود حضرت ھود علیہ السلام کا لڑکا تھا' کچھ کہتے ہیں کہ ان کا بھتیجا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ قحطان وہ پہلا شخص ہے جس نے عربی بولنا شروع کی تھی اور وہ بننے والے عربوں کا باپ تھا' رہے حضرت اسماعیل علیہ السلام تو وہ ان عربوں کے والد تھے جو باہر سے آ کر عرب بنے جبکہ خالص عرب اس سے پہلے موجود تھے جیسے عاد' ثمود' طسم' جدلیس اور عملیق وغیرہ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قحطان وہ پہلا شخص ہے جسے کہا گیا: ''لعنت کرنے سے بچو اور صبح کو دودھ پیو۔''

حضرت زبیر بن بکار اس طرف گئے ہیں کہ قحطان حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا' نسب یوں ہے: قحطان بن ھَمَیْسَع بن تیم بنبت بن اسماعیل علیہ السلام بخاری نے انہی کے نام پر ایک باب باندھا ہے کہ: ''باب نسبة الیمن الی اسمٰعیل'' انہوں نے بخاری میں وہ حدیث درج کی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے بنو اسلم سے خطاب میں فرمایا تھا کہ وہ بنو اسماعیل ہیں اور یہ اسلم' افصی بن حارثہ بن عمرو بن عامر بن حارثہ بن امرئ القیس کا بیٹا تھا جس کا نسب بیان کیا جا چکا ہے چنانچہ پتہ چلا کہ یمن والے' بنو قحطان ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور صحیحین میں حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہا کے قصے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا ظاہر مفہوم یہی ہے جس میں آتا ہے کہ ''اے بنو ماء! یہ تمہاری والدہ ہیں'' یہ بات آپ نے انصار سے گفتگو کرتے ہوئے فرمائی تھی کیونکہ ان کا دادا' عامر جو عمرو کا والد تھا' اسی لقب سے مشہور تھا یا پھر حضرت ابو ہریرہ نے اس سے مراد سارے عرب لوگ لئے تھے کیونکہ اکثر یہ جنگلوں میں رہتے تھے جہاں بارش ہوتی۔ اس معنٰی کے لحاظ سے یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ سارے عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہر ایک کو ''ابن ماء السماء'' کہتے ہیں کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہا کے فرزند تھے پھر آپ کی پرورش آبِ زمزم سے ہوئی تھی اور زمزم' آسمان ہی کا پانی ہے۔

حضرت عیاض نے اوّلیت اس بات کو دی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا مقصد خصوصی طور پر انصار تھے جن کی نسبت ان کے دادا ''ماء السماء'' سے ہے۔ انتہٰی چنانچہ اس صورت میں تمام اھل یمن کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا صاف دکھائی دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میرا خیال بھی یہی ہے چنانچہ ابن عبد البر نے حضرت قعقاع بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اسلم اور خزاعہ کے لوگوں پر گذر ہوا' وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھا کر

پیش کر رہے تھے' آپ نے فرمایا: تم اپنے آپ کو بنو اسماعیل کی اولاد کہا کرو۔" جبکہ اسلم وخزاعہ کا نسب نامہ قبائل یمن میں گذر چکا ہے جو قحطان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔اس کی تائید حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہما کے دادا منذر بن عمرو کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے:

"ہم بہلول عمرو بن عامر کے وارث ہیں اور حارثہ غطریف کے بھی جو بزرگی والے اور عظمت والے تھے' ہم آلِ ابن نبت بن مالک کی نشانی ہیں اور نبت بن اسماعیل سے ہماری شاخ چلتی ہے۔"

مخالف لوگوں نے اس کے کئی معنٰی نکالے ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے' تمام عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور اگر یہ شرط پوری نہیں ہوتی تو وہ عرب جنہیں کفو ہونے میں شرعاً شرافت اور اولیت حاصل ہے وہ بنو اسماعیل ہیں اور امامت کے بارے میں ہمارے ایک ساتھی (شافعی) کا قول بتاتا ہے کہ اگر تمام شرائط پر کوئی قرشی پورا نہ اُتر سکے تو اس کی جگہ کنانی کو لاکھڑا کیا جائے گا' اگر ایسا نہ مل سکے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی آدمی لیا جائے گا اور اگر یہ بھی مشکل ہو تو ہم کسی عجمی کو لے لیں گے' انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم باقی عربوں کو دیکھیں گے لیکن والی بنانے کے لئے آخرکار دیکھیں گے' اگر اولادِ اسماعیل علیہ السلام میں کوئی نہ ملے تو جرہمی کو لیں گے کیونکہ بنو جرہم اصل عرب ہیں اور اگر جرہم سے بھی نہ مل سکے تو اولادِ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے لیں گے۔

یہ بات "تہذیب" میں مذکور بغوی کے قول کے مخالف ہے' انہوں نے کہا: اگر اولادِ اسماعیل میں سے کوئی نہ مل سکے تو عجمی شخص کو لیں گے چنانچہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے آخر پر جرہمی کو متولی بنایا جائے گا کیونکہ بہرصورت انہیں عجمیوں پر فضیلت حاصل ہے اور پھر یونہی عجمیوں میں سے بھی بعض کو دوسرے عجمی پر مقدم کیا جائے گا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان عربوں کے باپ ہیں۔جنہیں اشرف الانبیاء ﷺ کی وجہ سے شرف حاصل ہے اور یہ بات اس بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' صرف عربی زبان بولنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا' علاوہ ازیں مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث ملتی ہے کہ فرمایا: "سب سے پہلے عربی بولنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔" البتہ بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے عربی زبان جرہم کے ان لوگوں سے سیکھی تھی جو آپ کی والدہ کے ہمراہ یہاں آئے تھے۔

عربی زبان سب سے پہلے کس نے بولی؟

ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جرہم اور قطورا وہ شخص ہیں جو قحطان کے بیٹے تھے اور جب بولیاں مل جل گئیں تو سب سے پہلے عربی انہی دو نے بولنا شروع کی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات اس شخص کی رائے کی بناء پر ہے جو کہتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی

اولاد سے نہیں ہیں۔

حضرت زبیر بن بکار نے نسب ناموں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علی کی حدیث بذریعہ حسن بیان کی ہے فرمایا:

''سب سے پہلے جس کی زبان سے عربی سنی گئی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔'' چنانچہ اس روایت کی قید سے گذشتہ اور بخاری میں پائی جانے والی حدیث کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے البتہ پہلی روایت کو واضح بیان ہونے کی بناء پر اولیت حاصل ہوگی نہ یوں کہ خواہ کچھ بھی ہو اسے اول قرار دیا جائے ہوسکتا ہے کہ اصل عربی جرہم سے سیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فصیح و بلیغ عربی بولی آپ پر الہام کر دی ہو اب اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ سارے عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نہیں ہیں تو شرف کا حق حضرت اسماعیل کے عربی بولنے کی وجہ سے ہوگا جس کی بناء پر بنو اسماعیل ممتاز ہوں گے۔''

ابن درید نے ''وشاح'' میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان یعرب بن قحطان نے بولی تھی پھر اسماعیل علیہ السلام بولے تھے اور ابن ہشام نے شرقی سے نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کا عربی بولنا یعرب بن قحطان سے زیادہ فصاحت والا تھا یونہی حمیر اور جرہم سے بھی زیادہ فصیح تھے اور یہ ساری گفتگو اس بات کے خلاف جاتی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ تمام عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

انصار کی والدہ اور اس کا نسب

علامہ کلبی کے مطابق انصار کی والدہ قیلہ بنت عمرو بن جفنہ تھی۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ ارقم بن عمرو بن جفنہ بن عمرو مزیقیاء کی بیٹی تھی۔ کچھ کہتے ہیں کہ کاھل بن عذرہ کی بیٹی تھی جن کا تعلق قضاعہ سے تھا اور اکثر کے نزدیک قضاعہ بنو حمیر سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ انصار بنی قیلہ کے نام سے مشہور ہیں ایک شاعر نے انہی کے بارے میں کہا تھا:

''بہلول کہلانے والے قیلہ کی اولاد سے ہیں خلط ملط کرنے والا کوئی بھی اس میں گڑ بڑ نہیں کر سکتا یہ لوگ مہمانوں کو کھانے کھلانے والے اور سرکش لوگوں کے لئے تیر تھے یہ اپنے باپ دادا کے طریقوں پر چلنا ضروری سمجھتے تھے۔''

ہمارے اس گذشتہ بیان کے بعد کہ انصار کا اصل اوس و خزرج ہیں جو ثعلبہ بن عمرو کی اولاد سے تھے علامہ رزین نے شرقی سے لے کر لکھا ہے کہ: ثعلبہ بن عمرو بن حارثہ سے اوس و خزرج پیدا ہوئے اور ان کی والدہ قیلہ ہے پھر اوس سے مالک پیدا ہوا اور مالک سے اوس کے سارے قبیلے پیدا ہوئے چنانچہ مالک سے عمرو عوف اور مُرّہ پیدا ہوئے انہیں اوس اللہ کہا جاتا ہے (اللہ کے خدمت گار)۔ یہ ذہی جعادرہ تھے۔

میں کہتا ہوں کہ عنقریب اس کے خلاف قول آ رہا ہے اور اوس کے ان قبیلوں کا ذکر ہوگا جو ان سے بکھر گئے

تھے۔

علامہ خرائطی لکھتے ہیں کہ جب اوس بن حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو کی موت کا وقت ہوا تو اس کی قوم اس کے پاس جمع ہوگئی' کہنے لگے: اللہ کا حکم آ پہنچا' آپ دیکھ ہی رہے ہیں' ہم آپ کو بوقت جوانی یہ کہتے رہے ہیں کہ کسی جوان عورت سے شادی کر لو' دیکھو یہ آپ کا بھائی خزرج ہے' اس کے پانچ بیٹے ہیں جبکہ مالک کے بغیر آپ کا اور کوئی بیٹا نہیں۔اوس نے کہا: جس نے مالک جیسا بیٹا چھوڑا ہے' اس کا نام ختم نہیں ہوگا' جو شراب سے آگ پیدا کر سکتا ہے' اس میں یہ بھی طاقت کہ مالک کی بہت سی نسل پیدا فرما دے اور بہادر بندے پیدا فرما دے۔ پھر وہ مالک کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے بیٹے! ''موت بہتر ہے' ذلت نہیں'' اور پھر بجع والی زبان میں دانائی کی باتیں بتائیں پھر یہ اشعار پڑھے:

''میں نے جنگوں کے دن قیدی دیکھے۔

میں نے لوگوں میں سے ملک والا کوئی نہیں دیکھا' اس کا شوق موت اور قبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ جس نے ثمود اور جرہم کو ہلاک کر دیا' عنقریب میرے پیچھے ایسی نسل پیدا کرے گا جو رہتی دنیا تک موجود رہے گی۔

اگر دنوں نے میری عمدگی کو بوسیدہ کر دیا ہے اور میرا سر سفید کر دیا ہے تو کیا ہوا' عمر کے ساتھ بڑھاپا آ ہی جاتا ہے۔

ہمارا عرش کی بلندی پر ربّ موجود ہے جو ہر خیر اور شر کو خوب جانتا ہے۔

کیا میری قوم تک یہ بات نہیں پہنچی کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف بلا رہا ہے' اس میں وہی کامیاب ہوگا جو نیک بخت اور بھلائی والا ہوگا۔

آلِ غالب میں سے جب ایک شخص کو زمزم اور حجر کے درمیان مکہ میں بھیج دیا جائے' تو تم اپنے اپنے شہروں میں ان کی مدد کرنا کیونکہ مدد ہی میں بھلائی ہے۔''

یہ کہنے کے بعد فوراً فوت ہوگیا۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ بنو عامر بن عمرو بن مالک بن اوس سب کے سب عُمان میں تھے' ان میں سے کوئی بھی مدینہ میں نہ تھا لہٰذا یہ انصار میں سے نہیں ہیں۔

شرقی کہتے ہیں کہ اوس کے بھائی خزرج بن حارثہ کے پانچ لڑکے تھے' ان سے کئی خاندان بن گئے۔

میں کہتا ہوں کہ وہ خاندان یہ ہیں: عمرو' عوف' جشم' کعب اور حارث' عنقریب آ رہا ہے کہ ان کے قبیلے کیسے پھیلے تھے۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ سائب بن قطن بن عوف بن خزرج کے پیچھے مدینہ میں کوئی شخص نہ تھا' یہ سب عمان میں تھے لہٰذا انصار نہیں ہیں۔ابن حزم نے کچھ ایسی ہی بات بنو حارث بن خزرج اکبر کے بارے میں بھی کی ہے جیسے آ رہا ہے

اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ کچھ بنو حنفہ بن عمرو مزیقیاء مدینہ میں تھے اور انصار میں شمار ہوتے تھے' واللہ اعلم۔

فصل نمبر ٤

اوس وخزرج کا مدینہ منورہ میں قیام'
یہودیوں پر غلبہ اور تُبَّع سے معاملہ

شرقی کہتے ہیں کہ اوس وخزرج جب مدینہ میں آئے تو اونچی نیچی جگہوں میں بکھر گئے' ان میں سے کچھ وہ تھے جو بنو اسرائیل کے ساتھ ان کے شہروں میں بس گئے اور کچھ ایسے تھے جو اکیلے جا ٹھہرے' وہ نہ تو بنو اسرائیل کے ساتھ ٹھہرے اور نہ ہی ان عربوں کے ساتھ جن کی بنو اسرائیل کے ساتھ دوستی تھی' بنو اسرائیل کے پاس دولت تھی' یہ بیس سے کچھ زیادہ قبیلے تھے' ان کے کئی شہر تھے جن میں انہوں نے قلعے بنا لئے تھے چنانچہ اوس وخزرج آئے تو ان کے درمیان اور آس پاس ٹھہر گئے۔

اوس وخزرج کی یہودیوں کے ساتھ رہائش

ابن زبالہ اہلِ مدینہ کے کئی بوڑھوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے بتایا: اوس وخزرج مدینہ میں رہائش رکھتے تھے' اموال' قلعے اور کھجوروں کے باغ یہودیوں کے پاس تھے' وہ تعداد اور قوت میں ان سے بڑھ کر تھے' جب تک اللہ کی مرضی تھی اوس وخزرج ٹھہرے رہے اور پھر ان سے کہا کہ آؤ آپس میں ایک دوسرے کے حلی بن جائیں تا کہ سب ایک دوسرے سے امن میں رہیں اور مل کر غیروں کا مقابلہ کریں چنانچہ انہوں نے معاہدہ کیا' قسمیں کھا لیں اور ایک دوسرے سے مل کر معاملات چلانے لگے' یوں انہیں بہت سا عرصہ گذر گیا' اوس وخزرج کے پاس مال جمع ہو گیا' ان کی اراضی کافی ہو گئی اور تعداد بھی بڑھ گئی۔ جب قریظہ ونضیر نے ان کا یہ حال دیکھا تو اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ ان کے گھروں اور مال پر غالب آ جائیں گے چنانچہ وہ برہم ہوئے اور وہ قسم توڑ دی جو ان کے درمیان ہوئی تھی حالانکہ قریظہ ونضیر تعداد میں اکثر تھے' انہیں کاہنان اور بنو الصریح کہا جاتا تھا' اسی لئے قیس بن خطیم ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''ہماری یہ حالت ہے کہ جب کوئی قوم ہمارے ساتھ جنگ کا ارادہ کرتی ہے تو کاہنان ہماری خاطر گھوڑے تیار کرتے ہیں اور پکا عہد کر کے نکلتے ہیں۔
>
> وہ ہماری کمزوری کو بھول جاتے ہیں اور اپنی طرف سے غمخواری کرتے ہیں' یہ بنو صریح پاک دامن اور بھلے لوگ ہیں۔''

یہودیوں کے سرکش بادشاہ فطیون کا قصہ

چنانچہ اوس وخزرج اپنے اپنے گھروں میں اس خوف سے ٹھہر گئے کہ یہ یہودی انہیں جلا وطن نہ کر دیں' آخر ان میں مالک بن عجلان سامنے آیا' یہ بنو سالم بن عوف بن خزرج کا بھائی تھا' اسے دونوں قبیلوں اوس وخزرج نے اپنا سردار بنا لیا' ادھر فطیون زھرہ میں یہودیوں کا بادشاہ تھا (یاقوت نے فیطون لکھا ہے) اوس وخزرج میں سے کسی عورت کی شادی ہوتی تو وہ دلہن اپنے شوہر کے گھر اس وقت تک نہیں بھیجی جاتی تھی جب تک بادشاہ کے پاس نہ جاتی' خاوند سے پہلے وہی اس کی عصمت کا پردہ چاک کرتا۔

ہوا یہ کہ مالک بن عجلان کی بہن اپنے ہی خاندان کے ایک شخص سے بیاہی گئی۔ ابھی مالک اپنی قوم کو آواز دے ہی رہا تھا کہ اس کی بہن کپڑے پہنے بغیر نکلی' اہلِ مجلس نے اس کی طرف دیکھا تو مالک کو یہ بات اچھی نہیں لگی چنانچہ وہ اس کے پاس گیا' سخت ناراض ہوا اور تنبیہ کی۔ اس نے کہا کہ جو کچھ کل میرے ساتھ ہوگا' وہ اس سے بھی برا ہے' مجھے میرے شوہر کے علاوہ کسی اور کے پاس بھیجا جائے گا۔

شام ہوئی تو مالک نے تلوار تھامی' فطیون کے پاس عورتوں کے بھیس میں پہنچا اور موقع پا کر اس کی طرف بڑھا اور اسے قتل کر دیا پھر اپنی قوم کے پاس آ گیا اور پھر خود اس نے اور اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے ایک آدمی کو اس شخص کی طرف شام میں بھیجا جو وہاں سربراہ تھا' اسے اپنا حال لکھ بھیجا اور شکایت کی کہ یہودی ہم پر غالب ہیں۔ ایلچی رمق بن زید بن امرئ القیس تھا' یہ بنو سالم بن عوف بن خزرج میں سے ایک تھا' یہ نہایت بدصورت اور بلیغ شاعر تھا' وہ ایلچی گیا اور ابو جبیلہ کے پاس پہنچا' وہ بنو جشم بن خزرج کے ان لوگوں میں شامل تھا جو یثرب سے شام پہنچے تھے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ابو جبیلہ جفنہ بن عمرو بن عامر کی اولاد سے تھا' اسے شام میں حکومت اور عزت ملی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ پہلے آ چکا ہے کہ جفنہ کی اولاد غسان سے تعلق رکھتی تھی اور یہ لوگ شام میں بادشاہ تھے۔

جب ابن حزم نے بنو جشم بن خزرج کا ذکر کیا تو بتایا کہ جشم کا بن بیٹا غضب تھا' غضب کا مالک' مالک کا عبد حارثہ' عبد حارثہ کا حبیب' حبیب کا عبد اللہ اور عبد اللہ کا بیٹا ابو جبیلہ غسانی بادشاہ تھا جسے مالک بن عجلان نے یہودیوں کو قتل کرنے کے لئے بلایا تھا انتہی۔

یہ بات محلِ نظر ہے کیونکہ خزرج کے کسی قبیلے سے غسانی نہیں ہوا جیسے ابن حزم کی گذشتہ گفتگو سے پتہ چلتا ہے جو پہلے آ چکی اور مشہور وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا۔

کہتے ہیں کہ اس نے اپنے حالات کا شکوہ کیا اور یہودیوں کے غلبے کا بتایا' یہ بتایا کہ وہ ان سے خوفزدہ ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ لوگ انہیں جلا وطن نہ کر دیں' پھر شعر بھی سنائے جس سے وہ بڑا متعجب ہوا' بلاغت' بدصورتی پر تعجب کرنے لگا پھر کہنے لگا کہ " ستھرا شہد ہے جو برے برتن میں ڈالا گیا ہے۔" چنانچہ رمق نے کہا: اے بادشاہ! انسان

سے دو چھوٹی سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی زبان اور دل' اس نے کہا' تم نے سچ بولا اور پھر لشکر لے کر اوس و خزرج کی امداد کے لئے تیار ہوا۔ (ابن زبالہ)۔

رزین' شرقی سے وہ بات نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مالک بن عجلان خود گیا تھا اور وہ جو فطیون کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ عورتوں کی بے حرمتی کرتا تھا' یہ معاملہ اوس و خزرج کے علاوہ دوسروں سے تھا جبکہ اس کے ارادے میں یہ تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا تو مالک بن عجلان نے اسے قتل کر دیا کیونکہ وہ کہتا تھا: فطیون نے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ جب تک عورت اس کے قریب نہیں جاتی' اپنے شوہر کے پاس نہیں جا سکے گی اور جب اوس و خزرج مدینہ میں رہنے لگے تو اس نے ان کے بارے میں بھی یہی ارادہ کر لیا چنانچہ مالک بن عجلان کی بہن نے بنو سلیم کے ایک شخص سے شادی کی' اسی دوران فطیون نے اس سلسلے میں آدمی بھیجا' اس کا بھائی مالک غائب تھا' وہ اسے تلاش کرنے چلی اور ایسے لوگوں کے پاس گئی جن میں اس کا بھائی موجود تھا' اس نے آواز دی تو بھائی نے کہا: بہن تم نے بہت برا کیا' تم نے مجھے آواز دی ہے' شرم نہیں آتی؟ اس نے کہا' جو مجھ سے ارادہ کیا گیا ہے وہ اس سے بھی بُرا ہے چنانچہ اس نے سب کچھ بتا دیا جس پر اس نے کہا: میں نمٹ لوں گا۔ بہن نے کہا کیسے؟ تو کہنے لگا: میں عورتوں کا بھیس بدل لوں گا' تمہارے ساتھ تلوار لے کر اس کے پاس چلا جاؤں گا اور اسے قتل کر دوں گا چنانچہ اس نے یہ کام کر دیا۔

پھر وہاں سے نکلا اور سیدھا شام کو چلا گیا اور ابو جبیلہ کے پاس پہنچا' ابو جبیلہ شام میں اس وقت سے ٹھہر گیا تھا جب دوسرے لوگ مدینہ میں ٹھہرے تھے۔ اب اس نے ایک عظیم لشکر تیار کیا اور چلتا ہوا یوں دکھائی دیا جیسے یمن جانے کا ارادہ ہو' مالک بن عجلان انہی میں چھپ گیا' وہ آیا اور ''ذی حرض'' میں رُکا' پھر اہلِ مدینہ اوس و خزرج کو بلا بھیجا' وہ آئے تو انہیں انعامات دیئے' پھر بنو اسرائیل کو بلا بھیجا (یہودیوں کو) اور کہہ دیا کہ جسے بادشاہ سے کسی عطیہ کی ضرورت ہو وہ خود بادشاہ سے ملے۔ یہ اس اندیشہ کے لئے کیا کہ کہیں وہ اپنے قلعوں میں بند نہ ہو جائیں اور پھر ان کو قابو کرنا مشکل ہو جائے۔ اس اعلان پر بنی اسرائیل کے بڑے بڑے لوگ سب کے سب اس کے پاس پہنچے' اس نے دعوت کی تو سب اکٹھے ہو گئے چنانچہ اس نے سبھی کو قتل کرا دیا۔ اب اوس و خزرج اہلِ مدینہ میں باعزت ہو گئے' بلوی شاعر مالک کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سننے کے لئے بنو سالم سے بلوی جماعت آ جائیں۔ کیا فطیون کے لئے تمہاری عورتوں کی عزت داؤ پر لگ چکی تھی' یہ حاکم کا حکم تو نہ تھا۔ آخر کار مالک نے اپنی بہن کی طرف سے اسے منہ کے بل دے مارا (قتل کر دیا)' وہ سرخ رنگ والی ہنس رہی تھی۔''

اس کے بعد علامہ رزین نے کئی اور شعر لکھے ہیں جنہیں ابو یزید بن سالم کی طرف منسوب کیا ہے' یہ بنو سالم بن عوف بن خزرج میں سے تھا' ان میں اس نے ابو جبیلہ کی تعریف کی ہے' لیکن ابن زبالہ نے ان اشعار کو رمق کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے:

''اوس وخزرج نے ابو جبیلہ سے اس وقت کہا جب وہ ان کی مدد کے لئے آیا تھا کہ اگر یہودیوں کو تمہارے ارادے کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے قلعوں میں بند ہو جائیں گے اور تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے' تم انہیں اپنی ملاقات اور عطیات کے بہانے بلاؤ' ان کے دل سے تمہارا نکل جائے اور وہ مطمئن ہو جائیں تو تم جو چاہو گے کر سکو گے چنانچہ اس نے ان کے لئے دعوت کی اور یہودیوں کے سرداروں' رئیسوں کو بلا بھیجا' وہ سب کے سب آ گئے' ان میں سے ہر ایک اپنے اہل وعیال اور خادموں کو عطیات کی غرض سے ساتھ لایا' ابو جبیلہ نے ان کے لئے ایک جگہ بنا کر کچھ آدمی کھڑے کئے تھے کہ جو بھی اندر آ جائے' اسے قتل کرتے جاؤ' وہ یوں کرتے گئے اور ان کے سرداروں کو بھی قتل کر دیا جس سے اوس وخزرج مدینہ منورہ میں عزت دار بن گئے اور پھر اپنے گھروں' جائیداروں اور قلعوں پر قابض ہو گئے' رمق نے ابو جبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

''خوبصورت عورتوں کی طرف سے تم نے قرض نہیں اُتارا' ارادہ تمہارا بھی ہے اور ہمارا بھی' خوبصورت خواتین کے بارے میں تم پختہ ارادہ کر لو' ارادہ تمہارا بھی ہے اور ہمارا بھی۔''

ایک روایت میں آیا ہے کہ جب مالک بن عجلان نے فطیون کو قتل کر دیا تو تبّع اصغر سے ملنے کے لیے یمن کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر تبع کو اس بارے میں بتایا جو فطیون ان سے کر رہا تھا' اس پر تبّع اصغر نے عہد کر لیا کہ جب تک وہ مدینہ میں جا کر یہودیوں کو رسوا نہیں کر دیتا' تب تک نہ تو کسی عورت کو ہاتھ لگائے گا' نہ خوشبو استعمال کرے گا اور نہ ہی شراب پئے گا اور پھر یونہی کیا۔

ابن قتیبہ نے اپنے معارف میں تبّع بن حسان کا ذکر کیا ہے کہ: یہ تبّع کہلانے والوں میں سے چھوٹا اور آخری تبّع تھا۔ پھر یہ ذکر کیا کہ وہ شام کی طرف ہوا' وہاں کے بادشاہ غسان تھے جنہوں نے اس کی اطاعت کر لی' ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بھائی حارث کی طرف ہوا' وہ مقام ہجر کی طرف مقیم تھا چنانچہ اس کے پاس وہ لوگ آئے جو یثرب میں ٹھہرے تھے' یہ وہ لوگ تھے جو عمرو مزیقیاء کے ساتھ چلے تھے اور مدینہ میں یہودیوں کے حلیف بنے تھے (یعنی یہ انصار تھے) انہوں نے یہودیوں کی شکایت کی اور ان کی بری ہمسائیگی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے یہودیوں سے طے کردہ وہ شرائط توڑ دیئے ہیں جو یہاں آتے وقت ان سے طے کئے تھے اور رحم کا رشتہ ظاہر ہوا تھا' اس بات نے اسے ناراض کر دیا۔ چنانچہ وہ یثرب کی طرف ہوا اور اُحد کے دامن میں ٹھہر گیا' پھر یہودیوں کو بلا بھیجا' ان کے ساڑھے تین سو لوگ قتل کر دیئے اور مدینہ میں خرابی کا ارادہ کیا' اس پر ایک یہودی اُٹھ کھڑا ہوا جو اڑھائی سو سال کا تھا' کہنے لگا: اے بادشاہ! تم اس شہر کو برباد نہیں کر سکو گے۔ اس نے پوچھا' کیوں؟ تو یہودی نے کہا' یہ اس لئے کہ یہ جگہ بنو اسماعیل میں سے ہونے والے ایک نبی کی ہجرت کا مقام ہے جو اس مقام سے نکلے گا یعنی بیت الحرام سے۔ یہودی کی یہ بات سن کر تبّع اس بُرے ارادے سے رُک گیا اور یہاں سے روانہ ہو گیا' یہ یہودی بھی ساتھ ہی تھا' اس کے علاوہ ایک اور

یہودی عالم بھی ہمراہ تھا' یہ دونوں زبردست عالم تھے' وہ مکہ پہنچا اور خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا پھر یمن روانہ ہوا' یہ دونوں عالم اس کے ساتھ تھے' تبع نے ان کا دین اپنا لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا۔

شاید مالک بن عجلان نے ملک غسان کی طرف توجہ کی تھی جہاں تبع اصغر موجود تھا چنانچہ دونوں میں امداد کا سلسلہ واقع ہوا تو کچھ لوگوں نے اسے تبع کی طرف منسوب کیا ہے اور کچھ نے ابو جبیلہ غسان کی طرف۔

کہتے ہیں کہ یہودیوں نے مالک بن عجلان پر اپنے گرجوں اور عبادت والی جگہوں میں لعنت کرنا شروع کر دیا' مالک کو اس بات کا پتہ چل گیا تو اس نے کہا:

"میں نے کیا جرم کیا کہ یہ یہودی لعنت کرتے ہیں' انہیں ذلیل کرنے سے موتیں آتی ہیں۔"

اہلِ سیرت لکھتے ہیں کہ ابو جبیلہ پھر شام کی طرف لوٹ گیا' اس نے حجاز اور اہل مدینہ کو ذلیل کرتے ہوئے اوس و خزرج کے لئے بنیاد تیار کر دی۔

علامہ مجد' علامہ یاقوت سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تبع مدینہ میں تھا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ: یاقوت نے دلہنوں کی بے عزتی کا قصہ اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ علامہ مجد نے اسے یمامہ کا قصہ لکھا ہے اور اہلِ مدینہ میں سے تبع کے ساتھ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ گندی رسم یمامہ سے دور کی تھی۔ اس کے بعد علامہ مجد نے یاقوت کی عبارت لکھی ہے لیکن اس کا مضمون وہ نہیں جو اس نے ذکر کیا ہے بلکہ اس کا مضمون یہ ہے: جن کے ساتھ یمامہ میں رسوائی اور ذلت کا یہ کام کیا جاتا تھا' انہوں نے اس گندگی کو دور کرنے کا حیلہ کیا اور اس کو قتل کر دیا جو ان کے ساتھ معاملہ کرتا تھا اور یوں اس پر غالب ہو گئے' پھر ان میں سے ایک شخص بھاگا اور تبع سے جا ملا چنانچہ اس کے کہنے پر تبع نے اہلِ مدینہ کی امداد کی تھی۔ یہ بات ماننے میں نہیں آتی' ہم اسے علامہ مجد کی اتباع میں پیش کر رہے ہیں۔

علامہ یاقوت کہتے ہیں کہ قبیلۂ طسم اور جدیس' لاوذ بن ارم بن لاوذ بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جو یمامہ میں ٹھہر گئے تھے اور وہاں کافی بڑھ گئے تھے اور پھر ان کا بادشاہ عملیق طمسی بن گیا تھا (یہ بڑا جابر اور ظالم تھا' اس نے جدیس کے بارے میں یہ ظالمانہ فیصلہ کیا تھا جو عورت اور اس کے شوہر سے تعلق رکھتا تھا' اس بارے میں عورت کے شعر کہے تھے جو اس تک پہنچ گئے تھے چنانچہ اس نے حکم دیا تھا کہ جدیس کی کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر اس وقت تک نہ جائے جب تک وہ خود اس سے برائی نہ کرے' جس سے پتہ چلا کہ یہ وہی تھا جو یہ بدترین کام کرتا تھا) اور جدیس والے اس سے ذلت میں ملتے تھے پھر وہ وقت آیا کہ ان جدیس کے سردار الاسود بن غفار کی بہن بیاہی گئی' یہ بڑا مضبوط تھا۔ جب عملیق کے پاس جانے کی رات آئی تو وہ باہر نکلی' لونڈیاں اس کے اردگرد تھیں کہ اسے عملیق کے پاس لے جائیں' وہ ساز بجاتے ہوتے کہہ رہی تھیں:

"عملیق کے پاس گندے لوگ دکھائے دیتے ہیں' کھڑی ہو جاؤ' سوار ہو کر صبح تک یہ عجیب کام کرو' تم اس سے ملنے جا رہی ہو جس سے نکاح نہیں ہوا' اس کے سامنے کوئی کنواری بھاگنے کا راستہ نہیں

پاتی۔"
پھر وہ عملیق کے سامنے پیش کر دی گئی' اس نے بے حرمتی کا ارادہ کیا' کہتے ہیں کہ وہ عورت بڑی طاقتور تھی لہٰذا اس نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا' اس کو اپنی بے عزتی کا خوف ہوا تو اس نے لوہے کی کوئی شے اس کی شرمگاہ میں مار کر اسے لہولہان کر دیا' وہ وہاں سے نکلی' اس نے اپنی بے عزتی کی بناء پر اپنی پچھلی طرف سے کپڑا پھاڑ دیا' خون بہہ رہا تھا چنانچہ وہ روتے ہوئے لوگوں کے اس مجمع میں پہنچی جہاں اس کا بھائی تھا' وہ یوں کہہ رہی تھی:
"جدیس والوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں' کیا نئی نویلی دلہنوں سے ایسے کیا جاتا ہے؟"
اس سے اس کا بھائی طیش میں آ گیا' اس نے قوم کے اعلان کرنے والے کے پاس اسے کھڑا کیا تو وہ جدیس کو طعنہ دیتے ہوئے یہ اشعار پڑھنے لگی جن میں اس نے یوں طعنہ دیا:
"کیا یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تمہاری نوجوان لڑکیاں کسی کے سامنے پیش کی جائیں' تم مرد ہو اور ریت کے ذروں جتنے ہو'
کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ جس رات لڑکی نے اپنے شوہر کے پاس جانا ہوتا ہے' اس دن وہ (کسی غیر سے) خون میں لت پت ہو جائے۔
اگر تم یہ واقعہ سن کر بھی غضب ناک نہیں ہوئے تو عورتیں بن جاؤ۔
اگر ہم مرد ہوتیں اور تم عورتیں ہوتے تو ہم اس ذلت پر کبھی آمادہ نہ ہوتیں۔
میں کہتی ہوں کہ یا تو خود مر جاؤ یا پھر اپنے دشمن کو مار دو اور اس آگ کی طرح ہو جاؤ جو موٹی لکڑیوں سے سلگائی گئی ہو۔
ورنہ اس سے الگ ہو کر دکھا دو اور دور کسی شہر کی طرف چلے جاؤ۔
ذلیل ہو کر رہنے سے تو موت بہتر ہے اور گم نام رہنے سے تو محتاجی بہتر ہے۔
چنانچہ اس کی طرف تلواریں اور نیزے لے کر چل نکلو۔
یوں اس نے اپنی قوم کو شرمندہ کیا تو جدیس والے غیظ و غضب سے بھر گئے اور مارے شرم کے انہوں نے گردنیں جھکا دیں' پھر اس بارے میں مشورہ کرنے لگے چنانچہ اسود (لڑکی کا بھائی) کہنے لگا' تم میری بات مانو کیونکہ بادشاہ ہر لحاظ سے تو غالب ہے (اس سے لڑنے کی ہم میں ہمت نہیں) میرا خیال ہے کہ میں بادشاہ کے لئے کھانا پکاتا ہوں اور پھر اسے اس کی قوم سمیت بلاؤں گا' جب وہ آ جائیں گے تو میں بادشاہ کو قتل کر دوں گا' اسی دوران تم میں سے ہر ایک کھڑا ہو جائے اور ان کے ایک ایک رئیس کو قتل کر دے' یوں باقی لوگوں میں طاقت نہ رہ جائے گی لیکن اسود کی بہن نے اس دھوکے بازی سے انہیں روک دیا اور کہا' تمہیں ان سے مقابلہ کرنا چاہئے' اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا کیونکہ وہ ظالم ہیں' لوگوں نے اس لڑکی کی بات نہیں مانی تو وہ کہنے لگی:

"دھوکا نہ کرو کیونکہ یہ ایک نقص ہوتا ہے' عیب آخر عیب ہی دکھائی دیا کرتا ہے' خواہ چھوٹا ہی ہو' میں کل کے بارے میں تمہارے بارے فکر مند ہوں' معاملات میں غور کیا جائے تو کوئی راہ نکل ہی آیا کرتی ہے۔

جنگ کی آگ ان کے مقابلے میں آ کر بھڑکاؤ' تم میں سے ہر ایک بہادر ہے' مجھے امید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔"

اس پر اُس کے بھائی نے مقابلے میں آنے سے گریز کی وجہ بتائی کہ وہ بادشاہ طاقتور ہے ہماری گردنیں اُڑا دے گا۔

چنانچہ اس اسود نے کھانا تیار کر دیا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی تلوار ننگی کر کے ریت کے نیچے دبا دی۔ بادشاہ بیٹھ گیا اور قوم بھی کھانا شروع کرنے لگی تو جدیس قبیلہ والے ان پر جھپٹ پڑے اور سب کو قتل کر دیا پھر دوسرے لوگوں کو بھی جا قتل کیا۔ اسی اثناء میں طسم قبیلہ کا ایک نوجوان بھاگا اور تبع سے جا ملا' یہ اسعد بن کلیکرب میں سے تھا' کچھ کہتے ہیں کہ حسان بن تبع حمیری کی اولاد سے تھا اور مدینہ میں رہتا تھا۔

طسم والے آدمی نے جا کر اس سے فریاد کی اور ایسے اشعار سنائے جن میں اس دھوکے کا ذکر تھا جو جدیس قبیلہ نے کیا تھا چنانچہ اس نے اس سے امداد کا وعدہ کر لیا لیکن پھر امداد نہ کی۔

زرقاء الیمامہ کا قصہ

دوسرے اشعار میں ہے کہ تبع اپنے لشکر لے کر مدینہ سے چلا اور جب وہ یمامہ سے ایک رات کی مسافت پر پہاڑ کے پاس پہنچا تو اسے اس طسمی شخص نے کہا' اے بادشاہ ٹھہر جاؤ کیونکہ میری ایک بہن ہے جو جدیس قبیلہ میں بیاہی ہوئی ہے' اس کا نام یمامہ ہے' وہ بہت تیز نظر کی مالک ہے' مجھے ڈر ہے کہ وہ ہمیں دیکھ لے گی تو یہ لوگ اس کے نام پر ہمیں ڈرائیں گے۔

تبع وہیں ٹھہر گیا اور ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ پہاڑ پر چڑھ کر انہیں دیکھے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں' پہاڑ سے اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا' وہ اسے نکالنے کے لئے نیچے جھکا تو یمامہ نے اسے دیکھ لیا' اس کی آنکھیں نیلگوں تھیں۔ وہ انہیں کہنے لگی کہ میں نے فلاں پہاڑ پر ایک آدمی دیکھا ہے' یقیناً وہ آدمی ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا کر رہا ہے؟ تو اس نے کہا کہ یا تو وہ جوتا درست کر رہا ہے' یا مونڈھے کھجلا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اسے جھٹلا دیا۔

اس کے بعد طسمی نے تبع سے کہا کہ رات کے وقت اس کی نظر اور تیز ہو جاتی ہے لہٰذا اپنے ساتھیوں سے کہو کہ درختوں سے ٹہنیاں کاٹ لو تا کہ اپنی حفاظت کر سکو' اس سے وہ شبہ میں پڑ جائے گی چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ رات کے وقت یمامہ کے قریب پہنچ گئے تو اس نے ان کی طرف دیکھا تو کہنے لگی: اے جدیس قبیلہ والو! تمہاری طرف

درخت چلے آ رہے ہیں یا پھر حمیر قبیلہ کے اولین گھوڑے آ رہے ہیں' انہوں نے پھر اسے جھٹلایا' یوں صبح سویرے حمیر والے ان کے پاس پہنچ گئے تو اسود اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ جبل طئی کی طرف بھاگ گیا' یوں اہل مدینہ نے یمامہ کا قلع فتح کر لیا' صرف نیلگوں آنکھوں والی یمامہ کا قلعہ رہ گیا' تبع نے صبر سے کام لیا اور اسے فتح کر کے یمامہ کو قبضہ میں لے لیا' پھر اس سے پوچھا کہ تم نے انہیں کیسے دیکھا تھا؟ تو اس نے پہاڑ پر چڑھے شخص کا واقعہ سنا دیا۔ تبع نے اس آدمی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھا تو میری جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا تھا اور پھر پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ چنانچہ یمامہ نے اس کا کانٹا نکال دیا اور تسمہ گانٹھ دیا۔ اس کے بعد تبع نے نظر میں اس قدر تیزی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میں ایک سیاہ پتھر لیتی' اسے باریک کرتی اور سرمہ کے طور پر آنکھوں میں لگایا کرتی ہوں جس کی وجہ سے میری نظر تیز ہوگئی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یمامہ پہلی خاتون ہے جس نے اثمد پتھر کا سرمہ لگایا تھا۔ تبع نے اس کی آنکھیں نکالنے کا حکم دیا تاکہ دیکھ سکے کہ ان میں کیا ہے؟ اس نے دیکھا تو آنکھ کی تمام رگیں' اثمد سرمہ سے بھری تھیں۔ اس دن یمامہ کو برباد کر دیا گیا' تبع نے وہاں رہنے والوں کو قتل کر دیا اور کوئی ایک بھی نہ رہنے دیا تھا' اس کے بعد وہ مدینہ کو واپس آ گیا۔

یہ وہ مضمون ہے جو علامہ مجد نے علامہ یاقوت سے مختصر طور پر نقل کیا ہے اور اس میں قصہ مذکورہ کے الٹا ہونے کا کوئی معاملہ نہیں' یہ صورت تو مدینہ اور یمامہ دونوں سے بن سکتی ہے اور لگتا یوں ہے کہ قصہٴ یمامہ قصہٴ مدینہ کے بعد کا ہے۔

رزین نے شرقی سے نقل کی ہے کہ ابوجبیلہ جب اہلِ مدینہ کی امداد کر کے فارغ ہو گیا تو شام کی طرف چلا گیا' پھر آخری تبع کا دور آیا (یہ کرب بن حسان بن اسعد حمیری تھا اور تبع نامی تمام لوگ حمیر کی اولاد تھے) اس نے پہلے تبع نامی بادشاہوں کی طرح مشرق جانے کا ارادہ کیا اور مدینہ کی طرف گیا' وہاں اپنے بیٹے کو نائب بنا کر شام کو چلا اور پھر وہاں سے عِراق کو گیا' یہ جب عراق پہنچا ہے تو مدینہ میں اس کا لڑکا دھوکے سے قتل کر دیا گیا لہٰذا وہ مدینہ میں تباہی کے ارادے سے واپس مڑا اور اُحد کے دامن میں ٹھہر گیا' وہاں اس نے کنواں کھدوایا اور پھر مدینہ کے بڑے بڑے شرفاء کو بلا بھیجا۔ جب ایلچی ان کے پاس پہنچا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم پر غلبے کا ارادہ کئے ہوئے ہے پھر احیحہ بولا' بخدا اس نے تمہیں خیریت سے نہیں بلایا' اس احیحہ کے پاس جنوں کا سردار تھا چنانچہ وہ وہاں سے نکلے تو احیحہ بھی ان کے ساتھ نکلا' اس کے ساتھ ایک گانے والی' شراب اور ایک خیمہ تھا' اس نے خیمہ لگا دیا اور گانے والی کے ساتھ شراب بھی رکھ دی اور سب سے پہلے تبع کے پاس چلا گیا' اس سے بات چیت کی اور اسے پتہ چل گیا کہ یہ شریر ہے' پھر کہا کہ میرے ساتھی تمہیں ظہر تک ملنے آئیں گے۔ اس کے بعد اس نے خیمہ کی طرف چلے جانے کی اجازت مانگی تو اس نے اجازت دے دی۔ اس نے وہاں شراب پی اور گانے والی نے اشعار گائے۔ اس نے تھوڑی سی شراب پی تھی' اس کے ساتھی رات کے قریب آئے تو تبع نے ان کی دعوت کرنے کو کہا' جب آدھی رات ہوئی تو اس نے انہیں قتل کر دینے کا پیغام بھیجا' احیحہ کو پتہ چل گیا تو اس نے اس لونڈی سے کہا: میں گھر جاتا ہوں اور جب بادشاہ مجھے بلائے تو کہہ دینا کہ وہ

سو رہا ہے اور اگر پھر بھی اصرار کریں تو انہیں کہنا کہ احیحہ تو چلا گیا' اس نے اپنی لونڈی سے دھوکا کیا ہے۔

چنانچہ احیحہ اپنے قلعے میں محفوظ ہو گیا' انہوں نے تین دن تک اس کا محاصرہ کیے رکھا' صرف دن کو لڑائی کرتے' رات ہوتی تو وہ ان کی طرف کھجوریں پھینک کر کہتا کہ یہ تمہاری مہمان نوازی ہے لہٰذا تبع کو اطلاع دے دو کہ وہ مضبوط قلعے میں ہے پھر اس نے حکم دیا کہ اس کی کھجوریں جلا دو چنانچہ تبع اور مدینے میں رہنے والے یہودیوں' اوس اور خزرج کے درمیان جنگ بھڑک اُٹھی اور وہ اپنے قلعوں میں محفوظ ہو گئے۔

اب تبع کی طرف سے ایک شخص بنو عدی بن نجار کی طرف آیا' ان کے باغ میں داخل ہوا' کھجور کے درخت پر چڑھا اور اسے کاٹنے لگا' درخت والا نیچے اترا اور اسے قتل کر دیا پھر گھسیٹ کر کنوئیں میں گرا دیا۔

اس پر تبع کو بہت غصہ آیا اور اس نے بنو نجار کی طرف گھوڑے دوڑائے' بنو نجار نے ان کا مقابلہ کیا' ان دنوں ان کا رئیس عمرو بن طلحہ تھا' یہ بنو معاویہ بن مالک بن نجار کا بھائی تھا' تبع کے لشکر نے انصار کے قلعوں کو تیر کا نشانہ بنایا۔ جب اسلام آ گیا تو وہ تیر محفوظ تھا۔ اس لڑائی میں تبع کا گھوڑا چلایا تو اس نے قسم اُٹھائی کہ وہ اس وقت تک یہاں سے نہیں جائے گا جب تک مدینہ کو برباد نہیں کر دے گا' یہ اس کا ایک خیال تھا۔ اس کی یہ بات یہودی عالموں نے سن لی تو اس کے پاس گئے اور کہنے لگے:

> ''اے بادشاہ! یہ شہر حفاظت میں لے لیا گیا ہے' ہم اپنی کتابوں میں اس کا نام ''طیبہ'' دیکھتے ہیں' یہ اولادِ اسماعیل میں سے ایک نبی کی ہجرت گاہ بن رہا ہے اور حرم ہے' یہ اس کی رہائش گاہ ہو گی لہٰذا تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔''

تبع نے ان کی یہ بات سنی تو حیران رہ گیا اور اس کے بارے میں اپنی نیت تبدیل کر لی اور پھر اپنے لشکر کو حکم دیا تو انہوں نے آپس میں عہد و پیمان کر لئے۔ تبع کا وہ کنواں جو اس نے کھودا تھا' خراب ہو گیا' وہ بیمار ہو گیا تو بنو زریق میں سے ایک ''فکہہ'' نامی عورت اس کے پاس صاف پانی لے کر آئی جو اس نے رومہ نامی کنوئیں سے لیا تھا' پانی اسے اچھا لگا تو اس نے لذیذ سمجھ کر پی لیا۔

جب اس کی روانگی کا وقت ہوا تو اس سے کہا' اے فکہہ! جب ہم یہاں سے چلے جائیں تو جو کچھ ہم یہاں چھوڑیں گے' تمہارا ہو گا چنانچہ اس نے سب کچھ لے لیا اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہ رہی۔ تبع یمن کا ارادہ لے کر روانہ ہوا' وہ یہودی دو یا تین عالم' جنہوں نے اسے مدینہ کی بربادی سے منع کیا تھا' اس کے ہمراہ تھے' تبع نے ان سے کہا تھا کہ کچھ دن میرے ساتھ رہو کیونکہ تمہاری گفتگو مجھے پسند آئی ہے' وہ راستے میں اسے اپنی کتاب کے بارے میں بتاتے رہے اور نبی کریم ﷺ کی باتیں سناتے رہے' تبع نے انہیں ساتھ ہی رکھا اور یمن پہنچ گئے۔ یہ پہلے وہ یہودی تھے جو سرزمین یمن میں داخل ہوئے تھے۔ تبع کی طرف سے خانہ کعبہ کو غلاف پہنانے کا قصہ تو پہلے گذر ہی چکا ہے۔

ہم ایک روایت میں پہلے بتا چکے ہیں کہ جب مالک بن عجلان نے یہودیوں کے بادشاہ کو قتل کر دیا تو تبع اصغر کو

ملنے کے لئے یمن کا ارادہ کر لیا' یہی وہ شخص تھا جس نے یہودیوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کی تھی اور شاید علامہ یاقوت کے اس قول کا مقصد بھی یہی ہے' کہا تھا: "یہودی ہی اہل مدینہ تھے کہ اسی دوران تبع ان کے پاس آ گیا اور بنو عمرو بن عوف کو ان کے ہمراہ ٹھہرا دیا' لیکن علامہ مجد وغیرہ نے ابن اسحٰق کی کتاب "مبتدا" سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے اس گھر کے بارے میں کہا تھا جس میں مدینہ تشریف آوری کے موقع پر نبی کریم ﷺ ٹھہرے تھے کہ: یہاں سے گذرتے وقت تبع اول نے اسے بنایا تھا چنانچہ "ابتداء" میں کہا: اس کا نام قبان اسعد بن کلیکرب تھا اور اس کے ہمراہ چار سو عالم تھے' انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ یہاں سے کسی بھی صورت میں نکلیں گے نہیں۔

تبع نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک شخص محمد نام والا ہوگا' یہ اس کی ہجرت کا مقام ہے لہٰذا ہم یہاں ٹھہرے رہیں گے کہ شاید ان سے ملاقات ہو جائے چنانچہ تبع نے بھی ان کے ساتھ ہی رہنے کا ارادہ کر لیا پھر اس نے ان عالموں میں سے ہر ایک کے لئے مکان بنوایا' پھر ایک لونڈی خریدی' اس سے شادی کر لی اور اسے بہت سا مال دیا پھر ایک خط لکھا جس میں آپ پر اپنے اسلام لانے کا ذکر کیا تھا' اس خط میں یہ اشعار بھی تھے:

"میں احمد کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ مخلوقات کو پیدا فرمانے والے اللہ کے رسول ہوں گے' اگر ان کی تشریف آوری تک میں زندہ رہا تو ان کا وزیر بنوں گا اور چچا زاد ہوں گا۔"

پھر اس پر سنہری مہر لگا دی اور ان عالموں میں سے ایک بڑے کو دے دیا پھر اسے تاکید کی کہ اگر اسے نبی کریم ﷺ سے ملاقات کا موقع مل جائے تو ان کی خدمت میں پیش کر دے' ورنہ اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیتا چلا جائے اور پھر حضور ﷺ کی تشریف آوری پر آپ کی رہائش کے لئے ایک مکان بھی بنا دیا چنانچہ تبع کے بنائے اس مکان کے مالک بنتے گئے اور آخرکار یہ مکان حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا' آپ اسی عالم کی اولاد میں سے تھے اور اہل مدینہ میں سے ہر ایک انہی عالموں کی اولاد تھا جنہوں نے حضور ﷺ کی مدد کی تھی۔ انتہی۔

علامہ مجد کے علاوہ دوسرے عالم نے اس مضمون میں اور اضافہ کیا کہ: "وہ خط جس میں یہ اشعار لکھے تھے' اس وقت حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے پاس تھا جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تھے چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تاریخ کی کتابیں انصار کے بارے میں ہمارے پہلے بیان پر اتفاق کرتی ہیں۔

علامہ سہیلی نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ تبع کے ایمان کا ذکر کیا ہے اور دو شعر بھی لکھے ہیں پھر یہ حدیث بھی لکھی ہے کہ "تبع کو برا بھلا نہ کہنا کیونکہ وہ ایمان لے آیا تھا۔"

پھر علامہ عبدالرزاق نے حضرت وھب بن منبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی انہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے جس کے بارے میں اسعد کو برا بھلا کہنے سے منع کیا تھا' یہ تبع ہی تھا۔ حضرت وھب بتاتے ہیں کہ یہ دین ابراہیم کا پیروکار تھا۔

حضرت احمد نے حضرت سہل بن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے: ''تبع کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ اسلام لے آیا تھا۔'' طبرانی نے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے جس کی سند سہل سے بھی بہتر ہے' البتہ عبد الرزاق نے جو حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو یہ روایت کی ہے کہ ''مجھے اس بارے میں علم نہیں ہو سکا کہ تبع لعنتی تھا یا نہیں'' تو اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں' آپ کا یہ ارشاد اس کے بارے میں علم سے پہلے کا ہے۔

علامہ مرجانی کہتے ہیں کہ کرب بن اسعد حمیری کا باپ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے سات سو سال پہلے ایمان لایا تھا۔ مرجانی کہتے ہیں کہ میں نے احمد کے ذکر کردہ یہ دو اشعار دیکھے ہیں' اس کا باپ اسعد تھا اور یہ وہی تبع تھا جس نے کعبہ پر غلاف ڈالا تھا۔ مرجانی نے یہ بات ابن قتیبہ کے بیان سے لی ہے پھر قتیبہ ہی کی جو روایت ''معارف'' میں میں نے دیکھی ہے' وہ یہ ہے کہ اسعد' کرب حمیری کا باپ تھا اور جو کچھ پہلے ذکر ہوا' اسی کے بارے میں تھا۔

ابن زبالہ نے لکھا ہے کہ جب تبع مدینہ میں آیا اور اسے برباد کرنے کا ارادہ کیا تو بنو قریظہ میں سے دو عالم آئے جن کے نام سمیت اور منبہ تھے' وہ کہنے لگے کہ اے بادشاہ! اس شہر سے ٹل جاؤ کیونکہ اس کی حفاظت ہو رہی ہے' یہ وہ شہر ہے کہ آخری زمانے میں بنو اسماعیل میں سے ایک نبی کی ہجرت کا مقام بنے گا جن کا نام احمد ہوگا۔ اسے یہ بات بہت پسند آئی' دونوں کو درست قرار دیا اور اہلِ مدینہ کو تکلیف دینے سے باز آیا۔

فصل نمبر ٥

اس فصل میں یہودیوں کی ذلت کے بعد انصار قبیلوں کے مکانات کا ذکر ہے' ان کے کچھ قلعوں کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں جنگیں کیسے ہوئیں؟ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان مسجدوں کے بارے میں پتہ چل سکتا ہے جن کا ان دنوں کسی کو علم ہی نہیں۔

دیکھیے' جو کچھ ابن زبالہ نے نقل کیا ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو جبیلہ کی واپسی اور امداد کے بعد اوس و خزرج' مدینہ کے بالائی اور زیریں علاقے میں پھیل گئے' جائیدادیں بنا لیں اور اپنے اپنے قلعے تیار کر لئے چنانچہ بنو عبد الاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج اصغر اور بنو حارثہ بن حارث بن خزرج اصغر بن عمرو بن مالک بن اوس بن حارثہ' یہ دونوں گروہ اوس سے تعلق رکھتے تھے' یہ لوگ مشرق میں موجود پتھریلی جگہ میں دارِ بنو ظفر کی ایک طرف دارِ بنو عبد الاشہل میں ٹھہرے تھے۔ یہ بات علامہ مطری نے لکھی ہے لیکن جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے کہ ان کے گھر بنو ظفر کے مکانات کے قریب اس طرف واقع تھے جو شام کی جانب ہے اور پھر یہ مکانات اس پتھریلی زمین تک پھیل گئے تھے جو آج کل ''دشم'' کے نام سے مشہور ہے اور اس کے اردگرد کے علاقے میں تھے بلکہ خندق کے بیان میں جو کچھ آگے آ رہا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ''شیخین'' کے قریب تھے۔ بنو عبد الاشہل نے قلعے بنائے تھے جنہیں ''واقم'' کہتے تھے اور اسی پورے علاقے کو ''واقم'' کہا جانے لگا' اس علاقے میں حضیر بن مالک کے کچھ قلعے تھے' ان میں سے ایک شاعر نے انہی کے متعلق کہا تھا:

"ہم نے پتھریلی جگہ میں "واقم" بنایا اور گارے سے اونچے مکان بنائے۔"

حضیر بن سماک کے ان قلعوں کو "رعل" کہا جاتا تھا اور اس کی وجہ وہ زمین تھی جو "واسط" کہلاتی تھی کیونکہ یہ بنو عبد الاشہل کی والدہ کا صخرہ کہلاتا تھا' اسی کے بارے میں "بعاث" کے موقع پر ایک شاعر نے کہا تھا: "ہم بنو صخرہ ہیں جو رعل کے علاقہ والے ہیں" علاوہ ازیں حضیر بن سماک کے اور قلعے بھی تھے' پھر بنو حارثہ نے قلعے بنائے جنہیں "مُسَيَّر" کہا جاتا تھا اور جب بنو حارثہ اپنے گھروں سے نکل گئے تو یہ بھی بنو عبد الاشہل کے قبضہ میں آ گئے کیونکہ بنو حارثہ ان مکانات کو چھوڑ کر حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت کے مغرب میں اس مقام پر آباد ہو گئے جو آج کل یثرب کے نام سے مشہور ہے تو یہ وہ جگہ ہے جہاں ان کے مکانات تھے جیسے کہ پہلے باب میں ہم مطری کی روایت بیان کر چکے ہیں تاہم علامہ واقدی اور ابن زبالہ وغیرہ کے کلام سے جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جن مکانات میں وہ ٹھہرے رہے اور اسلام آنے پر وہیں رہائش رکھتے تھے یہ مکانات مشرقی حَـرّہ بنو عبد الاشہل کی شام والی جانب میں تھے' پھر اس کی تائید خندق کے بیان میں اس بیان سے ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے لئے "شیخین" کے آباد علاقے میں خط لگا دیا تھا جو بنو حارثہ کی ایک جانب واقع تھا (طبرانی)۔

علامہ مطری نے' جیسے کہ آگے آ رہا ہے' کہا ہے کہ "شیخان" مدینہ اور اُحد پہاڑ کے درمیان ہے اور یہ حرہ کے ساتھ جبلِ احد کی طرف جاتے ہوئے راستے کے مشرق میں ہے اور پھر اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مطری نے ذکر کیا ہے: نبی کریم ﷺ جنگ احد کے موقع پر صبح کو احد کی طرف تشریف لے جاتے وقت اسی مذکور شرقی راستے پر چلے تھے اور آگے آ رہا ہے کہ آپ رات کو "شیخین" میں ٹھہرے تھے۔

ابنِ قتیبہ کی "معارف" میں ابن اسحاق سے ہے کہ "جب قریش رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لئے چلے تو رسول اللہ ﷺ اور مسلمان نکلے پڑے اور رات و دن کا باقی حصہ بنو حارثہ کے مکانوں میں گذارا' پھر اگلے دن وہاں سے چلے۔ یہاں ابن اسحاق نے عبد اللہ بن اُبَـیّ کے مرتد ہونے کا ذکر کیا ہے' چنانچہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنو حارثہ کے مکانات "شیخین" اور اس کے اردگرد تھے۔ ابن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس دن گذر کر مربع بن قیظی کے گھر گئے تھے اور یہ آئندہ بیان اسی سے ملتا جلتا ہے' یہ مربع نامی شخص بنو حارثہ میں سے تھا۔ اور پھر ہم چوتھی فصل میں اس کی حرمت کے بارے میں اسماعیلی کی روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول بتا چکے ہیں کہ: پھر نبی کریم ﷺ بنو حارثہ کے پاس آئے اور وہ حرّہ کے مقام پر تھے الخ جبکہ وہ مقام جس کا مطری نے ذکر کیا ہے' حرہ کے مقام پر نہیں ہے' وہاں وہ ہے جس کا ہم بیان کر چکے اور پھر یہ بھی احتمال ہے کہ بنو حارثہ کے کچھ مکانات اس مقام پر ہوں جن کا مطری نے بھی ذکر کیا ہے۔

ابن زبالہ لکھتے ہیں کہ بنو حارثہ نے اس نئی جگہ پر کچھ قلعے بنائے جنہیں ریان کہا جاتا تھا' یہ مسجد بنو حارثہ کے پاس تھے' یہ مسجد مجذعہ بن حارثہ کی کہلاتی تھی۔ بنو حارثہ کے بنو عبد الاشہل کے مکانوں سے نکلنے کی وجہ وہ جنگ تھی جو ان

کے اور بنو عبد الاشہل کے درمیان ہوئی تھی' اس میں بنو ظفر نے بنو عبد الاشہل سے تعاون کیا تھا پھر بنو حارثہ نے انہیں شکست دے دی اور سماک بن رافع کو قتل کر دیا' بغاوت کرنے والا یہی تھا' اسے مسعود ابو محیصہ حارثی نے قتل کیا تھا' بنو حارثہ کامیاب ہوئے تو پہلے انہیں جلا وطن کر دیا' وہ بنو سلیم کی سرزمین میں چلے گئے' حضیر بن سماک بنو سلیم کی طرف گیا' بنو حارثہ سے لڑا اور کئی لوگ قتل کر دیئے' ان کا محاصرہ' ان کے "مُسَیّر" نامی قلعوں میں سخت ہو گیا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے' چنانچہ بنو عمرو بن عوف اور بنو خطمہ ان کی طرف گئے اور کہنے لگے کہ یا تو ان کا راستہ خالی کر دو' یا اپنے ساتھی کی دیت لے لو اور یا پھر ان سے صلح کر لو لیکن انہوں نے یہ بات پسند کی کہ انہیں وہاں سے نکال دیں چنانچہ بنو حارثہ خیبر کی طرف چلے گئے اور تقریباً سال بھر وہیں رہے پھر حضیر کے دل میں نرمی آئی تو صلح کے لئے تیار ہو گئے' دونوں طرف کے ثالث آئے اور ان میں صلح ہو گئی لیکن بنو حارثہ نے بنو عبد الاشہل کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور اس مقام میں ٹھہرے جو آج کل ان کے نام سے منسوب ہے اور بنو ظفر (یعنی کعب بن خزرج اصغر بن عمرو بن مالک بن اوس) اپنے اس مقام میں ٹھہرے جو ان کی مسجد کے پاس بقیع کی مشرقی جانب تھا' یہ مسجد' مسجدِ بغلہ کے نام سے مشہور تھی اور بنو عبد الاشہل کے قریب تھی۔

ابن حزم نے "جمہرہ" میں ذکر کیا ہے کہ بنو عمرو بن مالک بن اوس کے قبیلے یہ تھے: "نبیت جن میں ظفر شامل تھا' حارثہ' بنو عبد الاشہل' بنو زعورا بن جشم بن حارث جو عبد الاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔ ابن زبالہ نے بنو زعوراء کو ان خاندانوں میں ذکر نہیں کیا بلکہ تمام انصار کے قبیلوں میں شامل نہیں کیا۔ البتہ ابن حزم کہتے ہیں کہ مالک بن تیہان اور بنو اوس بن عقیک وغیرہ اسی میں شامل تھے۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ جشم کے ہاں عبد الاشہل پیدا ہوا' یہ بڑا قبیلہ تھا' زعوراء بھی قبیلہ تھا جنہیں اہل راتج کہتے تھے۔

قبیلۂ بنو عمرو بن عوف بن مالک بن اوس' قباء میں ٹھہرے' انہوں نے یہاں قلعہ بنایا جسے شنیف کہا جاتا تھا' یہ ابو سفیان بن حارث کے گھر کے قریب' مراء کی پہاڑوں اور بنو الموالی کی مجلس کے درمیان تھا جو بنو ضبیعہ بن زید بن مالک بن عوف کی تھی اور ایک قلعہ عبد اللہ بن ابو احمد کے گھر میں تھا جو کلثوم بن ہدم کا کہلاتا تھا' یہ کلثوم' بنو عبید بن زید بن اسلم میں سے تھا جو بنو عبید بن زید بن مالک کا بھائی تھا اور ایک قلعہ وہ تھا جسے واقم کہا جاتا تھا جو احیحہ بن جلاح جحجبی کے نام پر قباء میں تھے اور پھر ان کے دادا رفاعہ بن زر بن زید بن امیہ بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف کی دیت کی وجہ سے بنو عبد المنذر بن رفاعہ ہو گیا تھا' اور بنو زید بن مالک بن عوف کی کھلی زمین میں چودہ قلعے تھے جنہیں "صیاصی" کہا جاتا تھا اور پھر مسجد قباء کے مشرق میں بھی مسکبہ کے مقام پر ان کا ایک قلعہ تھا اور ایک وہ قلعہ بھی تھا جسے "مستظل" کہا جاتا تھا' وہ غرس کنوئیں کے قریب تھا' یہ احیحہ کا تھا اور پھر ان کے دادا رفاعہ کی دیت کی وجہ سے بنو عبد المنذر کا ہو گیا پھر بنو جحجبا بن کلفہ بن عوف بن عمرو بن عوف اس وقت قباء سے نکل گئے جب انہوں نے رفاعہ بن زر اور غنم کو قتل کر دیا تھا جو بنو عمرو بن عوف کے بھائی تھے چنانچہ "عصبہ" میں جا ٹھہرے' یہ مسجد قباء کے مغرب میں تھا۔ سعد بن عمرو

جحجبی نے بشر بن سائب سے کہا تھا: جانتے ہو کہ ہم "عصبہ" میں کیوں ٹھہرے ہیں؟ اس نے کہا' معلوم نہیں' اس نے کہا: اس لئے کہ ہم نے دور جاہلیت میں تمہارا ایک شخص قتل کر دیا تھا۔ اس پر بشر نے کہا۔ یہ بات امانت ہے' میں یہ پسند کرتا ہوں کہ ہم میں سے ایک اور کو قتل کر دو' تم عیر کے پیچھے ہو یعنی اس پہاڑ کے پیچھے جو "عصبہ" کے مغرب میں ہے۔

پھر احیحہ بن جلاح نے عصبہ میں ایک قلعہ بنایا جسے ضحیان کہتے تھے اور وہ سیاہ رنگ کا قلعہ عصبہ میں تھا' اس کی چوڑائی اور لمبائی تقریباً ایک جیسی تھی' پہلے اس نے اسے چھوٹے چھوٹے سفید پتھروں سے بنایا تھا جو گر گیا تھا' اسے دور سے دیکھا جا سکتا تھا' احیحہ نے اسی کے بارے میں کہا تھا:

"میں نے نو عمروں کے لئے ایک قلعہ بنایا ہے' اگر آدمی کی عقل ساتھ دے' اس کا سر لمبا تھا اور یہ سفید تھا' بلند تھا اور ایسے روشن تھا جیسے صاف کی ہوئی تلوار۔"

پھر انہوں نے اور بنو مجدعہ نے ایک قلعہ بنایا جسے "ھجیم" کہتے تھے' یہ اس مسجد کے قریب تھا جس میں نبی کریم علیہ السلام نے نماز پڑھی تھی' یہ پہلے ذکر ہو چکا کہ بنو انیف یہودیوں کے ساتھ قباء میں تھے' یہ بنو انیف "بلی" کی ایک شاخ ہے' اسی وجہ سے ابن زبالہ نے ان کے مکانوں کا یہاں ذکر نہیں کیا اور عنقریب اس کا ذکر مطری کی ذکر کردہ مسجدوں میں آ رہا ہے' علامہ مجد نے بھی اسی کی پیروی کی ہے کہ بنو انیف بھی اوس ہی کی ایک شاخ ہے اور ان کے گھر بنو عمرو بن عوف اور عصبہ کے درمیان تھے۔ علامہ مطری نے انہیں اوس کی طرف منسوب کرتے وقت مغازی میں اہلِ سیرت کے قول کو سامنے رکھا ہے: اوس کے اتنے لوگ شہید ہو گئے تھے اور پھر ان میں کچھ بنو انیف بھی ذکر کئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اوس کے حلیف تھے' اس لئے نہیں کہ یہ ان میں سے تھے۔ اس پر ابن اسحٰق نے تنبیہ کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ بدر میں اوس کے ساتھ سے کچھ زیادہ لوگ شامل ہوئے تھے چنانچہ بنو جحجبا کی ایک جماعت کا ذکر کیا' پھر کہا کہ ان کے حلیف لوگوں میں بنو انیف کے ابو عقیل تھے پھر اسے بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ کی طرف منسوب کیا لیکن مطری کے قول سے جو کچھ ہمیں پتہ چلا' وہ یہ ہے کہ ان کے گھر عصبہ اور قباء کے درمیان تھے اور ابن زبالہ سے ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کچھ گھر بیر عذق اور اس کے اردگرد تھے اور پھر اس اراضی کے درمیان تھے جسے "قائم" کہا جاتا ہے اور یہ قباء میں مشہور جگہ ہے۔

بنو معاویہ بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف نکلے تو اپنے اس گھر میں ٹھہرے جو بقیع غرقد کے پیچھے انہی کے نام سے مشہور تھا اور جو کچھ خزرج میں بنو نجار کے گھروں کے بارے میں آ رہا ہے کہ حدیلہ' معاویہ بن عمرو بن مالک بن نجار کا لقب ہے' یہ اعتراض نہیں بن سکتا کیونکہ نام میں اشتراک پایا جاتا ہے لیکن ان کے لئے شہرت بنو معاویہ کو حاصل ہے اور یہ لوگ بنو حدیلہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن یہ بات مطری کے لئے شبہ کا باعث بن گئی چنانچہ انہوں نے مسجد بنو معاویہ (مسجد الاجابہ) کے بارے میں جو کہہ دیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ بنو معاویہ بن عمرو بن مالک بن نجار کی مسجد ہے اور پھر بنو نجار کے گھروں کے بارے میں کہا کہ:

بنو حدیلہ' بنو معاویہ بن عمرو بن مالک بن نجار تھے اور ان کے گھر ''بُرحاء'' کے قریب تھے۔ پھر کہا کہ بنو دینار کے گھر بنو معاویہ بن عمرو بن مالک بن نجار کے درمیان تھے جو مسجد اجابہ اور دار بنو حدیلہ والے تھے چنانچہ پہلے تو انہوں نے یہ ذکر کیا کہ یہ وہی ہیں اور بعد میں انہیں الگ الگ بتا دیا اور درست بھی یہی ہے کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اور بنو حدیلہ خزرج سے ہیں جبکہ بنو معاویہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اہلِ سیرت نے بھی دونوں کو الگ الگ بتایا ہے اور ان کو الگ الگ قبیلہ سے منسوب کیا ہے جیسے کہ ہم بتا چکے اور مسجد اجابہ' اوس کے قبیلہ بنو معاویہ سے منسوب ہے اور مطری نے جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے' وہ ہے جو قاضی عیاض کی طرف سے انشاء اللہ بنو حدیلہ کے بیان میں آئے گا اور بنو معاویہ میں سے حاطب بن قیس بھی ہیں اور انہیں میں حاطب کی جنگ ہوئی تھی جیسے ابن حزم نے ذکر کیا ہے۔

بنو سمیعہ (یہ بنو لوذان بن عمرو بن عوف تھے) نکلے تو: ''رقاق ربیع'' کے قریب ٹھہرے اور یہیں انہوں نے اپنا قلعہ بنایا جسے ''سعدان'' کہتے تھے اور اس کا مقام ''ربع'' (وہاں کا ایک باغ) تھا جیسے ابن زبالہ نے بتایا اور شاید یہ وہی باغ ہے جو آج کل ''ربعی'' کے نام سے مشہور ہے ان بنو سمیعہ کو دورِ جاہلیت میں بنو الصماء کہا جاتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے انہیں بنو سمیعہ کا نام دے دیا۔

بنو واقف اور سلم' امرئ القیس بن مالک بن اوس کی اولاد تھے' یہ مسجد فضیخ کے قریب ٹھہر گئے۔ یہ اور ان کی اولادیں یہیں رہے۔ بنو واقف نے قلعہ بنایا جسے ''زیدان'' کہا جاتا تھا' قیس بن رفاعہ نے اسی کے بارے میں کہا تھا:

'' ان کے بعد (بنو واقف) میں خوشگوار زندگی کی امید کیسے کر سکتا ہوں اور ان کے بھی بعد جو اہلِ زیدان میں سے جا چکے۔''

بنو واقف وغیرہ کے لئے عام جگہ مسجد الفضیخ کے قبلہ میں تھی اور ان کے قلعہ کی جگہ ''بئرِ عائشہ واقمی'' وغیرہ تھی۔ پھر سَلَم اور واقف کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا چنانچہ بڑے واقف نے سلم کی آنکھ پر تھپڑ مار دیا (یہ بڑا بدخلق تھا) سلم نے قسم کھا لی کہ یہاں نہیں رہے گا لہٰذا وہ بنو عمرو بن عوف کے ہاں جا ٹھہرا اور پھر اس کی اولاد بھی یہیں رہی (انہی میں سے سعد بن خیثمہ بن حارث تھا) اور پھر ۱۹۹ھ ہجری میں یہ لوگ ختم ہو گئے۔

بنو سلم کا ایک قلعہ مسجد قباء کی مشرقی جانب تھا جیسے ابن زبالہ نے بتایا ہے جبکہ ابن حزم نے تمام بنو سلم کے ختم ہو جانے پر لکھا ہے کہ: دورِ جاہلیت میں ان کے جنگجوؤں کی تعداد ایک ہزار ایک تک پہنچ گئی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ اشرفیہ اور سابور نامی مشہور باغ کے نزدیک مسجد فضیخ کے قبلہ کی طرف قلعوں کے آثار' شہر اور عظیم قلعے کے آثار اب بھی باقی ہیں' یہ بنو واقف کے مکانات تھے۔

بنو وائل بن زید بن قیس بن عامر بن مرہ بن مالک بن اوس اسی حویلی میں ٹھہرے جو ان کے نام سے مشہور ہے انہوں نے قلعہ بنایا جسے "موجا" کہا جاتا تھا' اس کی جگہ مسجد بنو وائل میں تھی۔

بنو امیہ بن زید بن قیس بن عامر بن مرّہ بن مالک بن اوس اپنے ان گھروں میں ٹھہرے جو ان کے نام سے مشہور تھے جہاں "کبا" بھی تھا جس میں مذینب کا سیلاب ان کے گھروں سے گذرتا تھا پھر یہ سیلاب اور بنو قریظہ کا سیلاب بنو خطمہ کے کھلے میدان میں مل جاتا تھا اور اسی سے وہ نتیجہ نکلتا ہے جو ابن زبالہ نے "نواعم" میں بنو نضیر کے گھروں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بنو امیہ بن زید کے گھر کے قریب تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں اور انصار میں سے میرا ایک ہمسایہ بنو امیہ بن زید میں تھے' یہ مدینہ کی بالائی جانب تھا' ہم باری باری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قلعہ بنایا جسے "اطم عذق" کہا جاتا تھا یہ "کبا" میں تھا جو بنو امیہ کی مسجد کے مقابلہ میں تھا' علاوہ ازیں ایک قلعہ آلِ رویفع کی حویلی میں تھا جو مسجد بنو امیہ کے مشرق میں تھی۔

بنو عطیہ بن زید بن قیس بن عامر بن مرہ بن مالک بن اوس، "صفنہ" کے مقام پر ٹھہرے تھے جو بنو جبلی کے اوپر تھا۔ صفنہ' جَـفْـنَـہ کے وزن پر ہے' یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ سیلابوں کے پانی سے اوپر واقع تھا لہٰذا اس پانی سے سیراب نہ ہوتا تھا۔ اس میں انہوں نے قلعہ بنایا جس کا نام "شِاس" رکھا۔ یہ شاس بن قیس (بنو عطیہ بن زید کے بھائی) کے نام پر تھا اور مسجد قباء کے کھلے میدان میں قبلہ کی طرف جاتے ہوئے دائیں طرف تھا۔

پھر وائل' امیہ اور عطیہ جو زید کے بیٹے تھے' انہیں "جعادرہ" کہا جاتا تھا۔ یہ نام اس لئے پڑا کہ جب یہ کسی کے ہمسائے بنتے تو اسے کہتے تھے جعدر حیث شئت' یعنی جہاں چاہو جاؤ' کوئی فکر کی بات نہیں' رمق بن زید نے کہا تھا:

" لونڈیوں کے درمیان ہماری ایک لڑکی ہے جو جعادر اور کسر کے درمیان' سامنے ہے۔

جب دو زیدوں میں سے یعنی زید بن مالک اور زید بن قیس کو بلاتے ہو تو اس کے پاس بڑی مدد آتی ہے۔"

کہتے ہیں کہ "کسر" امیہ' عبید اور ضبیعہ کو کہتے تھے' یہ زید بن مالک بن عوف کے لڑکے تھے' گویا انہیں سونے کے ٹکڑے کہا جاتا۔ اس شعر میں رمق شاعر نے کسر کا یہی معنٰی لیا ہے جیسے ابن زبالہ نے کہا لیکن علامہ رزین کہتے ہیں کہ "جعادرہ" سارے اوس قبیلہ کو کہتے ہیں کیونکہ شرقی کے مطابق اس نے کہا تھا: "اوس کا لڑکا مالک تھا اور مالک ہی سے اوس کے تمام قبیلے پھیلے چنانچہ مالک سے عمرو' عوف اور مرہ پیدا ہوئے' انہیں "اوس اللہ" بھی کہا جاتا تھا اور "جعادرہ" یہی کہلاتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن اسحاق سے جو روایت ساتویں فصل میں آگے آ رہی ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوس اللہ بنو امیہ بن زید نیز وائل' واقف اور خطمہ تھے' واللہ اعلم۔

بنو خطمہ (یہ وہی عبد اللہ بن جشم بن مالک بن اوس تھا) اپنے اس گھر میں ٹھہرے جو ان کے نام سے مشہور تھا' وہاں انہوں نے قلعے بنائے اور کھجور کے درخت لگائے اور پھر ان سے قلعہ بنایا جسے "صع ذرع" کہتے تھے' وہاں مکان کوئی نہ تھا' اسے انہوں نے ایسے بنا لیا تھا جیسے جنگ کے دوران بچاؤ کے لئے (عارضی) قلعہ بنا لیا جاتا ہے' یہ سب خطمہ کے لئے تھا۔ یہ بنو خطمہ کے قلعے "مہراس" کے پاس تھا۔ اس کا نام "صع ذرع" اس لئے رکھا گیا کیونکہ یہ بنو خطمہ کے اس کنوئیں کے قریب تھا جسے ذرع کہا جاتا تھا۔ اور امیہ بن عامر بن خطمہ نے ایک قلعہ بنایا جو اس ماجشون کی اراضی میں تھا جو ابان بن ابی حدیر کے صدقہ میں خرچ ہونے والی زمین سے ملتی تھی۔

میں کہتا ہوں' ظاہر یہ ہے کہ آج کل اسی کا نام "مجشونیہ" ہے کیونکہ اس کا اصل نام جیسے کہ صعیب کی قبر کے ذکر میں آیا' ماجشونیہ تھا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ بنو خطمہ کے مکانوں کا اب پتہ نہیں چلتا کہ کہاں تھے البتہ ظاہر یہ ہے کہ وہ مسجد شمس کی مشرقی جانب بالائی حصے میں تھے کیونکہ اوس کے تمام گھر وہیں تھے اور جو مدینہ کی طرف نچلا حصہ تھا وہاں خزرج کے مکان تھے۔

علامہ مطری کا قول وما سفل الخ (نچلا حصہ) محل نظر ہے اور جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ خزرج کے پہلے گھر کی اس طرف بنو حارث کے مکان تھے جیسے آگے آ رہا ہے' ان کے اوپر کی طرف بنو خطمہ تھے اور پھر آگے وادی بطحان اور وادی مہزور کے ذکر میں جو کچھ آ رہا ہے' وہ اس کی تائید کرتا ہے۔

یہ بنو خطمہ اپنے اپنے قلعوں میں بکھرے ہوئے تھے' کسی بڑے شہر میں ان کا کوئی گھر نہ تھا اور جب اسلام آ گیا تو انہوں نے مسجد بنائی اور ان میں سے ایک شخص نے مسجد کے قریب ایک گھر بنایا چنانچہ وہ ہر صبح اس سے خیریت دریافت کرتے' انہیں ڈر ہی رہتا کہ اسے درندہ کوئی نقصان نہ پہنچائے پھر وہ گھر میں کافی لوگ ہو گئے تو انہیں "غزّہ" کہنے لگے کیونکہ یہ بہت لوگوں کی وجہ سے شام کے غزہ جیسا تھا۔

اوس کے گھروں کے بارے میں گفتگو ہو چکی۔ اب خزرج کے گھروں کا بیان شروع ہوتا ہے۔

ابن زبالہ لکھتے ہیں:

بنو الحارث بن خزرج اکبر بن حارثہ (یہ بلحارث کہلاتے تھے) کا گھر مدینہ کے بالائی حصے میں مشہور تھا یعنی وادیٔ بطحان اور تربت صعیب کے مشرق میں' آج کل "بنی" کا لفظ اُڑا کر اسے صرف "حارث" بولتے ہیں۔ انہوں نے وہ قلعہ بنایا جو بنو امرئ القیس بن مالک کا تھا پھر جشم اور زید (حارث بن خزرج کے بیٹے) جڑواں بھائی نکلے اور "سنح" میں جا ٹھہرے اور ابن حزم کے اس قول سے یہی مراد ہے: بنو حارث کی رہائش "سنح" میں تھی جو رسول اللہ ﷺ کی مسجد سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ انتہی۔

ابن زبالہ کہتے ہیں' انہوں نے قلعہ بنایا جسے "سنح" کہا جاتا تھا اور یہی اس جہت کا نام رکھ دیا گیا' کچھ لوگ

کہتے ہیں کہ اس کا نام "ریان تھا" اور سخ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مکان اپنی بیوی بنت خارجہ بن زید کے ہمراہ تھا۔ یہ بات قاضی عیاض نے لکھی ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ وہ بنو حارث بن خزرج کے گھر تھے جو مدینہ کی بالائی جانب تھے' حضورﷺ اور ان کے درمیان ایک میل کا فاصلہ تھا۔ انتہی۔

تو گویا "سخ" بالائی حصے میں بنو حارث کے گھروں کے قریب تھا۔

پھر عتبہ بن عمر بن خدیج بن عامر بن جشم بن حارث بن خزرج نکلا اور شوط اور "کوم الکومہ" میں جا ٹھہرا جسے "کومہ ابی الحمراء" کہتے تھے' پھر سخ کی طرف آ گیا۔

بنو خدرہ بن عوف بن حارث بن خزرج چلے تو اس گھر' میں ٹھہرے جسے "جرار سعد" کہتے تھے' یہ مدینہ کے بازار سے مل جاتا تھا۔

بنو ابجر (یہ خدرہ بن عوف بن حارث بن خزرج' یہ بنو حذرہ اور بنو خدارہ کے بھائی تھے) چلے اور اپنے اس گھر میں ٹھہرے جسے بنو خدرہ کہا جاتا تھا' یہاں انہوں نے قلعہ بنایا جسے "اجرد" کہا جاتا تھا' یہ وہ قلعہ تھا جس میں موجود کنوئیں کو "بصّـہ" کہا جاتا تھا' یہ مالک بن سنان کا تھا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے دادا تھے۔ پھر انجم نے حارث بن خزرج اکبر کے بیٹے کا نام ذکر کیا جو خزرج بن حارث تھا اور یہ بتاتے ہوئے کہا کہ خزرج کا بیٹا کعب تھا چنانچہ اس کا ایک بیٹا غسان کے ہمراہ شام کی طرف چلا گیا' وہ انصار سے نہ تھا اور باقی جو رہ گئے' انہیں انصار کہا گیا۔

عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج الاکبر کے دونوں بیٹے سالم اور غنم اس گھر میں مقیم ہو گئے جو "دار بنی سالم" کہلاتا تھا' یہ مغربی حرہ (پتھریلی جگہ) کے کنارے' اس وادی کے مغرب میں تھا جس میں قبیلہ "رانونا" کی مسجد جمعہ واقع تھی۔ پھر انہوں نے کئی قلعے بنائے جن میں سے ایک "مزدلف" تھا' یہ مالک بن عجلان کا تھا۔ اسے مطری نے بیان کیا اور کہا کہ "مزدلف" وہ قلعہ تھا جسے عتبان بن مالک نے بنایا' یہ مالک بن عجلان سالمی کے نام پر تھا' مالک نے اسی کے بارے میں کہا تھا "میں نے جنگوں کی غرض سے مزدلف بنا دیا ہے۔"

انہی قلعوں میں سے ایک "شاغ" تھا' یہ قبلہ کی طرف سے بنو سالم کے گھروں سے باہر تھا۔

انہی میں سے "قواقل" کا قلعہ تھا' یہ وہی قلعہ تھا جو بنو سالم کے گھروں کی ایک طرف "عصبہ" کی طرف جا ملتا تھا' یہ بنو سالم بن عوف کا تھا' اس کا یہ نام رکھنا اس بات کو ترجیح دیتا ہے جو سید الناس کے بیٹے نے ذکر کیا ہے کہ قواقل' عوف کی اولاد میں' بنو غنم اور بنو سالم کہلاتے تھے' ان کے اس نام کی وجہ یہ تھی کہ جب یہ کسی کے پڑوس میں چلے جاتے تو اسے کہہ دیتے قوقل حیث شئت (بے فکر ہو کر جہاں چاہو چلے جایا کرو) ایک تاریخ دان نے ذکر کیا ہے کہ قواقل' بنو سالم بن غنم میں سے کچھ لوگ تھے اور یہ بنو الحبلی تھے اور جو ہم پہلے بتا چکے ہیں' ظاہر وہی ہے کیونکہ یہ اس بیان میں آ رہا ہے جہاں حضورﷺ کے قباء سے مدینہ میں نکل آنے کا ذکر ہے۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ عوف بن عمرو کی اولاد ایک قبیلہ سالم' ایک غنم اور ایک غز تھا' یہی قوقل تھا نیز ابن حزم نے ان کی اولاد میں سے عبادہ بن صامت بن قیس بن اصرم بن فہر بن ثعلبہ بن قوقل بن عوف بن عمرو تھے۔

پھر بنو غصینہ (بلی کا ایک قبیلہ اور بنو سالم کے خلیف) مسجد بنو غصینہ کے قریب ٹھہرے۔

بنو حبلی (حاملہ عورت کے لئے بولا جانے والا لفظ ہے) اس کا نام مالک بن سالم بن غنم بن عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج الاکبر تھا' یہ لوگ اپنے مشہور گھر میں ٹھہرے جو قباء اور حارث بن خزرج کے دونوں بیٹوں کے گھر کے درمیان تھا جو بطحان وصعیب کی شرقی وادی میں تھا۔مطری نے یونہی لکھا ہے۔میرے خیال میں اس بیان کی سند وہ ہے جو اوس کے گھروں کے اس بیان میں ابن زبالہ سے گذری کہ: بنو عطیہ بن زید بن قیس' صفنہ میں ٹھہرے جو بنو الحبلیٰ بالائی جانب تھا۔ابن حزم لکھتے ہیں کہ بنو الحبلیٰ کے مکانات بنو النجار اور بنو ساعدہ کے گھروں کے درمیان تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس بیان سے ہوتی ہے جو حضور ﷺ کے قباء سے مدینہ کی طرف نکلنے کے بارے میں ہے اور یونہی آپ کے عبد اللہ بن ابی کے قریب سے اس وقت گذرنے سے ہوتی ہے جب آپ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے اور پھر اس سے بھی جو انہوں نے ذکر کیا ہے کہ حبلیٰ کا نام مالک بن سالم تھا جسے ابنِ زبالہ نے ذکر کیا ہے۔ابن ہشام کہتے ہیں کہ حبلیٰ' سام بن غنم بن عوف کو کہتے ہیں' اسے حبلیٰ اس لئے کہتے تھے کہ اس کا پیٹ بڑا تھا۔انتھیٰ ابن حبلیٰ نے یونہی بتایا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ حبلیٰ کا لفظ سالم پر بولا جاتا تھا جو مالک کا باپ تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا پھر یہ نام اس کے بیٹے کا ہو گیا حالانکہ یہ اس کا پوتا تھا اور اس وقت ابن زبالہ کا بنو عطیہ بن زید کے صفنہ میں ٹھہرنے کا گذشتہ بیان بنو الحبلی کے اوپر کی طرف ہونے پر محمول ہوگا' علاوہ ازیں سالم بن غنم کے گھر بنو سالم کے ہاں تھے کیونکہ ان کا بنو حبلیٰ کے ان قلعوں میں ذکر ہوا ہے جو ابن حزم کے اس کلام کے موافق ہے کہ وہ بنو ساعدہ کے گھر کے قریب اترے تھے کیونکہ ابن حزم نے کہا ہے کہ انہوں نے قلعے بنائے جن میں سے ایک "مزاحم" تھا جو بنو الحبلیٰ کے گھروں کے عین درمیان میں تھا' یہ عبد اللہ بن ابی بن سلول کا تھا۔ان میں سے ایک قلعہ عمارہ بن نعیم البیاضی اور ابن زمانہ کی سرزمین میں تھا اور ایک قلعہ عین ان کے گھروں کے درمیان تھا انتھیٰ۔

عنقریب بنو ساعدہ کے گھروں کے بیان میں "حماضہ" قلعے کا ذکر آئے گا اور پھر اس کا ذکر بنو بیاضہ کے گھروں میں ہے جبکہ ابن حزم جیسے اہلِ سیرت اور نسب جاننے والوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ عبد اللہ بن ابیؒ بنو حبلیٰ میں سے تھا جو خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر کو خلع کے بارے میں مذکور حدیث ثابت بن قیس بن شماس میں جو مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ عبد اللہ بن ابی' بنو مغالہ سے تھا جو بنو نجار کی شاخ تھی' وہ نرا وہم ہی ہے ہاں اس کا گھر مسجد کے مغرب میں بنو مغالہ کے گھروں کے قریب ضرور تھا جیسا کہ ظاہر ہے' واللہ اعلم۔

بنو سلمہ بن سعد بن علی بن اسد بن شاردہ بن تزید بن جشم بن خزرج اکبر' مسجد قبلتین سے مذاد کے درمیان ٹھہر گئے' یہ مذاد اس حرہ کی سند میں بنو حرام کا قلعہ تھا اور ان کے اس گھر کا نام "خربیٰ" تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس گھر کا نام طلحہ رکھا اور انہی سے علامہ زین مراغی نے بھی یونہی نقل کیا ہے جیسے کہ میں نے ان کے قلم سے لکھا دیکھا ہے لیکن شاید درست وہ ہے جسے علامہ مجد نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا نام "صلحہ" رکھا تھا انہوں نے اپنی قاموس میں کہا کہ 'صُرفیٰ' حبلیٰ کے وزن پر ہے' یہ بنو سلمہ کی ایک منزل (گھر) تھی جس کا نام تبدیل کر کے رسول اللہ ﷺ نے "صالحہ" رکھا تھا۔

بنو سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ' مسجد قبلتین سے لے کر ابن عبید دیناری کی زمین تک کے علاقے میں جا ٹھہرے' مسجد قبلتین انہی کی تھی' یہ ابن زبالہ نے لکھا ہے لیکن آگے مطری کی طرف سے جو ذکر کیا جا رہا ہے' وہ اس کے خلاف ہے' وہ کہتے ہیں کہ یہ بنی حرام کی تھی۔ انہوں نے قلعہ بنایا جسے "اغلب" کہا جاتا تھا' یہ اس نرم راستے پر تھا جس پر وہ پتھر پڑے تھے جن پر ماشکی رومہ سے بطحان کو آتے وقت آرام کیا کرتے تھے۔

ایک اور قلعہ تھا جسے "حیط" کہتے تھے اور مسجد قبلتین کے مشرق میں پتھریلی زمین کی بالائی جانب اس مقام پر تھا جہاں بنو سلمہ کی اراضی ختم ہو جاتی تھی۔ ایک اور قلعہ بھی تھا جسے "منیع" کہتے تھے اور جو مسجد قبلتین کی دائیں جانب پتھریلی زمین پر ابن ابان کی زمین میں سخت جگہ کی دائیں جانب تھا یا اس سے قریب تھا۔

بنو عبید بن عدی بن غنم بن کعب بن سلمہ' مسجد خربہ سے اس پہاڑ کے درمیان ٹھہرے جسے دو تخل کہتے تھے اور یہ جبل بنی عبید کہلاتا تھا' وہاں ان کے لئے مسجد الخربہ بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے "اشق" نامی قلعہ بنایا جو مسجد خرابہ کے سامنے تھا۔ یہ براء بن معرور صخر بن حسان بن سنان بن عبید کے نام پر تھا اور پھر "اطول" نامی قلعہ تھا جو مسجد خربہ سے قبلہ کی طرف یا اس کی بائیں طرف تھا۔

بنو حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ' اس مسجد بنی حرام صغیر کے پاس ٹھہرے جو جابر بن عتیک اور معبد بن مالک کی زمین کے درمیان کھلی جگہ پر واقع تھی' یہ لوگ بنو سلمہ سے مذاذ کے قبرستان کے درمیان میں رُکے تھے۔

یہاں ان کا ایک قلعہ تھا جسے "ناحیہ" کہا جاتا تھا' انہوں نے "جاعس" نامی قلعہ بنایا' یہ جابر بن عتیک کی نرم زمین اور اس کنوئیں کے درمیان تھا جسے حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بنوایا تھا اور یہ حضرت عمرو بن جموح کا تھا جو جابر بن عبداللہ عمرو کے دادا تھے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید یہ کنواں وہی ہے جس کے بارے میں ابن نجار نے لکھا ہے' یہ اس باغ کی طرف ہے جو مدینہ کی نچلی طرف مسجد فتح کے قریب تھا یعنی اس کے مغرب میں' اس جگہ کو "سیح" کہتے تھے جیسے مطری نے لکھا ہے واللہ اعلم۔

بنو مر بن کعب بن سلمہ (بنو حرام کے حلیف) نے قلعہ بنایا جسے "اخنس" کہا جاتا تھا' یہ سیاہ رنگ کا تھا جو بنو سلمہ میں اس باغ کی مغربی طرف تھا جو جابر بن عتیک کی تھی اور بنو عبید کے پہاڑ سے ملتی تھی' اسے ابن زبالہ نے ذکر کیا۔

علامہ مطری کے عند مسجد بنی حرام الصغیر سے یہ سمجھ آتا ہے کہ ان کی ایک بڑی مسجد بھی ہوگی' اس کا

ذکر سلع کی گھاٹی میں ان کے مکانوں میں آ رہا ہے اور پھر مسجدوں کے ذکر میں اس مسجد بنی حرام کا ذکر آ رہا ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی تھی کہ وہ میدان میں تھی' وہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ بڑی مسجد میں آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی۔

یہ سب مذکور لوگ بنوسلمہ کہلاتے تھے اور انہی گھروں میں رہتے تھے' ان سب کا اتفاق تھا اور ان کا بادشاہ امہ بن حرام تھا۔ یہ دیر تک ان پر حکومت کرتا رہا' آخرکار بنوعبید میں سے ایک بہت مالدار شخص مر گیا' اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام ''صخر'' تھا' امہ نے ارادہ کیا کہ اس کے مال میں سے بہت سا حصہ لے کر بنوسلمہ میں تقسیم کر دے لیکن صخر کو یہ بات بہت بری لگی' اس نے بنوعبید اور بنوسواد کے ہاں اس کی شکایت کی اور کہا کہ اگر امہ نے ایسا کر دیا تو میں اسے تلوار سے اُڑا دوں گا۔ پھر ان سے کہا کہ اگر یہ ایسا کرے تو اسے منع کر دینا۔ انہوں نے اس کی بات مان لی چنانچہ جب امہ نے ایسا کیا تو صخر نے اس پر تلوار کا وار کر کے کندھے کی ایک رگ کاٹ دی' بنوعبید اور بنوسواد آڑے آ گئے۔ اس دوران امہ نے نذر مانی کہ جب تک وہ زندہ ہے' گھر کے سایہ میں اس وقت تک نہیں بیٹھے گا جب تک بنوسلمہ' صخر کو قتل نہیں کر دیتے یا زندہ پکڑ نہیں لاتے' ایسی صورت میں وہ سوچنے لگا کہ کیا کرنا ہے پھر وہ مسجد فتح کی جرف سے ملنے والی بالائی جگہ پر دھوپ میں جا بیٹھا۔ اتنے میں لکڑیاں اٹھانے والی ایک لڑکی کا وہاں سے گذر ہوا تو اس نے پوچھا' اے میرے سردار! کیا ہوا' دھوپ میں کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا:

> ''میری قوم نے مجھے اپنا بادشاہ بنایا پھر میری خاطر صخر کو بلایا تو اس نے مجھے مارا ہے' میں نے قسم کھا لی ہے کہ جب تک صخر ان میں امن امان سے چلتا پھرتا اور سزا سے نہیں ڈرتا' میں دھوپ وغیرہ سے بچنے کے لئے کسی گھر کی چھت کے سائے میں نہیں جاؤں گا۔''

وہ لڑکی چلی گئی اور جا کر ان لوگوں کو بتایا تو انہوں نے صخر کو باندھا اور اس کے پاس لے آئے اور پھر اس سے جو لینا چاہتا تھا' لے کر انہیں معاف کر دیا۔ یہ ایک واقعہ تھا جو بنوسلمہ میں پیش آیا۔

ابن شبہ کہتے ہیں' حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ بنوسلمہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم اپنے گھر بار بیچ کر آپ کے پاس نہ آ جائیں کیونکہ آپ کے اور ہمارے درمیان وادی پڑتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ثابت قدم رہو کیونکہ تم وہاں کی گویا میخیں ہو' یاد رکھو جو شخص بھی نماز کے لئے ایک قدم اُٹھاتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کا اجر لکھ دیتا ہے۔

یحییٰ بن عبد اللہ بن ابوقتادہ سے بھی روایت ملتی ہے کہ انہوں نے کہا: ہمارے ساتھیوں (بنوسلمہ اور بنوحرام) نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ جمعہ کی نماز سے ہمیں درمیان میں آنے والا سیلاب روک دیتا ہے۔ اس وقت ان کے مکانات اس باغ اور زرعی زمین کے ساتھ ملتے تھے جو مسجد قبلتین اور مسجد خربہ کے درمیان میں تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا حرج ہے اگر تم پہاڑ کے پہلو کی طرف آ جاؤ (یعنی سلع پہاڑ) چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا' حرام تو گھاٹی میں

چلے گئے' جبکہ سواد اور عبید اس کے دامن میں آ گئے۔

میں کہتا ہوں کہ سلع پہاڑ میں بنو حرام کی گھاٹی اب بھی مشہور ہے' وہاں ان کے گھر اور مسجد کے آثار اب بھی موجود ہیں جو سلع کی مغربی جانب قبلہ کی راستہ سے مساجدِ فتح کی طرف چلنے والے کی دائیں طرف آتے ہیں اور مدینہ کی طرف جانے والے کی بائیں طرف ہیں پھر قریب ہی سلع کے مغرب میں سامنے قلعۂ ''خل'' موجود ہے۔

ابن زبالہ اور یحییٰ' حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت بتاتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: بنو حرام اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے درمیان سیلاب حائل ہو جایا کرتا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں گھاٹی کی طرف بسا دیا۔ انہیں وہاں رہنے والے اہلِ یمن کے سپرد کیا جنہیں ''ناغضہ'' کہتے تھے چنانچہ وہ وہاں سے اس گھاٹی کی طرف جا بسے جو مسجد کی نچلی طرف تھی' ان کے آثار و نشانات اب بھی وہاں دیکھے جا سکتے ہیں پھر بنو حرام نے کچھ پیسے جمع کر کے ایک رومی غلام خریدا' وہ پتھریلی جگہ سے پتھر لیتا' اس پر نقش و نگار بناتا اور یوں انہوں نے گھاٹی میں مسجد بنانا شروع کی جس میں لکڑی اور کھجور کی ٹہنیاں استعمال کیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس پر کچی اینٹیں لگائیں اور چھت برابر ڈال دی اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد والی ساکھو کی لکڑی استعمال کی۔

میں بتاتا چلوں کہ آج بھی مسجد کے ٹوٹے پھوٹے ستون موجود ہیں اور اس گھاٹی میں مسجد کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

عامر بن زریق بن عبد حارثہ بن مالک بن غضب بن جشم بن خزرج اکبر کے دونوں قبیلے بنو بیاضہ اور بنو زریق' بنو حبیب بن عبد حارثہ بن مالک بن غضب' بنو عدارہ یعنی بنو کعب بن مالک بن غضب' بنو اللحم یعنی بنو معاویہ بن مالک بن غضب یہ سب لوگ' دارِ بنو بیاضہ میں رہائش پذیر ہو گئے۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ جگہ دار بنو مازن بن نجار کی طرف' مسجد جمعہ سے وادئ بطحان تک کے علاقے کے اندر دار بنو سالم بن عوف بن خزرج کے درمیان میں واقع تھی۔

میں بتاتا چلوں' میرے نزدیک اولیت اس بات کو ہے کہ ان سب کے گھر دار بنو سالم بن عوف سے شام کی جانب' دارِ بنو مازن سے قبلہ کی طرف' مغربی پتھریلی زمین میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ ابن زبالہ کی کلام میں یہ بھی آتا ہے کہ ان کے گھر بنو ساعدہ کے گھروں تک پھیلے ہوئے تھے جیسے کہ ہم آگے بتائیں گے۔

انہوں نے اپنی آبادی میں قلعے بنا لئے تھے۔ ابن زبالہ لکھتے ہیں کہ ان کی آبادی میں انیس قلعے تھے پھر بنو امیہ بن عامر بن بیاضہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ صرف ان کے تیرہ قلعے تھے' ان میں سے اسود نامی قلعہ فرابن بن میسرہ کی زمین کے دائیں طرف پتھریلی زمین میں تھا' ایک ''عقرب'' نامی قلعہ شام کی طرف زرعی زمین پتھریلی زمین میں فقارہ پر تھا جسے رجالہ کہا جاتا تھا' ایک ''سوید'' نامی قلعہ حماضہ نامی باغ میں شام کی جانب تھا اور یہ اپنے مالک کے نام پر تھا' بنو ساعدہ کے گھروں کے بیان میں حماضہ کا ذکر آئے گا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی حماضہ تھا۔ ان میں سے ایک ''لواء''

نامی تھا جو ''سرارہ'' کی حدود میں تھا' اس کے اور حماضہ کا احاطہ کرنے والی شامی دیوار کے کونے میں بیس ہاتھ کا فاصلہ تھا' کچھ قلعے وہ تھے جو سرارہ میں تھے اور یہ مقام سرارہ ابن ابی قلیع کی سرزمین سے حماضہ کے آخر تک کے علاقے کے درمیان تھا نیز لواء نامی قلعے سے اس دیوار تک کے درمیان میں تھا جنہیں'' بیوت بن حارثہ'' کہا جاتا تھا اور اس دیوار کے اندر کی طرف تھا جسے زیاد بن عبید اللہ نے سرارہ کے درمیان میں برکت السوق (اونٹ بیٹھانے کی جگہ) کے لئے بنایا تھا۔ یہ ابن زبالہ کا بیان ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرارہ مدینہ کے بازار کے قریب تھا اور پھر بنو ساعدہ کے گھر میں حماضہ کے ذکر سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ برکۃ السوق سے یہاں مراد وہ جگہ تھی جو بطحان اور رانونا کے سیلابی مقام سے ملتی تھی کیونکہ ابن شبہ نے رانونا کے سیلابی مقام کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ذی صلب سے ملتا تھا یعنی مسجد جمعہ والی جگہ سے ملتا تھا پھر سرارہ کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا اونٹوں کے بیٹھنے کی گہری جگہ تک چلا جاتا تھا اور آگے دو حصے بن جاتا تھا جیسے آگے آرہا ہے۔

علامہ رزین نے لکھا ہے کہ سرارہ' بیاضہ اور حماضہ کے درمیان تھا۔ اس کے بعد ابن زبالہ نے باقی قلعوں کا ذکر کیا ہے اور پھر بتایا ہے کہ سرارہ کے اردگرد بنو بیاضہ کے گھروں کی آخری حد تھی۔ زرین اس کے بعد لکھتے ہیں کہ بنو حبیب بن عبد حارثہ بن مالک بن غضب بن جشم بن خزرج نے وہ قلعہ بنایا جو بنو بیاضہ کے گھروں کے بالکل قریب تھا اور جس کی نچلی طرف وہ پل تھا جو ذی ریش کے پاس تھا۔ رزین نے مزید بتایا کہ یہ سب بنو غضب بن جشم بن خزرج (جن کا اوپر ذکر ہوا ہے) بنو بیاضہ کے علاقہ میں رہتے تھے اور آپس میں اتفاق رکھتے تھے۔ پھر زریق بن عامر ہلاک ہو گیا اور اس نے اپنے بیٹوں کو سنبھالنے کے بارے میں اُن کے چچا حبیب بن عبد حارثہ کے سپرد کر دیا۔ حبیب انہیں ہاتھوں سے کھیتی میں پانی ڈالنے پر لگائے رکھتا' وہ تنگ آ گئے تو انہوں نے چچا کو قتل کر دیا چنانچہ بنو حبیب' بنو رزیق کے خلاف بنو بیاضہ کے حلیف بن گئے' بنو زریق کو ان کی کثرت سے فکر لاحق ہوئی' اس وقت بنو بیاضہ' بنو زریق سے زیادہ طاقت میں تھے چنانچہ وہ بنو بیاضہ کے علاقے سے نکلے اور اپنے مشہور ٹھکانے پر پہنچ گئے' یہ جگہ مصلّٰی میں موجود تھی مدینہ کی چار دیواری کے نشان آج بھی موجود ہیں اور وہ جگہ ذروان اور اس کے اردگرد مصلّٰی میں موجود ہے' وہاں انہوں نے قلعے بنا لئے' ان میں سے ایک قلعہ دار کبیر بن صلت کا تھا جو مصلّٰی میں ایک کونے پر تھا' ایک قلعہ ''ریان'' نامی تھا' جو آل سراقہ کی ''سقیفۃ الریان'' نامی ڈیوڑھی کے قریب تھا' بنو عمرو بن عامر بن زریق' بنو بیاضہ کے ہمراہ مقیم ہو گئے' ان کا قلعہ جنکے ساتھ ملنے والے بنو بیاضہ کے گھروں کے نزدیک' فراس بن میسرہ کی زمین میں شام والی جانب موجود تھا' یہ وہاں ٹھہرے رہے اور اس وقت تک ٹھہرے جب تک رافع بن مالک خود اور اس کا لڑکا اسلام آنے سے قبل وہاں سے چلے نہیں گئے چنانچہ وہ سنجہ کی جانب' اساس اور جانب سنجھیں اس جگہ ٹھہرے جہاں اسحاق بن عبید بن رفاعہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس رافع بن مالک کو'' کامل'' کہتے تھے کیونکہ دورِ جاہلیت میں کاتب (لکھنے والے) اور شاعر کو کامل کہا کرتے تھے۔ ان کے بعد باقی بنو عمرو بن عامر اس کے بعد وہاں سے گئے تھے چنانچہ انہوں نے بنو عوف بن زریق سے ان کے کچھ مکانات اور حقوق خرید

لئے اور بنوعوف بن زریق اسلام سے کچھ قبل شام کی طرف چلے گئے' ان کا خیال تھا کہ وہاں ان کے کچھ لوگ موجود ہیں' اب بنو بیاضہ اور بنو حبیب ایک عرصہ تک بنو زریق سے نہیں لڑے' ان کے ایلچی ایک دوسرے کی طرف جاتے رہے' بنو زریق ان دونوں گروہوں کو صلح صفائی اور ادائیگی دیت کے لئے پیغام بھیجتے رہے چنانچہ دونوں گروہوں نے ان کی بات مان لی اور جنگ کا سلسلہ ختم کر دیا اور جو بھرا مشکیزہ انہوں نے دونوں گروہوں کی جانب بھیجا' اسے زقاق الدیہ کا نام دیا' بنو بیاضہ میں سے بنو مالک بن زید بن حبیب بن عبد حارثہ وہاں سے نکلے اور اس طرف جا ٹھہرے جو بنو زریق نے انہیں دیت میں دیا تھا' وہاں انہوں نے بنو المعلی بن لوذان کے لئے قلعہ بنایا' اب بنو بیاضہ میں بنو الصمہ بن حارثہ بن حارث بن زید بن حبیب باقی رہ گئے چنانچہ بنو المعلی بن لوذان جب تک اللہ کو منظور تھا' بنو زریق میں رہے۔

پھر عبید بن المعلّٰی نے حصن بن خالد زرقی کو قتل کر دیا' اس پر بنو زریق نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر خیال آیا کہ عبید کی طرف سے حصن بن خالد کی' اپنے مال میں سے دیت دے دیں کہ بنو المعلی ان کے حلیف بن جائیں اور بنو بیاضہ سے حلیف ہونے کا تعلق توڑ لیں چنانچہ یونہی کیا' عامر بن زریق بن عبد حارثہ (زریق و بیاضہ کا والد) جب مرنے لگا تو اس نے اپنے لڑکے بیاضہ کو وصیت کی کہ جنگوں اور مخالفت کا سلسلہ بند کر دے نیز اس کے بھائی زریق کے بارے میں بھی وصیت کی کہ اسے بھی روکے' وہ بیاضہ سے چھوٹا تھا' اسی وصیت کے بارے میں ایک شاعر نے کہا تھا:

"عامر نے' بیاضہ کو صبر کرنے کی وصیت کی"

اوس اور خزرج سے کہا گیا کہ ان میں سے کم بھاگنے والے اور بار بار حفاظت کرنے والے بنو بیاضہ' بنو زریق اور بنو ظفر تھے' جب بھی اوس وخزرج کی جنگ میں سامنے آتے تو اوس وخزرج کے دوسرے خاندانوں کے مقابلے میں یہ قبیلے اعلیٰ شمار ہوتے تھے۔

رہے بنو عذارہ بن مالک بن غضب بن جشم تو یہ لوگ بنو مالک بن غضب کے مقابلے میں کم قبیلے والے تھے' یہ سخت قسم کی قوم تھی چنانچہ انہوں نے بنو مالک بن غضب کے قبیلوں بنو لین یا بنو اجدع میں سے ایک شخص کو قتل کر دیا' مقتول کے وارثوں نے دیت لینے سے انکار کر دیا اور وہ بنو بیاضہ سے امداد لینے گئے کہ بنو عذارہ سے انہیں ان کے آدمی کا قاتل لے کر دیں چنانچہ بنو بیاضہ نے اس سلسلے میں بنو عذارہ سے بات کی لیکن بنو عذارہ نے قاتل دینے سے انکار کر دیا چنانچہ بنو بیاضہ نے ارادہ کر لیا کہ زبردستی قاتل لے لیں' اس پر وہ بنو بیاضہ کے گھروں سے نکلے اور بنو عمرو بن عوف کے پاس چلے گئے' انہیں اپنا حلیف بنایا اور ان سے اپنا قریبی تعلق پیدا کیا' بنو بیاضہ سے الگ ہو گئے پھر بنو عذارہ اور بنو عمرو بن عوف کے درمیان اسلام آنے سے ذرا پہلے کوئی معاملہ بن گیا جس پر انہوں نے اتفاق کر لیا کہ ان کے ہاں سے بنو زریق کے پاس چلے جاتے ہیں' بنو بیاضہ کی طرف واپس جانا انہیں پسند نہیں آیا چنانچہ وہ ان کے پاس آ گئے اور آنے کا سبب بتایا' وہ اچھے طریقے سے ملے اور ان کی رائے کو درست قرار دیا پھر ابو عبیدہ سعید بن عثمان زرقی کے پاس آئے' اس معاملہ کا ذکر کیا تو اس نے مرحبا کہا اور ان کی شرافت وعظمت کا ذکر کیا اور کہا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے ماموؤں

کے پاس چلے جاؤ (یعنی بنو عمرو بن عوف) بنو زریق کی طرف نہ جاؤ کیونکہ تمہاری طبیعت میں سختی ہے اور بنو زریق بھی تمہاری طرح کے ہیں۔

وہ اس کی رائے پر بکھر گئے اور پھر اس وقت تک یونہی رہے جب تک مہدی نے انصار کے لئے ۱۶۰ھ میں حصہ مقرر نہیں کر دیا' چنانچہ وہ اپنا دیوان بنو بیاضہ کی طرف لے گئے' وہاں بنو مالک بن غضب کے دو خاندان تھے' جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ لین میں سے تھے یا اجدع سے' دور جاہلیت میں ان کے درمیان سلسلۂ وراثت موجود تھا' وہ اس معاملے میں جھگڑ پڑے اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اس معاملہ میں کسی بھی طرح درست راستے پر نہیں ہیں تو ایک دوسرے کو جنگ کی دعوت دے دی اور طے یہ کیا کہ وہ بنو بیاضہ میں موجود باغ میں داخل ہو کر وہاں جنگ کریں گے چنانچہ اس میں جا کر ہر طرف سے اسے بند کر لیا چنانچہ وہ اس میں اس حد تک لڑے کہ ان میں سے آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ رہ گیا' اس باغ کا نام ''حدیقۃ الموت'' پڑ گیا' بنو مالک کے پاس دور جاہلیت میں بنو زریق کے علاوہ ایک ہزار جنگجو تھے لیکن بنو اجدع میں سے کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا البتہ بنو ''لین'' میں سے دو آدمی بچے تھے جو ختم ہو گئے اور ان کا کوئی شخص باقی نہ بچا۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ زید بن حبیب بن عبد حارثہ بن مالک بن غضب (جس کے بیٹوں کا ذکر پہلے گزرا) کا ایک بھائی تھا جس کا نام عبد اللہ بن حبیب تھا' یہ شخص ابو جبیلہ غسانی کا لڑکا تھا جسے مالک بن عجلان نے مدینہ میں یہودیوں کو قتل کرنے کے لئے تیار کیا تھا جیسے ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں' واللہ اعلم۔

بنو ساعدہ بن کعب بن خزرج اکبر' چار مختلف مقامات پر بکھر گئے تھے چنانچہ بنو عمرو اور بنو ثعلبہ (خزرج بن ساعدہ کے بیٹے) دار بنو ساعدہ میں ٹھہرے جو مدینہ کے بازار اور بنو ضمرہ کے درمیان تھا' یہ مدینہ کے مشرق میں شام کی طرف تھا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ بنو ساعدہ کا شہر بضاعہ نامی کنوئیں کے قریب تھا اور یہ کنواں ان کے گھروں کے درمیان تھا۔ابن زبالہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک قلعہ بنایا جسے معرض کہتے تھے' یہ مسجد بنو ساعدہ کے سامنے والی آبادی میں تھا' یہ آخری قلعہ تھا جو مدینہ میں بنایا گیا' حضور ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو وہ اسے بنا رہے تھے چنانچہ انہوں نے آپ سے اسے مکمل کرنے کی درخواست کی جس پر آپ نے اجازت دے دی۔اس موقع پر ان میں سے ایک شاعر نے کہا:

''ہم نے تمام بنو بضاعہ کی طرف سے حمایت کی اور ایک قلعہ بنایا جس کا نام ''معرض'' تھا جو کافی بلند جگہ پر تھا''

پھر دار ابو دجانہ صغریٰ میں ایک قلعہ بنایا جو بضاعہ کے قریب تھا۔

بنو قشبہ (عامر بن خزرج بن ساعدہ) بنو حدیلہ کے قریب مقیم ہو گئے اور انہوں نے عمرو بن امیہ ضمری کے جھونپڑے کے قریب قلعہ بنایا۔میں کہتا ہوں کہ ان کی رہائش بنو ضمرہ کے مشرق میں تھی اور مذکورہ جگہ اس سے پہلے

موجود تھی' واللہ اعلم۔

بنو ابوخزیمہ بن ثعلبہ بن طریف بن خزرج بن ساعدہ (حضرت سعد بن عبادہ کا قبیلہ) اس مقام پر ٹھہرے جسے ''جرارِ سعد'' کہتے تھے (سعد کا کنواں) یہ وہی کنواں تھا جہاں سے آپ کی والدہ کی وفات پر لوگ پانی پیا کرتے تھے۔ابن زبالہ بتاتے ہیں کہ مدینہ کے بازار کی چوڑائی مسجد کے مصلّٰی (جائے نماز) سے لے کر سعد بن عبادہ کے کنوئیں تک تھی۔

میں کہتا ہوں' اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بازار سے ملا ہوا تھا' یا تو مشرق کی طرف سے جبکہ مصلّٰی کی حد مغرب کی طرف تھی' اس کی شہادت ملتی ہے کیونکہ آج کل یہ مشہور جگہ ہے جو اہلِ درب میں سویقہ کے نام سے یاد کی جاتی تھی جو بنو ساعدہ کے جھونپڑے میں تھی' سقیفہ کا نام اس جگہ پر بولنا صحیح ہے اور ایسے نہیں جیسے مطری نے کہا کہ یہ جگہ بئرِ بضاعہ کے نزدیک بنو ساعدہ کی بستی میں تھی کیونکہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ وہاں نہیں رہتے تھے' وہ تو اپنے قبیلے کے ہمراہ اپنے گھر میں رہا کرتے تھے اور یہ جھونپڑا آپ کے گھر کے قریب تھا۔

یا سعد کا یہ کنواں شام والی جانب سے بازار کے ساتھ ملتا تھا اور مصلّٰی قبلہ والی حد تھا۔یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ پہلے بیان کردہ مشرقی جہت ہی میں بنو زریق کے گھر تھے۔ واللہ اعلم۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یہاں انہوں نے قلعہ بنایا جسے ''واسط'' کہتے تھے اور پیچھے گذر چکا ہے کہ بنو خدارہ بھی حضرت سعد کے کنوئیں کے پاس ٹھہرے تھے تو گویا یہ ان کا گھر تھا اور خدارہ' جیسا کہ گذرا بنو حارث بن خزرج کی شاخ تھے تو حضرت سعد بن عبادہ کی بیمار پرسی کی حدیث میں ان کا جو گھر مراد ہے' وہ بنو حارث بن خزرج میں تھا نہ کہ دار بنو حارث میں جو ان کے نام سے مشہور تھا' کیونکہ وہ بنو ساعدہ کے گھروں سے کافی دور تھا اور یہ قوم سعد میں سے نہ تھے ہاں کل کو خزرج کہہ دیتے تھے اور بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ کی اس حدیث ''کس چیز پر تمہاری گذر اوقات تھی؟ کے بعد فرمایا تھا کہ کھجور اور پانی پر' البتہ رسول اللہ ﷺ کے انصار میں سے ہمسائے تھے جن کے پاس عطیہ جات آجایا کرتے تھے۔'' الحدیث۔

حافظ ابن حجر اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ آپ کے ہمسائے انصار میں سے یہ تھے: حضرت سعد بن عبادہ' حضرت عبداللہ بن عمرو بن حزم' ابو ایوب اور حضرت سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہم تو حضرت سعد بن عبادہ کا بنو الحارث کے گھر میں ہونا بعید سی بات ہے کیونکہ وہ پڑوسیوں میں شمار تھے۔ابن حجر نے یہ روایت اُمّ مسلمہ سے بذریعہ ابن سعد لی ہے' جس میں حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ انصار رسول اللہ ﷺ کی ان مہربانیوں کا بہت دھیان رکھتے تھے' جو آپ حضرت سعد بن عبادہ' سعد بن معاذ' عمارہ بن خرم اور ابو ایوب پر فرماتے تھے اور یہ اس لئے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ سے نزدیکی ہمسائیگی حاصل تھی۔انتہٰی۔

ثعلبہ بن طریف بن خزرج بن ساعدہ کے دونوں لڑکے بنو وقش اور بنو عنان اس گھر میں ٹھہرے تھے جسے ''بنو

ساعدہ'' کہا جاتا تھا نیز اسے ''بنو طریف'' بھی کہتے تھے۔ یہ حماضہ اور سعد کے کنوئیں کے درمیان تھا اور عنقریب شوط کے مفہوم میں آ رہا ہے کہ بنو ساعدہ کا ایک گھر مسجد رایہ سے شام کی جانب تھا اور ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی گھر تھا۔ واللہ اعلم۔

بنو مالک بن نجار اپنے مشہور مقام میں ٹھہرے تھے چنانچہ بنو غنم بن مالک نے ایک قلعہ بنایا جسے ''فویرع'' کہا جاتا تھا اور اسی جگہ میں حسن بن زید بن حسن بن حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہم کا گھر تھا۔ میں بتاتا چلوں کہ یہ وہی گھر تھا جو حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اس گھر کے سامنے تھا جو مدرسۂ شہابیہ کے قبلہ میں تھا جیسے ابن شبہ سے نقل آ رہی ہے۔

بنو مغالہ (یہ بنو عدی بن عمرو بن مالک تھے جبکہ مغالہ عدی کی ماں تھی) نے ایک قلعہ بنایا جسے ''فارع'' کہتے تھے۔ یہی وہ قلعہ تھا جو بنو طلحہ بن عبید اللہ کے گھروں کے سامنے تھا اور یہ جعفر بن یحییٰ بن خالد بن برمک کے گھر میں داخل ہوئے۔

علامہ زین مراغی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قلعہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے والد ثابت کا تھا' وہ اس گھر میں رہائش کے لئے داخل ہوئے جو باب الرحمۃ کے سامنے تھا اور جو عاتکہ کا گھر تھا۔ علامہ زین نے اسے اس بات سے نکالا ہے کہ عاتکہ کا گھر جعفر بن یحییٰ کے گھر ہی میں تھا لیکن ابن زبالہ اور یحییٰ کے کلام سے عنقریب مسجد کے دروازوں کے بیان میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ عاتکہ کے گھر ہی میں جعفر بن یحییٰ کا گھر شامل تھا اور ''فارع'' نامی قلعہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تھا' وہاں ہم نے اس کی جگہ بتا دی ہے کہ یہ اس مذکور گھر (عاتکہ والا) کے شام والی طرف تھا اور یہ فارع نامی قلعہ وہ ہے جس میں یوم خندق پر رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں جبکہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ ان کے پاس تھے اور پھر ابنِ صیاد والی مسلم کی حدیث میں ہے: ''انہیں بنو مغالہ کے قلعے کے پاس پایا'' قاضی عیاض رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ جب تم ہموار زمین کے آخر میں جا کر کھڑے ہو جاؤ تو مسجد نبوی کے سامنے بنو مغالہ کے گھر اس جگہ تھے جو تمہاری دائیں طرف ہو گی۔

بنو حُدیلہ (ابن زبالہ وغیرہ کے مطابق یہ معاویہ بن عمرو بن مالک بن نجار کا لقب تھا) نے ایک قلعہ بنایا' جسے ''مشعط'' کہتے تھے' یہ مسجد حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی غربی جانب تھا اور پھر اسی جگہ ایک گھر تھا جسے ''بیت ابی نبیہ'' کہتے تھے۔ ابن زبالہ نے گذشتہ حدیث کے بعد یہ حدیث بھی لکھی ہے کہ ''اگر وباء کسی جگہ موجود ہے تو وہ مشعط کے سائے میں ہے۔'' ابنِ شبہ نے بنو حدیلہ کے محل کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اسے حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما نے بنایا تھا تاکہ قلعہ کا کام دے۔'' ابن شبہ بتاتے ہیں کہ اس کے دو دروازے تھے۔ عام لوگوں کے گذرنے کا دروازہ بنو حدیلہ کی جانب موجود تھا اور دوسرا دروازہ محمد بن طلحہ تیمی کے گھر کے پاس مشرقی یمنی گوشے میں تھا اور اس کے درمیان بئیرِ حاء موجود تھا۔ انتہٰی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ مشارق میں بتاتے ہیں کہ ''بئر حاء'' اس جگہ تھا جو بنو حدیلہ کے محل کے نام سے مشہور تھی

پھر ابن اسحق بتاتے ہیں کہ بنو عمرو بن مالک بن نجار کو بنو حدیلہ کہتے تھے اور یہ اس وجہ سے کہ بنو حدیلہ انہی کی ایک شاخ تھی جیسے کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ معاویہ بن عمرو بن مالک کے باپ کا لقب تھا۔

میں بتاتا چلوں کہ یہ بنو حدیلہ' بنو معاویہ نہیں تھے جن کا قبیلہ اوس تھا اور وہ مسجد الاجابہ والے تھے جیسے کہ ہم بیان کر چکے' یہ وہم اس لئے پیدا ہوا کہ یہاں دو نام مشترک (ایک جیسے) آ گئے ہیں اس لئے مشارق میں علامہ قاضی کی قلم سے وہ کچھ نکل گیا جو عام علماء کے خلاف ہے چنانچہ انہوں نے کہہ دیا:

"زبیر کہتے ہیں کہ مدینہ میں جو کچھ بھی اس وقت تمہاری داہنی جانب آئے جب تم ہموار زمین کے آخر میں نبی کریم ﷺ کی مسجد کے سامنے کھڑے ہو تو وہ بنو مغالہ کے گھر ہوں گے اور اس کی سامنے والی طرف جو تمہاری بائیں طرف ہوں گے وہ بنو حدیلہ کے گھر ہوں گے' یہ بنو معاویہ ہیں اور یہ اوس قبیلہ کی شاخ ہیں۔"

علامہ جوہری کہتے ہیں کہ یہ انصار کی ایک بستی تھی۔ علامہ قاضی لکھتے ہیں' یہ انصار ہی کا ایک قبیلہ تھا' یہ جانب انہی کے نام منسوب تھی اور یہ بھی بنو حدیلہ تھے۔ حدیلہ ان کی ماں کا نام تھا۔ انتہی۔

زبیر سے ان کے علاوہ جس نے روایت لکھی ہے' ان کے مطابق بنو حدیلہ' بنو نجار میں سے تھے جو خزرج کی شاخ تھے جبکہ بنو معاویہ اوس میں سے تھے جو ان کے علاوہ تھے۔ اسے ہم زبیر کے شیخ ابن زبالہ کے حوالے سے بتا چکے ہیں اور ابن حزم نے "الجمہرہ" میں معاویہ کو اوس سے شمار کیا ہے جبکہ بنو حدیلہ کو خزرج سے شمار کیا ہے چنانچہ کہا: مالک بن نجار کا لڑکا معاویہ اور اس کی والدہ کا نام حدیلہ تھا' یہاں انہیں حدیلہ کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ قاضی کا یہ قول ہے کہ "وہ اوس میں سے تھے" لیکن قاضی نے جب ان کا یہ قول دیکھا "وہ بنو معاویہ تھے" تو ان کے ذہن میں آیا کہ وہ بنو معاویہ تھے جن کا تعلق اوس سے تھا اور یہ وہ سبب ہے جس کی بناء پر مطری کو یہاں دھوکا لگا چنانچہ ایک جگہ تو انہیں الگ الگ کہا اور دوسری جگہ دونوں کو اکٹھا کر دیا حالانکہ یہ جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ مراغی کے مطابق احتمال یہ ہے کہ بنو معاویہ' بنو حدیلہ سے ایک قبیلہ یا شاخ ہوں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

بنو مبذول (اصل نام عامر بن مالک بن نجار تھا) نے ایک قلعہ بنایا تھا جسے "سج" کہتے تھے' علاوہ ازیں ایک قلعہ آلِ حُیَیّ بن اخطب کی رہائش گاہ میں بنو مالک بن مبذول کا تھا پھر ایک اور قلعہ زبیر کے غلام سر جس کی رہائش گاہ میں تھا' یہ جگہ بقیع زبیر تک تھی اور قلعہ آلِ عبید بن نعمان (نعمان بن عمرو بن مبذول) کے لئے تھا اور بقیع زبیر (درختوں کا ذخیرہ) ان جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان گھروں کے مشرقی جانب تھا جو گنبد خضری سے بنو زریق' بنو غنم اور بقال تک پھیلا ہوا تھا جیسے عنقریب آ رہا ہے۔

بنو عدی بن نجار اپنی اس مشہور رہائش گاہ میں جا ٹھہرے جو مسجدِ نبوی کے مغرب میں تھی جیسے مطری نے لکھا ہے اور وہیں وہ قلعہ تھا جو ان کی مسجد کے قبلہ کی طرف تھا پھر انہوں نے وہ قلعہ بنایا جسے "اطم زاہریہ" کہا جاتا تھا۔ یہ عورت

اس میں رہائش رکھتی تھی' یہ دار نابغہ میں اس مسجد کے قریب تھا جو اس حویلی میں تھی۔

بنو مازن بن نجار اپنے مشہور گھر میں رہے جو بئرِ بصہ کے قبلہ کی طرف تھا' آج کل اس جانب کو ابو مازن کا نام دیتے ہیں' یہ نام اہل مدینہ نے بدل کر رکھا تھا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ وہاں انہوں نے دو قلعے بنائے تھے جن میں سے ایک کا نام ''واسط'' تھا۔میں کہتا ہوں کہ قبیلوں کے رہائش گاہوں میں جو کچھ آ رہا ہے اس کے بارے میں ابن شبہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ بنو مازن کی رہائش گاہیں مدینہ کے قبلہ کی طرف بنو زریق کی رہائش گاہوں کے قریب ہی مشرق میں واقع تھیں۔واللہ اعلم۔

بنو دینار بن نجار بطحان کی پچھلی طرف اس مقام پر ٹھہرے جو ان کے نام سے مشہور تھا اور پھر انہوں نے ''منیف'' نام کا قلعہ بنایا' یہ ان کی اس مسجد کے قریب تھا جسے مسجد بنو دینار کہا جاتا تھا جیسے ابن زبالہ نے لکھا ہے۔اس مسجد کے بارے میں مطری لکھتے ہیں کہ ''بنو دینار بن نجار کے گھر بنو حدیلہ اور مسجد الاجابہ والے بنو معاویہ کے گھروں کے درمیان تھے اور بنو حدیلہ کے گھر بئرِ حاء کے قریب تھے اھ۔

مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ مطری نے یہ کہاں سے لے کر لکھا ہے اور جو ابن زبالہ نے لکھا ہے وہ ان امور کے بارے میں زیادہ قابلِ بھروسہ ہے جو ان کی مسجد کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔

ابن زبالہ کہتے ہیں: بنو دینار کا خیال ہے کہ اولاً وہ دارِ ابوجہم بن حذیفہ عدوی میں پہنچے تھے' وہاں ان کی ایک عورت رہتی تھی جس کے سات بھائی تھے' وہ ان کے کنوئیں کے کنارے کھڑی ہوئی جو ابوجہم کے گھروں میں تھا' ان کے پاس چاندی کی کنگھی تھی' وہ کنوئیں میں گر گئی تو چلّا کر اس نے اپنے بھائیوں کو آواز دی چنانچہ ان میں سے ایک کنگھی نکالنے کے لئے کنوئیں میں اترا تو ڈوبنے لگا' اس نے دوسرے بھائی کو آواز دی اور یوں ساتوں داخل ہو گئے اور یکے بعد دیگرے مر گئے' بنو نجار کے یہ گھر تھے۔

علامہ مطری کہتے ہیں (بعد والوں نے انہی کی پیروی کی) کہ نابغہ کا وہ گھر جس کا بنو عدی کے گھروں میں ذکر ہو چکا' یہ مسجد الرسول ﷺ کے مغرب میں تھا' یہ بنو عدی بن نجار کی رہائش گاہ تھی' مسجد الرسول اور اس کے ساتھ ہی مشرق کی طرف بنو غانم بن مالک بن نجار کے گھر تھے اور بنو نجار کے گھر مدینہ اور اس کے گرد شمال سے مسجد الاجابہ تک پھیلے ہوئے تھے۔نجار' تیم اللہ بن ثعلبہ کو کہتے تھے۔اسے نجّار کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک آدمی کو مارا اور داغ دیا تھا چنانچہ اسے نجّار کہا جانے لگا' یہ وہی نجار ہیں جن کے بیٹوں اور اولاد کے گھروں کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا ''گھروں میں سب سے بہتر بنو نجار کے اور پھر بنو عبد الاشہل کے گھر ہیں۔'' اور یہ لوگ قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ایک اور حدیث میں ہے: ''کیا میں تمہیں انصار کے گھروں کے بارے میں نہ بتا دوں؟ صحابہ نے عرض کی' ہاں بتا دیجئے تو فرمایا کہ یہ بنو عبد الاشہل کے گھر ہیں' یہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ہیں' صحابہ نے عرض کی کہ ان کے بعد اور کون ہیں؟ تو فرمایا پھر بنو نجار ہیں۔'' دونوں روایتوں کے راوی ایک ہیں' دونوں احادیث صحیح ہیں لیکن ان میں

اختلاف ہے' بنو نجار کی اوّلیت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت شدہ ہے جس میں اختلاف نہیں اور اس کی کئی احادیث سے تائید ہوتی ہے۔ یہ حضرات حضرت عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے ماموں ہیں جو نبی کریم ﷺ کے جدّ امجد تھے اور یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ ان کے پاس نازل ہوئے تھے جیسے آگے آ رہا ہے پھر اس مذکور روایت میں بنو عبد الاشہل کے بعد بنو حارث بن خزرج اکبر کا ذکر فرمایا اور پھر بنو ساعدہ کا اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ارشاد ہے: ''انصار کے سب گھروں میں بھلائی پائی جاتی ہے'' گویا یہ عظمت ان کے سب سے پہلے اسلام لانے کی وجہ سے تھی اور ان کی ان کوششوں کی وجہ سے تھی جو انہوں نے اسلام پھیلانے میں کی تھیں۔

ابن زبالہ' انصار کے تمام گھر ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: بنو شطبہ شام سے آئے تو میطان میں ٹھہرے' وہ جگہ موافق نہ آئی تو ہٹ کر جذمان کے قریب چلے گئے پھر وہاں سے ''راتج'' کے پاس ٹھہرے چنانچہ یہ راتج کے تین قبیلوں میں سے ایک تھے' ابن زبالہ راتج کا ذکر یہودیوں کے گھروں میں کیا ہے چنانچہ انہوں نے کہا کہ راتج میں یہودی آباد تھے' راتج ایک قلعہ تھا جس کی وجہ سے وہ جانب راتج کہلائی اور پھر یہ جانب بنو جذماء کے لئے ہو گئی اور بعد میں ان اہلِ راتج کے لئے ہوئی بنو عبد الاشہل کے حلیف تھے۔

اس سے قبل ہم اہلِ راتج کے بارے میں بتا چکے ہیں کہ اہلِ راتج بنو زعوراء بن جشم کو کہتے ہیں جو عبد الاشہل بن جشم کا بھائی تھا پھر انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اہل راتج ہی میں سے بنو سعد بن مرہ بن مالک بن اوس تھے۔

علامہ مطری نے لکھا کہ راتج ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو وادی بطحان کے مغربی جانب میں ہے اور اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا ایک اور پہاڑ ہے جسے جبلِ بنو عبید کہتے ہیں۔ انتہٰی۔

آگے اس کے بارے میں اختلاف کا ذکر آ رہا ہے نیز یہ بھی بتایا جائے گا کہ راتج ''مسجد الرایہ'' کی جانب میں ہے۔

فصل نمبر ۶

اوس وخزرج میں جنگِ بعاث

علامہ رزین نے علامہ شرقی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب تک اللہ کو منظور تھا' اوس وخزرج مدینہ طیبہ میں اتفاق واتحاد سے رہے اور پھر ان کے درمیان بہت سی جنگیں ہوئیں کہ ان سے زیادہ کسی اور قوم میں نہیں سنی گئیں اور نہ ہی اتنی طویل جنگیں کہیں ہوئیں۔

بعاث سے پہلے کی جنگیں

ان میں سب سے پہلی جنگ ''حربِ سمیر'' تھی جس کا سبب بنو ثعلبہ میں سے ایک مرد بنا جو مالک بن عجلان کا

حلیف تھا' اسے اوس کے ایک شخص نے قتل کر دیا تھا جسے سمیر کہتے تھے۔ پھر ان کے درمیان حرب کعب بن عمرو ہوئی پھر یوم السرارہ (یہ بنو بیاضہ اور حماضہ کے درمیان ایک جگہ تھی) پھر جنگ یوم الدیک ہوئی (یہ بھی ایک جگہ کا نام ہے) اور پھر یوم بعاث تھی جو سب سے آخر میں ہوئی جس میں اوس وخزرج کے سردار اور رئیس قتل ہو گئے۔

میں بتاتا چلوں کہ اوس وخزرج کے درمیان کئی معرکے ہوئے جن میں سب سے مشہور یوم السرارہ تھا' یوم فارع تھا اور اوّل و دوم یوم فجار تھا پھر حرب حضیر بن اسلت پھر حرب حاطب بن قیس اور آخر میں جنگ بعاث ہوئی چنانچہ علامہ خطابی کے قول: ''یوم بعاث مشہور دن تھا جس میں اوس کی طرف سے خزرج کے خلاف سخت معرکہ ہوا اور یہ جنگ ابن اسحاق وغیرہ کے مطابق اسلام آنے تک ایک سو بیس سال تک جاری رہی'' کا مطلب یہ بنے گا کہ اوس وخزرج کی تمام جنگیں یوم بعاث سے پہلے ہوئیں اور اس کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا ورنہ یہ بات ردّ کر دی جائے گی۔ آگے یوم بعاث کی معین تاریخ کا ذکر آ رہا ہے۔

جنگِ بعاث کا سبب

اس جنگ کا سبب یہ تھا کہ پہلی تمام جنگوں میں اکثر خزرج کو اوس کے خلاف کامیابی ہوتی رہی' تنگ آ کر اوس بنو قریظہ کو حلیف بنانے چلے گئے' خزرج نے انہیں پیغام بھیج دیا کہ اگر تم نے ایسا کر دیا تو ہماری طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ اس پر وہ بکھر گئے اور خزرج کو پیغام بھیجا کہ ہم ان کو حلیف نہیں بنائیں گے اور نہ ہی انہیں تمہارے سامنے لائیں گے چنانچہ خزرج نے یہود سے کہا: تم ہمیں ضمانت دو ورنہ ہم تم سے بے فکر نہیں رہ سکتے' انہوں نے ضمانت میں چالیس غلام بھیج دیئے جنہیں خزرج نے اپنے گھروں میں تقسیم کر لیا۔

جب اوس یہودیوں کی امداد سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے خزرج کے کچھ قبیلوں کو حلیف بنایا جن میں بنو عمرو بن عوف تھے' سب نے کہا: بخدا ہم صلح نہیں کریں گے بلکہ بدلہ لیں گے چنانچہ جنگ شروع ہو گئی' اوس میں بہت سے قتل ہوئے کیونکہ ان کی قوم نے انہیں ذلیل کیا۔ سعد بن معاذ اشہلی نکلا تو عمرو بن جموح حرامی نے اسے پناہ دی اور جب اوس نے دیکھ لیا کہ ان کا معاملہ گھاٹے میں ہے تو انہوں نے عہد کر لیا کہ مدینہ میں خزرج کے حلیف بن جائیں پھر مشورہ کیا کہ قریش کے حلیف بنیں چنانچہ انہوں نے عمرے کا ارادہ ظاہر کیا' سب میں یہ عہد تھا کہ حج و عمرہ کا ارادہ کرنے والے کو کچھ نہیں کہتے تھے اس لئے ان کے احوال کی حفاظت پر براء بن معرور مقرر ہوا' وہ مکہ آ گئے اور قریش کو حلیف بنا لیا۔ اس کے بعد ابو جہل آیا (پہلے موجود نہ تھا) تو اس نے حیلے بہانے سے یہ معاہدہ توڑ دیا۔

میں بتلاتا ہوں کہ ابن شبہ نے افلح بن سعید سے روایت کی ہے جو اس بات کے مخالف ہے کہ ابو جہل نے معاہدہ توڑنے میں کوئی دخل دیا تھا اور کسی حیلہ سے کام لیا تھا چنانچہ ابن شبہ نے کہا کہ خزرج کے جلا وطن کرنے پر اوس نکل کھڑے ہوئے تھے اور قریش مکہ کے پاس پہلے گئے' انہوں نے حلیف بنا لیا اور جب انہیں حلیف بنا لیا تو ولیدہ بن

مغیرہ نے کہا: بخدا جب بھی کوئی قوم کسی دوسری قوم کے پاس آتی ہے تو ان کا شرف و عزت گنوا دیتی اور ان کے گھروں کی وارث بن جاتی ہے لہٰذا اوس سے حلف نامہ توڑ دو۔ انہوں نے کہا کس بناء پر توڑ دیں؟ ولید نے کہا کہ قوم میں لحاظ ملاحظہ پایا جاتا ہے لہٰذا ان سے کہہ دو کہ ہمیں کوئی بات بھول گئی جسے ہم یاد نہ رکھ سکے تھے' ہم وہ لوگ ہیں کہ عورتیں گھر پر ہوتی ہیں لہٰذا کوئی انہیں دیکھ کر خوبصورت لگنے پر اسے قتل کر دے گا یا انہیں ہاتھ لگا دے گا چنانچہ جب انہوں نے اوس سے یہ بات کہی تو وہ نفرت کھا گئے اور کہنے لگے کہ یہ حلف توڑ دو چنانچہ قریش نے یہ حلف توڑ دی۔ انتہٰی۔

ابھی یہ قسم پوری نہ ہو سکی تھی کہ اوس میں سے نَبِیــــت خیبر کو چلے گئے' (میں کہتا ہوں کہ اس نبیت کے لفظ سے ابن شبہ نے چند لوگ مراد لئے ہیں اور یہ بنو حارثہ تھے کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ یہ لفظ ان پر بولا جاتا تھا اور ان کے علاوہ بنو عبد الاشہل' بنو ظفر اور بنو زعورا پر بولا جاتا تھا تاہم خیبر کو چلے جانے والے صرف بنو حارثہ تھے جیسے گذر چکا' ہاں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کچھ اور مراد لیا ہو اور یہ لوگ سال بھر وہاں رہے' اس دوران وہاں ان کی ایک بڑھیا مر گئی تو انہوں نے کہا ''سال بھر میں ایک بڑھیا کا مر جانا ایک معمولی حادثہ ہے۔'' یہ ان کی طرف سے ایک کہاوت بن گئی۔

جب خزرج نے دیکھا کہ وہ اوس پر فتح پا گئے ہیں تو اپنے شعروں میں ان پر فخر جتلانے لگے عمرو بن نعمان بیاضی نے کہا: اے میری قوم! بیاضہ بن عمرو نے تمہیں بری جگہ پر لا کھڑا کیا ہے' بخدا میں اس وقت تک غسل نہیں کروں گا جب تک تمہیں بنو قریظہ اور نضیر کے ساتھ نہیں لا کھڑا کروں گا اور جب تک ضمانت والوں کو قتل نہیں کروں گا۔ ان کے پاس پانی کی کمی نہ تھی اور عمدہ کھجوریں بھی بہت تھیں' ان میں سے ایک آدمی نے خوبصورتی سے شعر پڑھے جن میں اوس کے خیبر کی طرف جلا وطن ہونے کا ذکر کیا اور یہ بھی کہ انہوں نے یہودیوں سے ضمانت لی تھی:

> ''اپنے حلیفوں کی طرف آؤ' ان کی عظمت خاک میں مل چکی۔ ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب دشمن کے مقابلے پر جاتے ہیں تو انہیں ایسی ضرب لگاتے ہیں جو دل دہلا دیتی ہے۔''

ان کی یہ بات بنو قریظہ اور نضیر تک پہنچ گئی، ''صریح'' کے لفظ سے یہی لوگ مراد ہیں کیونکہ یہ بنو الکاہن بن ہارون کی اولاد سے تھے اور پھر یہی بات مدینہ میں رہ جانے والے کچھ اوس کے لوگوں کے کانوں میں بھی پڑی چنانچہ وہ کعب بن اسد قرظی کی طرف گئے اور اسے خزرج کے مقابلہ میں حلف پر مجبور کیا چنانچہ اس نے یہ بات مان لی پھر انہوں نے بنو قریظہ اور نضیر سے قسمیہ معاہدہ کیا اور پھر یہ اطلاع خیبر میں جانے والوں تک پہنچا دی' وہ آ گئے تو خزرج نے قتل و غارت کی ٹھانی جس پر کعب بن اسد قرظی نے کہا کہ یہ صرف ایک رات ہے پھر نو ماہ ہیں' حلف پوری ہو جائے گی' انہوں نے اوس کی طرف پیغام بھیجا' ہماری طرف چلے آؤ اور اکٹھے ہو کر ہم ان کی طرف جاتے ہیں' خزرج عبد اللہ بن ابی کی طرف آئے اور کہنے لگے: تمہیں کیا ہوا کہ ضمانت والوں کو قتل نہیں کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں کبھی بھی ان سے دھوکا نہ کروں گا' تم تو باغی لوگ ہو' مجھے معلوم ہوا ہے کہ اوس کہتے ہیں: انہوں نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے' بخدا یہ لوگ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک تم میں سے بہت سے لوگوں کو قتل نہ کر دیں گے۔ عمرو بن نعمان نے کہا: واللہ تمہاری ہوا

اکھڑ گئی ہے' اس پر اس نے کہا کہ میں تمہیں نہیں بلاتا' میں تمہیں قتل ہوتا دیکھ رہا ہوں' چار آدمی تمہیں چادر میں ڈال کر اٹھا لیں گے۔

بنوخزرج نے اکٹھ کیا اور عمرو بن نعمان کو اپنا رئیس بنا لیا(میں یہاں بتاتا چلوں کہ ابن حزم کے مطابق ان دنوں ان کا رئیس نعمان کا والد تھا یعنی رحیلہ بن ثعلبہ بیاضی' واللہ اعلم) اور بعاث کے مقام پر لڑے' یہ "قوری" کی بالائی جانب ایک مقام تھا' خزرج کو شکست ہوئی اور عمرو بن نعمان قتل ہو گیا' اسے اُٹھا کر لایا گیا تو ابی کے کہنے کے مطابق چار شخص اسے اُٹھا کر لائے۔اس پر یہودیوں نے قسم کھائی کہ عبداللہ بن اُبی کا قلعہ گرا دیں گے۔

ابوعمر وراھب اوس والوں کے ساتھ تھا جبکہ ابی کی بیٹی جمیلہ اس کی بیوی تھی' حنظلہ غسیل کی ماں یہی تھی۔

جب یہودیوں نے عبداللہ کے گھر کا احاطہ کیا تو اس نے کہا: جہاں تک میرا معاملہ ہے' میں تو ان کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا اور یہ جو میرے پاس لوگ ہیں' تمہاری ہی اولاد ہیں' میں نے ان میں سے ایک کو بھی قتل نہیں کیا۔خزرج کو لوٹ لیا گیا' انہوں نے میری بات نہیں مانی۔اس کے پاس بچ جانے والوں میں سے بڑی تعداد بنونضیر کی تھی۔انہوں نے سنا تو بہت خوش ہوئے چنانچہ انہوں نے اوس اور قریظہ سے انہیں پناہ دی' ان کی اولاد اور حلیف لوگوں کو چھوڑ دیا گیا' یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ خزرج کے حلیفوں نے حیلے بہانے سے انہیں واپس کر دیا۔

اس جنگ میں اوس کا رئیس حضیر تھا جسے "حضیر الکتائب" کہتے تھے' یہ اسید بن حضیر کا والد تھا' یہ یہیں قتل ہو گیا' خفاف بن ندبہ نے حضیر کا یہ مرثیہ لکھا:

" مجھے خبر مل گئی تھی لیکن میں نے جھوٹ سمجھا' لوگوں نے کہا تھا کہ تمہارا دوست مر گیا ہے' اے آنکھ حضیر الکتائب پر آنسو بہاؤ۔"

ادھر خزرج کا رئیس عمرو بن نعمان بیاضی تھا جیسے گذر چکا۔کچھ کہتے ہیں کہ پہلے امداد خزرج کو ملی تھی پھر حضیر نے اوس کو حوصلہ دیا تو وہ مڑ آئے اور مدد حاصل کر لی۔

ابو الفرج اصفہانی نے ذکر کیا ہے: اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے قاعدے کے مطابق اصیل شخص کو حلیف کے بدلے میں قتل نہیں کرتے تھے چنانچہ اوس نے خزرج کے ایک حلیف کو قتل کر دیا' انہوں نے اسے قید کرنے کا ارادہ کیا پھر رُک گئے' یہی وہ وجہ تھی جس کی بناء پر ان کے درمیان جنگ ہوئی اور صحیح یہ ہے کہ جنگ بعاث ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی' بعض چار سال قبل لکھتے ہیں اور کچھ نے زیادہ عرصہ کیا ہے' یہی وہ جنگ ہے جس کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ملتی ہے: "یہ وہ جنگ بعاث ہے جسے اوس وخزرج کے اسلام لانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خاطر برپا کیا تھا' آپ یہاں تشریف لائے تو ان میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا اور ان کے سردار قتل ہو گئے تھے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وہ اکابر قتل ہو گئے تھے جو اپنی جہالت میں شدت کی بناء پر اسلام لانے والے

نہ تھے کیونکہ وہ تکبر والے تھے' کسی کے ماتحت ہونا نہیں جانتے تھے' ان میں سے صرف عبد اللہ بن ابی رہ گیا تھا جس کی کہانی مشہور ہے' یونہی ابو عامر راہب بچ گیا تھا جسے حضور ﷺ نے فاسق کا نام دیا تھا۔

اہلِ سیرت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو اس سے قبل اہلِ مدینہ کا سردار عبد اللہ بن ابی بن سلول تھا جو قبیلۂ خزرج سے تھا پھر بنو عوف بن خزرج اور پھر بنو الحبلی سے تعلق تھا' اس کی قوم میں اس سے بڑھ کر کوئی باعزت نہ تھا' اوس اور خزرج دونوں قبیلے اسلام لانے سے پہلے اور بعد' اس کے سوا کسی ایک شخص پر متفق نہیں ہوئے تھے حالانکہ اسی کے دور میں اوس کے اندر بھی ایک اچھا شخص موجود تھا جس کی اتباع ہوتی تھی' وہ ابو عامر بن صیفی بن نعمان تھا جو بنو ضبیعہ بن زید میں سے ایک تھا' اسی کو ابو حنظلہ غسیل کہتے تھے' یہ راہب بن گیا تھا اور بالوں سے بنی گودڑی پہنا کرتا تھا۔ یہ دونوں شخص اپنی اپنی اس عزت کے باوجود بد بخت تھے' رہا عبد اللہ بن ابی بن سلول تو جب اس کی قوم اس کو چھوڑ کر اسلام لے آئی تو وہ کینہ سے بھر گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے حکومت چھین لی ہے اور پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کی قوم اسلام سے نہیں ہٹے گی تو مجبوراً اسلام لے آیا لیکن اندر سے پکا منافق اور کینہ سے بھرپور رہا اور یہی وجہ تھی کہ وہ منافقوں کا سردار ٹھہرا' منافق اسی کے پاس جمع ہوتے اور غزوۂ بنو المصطلق کے موقع پر قرآن کے مطابق اسی نے کہا تھا:

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ○ (سورۂ منافقون: ۸)

"ہم مدینہ پھر کر گئے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے' وہ اس میں سے نکال دے گا' اسے جو نہایت ذلت والا ہے۔"

رہا ابو عامر تو اس کی قوم (اوس) جب اسلام لے آئی' وہ کفر پر ڈٹ گیا اور اپنی قوم سے الگ تھلگ ہو گیا' رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لے آئے تو وہ یہاں پہنچا اور کہا: یہ کیا دین ہے جسے تم لے آئے ہو؟ آپ نے فرمایا: یہ دین ابراہیم ہے جس میں اونچ نیچ نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا: دین ابراہیمی پر کار بند تو میں ہوں۔ آپ نے فرمایا: تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ اس نے کہا: اے محمد! تم نے وہ کچھ اس دین میں داخل کر دیا ہے جو اس میں نہ تھا۔ آپ نے فرمایا' میں نے تو ایسا نہیں کیا' میں تو صاف ستھرا دین لایا ہوں۔ اس جھوٹے نے کہا: اللہ اس دین کو یہاں سے نکال دے اور یہ اکیلا رہ جائے۔ آپ نے فرمایا' ہاں جو جھوٹا ہو گا' وہ یونہی ہو گا چنانچہ وہ دشمن خدا اسلام چھوڑ کر مکہ کو چلا گیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسے راہب نہ کہو بلکہ "فاسق" کہا کرو" اور جب آپ نے مکہ فتح کر لیا تو وہ طائف کی طرف چلا گیا پھر جب اہلِ طائف اسلام لے آئے تو اہلِ شام کے پاس چلا گیا تو وہاں جا کر ذلت' بے وطنی اور تنہائی کی موت مر گیا۔

کچھ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ اوس و خزرج میں سے ایک بھی شخص ابو عامر سے بڑھ کر حضرت محمد ﷺ کی تعریف نہیں کیا کرتا تھا' وہ یہودیوں سے پیار رکھتا اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ان سے پوچھتا رہتا' وہ اسے آپ کے بارے میں بتایا کرتے پھر تیماء کے یہودیوں کی طرف گیا اور شام پہنچا' وہاں کے عیسائیوں سے اس بارے میں پوچھا

تو انہوں نے بتا دیا' وہاں سے واپس ہوا تو کہتا تھا کہ میں اعتدال والے دین پر ہوں پھر راہب بنا اور بالوں سے بنی گوڈری پہنی' ظاہر یہ کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے تشریف آوری کا منتظر ہے اور جب مکہ میں آپ کا ظہور ہو گیا تو آپ کی طرف نہیں گیا اور جب آپ مدینہ پہنچے تو حسد کرنے لگا اور باغی ہو گیا' راوی نے نبی کریم ﷺ کے پاس اس کے جانے کا پہلے کی طرح ذکر کیا البتہ یہ بتایا کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا' یہ جھوٹا ہے' اللہ اسے تنہائی اور ذلت کی موت دے گا' اس نے کہا: آمین۔

پھر اس راوی نے اس کے مکہ کو چلے جانے کا ذکر کیا اور یہ بات بڑھائی کہ: وہ قریش کے دین کی اتباع کرتے ہوئے ان کے ساتھ رہا اور اپنا مذہب چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہ وہ شخص تھا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کے مطابق دیکھا گیا۔

فصل نمبر ۷

اوس وخزرج پر نبی کریم ﷺ کی مہربانیوں کی ابتداء اور عقبۂ صغریٰ کا ذکر

پہلے ذکر شدہ جنگیں اوس وخزرج میں جاری تھیں کہ اللہ نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کا شرف بخشا اور وہ یوں کہ آپ عربوں کے اجتماع والے ہر موقع پر ان سے فرمایا کرتے کہ انہیں اپنے قبیلہ کی طرف لے چلیں' فرمایا: کوئی ایسا ہے جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے چلے؟ کیونکہ قریش نے مجھے کلامِ ربانی سنانے سے روک دیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ قوم میں ایسا شخص پہلے ہی ہوتا ہے جو ان کے حالات جاننا ہوتا ہے۔

ابن اسحاق نے بتایا کہ حضور ﷺ نے کندہ' کلب اور بنو حنیفہ کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا چنانچہ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ ان قبائل سے زیادہ آپ کے ساتھ برا پیش آنے والا اور کوئی نہ تھا۔ امام زہری کہتے ہیں کہ ہجرت سے قبل کے سالوں میں آپ مختلف قبیلوں کے پاس جانے کی خواہش فرماتے' قوم کے شریف لوگوں سے بات کرتے اور صرف ان سے اتنا چاہتے کہ آپ کی بات سنیں اور انکار نہ کیا کریں پھر فرماتے کہ میں تم میں سے کسی کو کسی کام کے لئے مجبور نہ کروں گا' میں صرف یہ کہوں گا کہ مجھے تکلیف پہنچانے والوں کو ذرا روک دیا کرو کہ میں لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا لیا کروں ورنہ وہ میری بات قبول نہیں کرتے۔

علامہ واقدی نے حضور ﷺ کی طرف سے بنو عبس کو دعوتِ اسلام دینے کا ذکر کیا ہے' آپ عکاظ میں غسان اور بنو محارب کے گھروں کی طرف تشریف لے گئے' دین اسلام کی دعوت دیتے رہے' آپ عرب والوں میں سے جسے بھی ملتے اور دیکھتے' اسے اسلام کی دعوت دیئے جاتے' ہوتے ہوتے آپ سوید بن صامت (اوس قبیلہ میں سے بنو عمر

بن عوف کا بھائی بند) کے پاس تشریف لے گئے (وہ چونکہ مضبوط اور بالوں والا تھا لہٰذا اسے "کامل" کہتے تھے) اور اسے دعوتِ اسلام دی' نہ تو اس نے نفرت کی اور نہ ہی دعوت قبول کی پھر یثرب کی طرف چلا گیا اور جلد ہی جنگ بعاث میں قتل ہو گیا۔

ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ اس کی قوم کے کچھ کہا کرتے تھے کہ ہم نے اسے مرتے دیکھا تھا' وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

پھر آپ ابو الحیسر انس بن رافع کے پاس مکہ پہنچے (وہ اپنی قوم بنو عبد الاشہل کے جوانوں میں شامل تھا جو حلیف بننا چاہتے تھے) اور انہیں دعوتِ اسلام دی۔ان میں سے ایک جوان ایاس بن معاذ نامی نے کہا کہ بخدا یہ دین ہمارے پہلے دین سے بہتر ہے' اس پر ابو الحیسر نے اسے مارا اور جھڑکا' وہ خاموش ہو گیا اور اس کے بعد وہ حلیف نہ بن سکے اور اپنے اپنے شہروں کو چلے گئے' یہ ایاس بن معاذ مر گیا تو لوگوں نے کہا کہ مسلمان مرا ہے۔

علامہ رزین نے یہی واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: پھر اوس قبیلہ والے آئے' وہ قریش کے حلیف بننا چاہتے تھے' رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں اپنی بات سننے کا فرمایا: ارشاد فرمایا کہ میری بات سنو! تم جس کام کے لئے آئے ہو' اس میں کیا بہتری دیکھتے ہو' پھر انہیں قرآن کی تلاوت سنائی اور حکم دیا کہ مجھ سے بیعت کر لو اور میری بات مانا کرو کیونکہ عنقریب تمہیں میرے پاس جمع ہونا ہے۔یہ سن کر عمرو بن جموح نے کہا: اے میری قوم! تم جس کام کے لئے آئے ہو' اس سے یہ بہت بہتر ہے۔لیکن انہوں نے اسے جھڑک دیا اور کہا: ہم اس غرض سے تو آئے ہی نہیں چنانچہ انہوں نے آپ کی بات نہ مانی اور واپس چلے گئے چنانچہ جنگ بعاث ہوئی۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بات سنانا چاہتے تو لوگ انکار کرتے' اسی دوران آپ نے اوس کے ایک گروہ کے بارے میں سنا کہ ان میں پچھلی نفرت بھڑک اٹھی ہے چنانچہ ان کے گھروں میں تشریف لے گئے' وہ پوچھنے لگے: تم کون ہو؟ آپ نے انہیں رشتہ داری بتائی اور اپنے بارے خبردار کیا' قرآن کی تلاوت فرمائی اور انہیں بتایا کہ تم میرے ننھیال ہو' میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں مجھے بلاؤ اور مخالفت کرنے والوں کو ذرا روکو تاکہ میں اللہ کے احکام بتا سکوں۔یہ سن کر ان میں سے کچھ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دل میں کہا: بخدا یہ شخص سچا ہے' یہ تو وہی نبی ہے اہلِ کتاب جس کا ذکر کیا کرتے ہیں اور اسی کے نام کی برکت سے تمہارے خلاف فتح حاصل کیا کرتے ہیں' چنانچہ اوس قبیلہ والوں نے آپ کی آمد کو اچھا جانا اور آپ پر ایمان لے آئے' کہنے لگے: آپ تو اللہ کے رسول ہیں' ہم آپ کو خوب پہچانتے ہیں' آپ پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کو سچا کہتے ہیں' آپ ہمیں حکم دیں' ہم آپ کی بے فرمانی نہیں کریں گے۔

حضور ﷺ ان کے پاس جانے آنے لگے تو انہیں اسلام کی سوجھ بوجھ آنے لگی۔پھر آپ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی قوم کو اپنے اس دین کی دعوت دو۔انہوں نے عرض کی کہ آپ ہمارے ساتھ ان کے پاس تشریف لے چلیں جس پر

آپ نے فرمایا' ایسا اللہ کے حکم آنے پر کروں گا چنانچہ وہ اہلِ مدینہ میں اپنے اہلِ قبیلہ سے جا ملے اور پھر موسم میں آپ کی خدمت حاضر ہوئے پھر واقعۂ عقبہ ہوا۔

ابن زبالہ کا یہ بیان پہلے بیان کے مخالف ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ اوس قبیلہ میں سے کچھ لوگوں نے آپ دعوت قبول نہ کی تھی۔

حاکم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت لکھی ہے' انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا کہ اہل عرب کو تبلیغ فرمایا کریں۔آپ منیٰ کو چل پڑے: میں اور ابوبکر ساتھ تھے۔وہاں اہلِ عرب کی ایک مجلس میں پہنچے۔ابوبکر آگے ہوئے' آپ نسب ناموں کے ماہر تھے' ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے بتایا' ہم ربیعہ ہیں۔

چنانچہ حاکم نے اس کے بعد ایک طویل حدیث لکھی ہے جس میں ان کے مڑنے کا ذکر کیا اور اخیر میں اسلام سے رُک جانے کا بیان کیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم اوس وخزرج کی مجلس میں گئے' یہی وہ لوگ تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ''انصار'' کا نام دیا تھا کیونکہ انہوں نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور امداد کی تھی۔فرماتے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ سے بیعت کر لی تھی۔

عقبۂ اُولیٰ

ابن اسحاق' عقبۂ اولیٰ کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کرنے کا ارادہ فرمایا تو رسول اللہ ﷺ اس موسم میں نکلے جس میں انصار سے ملے تھے اور اسی موسم میں انہیں دعوتِ اسلام دی اور اپنا آپ ان پر پیش کیا جیسے ہر موسم کرتے رہتے تھے' چنانچہ عقبہ (گھاٹی) کے پاس تھے کہ خزرج کے ایک گروہ سے ملے اور پوچھا: کیا یہودیوں کے غلام ہو؟ انہوں نے کہا' ہاں۔فرمایا: ذرا دیر بیٹھتے نہیں ہو' میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟ انہوں نے کہا' کیوں نہیں ضرور بات کیجئے چنانچہ وہ آپ کے پاس بیٹھ گئے' آپ نے انہیں اللہ کے بارے میں بتایا اور دعوتِ اسلام دی۔اللہ نے ان کے اسلام لانے کا یہ بہانہ بنایا کہ یہودی ان کے شہروں میں تھے جو اہلِ علم وکتاب تھے' یہ لوگ مشرک تھے اور بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے' وہ ان شہروں میں ان سے جنگ کرتے' جب بھی ان کے درمیان کوئی معاملہ آ جاتا تو ان سے کہتے: ایک نبی کا زمانہ قریب ہے' ہم ان کی اتباع کریں گے اور ان کے ساتھ مل کر تمہیں عاد وارم کی طرح قتل کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب اس گروہ سے بات کی اور انہیں اللہ کی طرف بلایا تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا: یہ بات جان لو کہ یہ وہی نبی ہیں جن کے متعلق یہودی تمہیں بتاتے رہے ہیں لہٰذا ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں چنانچہ فوراً انہوں نے آپ کی بات مان لی (اسلام لے آئے) اور عرض کی: ہم اپنی قوم کو چھوڑ

رہے ہیں، ایسی کوئی قوم نہیں جن میں موجود دشمنی ان کی دشمنی جیسی ہو اگر یہ آپ پر اکٹھے ہو جائیں تو انہیں آپ جیسا پیارا اور کوئی نہیں لگے گا۔

اس کے بعد وہ اپنے اپنے علاقے کو چلے گئے اور اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دینے لگے اور جب وہ آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے تو ان کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کے گھر میں آپ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔

عقبۂ اولیٰ میں شامل حضرات

ابن اسحاق کہتے ہیں، جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ پہلی مرتبہ آنے والے (عقبۂ اولیٰ) کل چھ افراد تھے جن کا تعلق خزرج سے تھا، وہ یہ تھے: ابو امامہ اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، (یہ دونوں بنو غنم بن مالک بن نجار میں سے تھے) رافع بن مالک بن عجلان زرقی، قطبہ بن عامر بن حدیدہ، جابر بن عبد اللہ بن رئاب اور عقبہ بن عامر بن نابی تھے (یہ تینوں بنو سلمہ میں سے تھے) لیکن موسیٰ بن عقبہ نے عروہ کے ذریعے زہری اور ابو الاسود سے روایت کی کہ وہ چھ حضرات یہ تھے: اسعد بن زرارہ، معاذ بن عفراء (عفراء ان کی والدہ تھیں اور باپ کا نام عمرو بن جموح تھا، یہ بھی بنو غنم بن مالک بن نجار تھے) رافع بن مالک، یزید بن ثعلبہ بلوی جو بنو غصینہ میں سے ان کے حلیف تھے، ابو الہیثم مالک بن تیہان اوسی، یہ عبد الاشہل بن جشم کے برادران میں بنو جشم کہلاتے تھے، عویم بن ساعدہ اوسی، یہ بنو امیہ بن زید سے تھے، یہ بھی کہتے ہیں کہ ان میں عبادہ بن صامت خزرجی تھے، یہ سالم بن عوف کے برادران بنو غنم میں سے تھے اور ذکوان زرقی تھے چنانچہ یہ کل آٹھ حضرات تھے۔ کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے سات افراد گنے ہیں چنانچہ انہوں نے جابر بن عبد اللہ یا عبد اللہ بن زید کو شمار نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ پہلے سال میں صرف یہ دو حضرات اسلام لائے تھے، اسعد بن زرارہ اور ذکوان۔

ابن اسحاق دوسرے عقبہ یا پہلے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب اگلا سال آیا تو بارہ افراد آئے تھے پھر جابر بن عبد اللہ کے علاوہ پہلے حضرات کا ذکر کیا علاوہ ازیں ذکوان زرقی، عبادہ بن صامت، یزید بن ثعلبہ، عباس بن عبادہ بن نضلہ غنمی سالمی خزرجی، معاذ بن عفراء، ابو الہیثم بن تیہان اور عویم بن ساعدہ تھے۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے گھاٹی (عقبہ) کے پاس انہیں عورتوں جیسے طریقے پر بیعت فرمایا یعنی اس طرح بیعت فرمایا جیسے فتح مکہ کے بعد عورتوں سے بیعت لی تھی کہ:

عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا ۝ (سورۂ ممتحنہ: ۱۲)

''کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گی۔''

ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا بلکہ توحید اور نماز کے علاوہ یہ سب کچھ فرض نازل ہونے سے پہلے ہوا تھا۔

حضور ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا کہ انہیں دین سکھائیں اور اسلام

کی تعلیم دیں۔ وہ انہیں نماز پڑھایا کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ آپ نے اس کے بعد حضرت مصعب کو ان کی طلب پر ان کی طرف بھیجا کہ وہ علم سکھائیں اور قرآن پڑھائیں چنانچہ انہیں "مُقْرِیء" کہا جاتا تھا' یہ وہ پہلے صحابی ہیں جنہیں ایسا کہا گیا۔

وہ گئے اور اسعد بن زرارہ کے پاس ٹھہرے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی طرف مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم کو بھیجا تھا' حضرت مصعب بن عمیر تو انہیں نماز پڑھایا کرتے کیونکہ اوس وخزرج میں سے کچھ لوگ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ ان میں کوئی دوسروں کو نماز پڑھائے چنانچہ انہوں نے انہیں جمعہ پڑھایا' اسلام میں یہ پہلا جمعہ تھا۔ دار قطنی میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہے' رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ انہیں جمعہ پڑھائیں' انہوں نے جمعہ پڑھایا جس میں کل بارہ افراد تھے۔

علامہ زھری لکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق کے نزدیک انہیں پہلا جمعہ پڑھانے والے ابو امامہ اسعد بن زرارہ تھے۔ ابو داؤد میں حضرت عبد الرحمٰن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے' کہا کہ میرے والد جب جمعہ کی آواز سنتے تو اسعد بن زرارہ کے لئے استغفار کیا کرتے' میں نے اس بارے میں پوچھا تو کہا: یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نقیع الخضمات میں سب سے پہلا جمعہ پڑھایا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ اس دن کتنے لوگ تھے تو انہوں نے بتایا' چالیس افراد تھے۔

علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ یہ روایت زھری کی اس روایت کے خلاف نہیں جس میں مصعب بن عمیر کے انہیں جمعہ پڑھانے کا ذکر ہے جس میں بارہ افراد شامل ہوئے کیونکہ زھری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انہوں نے ان بارہ حضرات کے تعاون سے جمعہ قائم کیا تھا جنہوں نے گھاٹی میں بیعت کی تھی اور حضور ﷺ نے انہیں ان کے ساتھ ہی بھیج دیا تھا یا مسلمانوں کی کثرت ہونے پر انہیں ان کے پیچھے روانہ کیا تھا اور اسعد بن زرارہ انہیں میں تھے چنانچہ زھری نے جمعہ پڑھانے کو مصعب کی طرف منسوب کیا کیونکہ وہ امام بنے تھے لیکن کعب نے اسعد کی طرف منسوب کیا کیونکہ مصعب پہلے انہی کے پاس گئے تھے' انہوں نے ہی مدد کی تھی اور دعوتِ اسلام دینے کے لئے انصار کے گھروں تک وہی لے کر گئے تھے' بارہ افراد سے زھری کی مراد وہ لوگ تھے جو ان کے ساتھ نکلے تھے اور ان کے پشت پناہ تھے جبکہ کعب کا مقصد یہ بتانا ہے تمام غازی اتنے تھے لہٰذا کعب کا یہ قول متصل ہے جبکہ زھری کا منقطع ہے اھ۔

طبرانی نے حضرت عروہ سے ایک طویل مرسل حدیث لکھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ اپنی طرف سے کسی آدمی کو بھیجیں جو لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم دے کیونکہ وہ اس لائق ہوگا کہ اس کی بات مانی جائے چنانچہ رسول اللہ نے ان کی طرف بنو عبد الدار کے بھائی بنو مصعب بن عمیر کو روانہ فرمایا' وہ بنو غنم کے اسعد بن زرارہ کے پاس پہنچے اور لوگوں کو دعوت دینے لگے اور اسلام پھیلانا شروع کر دیا' دعوتِ اسلام کا یہ سلسلہ وہ خفیہ طور پر کرتے تھے پھر اسعد بن زرارہ آئے' مصعب بن عمیر ساتھ تھے' یہ مرق کے مقام یا اس کے قریب پہنچے' وہاں بیٹھ گئے' ایک قبیلہ والوں کو پیغام بھیجا' وہ چھپ کر آئے' مصعب بن عمیر ان انہیں کچھ سمجھا رہے تھے اور قرآن کا

قصہ بیان کر رہے تھے کہ سعد بن معاذ کو کسی نے بتا دیا تو وہ ہتھیار پہن کر ان کے پاس پہنچا' نیزہ پاس تھا' آ کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: ایک غلام ہو کر ہمارے گھر میں آ گیا ہے' یہ ایک تنہا ذلیل اور پردیسی ہو کر ہمارے کمزور لوگوں کو باطل طریقے سے بے وقوف بنا رہا ہے اور انہیں دعوتِ اسلام دے رہا ہے' آئندہ تم دونوں ہماری طرف نہ آنا چنانچہ وہ واپس چلے گئے پھر دوبارہ وہ مرق نامی کنوئیں یا اس کے قریب آئے تو پھر سعد بن معاذ کو پتہ چل گیا۔ اس پر اس نے پہلے سے کم انہیں ڈانٹا۔ اسعد نے یہ نرمی دیکھی تو کہا: اے خالہ زاد بھائی! اس کی بات تو سنو! اگر یہ نامناسب بات کریں تو اچھے طریقے سے انکار کر دو اور اگر بہتر ہے تو اسے ماننے کی کوشش کرو۔ سعد نے کہا' یہ کیا کہتا ہے؟ اس پر مصعب نے یہ تلاوت کی:

حٰمٓ ○ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (سورۂ زخرف: ۱ تا ۳)

"روشن کتاب کی قسم' ہم نے اسے عربی قرآن اُتارا کہ تم سمجھو۔"

یہ سن کر سعد نے کہا میں وہی سنوں گا جس کو جانتا ہوں' واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دے دی تھی' انہوں نے اپنی قوم میں جانے تک اسلام ظاہر نہیں کیا چنانچہ بنوعبد الاشہل کو بلایا اور بتایا کہ وہ اسلام لے آئے ہیں اور کہا جو بھی چھوٹا بڑا اس میں شک کرے گا تو اسے اس سے زیادہ ہدایت کی بات بتانا ہو گی' بخدا یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔ یہ سن کر آپ اسلام لے آئے اور دعوتِ اسلام دیتے' گنتی کے چند لوگوں کے علاوہ سب اسلام لے آئے چنانچہ اسلام کے گھروں میں سب سے پہلا یہ گھر تھا جو اسلام لے آیا۔ پھر بنونجار نے اسعد بن زرارہ پر سختی کی اور مصعب بن عمیر کو وہاں سے نکال دیا' وہ سعد بن معاذ کے پاس چلے گئے اور انہی کے سہارے دعوتِ اسلام دینے لگے اور پھر انصار میں سے کوئی گھر ایسا نہیں ہو گا جس میں سے کوئی اسلام نہ لایا ہو' ان کے اشراف لوگ اسلام لے آئے' عمرو بن جموح بھی اسلام لے آئے اور اپنے بت توڑ دیئے' مسلمانوں نے بت پرستوں کو اسلام کی دعوت دی پھر مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اھ۔

ابن اسحاق نے اپنے مشائخ سے سن کر کم وبیش یہی قصہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ: اسعد بن زرارہ' مصعب بن عمیر کو لے کر بنوعبد الاشہل اور بنوظفر کے گھروں کی طرف گئے اور بنوظفر کے ایک باغ میں مرق نامی کنوئیں پر پہنچے' وہاں بیٹھ گئے' اسلام لانے والے جمع ہو گئے اور جب سعد بن معاذ و اسید بن حضیر (یہ اپنی قوم بنوعبد الاشہل کے سردار تھے) سے سنا (یہ دونوں مشرک تھے) تو سعد نے اسید سے کہا: تمہارا باپ نہ رہے' آؤ میرے ساتھ ان دو شخصوں کی طرف چلیں جو ہمارے پاس آ کر ہمارے کمزور لوگوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں' انہیں ڈانٹتا ہوں اور اس بات سے روکتا ہوں کہ ہمارے گھروں میں آیا کریں کیونکہ اگر اسعد بن زرارہ رشتہ دار نہ ہوتے تو میں اکیلا ہی کافی تھا' وہ میرا خالہ زاد ہے۔

اسید نے اپنا نیزہ پکڑا اور ان دونوں کی طرف آیا' اسعد بن زرارہ نے جب دیکھا تو مصعب سے کہا کہ یہ اپنی قوم کا سردار ہے جو تمہارے پاس آ رہا ہے' اس کے پاس اللہ کی سچائی بیان کرنا۔ وہ دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور

گالیاں دیتا رہا' کہنے لگا: تمہیں کس چیز نے ہمارے پاس آنے پر مجبور کیا کہ ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بنا رہے ہو؟ جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ مصعب نے کہا: تم یہاں کچھ دیر کے لئے بیٹھ کر بات سن سکتے ہو؟ اگر ہماری بات پسند آئے تو مانو اور نہ پسند آئے تو نہ مانو۔ اس نے کہا بالکل ٹھیک کہا ہے اور پھر اپنا نیزہ زمین پر گاڑ کر ان کے پاس بیٹھ گیا' حضرت مصعب نے ان سے اسلام کے بارے میں بات کی اور کچھ آیات تلاوت کر دیں چنانچہ دونوں کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا: بخدا ہم نے سعید کے بولنے سے قبل ہی اس کے چہرے پر اسلام کا اثر دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ کہنے لگا:

> ''یہ کتنا خوبصورت دین ہے اور کیا اچھا قرآن ہے! تم اس دین میں داخل ہونے کے لئے کیا کچھ کرتے ہو؟ دونوں نے کہا: پہلے غسل کر کے پاکیزہ ہو جاؤ پھر پاکیزہ کپڑے پہنو اور پھر اللہ کی گواہی دو پھر تمہیں نماز پڑھنا ہو گی' اسید اُٹھ کھڑے ہوئے' ان کے کہنے کے مطابق کیا اور پھر دونوں سے کہنے لگا کہ میرے پیچھے ایک اور شخص ہے' اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو اس کی قوم میں سے کوئی بھی اسلام لانے سے نہیں رہے گا' میں ابھی اسے تمہارے پاس بھیجتا ہوں' وہ سعد بن عبادہ ہے۔''

پھر اسید' سعد اور اس کی قوم کے پاس گئے' وہ اکٹھے بیٹھے تھے' سعد نے انہیں آتے دیکھا تو کہا' بخدا یہ اس رنگ میں نظر نہیں آ رہے جس میں یہاں سے گئے تھے چنانچہ جب اسید ان کی مجلس میں جا کھڑے ہوئے تو سعد کہنے لگا: کیا کر آئے ہو؟ اسید نے بتایا کہ میں نے دو آدمیوں سے بات کی تو بخدا ان پر خوف کا کوئی اثر نہ تھا' میں نے انہیں روکا تھا تو کہنے لگے' تم جیسے چاہتے ہو کریں گے' مجھے پتہ چلا ہے کہ بنو حارثہ اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے گئے ہیں' انہیں پتہ چلا ہے کہ وہ تمہارا خالہ زاد بھائی ہے' وہ تمہیں شرمسار کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سن کر سعد اُٹھ کھڑا ہوا' سخت ناراض تھا اور تیزی سے اس کی جانب ڈرانے چلا جس کے بارے میں اسید نے بتایا تھا۔ اسعد نے اس کے ہاتھ سے نیزہ پکڑ لیا اور کہا بخدا تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پھر دونوں کی طرف گیا اور دیکھا کہ وہ مطمئن تھے تو اسے پتہ چل گیا اسید کا مقصد یہ ہے کہ ان کی بات سنیں چنانچہ سعد ان کے پاس کھڑا ہو گیا اور گالیاں دیں پھر کہا اے ابو امامہ! بخدا اگر میری اور تمہاری رشتہ داری نہ ہوتی تو تم مجھ سے یہ امید نہ رکھتے' کیا اس چیز کے بارے میں ہمیں گھیرا ہے جو ہمیں ناپسند ہے' اسعد نے مصعب سے کہا تھا: اے مصعب! واللہ تمہارے پاس قوم کا سردار آ رہا ہے اگر وہ تمہاری بات مان لیتا ہے تو اس کی قوم میں تمہاری بات ماننے سے دو آدمی بھی پیچھے نہیں رہ جائیں گے' مصعب نے کہا تھا کیا کچھ دیر بیٹھ کر میری بات سن سکتے ہو؟ اگر میری بات پسند آ جائے تو اسے قبول کر لینا اور اگر ایسا نہیں تو ہم قابلِ اعتراض بات نہیں کریں گے' سعد نے کہا: بات تو انصاف کی ہے اور پھر نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گئے' انہوں نے اسلام لانے کو کہا اور قرآن کی تلاوت کی' وہ کہتے کہ بخدا ہم نے بات کرنے سے پہلے ہی ان کے چہرے پر اسلام کا اثر دیکھ لیا کیونکہ اس میں ایک خاص چمک اور تر و تازگی تھی پھر دونوں سے کہا کہ اسلام لاتے وقت تم

کیا کرتے ہو؟ تو انہوں نے گذشتہ بات دہرا دی پھر عامر اپنی قوم کی مجلس میں گئے' اسید بن حضیر ساتھ تھے' ان کی قوم نے انہیں آتے دیکھا تو کہنے لگے: ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں جس صورت میں سعد گئے تھے' اس میں دکھائی نہیں دیتے۔ جب ان کے پاس آ ٹھہرے تو کہا: اے بنو عبد الاشہل! تم میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں' آپ کی رائے سب سے بہتر ہوتی ہے کہنے لگے: تمہارے مردوں اور عورتوں سے مجھ پر کلام اس وقت تک حرام ہے جب تک تم اللہ و رسول پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ کہتے ہیں: رات ہوئی تو بنو عبد الاشہل کے گھروں میں کوئی مرد اور عورت ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو' پھر مصعب اسعد بن زرارہ کے گھر گئے' وہ ٹھہرے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے' انصار میں سے ایسا کوئی گھر باقی نہ رہ گیا تھا جس میں مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوگئی ہوں البتہ بنو امیہ بن زید' خطمہ' وائل اور واقف' یہ اوس اللہ تھے' سے کچھ لوگ رہ گئے تھے' اس کی وجہ یہ تھی کہ ابو قیس بن صیفی بن اسلت ان میں موجود تھا' یہ ان کا شاعر تھا وہ لوگ اس کی بات سنتے اور مانا کرتے تھے' رسول اللہ ﷺ کی ہجرت تک اسلام سے دور رہا' بدر' اُحد اور خندق کے واقعات گذر گئے تو پھر یہ سب لوگ اسلام لے آئے۔

علامہ بخاری کی تاریخ اوسط میں ہے کہ اہلِ مکہ نے غائبانہ طور پر ایک آواز سنی تھی' ابھی سعد بن معاذ اسلام نہیں لائے تھے:

"اگر دونوں سعد اسلام لاتے ہیں تو مکہ میں حضرت محمد ﷺ کو کسی مخالف سے کوئی خطرہ نہ ہوگا۔
تو اسے اوس کے سعد تو مددگار ہو جا اور اے خزرج کے سعد ہدایت دینے والے (نبی) کی بات مان لینا اور اللہ سے جنت الفردوس میں جانے کی آرزو ایک عارف کی طرح رکھنا۔"

آگے ان کے ایمان کا سبب کچھ اور بھی آ رہا ہے جسے رزین نے ذکر کیا ہے لیکن یہ زیادہ صحیح ہے' ابن اسحاق نے پہلی روایت میں حضرت عمرو بن جموح کے اسلام کا ذکر نہیں کیا بلکہ اسے دوسرے عقبہ میں جا کر ذکر کیا ہے جیسے آ رہا ہے ہاں اس کے بیٹے معاذ عقبہ میں موجود تھے۔

فصل نمبر ۸

عقبۂ کبرٰی

کچھ علماء اسے عقبۂ ثانیہ کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ تیسرا تھا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ پھر مصعب بن عمیر مکہ واپس آ گئے اور نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی اور بیعت کی بناء پر کچھ مسلمان انصار اہلِ شرک قوم کے حج کرنے والوں کے ساتھ نکلے اور مکہ پہنچے' انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایامِ تشریق میں عقبہ کا وعدہ کیا جب اللہ نے ان کے بارے میں جو ارادہ فرمایا انہیں عزت دی' اپنے نبی کی مدد کی' اسلام اور اہلِ اسلام کو غالب کیا' شرک اور مشرکوں کو ذلیل کیا۔

ابن اسحاق نے حضرت کعب بن مالک سے روایت کی' انہوں نے کہا کہ ہم اپنے حج کے لئے چلے تو ہماری قوم کے رشتہ دار ہمراہ تھے' ہم نمازیں پڑھتے اور دین سیکھتے رہے' ہمارے سردار اور بڑے براء بن معرور ساتھ تھے' انہوں نے کعبہ کی طرف نماز ادا کرنے کا طریقہ بتایا' ہم مکہ پہنچے' ہم نے اس سے قبل رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہ تھا چنانچہ آپ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ حضرت عباس کے ساتھ مسجد میں ہیں' ہم آپ کے پاس پہنچ کر مجلس میں بیٹھے' براء نے آپ سے قبلہ کے بارے میں سوال کیا پھر حج کے لئے نکلے اور عقبہ کا وعدہ لیا' جب وہ رات آئی جس کا رسول اللہ ﷺ سے وعدہ گیا تھا' ہم نے اپنے ہمراہ آنے والے مشرکوں سے اپنا اسلام چھپا رکھا تھا' ہمارے ساتھ حضرت جابر کے والد عبد اللہ بن عمرو تھے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے' انہیں ہم نے اسلام کے بارے میں سمجھایا تو وہ فوراً مسلمان ہو گئے اور انہیں عظمت مل گئی۔

کہتے ہیں کہ اس رات ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنے پڑاؤ میں سو گئے۔رات کا تیسرا حصہ گذرا تھا کہ ہم وہاں سے آپ سے وعدہ کے مطابق پاؤں کھسکاتے اور چھپتے چھپاتے نکلے اور گھاٹی میں عقبہ کے نزدیک جمع ہوئے' ہم تہتر افراد تھے' دو عورتیں بھی ہمراہ تھیں: بنو مازن میں سے ایک ام عمارہ بنت کعب اور بنو سلمہ میں سے ایک اسماء بنت عمر بنت عدی تھیں۔

کہتے ہیں' آپ تشریف لائے تو حضرت عباس آپ کے ہمراہ تھے' انہوں نے کہا' تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ ہم سے ہیں' ہم ان کی حفاظت کرتے ہیں' وہ غالب ہوں گے' وہ صرف آپ کے پاس تشریف لائے ہیں لہٰذا اگر تم آپ سے اس معاملے میں پورا اترو گے جس کے لئے آپ نے تم کو دعوت دی ہے اور مخالفین سے آپ کی حفاظت کرو گے تو بس ٹھیک ہے انہوں نے کہا' ہم نے آپ کی بات سن لی' یا رسول اللہ! اب آپ بات کریں' آپ ہم سے اپنے اور اللہ کے بارے میں جو توقع رکھتے ہیں' ہم پورا کرنے کو تیار ہیں چنانچہ آپ نے بات شروع فرمائی' دینِ اسلام کی دعوت دی اور تلاوت کی پھر اسلام میں آنے کا شوق دلایا اور ارشاد فرمایا: میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت ویسے ہی کرو گے جیسے اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہو۔

فرماتے ہیں' اس پر براء بن معرور نے آپ کا ہاتھ مبارک تھام لیا اور عرض کی: ہاں یا رسول اللہ ہمیں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا بنا کر بھیجا ہے' ہم آپ کی حفاظت ویسے ہی کریں گے جیسے اپنے سامان کی کرتے ہیں' یا رسول اللہ! آپ ہماری بیعت لیں' ہم جنگجو لوگ ہیں' ہمارا ایک حلقہ ہے جو عرصۂ دراز سے چلا آتا ہے۔براء ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ درمیان میں ابو الہیثم بن تیہان بولے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے اور ان یہودیوں کے درمیان تعلقات تھے جنہیں ہم کاٹ رہے ہیں' یہ فرمایئے' اگر ہم آپ کی مان لیتے ہیں اور پھر اللہ آپ کو غلبہ عطا فرماتا ہے تو آپ اپنی قوم میں جا کر ہمیں چھوڑ تو نہ دیں گے؟ اس پر آپ نے تبسم فرماتے ہوئے فرمایا:

''تمہارا خون میرا خون ہے' میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہو گا' میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے'

جس سے تم جنگ کا ارادہ کرو گے' میں اس سے لڑوں گا اور جسے تم کچھ نہ کہو گے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا۔''

بارہ نقیب اور قبیلے

پھر فرمایا تم اپنے ہاں سے بارہ نقیب نکالو جو اپنی اپنی قوم کے معاملات سنبھال سکیں چنانچہ انہوں نے بارہ نقیب (ذمے دار) نکالے' نو تو خزرج سے تھے اور تین اوس سے' خزرج میں سے یہ تھے: اسعد بن زرارہ' یہ بنونجار کے نقیب تھے' سعد بن ربیع اور عبد اللہ بن رواحہ' یہ بنو حارث بن خزرج کے نقیب تھے' رافع بن مالک بن عجلان' یہ بنوزریق کے نقیب تھے' براء بن معرور اور عبد اللہ بن عمرو بن حرام' یہ بنوسلمہ کے نقیب تھے' عبادہ بن صامت' یہ دوسرے قبیلوں کے نقیب تھے لیکن طبرانی میں ہے کہ یہ خزرج میں سے بنوعدی کے نقیب تھے تو گویا تمام کے نقیب تھے' سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرؓ یہ بنوساعدہ کے نقیب تھے۔ اوس میں سے اسید بن حضیر' یہ بنوعبد الاشہل کے نقیب تھے' سعد بن خیثمہ اور رفاعہ بن عبد المنذر' یہ بنوعمرو بن عوف کے نقیب تھے۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اہلِ علم ان میں ابو الہیثم بن تیہان کو تو شمار کرتے ہیں مگر رفاعہ کو شمار نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ یوں ابو الہیثم بنوعبد الاشہل کے دوسرے نقیب بنتے ہیں کیونکہ یہ انہی میں سے تھے علماء نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے۔

حضورﷺ نے کئی قبائل پر نقیب مقرر کر دیے اور یہ روایت ملتی ہے کہ تمام نقیبوں پر آپ نے اسعد بن زرارہ کو مقرر فرمایا' مسجد نبوی زیرِ تعمیر تھی کہ آپ فوت ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس پر بنونجار اکٹھے ہو کر رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ان کے بدلے میں کسی کو ان پر نقیب مقرر فرما دیں' آپ نے فرمایا: تم لوگ میرے ماموں لگتے ہو اور میں تم میں سے ہوں' میں تمہارا نقیب ہوں' آپ نے یہ مناسب نہ سمجھا تھا کہ ان میں سے کسی کو نقیب بنا دیں چنانچہ یہ بنونجار کی ایک ہی فضیلت تھی جسے وہ اپنے لئے شمار کرتے تھے۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں مجھے عبد اللہ بن ابو بکر بن حرام رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہﷺ نے مقرر کردہ نقیبوں سے فرمایا: ''تم لوگ اپنی اپنی قوم کے نقیب اور ذمہ دار ہو بالکل ایسے ہی جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری (مددگار) تھے۔'' انہوں نے عرض کی' ہاں (یارسول اللہ)۔

عاصم بن عمر بن قتادہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ جب بیعت کے لئے اکٹھے ہوئے تو عباس بن عبادہ بن نضلہ (بنوسالم بن عوف کا بھائی بند) نے کہا: اے خزرج والو! جانتے ہو کہ اس شخص کی بیعت تم کس بات پر کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ انہوں نے کہا تمہاری بیعت اس بات پر ہے کہ ہر سرخ و سفید (عرب وعجم) سے تمہیں (بوقت حکم) جنگ کرنا ہو گی' اگر تم یہ دیکھتے ہو کہ اپنے مال لوٹ لئے جانے اور اپنے اشراف کے قتل ہونے پر ان کو چھوڑ دو گے تو آج

ہی سوچ لو' بخدا اگر تم نے ایسا کیا تو یہ دنیا و آخرت کی ذلت ہوگی اور اگر تم اس حکم کو پورا کر دکھاؤ گے جس کے لئے تمہیں دعوت دی گئی ہے جیسے میں ذکر کر چکا ہوں تو یہ تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی کا باعث ہوگا۔انہوں نے کہا: یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم وہی کر دکھائیں گے جو آپ کہیں گے' اگر ہم آپ کے حکم کے مطابق کر دکھائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت ملے گی۔اس پر انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ (ﷺ)! ہاتھ بڑھایئے' آپ نے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے بیعت کر لی۔

حضرت عاصم کہتے ہیں' حضرت عباس کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کے گلے میں ذمہ داری مضبوط پڑ ڈال دی جائے لیکن دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اس رات تک کے لئے ڈھیل کرنا تھا' وہ یہ امید لئے تھے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول بھی آ جائے تو کام پکا ہو جائے۔

اوس وخزرج میں سب سے پہلے بیعت کس نے کی؟

ابن اسحاق کہتے ہیں' بنو نجار کا خیال تھا کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی لیکن بنو عبد الاشہل کہتے تھے کہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے ابو الہیثم بن تیہان تھے' اس سے قبل والی حدیث کعب میں ہے کہ یہ براء بن معرور تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بیعت کی تھی۔

مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ براء بن معرور پہلے وہ شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے بیعت عقبہ کی تھی۔

حاکم نے اکلیل میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے بتایا کہ عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا تھا: یا رسول اللہ! آپ اپنے پروردگار اور اپنے لئے جو چاہیں شرط لگائیں' آپ نے فرمایا: میں اللہ کے لئے یہ شرط لگا رہا ہوں کہ تم کو اس کی عبادت کرنا ہوگی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنانا ہوگا اور اپنی ذات کے بارے میں میری یہ شرط ہے کہ تمہیں میرا دفاع اسی طرح کرنا ہوگا جیسے اپنا کرتے ہو۔اس پر انہوں نے عرض کی' ایسا کرنے پر ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت ملے گی۔انہوں نے عرض کی کہ یہ بیعت تو فائدہ مند ہے' نہ ہی ہم آپ کو اکھاڑیں گے' نہ ہی خود اکھڑیں گے چنانچہ یہ آیت اُتری:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۝ (سورۂ توبہ:۱۱۱)

"بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں' اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔"

اور گزشتہ حدیثِ کعب میں' شیطان کے چلانے کے بعد مذکور ہے کہ حضرت عباس بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دینِ حق دے کر بھیجا' آپ چاہیں تو کل ہی ہم اہلِ منٰی کے

خلاف تلواریں اُٹھانے کو تیار ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس بات کا حکم نہیں ملا لہٰذا تم اپنی اپنی قیام گاہوں کو چلے جاؤ چنانچہ ہم اپنے ٹھکانوں پر آ گئے اور رات کو سو رہے' صبح ہوئی تو قریش کے عظیم لوگ ہمارے ٹھکانوں پر آ گئے اور کہنے لگے: اے خزرج والو! ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم ہمارے اس ساتھی کو ہمارے درمیان سے نکال رہے ہو اور ہمارے خلاف جنگ کے لئے ان سے بیعت کر رہے ہو حالانکہ اللہ کی قسم عرب کا کوئی قبیلہ ہمارے لئے تم سے برا نہیں ہو گا اگر تم ہمارے درمیان جنگ بھڑکا دو' یہ سن کر ہم میں سے ہماری قوم کے مشرکوں نے قسم کھائی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی ہمارے علم میں ہے۔ انہوں نے یہ بات سچی کی تھی کیونکہ انہیں اس کا علم نہیں تھا۔

حضرت کعب کے علاوہ اور حدیث میں ہے کہ یہ لوگ عبداللہ بن اُبی کے پاس آئے تو اس نے ان سے کہا کہ یہ ایک بڑا کام ہے' میری قوم اسے پورا کرتے دکھائی نہیں دیتی اور جو میں جانتا ہوں' ہو گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس سال جن مشرک انصار نے حج میں شمولیت کی' یہ پانچ سو تھے اور اہل عقبہ ستر افراد تھے۔

بیعت عقبہ کرنے والوں کی تعداد

ابن اسحاق کی ایک روایت یہ ہے کہ اوس سے گیارہ افراد نے بیعت کی تھی اور خزرج کے حلیف قبیلوں میں سے چار افراد نے بیعت کی جبکہ بنو حارث بن خزرج میں سے باسٹھ افراد تھے تو گویا ابن اسحاق نے خزرج میں ان کے چار حلیف بھی داخل کر دئیے' ورنہ یہ تعداد تہتر سے بڑھ جاتی۔

علامہ رزین کہتے ہیں کہ اہل عقبہ ستر افراد تھے اور دو عورتیں بھی تھیں کیونکہ انہوں نے یہ حدیث عبادہ بن ثابت سے یونہی روایت کی ہے جیسے کعب کی گذشتہ حدیث چنانچہ بتایا کہ: عبادہ بن صامت نے کہا: ''اگلا سال آیا تو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ستر افراد حاضر ہوئے نیز ہماری قوم کی دو عورتیں بھی شامل تھیں' رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مسجد شعب عقبہ میں آنے کا ارشاد فرمایا' یہ جگہ تم منیٰ کی طرف جا رہے ہو تو تمہاری دائیں طرف آئے گی۔ ہم آپ کی انتظار میں تھے کہ آپ تشریف لائے' ساتھ عباس بھی تھے' عباد نے کہا: اے گروہ خزرج! (یہ لفظ وہاں اوس و خزرج پر اکٹھا بولا جاتا تھا) یہ محمد' جیسا کہ تم جانتے ہو' ہم ہی سے تو ہیں اور جیسے کہ تمہیں پتہ چل گیا ہے' ہم نے ان کی حفاظت کرنی ہے' تو اگر تم کو یہ یقین ہے کہ ان کی حفاظت کر سکو گے تو ٹھیک ہے' کرو' ورنہ انہیں جانے دو کیونکہ اپنی قوم میں انہیں عزت و حفاظت حاصل ہے۔

یہ سن کر براء بن عازب کھڑے ہوئے اور کہا: ہم نے آپ کی بات سن لی ہے' ہم نے اس وقت تک ان کی طرف مکمل رجوع نہیں کیا جب تک ہمیں پتہ نہیں چل گیا کہ یہ اللہ کے نبی ہیں لہٰذا یا رسول اللہ! آپ ہم سے بیعت لے لیں اور پھر اپنے اور اپنے پروردگار کے لئے جو چاہیں' ہم سے ضمانت لے لیں۔

اس پر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے' حمد و ثناء الٰہی کی' اللہ کی طرف آنے کو فرمایا اور اسلام لانے کا شوق پیدا فرمایا۔ پھر فرمایا: میں اس شرط پر تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت اسی طرح کرو گے جیسے اپنی خواتین کی کرتے ہو۔ حضرت براء نے آپ کا ہاتھ مبارک تھام لیا اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمیں منظور ہے' اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے' ہم آپ کی حفاظت ویسے ہی کریں گے جیسے اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں' ہم کافی تعداد میں ہیں' ہمارے قلعے بھی ہیں اور ہم جنگی لوگ ہیں۔ اس پر ابو الہیثم بن تیہان اُٹھے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان گہرے رشتے ہیں' ہم قطع تعلق کر رہے ہیں تو کیا آنے والے وقت میں ایسا تو نہیں ہو گا کہ اللہ آپ کو فتح دیدے اور پھر آپ اپنی قوم میں چلے جائیں تو ہمیں چھوڑ دیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' نہیں بلکہ تمہارا خون میرا ہی خون ہے' زندگی تمہارے ساتھ اور موت بھی تمہارے ساتھ ہو گی' جس سے تمہیں لڑنا پڑے' میں بھی ساتھ ہونگا اور جسے تم امن دو گے' میں بھی امن دیا کروں گا لہٰذا اپنے میں سے دس نقیب نکالو جو لوگوں پر نگہبان بن سکیں۔ چنانچہ انہوں نے خزرج سے نو اور اوس سے تین افراد نکالے۔

ابھی معاملہ چل ہی رہا تھا کہ شیطان چلا اُٹھا' کہنے لگا اے جباجب والو! (ان کے ٹھکانوں کے نام) کیا تم اپنے دین سے پھر جانا چاہتے ہو؟ یہ لوگ تمہارے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ عقبہ کی بدقسمتی ہے' اے اللہ کے دشمن! میں تم سے نمٹ لوں گا۔ (فرمایا) تم اپنے ٹھکانوں پر چلے جاؤ' اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ عباس بن عبادہ بن نضلہ نے عرض کی' اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے' آپ چاہیں تو کل منٰی میں ہم اپنی تلواریں لے کر حاضر ہو جائیں' آپ نے فرمایا: مجھے اس بات کا حکم نہیں ملا۔

علامہ رزین کہتے ہیں' یہ بھی بتاتے ہیں کہ قریش اور انصار کے درمیان رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چلنے کے بارے گفتگو ہوئی' پھر قریش کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا تو وہ کہنے لگے: تمہارے ساتھ سال کے مہینے کے سوا نہیں نکل سکتے' عرب یہ نہ کہیں کہ تم ہم پر غالب آ گئے ہو۔ اس پر انصار نے کہا: اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی مرضی دیکھی جائے گی' ہم تو آپ کا حکم سنیں گے چنانچہ اللہ نے اپنے رسول پر یہ آیت اُتاری:

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (سورۂ انفال: ۶۲)

"اور اگر وہ تمہیں فریب دیا چاہیں تو بے شک اللہ تمہیں کافی ہے۔"

یعنی اگر کفار قریش آپ سے مکر کرنا چاہیں تو عنقریب اللہ ان کے مکر کا جواب دیدیگا چنانچہ انصار مدینہ کو واپس چلے گئے۔

کہتے ہیں کہ قریش کو ان کے نکل جانے کا پتہ چلا تو ان کے پیچھے چلے اور ان میں سے دو کو پکڑ لیا' وہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے چنانچہ انہیں مکہ لے آئے' یہ منذر اور عباس بن عبادہ تھے' جبیر بن مطعم اور حارث بن امیہ کو پتہ چلا تو انہوں نے رہائی دلا دی اور یہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

میں کہتا ہوں' علامہ رزین کے علاوہ کسی اور نے لکھا ہے کہ وہ دونوں آدمی منذر اور عباس بن عبادہ تھے' منذر نے تو اس قوم کو عاجز کر دیا اور نکل گئے لیکن سعد کو انہوں نے پکڑ لیا اور ان کے کجاوے کی رسّی کے ذریعہ ان کے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے پھر اپنے ساتھ مکہ لے آئے' مارتے جاتے اور بالوں سے گھسیٹتے چلے جاتے تھے' ان کے بال بہت گھنے تھے' آخر جبیر بن مطعم اور حارث بن امیہ نے انہیں رہائی دلائی کیونکہ سعدؓ ان دونوں کے تاجروں کو پناہ دیتے اور ظالموں سے بچاتے تھے۔

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

پہلے ان کے اسلام کا ذکر ہوا تھا' وہاں اس کے بعد رزین کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن جموح بنو سلمہ کے سرداروں میں شامل تھے' ان کا بیٹا معاذ عقبہ میں موجود تھا' عمرو کا اپنے گھر میں ایک بت موجود تھا جسے وہ پوجا کرتا تھا' یہ لکڑی سے بنا تھا اور اسے ''مناۃ'' کہتے تھے چنانچہ ان کا بیٹا معاذ' معاذ بن جبل اور بنو سلمہ کے کچھ نوجوان رات کو عمرو کے بت کے پاس آتے اور لے جا کر بنو سلمہ کے ایک گڑھے میں اوندھا پھینک دیتے جس میں گندگی بھری ہوتی تھی' صبح ہوتی تو عمرو کہتے' آج ہمارے خدا پر یہ زیادتی کس نے کی ہے؟ اور پھر تلاش کرنے چلے جاتے اور جب اسے دیکھ لیتے تو دھوتے اور خوشبو لگاتے پھر کہتے' بخدا اگر مجھے پتہ چل جائے تو میں ایسا کرنے والے کو ذلیل کر دوں گا' ایسا کئی بار ہوا تھا چنانچہ ایک دن اسے صاف کر کے خوشبو لگائی اور پھر تلوار لا کر اس پر لٹکا دی اور کہا: مجھے تو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ تمہارے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے' اگر تم میں جرأت ہے تو اسے روکو' یہ تلوار تمہارے پاس موجود ہے!

عمرو سو گئے تو انہوں نے تلوار تو اتار کر رکھ دی' اس بت کے ساتھ رسّی سے ایک مردہ کتا باندھا اور بنو سلمہ کے ایک کنوئیں میں پھینک دیا جس میں گندگی پھینکی جاتی تھی۔ عمرو نے جب دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا' دیکھنے نکلے تو اس بری حالت میں پڑا تھا چنانچہ اس بارے میں مسلمان ہونے والے سے بات کی تو اسلام لے آئے اور پکے مسلمان ہو گئے پھر اس کے بارے میں کہا:

> ''اگر تو خدا ہوتا تو بخدا کتّے کے ساتھ کنوئیں میں اس طرح نہ پڑا ہوتا' خدا ہو کر تمہارے اس طرح گرے پڑے ہونے پر افسوس ہے۔
>
> ہر تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو بلند مرتبہ' احسان فرمانے والا' رزق دینے والا اور جزاء دینے والا ہے۔ وہی ہے جس نے مجھے قبر کی تاریکی میں پڑے رہنے سے پہلے بچا لیا ہے۔''

فصل نمبر ۹

ہجرت مدینہ اور دارِ ہجرت کے بارے میں خواب

صحیحین میں ہمیں یہ حدیث ملتی ہے' آپ نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ مکہ سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر گیا ہوں جہاں کھجور کے درخت ہیں' میرے خیال میں یہ جگہ یمامہ تھی یا ہجر' دیکھا تو شہر یثرب تھا۔''

بیہقی میں صہیب سے روایت شدہ حدیث ہے کہ ''مجھے تمہاری ہجرت کا مقام دکھایا گیا' ایک دلدل والی زمین ہے اور دو پتھریلی جگہوں کے درمیان ہے' یا تو ہجر ہے یا پھر یثرب۔'' یہاں یمامہ کا ذکر نہیں فرمایا۔

ترمذی میں حضرت جریر کی حدیث ہے: ''مجھ پر وحی کی گئی کہ ان تین مقامات میں سے جون سے مقام میں ٹھہر گے وہ آپ کا مقامِ ہجرت ہوگا' مدینہ' بحرین اور قنسرین۔'' یہ حدیث غریب ہے اور محلِ نظر ہے کیونکہ یہ صحیحین کی اس حدیث کے مخالف ہے جس میں یمامہ کا ذکر ہے' رہا ھَجَر تو اسے مانا جا سکتا ہے کیونکہ یہ بحرین کے علاقہ میں ہے اور رہا قنسرین تو یہ شام میں ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ صحیح بخاری میں دکھائے جانے والے مقامات کے بارے وحی میں' اس حدیث سے پہلے یا بعد اختیار دیا گیا ہو کہ جہاں چاہو رہو چنانچہ آپ نے مدینہ کو پسند فرما لیا ہو۔

ابن التین کہتے ہیں کہ پہلے آپ کو مقامِ ہجرت اس صورت میں دکھایا گیا جس میں مدینہ جیسی حالتیں تھیں لیکن پھر خاص صورت دکھائی گئی جس پر پتہ چل گیا کہ یہ مدینہ ہے۔

صحابہ کرام کو حکم ہجرت

حضور علیہ السلام نے اپنے صحابہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اطلاع دے رکھی تھی لیکن مکہ میں ٹھہرے رہے اور انتظار یہ رہی کہ کب یہاں سے نکلنے کا حکم ہوتا ہے چنانچہ دو عقبوں کے درمیان کچھ لوگ ملے جن میں عبد اللہ بن اُم کلثوم بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے پہلے شخص حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو سلمہ عبد الاسد مخزومی تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حبشہ سے آئے تھے تو آپ کو سخت تکلیف دی گئی تھی چنانچہ واپسی کا پختہ ارادہ کر لیا پھر انہیں مدینہ کے بارہ نقیبوں کا قصہ معلوم ہوا تو وہ مدینہ کو روانہ ہو گئے' آپ صبح سویرے وہاں پہنچے تاہم عامر بن ربیعہ ان کے بعد رات کو پہنچے تھے پھر مصعب بن عمیر انصار سے نئے مسلمان ہونے والوں کو دین سکھانے کے لئے متوجہ ہوئے جیسے بتایا جا چکا اور پھر عقبۂ اخیرہ کے بعد وہ مسلسل مکہ سے نکلتے رہے' یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں نکل رہے تھے جن میں عمر بن خطاب اور ان کے بھائی زید' طلحہ بن عبید اللہ' صہیب' حمزہ بن عبد المطلب' زید بن حارثہ' عبیدہ بن حارث' عبد الرحمٰن بن عوف' زبیر اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم شامل تھے اور آخرکار مکہ میں آپ کے ہمراہ صرف حضرت علی بن ابو طالب اور صدیق رضی اللہ عنہما رہ گئے تھے' ابن اسحاق وغیرہ نے یونہی کہا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اہم لوگوں میں

سے اور کوئی نہ رہ گیا تھا کیونکہ یہ روایت ملتی ہے کہ مکہ میں سے نکلنے کی جس مسلمان میں ہمت تھی وہ حضور ﷺ کے یہاں سے نکل جانے کے بعد نکل گئے تھے۔ نکلنے والوں کو ابوسفیان جیسے مشرکین نے واپس ہٹایا اور قید کر لیا چنانچہ اس طرح ان کے کئی آدمی آزمائش میں گھر گئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت صدیق اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کے علاوہ بھی کچھ لوگ حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔ قریش نے جب دیکھا کہ آپ کے صحابہ کی قوت بڑھتی جا رہی ہے اور وہ ایک مقام پر جمع ہو رہے ہیں تو انہیں پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس چلے جائیں گے چنانچہ وہ ''دار الندوہ'' میں جمع ہوئے تاکہ حضور ﷺ کے معاملے میں سوچ بچار کریں' ان میں ابوجہل بھی تھا۔ ''وشاح'' میں ہے کہ ابن درید کے خیال میں یہ پندرہ افراد تھے' ابن دحیہ کی ''المولد'' میں ہے کہ یہ سو افراد تھے' شیخ نجدی کی صورت میں شیطان وہاں پہنچا اور کہنے لگا: مجھے بھی اپنے پاس بیٹھنے دو' میں بھی کوئی بڑی رائے دوں گا چنانچہ انہوں نے بیٹھنے دیا چنانچہ ایک نے کہا کہ ہم اس شخص کو جانے دیتے ہیں' ایک نے کہا ہم اسے قید کریں گے اور مر جانے تک کچھ کھانے پینے کو نہ دینگے' ابوجہل بولا: میں تمہیں ایک بہترین رائے دیتا ہوں کہ پانچ قبیلوں میں سے ایک ایک کو ایک ایک تلوار دے دی جائے جس سے بیک وقت وہ اسے قتل کر دیں' اس کا قتل پانچ قبیلوں میں شمار ہو گا چنانچہ بنو ہاشم کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ اس پر بڈھا نجدی بولا کہ یہی رائے سب سے بہتر ہے' حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دے دی چنانچہ یہ آیت اُتری:

وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ○

''اور اے محبوب! یاد کرو جب کافر تمہارے ساتھ مکر کرتے تھے کہ تمہیں بند کر لیں یا شہید کر دیں یا نکال دیں اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے بہتر۔''

اس پر نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ میرے بستر پر سو جاؤ اور میری چادر اوڑھ لو' تم سے ان کی کوئی بات اوجھل نہ رہنے پائے' یہ تمام امانتیں لوگوں کو واپس لوٹا دینا' کیونکہ کفار امانتیں آپ ہی کے پاس رکھا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ کو صادق اور امین کہتے تھے پھر آپ حضرت صدیق کے ہاں تشریف لائے اور انہیں اس بارے میں بتایا کہ انہیں ہجرت کا حکم ہوا ہے' انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! میں بھی ساتھ چلوں گا' انہوں نے اسی وجہ سے اپنے آپ کو یہاں روک رکھا تھا کیونکہ صحیح میں یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اپنے صحابہ سے گذشتہ خواب کا ذکر کیا تو بہت سے لوگ مدینہ کو ہجرت کر گئے اور حبشہ گئے ہوئے لوگ وہیں سے مدینہ کو ہجرت کر گئے' حضرت ابوبکر نے بھی مدینہ جانے کی تیاری کر لی تھی جس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا' آپ ٹھہریئے کیونکہ مجھے امید ہے کہ حکم آئے گا۔ حضرت صدیق نے عرض کی یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا واقعی اُمید ہے؟ فرمایا' ہاں اُمید ہے چنانچہ

انہوں نے ساتھ جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے ہی مدینہ جا چکے تھے' حضرت ابوبکر کے سواری کی پاس دو اونٹنیاں تھیں جنہیں چار ماہ سے وہ درختوں کے جھڑے پتے کھلا رہے تھے جن میں سے ایک حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ فرمایا' قیمتاً لوں گا۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ فرمایا: میں ایسی سواری پر سوار نہیں ہونگا جو میری نہیں ہے۔ ابوبکر نے عرض کی' یا رسول اللہ یہ آپ ہی کو پیش کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا' ایسے نہیں بلکہ اتنی قیمت میں خریدوں گا جتنے میں تم نے خریدی ہے' انہوں نے عرض کی کہ اتنے اتنے مال سے خریدی ہے۔ آپ نے فرمایا' میں اتنے ہی میں خریدتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی یہ آپ کی ہوئی۔

سواری اپنی خریدنے میں حکمت یہ تھی کہ ہجرت اپنے ہی مال سے کی جائے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جو اونٹنی آپ نے لی' وہ کان کٹی تھی اور بنو حریش کے اونٹوں میں سے تھی' علامہ واقدی کہتے ہیں کہ اس کی قیمت سو درہم تھی اور جو اونٹنی لی تھی اسے قصوی کہتے تھے اور وہ بنو قشیر کے اونٹوں میں سے تھی' وہ عرصہ تک زندہ رہی اور خلافتِ صدیق میں مر گئی۔ وہ کھلی پھرا کرتی اور کھاتی پیتی۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ اس کی قیمت آٹھ سو درہم تھی' ابوبکر نے اسے بنو قشیر کے اونٹوں میں سے خریدا تھا' نبی کریم ﷺ نے یہ قصوی اسی قیمت سے خریدی۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ہجرت کا حکم اس فرمانِ الٰہی سے ملا تھا:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝

''اور یوں عرض کرو کہ اے میرے ربّ مجھے سچی طرح داخل کر اور سچی طرح باہر لے جا اور مجھے اپنی طرف سے مددگار غلبہ دے۔''

حضرت ابوبکر (راہنمائی کے لئے) عبداللہ بن اریقط کے پاس گئے' تہذیب ابن ہشام میں نام عبداللہ بن ارقد ہے' ابن اسحاق میں ابن اربقد اور غنیۃ میں رقیط ہے جو کنانہ کی شاخ بنو دیل سے تھا۔ آپ نے اس سے کرایہ طے کر لیا' وہ بڑا ماہر راہنما تھا' راستہ خوب جانتا تھا لیکن کفر پر تھا۔ علامہ نووی کہتے ہیں کہ ہمیں اس کے اسلام کا علم نہیں ہو سکا۔ آپ نے اسے کہا کہ تین دن بعد غار ثور پر آ جانا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لے آئے۔ یہاں حضرت علی حاضر ہوئے' قریش گھر کے دروازے پر آپ کو قتل کرنے کے خیال سے جمع ہو چکے تھے۔ ابوجہل نے کہا اس وقت تک قتل نہ کرنا جب تک پانچ قبیلوں کے لوگ اکٹھے نہ ہو جائیں۔ اس نے لوگوں سے کہا تھا: یہ محمد ہے جس کا خیال ہے کہ اگر تم اس کی اتباع کر لو تو عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے اور آخرت میں تمہیں جنت ملے گی جس میں سے پھل کھاؤ گے اور اگر تم نے اتباع نہ کی تو دنیا میں تمہیں قتل ہونا پڑے گا اور آخر میں جہنم جاؤ گے جہاں تمہیں جلا دیا جائے گا۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخدا میں یونہی کہتا ہوں اور یونہی ہو گا تم ان میں سے ایک ہو' پھر مٹی کی مٹھی لی اور ان کے چہروں پر پھینک دی' ان کی آنکھیں بھر گئیں' کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا' آپ نے ہر ایک کے سر پر خاک

ڈالی، مٹی ڈالتے وقت آپ نے سورۂ یٰسین کی اوّل آیت سے فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ تک پڑھا تھا اور یہ آیت پڑھی:

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ○

'' اور اے محبوب! تم نے قرآن پڑھا، ہم نے تم پر اور ان میں کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ایک چھپا ہوا پردہ کر دیا۔''

پھر حضرت ابوبکر کے گھر تشریف لے گئے چنانچہ اکٹھے ان کے جھونپڑے سے نکلے اور غار ثور پر پہنچے۔ مشرکین دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے، دور کھڑا ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: کیا دیکھ رہے ہو؟ کہنے لگے ہم محمد کو قتل کرنا چاہتے ہیں، اس نے کہا، اللہ تمہیں ذلیل و رسوا کرے، تمہیں پتہ نہیں چلا کہ وہ تو تمہارے سروں پر خاک ڈال کر جا چکے ہیں۔ ابوجہل نے کہا: کیا وہ تھا جس نے چادر اوڑھ رکھی تھی؟ ابھی ہم انتظام کرتے ہیں۔

صبح ہوئی تو حضرت علی بستر سے اُٹھے۔ ابوجہل نے کہا کہ اس خبر دینے والے نے صحیح کہا تھا چنانچہ قریش جمع ہوئے اور مختلف راستوں پر تلاش میں نکلے، پکڑ کر لانے والوں کے لئے انعام مقرر کر دیئے گئے، وہ تھک گئے لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔

موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے گذشتہ حدیث کی روایت میں بتایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر انہیں مغالطہ دینے کے لئے سوئے تھے جبکہ قریش مشورہ کر رہے تھے کہ بستر پر لیٹنے والے پر کون حملہ کر کے اسے باندھ دے گا، اسی حالت میں صبح ہو گئی، دیکھا تو حضرت علی تھے۔ انہوں نے آپ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا، مجھے علم نہیں اس پر انہیں یقین ہو گیا کہ آپ وہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

احمد نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ کے اس فرمان کی تفسیر بیان کی ہے جس میں لکھا ہے:

وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ○

'' جب کافر آپ سے مکر کر رہے تھے۔''

آپ نے قریش کے مشورہ کا ذکر کر کے لکھا کہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ ﷺ کے بستر پر شب گذاری، آپ نکلے اور غار میں پہنچ گئے، مشرکین نے گھیرا ڈالے رکھا، وہ حضرت علی کو رسول اللہ ﷺ سمجھتے رہے یعنی وہ اس انتظار میں رہے کہ وہ اٹھیں تو ان سے وہ معاملہ کریں جس پر اتفاق کر لیا تھا، جب صبح ہوئی اور حضرت علی نظر پڑے تو اللہ نے ان کا مکر ان کے منہ پر مارا، وہ کہنے لگے: تمہارا ساتھی کہاں گیا؟ انہوں نے کہا، نہیں معلوم تو انہوں نے تلاش شروع کر دی۔ جب پہاڑ پر پہنچے تو راستہ بھول گئے، اور اوپر چڑھے اور غار کے قریب سے گذرے، غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تنا تھا، دیکھ کر کہنے لگے: اگر یہاں داخل ہوتے تو دروازے پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔

آپ تین دن تک وہاں ٹھہرے رہے۔ موسیٰ بن عقبہ نے زھری سے یہی کچھ لکھا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ غار کی طرف آپ کا نکلنا اس رات کے آخری حصے میں ہوا تھا۔ یہ واقعہ عقبہ سے دو ماہ اور چند راتیں بعد ہوا تھا۔ حاکم کہتے

ہیں کہ تین ماہ یا اس کے لگ بھگ گذرنے پر ہوا۔ ابن اسحاق کے اس قول سے پتہ چلتا ہے پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ آپ نے کہا: آپ ربیع الاوّل کے پہلے دن نکلے تھے چنانچہ یہ واقعہ دو ماہ اور چند دن بعد کا بنے گا۔ اموی نے بھی یہی لکھا ہے' کہتے ہیں کہ ربیع الاوّل کا چاند دیکھ کر نکلے تھے اور مدینہ پہنچے تو ربیع الاوّل کی بارہ راتیں رہتی تھیں چنانچہ اس بناء پر آپ ہجرت کے لئے جمعرات کو نکلے تھے یعنی اسی رات کے درمیان جیسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ محمد بن موسیٰ نے یہی ذکر کیا ہے لیکن حاکم کہتے ہیں' کہ متواتر حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ پیر کے دن چلے تھے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ آپ پیر کے دن نکلے تھے۔

جس نے دو راتوں کا ذکر کیا ہے' شائد انہوں نے پہلی رات کا شمار نہیں کیا۔ رہی حاکم کی یہ حدیث: ''میں اپنے ساتھی کے ساتھ ٹھہرا رہا'' یعنی ابوبکر کے ساتھ ''غار میں دس سے کچھ زیادہ دنوں تک' ہمارے پاس پیلو کے درخت کے پھل کے علاوہ کچھ کھانے کو نہ تھا'' تو وہ اس کے بارے میں کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ: ہم کفار سے چھپ کر غار میں ٹھہرے رہے اور راستہ میں بھی رہے تو یہ دس سے زیادہ دنوں کا عرصہ تھا لیکن ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ واقعہ کوئی اور ہے کیونکہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ عامر بن فہیرہ صبح و شام غار میں دودھ لے جایا کرتے تھے۔

نبوت کے بعد مکہ میں آپ کا قیام دس سے زیادہ سال تک رہا۔ عروہ دس سال تک کہتے ہیں' ابن عباس پندرہ سال اور آپ کی دوسری روایت میں تیرہ سال ہے' آپ کے نکلنے کا حضرت علی اور حضرت ابوبکر کی آل کے علاوہ کسی کو پتہ نہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر چل پڑے' عامر بن فہیرہ خدمت کے لئے ساتھ تھے۔ وہ مکہ کی نشیبی جگہ' ساحل کے راستے پر عسفان کے نچلی طرف سے چلے اور ''مج'' کے راستہ کے سامنے لے آئے پھر ''قدید'' سے بنوکعب کی اُم معبد خزاعیہ کے خیموں سے نیچے اُترے۔ اس کے بعد کی منزلوں کا ذکر ابن زبالہ نے کیا ہے۔ اصل کتاب (اقتفاء الوفاء) میں ہم نے وضاحت کر دی ہے۔

علامہ رزین کہتے ہیں کہ قریش کئی دن تک پتہ لگاتے رہے کہ محمد ﷺ کہاں گئے؟ آخر انہوں نے ابوقبیس پہاڑ سے آواز سنی' کوئی کہہ رہا تھا: ''اگر دو سعد سلامت رہے تو محمد امن میں رہیں گے' انہیں کسی مخالف کا ڈر نہیں ہوگا۔'' اس پر قریش نے کہا: کاش ان کے بارے میں ہمیں پتہ چل جاتا! تو پھر وہی آواز آئی:

> ''اے اوس کے سعد' تو رکاوٹ والا بن جا اور اے نجی خزرجیوں کے سعد! ہدایت دینے والے کی بات مان لو اور جنت میں ان کے قریب اللہ کی طرف سے ٹھکانا بنا لو۔''

اس سے انہیں پتہ چلا کہ وہ مدینہ کی راہ پر چل نکلے ہیں۔

اُمّ معبد کا قصہ

میں کہتا ہوں کہ اس وقت یہ اشعار سنے گئے تھے' لوگوں نے ابوقبیس پہاڑ پر کسی کو کہتے سنا:

"اللہ تعالیٰ اُمّ معبد کے خیمہ میں قیلولہ کرنے والے دو ساتھیوں کو جزاء دے' جزاء دینا اسی کا کام ہے۔

وہ دونوں حق کی مدد سے چلے اور اسی کے نام پر پہنچے چنانچہ شام کو آنے والا محمد کا ساتھی بن گیا۔"

رسول اکرم ﷺ راستے میں اُمّ معبد کے ہاں سے گذرے اور اس سے دودھ مانگا اس نے عرض کی' دودھ تو نہیں ہے' ہم تو قحط میں گرفتار ہیں' آپ نے ایک بکری دیکھی تو نہایت کمزور اور لاغر تھی' فرمایا: یہ بکری میرے قریب کر دو' اس نے قریب کر دی' آپ نے اپنے ہاتھ مبارک سے اس کے تھن چھوئے' بسم اللہ پڑھی اور دعا مانگی پھر فرمایا کہ کوئی برتن لاؤ' وہ برتن لائیں' آپ نے دودھ دوہا تو برتن بھر گیا' حضرت ابوبکر کو پینے کا حکم فرمایا' انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! پہلے آپ پیجئے' آپ نے فرمایا: پلانے والا آخر میں پیتا ہے پھر ابوبکر نے پیا' پھر دوہا تو رسول اللہ ﷺ نے پیا اور پھر دوہا تو اُمِ معبد نے پیا' اس کے بعد پھر دوہا تو اسے کہا کہ ابو معبد آئیں تو یہ انہیں دینا پھر دونوں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ابو معبد آیا تو اُم معبد نے اسے سارا واقعہ سنایا اور دودھ پلا دیا' اسے پتہ چل گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ تھے' وہ سوار ہو کر پیچھے چلا' اس کی خواہش تھی کہ اسلام لے آئے اور کہتے ہیں کہ یہ گذشتہ شعر راستے میں اسی نے کہے تھے۔

علامہ شرقی لکھتے ہیں' مجھے معلوم ہوا کہ ابو معبد نے انہیں "بطن ریم" میں پا لیا تھا چنانچہ اس نے حضور ﷺ سے بیعت کی اور واپس چلا آیا۔

میں کہتا ہوں کہ رزین کے علاوہ کسی اور نے یہ اشعار ذکر نہیں کئے ہیں' یہ مکہ کی نچلی جانب ایسے قائل سے سنے گئے جس کا پتہ نہ چل سکا۔جب حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ شاعرِ رسول ﷺ نے یہ اشعار سنے تو ہاتف کے جواب میں کہا:

"وہ قوم بڑے گھاٹے میں پڑ گئی جن کے ہاں سے ان کے نبی چلے گئے اور جن کے پاس چلے گئے وہ پاکیزہ ہو گئے۔آپ ایک قوم سے گئے تو وہ گمراہ ہو گئے اور ایسی قوم کے پاس گئے جو منور ہو گئے۔

اللہ نے انہیں گمراہی کے بعد ہدایت دی اور انہیں راہِ ہدایت دکھائی کیونکہ جو راہِ حق پر چلتا ہے وہ ہدایت پا لیتا ہے۔

وہ نبی تھے جو وہ دیکھتے تھے' ان کے گردوا سے نہیں دیکھتے تھے اور وہ اللہ کی کتاب ہر مسجد میں پڑھتے تھے۔

ابوبکر کو ان کے دادا کی برکت مبارک ہو آپ کی صحبت کی بناء پر' جسے اللہ نیک بخت کرتا ہے وہ نیک بخت ہو جاتا ہے۔"

حضرت ابو بریدہ اور رسول اللہ ﷺ کا استقبال

ابوسلیمان خطابی کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ کے پاس پہنچے تو انہیں بریدہ اسلمی اپنی قوم بنو اسلم کے ستر افراد لے کر ملے۔ آپ نے پوچھا: کون ہو؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ بریدہ ہوں' آپ نے ابوبکر سے فرمایا: ہمارا کام درست ہو گیا کہ اس میں ٹھنڈک آ گئی۔ پھر پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو؟ اس نے بتایا کہ بنو اسلم سے۔ آپ نے فرمایا' ہمارے لئے یہاں سلامتی ہے۔ پھر پوچھا کہ اسلم کی کونسی شاخ سے ہو؟ اس نے عرض کی' بنو سہم سے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا حصہ نکل آیا یعنی ہم نے کامیابی حاصل کر لی۔

علامہ ابن جوزی نے "شرف المصطفیٰ" میں بیہقی سے لے کر حضرت بریدہ تک یہ روایت ملائی ہے' بریدہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بدفالی نہیں لیتے تھے البتہ نیک فالی ضرور لیتے تھے۔ قریش نے اس وقت نبی کریم کو پکڑ کر لانے والے کے لئے سو اونٹ کا انعام رکھا تھا' جب آپ مدینہ کو چل پڑے تھے چنانچہ بریدہ رضی اللہ عنہ بنو سہم میں سے اپنے گھر سے ستر سوار لے کر سوار ہوئے اور نبی کریم ﷺ سے ملے تو آپ نے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کی' بریدہ ہوں' آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے ابوبکر! ہمارے کام میں ٹھنڈک ہے اور درست ہو گیا۔ پھر پوچھا کس قبیلہ سے تعلق ہے؟ انہوں نے عرض کی' اسلم سے' اپنے ابوبکر سے فرمایا: ہم سلامتی میں آ گئے' پھر پوچھا کونسی شاخ سے ہو؟ انہوں نے عرض کی کہ بنو سہم سے۔ آپ نے فرمایا تمہارا حصہ نکل آیا۔ پھر حضرت بریدہ نے نبی کریم ﷺ نے پوچھا آپ کون ہیں؟ فرمایا' میں محمد بن عبداللہ رسول خدا ہوں۔ اس پر بریدہ نے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ' چنانچہ بریدہ مسلمان ہو گئے اور آپ کے قریب بیٹھے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔

صبح ہوئی تو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: آپ جھنڈا لئے بغیر مدینہ میں تشریف نہ لے جائیں چنانچہ اپنا عمامہ (پگڑی) کھولا اور پھر اسے نیزے پر باندھ کر آپ کے آگے چلے' عرض کی یا رسول اللہ! کس کے پاس ٹھہرنا ہے؟ فرمایا: میری یہ اونٹنی اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ یہ سن کر حضرت بریدہ نے کہا: اس ذات کی حمد و ثناء ہے جس پر بنو سہم کے لوگ فرمانبرداری سے مسلمان ہو گئے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے اپنے سوار مسلمانوں کے ساتھ ملے' یہ لوگ تاجر تھے جو شام سے واپس آ رہے تھے' انہوں نے رسول اللہ اور حضرت ابوبکر کو سفید کپڑے پہنائے۔

یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت طلحہ شام سے واپس آئے تو ان کے پاس سفید کپڑے تھے جو انہوں نے حضرت ابوبکر کو تحفہ میں دینا تھے چنانچہ جب ملے تو انہیں دیدئے۔ ان میں سے نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر نے پہنے تھے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں' احتمال یہ ہے طلحہ اور زبیر میں سے ہر ایک نے دونوں کو بطور ہدیہ پیش کئے لیکن سیرت کی کتابوں میں صرف طلحہ کا ذکر ہے' بہتر یہی ہے کہ دونوں کو جمع کیا جائے' ابن ابو شیبہ کے پاس وہ روایت ہے جو اس کی تائید کرتی ہے ورنہ صحیح بخاری کی روایت سب سے صحیح ہے۔

فصل نمبر ۱۰

حضور ﷺ کا مدینہ میں داخلہ اور مسجد قباء کی بنیاد

مدینہ طیبہ ومنورہ میں لوگوں نے سن رکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ یہاں تشریف لائینگے لہٰذا روزانہ وہ صبح سویرے پتھریلی زمین (حرہ) کی طرف چلے جاتے اور آپ کی انتظار کرتے' دھوپ آ جاتی تو واپس آتے' ایک دن وہ واپس ہوئے تو یہودیوں میں سے ایک آدمی نے کسی مقصد سے نظر دوڑائی' اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دیکھ لیا' وہ سفید رنگ کے کپڑے پہنے چلے آ رہے ہیں' یہودی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بلند آواز سے بولا: اے بنو قیلہ! (انصار) ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں "اے عرب کے لوگو!" یہ تمہارے اپنے ہیں۔(ایک روایت میں ہے کہ یہ وہی ہیں جس کی تم انتظار کیا کرتے ہو) چنانچہ مسلمانوں نے ہتھیار پہنے اور حرہ کی پچھلی طرف آپ کا استقبال کیا' آپ انہیں لے کر دائیں طرف مڑ گئے اور قباء میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں کلثوم بن ھدم کے پاس جا ٹھہرے۔کہتے ہیں کہ ان دنوں وہ مشرک تھا۔ابن زبالہ نے یہ بات یقین سے کہی ہے۔رزین کہتے ہیں کہ ایک کھجور کے سائے میں بیٹھ گئے اور پھر وہاں سے بنو عمرو بن عوف کے بھائی بند کلثوم کے گھر تشریف لے گئے پھر "اخبار مدینہ" میں محمد بن معاذ نے کہا کہ یعقوب اور عبدالرحمٰن بن یزید دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے حرہ میں نماز پڑھی پھر سوار ہوئے اور بیرِ غرس کے قریب عذق کے پاس اونٹنی بٹھائی' ابھی دھوپ نہیں آئی تھی' رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر میں فرق نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ دونوں کا لباس ایک جیسا تھا' لوگ ان کے لئے کھڑے تھے کہ اتنے میں ان کے پاس قلعے کی طرف سے دھوپ آ گئی جسے "شنیف" کہتے تھے' دھوپ دیکھ کر ابو بکر نے ذرا ڈھیل کر دی اور یوں معلوم ہوا! کہ ابو بکر حضور ﷺ کو چلاتی دھوپ میں کھڑا کئے ہوئے ہیں' اسی دوران وہ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر سے آپ پر سایہ کر دیا جس پر لوگوں کو آپ کا پتہ چل گیا' لوگوں نے حاضری شروع کر دی' آتے جاتے اور سلام لیتے جاتے۔

میں بتاتا چلوں کہ یہ خبر میں نے اس نسخہ میں نہیں دیکھی جسے ابن یحییٰ کے لڑکے نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور پھر ان کا "بیرِ غرس" کہنا غلطی ہے' شاید یہ لفظ "بیرِ عذق" ہے کیوں کہ قباء میں جہاں آپ ٹھہرے تھے وہ اس سے دور تھا البتہ عذق قریب تھا۔کچھ نے سعد بن خیثمہ کے پاس ٹھہرنے کا بتایا ہے۔

کتاب یحییٰ میں بھی محمد بن اسماعیل بن مجمع سے ہے' کہا: جب رسول اللہ ﷺ' ابو بکر اور عامر بن فہیرہ' کلثوم بن ھدم کے پاس ٹھہرے تو اس نے اپنے آقا سے کہا: اے نجیح! اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر کی طرف دیکھتے

ہوئے فرمایا: میں کامیاب ہو گیا' یا فرمایا: ہم کامیاب ہو گئے پھر فرمایا کہ ہمیں تازہ کھجوریں کھلاؤ' وہ اُم جرذان کا تھیلا لے آئے جس میں تازہ کھجوریں تھیں اور کچھ پھل تھے' کھجوریں سرخی یا زردی مائل تھیں۔ آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ اُم جرزان کی کھجوریں ہیں' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! اُم جرذان کے لئے برکت فرما۔

مدینہ میں تشریف آوری اور اس کی تاریخ میں علماء کا اختلاف

حاکم بھی کہتے ہیں کہ آپ کلثوم کے پاس ٹھہرے' ابن شہاب کا بھی یہی قول ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حضرت سعد کنوارے تھے لہٰذا رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ اس کے گھر میں بیٹھا کرتے اور یہی وجہ ہے کہ کہتے ہیں: آپ اس کے ہاں ٹھہرے پھر ابن جوزی کی یہ روایت اس کی تائید کرتی ہے: کہ ''نبی کریم ﷺ کلثوم بن ھدم کے پاس ٹھہرے تھے اور سعد کے پاس گفتگو ہوا کرتی' یہ جگہ ''منزل العزاب'' کہلاتی تھی پھر بخاری میں ہے کہ ''لوگوں نے حرہ کے پیچھے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپ انہیں دائیں طرف سے لے کر بنوعمرو بن عوف کے پاس پہنچے۔''

ایک روایت میں ہے کہ مدینہ کا بالائی (اوپر والا) حصہ اور ''قباء عالیہ'' شمار ہوتا تھا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو اور آپ کے دین کو بلندی کا مقام حاصل ہو۔

اکثر علماء کے نزدیک آپ پیر کے دن تشریف لائے تھے۔ ابن حجر اسی پر بھروسہ کرتے تھے' وہ لوگ بہت کم ہیں جو جمعہ کی تشریف آوری بتاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس شخص کی مراد یہ تھی کہ خود شہر مدینہ میں آمد جمعہ کے روز ہوئی۔ یہ قول بھی ملتا ہے کہ پیر کی رات تشریف لائے کیونکہ مسلم شریف میں آپ نے ''لیلاً'' کا لفظ ذکر فرمایا۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ ان دونوں کو جمع کیا جا سکتا ہے' اور وہ یوں کہ آپ رات کو تشریف لائے اور صبح کو مدینہ میں پہنچے۔

میں کہتا ہوں یہ بات محلِ نظر ہے' آپ کی آمد ابن شہاب کے مطابق پہلی ربیع الاوّل کو ہوئی: کچھ آٹھ کو کہتے ہیں۔ ابن اسحاق سے ہے کہ آپ مدینہ میں ماہ ربیع الاوّل کی دو راتیں گذرنے پر تشریف لائے' ابومعشر پیر کی رات بتاتے ہیں۔ زھری کہتے ہیں' رسول اللہ ﷺ پیر کے دن سخت دھوپ کے وقت ربیع الاوّل کی بارہ راتیں گذرنے پر تشریف لائے۔

پیر کے دن کی عظمت

ابن جوزی کی ''شرف المصطفیٰ ﷺ'' میں ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پیر کے دن حضور ﷺ کی ولادت ہوئی' پیر ہی کے دن اعلانِ نبوت فرمایا' اسی دن آپ نے حجرِ اسود اُٹھایا تھا' اسی دن مکہ سے ہجرت فرمائی' اسی دن آپ مدینہ میں تشریف لے گئے اور اسی پیر کے دن آپ کا وصال ہوا۔ روضۃ الاقشہری میں ابن کلبی نے بتایا کہ آپ یکم ربیع الاوّل بروز پیر غار سے نکلے اور جمعہ کے دن بارہ ربیع الاوّل کو پہنچے' شرف المصطفیٰ میں تیرہ ربیع الاوّل لکھا ہے' ان دونوں میں اختلاف کو چاند کی تاریخ میں اختلاف پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ ابوسعید کے پاس حضرت عمر کی یہ حدیث ہے

کہ: آپ بنو عمرو بن عوف کے پاس پیر کے دن ربیع الاوّل کی دو راتیں گذرنے پر تشریف لائے۔ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نصف ربیع الاوّل کو ہوا تھا۔یہ بھی کہتے ہیں کہ سات کو تشریف لائے۔ابن حزم کا یقین ہے کہ آپ مکہ سے نکلے تو صفر کی تین راتیں گذری تھیں' یہ بات ہشام بن کلبی کے اس قول کے موافق ہے کہ آپ غار سے پیر کو نکلے اور ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ تھی۔اگر یہ بات محفوظ ہے تو شاید قباء میں آپ کا آنا آٹھ ربیع الاوّل بروز پیر تھا اور اگر اسے آئندہ اس روایت سے ملا دیا جائے تو حضرت انس کے مطابق قباء میں آپ چودہ راتیں ٹھہرے جو اس سے نکال لی گئیں اور مدینہ میں داخلہ بائیس کو تھا لیکن کلبی کا یقین ہے کہ بارہ کو داخل ہوئے تھے۔ابن حزم کہتے ہیں کہ وہاں آپ منگل' بدھ اور جمعرات کو ٹھہرے اور جمعہ کو نکلے' انہوں نے نکلنے کا دن شمار نہیں کیا۔یونہی موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ آپ وہاں تین راتیں ٹھہرے تو گویا انہوں نے وہاں آنے اور وہاں سے نکلنے کا دن شمار نہیں کیا۔

بنو عمرو بن عوف میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ قباء میں بائیس دن ٹھہرے' بخاری میں ہے' حضرت انس فرماتے ہیں کہ وہاں چودہ راتیں ٹھہرے' حضرت عائشہ کے فرمان ''دس سے کچھ زیادہ راتیں'' سے بھی یہی مراد ہے۔ابن شہاب کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں تین راتیں ٹھہرے۔ابن اسحاق کہتے ہیں کہ پانچ راتیں ٹھہرے بنو عمرو اس سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

حضور ﷺ نے تاریخ لکھنے کا حکم فرمایا تو ربیع الاوّل میں ہجرت کے دن سے لکھی گئی لیکن مشہور یہ ہے' یہ کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا تھا کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا کہ ہجرت نے حق و باطل میں فیصلہ کر دیا ہے چنانچہ تاریخ لکھی گئی اور حضرت علی و عثمان رضی اللہ عنہما کے مشورہ پر ابتداء محرم سے کی گئی اور ہم اپنی اصل کتاب (اقتفاء الوفاء) میں اس کا سبب بیان کر دیا ہے۔

علامہ سہیلی نے یہ نئی بات بتائی ہے کہ صحابہ نے ہجرت کی تاریخ اللہ کے اس قول سے نکالی:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ ۝ (سورۂ توبہ: ۱۰۸)

''بے شک وہ مسجد کہ پہلے ہی دن سے اس کی بنیاد پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے۔''

ہجرت سے تاریخ کا آغاز

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آپ یہاں پہنچے تو حضرت ابوبکر لوگوں سے ملاقات کے لئے کھڑے ہوئے' رسول اللہ ﷺ بیٹھے تھے' انصار میں سے آنے والے ابوبکر سے سلام لیتے تھے' حضور ﷺ پر دھوپ آ گئی' حضرت ابوبکر آگے بڑھے اور آپ پر اپنی چادر کا سایہ کیا جس سے لوگوں کو حضور کا پتہ چل گیا۔ابن شہاب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاموش بیٹھے تھے چنانچہ انصار میں جس نے حضور کو دیکھا نہ تھا وہ ابوبکر کو سلام کہتے اور جب ان پر دھوپ آ گئی تو ابوبکر آگے بڑھے کہ آپ پر کسی شے کا سایہ کر دیں۔

حضور ﷺ کے مکہ سے نکلنے کے بعد حضرت علی وہاں کچھ دن ٹھہرے۔ ایک روایت یہ ہے کہ تین دن ٹھہرے اور لوگوں کی امانتیں واپس کیں، حضور ﷺ نے انہیں اسی لئے روکا تھا پھر وہاں سے چلے، آپ کے پاس قباء پہنچے اور کلثوم بن ھدم کے پاس ٹھہرے۔ ابن رزین بتاتے ہیں، حضرت علی نے بتایا: ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سویا تھا کہ اسی دوران ایک مرد نے کسی عورت کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ نکلی، کوئی شے اسے دی تو وہ چلا گیا پھر دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا اور جب اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو کہا یہ سہل بن حنیف تھے، ہر رات اپنی قوم کے بتوں کے پاس آتے ہیں، انہیں توڑتے ہیں اور انہیں لکڑیوں سے جلاتے ہیں، انہیں پتہ چلا ہے کہ اب میرے پاس کوئی لکڑی نہیں۔

عبد العزیز بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنو عمرو بن عوف کے پاس تشریف لائے، اوس وخزرج میں مخالفت چلی آتی تھی، خزرج، اوس کے گھروں میں جانے سے ڈرتے اور اوس، خزرج کے گھروں میں جانے سے ڈرا کرتے تھے، اسعد بن زرارہ نے نبتل بن حارث کو بعاث کے دن قتل کر دیا تھا، حضور ﷺ نے پوچھا: اسعد بن زرارہ کہاں ہے؟ جس پر سعد بن خیثمہ، مبشر بن عبد المنذر اور رفاعہ بن عبد المنذر نے کہا کہ یا رسول اللہ! یوم بعاث پر اس نے ایک آدمی قتل کر دیا تھا اور جب بدھ کی رات آئی تو اسعد، مغرب وعشاء کے درمیان چادر اوڑھے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے، آپ نے اسے دیکھا تو فرمایا: اے ابو امامہ! تم اپنے گھر سے یہاں آئے ہو حالانکہ تمہارے اور تمہاری قوم کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ ابو امامہ نے عرض کی مجھے آپ کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی لہٰذا میں چلا آیا پھر رات رسول اللہ ﷺ کے ہاں سوئے، صبح ہوئی پھر آپ کی خدمت میں آئے تو آپ نے سعد بن خیثمہ، رفاعہ اور مبشر (عبد المنذر کے لڑکے) سے فرمایا کہ اسے اپنے پاس رکھو، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ رکھ لیجئے، ہمارا پڑوس آپ کے قریب ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی اسے اپنے پاس رکھ لے، سعد بن خیثمہ نے کہا کہ وہ میرے پڑوس میں ہے پھر سعد بن خیثمہ اسعد بن زرارہ کے گھر گئے تو بن محاصرہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آئے اور عمرو بن عوف تک چلے گئے پھر اوس نے کہا یا رسول اللہ! ہم سب پڑوسی ہیں چنانچہ اس کے بعد اسعد بن زرارہ صبح وشام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔ انتہٰی۔

قباء کے مقام پر کلثوم بن ھدم کا ایک پلاٹ تھا (جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں) رسول اللہ ﷺ نے ان سے لے کر وہاں مسجد کی بنیاد رکھ دی۔

صحیح بخاری میں حضرت عروہ کی روایت ہے کہ بنو عمرو بن عوف کے پاس آپ دس سے کچھ زیادہ راتیں ٹھہرے اور وہ مسجد بنائی جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔ عبد الرزاق نے عروہ کی روایت بیان کی ہے کہ جنہوں نے وہ مسجد بنائی جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی، وہ بنو عمرو بن عوف تھے، ابن عائذ کے نزدیک ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسی ہی حدیث ملتی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں کہ: آپ بنو عمرو بن عوف میں تین راتیں ٹھہرے رہے اور ان کے مکان کو مسجد بنا لیا اور اس میں نمازیں پڑھیں پھر بنو عمرو بن عوف نے اسے بنایا چنانچہ یہ وہ مسجد تھی جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔

حکم بن عتبہ "زیادات المغازی" میں فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب قباء میں تشریف لائے تو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ان کے لئے کوئی سایہ دار جگہ بنائی جائے کہ جاگیں تو سایہ میں بیٹھ سکیں اور نماز پڑھ سکیں' انہوں نے پتھر اکٹھے کئے اور مسجد قباء بنائی چنانچہ سب سے پہلے یہ مسجد بنی یعنی عام مسلمانوں کے لئے یا مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے لئے' چنانچہ یہ پہلی مسجد ہے جس میں ظاہراً آپ نے اپنے صحابہ کو نماز پڑھائی اگرچہ اس سے قبل کئی اور مساجد بن چکی تھیں چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل دو سال سے وہاں رہ رہے تھے' ہم نے کئی مسجدیں بنائیں اور ان میں نماز پڑھا کرتے تھے' اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے قباء میں رہنے والوں اور انصار نے یہ مسجد بنا رکھی تھی جس میں نماز پڑھا کرتے تھے اور جب آپ نے ہجرت فرمائی اور قباء میں تشریف لائے تو اس میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھائی' کوئی نئی شے نہیں بنائی تھی یعنی شروع میں کچھ نہیں بتایا تھا پھر بتایا کہ آپ نے مسجد قباء بنائی اور قبلہ اس طرف رکھا جدھر آج کل ہے' آپ نے فرمایا تھا کہ جبریل بیت اللہ کی طرف منہ کر کے میرے امام بنے تھے۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ اس آیۂ مبارکہ سے مراد کونسی مسجد ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ○

تو جمہور یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے اور یہ حضور ﷺ کے اس فرمان کے مخالف نہیں جس میں آپ نے مسجد نبوی کے بارے میں فرمایا تھا: "آیت میں تمہاری یہ مسجد مراد ہے" کیونکہ دونوں ہی مسجدیں تقویٰ کی بنیاد پر بنی تھیں۔ وضاحت آگے آ رہی ہے۔

طبرانی میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جب اہل قباء نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے لئے مسجد بنا دیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی اُٹھ کر اونٹنی پر سوار ہو' حضرت ابوبکر اُٹھے' سوار ہونے لگے' اسے ہلایا لیکن وہ نہ اُٹھ سکی' آپ واپس آ کر بیٹھ گئے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے' اسے ہلایا لیکن وہ نہ اُٹھی' آپ بھی واپس آ کر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے پھر اعلان فرمایا کہ کوئی اُٹھ کر اس پر سواری کرے۔ اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُٹھ کھڑے ہوئے' ابھی آپ نے رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ اونٹنی اچھلی اور چل پڑی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دو اور جہاں رک جائے' وہاں مسجد تعمیر کرو کیونکہ یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔

طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو اپنے صحابہ سے فرمایا: آؤ میرے ساتھ چلو کہ اہل قباء کو سلام کر آئیں' وہاں تشریف لائے' سلام فرمایا تو انہوں نے مرحبا کہا پھر انہیں حکم فرمایا کہ اس حرہ سے پتھر لے کر آؤ چنانچہ بہت سے پتھر جمع ہو گئے' آپ کے پاس چھوٹا سا نیزہ تھا' اس سے قبلہ کا نشان لگایا پھر ایک پتھر خود لے کر رکھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس پتھر کے ساتھ ہی ایک پتھر تم بھی رکھ دو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوبکر والے پتھر کے ساتھ ہی تم بھی ایک پتھر رکھ دو پھر حضرت عثمان سے فرمایا کہ اسی

کے ساتھ تم بھی ایک پتھر رکھ دو پھر دوسرے لوگوں کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا تم میں سے ہر ایک جہاں چاہے خط پر ایک ایک پتھر رکھتا جائے۔

مسجد قباء کب بنی؟

میں کہتا ہوں' حضرت جابر والی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنیاد حضور ﷺ کی قباء میں تشریف آوری کے وقت نہیں رکھی گئی بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حبشہ سے واپس آنے پر رکھی گئی ہو گی کیونکہ وہ اپنا دین بچانے کے لئے اپنی بیوی دخترِ رسول حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو لے کر حبشہ چلے گئے تھے' سب سے قبل ہجرت آپ ہی نے کی تھی پھر دوسری ہجرت مدینہ منورہ کی طرف کی تھی لہٰذا ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی آمد پر بنیاد رکھی ہو اور پھر بعد میں اسے بنایا ہو ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو وہاں موجود ہی نہ تھے۔

اسی لئے سہیلی نے کہا ہے کہ سب سے پہلے پتھر حضور ﷺ نے رکھا' پھر ابوبکر نے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے لیکن حضرت عثمان کا ذکر نہیں کیا' پھر کہا کہ مدینہ آنے سے پہلے آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے اس میں نماز پڑھی انتہیٰ۔

عنقریب مسجدوں کے ذکر میں آ رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' میں نے رسول اللہ ﷺ' ابوبکر اور دیگر صحابہ کو دیکھا کہ ہم اپنے اپنے پیٹ پر پتھر اُٹھا کر لاتے تھے' رسول اللہ ﷺ نے بنیاد رکھی اور جبریل بیت اللہ کی طرف منہ کر کے امام بنے تھے۔ میں نے ایسا کوئی نہیں دیکھا جو حضرت عثمان کے حبشہ سے آنے کا مقرر وقت بتا سکے اور عنقریب مسجد مدینہ کی بناء میں ایسی اخبار آ رہی ہیں جن میں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان وہاں موجود تھے' اس میں بھی پہلی اور دوسری مرتبہ بنیاد رکھنے کا احتمال ہے۔

محبّ طبری کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کی حبشہ سے آمد ہجرت سے قبل یا بعد اور واقعۂ بدر سے پہلے معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ واقعۂ بدر پر آپ اپنی بیوی رقیہ دختر رسول کی بیماری کی وجہ سے جنگ میں شامل نہیں ہو سکے تھے' واقعۂ بدر تو ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا جبکہ حبشہ سے ہجرت کر کے آنے والے اکثر صحابہ ہجرت کے ساتویں سال آئے تھے جیسے آگے آ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

طبرانی میں شموس بنت نعمان رضی اللہ عنہا کی روایت ہے' کہتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی آمد ہوئی' یہاں ٹھہرے اور مسجدِ قباء کی بنیاد رکھی تو خود میں نے آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا' میں نے دیکھا کہ آپ پتھر اٹھاتے تو اس کی وجہ سے جھک جاتے اور میں نے پتھر کے سفید نشان آپ پیٹ یا ناف پر دیکھے تھے' اسی دوران کوئی آ جاتا اور عرض کرتا' میرے ماں باپ آپ پر قربان' یہ مجھے دیدیں' میں اٹھا لیتا ہوں مگر آپ فرماتے' نہیں' کوئی اور پتھر اُٹھا لاؤ اور یوں آپ نے بنیاد رکھ دی' آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جبریل کعبہ کی طرف سیدھ کرتے تھے۔ پھر کہتی ہیں کہ کہا جاتا تھا کہ یہ

مسجد عین کعبہ کی طرف ہے۔

میں یہاں بتا دوں اور صحیح حدیث میں ہے کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے' پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور صبح کی نماز کے دوران کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آ گیا تو آپ نے سب کو بتا دیا' اس وقت ان کے چہرے شام کی طرف تھے چنانچہ گھوم کر کعبہ کی طرف ہو گئے۔ اس میں احتمال یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو بیت اللہ دکھا رہے تھے تا کہ اس کے ذریعے بیت المقدس کی جانب کا پتہ چل سکے کیونکہ دونوں جانبیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں اور پھر انہیں یہ علم بھی تھا کہ قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آنے والا ہے یا یہ کہ ہجرت کرتے ہی آپ کو خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں جدھر چاہیں منہ کر کے نماز پڑھنے کی اجازت حاصل تھی جیسے ربیع کہتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ حضرت جبریل نے امام بنتے وقت قبلہ کی طرف منہ کیا تھا' اسی دوران آپ کے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا مقصد یہودیوں کو اپنی طرف مائل کرنا تھا یا یہ ممکن ہے کہ اس وقت خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم رہا ہو پھر یہ حکم بیت المقدس کی وجہ سے منسوخ ہو گیا ہو اور پھر یہ حکم بیت اللہ کی وجہ سے منسوخ ہوا ہو جیسے ابن العربی وغیرہ نے بتایا ہے کہ قبلہ دو مرتبہ منسوخ ہوا تھا۔

رہا طبرانی میں حضرت شموس رضی اللہ عنہا کہ یہ قول کہ آپ پتھر کو اٹھاتے جھک جاتے تھے' اسے علامہ محمد نے خطابی کی روایت سے اور لفظوں میں بیان کیا ہے چنانچہ کہا: شموس نے بتایا کہ حضور ﷺ نے جب مسجد قباء تعمیر فرمائی تو پتھر پیٹ تک لاتے وقت جھکتے اور رکھ دیتے کوئی اور آگے بڑھ کر اسے اُٹھانے کی کوشش کرتا مگر نہ اُٹھا سکتا تو آپ فرماتے کہ اسے یہیں رہنے دو' کوئی اور اُٹھا لاؤ!

ابن شبہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب مسجد قباء کی تعمیر ہو رہی تھی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا تھا:

افلح من یّعالج المساجد

''مسجدیں بنانے والے کامیاب شمار ہوتے ہیں۔''

اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ المساجدا پڑھو۔

حضرت عبداللہ نے پھر پڑھا:

ویقرأ القراٰن قائما و قاعد

اس پر آپ نے فرمایا وقاعدا پڑھو۔

انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا:

ولا یبیت اللّیل عنہ راقد

آپ نے فرمایا راقدا پڑھو۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۱

شہرِ مدینہ میں داخلہ' ابو ایوب انصاری کے گھر میں رہائش' دیگر معلومات اور مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کا قیام

اہلِ سیرت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نجار کو بلا بھیجا' وہ تلواریں جسم پر لگائے حاضر ہو گئے' یہ لوگ آپ کے ننھیال تھے کیونکہ حضرت ہاشم بن عبد مناف نے ان کی ایک خاتون سے شادی کی تھی' یہ سلمٰی بنت عمرو تھیں' ان سے ایک لڑکا ہوا' جب ہاشم فوت ہوئے اور وہ لڑکا جوان ہو گیا تو قریش کے کچھ لوگ اسے لے گئے اور اسے سب کو دکھایا' وہ خوب جوان ہوئے اور تیر انداز بن گئے' وہ کہا کرتے کہ میں قرشی ہوں' وہ انہیں لے کر آئے اور ان کے چچا عبد المطلب بن عبد مناف کو اطلاع دی' وہ انہیں لینے آئے اور اپنے پیچھے بٹھا کر مکہ میں داخل ہوئے' سفری کپڑے پہن رکھے تھے' قریش نے کہا کہ یہ عبد المطلب ہیں چنانچہ یہی نام مشہور ہو گیا اور یہی وجہ تھی کہ بنو نجار آپ کے ننھیال بنتے ہیں' انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی تھی کہ امن و امان اور فرمانبرداری سے سوار ہو جایئے۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ہے' بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک قبیلہ کے ہاں تشریف لائے جنہیں بنو عمرو بن عوف کہتے تھے اور ان کے ہاں چودہ راتیں ٹھہرے پھر بنو نجار کو پیغام بھیجا تو وہ تلواریں تان کر آئے۔ امام بخاری نے دوسرے طریقے سے روایت لکھی اور کہا: نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور حرہ کی جانب ٹھہرے پھر انصار کو بلا بھیجا تو وہ حضور ﷺ اور ابوبکر کے پاس حاضر ہوئے' انہیں سلام کہا اور عرض کی امن و امان سے سوار ہو جایئے چنانچہ آپ سوار ہوئے اور ابو ایوب کے گھر کی طرف تشریف لے گئے۔

علامہ بخاری کی تاریخ صغیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے فرماتے تھے: میں اس وقت لڑکوں کے ہمراہ دوڑتا جاتا تھا جب وہ کہتے تھے کہ "محمد آ گئے" ہم بن دیکھے بھاگے جاتے تھے' اسی دوران آپ اور آپ کے ساتھی (ابوبکر) آ گئے' ہم مدینہ کی ایک جانب چھپ گئے' انہوں نے ایک دیہاتی آدمی کو بھیجا کہ ان کی آمد کی اطلاع دیدے چنانچہ پانچ سو انصار نے آپ کا استقبال کیا' وہ کہے جا رہے تھے کہ امن' امان اور اللہ کی اطاعت میں چلتے جاؤ الحدیث۔ اس میں اس واقعہ کو لپیٹ دیا گیا ہے' شائد ان کا ارادہ یہ ہے کہ یہ واقعہ ابتداء میں اس وقت پیش آیا جب آپ قباء میں ٹھہرے تھے' رزین کی روایت بھی یہی بتاتی ہے کیونکہ انہوں نے حضرت انس سے روایت کی' آپ نے فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں نو سال کا تھا' میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ کہتے سنتا تھا کہ "رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔" ہم باہر نکلے تو کچھ دکھائی نہ دیا' پھر اسی دوران رسول اللہ اور حضرت ابوبکر آ گئے چنانچہ ہم مدینہ کی ایک طرف ویران جگہ میں جا چھپے' انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ انصار کو ان دونوں کے بارے میں بتا دے چنانچہ کوئی

پانچ سو کے قریب انصار نے ان کا استقبال کیا اور حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ آج تک میں نے ایسا ہوتے نہیں دیکھا بخدا ہر شے روشن دکھائی دے رہی تھی' یہ دونوں حضرات کلثوم بن ہدم کے ہاں ٹھہرے۔ پھر بخاری نے مسجد قباء کی بنیاد کا ذکر کیا اور بتایا کہ آپ مدینہ کو روانہ ہوئے' آپ انصار کے جس گھر کے قریب سے گذرتے وہ آنکھیں بچھاتے جاتے۔ یہ روایت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہ معاملہ آپ کے مدینہ میں ابتداءً آنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ جمعہ کے دن قباء سے نکلے تھے۔

یحییٰ روایت کرتے ہیں کہ آپ جب قباء سے دکھائی دئے تو بنو عمرو بن عوف جمع ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ناراضگی سے نکلے ہیں یا ہمارے گھروں سے بہتر کی تلاش ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے اس بستی کا حکم ملا ہے جو اور بستیوں کو کھانے والی ہے لہٰذا اس اونٹنی کو جانے دو کیونکہ یہ حکم الٰہی پر چل رہی ہے چنانچہ آپ قباء سے نکلے' راستے میں انصار کے قبیلے ملے جو آپ سے امداد کا وعدہ کر رہے تھے' آپ فرما رہے تھے کہ اونٹنی کو جانے دو کیونکہ یہ حکم خداوندی کی پابند ہے' آپ بنو سالم کے پاس پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا' آپ نے وادی ذی صلب میں جمعہ کی نماز پڑھی۔

قلتیبی کہتے ہیں کہ یہ وہ جمعہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں پڑھا تھا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک آپ قباء میں ٹھہرے رہے' جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرمایا: جب جمعہ کا دن آیا اور خوب چڑھ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری منگوائی' مسلمان جمع ہوئے اور ہتھیار پہن لئے' حضور ﷺ اپنی اونٹنی قصوی پر سوار ہوئے' لوگ دائیں بائیں اور پیچھے تھے' کچھ پیدل اور کچھ سوار تھے' انصار سامنے آئے' ان میں سے کوئی گھر ایسا نہ تھا جو یہ نہ کہہ رہا ہو: یا رسول اللہ! تشریف لائیے ہم تن من دھن قربان کرنے کو ہیں' آپ شاباش دیتے جاتے اور دعائیں فرماتے نیز فرماتے کہ یہ اونٹنی حکم خداوندی پر چل رہی ہے' اس کا راستہ چھوڑ دو چنانچہ آپ بنو سالم کے قریب سے گذرے تو عتبان بن مالک' نوفل بن عبداللہ بن مالک بن عجلان سامنے آئے' وہ آپ کی سواری کی لگام تھام کر کہہ رہے تھے' ہمارے پاس قیام فرمائیے کیونکہ ہم کافی تعداد میں ہیں' ساز و سامان پاس ہے اور ہمارا ایک حلقہ موجود ہے' ہمارے پاس قوت ہے' باغات ہیں اور ہم ہر سوجھ بوجھ والے ہیں یا رسول اللہ اس سے قبل کوئی عرب یہاں آ کر مارے ڈر کے مارے پناہ لیتا تو ہم اسے کہہ دیا کرتے تھے' چلو جہاں چاہو پھرو۔ یہ سن کر حضور ﷺ تبسم فرماتے اور آپ فرماتے' راستہ چھوڑ دو کیونکہ یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔

پھر حضرت عبادہ بن صامت اور عباس بن صامت بن ثعلبہ بن عجلان سامنے آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے پاس ٹھہریئے' نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ اونٹنی اللہ کے حکم پر چلی جا رہی ہے' جب آپ مسجد بنو سالم کے پاس پہنچے تو سب کو جمعہ پڑھانے کے لئے خطبہ دیا پھر دائیں طرف کا راستہ لیا اور بنو الحبلی کے پاس پہنچے' ارادہ عبداللہ بن اُبی کے پاس اتریں' اس نے دیکھا (وہ قلعے میں بیٹھا تھا) تو کہنے لگا: جاؤ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے آپ کو بلایا ہے اور

ان کے پاس ٹھہرو۔اس پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اس کی بات کا برا نہ منایئے' آپ تو ہمارے پاس تشریف لائے ہیں' قریش چاہتے ہیں کہ اسے اپنا حکمران بنا لیں لیکن یہ تو میرا گھر ہے' پھر آپ بنو ساعدہ کے ہاں سے گذرے تو سعد بن عبادہ' منذر بن عمرو اور ابو دجانہ نے عرض کی' یا رسول اللہ تشریف لایئے' آپ کو عزت' دولت' قوت اور مضبوطی ملے گی' ادھر حضرت سعد عرض کر رہے تھے کہ یا رسول اللہ! ہمارے اتنے وسائل تو نہیں البتہ دولت قوت موجود ہے' آپ نے فرمایا اللہ تم میں برکت کرے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راستہ دیدو کیونکہ میری اونٹنی اللہ کے حکم کی پابند ہے پھر چلتے گئے' آگے سعد بن ربیع ' عبد اللہ بن رواحہ اور بشیر بن سعد ملے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہم سے آگے تشریف نہ لے جایئے کیونکہ ہم کافی تعداد میں ہیں' دولت مند ہیں اور ایک حلقہ رکھتے ہیں۔آپ نے فرمایا: اللہ تمہیں برکت دے' اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو' کیونکہ یہ اللہ کے حکم پر چل رہی ہے' پھر بنو بیاضہ میں سے زیادہ بن لبید اور فروہ بن عمرو سامنے آئے' عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے پاس تشریف لایئے' ہمدردی و غمخواری ہو گی' عزت ہو گی' دولت موجود ہے' تعداد اور قوت حاصل ہو گی' یا رسول اللہ! ہم سوجھ بوجھ والے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ یہ امرِ خداوندی پر چل رہی ہے۔پھر بنو عدی بن نجار کے پاس پہنچے' وہ آپ کے ماموؤں میں سے تھے' ان میں سے ابو سلیط اور صرمہ بن ابی انیس کھڑے تھے' دونوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم آپ کے ماموں لگتے ہیں' رشتہ داری بھی ہے' تعداد بھی ہے اور ہمارے پاس قوت بھی ہے لہٰذا ہمارے پاس تشریف لایئے' ہم سے گذر کر آگے نہ جایئے' ہماری آپ سے رشتہ داری ہے اور ہم سے زیادہ کوئی بھی آپ کا قریبی نہیں ہے۔یہ سن کر فرمایا: راستہ دے دو کیونکہ اونٹنی اللہ کے حکم سے چل رہی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انصار میں سب سے پہلے بنو بیاضہ سامنے آئے تھے پھر بنو سالم پھر ابن ابی کی طرف مائل ہوئے پھر بنو عدی بن نجار کے پاس تشریف لے گئے اور آخرکار مالک بن نجار کے پاس پہنچے۔

قلت بنو عدی بن نجار کا یہ کہنا ''ہم آپ کے ماموں ہیں'' اس لئے تھا کہ وہ ماں کی طرف سے آپ کے قریبی تھے کیونکہ حضرت سلمٰی بنت عمرو' بنو عدی بن نجار سے تھیں جو آپ کے دادا عبد المطلب کی ماں تھیں پھر بخاری شریف میں حضرت براء کا یہ قول ہے: ''نبی کریم ﷺ مدینہ میں آئے تو پہلے اپنے ناناؤں کے پاس ٹھہرے یا کہا کہ ماموؤں کے پاس ٹھہرے' جو انصار تھے۔'' اس میں شبہ ہے۔کیونکہ حضرت نبی کریم ﷺ اپنے بھائی بندوں بنو مالک بن نجار کے ہاں ٹھہرے تھے یا انہوں نے ارادہ کیا کہ بنو نجار کے علاقے میں ٹھہریں کیونکہ سب کے گھر قریب قریب تھے اور بنو عدی انہی میں سے تھے۔

حافظ ابن حجر مقدمہ میں اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگ خزرج میں سے بنو عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے' عبد المطلب کی والدہ ان میں سے تھیں جو حضور ﷺ کے دادا تھے' اس کا نام سلمٰی تھا چنانچہ یہ لوگ حقیقۃً دادے اور مجازاً ماموں تھے' شک راوی کی طرف ہے۔انتہٰی لیکن یہ صرف وہم ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں

پہلی مرتبہ قباء میں آنے اور مستقل طور پر دوسری مرتبہ آنے میں شبہ پڑا ہے جبکہ بنو عمرو ایسے نہیں جیسے ان کے بارے میں بیان ہوا ہے' شرح میں انہیں کچھ معلوم ہو گیا چنانچہ وہاں یونہی لکھا ہے جیسے ہم نے بیان کیا ہے' واللہ اعلم۔

علامہ رزین نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ قباء سے چلے' ان کے ساتھ ہتھیار لگائے انصار کے کافی لوگ تھے' تمام مہاجرین بھی ہمراہ تھے۔علامہ نے نمازِ جمعہ کا بھی ذکر کیا ہے' کہا: پھر آپ سوار ہو کر بنو الحبلیٰ کے پاس آئے' ارادہ فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ جاتے ہیں' وہ اس وقت اپنے قلعوں میں بیٹھا تھا' کہنے لگا: ان کی طرف چلے جاؤ جنہوں نے آپ کو بلایا ہے۔اس پر سعد بن عبادہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اسے منہ لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے ماننے والوں نے اکٹھ کر رکھا ہے کہ اس کو سربراہ بنا کر تاج پہنائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ حق صرف آپ کو بخشا ہے تو وہ نہایت تنگدل ہو گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو کچھ صحیح بخاری میں ہے اس کے متعلق حضرت سعد نے ایک قصہ بیان کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں قیام کے بعد ان کی عیادت کی تھی اور سیرت کی کتابوں میں ابن اسحاق سے ہے کہ اس دن جمعہ تھا جب آپ رانونا میں تشریف لے گئے' یہ پہلا جمعہ تھا جو آپ نے مدینہ میں پڑھایا تھا' کل لوگ چالیس تھے' کچھ نے سو لکھے ہیں' اسی دوران عتبان بن مالک بنو سالم میں سے کچھ لوگوں کے ہمراہ حاضر ہوا تھا' انہوں نے عرض کی تھی کہ یا رسول اللہ ہمارے پاس ٹھہر جایئے کیونکہ یہاں تعداد بھی ہے' سامان بھی ہے اور آپ کو حفاظت ملے گی لیکن حضور ﷺ نے فرمایا تھا' اس اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ یہ کسی کے حکم پر چل رہی ہے چنانچہ انہوں نے راستہ چھوڑ دیا' وہ چلتی رہی اور جب بنو بیاضہ کے گھروں کے پاس پہنچی تو آپ سے زیاد بن لبید اور فروہ بن عمرو نے ملاقات کی' بنو بیاضہ کے کچھ لوگ ہمراہ تھے تو آپ نے انہیں وہ جواب دیا جو پہلے گذر چکا ہے چنانچہ انہوں نے راستہ چھوڑ دیا اور جب بنو حارث بن خزرج کے گھروں کے قریب پہنچے تو سعد بن ربیع' خارجہ بن زید اور عبد اللہ بن رواحہ سامنے آئے' بلحارث کے کچھ لوگ بھی ہمراہ تھے' آپ نے انہیں پہلے جیسا جواب دیا' انہوں نے راستہ دے دیا' اونٹنی آگے چلی اور جب بنو عدی بن نجار کے گھروں کے پاس پہنچی (وہ آپ کے قریبی ماموں تھے) تو سلیط بن قیس کچھ آدمیوں کے ہمراہ سامنے آیا' آپ نے انہیں پہلے والا جواب دیا اور پھر جب وہ بنو مالک کے گھروں تک پہنچی تو آپ کی مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئی پھر اچھلی اور تھوڑی دور چلی' رسول اللہ ﷺ نے لگام ڈھیلی کر رکھی تھی' اسے کسی طرف موڑتے نہ تھے' اونٹنی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پہلے والی جگہ پر آ بیٹھی پھر وہاں سے حرکت کی' آواز نکالی اور گردن زمین پر رکھ دی چنانچہ آپ اس سے اُتر آئے۔ایک روایت میں ہے کہ جب وہ اپنی پہلی جگہ پر اچھلی تو حضرت ابو ایوب کے گھر جا بیٹھی پھر وہاں سے اُٹھی اور پہلی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ایک اور روایت میں ہے کہ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انشاء اللہ یہیں ٹھہروں گا۔

قصۂ بنو سالم بیان کر کے ابن سید الناس نے لکھا ہے کہ آپ کی سواری چلی اور بنو بیاضہ کے گھروں کے برابر آ گئی۔پھر باقی قصہ بیان کر دیا پھر کہا: اونٹنی چلی اور جب بنو ساعدہ کے گھروں کے پاس پہنچی تو سعد بن عبادہ سامنے

آئے۔ پھر باقی قصہ بیان کیا اور کہا پھر چل پڑی اور جب بنو حارث بن خزرج کے گھروں کے سامنے پہنچی تو سعد بن ربیع سامنے آئے۔اس کے بعد باقی قصہ لکھا۔

یحییٰ نے ایک اور روایت میں لکھا ہے کہ آپ بنو سالم سے آگے چلے تو دائیں ہاتھ کو ہو لئے اور ابن ابی کے گھر پہنچے پھر وہاں سے چل پڑے' راستہ کھلا تھا' آپ سعد بن عبادہ کے ہاں پہنچے' یہاں داہنی طرف سے بنو بیاضہ سامنے آئے پھر وہاں سے چلے اور بنو عدی بن نجار کے پاس آئے اور پھر بنو مازن بن نجار کے پاس تشریف لائے' ان کے بڑے لوگوں نے حاضری دی اور یوں مسجد کے دروازے تک جا پہنچے' یہاں بنو مالک بن نجار جمع تھے' وہ انتظار میں کھڑے تھے' آپ دکھائی دیئے تو اسعد بن زرارہ' ابو ایوب' عمارہ بن حزم اور حارثہ بن نعمان حاضر ہوئے' عرض کی یا رسول اللہ خزرج جانتے ہیں کہ ان کے ہاں قیام زیادہ نہیں ہوا۔ بتاتے ہیں کہ اونٹنی ان کے درمیان بیٹھ گئی جس سے وہ خوش ہو گئے پھر وہاں سے اُٹھی' ڈری ڈری لگتی تھی اور آواز نکال رہی تھی' انہیں یہ بات بری لگی' وہ اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے' اونٹنی بئر جمل پر حبشی کی گلی تک پہنچی' وہاں بیٹھ گئی' نبی کریم ﷺ اوپر سوار تھے' لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ پھر کھڑی ہوئی اور پہلی جگہ آ گئی' اب تیز چلی تھی اور چلتے چلتے مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئی' گردن زمین سے لگا دی اور پاؤں پھیلا دیئے' حضرت ابو ایوب حاضر ہوئے تو لوگ اپنے پاس ٹھہرنے کی درخواستیں کر رہے تھے' ابو ایوب نے سواری تھامی اور اندر لے گئے' رسول اللہ ﷺ نے سواری کو بیٹھے دیکھا تو فرمایا: آدمی اپنی سواری کے ساتھ ہوتا ہے۔

علامہ رزین نے بنو سالم کے آپ کے سامنے آنے کا ذکر کیا ہے اور آپ کے اس فرمان کو ذکر کیا ہے کہ "اونٹنی کے راستے سے ہٹ جاؤ کیونکہ حکم کی پابند ہے" پھر کہا کہ آپ بنو بیاضہ کے پاس پہنچے تو یونہی فرمایا' پھر بنو ساعدہ کے ہاں پہنچے تو یونہی فرمایا پھر بنو حارث بن خزرج کے پاس پہنچے تو یونہی فرمایا' یونہی بنو عدی بن نجار کے پاس پہنچ کر فرمایا پھر چلتی رہی اور جب بنو مالک بن نجار کے گھروں تک پہنچی تو مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئی' وہ بیٹھی تو رسول اللہ ﷺ اس سے اُترے نہیں' اتنے میں اُٹھ کھڑی ہوئی' کچھ دور گئی' پیچھے مڑ کر دیکھا اور پہلی جگہ جا بیٹھی' اب رسول اکرم ﷺ اس سے اُتر پڑے اور پھر فرمایا' کونسا گھر نزدیک ہے؟ حضرت ابو ایوب نے عرض کی کہ میرا گھر اور یہ اس کا دروازہ ہے' ہم نے آپ کی سواری سے سامان اتار لیا۔اس پر فرمایا: آدمی تو اپنی سواری ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ اونٹنی جب ابو ایوب کے دروازے پر بیٹھی تو حضور ﷺ نے اُترنے کا ارادہ کیا' اس نے حرکت کی' حضرت ابو ایوب گرداگرد تھے' دیکھا تو بنو مسلمہ کے بھائی بند جبار بن صخر نے اسے چھڑی وغیرہ لگائی۔ اس پر ابو ایوب نے کہا: اے جبار! میرے گھر سے اسے اٹھانا چاہتے ہو؟ سنو! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا بنا کر بھیجا ہے' اگر اسلام نہ ہوتا تو میں تلوار سے تمہاری گردن اُڑا دیتا چنانچہ نبی کریم ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور سامان وغیرہ رکھ دیا جس سے ان کے گھر میں بہار آ گئی۔ حضرت زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے۔

حاکم کے مطابق حضرت انس کہتے ہیں: انصار حاضر ہوئے اور عرض کی' یا رسول اللہ! ہمارے پاس تشریف لایئے'

آپ نے فرمایا: اونٹنی کو جانے دو کیونکہ یہ حکم کی پابند ہے چنانچہ وہ حضرت ابو ایوب کے دروازے پر جا بیٹھی۔

طبرانی میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو آپ کی اونٹنی جعفر بن محمد بن علی اور حسن بن زید کے گھروں کے درمیان جا بیٹھی، لوگ حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے ہاں ٹھہریئے، اونٹنی آپ کو لئے جا رہی تھی، وہ بیٹھی، پھر حرکت کی، وہاں لوگوں کے لئے ایک جھونپڑی تھی جس میں وہ چھڑکاؤ کر کے ٹھنڈک حاصل کرتے تھے، آخر آپ اونٹنی سے اُترے، سایہ دیکھا تو وہاں اُتر گئے، حضرت ابو ایوب حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا گھر سب سے زیادہ نزدیک ہے، اجازت ہو تو سواری ادھر لے جاؤں؟ آپ نے فرمایا، ٹھیک ہے چنانچہ وہ سواری کو لے گئے، اسی دوران ایک اور شخص آئے اور عرض کی، آپ میرے پاس تشریف لائیں، آپ نے فرمایا، سواری جہاں ہوگی، آدمی وہیں ہوگا پھر اس جھونپڑی میں آپ بارہ راتیں ٹھہرے اور مسجد کی بنیاد رکھی۔

قلت: جعفر بن محمد کا گھر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کے ساتھ ہی تھا جبکہ حسن بن زید کا گھر مغرب کی طرف اس کے سامنے تھا، درمیان سے کھلا راستہ گذرتا تھا۔

ابن عائذ اور سعید بن منصور بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی پہلے آپ کو لئے بیٹھ گئی تو لوگ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے پاس قیام فرمایئے، فرمایا اسے چھوڑ دو، وہ اُٹھی اور مسجد کے منبر کے پاس جا بیٹھی پھر اس نے حرکت کی، آپ اُتر آئے۔ اتنے میں حضرت ابو ایوب حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرا گھر سب سے قریب ہے، اجازت ہو تو میں سواری وہاں لے جاؤں، آپ نے اجازت دے دی تو انہوں نے اونٹنی گھر میں بٹھا دی۔

علامہ واقدی کہتے ہیں کہ حضرت اسعد بن زرارہ نے اونٹنی کی لگام تھام رکھی تھی، وہ انہی کے پاس تھی۔ اشہری سے مالک نے نقل کی ہے کہ جب اونٹنی مسجد کی جگہ پہنچی تو بیٹھ گئی، آپ سواری پر تھے، آپ پر وحی کی سی حالت تھی پھر بغیر اُٹھائے اُٹھ کھڑی ہوئی اور تھوڑا سا چلی پھر پیچھے مڑ کر دیکھا اور پہلے مقام پر آ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں وحی کی حالت ختم ہو گئی، آپ نے سامان اُتارنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب لوگوں میں یہ بحث چھڑی کہ یہ اونٹنی کہاں ٹھہرائی جائے تو آپ نے فرمایا تھا: میں عبد المطلب کے ماموؤں کے پاس ٹھہروں گا اور انہیں یہ عزت دوں گا۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چل رہے تھے اور آخر ابو ایوب کے گھر کے پہلو میں اُترے، پوچھا یہاں ہمارے گھروں میں سے کونسا گھر قریب ہے؟ حضرت ابو ایوب نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ رہا میرا گھر اور یہ رہا دروازہ۔ فرمایا تو پھر جاؤ اور میرے دوپہر کو سونے کا انتظام کرو۔

ابن زبالہ کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اختیار دے دیا گیا تھا چنانچہ آپ جہاں چاہتے تھے، اُترے، آپ نے خیال کیا کہ سب انصار کے درمیان میں اُتروں۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ بات آپ کے اس فرمان کے مخالف نہیں جس میں فرمایا تھا کہ "اونٹنی کو جانے دو کیونکہ یہ حکم کی پابند ہے۔" کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دے رکھا تھا کہ جیسے چاہیں کریں۔

آپ کی مدینہ آمد پر اہلِ مدینہ کی خوشی

اہلِ مدینہ آپ کے مدینہ میں تشریف لانے پر نہایت خوش تھے چنانچہ بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے حدیث ملتی ہے کہ: "اہلِ مدینہ کو جتنی خوشی آپ کی آمد پر ہوئی' میں نے آج تک ایسی خوشی نہیں دیکھی۔ابو داؤد نے لکھا ہے کہ حبشہ والے آپ کی آمد پر خوشی سے نیزوں کے کرتب دکھاتے تھے۔علامہ رزین لکھتے ہیں کہ بچیاں مکانوں کی چھتوں پر یہ گا رہی تھیں:

"آج وداع کی پہاڑیوں میں سے نکل کر ہم پر چودھویں رات کا چاند چڑھ آیا ہے' تو جب تک اللہ کی طرف دعوت دینے والا کوئی موجود ہے' ہم پر لازم ہے کہ اللہ کا اس پر شکر ادا کرتے رہیں۔"

ایک روایت میں یہ بھی ہے:

"اے ہماری طرف رسول اللہ بن کر آنے والے! آپ ایسا حکم لائے ہیں جسے ہمیں ماننا ہوگا۔"

ادھر ہر طرف لڑکے اور لڑکیاں خوشی سے یہ نعرے لگاتے پھرتے تھے کہ:

"رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔"

"شرف المصطفیٰ" میں لکھا ہے کہ جب اونٹنی حضرت ابو ایوب کے دروازے پر بیٹھ گئی تو بنونجار کی بچیاں گھروں سے نکل آئیں' وہ یوں دف بجاتے ہوئے یوں پڑھ رہی تھیں:

"ہم بنونجار کی لڑکیاں ہیں! اے محمد! آپ کی تشریف آوری بڑی باعثِ برکت ہے۔"

یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ انہوں نے عرض کی' ہاں یا رسول اللہ! اس پر فرمایا تو مجھے بھی تم سے محبت ہے' تین مرتبہ فرمایا۔ایک روایت میں ہے "اللہ جانتا ہے کہ مجھے تم سے پیار ہے۔" یہی بات حاکم نے بھی لکھی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے نکلے تو وہاں کی ہر شے تاریکی میں ڈوب گئی اور جب آپ مدینہ منورہ پہنچے تو یہاں کی ہر شے روشن ہوگئی۔ابن ماجہ سے یوں لکھا ہے: "جب وہ دن آیا جس میں رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو مدینہ کی ہر شے میں ایک چمک سی آ گئی اور جب آپ کا وصال ہوا تو یہاں کی ہر شے اندھیرے میں ڈوب گئی۔" پھر داؤد نے لکھا: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو حبشی خوشی سے اپنے نیزوں کے کرتب دکھانے لگے' میں نے اس دن جیسا اچھا اور روشن دن نہیں دیکھا' اس دن ہر شے چمک دمک رہی تھی الحدیث۔

اسی میں ابو خیثمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں بھی وہاں موجود تھا چنانچہ میں نے اس دن جیسا خوشیوں بھرا اور روشن دن کبھی نہیں دیکھا۔

یحییٰ کی روایت میں عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے

تو جلدی سے لوگ حاضر خدمت ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں دیکھتا رہا' میری نظر آپ کے چہرے پر پڑی تو یقین آ گیا کہ یہ جھوٹے نہیں ہیں' آپ نے سب سے پہلی بات یہ کی کہ: اے لوگو! سلام کہتے رہا کرو' کھانا کھلاتے رہو' صلہ رحمی کرتے رہو' لوگ سو رہے ہوں تو تم نماز پڑھا کرو' بڑے مزے سے جنت میں چلے جاؤ گے۔

رسول اکرم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ اور ابو رافع کو مکہ بھیجا' انہیں پانچ سو درہم اور دو اونٹ دیئے چنانچہ وہ ان خواتین و حضرات کو لے کر مدینہ پہنچے' حضرت فاطمہ و اُمّ کلثوم (آپ کی صاحبزادیاں) حضرت سودہ (بیوی) اُمِ ایمن (زید بن حارثہ کی بیوی) اسامہ بن زید کو آپ کے پاس لائے' ادھر حضرت عبد اللہ بن ابوبکر ان کے ساتھ ابوبکر کے اہل و عیال لے کر چلے جن میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں' ان کی بہن حضرت اسماء (زوجۂ زبیر) اور ان کی والدہ اُمّ رومان رضی اللہ عنہم بھی ساتھ تھیں اور جب یہ مدینہ پہنچے تو انہیں حارثہ بن نعمان کے گھر ٹھہرا دیا گیا۔ رزین کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے عبد اللہ بن اریقط کو زید بن حارثہ کے ہمراہ بھیجا تا کہ حضرت عائشہؓ ان کی والدہ اُمّ رومان اور عبد الرحمٰن کو لے آئیں کہتے ہیں کہ جب وہ روانہ ہوئے تو طلحہ بن عبید اللہ بھی آ گئے چنانچہ وہ بھی ساتھ ہو گئے اور یہ سب مل کر مدینہ پہنچے۔

ابن اسحاق نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی' انہوں نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ میرے ہاں ٹھہرے تو نچلی منزل میں قیام فرمایا جبکہ میں اور اُمّ ایوب اوپر تھے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تو اوپر رہوں اور آپ نیچے لہٰذا آپ اوپر تشریف لے آئیں' ہم نیچے آ جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا' اے ابو ایوب! میرے اور اہل کے لئے نیچے رہنا بہتر ہے' وہ بتاتے ہیں کہ پھر آپ نچلے مکان میں ٹھہرے رہے جبکہ ہماری رہائش اوپر رہی' ایک دن پانی کا برتن ٹوٹ گیا ہیں اور اُمّ ایوب اُٹھے' چادر پکڑی' اس کے علاوہ کوئی چادر بھی نہ تھی' اس خوف سے ہم نے پانی خشک کرنا شروع کیا کہ کہیں آپ پر نہ پڑے اور آپ کو تکلیف پہنچے۔

قلت: ایک عالم نے لکھا ہے کہ یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے بعد میں آپ اوپر کے مکان پر ٹھہرے تھے۔ صحیح مسلم میں ابو ایوب سے ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابو ایوب کے پاس ٹھہرے' نیچے کی منزل میں قیام فرمایا' ابو ایوب اوپر تھے' ایک رات ابو ایوب کو خیال آیا کہ ہم تو نبی کریم ﷺ کے اوپر رہتے ہیں چنانچہ وہ ایک طرف ہو گئے اور یونہی رات گذاری پھر آپ سے بات کی تو آپ نے فرمایا' نیچے آسانی ہے' انہوں نے عرض کی' میں ایسے جھونپڑے میں نہیں ٹھہروں گا جس کے نیچے آپ ٹھہرے ہوں چنانچہ آپ اُوپر تشریف لے گئے اور ابو ایوب نیچے آ گئے۔

پہلے ہم فصل نمبر ۴ میں بتا چکے ہیں کہ یہ مکان تبع اوّل نے یہاں سے گذرتے وقت بنایا تھا تا کہ نبی کریم ﷺ جب یہاں تشریف لائیں تو اس میں ٹھہریں چنانچہ کئی لوگ اس کے مالک بنتے رہے اور آخر یہ مکان حضرت ابو ایوب کی ملکیت میں آ گیا۔ حضرت ابو ایوب اس عالم کی اولاد سے تھے جنہیں تبع نے اپنا خط دیا تھا۔

ابن عساکر نے تبع کے حالات میں اس مکان کا ذکر کیا ہے، حضورﷺ اسی میں ٹھہرے تھے، یہ گھر مغیرہ بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام نے ابو ایوب کے غلام ابن فلح سے ایک ہزار دینار میں خریدا تھا اور اسے صدقہ کر دیا تھا۔ یہ مکان مسجد مقدس کی مشرقی جانب تھا جیسے مسجد کے گرد گھروں میں اس کا ذکر آ رہا ہے، پھر اسے ملک مظفر شہاب الدین غازی بن ملک عادل سیف الدین ابوبکر بن ایوب بن شادی نے خریدا اور چاروں مذاہب میں تعلیم کے لئے مدرسہ بنا دیا، اس کے اوپر اس نے دفتر بنائے تھے۔ دمشق میں بھی ان کی وقف جائیداد تھی، مدینہ طیبہ میں کھجور کا باغ تھا، یہ سب کچھ وقف کر دیا گیا۔ یہاں بہت سی کتابیں موجود تھیں جو مختلف ہاتھوں میں چلی گئیں اور یہ مدرسہ معطل ہو کر رہ گیا۔ یہاں سلطان کے دفتر تھے۔ مدرسہ کے دو صحن تھے ایک بڑا اور ایک چھوٹا، مغربی چھوٹے ایوان میں چھوٹا سا خزانہ تھا اور جو حصہ قبلہ کی طرف تھا اس میں محراب تھا، علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں حضورﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی۔

اس گھر میں حضورﷺ سات ماہ تک رہے اور مکان بنا لینے تک یہیں قیام فرمایا۔

علامہ رزین لکھتے ہیں کہ آپ حضرت ابو ایوب کے ہاں ربیع الاوّل سے اگلے سال صفر تک مقیم رہے، دولابی کہتے ہیں کہ ایک ماہ ٹھہرے تھے، زید بن ثابت کہتے ہیں کہ جب حضورﷺ حضرت ابو ایوب کے گھر میں ٹھہرے تو وہاں کوئی ہدیہ نہیں آیا، جو سب سے پہلا ہدیہ آیا وہ پیالہ تھا جس میں گندم کی روٹی، گھی اور دودھ تھا، زید کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا اور عرض کی یا رسول اللہ یہ پیالہ میری والدہ نے بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ انہیں برکت دے پھر اپنے صحابہ کو بلایا اور سب نے اسے کھایا، ابھی میں دروازے ہی پر کھڑا تھا کہ ایک اور بڑا پیالہ آیا، غلام اسے ڈھانپ کر لایا، میں نے ابو ایوب کے دروازے پر کھڑے کھڑے دیکھنے کے لئے کپڑا اُٹھایا تو دیکھا کہ اس میں شوربہ والی روٹی تھی، وہ رسول اللہﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

حضرت زید کہتے ہیں کہ بنو مالک بن دینار میں سے ہر رات ہم تین چار آدمی آپ کے دروازے پر رہا کرتے جو باری باری کھانا اٹھایا کرتے تھے، آخر کار آپ حضرت ابو ایوب کے گھر سے منتقل ہو گئے، اس گھر میں آپ کا قیام سات ماہ تک رہا، ہر رات سعد بن عبادہ اور اسعد بن زرارہ کی طرف سے بلا ناغہ پیالہ آیا کرتا۔

کتاب یحییٰ ہی میں ہے کہ اُمّ ابو ایوب سے پوچھا گیا کہ حضورﷺ کو کونسا کھانا سب سے زیادہ پسند تھا؟ کیونکہ آپ تمہارے یہاں ہی تو مقیم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کے فرمانے پر کھانا تیار کیا گیا ہو اور نہ ہی یہ دیکھا کھانا آنے پر آپ نے اس کا عیب نکالا ہو۔

ابو ایوب نے مجھے بتایا کہ ایک رات میں نے اس پیالے سے کھانا کھایا جو حضرت سعد بن عبادہ نے بھیجا تھا، وہ سالن سا تھا۔ ابو ایوب کہتے ہیں، میں نے رسول اللہﷺ کو دیکھا کہ ہنڈیا سے اولاً آپ کھاتے، ابھی کسی اور نے نہ کھایا ہوتا، ہم آپ کے لئے ہنڈیا تیار کر دیتے تھے پھر ہم هریس نامی کھانا تیار کرتے، وہ آپ کو بہت اچھا لگتا اور رات کے کھانے پر آپ کے پاس پانچ سے سولہ افراد تک کھانا کھاتے، جتنا کھانا ہوتا، اتنے آدمی کھاتے۔

اسی کتاب یحییٰ میں ہے' حضرت ابو ایوب فرماتے ہیں کہ انہوں نے اچھے طریقے سے کھانا پکایا جس میں سبزیاں (پیاز' تھوم' گندنا) تھیں اور جب آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے ناپسند فرمایا' ارشاد فرمایا' تم اسے کھا لو کیونکہ میں تمہارے جیسا نہیں' مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے میرے صاحب جبریل تکلیف ہو گی۔

رزین کے مطابق جب آپ حضرت ابو ایوب کے ٹھہرے تو سال میں سے کوئی ایسی رات نہ گذری جب حضرت سعد بن معاذ کے گھر سے کھانے کا پیالہ نہ آیا ہو' پھر اور لوگوں کی طرف سے بھی کھانا آتا رہا' وہ باری باری بھیجتے۔ ابو ایوب کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے آپ کے لئے کھانا تیار کیا اور اس میں تھوم ڈال دیا' حضور ﷺ نے اس سے نہیں کھایا' مجھے اندیشہ ہوا' نیچے اُتر کر میں نے پوچھا' یا رسول اللہ! کیا یہ حرام ہے؟ فرمایا: میں اللہ سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتا ہوں' اس لئے اسے اچھا نہیں جانتا' تم کھا سکتے ہو۔ آپ کہتے ہیں' میں نے عرض کی یا رسول اللہ! جسے آپ پسند نہیں فرماتے' میں بھی پسند نہیں کرتا۔

انصار و مہاجرین میں بھائی چارہ قائم کر دیا گیا

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار میں ایک تحریر لکھی جس میں یہودیوں سے مصالحت کی اور معاہدہ کیا' انہیں ان کے دین پر برقرار رکھا' ان کی جائیدادیں انہی کے پاس رہنے دیں اور ان کے لئے کچھ شرطیں رکھ دیں جبکہ ان میں بھائی چارہ بنا دیا جہاں تک ہمیں معلوم ہے' آپ نے فرمایا تھا: اللہ کی خاطر بھائی بھائی بن جاؤ' پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ یہ میرا بھائی ہے۔

قلت: یہ بھائی چارہ آپ کے مدینہ میں تشریف لانے کے پانچ ماہ بعد ہوا تھا' کچھ آٹھ ماہ لکھتے ہیں' اس وقت آپ مسجد بنا رہے تھے' کچھ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہوا تھا اور کچھ بعد میں ہوا بیان کرتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ بھائی چارے کی ابتداء مدینہ میں ہوئی' پھر جیسے جیسے لوگ اسلام لاتے گئے اور یہاں آتے گئے' یہ سلسلہ جاری رہا۔ کہتے ہیں کہ بھائی چارہ والے کل افراد نوے (۹۰) تھے' ہر گروہ میں سے پینتالیس پینتالیس لوگ لئے گئے' کچھ سو کہتے ہیں۔ آپ نے ان میں بھائی چارہ' حق' غم خواری اور وراثت کی بناء پر قائم فرمایا تھا' وہ اسی حال پر رہے تا آنکہ یہ آیت اُتری۔

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ (سورۂ انفال: ۷۵)

(اور رشتہ داریاں بن گئیں)

علامہ واقدی فرماتے ہیں کہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو مہاجرین میں بھائی چارہ بنایا اور پھر مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم فرمایا۔

ابن عبد البر کہتے ہیں کہ یہ بھائی چارہ دو مرتبہ قائم کیا گیا' ہجرت سے پہلے مکہ میں قائم فرمایا' یہ صرف مہاجرین میں تھا چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر میں قائم فرمایا پھر قائم فرماتے گئے' آخر میں حضرت علی رہ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

کہ تم اس بات پر خوش نہیں ہو گے کہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیوں نہیں' میں تو بہت خوش ہوں۔ فرمایا تو سن لو کہ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو اور دوسری مرتبہ وہ بھائی چارہ قائم فرمایا جو مہاجرین و انصار میں تھا' جیسے گذرا۔ حضرت حسن کے اس قول سے یہی بھائی چارہ مراد ہے کہ وراثت بھائی چارہ کی حلف کی بناء پر تھی پھر وراثت کی آیت سے یہ وراثت منسوخ ہو گئی۔

ابو داؤد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کو ہمارے گھر میں حلیف بنایا۔ اب رہی یہ حدیث کہ "اسلام میں حلف نہیں" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حلیف بننے سے وراثت نہیں چلتی' حلف اس چیز پر ہوتی ہے جس سے شریعت منع کر دے۔ رزین مہاجرین وانصار میں بھائی چارے کا ذکر چھوڑ گئے' انہوں نے ابو حاتم سے نقل کر کے لکھا: "پھر آپ نے اپنے صحابہ میں بھائی چارہ قائم فرمایا اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی دعوت کرنے کو فرمایا اور پھر فرمایا: تمہارے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ تم جنت کے اعلیٰ محلوں میں ہو گے' نیز حضرت علی سے فرمایا: میں نے صرف اپنے لئے تمہیں آخر میں رہنے دیا' تم میرے بھائی ہو اور میرے علم کے وارث ہو' تم جنت میں میرے ساتھ ہو گے' میری بیٹی بھی ہمراہ ہو گی۔

بھائی چارے کے اس قصے کا ذکر حاکم نے کیا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر کے بھائی چارے کا ذکر کیا ہے اور دیگر لوگوں کی مؤاخاۃ کا ذکر کیا ہے پھر بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اپنے صحابہ میں تو بھائی چارہ قائم فرما دیا' میرا بھائی کون ہو گا؟ فرمایا: تمہارا بھائی میں ہوں۔

بھائی چارے کے انکار پر ابن تیمیہ کا رد

ابن تیمیہ نے ابن مطہر رافضی کے مہاجرین میں بھائی چارے کا ذکر کرنے پر اس کا رد کیا ہے خصوصاً حضرت علی سے نبی کریم ﷺ کے بھائی چارے کا چنانچہ وہ کہتا ہے: "بھائی چارہ تو نرمی اور الفت پیدا کرتا ہے جس کا مہاجرین میں کوئی معنٰی نہیں۔" لیکن ابن تیمیہ کا یہ قول تو حضور ﷺ کے واضح فرمان کا رد ہے اور وہ اس میں موجود حکمت سے غافل ہے' دیکھئے ان حضرات میں کچھ لوگ مالی اور قبیلہ کے لحاظ سے دوسروں پر قوی تھے اور یہ نرم رویہ رکھنا ممکن ہے' حضور ﷺ حضرت علی کے ساتھ بچپن ہی سے نرمی فرماتے تھے اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ حاکم اور ابن عبد البر نے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا تھا حالانکہ وہ دونوں مہاجرین میں سے تھے۔

یہودی اوس و خزرج میں فساد پیدا کرتے تھے

نبی کریم ﷺ کی برکت سے اوس و خزرج دونوں قبیلوں میں بھائی چارے کا سلسلہ چلتا رہا' ایک دن شاس بن قیس (یہ یہودی بڈھا تھا اور مسلمانوں سے شدید بغض و حسد رکھتا تھا) اوس و خزرج کے ایک گروہ کے ہاں سے گذرا' وہ

باتیں کر رہے تھے' اس نے جاہلیت کی عداوت کے بعد ان میں اس طرح کی محبت و الفت دیکھی تو جل گیا۔ کہنے لگا: ان شہروں میں بنو قیلہ کافی رہتے ہیں اور ان کے ہوتے ہمیں قرار کہاں' چنانچہ اس نے ایک یہودی نوجوان سے کہا جو اس کے ساتھ تھا کہ تم ان کے پاس بیٹھ جاؤ اور جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ دو' اس میں جو کچھ ہوا تھا' بیان کرو اور اس میں پڑھے گئے فخریہ شعر پڑھو چنانچہ اس نے یہ کام کر دیا جس پر وہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے اور اپنا اپنا فخر جتلانے لگے پھر دونوں قبیلوں میں سے ایک ایک آدمی اچھل پڑا' یہ اوس بن قیظی اور جبار بن صخر تھے' ان میں بڑھ چڑھ کر باتیں ہوئیں' ایک نے دوسرے سے کہا' چاہو تو ابھی مزہ چکھا دیں' وہ سب لوگ غصے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان حرہ میں مقابلہ ہو گا چنانچہ وہ اس طرف چل پڑے۔

یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی' آپ مہاجرین کو لے کر ان کے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا: اے گروہِ مسلمین! اللہ سے خوف کرو' کیا میرے ہوتے جاہلیت کے کام کرنے لگے ہو؟ اللہ نے تمہیں راہِ اسلام دکھائی ہے اور مسلمان بنا دیا ہے' اس اسلام کی برکت نے جہالت کے کام تم سے دور کر دیئے ہیں اور کفر سے تمہیں بچا لیا ہے' تمہارے اندر الفت پیدا فرمائی ہے۔

یہ سن کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو شیطان کا بہکاوہ تھا اور دشمن کی چال تھا چنانچہ وہ رونے لگے اور پھر اُٹھ کر ایک دوسرے کے گلے لگے اور پھر اکٹھے حضور ﷺ کے ہمراہ سنتے اور اطاعت کرتے واپس آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے دشمنِ خدا شاس بن قیس کی بھڑکائی آگ سے انہیں بچا لیا چنانچہ فرمانِ الٰہی نازل ہوا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ○ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ○ (سورۂ آل عمران: ۹۸'۹۹)

"تم فرماؤ! اے کتابیو! اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے اور تمہارے کام اللہ کے سامنے ہیں' تم فرماؤ! اے کتابیو! کیوں اللہ کی راہ سے روکتے ہو اسے جو ایمان لائے' اسے ٹیڑھا کیا چاہتے ہو اور تم خود اس پر گواہ ہو اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں۔"

اور اللہ نے ان دونوں کے بارے میں فرمایا اور انہیں اپنے کئے کے بارے میں بتایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (الیٰ) كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ○ (سورۂ آل عمران: ۱۰۰ تا ۱۰۳)

"اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہنے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر چھوڑیں گے اور تم کیونکر کفر کرو گے' تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول تشریف لایا اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو ضرور وہ سیدھی راہ دکھایا گیا' اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا

اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان اور اللہ کی رسّی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں بَیر تھا' اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی ہو گئے اور تم ایک غار دوزخ کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا دیا' اللہ تم سے یونہی اپنی آئتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم ہدایت پاؤ۔"

حُیّی بن اخطب اور اس کا بھائی ابو یاسر عرب میں شدید قسم کے یہودی تھے' حضور ﷺ کی خصوصیات سے حسد کرتے تھے' دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو اسلام سے ہٹائیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت اُتاری:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم (تا) حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (سورۃ البقرہ:۱۰۹)

"بہت کتابیوں نے چاہا' کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں' اپنے دلوں کی جلن سے' بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو اور درگذر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے' بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا ابو یاسر کو ساری اولاد میں سے پیاری تھی' میں ان کے لڑکوں کے ہوتے انہیں ملتی تو وہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لے آئے تو میرے والد اور چچا صبح سویرے اندھیرے ہی میں ان کے پاس گئے اور سورج کے غروب ہونے تک واپس نہیں آئے' واپس آئے تو تھکے تھکے تھے اور نرم رفتار سے چل رہے تھے' میں پہلے کی طرح خوشی سے ان کی طرف گئی لیکن بخدا دونوں میں سے ایک نے بھی میری طرف توجہ نہیں کی' وہ غمگین دکھائی دیتے تھے' میں نے چچا سے سنا' میرے والد سے کہہ رہے تھے "کیا یہ وہی ہے؟" اس نے کہا ہاں بخدا وہی ہے' پھر پوچھا اسے خوب جانتے ہو؟ اس نے کہا ہاں' پھر پوچھا کہ اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا جب تک زندہ ہوں' اس سے دشمنی رکھوں گا چنانچہ دونوں کے جسم پھٹ گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۲

ہجرت کے سالوں میں آپ کے نمایاں کام

یہ مضمون علامہ رزین نے تاریخ ابو حاتم سے مختصراً بیان کیا ہے جس میں میں نے کچھ نفیس چیزیں نمایاں کر کے شامل کر دی ہیں چنانچہ ان کے اوّل میں ہیں "قلت" اور آخر میں "واللہ اعلم" لکھتا جاؤں گا۔

نبی کریم ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں دس سال تک رہے' اس پر اجماع ہو چکا ہے جیسے علامہ نووی نے

بتایا ہے۔

پہلا سالِ ہجرت۔(واقعات)

اس کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے اس میں مسجد قباء وغیرہ تعمیر فرمائی تھی۔ابو حاتم کہتے ہیں کہ اسی میں مسجد نبوی تعمیر ہوئی' مسجد کی تعمیر جاری تھی کہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا چنانچہ بقیع میں دفن ہونے والے سب سے پہلے مسلمان آپ ہی تھے۔

(قلت)اس روایت سے پتہ چلا کہ مہاجرین میں سے بقیع میں اوّلاً دفن ہونے والے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے اس سے دونوں نقلیں جمع ہو سکتی ہیں اور کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ حضرت اسعد بن زرارہ سے بھی پہلے فوت ہوئے تھے اور نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد انصار میں سب سے پہلے فوت ہونے والے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت اسعد بن زرارہ دوسرے سالِ ہجرت میں فوت ہوئے تھے (واللہ اعلم)۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل فوت ہوئے انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں کعبہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے' رسول اللہ ﷺ نے ان کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی (یہ آپ کی خصوصیت ٹھہری ورنہ حنفیوں کے نزدیک ایسا جائز نہیں) انصار مرد و زن حضور ﷺ سے قرب کے لئے ہدیہ جات پیش کیا کرتے' لیکن حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اس پر افسوس کیا کرتیں کیونکہ ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں چنانچہ اپنے بیٹے انس کو لائیں اور عرض کی یا رسول اللہ!۔کیا انس آپ کی خدمت کر سکتا ہے؟ فرمایا' ہاں۔

(قلت) صحیح بخاری میں جو کچھ حضرت انس سے روایت ہے' وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو خادم پاس نہ تھا چنانچہ ابوطلحہ نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا اور عرض کی' یا رسول اللہ! انس نہایت سمجھدار ہے آپ کی خدمت کیا کرے گا۔حضرت انس کہتے ہیں کہ پھر میں آپ کی خدمت میں لگ گیا۔الحدیث۔ان دونوں روایتوں کو جمع یوں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی والدہ خدمت میں پہلے لائیں اور پھر حضرت ابوطلحہ انہیں لے کر حاضر ہوئے کیونکہ وہ ان کے ولی اور گہرے رشتہ دار تھے اور اس میں لغزش موجود ہے کیونکہ ابوطلحہ کا انہیں خدمت میں لانا غزوۂ خیبر کے موقع پر تھا جیسے حدیث کے الفاظ سے سمجھ آتا ہے۔(واللہ اعلم)۔

پھر جب آپ کو مدینہ میں تشریف لائے ایک ماہ گذر چکا تو مقیم کے لئے دو رکعت (فرض) بڑھائی گئیں۔

(قلت) سہیلی کہتے ہیں کہ یہ اضافہ ہجرت کے لگ بھگ ایک سال بعد ہوا لیکن اکثر علماء اس طرف ہیں کہ مکمل نماز شروع ہی سے نازل ہو چکی تھی (واللہ اعلم)۔

اسی سال میں آپ کے صحابہ کو بخار ہوا تو آپ نے دُعا فرمائی کہ اسے جحفہ کی طرف بھیج دیا جائے اور پھر فرمایا: ''الٰہی! مدینہ ہمیں محبوب فرما دے۔'' اور پھر اپنے صحابہ میں بھائی چارہ قائم فرمایا جیسے گذر چکا پھر ولید بن مغیرہ مکہ

میں مر گیا' اسی سال میں حضرت عبد اللہ بن زبیر کی ولادت ہوئی' ان کی والدہ ہجرت کے بعد آئیں اور شوال کو قباء میں انہیں نفاس آیا چنانچہ ہجرت کے بعد یہ اسلام میں پہلے مہاجر شخص تھے جو مدینہ میں پیدا ہوئے اور ان کے پیٹ میں سب سے پہلے جانے والی شے حضور ﷺ کا لعاب مبارک تھا جو آپ نے ان کے منہ میں ڈالا تھا۔

(قلت) ان مساجد کے ذکر میں جن کا مقرر مقام معلوم نہیں' سعد بن خیثمہ کے گھر کے قریب مسجد کے بارے بتاتے ہوئے ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ دوسری ہجری کو پیدا ہوئے۔(واللہ اعلم)۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا زاد عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب کو ساٹھ مہاجرین پر مقرر کرتے ہوئے جھنڈا باندھ کر دیا تھا' ان میں ایک بھی انصار نہ تھا۔یہ وہ پہلا جھنڈا تھا جو دورِ اسلام میں باندھا گیا' اسی میں حضرت سعد بن ابو وقاص نے تیر پھینکا چنانچہ یہ پہلا تیر تھا جو دورِ اسلام میں پھینکا گیا' وہ ابو سفیان بن حرب کے ساتھ الجھے تھے' کچھ کہتے ہیں عکرمہ بن ابو جہل سے لڑے تھے' وہ رابغ کے نشیبی علاقے میں سو لوگوں کے ہمراہ تھا' اسے ودان بھی کہتے ہیں چنانچہ مشرکوں میں سے مقداد بن عمرو بن اسود اور عتبہ بن غزوان مسلمانوں سے آ ملے تھے۔

دورِ اسلام میں باندھا جانے والا پہلا جھنڈا

(قلت) ابو الاسود نے اپنے ''مغازی'' میں حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ابواء کے مقام پر پہنچے تو عبیدہ بن حارث کو ساٹھ آدمیوں کے ہمراہ بھیجا تھا پھر قصہ بیان کیا چنانچہ یہ دوسرے سال کا واقعہ ہے۔اہلِ سیرت نے یہی کچھ لکھا ہے۔(واللہ اعلم)۔

پھر آپ نے چچا حضرت حمزہ کے لئے جھنڈا باندھا تھا' ان کے ساتھ تیس مہاجرین تھے (کچھ کہتے ہیں کہ انصار میں سے تھے) تاکہ وہ قریش کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ آپ ابو جہل کے مقابلے میں آئے' اس کے ہمراہ تین سو سوار تھے' ان کے درمیان مجدی بن عمرو آ گئے' یہ دونوں طرف کا حلیف تھا چنانچہ وہ بغیر لڑے واپس چلے گئے' ان دنوں حضرت حمزہ کا جھنڈا اُٹھانے والے ابو مرثد تھے۔

(قلت) کچھ نے حضرت حمزہ کے اس دستے کو عبیدہ کے دستے سے پہلے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت حمزہ کا جھنڈا اسلامی دور میں باندھا جانے والا پہلا جھنڈا تھا لیکن ابن اسحاق نے پہلے دستے کو اوّل قرار دیا ہے اور کہا کہ ان دونوں کا معاملہ مشکل نظر آتا ہے' نبی کریم ﷺ نے دونوں ہی کا ساتھ دیا تھا۔ابو عمرو کہتے ہیں کہ دورِ اسلام میں سب سے پہلا جھنڈا عبد اللہ بن جحش کے لئے باندھا گیا تھا اور کچھ کہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا یہ دستہ دوسرے سال میں نکلا تھا (واللہ اعلم)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی

نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہم بستری فرمائی تو ان کی عمر نو سال کی تھی جبکہ نکاح' ہجرت

سے تین سال قبل مکہ میں ہوا تھا' تب ان کی عمر چھ سال تھی۔

حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

(قلت) حضورﷺ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد کیا تھا اور کچھ حضرات کہتے ہیں کہ پہلے کیا تھا اور ان سے ہم بستری مکہ میں کی تھی' (حضرت عائشہ سے ہم بستری نویں ماہ کے آخر میں ہوئی) کچھ آٹھ ماہ بعد بتاتے ہیں اور کچھ اٹھارہ ماہ بعد بتاتے ہیں یعنی جب آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لے آئے تھے (اس وقت کے بعد) واللہ اعلم۔

پھر آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے لئے جھنڈا باندھا تو یہ بیس آدمی تھے' وہ ذوالقعدہ میں قریش کے دستے کا مقابلہ کرنے چلے تھے چنانچہ وہ پیدل چلے' دن کو چھپ جاتے اور رات کو چلا کرتے' سعد کے لئے جھنڈا اُٹھانے والا مقداد بن عمرو تھا لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ دیکھا پھر ابوقیس بن اسلت اسلام لانے کے لئے آیا' اسے ابن ابی بن سلول مل گیا اور کہا کہ ابھی رُک جاؤ اور دیکھو کیا ہوتا ہے' وہ واپس ہوا اور حالتِ کفر میں مر گیا۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

(قُــلْــتُ) حضورﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے چنانچہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت شدہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ حضورﷺ کی تشریف آوری سنتے ہی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر آنے سے پہلے حضرت عبد اللہ بن سلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر اپنے گھر واپس چلے گئے پھر حضورﷺ نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: گھر جاؤ اور ہمارے لئے قیلولہ کرنے کا انتظام کرو۔ انہوں نے عرض کی' اللہ کی برکت سے دونوں ہی چلے آیئے یعنی آپ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں عرض کی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب نبی کریمﷺ تشریف لائے تو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کی: میں گواہی دے رہا ہوں کہ آپ اللہ کے خاص رسول ہیں اور آپ حق دین لے کر تشریف لائے ہیں' یہودی یہ جانتے ہیں کہ میں ان کا سردار اور سردار کا بیٹا ہوں' ان سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ علم والے کا بیٹا ہوں تو آپ میرے بارے میں یہودیوں سے پوچھئے' انہیں میرے اسلام لانے کی خبر نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں اسلام لے آیا ہوں تو وہ میرے بارے میں وہ کچھ کہیں گے جو میرے اندر موجود نہیں چنانچہ رسول اللہﷺ نے انہیں بلا بھیجا' وہ حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے یہودیو! تم برے لوگ ہو' اللہ سے ڈرو' اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں' تمہیں یقین ہے کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں اور تمہارے پاس سچا دین لے کر آیا ہوں لہٰذا تم اسلام لے آؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ عبد اللہ

بن سلام کی تم میں حیثیت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں‘ ہم سب سے زیادہ علم والے اور سب سے بڑے عالم کے بیٹے ہیں۔ فرمایا بھلا یہ بتاؤ کہ اگر وہ اسلام لے آئیں (تو تم کیا کہو گے) انہوں نے کہا بخدا ایسا نہیں ہو سکتا‘ آپ نے تین مرتبہ دہرا کر کہا تو ہر بار انہوں نے یہی جواب دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے ابنِ سلام ذرا باہر آیئے! وہ باہر آئے اور کہا: اے یہودیو! اللہ سے ڈرو‘ اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی بھی لائق عبادت نہیں‘ تمہیں یقین ہے کہ یہ اللہ کے سچے رسول ہیں اور سچا دین لے کر آئے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو‘ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نکال دیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ سے کچھ سوال کئے اور جب آپ نے جواب دیدئے تو وہ اسلام لے آئے‘ اسی روایت میں یہودیوں کا گذشتہ قصہ موجود ہے اور یہ بھی ہے کہ جب حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آئے اور کلمۂ شہادت پڑھا تو وہ کہنے لگے: وہ تو شرارتی ہے اور شرارتی کا لڑکا ہے اور خامیاں نکالتے گئے۔ اس پر انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ‘ مجھے ان سے یہی اندیشہ تھا۔

یہودیوں کے عالموں نے حسد اور سرکشی کی بناء پر نبی کریم ﷺ سے دشمنی شروع کر دی جن میں حیی بن اخطب‘ ابو رافع اعور‘ کعب بن اشرف‘ عبد اللہ بن صوریا‘ زبیر بن باطا‘ شمویل اور لبید بن اعصم وغیرہ پیش پیش تھے پھر ان میں سے کچھ لوگ منافقانہ طور پر اسلام لے آئے اور اوس وخزرج میں سے بھی کچھ منافق ان سے مل گئے۔

اسی سال حضرت عبد اللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبد ربہ کو اذان کا طریقہ دکھایا گیا۔ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ دوسرے سال کا واقعہ ہے جب حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے نماز کے لئے لوگوں کو جمع کرنے کی خاطر مشورہ فرمایا تھا کیونکہ اس سے قبل انہیں نماز کی خاطر اکٹھا کرنے کے لئے ایک شخص آواز لگایا کرتا تھا کہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ (واللہ اعلم)۔

دوسرا سالِ ہجرت (واقعات)

جب محرم کی دس تاریخ آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو روزہ رکھنے کا ارشاد فرمایا: فرمایا کہ ہم یہودیوں کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تعلق والے ہیں۔ پھر اسی سال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نکاح فرمایا۔

(قلت) یہ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے اور صحیح یہ ہے کہ رجب میں ہوا جبکہ انہوں نے ذوالحجہ میں ہم بستری کی تھی جیسے آگے آ رہا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال تھی۔ اٹھارہ سال بھی لکھتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ اُحد کے بعد شادی کی تھی۔ (واللہ اعلم)۔

پھر اسی سال حضور ﷺ غزوہ کے لئے ''ابواء'' تک چلے۔ یہ مقام ودان سے مدینہ کی طرف چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔

(قلت) چونکہ ابواء اور ودان قریب قریب ہیں' اس لئے اسے غزوۂ ودان کہا گیا (واللہ اعلم)۔

آپ نے مدینہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو نائب مقرر فرمایا تھا۔آپ کے جھنڈا بردار حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ تھے پھر آپ لڑے بغیر واپس تشریف لے آئے' آپ مجدی بن عمرو ضمیری کو ذمہ دار بنا کر واپس تشریف لائے تھے۔اس کے بعد آپ دو سو افراد لے کر''رضوی'' کی طرف تشریف لے گئے' جھنڈا اُٹھانے والے حضرت سعد بن ابو وقاص تھے۔اس مرتبہ بھی آپ لڑے بغیر واپس تشریف لے آئے تھے۔

(قلت) یہ غزوۂ''بواط'' تھا' رسول اللہ ﷺ قریش کے تاجروں کی نیت سے بھی نکلے اور''رضوی'' کے قریب ''بواط'' تک پہنچے۔ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس مرتبہ آپ نے مدینہ پر اپنا نائب سائب بن عثمان بن مظعون کو مقرر فرمایا تھا' واقدی کے مطابق سعد بن معاذ کو مقرر کیا تھا (واللہ اعلم)۔

پھر کرز بن جابر فہری مدینہ کی طرف حملہ آور ہو کر آیا تو رسول اللہ ﷺ مہاجرین کو لے کر اس کے پیچھے روانہ ہوئے' جھنڈا بردار حضرت علی بن ابو طالب کرم اللہ وجہہ تھے' آپ نے مقامِ بدر تک اس کا پیچھا کیا لیکن کرز کہیں نظر نہ آیا۔یہ بدر اولیٰ کہلاتا ہے۔

(قلت) اس واقعہ کو ابن اسحاق نے عشیرہ سے کچھ راتیں بعد ذکر کیا ہے۔(واللہ اعلم)۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ دے کر بھیجا' یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ماہ حرام میں بارہ کی تعداد میں ہوتے ہوئے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔عتبہ بن غزوان اور سعد بن ابو وقاص نے اپنے سواریاں گم کر لیں چنانچہ ان سے پیچھے رہ گئے اور دس لوگ چلے گئے' وہ قریش کی ایک جماعت سے لڑے' ان میں عثمان بن عبد اللہ بن مغیرہ بھی شامل تھا جس نے فدیہ دے دیا تھا' حکم بن کیسان اسلام لے آئے اور انہوں نے عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا۔

(قلت) ابن اسحاق نے اس کا ذکر العشیرہ کے بعد کیا ہے' یہ لوگ نخلہ تک گئے تھے جو مکہ سے ایک دن رات کے فاصلے پر تھا' قریش کا ایک قافلہ ان کے قریب سے گذرا' وہ طائف سے چمڑا اور کشمش لئے آ رہے تھے' یہ مذکورہ لوگ اس میں شامل تھے' رجب کا آخری دن تھا' انہوں نے دو قید کر لئے اور عمرو کو قتل کر دیا پھر قافلے کو بھگا دیا۔یہ دورِ اسلام میں پہلا مال غنیمت تھا۔(واللہ اعلم)۔

پھر رسول اللہ ﷺ عشیرہ کی طرف تشریف لے گئے' معاملات بنو مدلج کے سپرد کئے اور واپس تشریف لے آئے۔

(قلت) آپ قریش کے لشکر کا راستہ روکنے نکلے تھے' کچھ دن کی تاخیر ہو گئی تھی۔ابو سلمہ بن عبد الاسد کو نائب مقرر فرمایا تھا۔(واللہ اعلم)۔

کعبہ کی طرف توجہ

ابو حاتم کہتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کی طرف توجہ کرنا پسند فرماتے تھے' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی' یا رسول اللہ! کاش آپ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے چنانچہ آپ نے اللہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ (تا) وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (سورۂ بقرہ:۱۴۴)

"ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا تو ضرور تمہیں ہم پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے' ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو' اپنا منہ اسی طرف کرو۔"

یہ ظہر کا وقت تھا' منگل کا دن' شعبان کا نصف اور ہجرت کا دوسرا سال تھا۔

(قلت) اس کے بعد والے باب میں تیسری فصل کے اندر اس کے بارے میں اختلاف کا ذکر آ رہا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

پھر اسی سال شعبان میں روزے فرض ہوئے چنانچہ سب نے روزے رکھے اور جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے عاشوراء کے روزے کا نہ تو حکم فرمایا اور نہ ہی روکا۔

پھر اسی سال رمضان میں غزوۂ بدر ہوا' تاریخ ۱۲ رمضان تھی' کچھ کہتے ہیں کہ جمعہ کا دن اور سترہ تاریخ تھی اور یہ بھی کہتے ہیں ۲۴ تاریخ کی صبح تھی۔ مسلمان تین سو دس سے کچھ زیادہ تھے۔

(قلت) زیادہ صحیح قول دوسرا (۱۷ رمضان) ہے۔ اس میں انصار حضور ﷺ کے ہمراہ چلے تھے' اس سے قبل وہ کسی جگہ نہیں نکلے تھے' ان کے ہمراہ تین گھوڑے تھے' مشرکوں کی تعداد ایک ہزار تھی اور کچھ کہتے ہیں ساڑھے نو سو تھے' ان کے پاس سو گھوڑے تھے' یہ بدر ثانی تھا۔ (واللہ اعلم)۔

پھر عمیر بن عدی خطمی نے انصار کی ایک عورت عصماء کو قتل کر دیا' یہ یزید خطمی کی بیوی تھی' یہ اپنے برے اشعار پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو ستاتی تھی: اسے قتل کر کے وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا: "اس میں دو بکریاں نہیں بھڑیں گی۔"

(قلت) "اکتفاء" میں لکھا ہے کہ یہ عصماء اس وقت منافق بنی جب ابو عفک قتل ہوا' اس نے ایسے شعر کہے کہ جن میں اسلام اور اہل اسلام کو برا بنایا اور انصار کو اس بات پر ملامت کی کہ وہ حضور ﷺ کی اتباع کرتے تھے۔ عمیر اسے قتل کر کے اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے تو لوگ اس کے بارے میں بہت کچھ کہنے لگے۔ اس کے پانچ آدمیوں سے کچھ بیٹے تھے چنانچہ کہا کہ اے بنو خطمہ! میں نے مروان کی بیٹی قتل کر دی ہے یعنی عصماء کو قتل کیا ہے چنانچہ جس سے جو

ہو سکتا ہے کر لے۔ وہ بنو اسلم سے اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے اور اس دن اسلام کی عظمت دیکھ کر ان میں سے کئی آدمی اسلام لے آئے۔ انتہٰی۔

ابن سید الناس نے ابن سعد سے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے عمیر کے عصماء کو قتل کرنے کے بعد کہا:
پھر شوال میں سالم بن عمیر کا دستہ ابو عفک یہودی کی طرف ہوا' ابو عفک بنو عمرو بن عوف میں سے ایک بڑھا تھا جو ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا' وہ لوگوں کو اشعار کے ذریعے حضورﷺ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا جس پر سالم بن عمیر نے (جو بدر میں شریک ہوئے) کہا تھا مجھ پر لازم ہے کہ ابو عفک کو قتل کر دوں یا اس کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔ ابن سعد نے اس کے قتل کو ذکر کیا۔

یہ روایت اکتفاء کی روایت کے مخالف ہے جس میں ابو عفک کا قتل عصماء کے قتل سے پہلے ہے اور ابن سعد نے بھی ذکر کیا ہے کہ عصماء کا قتل رمضان کی پانچ پر ہوا تھا۔

یہ عمیر نابینا تھے' رسول اللہﷺ نے ان کا نام ''بصیر'' رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ بنو خطمہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے یہی تھے' وہ اپنی قوم کے امام اور قاری تھے' انہیں ''قاری'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ (واللہ اعلم)۔

پھر اسی سال رسول اللہﷺ نے عید الفطر سے دو دن قبل فطرانہ کے بارے میں لوگوں کو آگاہ فرمایا تھا۔

(قلت) یہ بھی کہتے ہیں کہ شوال کی یکم کو آپ نے آگاہ فرمایا تھا پھر نماز عید الفطر پڑھائی۔ اسی سال مال میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ تین ہجری کو فرض ہوئی' کچھ چوتھی ہجری کو بتاتے ہیں' کچھ ہجرت سے بھی پہلے بتاتے ہیں اور پھر یہ جاری ہو گئی۔ (واللہ اعلم)۔

پھر اسی سال غزوۂ بنی قینقاع شوال میں واقع ہوا تھا۔

(قلت) پہلے گزر چکا ہے کہ نبی کریمﷺ نے یہودیوں سے معاہدہ کیا ہوا تھا' ان کے تین گروہ تھے بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ' ان سب نے باری باری معاہدہ توڑ دیا' سب سے پہلے معاہدہ توڑنے والے بنو قینقاع تھے چنانچہ نبی کریمﷺ نے جنگ بدر کے بعد شوال میں ان سے جنگ کا ارادہ کیا' اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا' وہ حکم کے تابع ہو گئے' آپ نے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو عبد اللہ بن ابی نے انہیں چھڑانے کی درخواست کی' وہ اس کے حلیف تھے چنانچہ آپ نے اس کے سپرد کر دیئے اور پھر مدینہ سے انہیں اذرعات کی طرف نکال دیا۔

''اکتفاء'' میں ان کے معاہدہ توڑنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عرب کی ایک عورت تجارتی سامان لائی اور بازار قینقاع میں بیچ دیا اور وہاں ایک ڈھلائی کرنے والے سنار کے پاس بیٹھ گئی' لوگوں نے چاہا کہ وہ اپنا چہرہ کھول دے لیکن اس نے انکار کر دیا' ڈھلائی والے سنار نے اس کے کپڑے کا ایک کونہ پکڑا اور اس کی پیٹھ کی طرف باندھ دیا اور جب وہ اٹھی تو اس کی شرمگاہ ننگی ہو گئی' وہ ہنس پڑے جس پر وہ چلائی۔ اس پر ایک مسلمان اس سنار پر جھپٹا اور اسے قتل کر دیا' یہودیوں نے مسلمان سے سختی کی اور اسے قتل کر دیا چنانچہ یہودیوں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی' رسول اللہﷺ نے انہیں

گھیرے میں لے لیا اور وہ تابع ہوئے۔

یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابن ابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اے محمد! میرے غلاموں کے بارے میں اچھا سلوک کرو' پھر منہ پھیر لیا اور کہا: چار سو بغیر زرہ اور تین سو زرہ والے ہیں جنہوں نے مجھے سرخ وسفید سے روکا ہے' تم انہیں ایک ہی دن میں کاٹ دو گے' بخدا میں موت سے خوفزدہ ہوں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہیں لے لو۔

مغلطائی غزوۂ قینقاع میں کہتے ہیں: حاکم نے کہا کہ یہ اور بنو نضیر ایک تھے اور غور نہ کرنے والا شبہ میں پڑ جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر یہ بات ذکر کرنے کے بعد کہ معاہدہ توڑنے والے پہلے لوگ یہی تھے' کہتے ہیں کہ ان سے آپ نے جنگ کی پھر بنو نضیر سے کی۔ حاکم نے عجیب بات کر ڈالی' ان کا خیال ہے کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کو ایک ہی وقت میں نکالا گیا حالانکہ اس پر اتفاق نہیں ہے کیونکہ بنو نضیر کو عروہ کے مطابق بدر کے چھ ماہ بعد نکالا گیا تھا یا ابن اسحاق کے مطابق اس سے بھی بہت عرصہ بعد نکالا گیا' واقدی نے ذکر کیا ہے کہ بنو قینقاع کو شوال دو ہجری میں نکالا گیا تھا یعنی جنگ بدر کے ایک ماہ بعد' اس کی تائید ابن اسحاق کی روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فرمان ہے: جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کو بدر میں نقصان پہنچایا تو یہودیوں کو بنو قینقاع کے بازار میں اکٹھا کیا اور فرمایا: اے یہودیو! اس سے قبل ہی اسلام لے آؤ کہ تم سے وہ سلوک ہو جو قریش سے ہوا ہے' وہ کہنے لگے: وہ تو لڑنا نہیں جانتے تھے' ہم سے لڑو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ مردوں سے جنگ ہوئی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ .... لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ○ (سورۂ آل عمران: ۱۲'۱۳)

"فرما دو کافروں سے' کوئی دم جاتا ہے کہ تم مغلوب ہو گے اور دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بہت ہی برا بچھونا' بے شک تمہارے لئے نشانی تھی دو گروہوں میں جو آپس میں بھڑ پڑے' ایک جتھا اللہ کی راہ میں لڑتا اور دوسرا کافر کہ انہیں آنکھوں دیکھا' اپنے سے دونا سمجھیں اور اللہ ہی اپنی مدد سے زور دیتا ہے جسے چاہتا ہے' بے شک اس میں عقلمندوں کے لئے ضرور دیکھ کر سیکھنا ہے۔"

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قینقاع سے تین تلواریں اور دو زرہیں قبضہ میں لے لیں' ایک کا نام "فِضّہ" اور دوسری کا "سعدیہ" تھا۔ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ تھی جو انہوں نے جالوت کو قتل کرتے وقت پہنی تھی۔ (واللہ اعلم)۔

غزوۂ سویق

(قلت) اسے سویق اس لئے کہا گیا کہ اکثر یہ (ستو) مشرکین کی خوراک تھی' مسلمانوں نے یہ ستو مالِ غنیمت کے طور پر لے لئے تھے کیونکہ ابوسفیان دو سو یا صرف چالیس سوار لے کر نکلا تھا۔ یہ لوگ عریض کے مقام پر پہنچے اور کھجور

کے درخت جلا دیئے' انصار میں سے ایک شخص اور اس کے نوکر کو قتل کر دیا' حضور ﷺ اس کی تلاش میں نکلے' ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے بھاگتے وقت بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ستو کے بورے پھینک دیئے جنہیں مسلمان آتے وقت اُٹھا لائے' اس کے بعد ابوسفیان نے قسم کھا لی تھی کہ جب تک وہ حضرت محمد ﷺ سے لڑائی نہ کرے گا' جنابت سے غسل نہیں کرے گا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور خیال کیا کہ اس کی قسم پوری ہو گئی۔(واللہ اعلم)۔

اسی سال حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے' یہ ماہ ذوالحجہ تھا چنانچہ مدینہ میں سب سے پہلے فوت ہونے والے مہاجر یہی تھے۔پھر اسی سال آپ نے نماز عید پڑھی پھر اسی سال مینڈھے کی قربانی کی اور اسی سال حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہم بستر ہوئے۔

(قلت)علامہ نووی کہتے ہیں کہ ذی الحجہ میں اسی سال حضرت رقیہ بنت رسول رضی اللہ عنہا کا وصال ہوا لیکن اہل سیرت لکھتے ہیں کہ ان کا وصال اسی سال رمضان میں ہوا تھا۔(واللہ اعلم)۔

تیسرا سالِ ہجرت

یہ ہجرت کا تیسرا سال تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کعب بن اشرف سے کون نمٹے؟'' حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا: میں یہ کام کرتا ہوں اور پھر اسے قتل کر دیا۔

(قلت)ابن اشرف' اصل میں عربی تھا' نبھان کے علاقے سے تھا۔ابن اسحاق یہی بتاتے ہیں۔اس کا باپ مدینے میں آیا تو بنونضیر کی مخالفت کی' عزت پائی اور ابوالحقیق کی لڑکی سے شادی کی جن سے کعب پیدا ہوا' بھرے جسم کا شاعر تھا اور واقعۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی برائیاں بیان کرتا رہتا تھا' مکہ کو گیا اور اہل مکہ کو اشعار سنائے' قریش میں سے اہل بدر سے تعلق رکھنے والے مشرک روئے' وہاں وہ مطلب بن ابو وداعہ سہمی کے گھر ٹھہرا' عاتکہ بنت ابوالعیص بن امیہ بیبیں تھی' حسان نے اس کی اور اس کی بیوی عاتکہ کی ہجو کی وہ مدینہ واپس لوٹ آیا اور مسلمانوں کی عورتوں کے حسن کی باتیں کرنے لگا' رسول اللہ ﷺ کی برائی کرتا اور قریش کو آپ کے خلاف بھڑکاتا۔

کہتے ہیں کہ اس نے کھانا تیار کیا اور یہودیوں کو تیار کیا کہ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ دیں' وہ آئے تو انہیں دلیری دکھائی' پھر آپ کو بلا بھیجا تو جبریل نے آپ کو بتایا' آپ واپس تشریف لے گئے اور فرمایا: کعب بن اشرف کا کام کون تمام کرے گا' یہ سن کر محمد بن مسلمہ کچھ ساتھیوں کو لے کر نکلے' اس کے ساتھ حیلہ کیا اور رات کو اسے قتل کر دیا۔یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کو حکم دیا کہ کچھ لوگوں کو لے کر جائے تاکہ اسے قتل کر دیں۔(واللہ اعلم)۔

غزوۃ الکدر

پھر اسی سال آپ نے غزوۃ الکدر میں شرکت فرمائی' حضرت علی بن ابو طالب کرم اللہ وجہہ جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے' کسی سے مقابلہ نہ ہوا اور آپ واپس تشریف لے آئے۔

(قلت) حضور ﷺ اس غزوہ کے لئے تیار ہو کر تشریف لے گئے' حضرت سباع بن عرفطہ کو اپنا نائب بنایا۔ کچھ کہتے ہیں کہ ابن اُمّ مکتوم کو نائب بنایا' آپ کدر کے مقام پر پہنچے اسے "غزوہ قرقرۃ" کہتے ہیں' نجران بھی کہا جاتا ہے۔ کسی سے مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ (واللہ اعلم)۔

غزوۂ انمار

اسی سال غزوۂ انمار کے لئے تشریف لے گئے' دعثور آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آپ درخت کے نیچے سوئے ہوئے ہیں' آپ بیدار ہوئے تو وہ سر پر تلوار تانے کھڑا تھا' کہنے لگا: تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا' اللہ! اس پر اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی' رسول اللہ ﷺ نے پکڑ کر فرمایا: اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون چھڑا سکتا ہے؟ اس نے کہا' کوئی نہیں۔ آپ نے فرمایا: یہاں سے نکل جاؤ' وہ یہ کہتے ہوئے واپس ہوا کہ محمد مجھ سے بہتر ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ہاں' میرا حق یہی ہے۔ بنو غطفان آپ سے ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے۔

غزوۂ ذی امر

(قلـــــت) یہ غزوۂ ذی امر ہے' حاکم نے اسے غزوۂ انمار کا نام دیا ہے' کچھ نے اسے اعرابی غورث نام دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ذات الرقاع میں ہوا تھا' ہو سکتا ہے کہ یہ غزوہ متعدد بار ہوا ہو' ابو حاتم ایک ہی غزوہ قرار دیتے ہیں لہٰذا انہوں نے ذات الرقاع کا ذکر نہیں کیا' کچھ کے نزدیک یہ کھجور کے درختوں میں ہوا لہٰذا انہوں نے اسے ذکر نہیں کیا۔ (واللہ اعلم)۔

غزوۂ القردہ

(قلت) قَرْدَہ' نجد کے چشموں سے ایک چشمہ تھا' قریش جنگ بدر کے بعد اس راستہ پر چلنے سے ڈرتے تھے جس پر چل کر وہ شام کو جاتے تھے' وہ عراق کے راستے پر چلے' ان کے اس لشکر میں ابو سفیان بن حرب تھا' اس کے پاس بہت سی چاندی تھی' یہ ان کی بڑی تجارت کا مال تھا۔ (واللہ اعلم)۔ اس کے بعد غزوۂ اُحد ہوا۔

غزوۂ اُحد

(قلت) جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ غزوۂ اُحد شوال ۳ھ ہجری کو ہوا' چند ایک نے ۴ھ ہجری بتایا ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ شوال کی گیارہ تاریخ کو ہوا' سات تاریخ بھی کہتے ہیں' آٹھ بھی کہتے ہیں' نو بھی کہتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ نصف شوال کو ہوا تھا۔ مالک کہتے ہیں کہ بدر کے ایک سال بعد ہوا۔ اس میں زیادہ وقت بتایا ہے کیونکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ بدر کی جنگ رمضان میں ہوئی تھی تو یہ ایک سال اور ایک مہینہ بھی پورا نہ ہوا تھا لہٰذا مالک نے کہا کہ ہجرت کے اکتیس ماہ بعد ہوا تھا۔

واقعہ اُحد کا سبب یہ تھا کہ جب بدر میں اللہ تعالیٰ نے کفار قریش کو قتل کر دیا اور باقی لوگ واپس مکہ پہنچ گئے' ابو سفیان ان کا تجارتی مال لے کر پہنچا تو قریش نے ابوسفیان اور قافلے میں جن جن لوگوں کا مال تھا' ان سے بات کی کہ تعاون کرو تو ہم نبی کریم ﷺ سے جنگ کرتے ہیں' چنانچہ انہوں نے حامی بھر لی۔

کہتے ہیں کہ ان کا یہ مال پچاس ہزار دینار تھا چنانچہ اس نے قافلہ والوں کو اصل مال واپس کر دیا اور نفع الگ کر لیا' انہیں دینار کے مقابلے میں دینار نفع ہوتا تھا۔ اس نفع سے انہوں نے لشکر کی تیاری شروع کر دی اور اپنے ماتحت قبیلوں کو بھی اس جنگ کے لئے تیار کرنے لگے چنانچہ وہ اپنی اپنی ٹولیاں لے کر نکلے' ان کے تابعدار بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ والے بھی ان کے ساتھ ہو لئے' انہوں نے عورتیں بھی ساتھ لے لیں تاکہ یہ لوگ بھاگ نہ سکیں چنانچہ ابوسفیان (ان کا قائد) ہند بنت عتبہ کو لے کر چلا یونہی دوسرے سربراہوں نے اپنی عورتیں ہمراہ لیں' جبیر بن مطعم نے اپنے غلام وحشی نامی حبشی کو حکم دیا کہ لوگوں کے ساتھ چلے اور اسے کہا کہ اگر تو محمد کے چچا حمزہ کو میرے چچا طعمہ بن عدی کے بدلے قتل کر دے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔

وہ روانہ ہوئے اور مدینہ کے سامنے وادیٔ قناۃ کے پہلو میں عینین پہاڑ کے قریب آ ٹھہرے۔ وادیٔ قناۃ عینین پہاڑ کے پیچھے ہے جو اس کے اور اُحد کے درمیان ہے کیونکہ عینین اُحد کے سامنے تھا چنانچہ وہ مدینہ کی طرف عینین کے سامنے ٹھہر گئے' اس کے مغرب میں بیرِ رومہ تھا لہٰذا یہ مطری کے قول کے خلاف نہیں ہوگا جو آگے آ رہا ہے۔

ابن عقبہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان اپنی جماعت کو لے کر بیر جماوین کی طرف سے نمودار ہوا اور یہ لوگ اس وادی کے درمیان اُترے جو اُحد کی طرف تھی۔

جو مسلمان بدر میں شامل نہ ہو سکے تھے انہیں اس کا افسوس تھا' وہ جنگ کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران حضور ﷺ کو ایک خواب آئی' رات جمعہ کی تھی۔ صبح ہوئی تو فرمایا: رات کو میں نے خواب دیکھی ہے کہ ایک گائے ذبح کر دی گئی' اللہ خیر فرمائے گا' میں نے دیکھا کہ میری تلوار ایک طرف سے ٹوٹ گئی ہے یا فرمایا کہ اسے دندانہ پڑ گیا ہے' یہ میرے خیال میں اچھی نہیں' یہ دونوں مصیبتیں ہیں اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں نے ایک مضبوط زرہ پہن رکھی ہے' پیچھے ایک مینڈھا سوار ہے۔ صحابہ نے تعبیر پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ گائے تو وہ خون خرابہ ہے جو ہمارے درمیان ہوگا (صحابہ شہید ہوں گے) مینڈھا' کبش الکتیبہ ہے (طلحہ بن ابوطلحہ کو کہتے تھے) اور مضبوط زرہ مدینہ ہے لہٰذا رک جاؤ' لوگ اگر گلیوں میں چلے جائیں تو ہم چھتوں کے اوپر سے ان پر تیر برسائیں گے۔

ابنِ اسحاق نے بھی نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی نے کہا' یا رسول اللہ! آپ مدینہ میں ٹھہریں ان کے پاس نہ جائیں' بخدا مدینہ سے جو بھی نکل کر دشمن کے سامنے جائے گا' قتل ہوگا اور جو یہاں آئے گا اسے ہم قتل کر دیں گے لہٰذا انہیں رہنے دیجئے' لیکن صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم عرصہ سے اس دن کی انتظار کر رہے تھے' اکثر صحابہ نے مدینہ سے نکلنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے نماز جمعہ پڑھائی اور واپس تشریف لا کر ہتھیار منگوائے' انہیں پہنا اور دشمن کے مقابلے میں

نکلنے کا اعلان کرا دیا جس پر رائے دینے والوں کو شرمساری ہوئی' انہوں نے عرض کی آپ یہیں ٹھہریں جیسے ہمیں فرمایا ہے۔آپ نے فرمایا کہ ایک نبی جب ہتھیار پہن لیتا ہے تو اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ لڑے بغیر واپس آ جائے چنانچہ آپ اپنے ایک ہزار صحابہ کو لے کر چل پڑے' مشرکین کی تعداد تین ہزار تھی۔علامہ مطری کہتے ہیں کہ مدینہ میں یوم اُحد کو مشرکین کا داخلہ جمعہ کے دن ہوا تھا' وہ مزید بتاتے ہیں کہ ابن اسحاق بدھ کا دن بتاتے تھے۔

مطری کہتے ہیں کہ یہ لوگ وادیٔ عقیق میں رومہ کے مقام پر ٹھہر گئے۔رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں جمعہ پڑھایا اور پھر آپ صحابہ کو لے کر مشرقی حرہ کی طرف چلے جسے حرۂ واقم کہتے تھے' رات شیخین میں گذاری' یہ مدینہ اور جبل اُحد کے درمیان اُحد کو جاتے ہوئے حرہ کے ساتھ مشرقی حرہ پر واقع تھا' پھر ہفتہ کی صبح اُحد کی طرف چلے۔انتہٰی۔

علامہ اقشہری نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین نیزے منگوائے اور ان پر تین جھنڈے باندھے' بنو اوس کا جھنڈا اسید بن حضیر کو دیا' بنوخزرج کا حباب بن منذر بن جموح کو دیا' بعض کا خیال ہے کہ سعد بن عبادہ کو دیا تھا' مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا' کچھ کے خیال میں مصعب عمیر کو دیا تھا۔حضرت عبد اللہ بن اُم کلثوم کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر فرمایا اور پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے' کمان گلے میں لٹکائی اور ہاتھ میں نیزہ پکڑا۔مسلمانوں میں سے سو لوگوں کے پاس زرہیں تھیں' دونوں سعد آگے آگے چلے یعنی سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ' لوگ آپ کی دائیں بائیں جانب تھے۔آپ چلتے ہوئے جب شیخین پہنچے (یہ دونوں قلعے تھے) تو ایک خوبصورت دستہ دیکھا جن سے آواز بلند ہو رہی تھی۔آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ لوگ ابن ابی یہودی کے حلیف ہیں۔آپ نے فرمایا' ہمیں مشرکوں کی مدد کی ضرورت نہیں اور جب وہ باغ شوط تک پہنچے تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھی لے کر الگ ہو گیا۔انتہٰی۔

اکتفاء میں ہے کہ مخیّریق یہودیوں کا عالم تھا' اس نے اس دن یہودیوں سے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ حضرت محمد کی مدد کرنا تم پر لازم ہے' انہوں نے ہفتہ کے دن کا بہانہ کہہ سنایا (کہ اس میں لڑنا حرام ہے) مخیّریق نے کہا: یہاں ہفتہ کا بہانہ نہیں چلے گا پھر اپنی تلوار پکڑی' ہتھیار باندھے اور رسول اللہ ﷺ سے آ ملا' آپ کی طرف سے لڑا اور شہید ہو گیا۔اس نے پہلے کہہ دیا تھا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو میرا مال حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں پیش کر دینا' وہ جیسے چاہیں' اسے استعمال میں لائیں۔حضور ﷺ نے اسی کے بارے میں فرمایا تھا: مخیّریق یہودیوں میں سے بہترین شخص ہے۔انتہٰی۔

طبرانی نے کبیر اور اوسط میں ابو حمید ساعدی کی روایت لکھی کہ نبی کریم ﷺ اُحد کے دن نکلے اور جب ثنیۃ الوداع سے آگے بڑھے تو بہت اچھا لشکر دیکھا۔پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ صحابہ نے عرض کی: یہ عبد اللہ بن ابی ہے جو بنو قینقاع میں سے چھ سو یہودی غلام لئے آ رہا ہے۔پوچھا: کیا یہ مسلمان ہیں؟ عرض کی گئی: نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: انہیں کہہ دو کہ واپس چلے جائیں کیونکہ مشرکین کے خلاف ہم مشرکین سے مدد نہیں لیں گے۔

اقشہری نے اپنی گذشتہ کلام کے بعد لکھا ہے کہ اس مقام (شیخین) پر حضور ﷺ کے سامنے کچھ لوگ آئے'

آپ نے انہیں لوٹا دیا' اس موقع پر حضرت بلال نے اذانِ مغرب دی چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو نماز پڑھائی' رات وہیں گذاری' اس رات پہرے کے لئے پچاس آدمی دے کر حضرت محمد بن مسلمہ کو مقرر کیا جن کا کام یہ تھا کہ لشکر کے گرداگرد چکر لگاتے رہیں' آپ سحری کے وقت میں وہاں داخل ہوئے' مشرکوں کو دیکھ رہے تھے' راستہ دکھانے کے لئے ابوخیثمہ حارثی تھے' وہ بلند مقام تک لے پہنچے' نماز کا وقت ہو چکا تھا آپ نے ہتھیاروں سمت صفیں باندھ کر صحابہ کو نماز پڑھائی۔

اقشہری کہتے ہیں' مجاہد' کلبی اور واقدی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے پیدل اُحد تک پہنچے اور اپنے صحابہ کی صفیں لڑائی کے لئے درست کرنا شروع فرمادیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اُحد کی طرف چلے اور جب باغ شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھی لے کر الگ ہو گیا' ایک اور روایت میں ہے کہ تہائی لشکر کو الگ کر لیا تھا۔ ابن ابی نے آپ پر الزام لگایا کہ انہوں نے دوسروں کی بات مانی ہے' میری نہیں مانی' ابن عقبہ کہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ سات سو آدمی رہ گئے' جب ابن ابی واپس مڑا تو مومنین کے دوگروہوں کے ہاتھ لگا' یہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ تھے (ایک ان سے لڑنا چاہتا تھا اور دوسرا نہیں) علامہ اقشہری لکھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ سات سو لوگ رہ گئے' ساتھ اپنا ایک گھوڑا تھا اور ایک ابو بردہ بن نیار کا تھا۔ (واقدی) لیکن ابن عقبہ کی آئندہ روایت میں مسلمانوں کے ہاں گھوڑے کا ذکر نہیں ہے۔

اکتفاء میں ہے کہ ابن ابی کے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہونے کے بعد آپ چل پڑے اور حرۂ بنو حارثہ اور ان کی اَملاک کے قریب سے گذرے تو فرمایا: کوئی ایسا شخص ہے جو ہمیں قریبی راستے سے لے جا کر دشمن تک اس جگہ پہنچا دے جہاں ہم سے پہلے کوئی نہ پہنچے؟ یہ سن کر ابوخیثمہ نے عرض کی' یا رسول اللہ! میں لئے چلتا ہوں چنانچہ وہ حرۂ بنو حارثہ اور ان کی اراضی کے درمیان سے چلتے ہوئے مربع بن قیظی کے باغ تک چلے گئے۔ یہ شخص منافق اور اندھا تھا' جب اسے حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی آہٹ سنائی دی تو کھڑا ہو گیا اور ان کی طرف مٹی پھینکی اور کہنے لگا: اگر تم رسول اللہ ہو تو میں تمہیں اپنے باغ میں داخل نہیں ہونے دونگا۔ صاحب اکتفاء نے ذکر کیا کہ اس نے مٹی کی مٹھی بھری اور کہنے لگا: واللہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا وار خالی نہیں جائے گا تو میں تمہارے چہرے پر وار کرتا۔ صحابہ اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسے قتل نہ کرو کیونکہ جیسے یہ آنکھوں سے اندھا ہے یونہی دل کا بھی اندھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ آگے چلے اور اُحد کی گھاٹی میں جا اُترے' اُحد آپ کے لشکر کی پشت پر تھا۔ اقشہری نے بھی لکھا ہے کہ اُحد پچھلی طرف تھا اور مدینہ سامنے تھا جبکہ جبلِ عینین بائیں طرف تھا۔ ابن عقبہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اُحد کے نیچے صفین درست کیں جبکہ مشرکین نے شور زمین میں اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔

مشرکین کے گھوڑسواروں پر (جو سو تھے) خالد بن ولید مقرر ہوا تھا' مسلمانوں کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا' مشرکین

کا جھنڈا طلحہ بن عثمان کے ہاتھ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں پر حضرت عبد اللہ بن جبیر کو مقرر فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ القشیری کے مطابق انہیں جبلِ عینین پر مقرر کیا۔ اکتفاء میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے امیر سے فرمایا کہ دشمن کے گھوڑے ہم سے ہٹائے رکھنا' ہماری پچھلی طرف سے آنے نہ پائیں خواہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام' قریش تین ہزار کی تعداد میں تھے' ان کے ہمراہ سو گھوڑے تھے جو انہوں نے ایک طرف کئے تھے چنانچہ لشکر کی دائیں طرف کے گھوڑ سواروں پر خالد بن ولید کو مقرر کیا ہوا تھا اور بائیں طرف عکرمہ بن ابوجہل کو مقرر کیا تھا۔

اوس قبیلہ میں سے ابو عامر راہب مکہ کی طرف نکل گیا تھا' وہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ سے دور کرتا تھا' وہ اپنی قوم کو کہا کرتا تھا کہ اگر وہ اپنی قوم سے ملے گا تو پوری قوم میرے ساتھ ہو جائے گی جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے وہی آگے آیا' وہ مکہ کے غلاموں وغیرہ میں کھڑا تھا' اس نے آواز دی کہ: اے گروہ قریش! میں ابو عامر ہوں۔ انہوں نے کہا: اے فاسق! تیری مراد پوری نہ ہو' حضور ﷺ نے اسے فاسق نام دیا تھا حالانکہ اسے دورِ جاہلیت میں راہب کہتے تھے۔ جب اس نے سنا تو کہنے لگا کہ میرے بعد میری قوم بگڑ گئی ہے پھر شدید لڑائی شروع ہو گئی اور مسلمانوں نے ان پر پتھر برسائے۔ انتہی۔

بزاز نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت کی آپ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے دن اپنی تلوار سامنے کی اور فرمایا: کون ہے جو اس کا حق ادا کرے؟ حضرت ابو دجانہ اُٹھے اور عرض کی یا رسول اللہ! میں لے کر اس کا حق ادا کروں گا آپ نے تلوار انہیں دے دی' چنانچہ وہ نکلے تو میں پیچھے تھا' وہ جس طرف بھی جاتے چیرتے پھاڑتے جاتے اور یوں وہ پہاڑ کے دامن میں عورتوں کے پاس جا پہنچے' ہندہ ان کے ہمراہ تھی اور وہ یہ اشعار گا رہی تھیں:

"ہم (عزت میں) گویا پروین ستارے ہیں' ہم قالینوں پر چلنے والی ہیں' ہماری گردنوں میں موتی ہیں اور مانگ میں ہم نے کستوری لگا رکھی ہے۔
تم آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی اور تمہارے راستے میں فرش لگائیں گی۔ تم پیچھے مڑو گے تو ہم تم سے ایسے دور ہو جائیں گی جیسے رقیب ہوتے ہیں۔"

یعنی وہ اپنے مشرک جنگیوں کو اُبھار رہی تھیں۔ حضرت زبیر کہتے ہیں کہ ابو دجانہ (پہلوان) نے ان پر حملہ کر دیا' انہوں نے کھلے میدان میں آواز دی لیکن کسی نے ان کی فریاد نہ سنی' وہ پیچھے ہٹ گئے تو میں نے پوچھا: میں نے تمہیں تلوار سے وار کرتے دیکھا ہے' میں تعجب کرتا رہا لیکن تم نے عورت کو قتل نہیں کیا۔ ابو دجانہ نے کہا: وہ اس لئے کہ اس نے آواز دی لیکن کسی نے اسے جواب نہیں دیا (بات نہیں مانی) چنانچہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ایسی عورت کو رسول اللہ ﷺ کی تلوار سے قتل کروں جس کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

الاکتفاء میں ہے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ عبد اللہ بن جحش کی تلوار اُحد کے دن ٹوٹ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے کھجور کے گچھے کی لکڑی دے دی جو ان کے ہاتھ میں تلوار بن گئی' وہ اس سے لڑتے رہے' اس تلوار کا نام

عرجون پڑ گیا وہ نسل بہ نسل اب تک چلی آ رہی تھی اور ترکی کی خواہش پر دو سو دینار میں بیچ دی گئی۔

بزاز' بریدہ کی روایت سے کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اُحد کے دن کہا: اے اللہ! اگر محمد حق پر ہے تو اسے زمین میں دھنسا دے چنانچہ حضرت بریدہ کہتے ہیں کہ اسے زمین میں دھنسا دیا گیا۔

ابن اسحاق بتاتے ہیں کہ مشرکوں کے جھنڈا بردار اُحد میں ایک ایک کر کے قتل ہوتے گئے' وہ نو افراد تھے۔ ایک روایت ہے کہ گیارہ تھے جن میں سے آخری بنو طلحہ کا غلام تھا۔

ابن عقبہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے جھنڈا بردار مصعب بن عمیر تھے (بنو عبد الدار کے بھائی بند) انہوں نے طلحہ بن عثمان کو دعوتِ جنگ دی جو بنو عبد الدار سے تھا اور اسے قتل کر دیا پھر مسلمانوں نے مشرکین پر حملہ کر دیا اور انہیں بھگا دیا' ادھر سے مشرکین کے گھوڑ سواروں نے حملہ کیا تو تین مرتبہ انہیں تیر اندازوں نے نشانہ بنایا چنانچہ مسلمان مشرکین کے لشکر میں جا گھسے اور انہیں خوب لوٹا۔ جب مسلمانوں کے تیر اندازوں نے دیکھا تو اپنا مقام چھوڑ دیا اور لشکر میں آ گھسے' خالد اور اس کے ساتھیوں نے انہیں یوں کرتے دیکھا تو گھوڑوں پر سوار ہو کر ان پر حملہ کر دیا اور انہیں چکنا چور کر دیا' اسی دوران کسی نے چلا کر کہا کہ محمد (ﷺ) قتل ہو گئے' اپنے پیچھے دیکھو! اس پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو لاعلمی میں قتل کرنے لگے' ایک گروہ بھاگ کھڑا ہوا اور سب تتر بتر ہو گئے' آپس میں قتل و غارت شروع ہو گئی' جب انہوں نے ہوش سنبھالی تو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ صحیح سلامت ہیں اور ان کے پیچھے سے بلا رہے ہیں چنانچہ کچھ صحابہ بھاگ کر آپ کی طرف آ گئے' آپ گھاٹی میں تھے' آپ اپنے ساتھیوں کو تلاش فرما رہے تھے کہ اس دوران مشرکین سامنے آ گئے' انہوں نے آپ کے چہرہ پر تیر برسا کر خون آلود کر دیا اور سامنے کے دانت مبارک توڑ دیئے' آپ گھاٹی سے اوپر چڑھے' حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ہمراہ تھے' کچھ کہتے ہیں کہ آپ کے ہمراہ انصار کی ایک جماعت تھی جن میں سہل بن بیضاء اور حارث بن صمّہ شامل تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو قتل کئے جا رہے تھے ان کے ناک کان وغیرہ کاٹ رہے تھے' شرمگاہیں کاٹ رہے تھے اور پیٹ چیر رہے تھے' ان کا خیال تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ اور آپ کے اکابر صحابہ کو قتل کر دیا ہے چنانچہ اسی بنا ابوسفیان نے بڑے فخر سے کہا: اُعْلُ هُبَلْ (ھبل اونچے ہو جاؤ) جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں نعرہ بلند کیا اَللّٰهُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ (اللہ تعالیٰ اعلیٰ اور بہت عزت والا ہے) مشرکین کو اپنے سامان کی فکر پڑی تھی۔

رسول اللہ ﷺ اور قتلِ اُبَی

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ شکست اور آپ کے بارے میں قتل کی خبر مشہور ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ کو حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے پہچانا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ آنکھوں سے پہچان لیا جو خود کے نیچے روشن دکھائی دے رہی تھیں چنانچہ میں نے زور دار آواز لگائی کہ اے مسلمان ساتھیو! خوشیاں مناؤ' ادھر دیکھو رسول اللہ ﷺ تو یہ موجود ہیں' اس پر آپ نے اشارہ فرمایا کہ چپ رہو' مسلمانوں کو آپ کے بارے میں علم ہوا تو بھاگ

کر آپ کی طرف آئے' حضور ﷺ ان کے ساتھ ہو لئے' حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت حارث بن صمہ اور بہت سے مسلمان ہمراہ تھے۔ جب آپ گھاٹی کی طرف ہوئے تو ابی بن خلف نے انہیں پا لیا' وہ کہہ رہا تھا: محمد کہاں ہیں' اگر بچ گئے ہیں تو نہ بچیں' صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی اس کا کام تمام نہ کر دے؟ فرمایا' رہنے دو اور جب وہ قریب ہوا تو آپ نے حارث بن صمہ سے نیزہ پکڑا' ایک دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا: جب آپ نے نیزہ پکڑا تو وہ آپ کے سامنے آیا' آپ نے اس کی گردن پر نیزہ مارا تو وہ گھوڑے سے کئی بار دائیں بائیں جھکتا ہوا نیچے آ گرا۔ یہ ابی بن خلف مکہ میں آپ سے ملاقات پر کہتا تھا کہ ''اے محمد! میرے پاس ایک گھوڑا ہے جسے روزانہ آٹھ دس سیر جوار کھلاتا ہوں' میں اس پر بیٹھ کر تمہیں قتل کروں گا۔'' آپ فرماتے کہ انشاء اللہ تجھے میں ہی قتل کروں گا چنانچہ جب وہ قریش کے پاس گیا' اس کی گردن میں کوئی زیادہ زخم نہیں تھا البتہ خون بہہ رہا تھا' کہنے لگا کہ واللہ! محمد نے مجھے قتل کیا ہے۔ انہوں نے کہا واللہ! تمہارا دل قابو میں نہیں رہا' یہ زخم تو معمولی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ انہوں نے مکہ میں مجھے کہا تھا کہ تجھے میں قتل کروں گا' بخدا اگر یہ مجھ پر تھوک بھی دیں گے تو مر جاؤں گا چنانچہ جب اسے مکہ کی طرف لے جا رہے تھے تو راستے ہی میں ''سرف'' کے مقام پر مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دن فرمایا تھا: اس شخص پر اللہ کا عذاب سخت ہے جسے اللہ کے رسول نے قتل کر دیا ہے۔ اہلِ دوزخ اللہ کی رحمت سے دور رہیں گے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' فرماتی ہیں: اُحد کے دن مشرکین کو واضح شکست ہوئی تو ابلیس چیخ اُٹھا کہ اپنے پیچھے دیکھو چنانچہ ان کے پہلے پچھلوں کی طرف پلٹے اور لڑنے لگے حذیفہ نے نظر اُٹھائی تو اچانک باپ کو دیکھا چنانچہ آواز دی' میرے باپ کو بچاؤ۔ آپ فرماتی ہیں کہ انہوں نے دیر نہیں کی اور اسے قتل کر دیا' حذیفہ نے کہا' اللہ تمہاری بخشش فرمائے۔

اقشہری نقل کرتے ہیں کہ اس دن ابوسفیان نے حرب کے بنوعبد الدار سے کہا: تم لوگوں نے بدر کے دن جھنڈا ضائع کر دیا تھا جس کی وجہ سے جو کچھ ہوا سو ہوا تم نے دیکھ ہی لیا لہٰذا اَب جھنڈا ہمیں دے دو' ہم سنبھال لیں گے۔ اس کا مقصد انہیں جنگ کے لئے اُبھارنا تھا اور انہیں ثابت قدم کرنا تھا' اس پر وہ غصہ میں آ گئے اور اسے برا بھلا کہا۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ مشرکین کا جھنڈا کس کے پاس ہے؟ تو بتایا گیا کہ بنوعبد الدار کے پاس ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کام ہمارے کرنے کا ہے' مصعب بن عمیر کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ! حاضر ہوں' فرمایا: جھنڈا پکڑ لو چنانچہ جھنڈا انہیں دیدیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عثمان بن طلحہ پر حملہ کیا جو مشرکین کا جھنڈا اُٹھائے تھا' اس کے ہاتھ کاٹ دیئے اور مونڈھے سے ازار بند تک کاٹ ڈالا چنانچہ ان کے جھنڈا بردار یکے بعد دیگرے قتل ہوتے گئے' مشرکین کی شکست واضح ہو چکی تھی' ان کی عورتیں بددعائیں کر رہی تھیں' مسلمان ان پر ہتھیار چلا رہے تھے' انہوں نے مالِ غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔

جب تیر انداز مسلمانوں نے دیکھا تو ان کی ایک جماعت آگے بڑھی اور پہاڑ کا درہ خالی کر دیا چنانچہ خالد نے

ساتھیوں کی مدد سے دوبارہ حملہ کر دیا' عکرمہ بھی اس کے پیچھے تھا' انہوں نے باقی تیر اندازوں پر حملہ کر دیا اور انہیں قتل کر دیا نیز ان کے امیر عبد اللہ بن جبیر کو بھی قتل کر دیا۔ اب مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور ابلیس نے چلا کر کہا کہ محمد قتل ہو گئے حالانکہ آپ اپنے مقام پر ثابت قدم تھے' تیر کمان سے تیر برسا رہے تھے جن سے وہ بکھر گئے نیز آپ پتھر برسا رہے تھے' آپ کے ساتھ چودہ افراد کا ایک جتھا تھا' یہ سب مہاجرین تھے ان میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے اور ان کے علاوہ سات انصار بھی تھے اھ۔

امام نسائی کہتے ہیں کہ حضرت جابر نے بتایا: جب اُحد کے دن لوگ پیچھے بھاگے تو حضور ﷺ بارہ انصاریوں میں موجود تھے جن میں طلحہ بھی تھے۔

طبرانی میں سدی سے ہے کہ اس دن صحابہ بکھر گئے چنانچہ کچھ تو مدینہ کو چلے گئے' کچھ پہاڑ پر چڑھ گئے لیکن رسول اللہ ﷺ ثابت قدم تھے اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہے تھے۔ ابن قمیئہ نے آپ کو پتھر مارا جس سے ناک مبارک زخمی ہوا اور سامنے کے رباعیا دانت شہید ہو گئے' چہرہ پر زخم آیا جس نے آپ کو بوجھل کر دیا چنانچہ تیس صحابہ پلٹ کر آپ کے پاس آئے اور آپ کا دفاع کرنے لگے' طلحہ اور سہل بن حنیف نے حملہ کیا' طلحہ نے تیر پھینکا تو اس کا ہاتھ سوکھ گیا۔ پہاڑ کی طرف بھاگنے والے ایک شخص نے کہا: کاش کوئی ابن ابی کے پاس جانے والا ہوتا جو ابو سفیان سے ہمیں امن لے دیتا' اس پر انس بن نضر نے کہا: اے قوم! اگر محمد زندہ نہیں رہے تو ان کا خدا تو یقیناً زندہ ہے' وہ تو قتل نہیں ہوا چنانچہ وہ پہلے کی طرح لڑائی کرتے رہے اور پھر اس کے قتل کا قصہ بیان کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پہاڑ پر جانے کا ارادہ کیا تو آپ کے ایک صحابی نے آپ کو تیر مارنے کا ارادہ کیا جس پر آپ نے بتایا کہ میں تو رسول اللہ ہوں۔ مسلمانوں نے جب سنا تو وہ بہت خوش ہوئے' آپ کے اردگرد جمع ہوئے اور اسی دوران دوسرے لوگ بھی پلٹ آئے۔

حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا: اُحد کے دن میں نے حضور ﷺ کی دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے جن کے لباس سفید تھے اور وہ آپ کی طرف سے شدید لڑائی کر رہے تھے جنہیں نہ تو میں نے اس سے قبل دیکھا اور نہ ہی بعد میں دیکھا تھا (بخاری و مسلم) مسلم شریف میں ہے کہ وہ جبریل اور میکائیل علیہما السلام تھے لیکن مجاہد کہتے ہیں کہ فرشتے نہ تو اس دن لڑے' نہ ہی اس سے قبل اور نہ ہی بعد میں البتہ یوم بدر پر خوب لڑے تھے۔ علامہ بیہقی کہتے ہیں کہ جب قوم اس دن حضور ﷺ کے فرمان پر عمل نہ کر سکی تو فرشتے ان کی طرف سے نہ لڑے کیونکہ لوگوں نے آپ کے فرمان پر عمل نہ کیا تھا۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کی بناء پر مسلمانوں سے وعدہ فرمایا تھا کہ پانچ ہزار نشان والے فرشتوں کے ذریعے ان کی مدد فرمائے گا اور اس نے یہ وعدہ پورا فرما دیا لیکن جب انہوں نے حکم رسول ماننے میں کوتاہی کی' اپنا ٹھکانہ چھوڑ دیا' تیر اندازوں نے عہد توڑ دیا اور دنیوی مال کا لالچ کیا تو اللہ تعالیٰ

نے ان سے فرشتوں کی مدد روک دی' اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۝ (سورۂ آل عمران: ۱۵۲)

''اور بے شک اللہ نے تمہیں سچ کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کرتے تھے۔''

چنانچہ اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور انہیں فتح ہوتے دکھا دی لیکن جب وہ کوتاہی کر بیٹھے تو فتح کے بعد مصیبت نازل ہو گئی۔

ابن سعد کے مطابق حضور علیہ السلام کے ہمراہ سات انصار اور سات قریش رہ گئے تھے۔ اور مسلم شریف میں حضرت انس سے ہے کہ آپ سات انصاریوں اور قریش کے دو آدمیوں طلحہ اور سعد کے درمیان رہ گئے تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اُحد کے دن نبی کریم علیہ السلام کے سامنے والے رباعیا دانت مبارک ٹوٹ گئے اور چہرہ پر زخم آیا' چہرے سے خون بہہ رہا تھا' آپ پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: ایسی قوم کیونکر نجات حاصل کر سکتی ہے جنہوں نے ربّ کی طرف بلانے والے اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگ دیا' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ۝ (سورۂ آل عمران: ۱۲۸)

''یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں۔''

ابن اسحاق کے مطابق حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اپنے بھائی عتبہ کے علاوہ کسی شخص کے قتل کی حرص پیدا نہیں ہوئی اور اس کی وجہ وہ کردار تھا جو اس نے حضور علیہ السلام کے بارے میں انجام دیا۔

ابن ہشام حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ عتبہ بن ابو وقاص (سعد کے بھائی) ہی وہ شخص تھا جس نے آپ کے رباعیا نچلے دانت مبارک توڑے تھے' عبداللہ بن شہاب نے آپ کے چہرے پر زخم لگایا تھا' عبداللہ بن قمیہ نے آپ کے رخسار پر زخم کیا تھا چنانچہ خود کے دو گول ٹکڑے رخسار مبارک میں چبھ گئے تھے' حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ چہرے مبارک سے خون چوس لیا تھا اور نگل گئے تھے جس پر آپ نے فرمایا تھا کہ دوزخ تمہیں کچھ نقصان نہ دے سکے گا۔

حضور علیہ السلام کی ایذاء رسانی پر کفار کو مصائب

ابو امامہ کہتے ہیں کہ ابن قمیہ نے اُحد پر رسول اللہ علیہ السلام کو تیر مارا تو آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا اور دانت مبارک ٹوٹ گئے' اس پر اس نے کہا: یہ پکڑ لو میں ابن قمیہ ہوں! رسول اللہ علیہ السلام نے چہرۂ انور سے خون پونچھتے ہوئے فرمایا: اللہ تمہیں ذلیل کرے' تمہیں کیا ہو گیا ہے! اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑی ہرن مسلّط کر دیا جس نے اس کے ٹکڑے کر دئے۔

علامہ سہیلی کہتے ہیں کہ جس شخص نے آپ کے دانت توڑے' وہ سعد کا بھائی عتبہ تھا' اس کی نسل میں سے جو بھی

بچہ سوجھ بوجھ والا ہوتا تو اس کے منہ سے بدبو آتی یا دانت ہی نہ ہوتے اور یہ چیز اس کی اولاد کے لئے پہچان بن گئی۔

ابن جوزی بحوالہ محمد یوسف فریابی کہتے ہیں' انہوں نے بتایا کہ جس نے آپ کے دانت مبارک شہید کئے ان کی اولاد میں جو بچہ بھی ہوتا' اس کے رباعیا دانت نہ اُگتے۔

مسلمانوں کی شکست کا ایک سبب

کہتے ہیں' مسلمانوں کو شکست اس بناء پر ہوئی کہ ابن قمیئہ لیثی نے حضرت مصعب بن عمیر کو قتل کیا تھا' وہ جب ہتھیار پہن لیتے تو نبی کریم علیہ السلام کی طرح دکھائی دیتے' اس نے قتل کے وقت یہ خیال کیا کہ محمد کو قتل کر دیا ہے چنانچہ وہ قریش کے پاس آیا تو بتایا کہ اس نے محمد کو قتل کر دیا ہے' ان میں دلیری پیدا ہو گئی اور شیطان چیخ اُٹھا کر محمد قتل ہو گئے۔ مسلمانوں نے سنا تو وہ بکھر گئے اور شکست سے دوچار ہوئے اور کوئی کسی کی حفاظت نہ کر سکا لیکن اصل بات یہ ہے کہ شکست کا سبب تیر اندازوں کی حکم عدولی تھی اور یہ بات اسی چیز کی تائید تھی جبکہ اس معاملہ میں (ارادۂ الٰہی کے علاوہ) اصل یہ بات تھی کہ انہوں نے بدر میں فدیہ لے کر کافر چھوڑ دئے تھے چنانچہ ترمذی نسائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ جبریل امین اُترے اور کہنے لگے کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار دے دیجئے' قتل کر لیں یا فدیہ لے لیں' انہوں نے کہا کہ ہم فدیہ لیتے ہیں' کہتے ہیں کہ اس کی دلیل موجود ہے کیونکہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے صحابہ نے بدر کے دن یہ تکلیف اُٹھائی کہ ان کے ستر افراد شہید اور ستر ہی قیدی بنے' اس میں یہ بھی ہے کہ مشرکین نے اُحد کے دن مسلمانوں کے ستر افراد قتل کئے چنانچہ حدیثِ براء کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم اس دن مشرکین سے لڑے' حضور علیہ السلام نے تیر اندازوں کی ایک جماعت بٹھائی تھی جن پر عبد اللہ بن زبیر کو امیر مقرر کیا تھا' انہیں فرمایا تھا کہ یہاں سے ہلنا نہیں' اگرچہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں پھر بھی تم یہیں رہنا اور اگر یہ معلوم ہو کہ ہم شکست کھا رہے ہیں تو ہماری مدد کو نہ آنا لیکن ہم جب لڑے تو بھاگ گئے' میں نے دیکھا کہ ان کی عورتیں کپڑے اُٹھائے بھاگی جا رہی تھیں' پنڈلیاں ننگی تھیں اور پازیب نظر آ رہے تھے' مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا' غنیمت غنیمت! اس پر عبد اللہ نے کہا' حضور علیہ السلام نے عہد لیا تھا کہ یہ جگہ نہ چھوڑنا لیکن وہ نہیں مانے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے موڑ دئے چنانچہ ستر لوگ قتل ہو گئے۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ذریعے بدر کے قصے میں حضرت عمر سے روایت ملتی ہے کہ فرمایا: اُحد کا دن آیا تو مسلمانوں کے ستر افراد قتل ہوئے اور وہ بھاگے' نبی کریم علیہ السلام کے رباعیا دانت مبارک ٹوٹ گئے' سرِ انور پر خود کا حلقہ چبھ گیا اور خون بہہ کر چہرے پر آ گیا چنانچہ یہ آیت اُتری:

أَوَلَمَّآ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا ۝ (سورۂ آل عمران: ۱۶۵)

"کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچے کہ اس سے دوگنی تم پہنچا چکے ہو۔"

رباعیا دانت سے مراد وہ دانت مبارک ہے جو ثنایا سفلیٰ اور ناب کے درمیان تھا' اس کا کچھ حصہ ٹوٹا تھا' جڑ سے نہیں اکھڑا تھا۔ مسلم شریف میں ہے کہ ''مسلمان بھاگے'' اس کا مطلب ہے کچھ لوگ بھاگے تھے یا ان کے بھاگنے کا مقصد ہے کہ وہ بکھر گئے اور ان کے تین گروہ ہو گئے' ایک گروہ تو وہ تھا جو شکست کھا کر مدینہ کے قریب گئے اور پھر جنگ ختم ہونے پر بھی واپس نہیں لائے' یہ چند لوگ تھے' انہی کے بارے میں یہ آیت اُتری:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ۝ (سورۂ آل عمران: ۱۵۵)

''بے شک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔''

ایک گروہ وہ تھا جو حضور ﷺ کے قتل کا سن کر حیران ہو گیا' آخر انہوں نے سوچا کہ اپنا بچاؤ کریں یا۔آپ کی امداد کی بناء پر لڑائی جاری رکھیں تا آنکہ قتل ہو جائیں' یہ لوگ اکثر تھے اور ایک گروہ وہ تھا جو آپ کے ساتھ تھا اور پھر دوسرے گروہ میں تھوڑے تھوڑے لوگ یہ سن کر واپس آتے گئے کہ آپ زندہ ہیں۔رہا گنتی کا فرق تو اس بارے میں جس نے موقع پر جو دیکھا' بیان کر دیا۔

ابو یعلیٰ کی طرف سے حضرت عمر کی گذشتہ حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ جب اُحد کا دن آیا تو انہیں بدر کے دن فدیہ لینے کی وجہ سے سزا ملی چنانچہ ان میں سے بھی ستر افراد مارے گئے۔

الاکتفاء میں ہے کہ جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے جھنڈا حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو پکڑا دیا چنانچہ وہ سمیت لڑنے لگے' جب لڑائی سخت ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ اس دن انصار کے جھنڈے تلے تشریف لے گئے اور حضرت علی کو پیغام بھیجا کہ جھنڈا آگے لے چلیں' وہ آگے بڑھے اس نے کہا میں ابو القصم ہوں' انہیں ابو سعد بن ابو طلحہ نے آواز دی کہ اے ابو القصم! کیا تمہیں کو مبارزہ (جنگی دعوت) کرنے کی ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں چنانچہ انہوں نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلان کیا اور پھر ایک دوسرے سے دو دو ہاتھ کیئے' حضرت علی نے اسے ضرب لگائی اور پچھاڑ دیا' پھر واپس مڑ آئے اور قتل کی کوشش نہ کی' ساتھیوں نے پوچھا کہ قتل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا' میں اس کی بے پردگی کی وجہ سے ہٹ گیا ہوں' ذی محرم ہونے کا لحاظ آ گیا اور میرے دل میں آیا کہ اللہ نے اسے مار دیا۔کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابو وقاص وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے (ابو سعد) قتل کیا تھا۔

طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ حضرت علی' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور کہا' یہ لو تلوار' یہ برے شخص کی نہیں ہے' نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔تم اچھی طرح لڑتے ہو تو حضرت سہل بن حنیف اور ابو دجانہ بن حرشہ بھی اچھی جنگ لڑتے ہیں۔

الاکتفاء میں خود کے دو ٹکڑوں کا آپ کے رخسار میں چبھ جانے کا ذکر ہے اور پھر آپ اس گڑھے میں گرے جسے ابو عامر راہب نے اس لئے کھدوایا تھا کہ بے علمی میں مسلمان اس میں گر جائیں' اسی وقت حضرت علی نے ہاتھ

مبارک پکڑا اور طلحہ نے اُٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا جبکہ حضرت ابوسعید خدری کے والد آپ کے چہرۂ پاک سے خون چوس لیا تھا' حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے دو حلقوں میں سے خود کا ایک حلقہ رخسار سے نکال دیا جس سے آپ کا دانت مبارک گر گیا پھر دوسرا نکالا تو دوسرا دانت بھی گر گیا۔ حضرت سعد بن ابو وقاص نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں تیر چلائے' سعد کہتے ہیں کہ میں تیر چلاتا تو آپ مجھے اور تیر پکڑاتے وقت فرماتے: میرے ماں باپ تم پر قربان' چلاتے جاؤ!

اسی دن حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ نکل گئی تو رسولِ اکرم ﷺ نے دستِ مبارک سے اُسے وہیں رکھ دیا چنانچہ وہ دونوں آنکھوں میں سے خوبصورت دکھائی دینے لگی' عبد الرحمٰن بن عوف کے منہ میں تکلیف تھی تو اسے درست فرما دیا اور پھر بیس سے زیادہ ہی زخم تھے جن میں سے ایک پاؤں میں تھا آپ نے اس کا علاج کیا۔

جب حضور ﷺ گھاٹی تک پہنچے' صحابہ کرام ہمراہ تھے' آپ ابھی گھاٹی ہی میں تھے کہ قریش کی طرف سے آواز بلند ہوئی کہ ''پہاڑ کا دھیان کرو'' اس پر آپ نے کہا: الٰہی! انہیں ہم پر غالب نہیں آنا چاہئے' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور آپ کے مہاجر ساتھی لڑنے لگے اور لڑتے لڑتے انہیں پہاڑ سے نیچے گرا دیا' حضور ﷺ ایک پتھر اُٹھانے لگے تو ہمت نہ ہو سکی' بدن بوجھل ہو گیا تھا' زرہیں دو تھیں' اتنے میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ نیچے بیٹھے اور آپ کو اپنے پر سوار کر کے اس پر بٹھا دیا جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طلحہ جنتی ہو گئے۔ اس دن آپ نے بیٹھ کر نماز ظہر پڑھی کیونکہ آپ کو زخم لگا تھا جبکہ مسلمانوں نے بھی آپ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی تھی۔

صحیح بخاری میں حدیث براء میں ہے کہ ابوسفیان نے (واپس مڑتے وقت) کہا تھا: ''ہمارا عزّیٰ ہے تمہارا نہیں ہے'' اس پر آپ نے فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ نے عرض کی' کیا جواب دیں؟ تو فرمایا: کہو ''ہمارا آقا تو اللہ ہے' تمہارا آقا کوئی نہیں۔''

اسی میں یہ بھی ہے کہ اُحد کے دن ابوسفیان نے اوپر سے دیکھ کر کہا: ''کیا محمد قوم میں موجود ہے؟'' آپ نے فرمایا: جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس نے پھر آواز دی: ''کیا ابو قحافہ موجود ہے؟'' فرمایا: جواب نہ دو۔ اس نے پھر پوچھا کہ ''کیا ابن الخطاب ہے؟'' جب اسے کسی نے جواب نہیں دیا تو کہنے لگا: لگتا ہے کہ یہ سب قتل ہو گئے ہیں کیونکہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ برداشت نہیں کر سکے چنانچہ فرمایا: اے دشمنِ خدا! جھوٹ بک رہے ہو' اللہ تعالیٰ نے تمہاری ذلت کا سامان کر رکھا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر نے ابوسفیان کو جواب دے دیا تو وہ کہنے لگا: عمر! ادھر آؤ' حضور ﷺ نے عمر سے فرمایا: دیکھو تو سہی' کتنے پانی میں ہے' آپ گئے تو ابوسفیان کہنے لگا: عمر! میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں سچ بتاؤ کہ ہم نے محمد کو قتل کر دیا ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا: نہیں تو! اس وقت وہ تمہاری گفتگو سن رہے ہیں۔ اس نے کہا: تم میرے نزدیک ابن قمیئہ سے زیادہ سچے اور نیک ہو۔ پھر کہنے لگا: آج کا دن بدر کے دن کا جواب سمجھو' بخدا میں نہ اس پر راضی ہوں اور نہ ہی خوش' نہ ہی میں نے حکم دیا اور نہ ہی روکا۔

جب ابوسفیان اور اس کے ساتھی واپس ہونے لگے تو اس نے آواز دی: آئندہ سال موسمِ بدر میں تمہارا ہمارا مقابلہ رہا۔ حضورﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اسے کہہ دو کہ ہمیں تمہارا یہ چیلنج قبول ہے۔

پھر رسول اللہﷺ نے حضرت علی سے فرمایا کہ ان لوگوں کے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اگر وہ گھوڑوں کو الگ رکھ کر اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں تو سمجھ لینا کہ وہ مکہ کو جا رہے ہیں اور اگر گھوڑوں پر سوار ہو کر اونٹوں کو ساتھ لئے چلتے ہیں تو مدینے جانے کا ارادہ ہوگا۔ بخدا اگر وہ مدینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں ان کے پیچھے چلتا ہوں اور ان کا مقابلہ کروں گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ گئے تو دیکھا کہ وہ گھوڑوں کو ساتھ لئے اونٹوں پر سوار ہیں اور مکہ کی طرف رُخ کئے ہوئے ہیں۔

لوگ مقتولوں کو دیکھ کر گھبرائے اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں پھیل گئے۔ پانچویں باب کی چھٹی فصل میں ان کے بارے میں تفصیل آ رہی ہے۔ مسلمان اپنے مقتول لوگوں کو دیکھ کر روتے تھے اور منافق خوش ہوتے تھے' یہودیوں کا کھوٹ کھل چکا تھا اور منافق ہر طرف دکھائی دیتے تھے۔

جنگ اُحد میں حکمتیں

علماء کہتے ہیں کہ جنگ اُحد میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

☆ ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کو بتانا مقصود تھا کہ برائی کی اخیر بری ہوتی ہے اور روکے ہوئے کام کرنے میں شامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ تیر اندازوں سے یہ کوتاہی ہو گئی تھی۔

☆ خود انبیاء علیہم السلام کی آزمائشیں ہوتی رہی ہیں جس میں آخرکار وہی کامیاب ہوتے ہیں۔

☆ منافق ظاہر ہو گئے اور مسلمانوں کو پتہ چل گیا تھا کہ دشمن ان کے اندر بھی ہو سکتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے جنت میں وہ انعامات رکھے ہیں جو عمل کرنے سے نہیں مل سکتے' اسی وجہ سے یہ جنگ ان انعامات تک پہنچنے کا سبب بنا دی۔

☆ ایک یہ کہ شہادت کا مرتبہ اللہ کے دوستوں کا اعلیٰ مرتبہ ہوتا ہے چنانچہ انہیں رسول اللہﷺ کے سامنے شہید ہونے کا موقع عطا فرمایا کہ رسول اللہﷺ خود ان کی شہادت کی گواہی دے سکیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُحد کی عظمت بتانے کے لئے قرآنِ کریم میں سورۂ آلِ عمران کے اندر ساٹھ آیتیں نازل فرمائیں۔

ابن ابی حاتم' حضرت مسعود بن مخرمہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا' میں نے عبد الرحمٰن بن عوف سے کہا کہ مجھے یومِ اُحد پر اپنے ساتھ بیتے واقعات تو بتلاؤ تو انہوں نے کہا: سورۂ آل عمران میں ایک سو بیس آیتیں پڑھ لو' سب

کچھ پتہ چل جائے گا جو یہاں سے شروع ہوتی ہیں:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (تا) اَمَنَةً نُّعَاسًا

(سورۂ آل عمران: ۱۲۱ تا ۱۵۴)

ابوعزّہ جمحی کا قتل

واقعۂ اُحد کے بعد رسول اللہ ﷺ دشمن کو ڈرانے کی غرض سے نکل کر حمراء الاسد تک تشریف لے گئے' اسی دوران ابوعزہ جمحی سامنے آ گیا' حضور ﷺ نے بدر کے دن اس پر یہ احسان فرمایا تھا کہ فدیہ لئے بغیر چھوڑ دیا تھا اور اس سے قسم لے لی تھی کہ کسی اور کو نہ بتائے وہ شاعر تھا' صفوان بن امیہ نے اسے کہا' تم شاعر ہو لہٰذا زبان ہی سے ہماری مدد کرو' وہ مجبور کرتا رہا اور آخر کار یہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ جب حضور ﷺ نے اسے پکڑا تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے چھوڑ دیجئے' فرمایا: بخدا اب تم مکہ نہیں دیکھ پاؤ گے' تم کہتے ہو کہ میں نے محمد کو دو مرتبہ دھوکے میں رکھا' پھر حضرت زبیر سے فرمایا کہ اس کی گردن اُڑا دو چنانچہ انہوں نے اُڑا دی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اسے فرمایا تھا: مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ ڈنگ نہیں کھایا کرتا'' اسے عاصم بن ثابت اس کی گردن اُڑا دو چنانچہ انہوں نے اُڑا دی۔

شراب حرام کر دی گئی

اسی سال میں شراب خوری حرام کر دی گئی' یہ بھی کہتے ہیں کہ آئندہ سال حرام ہوئی' حضرت حافظ ابن حجر کہتے ہیں' لگتا یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر ۸ھ میں حرام ہوئی۔

اسی سال حضور ﷺ نے حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا' صحیح یہ ہے کہ شعبان میں ہوا تھا' یہ بھی کہتے ہیں کہ آئندہ سال ہوا تھا جبکہ حضرت زینب بنت خزیمہ اُم المساکین سے رمضان میں نکاح ہوا تھا' وہ آپ کے پاس دو یا تین ماہ ٹھہریں یا آٹھ ماہ تک ٹھہریں اور پھر وصال فرما گئیں۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ولادت بھی اسی سال نصف ماہ رمضان میں ہوئی اور اس کے پچاس راتیں بعد آپ کی والدہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حاملہ ہوگئیں۔

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ واللہ اعلم۔

چوتھا سالِ ہجرت

اس سال کے ماہ محرم میں واقعۂ بیرِ معونہ پیش آیا۔

(قلت) بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بنو رعل' ذکوان' عصیّہ اور

بنولحیان آئے' ظاہر کیا کہ وہ مسلمان ہیں' انہوں نے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے مدد مانگی چنانچہ حضور ﷺ نے اس غرض سے ستر انصاری روانہ فرما دیئے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ انہیں ہم ''قراء'' کہتے تھے۔ دن کو وہ لکڑیاں اکٹھی کرتے اور رات کو نوافل پڑھتے' وہ انہیں لے چلے۔ جب بئر معونہ پر پہنچے تو دھوکے سے انہیں قتل کر دیا چنانچہ رسول اکرم ﷺ مہینہ بھر رعل' ذکوان اور بنولحیان کے لئے دعاءِ تباہی فرماتے رہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ امداد مانگنے والوں نے اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ ان کا حضور ﷺ سے معاہدہ تھا' قاتل کوئی اور تھے البتہ ان کی قوم ہی سے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں یہی ہے۔ ابن اسحاق نے المغازی میں اور یونہی موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب کے ذریعے دونوں گروہوں کے نام بتائے تھے نیز یہ بتایا ہے کہ معاہدہ والے لوگ بنو عامر تھے جن کا رئیس ابو براء عامر بن مالک بن جعفر تھا جو مُلَاعِبُ الْاَسِنّہ (برچھیوں سے کھیلنے والا) کہلاتا تھا جبکہ دوسرا گروہ بنوسلیم سے تھا۔ عامر نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ سے دھوکے کی ٹھانی اور بنو عامر کو ان کے قتل کی دعوت دی' وہ رُک گئے اور کہنے لگے کہ ہم ابو براء کی ضمانت نہیں توڑیں گے' اس پر بنوسلیم میں سے بنوعصیہ اور بنو ذکوان کو اس نے چلا کر بلایا تو انہوں نے بات مان لی اور صحابہ کو قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد عامر بن طفیل کی اس حرکت پر افسوس کرتے ہوئے ابو براء فوت ہو گیا' یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ابو براء مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ لڑتے لڑتے قتل ہو گئے جبکہ عامر بن طفیل عرصہ تک زندہ رہا اور حضور ﷺ کی دعاءِ تباہی کی وجہ سے کافر ہی مر گیا' اسے گویا اونٹوں کی طاعون والی بیماری لگ گئی تھی۔

یہ سب قاری حضرات انصار میں سے نہ تھے بلکہ کچھ مہاجرین میں سے بھی تھے جیسے حضرت ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ' نافع بن ورقاء خزاعی وغیرہ۔ اس کا ثبوت بھی صحیح بخاری سے ملتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

پھر صفر میں ''غزوۃ الرجیع'' واقع ہوا۔

غزوۂ الرجیع

(قلت) ابن اسحاق نے اسے تیسرے سال بئر معونہ کے واقعہ سے قبل بتایا ہے' رجیع ھذیل کے علاقے میں ایک مقام کا نام ہے۔ (واللہ اعلم)۔

اس کے بعد غزوۂ بنونضیر ہوا تھا۔

غزوۂ بنونضیر

(قلت) بعض نے یہ غزوہ اُحد سے قبل ۳ھ ہجری میں بیان کیا ہے' زہری کہتے ہیں کہ واقعۂ بدر کے ۶ھ بعد احد سے پہلے واقع ہوا تھا۔ ابن اسحاق نے اسے ۴ھ ہجری میں واقعۂ بیر معونہ کے بعد بتایا ہے۔

اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دیت کے سلسلے میں بات کرنے بنونضیر کے پاس تشریف لے

گئے اور ان کی ایک دیوار کی طرف بیٹھے' انہوں نے آپس میں سکیم بنائی اور عمرو بن جحاش سے کہا کہ اوپر چڑھ کر آپ پر پتھر لڑھکا دے۔آپ کو آسمانی اطلاع ہو گئی چنانچہ کسی غرض کے بہانے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے صحابہ سے فرمایا کہ چلے چلو اور پھر تیزی سے مدینہ واپس تشریف لے آئے پھر ان سے لڑنے کا حکم دیا اور ساتھیوں کو وہیں رہنے کا فرمایا نیز حکم دیا کہ وہاں کی کھجوریں کاٹ کر جلا دیں۔ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ نے چھ راتوں تک ان کا محاصرہ کئے رکھا' انہوں نے درخواست کی کہ انہیں جلا وطن کر دیں اور اتنا مال لے جانے دیں جو ان کے اونٹوں پر لادا جا سکے چنانچہ اس بات پر صلح ہو گئی۔پھر خیبر اور شام کی طرف چلے گئے۔باقی مال صرف حضورﷺ کو پیش کر دیا گیا۔

ابن اسحاق نے یہ واقعہ بیان کر کے بڑے بڑے اہلِ مغازی سے اتفاق کیا ہے' اس سلسلے میں سب سے صحیح روایت ابن مردویہ کی ہے کہ ان لوگوں نے مل کر دھوکے کی ٹھانی چنانچہ حضورﷺ کو پیغام بھیجا کہ اپنے تین ساتھی لے کر ہمارے پاس آئیں' ہماری طرف سے تین عالم آپ سے بات کریں گے' اگر انہوں نے آپ کی بات مان لی تو ہم آپ کی فرمانبرداری کریں گے۔ان تینوں یہودیوں نے خنجر لے لئے۔اسی دوران بنونضیر میں سے ایک عورت نے انصار میں اپنے بھائی سے (جو مسلمان تھا) بنونضیر کی اس ارادے کا ذکر کر دیا' اس کے بھائی نے حضورﷺ کو اطلاع کر دی حالانکہ آپ ابھی ان کے پاس نہیں پہنچے تھے۔

آپ واپس تشریف لے آئے اور اگلے دن ایک دستہ ان کی طرف بھیجا جنہوں نے اس پورے دن ان کا محاصرہ کئے رکھا پھر اگلے دن بنوقریظہ کا محاصرہ کیا اور ان سے معاہدہ طے پا گیا' آپ ان سے ہٹ کر بنونضیر کے پاس تشریف لے گئے' ان سے جنگ کی اور آخرکار انہوں نے چلے جانے کا فیصلہ کیا اور یہ شرط بھی مانی کہ وہ ہتھیاروں کے علاوہ وہی کچھ اُٹھائیں گے جو ان کے اونٹ اُٹھا سکیں چنانچہ انہوں نے اپنے گھروں کے دروازے اُٹھا لئے' وہ اپنے گھروں کو اکھاڑتے وقت گھر گرا کر اپنے ساتھ لکڑیاں وغیرہ لے گئے۔یہ شام کی طرف جانے والوں کی پہلی جلا وطنی تھی۔

اس میں حضرت عکرمہ کی روایت کے مطابق ان کا یہ غزوہ کعب بن اشرف کے قتل کی صبح ہوا تھا۔یہ بھی لکھا ہے کہ قریش نے بنونضیر کو حضورﷺ کے خلاف بھڑکانے کے لئے خط لکھا لیکن نبی کریمﷺ سے دھوکا کی اطلاع نہ دی اور جب حضورﷺ نے کھجوریں جلا دیں تو انہیں شرمسار کرتے ہوئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بنولوی کے سرداروں کے لئے بویرہ میں آگ جلانا آسان ہو گیا کیونکہ وہ بکھر چکے تھے۔"

ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے اس کا جواب یوں دیا: (وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے)۔

"اللہ یہ جلانا ہمیشہ جاری رکھے اور بویرہ کے اردگرد آگ جلتی رہے' جلد تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کون آرام میں ہے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا ہماری کون سی زمین ضرر والی ہے۔"

یعنی عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ان سے دور کون ہے' کون سی زمین ہماری ہے یا تمہاری ہے' اسے نقصان پہنچے گا کیونکہ بنونضیر جب خرابی کرتے تھے تو ساتھ والی زمین کو نقصان پہنچاتے تھے' وہ انصار کی زمین تھی' قریش کی نہ تھی۔

ابن سید الناس نے ابوعمرو شیبانی سے نقل کیا ہے کہ پہلا شعر جو حضرت حسان کی طرف منسوب ہے' ابوسفیان بن حارث کا تھا اور جب حضرت حسان نے اسے پڑھا تو ھَانَ کی بجائے انہوں نے یہاں عَزَّ پڑھ دیا اور بتایا کہ شعر میں موجود لفظ بُوَیْرَہ کی جگہ بُوَیْلَہ روایت کیا گیا پھر یہ بھی لکھا کہ جواب میں دو اشعار حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے تھے لیکن جو ہم نے بتایا وہ بخاری کی روایت ہے۔

اس کے بعد ابنِ سید الناس نے لکھا کہ شیبانی کا کہا زیادہ صحیح ہے۔

(قلت) لگتا ہے کہ شیبانی نے اس بات کو بعید جانا ہے کہ حالت کفر میں ابوسفیان بنونضیر کے خلاف بددعا کرتا اور ہم اس کی وجہ پہلے بیان کر چکے ہیں۔

بنونضیر کے اشراف لوگ بنوالحقیق اور حیی بن اخطب تھے' یہ خیبر جانے والوں میں شامل تھے' اہلِ خیبر نے ان کی اطاعت کی تھی' ان میں سے یامین بن عمیر اور ابو اسعد بن وہب مسلمان ہو گئے تھے چنانچہ ان کا مال ان کے پاس رہنے دیا گیا۔

ابن شبہ بحوالہ کلبی کہتے ہیں کہ جب حضورﷺ نے بنونضیر کے اموال پر قبضہ کر لیا تو انصار سے فرمایا کہ تمہارے مہاجر بھائیوں کے پاس مال نہیں ہے' تم کہو تو میں یہ اموال تمہارے اور ان کے درمیان تقسیم کر دوں اور اگر کہو تو تمہارے مال تمہارے پاس رہیں اور یہ مال ان میں تقسیم کر دیں۔انہوں نے عرض کی کہ آپ یہ مال انہی میں تقسیم کر دیں اور کچھ ہم سے لے کر بھی دے دیں چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی:

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۝

''اور اپنی جانوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں شدید محتاجی ہو۔''

ابن اسحاق کہتے ہیں آپ نے یہ مال مہاجرین میں تقسیم فرما دیا البتہ سہل بن حنیف اور ابو دجانہ نے اپنی ضرورت بتائی تو آپ نے اس میں سے ان کو بھی دیا تھا۔(واللہ اعلم)۔

اسی سال حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی ولادت ہوئی۔

(قلت) مشہور یہ ہے کہ آپ کی ولادت ۳ھ ہجری میں ہوئی تھی جیسے ہم بتا چکے۔(واللہ اعلم)۔

اسی سال میں بدر کا واقعہ ہوا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

(قلت) یہ تیسرا واقعۂ بدر تھا جیسے گذر چکا۔(واللہ اعلم)۔

اسی سال سلام بن مشکم یعنی ابو رافع قتل ہوا' اسے عبد اللہ بن ابو الحقیق کہا جاتا تھا' عبید اللہ بن عتیک کے دستہ میں شامل تھا۔

اسی سال حضورﷺ نے دو یہودیوں کو سنگسار کیا جن میں ہر ایک زنا کا الزام دوسرے پر لگا رہا تھا۔

حضرت اُمّ سلمہ ہند بنت ابو امیہ سے شادی

(قلت) اسی سال شوال میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُم سلمہ ہند (یہ بھی ہے کہ رملہ سے شادی کی) بنت ابو امیہ سے شادی کی' آپ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اپنے شوہر ابو سلمہ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی پھر مدینہ کی طرف ہجرت کر آئیں۔ ابو عمرو کہتے ہیں کہ آپ نے بدر کے بعد ۲ھ میں شوال کو شادی کی تھی۔

غزوۂ ذات الرقاع

اسی سال میں غزوۂ ذات الرقاع ہوا' ابن اسحٰق کے مطابق بنو نضیر کے واقعہ کے دو ماہ بعد یہ واقعہ ہوا تھا' کچھ کہتے ہیں ۵ھ ہجری کو ہوا تھا' امام بخاری نے اسے خیبر کے بعد بتایا ہے کیونکہ ان کے مطابق حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس میں شامل تھے' یہ اصحابِ سفینہ سے تھے' یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دو واقعے ہوں۔ (واللہ اعلم)۔

پانچواں سالِ ہجرت

☆ اسی سال میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان کی غلامی ختم فرمائی۔

☆ اسی سال دومۃ الجندل کے لئے تشریف لے گئے' کوئی مقابلہ پر نہ آیا تو واپس تشریف لے آئے۔

☆ اسی سال میں حضرت ام سعد بن عبادہ فوت ہوئیں

اسی سال جمادی الآخرہ میں چاند گہن ہوا اور آپ نے لوگوں کو نماز کسوف الشمس پڑھائی۔

(قلت) یہودی تانبے کے برتن بناتے تھے اور کہتے تھے کہ چاند کو جادو ہو گیا ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں لکھا کہ حضور ﷺ نے چاند گہن کے لئے نماز پڑھی تھی۔ (واللہ اعلم)۔

☆ اسی سال قریش پر قحط پڑا' آپ نے ان کی طرف چاندی بھیجی' یہ انہیں بہلانے کے لئے تھی۔

☆ اسی سال میں بلال بن حارث مزنی کا وفد آیا' یہ کسی مسلمان کا مدینہ میں پہلا وفد تھا۔

☆ اس کے بعد ضمام بن ثعلبہ آئے۔

☆ اسی سال غزوۂ مریسیع واقع ہوا' یہ ماہِ شعبان تھا۔

☆ اسی میں آیت تیمم نازل ہوئی کیونکہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہار گم ہو جانے کا واقعہ ہوا تھا۔

(قلت) آگے آرہا ہے: زیادہ واضح یہی معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بنو المصطلق یہی تھا۔ (واللہ اعلم)۔

غزوۂ خندق

(قلت) اسی سال غزوۂ خندق ہوا' ابن اسحاق نے یہی لکھا ہے اور قابلِ بھروسہ یہی بات ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ یہ غزوہ شوال ۴ھ ہجری کو ہوا۔ نووی نے اپنے "روضہ" میں صحیح قرار دیا ہے۔

اسے خندق اس لئے کہا گیا کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اشارے سے اسے کھدوایا تھا' اسے احزاب بھی کہتے ہیں کیونکہ مشرکین کے بہت سے قبیلے اس جنگ کے لئے تیار ہوئے تھے' یہی وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے احزاب کا نام دیا تھا' اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب کی ابتدائی آیات اُتاری تھیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حُیَیّ بن اخطب جب بنونضیر کے گروہ کو لے کر خیبر سے مکہ کو نکلا تو انہوں نے قریش کو جنگ کے لئے بھڑکایا' کنانہ بن ابوالحقیق دوڑتا ہوا بنوغطفان کی طرف گیا اور انہیں رسول اللہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بھڑکایا' شرط یہ طے ہوئی تھی کہ انہیں خیبر کا نصف پھل دیں گے' اسے عیینہ بن حصن فزاری نے قبول کر لیا اور بنو اسد کے اپنے حلیفوں کو لکھا جس کے نتیجے میں طلیحہ بن خویلد نے یہ بات مان لی چنانچہ ابوسفیان قریش کو لے کر نکلا اور وہ ''مرالظہر ان'' میں اُترے' وہاں ان کے پاس بنوسلیم کے لوگ آئے جنہوں نے ان کی بات مانی تھی' انہوں نے ان سے مدد مانگی تھی چنانچہ یہ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا (ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد دس ہزار تھی جبکہ مسلمان تین ہزار تھے) نیز کہتے ہیں کہ مسلمان ایک ہزار تھے اور مشرکین چار ہزار تھے۔ موسیٰ بن عقبہ نے لکھا ہے کہ قریش نے تقریباً بیس دن تک خندق کا محاصرہ کئے رکھا' قریش' رومہ بنی جرف' زغابہ' غطفان اور اہلِ نجد کے تابعداروں کے ہمراہ اُحد کی ایک جانب آ ٹھہرے۔ ابن مردویہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مطابق عیینہ غطفان میں اور نجدیوں کے ہمراہ اُحد کی جانب باب نعمان میں اُترے' رسول اللہ ﷺ اور مسلمان نکلے' یہ سلع کی طرف پشت کر کے اور خندق کو سامنے رکھتے ہوئے ٹھہرے' عورتیں اور بچے قلعوں میں پابند کر دئے تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش دس ہزار کا لشکر لے کر اُترے' ان کے ساتھ بنوکنانہ و بنوتہامہ تھے' عیینہ غطفان میں اُترے۔

طبرانی' رافع بن خدیج کے حوالے سے لکھتے ہیں' انہوں نے بتایا کہ بنوحارثہ کے قلعہ سے کوئی بھی قلعہ مضبوط نہ تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو اس میں محفوظ کر دیا اور فرمایا: اگر کوئی بھی موجود نہ ہو تو تلوار سے مدد لینا چنانچہ ان عورتوں کی طرف بنوثعلبہ بن سعد میں سے ایک آدمی آیا جسے نجدان کہتے تھے' یہ بنوجحاش میں سے تھا' یہ گھوڑے پر آیا اور عین قلعے پر پہنچ گیا اور عورتوں سے کہنے لگا: میرے پاس آ جاؤ' تمہارے لئے بہتر ہوگا چنانچہ انہوں نے اپنی تلواریں تان لیں' رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے اسے دیکھ لیا تو ایک جماعت تیزی سے قلعے کی طرف گئی جن میں بنوحارثہ کا ایک شخص تھا جسے ظفر بن رافع کہا جاتا تھا' اس نے کہا اے نجدان! جنگ کے لئے آؤ چنانچہ وہ سامنے آیا' ظفر نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر قلم کر کے نبی کریم ﷺ کے سامنے لا رکھا۔

بزاز نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی طرف آنے لگے تو عورتوں اور اپنی پھوپھی صفیہ کو ایک قلعے میں محفوظ کر دیا جسے ''فارع'' کہا جاتا تھا' حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو نگران بنایا' ایک یہودی اُوپر چڑھا اور اُوپر سے سرکار دو عالم ﷺ کی عورتوں اور پھوپھی کی طرف جھانکا' حضرت صفیہ

رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے حسان! اس کی طرف دھیان کرو اور اسے قتل کر دو' انہوں نے کہا: مجھ میں یہ ہمت نہیں' اگر ممکن ہوتا تو میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہوتا' حضرت صفیہ نے فرمایا تو پھر تلوار میرے بازو سے باندھ دو' چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا اور سرتن سے جدا کر دیا اور آپ سے فرمایا کہ سر پکڑ کر یہودیوں کی طرف پھینک دو۔ انہوں نے کہا کہ مجھ میں تو ہمت نہیں چنانچہ خود انہوں نے سر لے کر یہودیوں کی طرف پھینک دیا جس پر یہودیوں نے کہا: ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آپ نے اپنی عورتوں کو مردوں کی حفاظت کے بغیر نہیں چھوڑا چنانچہ وہ تتر بتر ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خندق کے دن حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے قلعہ میں محفوظ تھیں' قلعے کا نام "فارع" تھا۔ اس کے بعد باقی حدیث بیان کی' یہودی کے قتل کا قصہ ذکر کیا اور بتایا کہ حضرت صفیہ نے حضرت حسان سے کہا تھا کہ آگے بڑھو اور اس کا سامان چھین لو' انہوں نے کہا تھا کہ مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔

طبرانی نے یہ قصہ غزوۂ اُحد میں لکھا ہے لیکن اہل سیرت نے اسے خندق میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ کچھ صحابہ بنو حارثہ کے قلعے میں تھے اور کچھ "فارع" میں اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جب یہودی کو قتل کر کے فارغ ہوئیں اور قلعہ میں آ گئیں تو حضرت حسان سے فرمایا کہ اس کا سامان اُتار لو کیونکہ مرد کا سامان اُتارنا میرے لئے مناسب نہیں۔ انہوں نے کہا تھا: اے عبدالمطلب کی بیٹی! مجھے سامان کی ضرورت نہیں۔

حضرت سہیلی لکھتے ہیں کہ لوگوں کے ہاں اس حدیث کا مطلب یہ بنتا ہے کہ حضرت حسان بہت بزدل تھے جبکہ علماء نے اس اعتراض کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت حسان کی ہجو لکھی جاتی کیوں کہ آپ شعراء کی ہجو لکھا کرتے تھے' لوگ اس ہجو کا جواب دیتے' انہیں کسی نے بھی بزدل نہیں کہا اور اگر یہ بات صحیح ہے تو شاید حضرت حسان اس دن ایسی بیماری میں مبتلا تھے جس نے آپ کو جنگ میں شمولیت سے روک دیا تھا۔ انتھٰی۔

طبرانی نے بذریعہ عروہ لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی عورتوں کو مدینہ کے قلعوں میں سے ایک قلعہ میں محفوظ کر دیا' حضرت حسان رضی اللہ عنہ بزدل تھے تو انہیں عورتوں کے پاس ٹھہرا دیا چنانچہ انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر باقی واقعہ لکھا۔

خندق میں اس واقعہ کو بیان کرنے والے ابن اسحاق ہیں' اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہود کی غداری صرف خندق میں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ حُیی بن اخطب بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت تک ان کے پاس رہا جب تک وہ غدار نہیں بن گئے۔ مسلمانوں کو ان کی غداری کا پتہ چل گیا چنانچہ ان پر سخت بلاء نازل ہوئی اور محاصرہ سخت ہو گیا اور معتب بن قشیر (بنو عمرو بن عوف کا بھائی بند) نیز اوس بن قیظی (بنو حارثہ کا بھائی بند) وغیرہ نے منافقانہ بات کی' اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری تھی:

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا۝

(سورۂ احزاب:۱۲)

''اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں روگ تھا' ہمیں اللہ و رسول نے وعدہ نہ دیا تھا مگر فریب کا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ان کے پاس اوپر سے آنے والے بنوقریظہ تھے اور نچلی طرف سے قریش اور بنوغطفان تھے' حیی بن اخطب' کعب بن اسد کے پاس پہنچا جس نے بنوقریظہ کی طرف سے معاہدہ کر رکھا تھا چنانچہ اس نے حیی کے لئے دروازہ نہیں کھولا بلکہ اسے کہا: میں نے تو محمد کو جب بھی دیکھا ہے وہ وعدہ پورا کرتے ہیں اور بات سچی کرتے ہیں۔اس نے کہا کہ میں تمہارے پاس حالات کی تبدیلی بتانے آیا ہوں' میں یہ بتانے آیا ہوں کہ قریش اور غطفان کے سردار اور آقا لوگوں نے مجھ سے عہد کر لیا ہے کہ جب تک محمد اور اس کے ساتھیوں کو جڑ سے اُکھاڑ نہیں پھینکتے' آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔کعب نے اسے کہا کہ بخدا تم ہمیں بدنام کرنے آئے ہو' تم ہمارے پاس گویا خالی بادل لے کر آئے ہو جو گرجتا اور چمکتا ہے لیکن اس میں کوئی بھی شے نہیں ہوتی۔حیی پھر بھی اصرار کرتا رہا اور آخرکار اس نے حضرت محمد ﷺ سے کیا ہوا عہد توڑ دیا اور معاہدہ کا انکار کر دیا جس سے مسلمان خوف میں مبتلا ہو گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس دوران قریش اور مسلمانوں میں صرف تیر پھینکنے تک جنگ ہوتی رہی۔اسی دوران عمرو بن عبد ودّ عامری ساتھی گھوڑ سواروں کو لے کر اس مقام سے خندق میں داخل ہو گیا جہاں سے خندق کی چوڑائی کم تھی' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے جنگ کی دعوت دی اور پھر قتل کر دیا پھر نوفل بن عبد اللہ بن مغیرہ مخزومی آگے آیا جسے حضرت زبیر نے للکارا اور قتل کر دیا' یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا اور باقی گھوڑا سوار بھاگ گئے' یہ بھی کہتے ہیں کہ تین دن تک سخت لڑائی ہوتی رہی اور پھر رات درمیان میں آ گئی خصوصاً تیسرے دن کی لڑائی بہت سخت تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی عصر اور مغرب کی نمازیں رہ گئیں' کہتے ہیں کہ ظہر کی بھی رہ گئی تھی اور یہ اس فرمان نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا۝ (سورۂ بقرہ:۲۳۹)

''پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے۔'' (نماز پڑھو)

حضرت مالک کہتے ہیں کہ خندق کے دن چار یا پانچ اور ایک قول کے مطابق چھ افراد شہید ہوئے' وہ حضرات یہ تھے: حضرت سعد بن عبادہ جیسے کہ آ رہا ہے' حضرت انس بن اوس بن عتیک' حضرت عبد اللہ بن سہیل (یہ حضرات بنوعبد الاشہل میں سے تھے) حضرت ثعلبہ بن غنمہ' حضرت طفیل بن نعمان (یہ دونوں بنوسلمہ میں سے تھے) اور حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہم (ان کا تعلق بنودینار بن نجار سے تھا)۔

دونوں فریقوں میں حملے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اہلِ قباء میں سے بنوعمرو بن عوف کا ایک آدمی مر گیا تو اس

کے رشتہ داروں نے حضور ﷺ سے اسے دفن کرنے کی اجازت مانگی' آپ نے اجازت دے دی' جب وہ صحراء کی طرف میت دفن کرنے کے لئے چلے تو ضرار بن خطاب اور مشرکوں کی ایک جماعت سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا' انہیں ابوسفیان نے بنو قریظہ کی طرف اس لئے بھیجا تھا کہ اس کے مال والے اونٹوں کے بارے میں بات کریں' کچھ اونٹوں پر انہوں نے گندم لا دی تھی' کچھ پر جَو' کچھ پر کھجوریں اور کچھ پر چارا رکھا تھا' جب وہ قباء کے میدان میں پہنچے تو ان لوگوں سے ملاقات ہو گئی جو میت دفن کر رہے تھے' مسلمانوں نے ان سے مقابلہ کیا اور ان پر غالب ہو گئے' ضرار کو کئی زخم آئے چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی بھاگ گئے اور مسلمان سامان سمیت اونٹوں کو ہانک لائے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یوں مسلمانوں کو بہت سا غلہ ہاتھ آ گیا۔

نعیم بن مسعود اشجعی اسلام لائے

پھر نعیم بن مسعود اشجعی کو حضور ﷺ کی خدمت میں لایا گیا' وہ اسلام لا چکے تھے لیکن ان کی قوم کو معلوم نہ تھا: آپ نے اسے فرمایا کہ انہیں لڑائی سے ہٹاؤ چنانچہ وہ بنو قریظہ کی طرف گئے' وہ ان کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے' انہوں نے بنو قریظہ سے کہا کہ تم میری محبت جانتے ہو؟' انہوں نے کہا' ہاں' اس نے کہا کہ قریش اور غطفان کے یہ شہر ملکیت نہیں ہیں' جب بھی انہیں موقع ملا وہ انہیں لوٹیں گے ورنہ وہ اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور تمہیں محمد کے مقابلے میں اکیلے چھوڑ جائیں گے' تمہیں تو ان کے مقابلہ کی طاقت ہی نہیں ہو گی۔ بنو قریظہ نے کہا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ نعیم نے کہا کہ تم ان کے ساتھ مل کر نہ لڑو جب تک ان سے شرطیں طے نہیں کر لیتے۔ بنو قریظہ نے اُن کی رائے قبول کر لی۔

اس کے بعد وہ قریش کی طرف چلے گئے اور ان سے کہا کہ یہودی محمد سے غداری پر پریشان ہیں چنانچہ انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ ان کی طرف رجوع کر لیں' انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ ہم اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک تم قریش سے شرائط نہیں طے کرتے' ورنہ ہم تم سے لڑیں گے' پھر غطفان سے بھی ایسی ہی بات کی۔

صبح ہوئی تو ابوسفیان نے عکرمہ بن ابوجہل کو بنو قریظہ کی طرف بھیجا کہ ہمارا یہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا ہے اور کھانے پینے کو کچھ نہیں رہا لہٰذا جلد آؤ کہ ہم محمد سے مقابلہ کر سکیں۔ بنو قریظہ نے کہا کہ آج تو ہفتہ ہے' آج ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ ان گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت آندھی بھیجی' ان کے سب خیمے اکھڑ گئے' برتن اُلٹ پلٹ ہو گئے' نہ ٹھہرے کو جگہ رہی اور نہ آگ جلانے کو چولہا رہا چنانچہ ابوسفیان اُٹھا اور کہنے لگا اے قریش! تم کسی کام نہ آئے' سب کچھ برباد ہو گیا ہے' بنو قریظہ نے ہم سے اختلاف کیا ہے' تم دیکھ رہے ہو کہ آندھی نے ہمارا برا حال کر دیا ہے تو چلو یہاں سے' میں بھی چلتا ہوں۔ قریش نے اپنا سامان اُٹھایا' آندھی نے ان کا سامان اُڑا دیا تھا۔ ادھر غطفان نے قریش کے بارے میں سن لیا تو وہ بھی اپنے علاقوں کو چلے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد قریش تم سے نہیں لڑیں گے۔

مدینہ ہی کی خبروں میں یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے کفار کی جماعتوں کا پیچھا کیا اور وہ روحاء تک جا پہنچے' وہ پیچھے سے انہیں ہانکتے گئے چنانچہ وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (واللہ اعلم)۔

اس کے بعد غزوۂ بنو قریظہ ہوا۔

غزوۂ بنو قریظہ

(قلت) الاکتفاء میں ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ خندق سے مدینہ کو واپس ہوئے' مسلمان ہمراہ تھے' ظہر کا وقت ہوا تو حضرت جبریل علیہ السلام آئے۔ ابن عقبہ کے مطابق جب جبریل حاضر ہوئے تو آپ غسل فرما رہے تھے پھر آپ نے سر کے ایک طرف کنگھی کی تو جبریل گھوڑے پر آئے' وہ کسی تیاری میں تھے' چہرہ گرد آلود تھا' مسجد کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے جہاں جنازہ کا مقام تھا۔ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو جبریل نے عرض کی: اللہ آپ کی بخشش فرمائے' کیا آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں؟ فرمایا ہاں اتار دیئے ہیں۔ جبریل نے عرض کی: ابھی تک فرشتوں نے تو نہیں اتارے' آپ کی قوم کو ابھی ہماری ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ بنو قریظہ کی طرف چلے جایئے' میں بھی جا رہا ہوں اور انہیں ہلا کر رکھ دونگا اھ۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جبریل نے عرض کی' میں ان کی طرف جا رہا ہوں اور انہیں ہلا کر رکھ دوں گا چنانچہ جبریل اور دوسرے فرشتے پیچھے چلے جن کی وجہ سے انصار کے قبیلہ بنو غنم کی گلیوں میں غبار اُٹھا' غبار کا یہ قصہ بخاری شریف مذکور ہے' حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں گویا میں اب بھی وہ غبار دیکھ رہا ہوں جو جبریل کے لشکر کی وجہ سے بنو غنم کی گلیوں میں اُڑا تھا۔

ابن سعد نے کہا نبی کریم ﷺ اور بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ تھا' جب انہوں نے اپنے گروہ دیکھے تو انہوں نے معاہدہ توڑ دیا اور جب اللہ نے ان گروہوں کو شکست دے دی تو وہ قلعہ میں بند ہو گئے۔ حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! آپ بنو قریظہ کی طرف چلئے' آپ نے فرمایا کہ ابھی میرے صحابہ تھکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عرض کی: آپ چلئے تو سہی' میں تو انہیں ذلیل کر دونگا چنانچہ جبریل اور ان کے ساتھی پیچھے مڑے تو انصار کے بنو غنم قبیلہ کی گلیوں میں غبار اُڑتا دکھائی دیا۔

(قلت) ان کی گلیاں جنازگاہ میں کی مشرقی جانب تھیں جیسے ان کے گھروں کے ذکر میں آیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ایک روایت یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمان خندق سے واپس آئے اور ہتھیار اُتار کر رکھ دیئے تو حضرت جبریل علیہ السلام استبرق کا عمامہ سر پر باندھے ایک خچر پر بیٹھے آئے جس پر ریشم کا زین ڈالا ہوا تھا اور پوچھا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے ابھی سے ہتھیار اُتار دیئے ہیں؟ فرمایا' ہاں۔ عرض کی کہ ابھی تک فرشتوں نے تو ہتھیار نہیں اُتارے' میں قوم کا کام پورا کیئے بغیر نہیں جاؤنگا' اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ آپ بنو قریظہ کی طرف چلیں۔

حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انہوں نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ جو بھی سنتا مانتا ہے اسے نماز عصر بنو قریظہ میں پہنچ کر پڑھنا ہو گی' بنو قریظہ کی طرف جاتے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جھنڈا لے کر آگے آ گئے' لوگ جلدی سے جمع ہو کر چل پڑے۔ حضور ﷺ نے ایک روایت کی بناء پر پچیس دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا' دوسری روایت میں پندرہ دن کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابن سعد دس دن بتاتے ہیں۔ وہ محاصرہ سے تنگ آ گئے اور ان کے دلوں پر رعب چھا گیا تو ان کا رئیس کعب بن اسد ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ یا تو تم لوگ محمد (ﷺ) پر ایمان لے آؤ کیونکہ واللہ وہ نبی ہیں یا پھر تم اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دو اور لڑتے ہوئے واپس ہو جاؤ' سامان ساتھ نہ لو' ہفتہ کی رات مسلمانوں کے پاس گذارو! بنو قریظہ نے کہا کہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی ہفتہ کے دن کو حلال بنائیں گے اور اگر ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیں تو ہمارا جینا کس کام کا؟ چنانچہ انہوں نے قبیلۂ اوس کے بنو عمرو بن عوف کے بھائی بند ابو لبابہ بن عبد المنذر کی طرف پیغام بھیجا' وہ ان کے حلیف تھے' ان سے رسول اللہ ﷺ کی بات ماننے کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے حلق کی طرف اشارہ کیا' پھر شرمسار ہوئے مسجد نبوی کی طرف چل پڑے اور وہاں اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا جو آج کل انہی کے نام سے مشہور ہے اور توبہ قبول ہونے تک وہیں بندھے رہے۔

شہدائے غزوۂ بنو قریظہ

مسلمانوں میں سے خلاد بن سوید (بنو حارث بن خزرج سے تعلق تھا) شہید ہوئے' ان پر بنو قریظہ کی ایک عورت نے چکی پھینک دی تھی جس نے انہیں قتل کر دیا' حضور ﷺ نے بعد میں اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا تھا جبکہ محاصرے میں ابو سنان بن محصن اسدی (عکاشہ بن محصن کے بھائی) فوت ہو گئے' انہیں رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کے اس قبرستان میں دفن کرا دیا جس میں سلمان اس وقت دفن کئے گئے تھے جب وہ وہاں رہتے تھے' ان کے علاوہ کوئی اور فوت نہیں ہوا تھا۔

بنو قریظہ حکم رسول ماننے پر مجبور ہو گئے

جب محاصرہ ان کے لئے زیادہ دشوار ہو گیا تو وہ حکم رسول اللہ ﷺ ماننے پر تیار ہو گئے چنانچہ اوس نے کہا: جو کچھ بنو قینقاع کے ساتھ ہوا' تم جانتے ہی ہو۔ انہوں نے کہا کیا تم اپنے ہی ایک شخص کے فیصلے کو مان جاؤ گے؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ انہوں نے کہا کہ یہ سعد بن معاذ ہیں۔ حضرت سعد ان دنوں خندق کے موقع پر بازو میں تیر لگنے کی وجہ سے زخمی تھے' وہ اپنی قوم میں آئے' انہوں نے آپ کو گدھے پر بٹھا لیا اور یہ کہتے ہوئے چل پڑے کہ: اے ابو عمرو! اپنے غلاموں سے اچھا سلوک کرنا کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے ذمے یہ فیصلہ لگایا ہے جب بار بار انہوں نے زور دیا تو آپ نے کہا کہ اب سعد پر لازم ہے کہ اللہ کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرے اور صحیح فیصلہ کرے۔

بنو قریظہ کے بارے میں حضرت سعد کا فیصلہ

حضرت سعد حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جس پر انہوں نے عرض کی کہ میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ ان کے آدمی قتل کر دیئے جائیں' مال تقسیم کر دیا جائے اور ان کی عورتیں اور اولادیں قید کر لی جائیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ان کے بارے میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ دیا ہے پھر انہیں نکال لیا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ میں قید کر دیا پھر مدینہ کے بازار میں تشریف لے گئے اور وہاں ان کے لئے گڑھے کھدوائے اور پھر انہیں منگوا کر انہی گڑھوں میں سر قلم کر دیئے گئے' حیی بن اخطب بھی انہی میں شامل تھا کیونکہ اس نے کعب بن اسد سے عہد کر رکھا تھا کہ اگر قریش اور غطفان واپس ہوئے تو میں قید خانہ میں تمہارے ساتھ ہونگا تاکہ جو برتاؤ تمہارے ساتھ ہوگا' میرے ساتھ بھی ہو سکے اور جب گروہ چلے گئے تو یہ اس کے ساتھ قید خانے میں داخل ہو گیا اور وہیں رہا پھر آپ نے ان کی عورتوں میں سے صرف ایک کو قتل کیا جس نے خلاد بن سوید پر چکی گرائی تھی۔

ابن سعد نے بحوالہ حمید بن ہلال روایت کی کہ حضرت سعد بن معاذ نے یہ بھی فیصلہ دیا تھا کہ ان کے گھر مہاجرین کو دے دیئے جائیں' انصار کو نہ دیئے جائیں' اس پر انصار نے انہیں ملامت کی تھی چنانچہ انہوں نے کہا تھا: مجھے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ تمہارے گھروں سے بے نیاز ہو جائیں۔

بنو قریظہ کے مقتولوں کی تعداد

ان کی تعداد میں اختلاف ہے' ابن اسحاق چھ سو لکھتے ہیں' ابن عائذ سات سو بتاتے ہیں' سہیلی بڑھا چڑھا کر سات سو سے آٹھ سو تک بتاتے ہیں' ابن ماجہ کہتے ہیں کہ چار سو تھے۔

زبیر بن باطا قرظی' ثابت بن قیس بن شماس کے ہاں سے دورِ جاہلیت میں یومِ بعاث کے موقع پر گذرے تھے اور جب بنو قریظہ قتل کر دیئے گئے تو ثابت ان کے پاس آیا' وہ اس وقت بہت بوڑھا ہو چکا تھا' اسے وہ وقت یاد دلایا' پھر گئے اور رسول اللہ ﷺ سے انہیں مانگ لیا جس پر آپ نے انہیں دے دیا تھا' انہوں نے عرض کی تھی کہ یا رسول اللہ یہ بوڑھے شخص ہیں' اس کی بیوی بچے نہ ہوئے تو زندگی کس کام کی؟ چنانچہ آپ نے اس کے بیوی بچے دے دیئے تھے۔ پھر عرض کی تھی کہ حجاز والوں کے پاس تو کوئی مال نہیں' ان کا گذر کیسے ہوگا؟ چنانچہ اسے بھی مال دے دیا' وہ آئے اور اسے جتایا اور کہا اے ثابت! فلاں فلاں نے کیا کیا؟ اور پھر قوم کے بارے میں اوصاف بتائے اور کہا کہ وہ قتل کر دیئے گئے' اس نے کہا: اے ثابت! میری جان تمہارے قبضے میں ہے' مجھے بھی قوم کے ساتھ ہی قتل کر دو کیونکہ ان کے بعد جینا کس کام کا' چنانچہ ثابت نے اسے آگے کیا اور قتل کر دیا۔

بنو قریظہ کے اموال کی تقسیم

پھر حضور ﷺ نے بنو قریظہ کے اموال' عورتیں اور بچے مسلمانوں میں تقسیم فرما دیئے اور گھوڑوں کے حصے کر

دئے قرعہ اندازی فرمائی اور اس میں سے خمس (پانچواں حصہ) نکال دیا' رسول اللہ ﷺ کے حصہ میں حضرت ریحانہ بنت عمرو بن خناقہ آئیں' یہ بنو عمرو بن قریظہ میں سے تھیں' یہ آپ کے وصال تک آپ کے پاس رہیں' آپ کی خواہش تھی کہ ان سے شادی کر لیں لیکن انہوں نے کہا کہ آپ مجھے اپنے ملک میں رہنے دیں کیونکہ یہ آپ کے اور میرے لئے زیادہ بہتر رہے گا چنانچہ آپ نے ویسے ہی رہنے دیا۔ جب وہ قید ہوئیں تو اسلام انہیں ناپسند تھا' حضور ﷺ کو اس بات کا دکھ تھا۔ ایک دن آپ اپنے صحابہ میں بیٹھے تھے کہ پیچھے سے جوتے کی آہٹ سنی' آپ نے فرمایا کہ یہ ثعلبہ بن شعبہ ہے جو مجھے ریحانہ کے اسلام لانے کی بشارت دینے آیا ہے چنانچہ یونہی ہوا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر کے شادی کر لی تھی اور جب آپ حجۃ الوداع سے واپس آ رہے تھے تو آپ کی حیات ہی میں وہ فوت ہو گئیں۔ واقدی کے نزدیک زیادہ معتبر یہی ہے اور یہ بھی آتا ہے کہ وہ بنو نضیر میں سے تھیں۔

جب بنو قریظہ کا معاملہ طے ہو گیا تو حضرت سعد کا زخم پھٹ گیا اور وہ شہید ہو گئے۔

بخاری میں ہے کہ بنو قریظہ اس سے قبل بنو نضیر سے لڑے تھے' نبی کریم ﷺ نے ان پر احسان فرمایا تھا۔ میں نے اس کی واضح روایت نہیں دیکھی' نہ ہی حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے البتہ بنو نضیر کے بارے میں ابن مردویہ سے ہم نے اس سے قبل روایت لکھی ہے جو اس بات کی شہادت بنتی ہے۔ امام بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنو نضیر اور بنو قریظہ آپس میں لڑے تو آپ نے بنو نضیر کو نکال دیا اور بنو قریظہ کو رہنے دیا' یہ ان پر احسان تھا' بنو قریظہ نے جنگ کی تو ان کے آدمی قتل کر دئے گئے اور ان کی عورتیں' مال اور بچے مسلمانوں میں تقسیم کر دئے گئے' ہاں کچھ چھوڑ دئے گئے جو حضور ﷺ کے ساتھ ہو گئے' آپ نے انہیں امان دی اور وہ مسلمان ہو گئے پھر سارے یہودیوں کو مدینہ سے نکال دیا' یہ بنو قینقاع (عبداللہ بن سلام کا قبیلہ) بنو حارثہ تھے' غرض مدینہ کے ہر یہودی کو نکال دیا اھ۔

ابو داؤد نے بھی یونہی لکھا ہے البتہ انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے بعد بنو قریظہ نے لڑائی کی یعنی پہلی لڑائی کے بعد' اس سے یہ مفہوم نکالا جاتا ہے کہ مدینہ میں رہنے والے گروہوں کو بنو قریظہ کے قتل کے بعد مدینہ سے نکالا گیا تھا۔

بخاری ہی میں ہے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے' فرمایا: آؤ یہودیوں کے پاس چلو' ہم ساتھ ہوئے' جب بیت المدراس (درس گاہ) میں پہنچے تو آپ نے فرمایا: اسلام لے آؤ' امن میں رہو گے اور یہ یقین رکھو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے' میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سرزمین سے نکال دوں تو جس کی کوئی جائیداد یہاں ہے' وہ بیچ دے ورنہ یقین کر لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ خیبر کے بعد ہوا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ ہجری میں اسلام لائے تھے۔ (واللہ اعلم)

پھر اسی سال عبید اللہ بن انیس کا دستہ عرنہ کے مقام پر سفیان بن خالد ھزلی کی طرف گیا۔
اسی سال میں حضور ﷺ اپنے گھوڑے سے گرے تھے اور زخمی ہو گئے تھے۔
اسی سال پورے عرب میں اعلان کیا گیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ تک ذخیرہ نہ کیا جائے۔
(قلت) اسی سال آپ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی (یہ آپ کی پھوپھی امیمہ کی بیٹی تھیں) کچھ کہتے ہیں کہ یہ شادی تیسری ہجری کو ہوئی' پردہ کی آیت انہی کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔
اسی سال حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما اسلام لائے (واللہ اعلم)۔

چھٹا سالِ ہجرت

اس سال حضور ﷺ کے پاس ثمامہ بن اثال کو قید کر کے لایا گیا پھر دوسری مرتبہ سورج گہن لگا' پہلی مرتبہ تب لگا تھا جب حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم سلام اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا۔
(قلت) شاید نسخے میں کوئی خلل ہے کیونکہ آگے ہم ذکر کریں گے کہ حضرت ابراہیم کی ولادت ۸ھ کو اور وصال ۱۰ھ کو ہوا تھا پھر سورج گہن جو ۶ھ کو لگا تھا' وہ پہلا تھا' اور اسی میں ظہار کا حکم نازل ہوا تھا۔ (واللہ اعلم)۔
اسی سال مشرکوں نے حضرت محمد بن مسلمہ کے دستے کو قتل کیا تھا' صرف آپ کو چھوڑا تھا' یہ کل دس افراد تھے۔
اسی سال حضرت علی بن ابو طالب کا سو افراد پر مشتمل دستہ فدک کی طرف گیا تھا۔ پھر عبد الرحمٰن بن عوف کا دستہ دومۃ الجندل کی طرف گیا تھا' آپ ان پر غالب آئے تو رسول اللہ ﷺ نے تماضر بنت اصبغن عمرو کلبی سے آپ کی شادی کی تھی جو ان کا بادشاہ تھا۔
اسی سال لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے مقام مصلّٰی پر رمضان میں بارش کی دُعا فرمائی چنانچہ بارش ہو گئی تھی۔
اسی سال آپ نے زید بن حارثہ کو دستہ دے کر بھیجا تو سلمہ بن اکوع نے اس دستے میں بنت مالک بن حذیفہ کو قید کیا تھا۔
اسی سال صلح حدیبیہ ہوئی تھی۔
اسی سال عیینہ بن حصن فزاری نے آپ کی اونٹنیوں پر ڈاکہ ڈالا تو آپ نے انہیں بچا لیا تھا۔
(قلت) حدودِ حرم کی بحث میں ہم نے بیان کیا تھا کہ حضور ﷺ کی اونٹنیاں غابہ اور اس کے اردگرد میں چرا کرتی تھیں' عیینہ بن حصن نے یومِ ذی قرد کے موقع پر ان پر ڈاکہ ڈالا' یہ وہ مقام تھا جہاں جنگ ہوئی تھی چنانچہ اسی کے نام پر غزوہ کا نام پڑ گیا' اسے غزوۃ الغابہ بھی کہتے ہیں۔
ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ بنولحیان سے واپس آئے' یہ شعبان ۶ھ تھا' ابھی تھوڑی ہی

راتیں ٹھہرے تھے کہ عیینہ نے غطفان کے گھوڑ سواروں کو لے کر آپ کی اونٹنیاں غابہ سے چرا لیں' اس جگہ بنوغفار کا ایک شخص اور اس کی عورت رہتی تھی' انہوں نے اس آدمی کو قتل کر دیا اور وہ عورت اونٹنی پر لاد دی۔ سب سے پہلے حضرت سلمہ بن اکوع انہیں پکڑنے کے لئے تیار ہوئے' وہ تیر کمان کے لئے صبح کے وقت غابہ کی طرف روانہ ہوئے' جب ثنیۃ الوداع کے اوپر سے جھانکا تو ان کے کچھ گھوڑ سوار نظر آئے' آپ سلع پہاڑ کے اوپر چڑھے اور چیختے ہوئے کہا: وَ اصَبَاحَاهْ! پھر تیزی سے ان کی طرف بھاگے اور انہیں جا لیا' آپ تیروں کے ذریعے انہیں ہٹاتے گئے' جب بھی تیر چلاتے تو کہتے: اسے پکڑو' میں ابن اکوع ہوں' آج ذلیل لوگ ہلاک ہوں گے' جب گھوڑ سوار ان کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ بھاگ گئے' پھر مقابلہ کرنے نکلے' کئی مرتبہ ایسا ہوا۔ حضور علیہ السلام تک آپ کی چیخ کی آواز پہنچ چکی تھی چنانچہ مدینہ میں آپ نے اعلان کر دیا کہ الفزع الفزع (خطرہ خطرہ) تیرانداز دوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے' جب جمع ہو گئے تو آپ نے سعد بن زید اشہلی کو ان کا امیر بنا دیا اور فرمایا کہ ان لوگوں کو تلاش کرو' میں بھی کچھ لوگ ساتھ لے کر آ رہا ہوں چنانچہ ابوقتادہ نے حبیب بن عیینہ بن حصن کو قتل کر دیا اور اس پر اپنی چادر ڈال دی۔ اتنے میں رسول اللہ علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر پہنچ گئے' حبیب پر ابوقتادہ کی چادر تھی لیکن وہ قتل ہو چکا تھا' انہوں نے موسیٰ ابوقتادہ سمجھا لیکن حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ ابوقتادہ نہیں بلکہ اس کا قتل کیا ہوا ہے۔ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے اوبار کو پا لیا اور اس کے بیٹے عمر بن اوبار کو دیکھ لیا' دونوں ایک اونٹ پر سوار تھے' آپ نے تیر کا نشانہ لیا اور دونوں ہی کو اکٹھے قتل کر دیا اور پھر کچھ اونٹنیاں بچا لیں' حضور علیہ السلام وہاں سے چل پڑے اور گھوڑوں سمیت ذی قرد میں ٹھہرے' لوگ آ ملے' آپ وہاں ایک دن اور رات رہے' حضرت سلمہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اگر سو آدمی میرے ساتھ روانہ فرمائیں تو میں باقی اونٹنیاں بچا کر انہیں قتل کر دوں گا' حضور علیہ السلام نے فرمایا: وہ غطفان میں ٹھہرے ہیں۔

رسول اللہ علیہ السلام نے ہر سو آدمی کے لئے ایک ایک اونٹنی بانٹ دی پھر کچھ دن وہاں ٹھہرے اور پھر واپس آ گئے۔

اس غفاری کی عورت ایک اونٹنی پر آئی اور رسول اللہ علیہ السلام کو خبر دی اور عرض کی کہ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے رہائی عطا فرما دے تو میں اسے راہِ خدا میں ذبح کروں گی۔ یہ سن کر رسول اللہ علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: تم اسے برا بدلہ دے رہی ہو اللہ تعالیٰ نے تجھے اس پر بیٹھنے کا موقع دیا ہے' اسی کی وجہ سے تمہیں نجات ملی ہے تو پھر بھی اسے ذبح کرنا چاہتی ہو؟ خدا کی بے فرمانی والے کام میں نذر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس چیز میں نذر مانی جا سکتی ہے جو اپنی ملکیت نہ ہو' یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور انہوں نے اس میں مسلمانوں کے دو افراد کے قتل کا ذکر کیا ہے۔

امام مسلم نے سلمہ کا یہی واقعہ طویل و مختصر ذکر کیا ہے اور انہوں نے کئی مقامات پر ابن اسحاق کی مخالفت کی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے حدیبیہ سے واپس آنے پر ہوا تھا جبکہ ابن اسحاق کے اس سے قبل کا بتاتا ہے۔

ایک یہ ہے کہ مسلم نے بتایا: آپ کی اونٹنیاں ذی قرد میں چرتی تھیں' بخاری نے بھی یہی لکھا ہے لیکن ابن

اسحاق نے غابہ کے مقام پر چرنے کا ذکر کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قاضی عیاض نے اول کو غلط قرار دیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو جمع کرنا یوں ممکن ہے کہ کبھی تو وہ وہاں چرتی ہوں اور کبھی یہاں۔

ایک یہ ہے کہ انہوں نے کہا: میں صبح کی اذان سے پہلے نکلا تو عبد الرحمٰن بن عوف کے غلام ملے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنیاں پکڑ لی گئی ہیں چنانچہ میں نے تین مرتبہ چیخ ماری یا صباحاہ اور میری یہ آواز مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان سنی گئی، پھر میں سیدھا ان کی طرف تیزی سے چل پڑا اور میں نے ان کو جا لیا اور وہ ذی قرد میں پکڑ لئے گئے، پانی پی رہے تھے۔ مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ اس وقت اونٹنیوں کے ساتھ تھے جب ان پر ڈاکہ ڈالا گیا اور پھر بلند ٹیلے پر چڑھ کر چلائے یا صباحاہ، تین مرتبہ چلائے اور اس میں اس بات کو اولیت حاصل ہے کہ وہ غابہ میں تھیں، ان کا ذی قرد میں ہونا قیاس سے دور ہے اور اگر وہ ذی قرد میں ہوتے تو انہیں ان سے ملنا ممکن نہ ہوتا۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی تمام اونٹنیاں چھڑا لی تھیں۔

ایک بات یہ ہے کہ انہوں نے اس میں کہا: ہم مدینہ کی طرف لوٹ آئے، بخدا ہم وہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرے اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ خیبر کی طرف چلے گئے۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں، اس میں اہلِ سیرت کا کوئی اختلاف نہیں کہ غزوۂ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے ہوا تھا۔ انتہٰی۔

بخاریؒ شریف میں غزوہ کی تاریخ اہل سیرت کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے، ہاں واقعہ کے کئی بار ہونے کی وجہ سے دونوں تاریخیں صحیح ہو سکتی ہیں اور پھر حاکم سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے الاکلیل میں ذکر کیا ہے کہ ذی قرد کی طرف جانا متعدد بار ہوا تھا چنانچہ پہلی مرتبہ زید بن حارثہ اُحد سے پہلے وہاں گئے تھے اور دوسری مرتبہ نبی کریم ﷺ ربیع الآخر ۵ھ میں اس طرف نکلے تھے اور اس دوسری مرتبہ میں اختلاف ہے۔ انتہٰی (واللہ اعلم)۔

قصہ عرنیین

(قلت) وجہ یہ بنی کہ ان میں سے آٹھ (جو عکل سے تھے) آئے، مسلمان ہو گئے پھر مدینہ چھوڑ گئے (ہوا موافق نہ آئی) اور انہوں نے کہا: ہم اونٹوں اور دودھ والے ہیں، زرعی زمین والے نہیں ہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں اونٹنیوں کی طرف بھیجا (ایک روایت میں صدقہ کے اونٹوں کا ذکر ہے، اور گویا کہ یہ دونوں ہی طرف بھیجے گئے لہٰذا دونوں کے بارے خبر دینا صحیح ہوا) کہ ان کا دودھ اور پیشاب پئیں، جب وہ صحیح اور تندرست ہو گئے تو انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ ہانک کر لے گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے پیچھے کرز بن خالد فہری کو روانہ کیا اور بیس آدمی ساتھ بھیجے، یہ لوگ لائے گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم دیا گیا اور آنکھ میں گرم سلائیاں پھیرنے کا کہا گیا پھر حکم دیا کہ انہیں دھوپ

میں ڈال دیا جائے جہاں پانی مانگیں تو انہیں دیا نہ جائے حتیٰ کہ یونہی مر جائیں۔ یہ حاصل بخاری ہے۔

اہلِ سیرت نے لکھا ہے کہ اونٹنیاں جماوات کی جانب چرتی تھیں (ایک روایت میں ذی الجدر ہے جو عیر پہاڑ کی غربی جانب مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر تھا)۔

ابن سعد نے ابنِ عقبہ سے روایت کی کہ اس دن گھوڑ سواروں کے امیر سعید بن زید تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں پا لیا' انہیں باندھا اور اپنے گھوڑ سواروں کے پیچھے بٹھا کر لے آئے' اونٹ لوٹا دیئے' ان میں ایک اونٹنی کے علاوہ کوئی گم نہ ہوئی تھی' اس کا نام "الحسنا" تھا' آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ انہوں نے اسے ذبح کر دیا ہے اور جب انہیں مدینہ میں لے کر آئے تو رسول اللہ ﷺ غابہ میں تھے۔

غزوۂ بنی المصطلق (مریسیع)

یہ غزوہ' غزوۂ ذی قرد سے واپس ہونے پر ہوا چنانچہ انہیں ان کی طرف لے گئے اور اسے زغابہ کے مقام پر ملے' چنانچہ ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے' آنکھیں پھوڑ دی گئیں اور وہیں انہیں سولی دی گئی۔ واللہ اعلم۔

پھر آپ نے غزوۂ المصطلق کیا اور حضور ﷺ واپسی کے موقع پر مریسیع سے گذرے' قصۂ افک اسی موقع پر ہوا تھا۔

(قلت) پانچویں ہجری میں غزوۂ مریسیع کا ذکر گذر چکا اور یہ مذکور ہے کہ آیت تیمم اسی میں اُتری گذشتہ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ مریسیع کا واقعہ دو مرتبہ ہوا' پہلے میں تیمم کا حکم ملا اور دوسرے میں واقعۂ افک ہوا اور اسی میں دونوں چیزوں کے جمع کرنے کا ذکر ہے' اہل سیرت نے بڑی تعداد میں ذکر کیا ہے کہ مریسیع ۵ھ میں ہوا جبکہ بخاری نے ابن اسحاق سے روایت کی کہ یہ ۶ھ میں ہوا تھا لیکن صحیح بخاری میں یہ ثابت ہے کہ حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے بتایا افک والوں کے درمیان جھگڑا ہوا تو اگر مریسیع (جسے غزوۂ مصطلق کہتے ہیں) ۶ھ کو ہوا ہو اور واقعۂ افک بھی اسی میں ہوا ہو تو وہ جو بخاری میں سعد بن معاذ کا ذکر آیا ہے' غلط ہوگا کیونکہ حضرت سعد بن معاذ غزوۂ بنو قریظہ کے دن میں فوت ہوئے' یہ ۵ھ تھا' ۴ھ بھی کہتے ہیں لہٰذا سب سے صحیح بات یہ ہے کہ غزوۂ بنو المصطلق اور مریسیع ایک ہی چیز ہیں اور دونوں ہی ۵ھ میں ہوئے۔

ابن عبد البر نے "تمہید" میں لکھا ہے کہ تیمم کا حکم غزوۂ بنو المصطلق کے موقع پر نازل ہوا۔

بخاری میں ہے کہ غزوۂ بنو المصطلق' غزوۂ مریسیع ہی کو کہتے ہیں چنانچہ طبرانی کی حدیث: ہم حضور ﷺ کے ہمراہ غزوۂ مریسیع میں تھے جسے غزوۂ بنو المصطلق کہتے ہیں' یہ بنو خزاعہ کی شاخ تھی۔ ان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا' حضور ﷺ کے ہمراہ بہت سے لوگ تھے' آپ انہیں ان کی طرف اس وقت لے کر نکلے جب پتہ چلا کہ وہ آپ کے خلاف جمع ہو رہے ہیں' آپ کے پاس تیس گھوڑے تھے نیز اُم سلمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہمراہ تھیں' آپ نے

انہیں شکست دی اور بہت سے کافر لوگوں کو گرفتار کر لیا' پھر آپ نے ان کے رئیس حارث کی بیٹی جویریہ سے شادی کر لی اور پھر حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی عزت کی خاطر سب صحابہ کرام نے اپنے اپنے ہاتھ آئے غلام آزاد کر دئے (کہ ہم آپ کی قوم کا کوئی غلام نہ رہنے دیں گے)۔

اسی غزوہ کے بارے میں عبد اللہ بن ابی (منافق) نے کہا تھا:

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ○

''ہم مدینہ پھر کر گئے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے' وہ اس میں سے نکال دے گا' اسے' جو نہایت ذلت والا ہے۔''

پھر یہ بھی کہا:

لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا○

''ان پر خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے پاس ہیں یہاں تک کہ پریشان ہو جائیں۔''

اور یہ ایسے ہوا کہ ابن ابی کچھ منافقوں کو ہمراہ لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلا اور جب دیکھا کہ اللہ نے اپنے رسول کی اور ان کے صحابہ کی مدد فرمائی ہے تو برائی شروع کر دی پھر ایک مہاجر اور انصاری لڑے' مہاجر غالب آیا تو اس موقع پر اس نے اپنی قوم سے یوں کہا تھا۔ حضرت زید بن ارقم نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بتا دی تو ابن ابی نے اپنی کوشش اور تیز کر دی جس کی وجہ سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق اُتار دی۔

حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا' اسے قتل نہیں کرو اور پھر جب ان کے اور اہلِ مدینہ کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا تو عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی جلدی سے مدینہ کے راستے میں جا بیٹھا' اتنے میں اس کا باپ آیا تو اس نے باپ سے کہا: بخدا جب تک رسول اللہ ﷺ تمہیں مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے' میں داخل نہیں ہونے دوں گا' آج تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عزت والا کون ہے اور ذلیل کون۔ اس پر اس منافق نے کہا: تمہارے بغیر کوئی اور روکنے والا نہیں تھا؟ انہوں نے کہا ہاں میں ہی روکوں گا۔ اس پر عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور شکایت کی تو آپ نے اس کے بیٹے کو پیغام بھیجا کہ اس کا راستہ نہ روکو چنانچہ وہ مدینہ چلا آیا۔

صحیح یہ ہے کہ حج اسی سال فرض ہوا تھا۔ (واللہ اعلم)

ساتواں سالِ ہجرت

اسی سال شام میں ابو سفیان اور ھرقل کے درمیان معاملہ ہوا تھا۔

اسی سال کی ابتداء میں آپ نے والیانِ مملکت کی طرف ایلچی بھیجے تھے۔
اسی سال جنگ خیبر ہوئی تھی۔
(قلت) حضورﷺ نے حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب کو بطور مالِ غنیمت لے لیا' انہیں آزاد کیا اور پھر نکاح میں لے لیا۔
اسی سال حضرت ماریہ قبطیہ نے اپنا خچر ہدیہ کے طور پر پیش کیا جس کا نام ولدل تھا۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔
اسی سال سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت الحارث نے حضورﷺ کو زہر دیا۔
پھر آپ وادی القریٰ کی طرف تشریف لے گئے اور کچھ دن وہاں کے لوگوں کا محاصرہ کیا۔
آپ کے غلام مدعم کو اچانک تیر لگا اور وہ شہید ہو گئے۔
مدینہ کی طرف واپسی کے موقع پر سوئے رہنے کی وجہ سے نمازِ صبح فوت ہوئی' یہ بھی آتا ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر فوت ہوئی تھی۔
علامہ واقدی کہتے ہیں کہ اسی سال محرم میں یہودیوں کے رئیس لبید بن اعصم کے پاس آئے (یہ بنو زریق کا حلیف اور جادوگر تھا) اور کہنے لگے: تم نے ہمیں جادو کر دیا ہے' ہم نے محمد کو جادو کیا ہے لیکن کوئی اثر نہیں ہوا' ہم تمہیں اسے مارنے کے لئے رقم دیتے ہیں چنانچہ تین دینار دے دئے۔ پھر پورا قصہ بیان کیا۔
حضرت زہری سے روایت ہے کہ حضورﷺ پر ایک سال تک جادو کا اثر رہا' دوسری روایت میں چالیس راتوں کا ذکر ہے۔ (واللہ اعلم)۔
اسی سال حضرت اُمِ حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہما آپ کے پاس آئیں جن سے آپ نے شادی فرمائی۔
اسی سال قضائے عمرہ کے موقع پر حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی۔

آٹھواں سالِ ہجرت

اس سال جنگ موتہ ہوئی' پھر فتح مکہ ہوئی' غزوۂ طائف ہوا' مکہ پر عتاب بن اسید کو امیر مقرر فرمایا' مالک بن عوف نصری اسلام لائے' ہوازن کا مال غنیمت دل بہلانے کے لئے دیا گیا اور پھر ذی قعدہ کے آخر میں آپ مدینہ کی طرف تشریف لے گئے۔
(قلت) اسی سال حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے بیٹے حضرت ابراہیم سلام اللہ علیہ پیدا ہوئے' ساتویں دن ان کا سر مونڈھا گیا اور بالوں کے وزن کے مطابق چاندی تقسیم فرمائی پھر عقیقہ کے طور پر دو مینڈھے ذبح کئے گئے' وہ ۱۰ھ کو دس ربیع الاول کے دن فوت ہوئے' اس وقت ڈیڑھ سال کی عمر تھی' کچھ نے ایک سال تین ماہ لکھے

ہیں۔اسی سال آپ کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا وصال ہوا' یہ آپ کی سب سے بڑی دختر تھیں' وہ ابو العاص بن ربیع بن عبد العزیٰ بن عبد شمس کی بیوی تھیں جن کی دامادی کے دنوں میں آپ نے ان کی تعریف کی تھی' یہ شادی آپ کے اعلانِ نبوت سے قبل ہوئی اور جب ابو العاص اسلام لے آئے تو پہلے ہی نکاح پر آپ نے سیدہ کو گھر بھیج دیا کیونکہ وہ اس وقت آئے تھے جب مسلمان عورتیں مشرکوں کے لئے حرام قرار دیدی گئی تھیں' یہ صلح حدیبیہ سے بعد کا واقعہ ہے۔(واللہ اعلم)۔

نواں سالِ ہجرت

اس میں آپ نے اپنی بیویوں کو مہینہ پر چھوڑے رکھا تھا۔اسی سال وفد آنے شروع ہوئے اور اسی سال حج فرض کر دیا گیا۔

(قلت)حج کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے' کہتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے فرض ہوا لیکن مشہور یہ ہے کہ بعد میں فرض ہوا چنانچہ کچھ نے ۵ھ کو کہا' ایک موقع پر امام رافعی نے اس کا ذکر کیا ہے' ایک نے ٦ھ لکھا ہے' دوسرے مقام پر رافعی نے اسے صحیح کہا ہے' یونہی نووی نے بھی صحیح کہا ہے' ۷ھ بھی لکھتے ہیں' کسی نے ۸ھ لکھا اور کسی نے ۹ھ' عیاض نے ۹ھ کو صحیح کہا ہے۔(واللہ اعلم)۔

دسواں سالِ ہجرت

اس سال کی ابتداء میں عدی بن حاتم طائی وفد لے کر حاضر ہوئے پھر بنو حنیفہ کا وفد آیا پھر وفد غسان آیا' پھر وفد نجران آیا جس میں مباہلہ کا واقعہ ہوا' پھر حضرت جبریل دین سکھانے آئے اور پھر اسی سال آپ نے جنگ تبوک کی۔

(قلت)یہ روایت ہماری بیان کردہ پہلی روایت کے خلاف ہے جس میں واقعہ تبوک ۹ھ میں ہونے کا ذکر ہے۔(واللہ اعلم)۔

اسی سال آپ نے لوگوں کو حجۃ الوداع کے لئے بلایا اور پھر واپس تشریف لائے' پھر اسی سال صفر کی دس تاریخ کو آپ بیمار ہوئے اور پھر ربیع الاوّل شریف کی بارہ تاریخ کو پیر کے دن وصال ہوا۔(رزین بذریعہ حاکم)۔

(قلت) یہ واقعہ ماہِ ربیع الاوّل ۱۱ھ کا تھا۔

حضور ﷺ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے کہ مرض شروع ہوا' یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے اور یہ بھی آتا ہے کہ حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔

ابتداءِ مرض نبوی اور تاریخ وصال کی تحقیق

علامہ خطابی نے مرض کی ابتداء پیر کو لکھی ہے' کچھ ہفتہ اور کچھ بدھ کا دن بتاتے ہیں۔''روضہ'' میں مرض کی مدت چودہ دن لکھی ہے اور پہلے اسی کا ذکر کیا ہے پھر تیرہ دن لکھی ہے اور اکثر علماء یہی بتاتے ہیں' کسی نے دس دن

لکھی ہے، سلیمان تیمی اسی پر یقین رکھتے ہیں، اس سارے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مدت بیس دن سے زیادہ تھی لیکن کسی نے کھل کر بیان نہیں کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ وصال مبارک پیر کو ہوا تھا اور ربیع الاوّل میں ہونے پر اجماع ہے لیکن بزار میں حضرت ابنِ مسعود کی روایت گیارہ رمضان بتاتی ہے، بہرحال ۱۲ ربیع الاوّل میں ہونا جمہور کا قول ہے، ایک جماعت اس طرف ہے کہ یکم ربیع الاوّل کو ہوئی تھی۔ یحییٰ نے ابن شہاب کے مطابق بتایا کہ جب سورج ڈھلا تھا۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نصف ربیع الاوّل کو وصال ہوا، کسی نے ۲ ربیع الاوّل لکھا ہے، سہیلی اسی کو مانتے ہیں۔

ہاں جمہور کے اس قول ماننے میں دشواری پیش آتی ہے، سب علماء تسلیم کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کو جمعہ کا دن تھا چنانچہ اوّل تاریخ جمعرات تھی پھر اگر پچھلے تینوں مہینے یکے بعد دیگرے تیس تیس دن کے گنے جائیں، تینوں پورے نہ ہوئے ہوں یا کوئی مکمل اور کوئی نامکمل ہوں تو پھر آپ کا وصال پیر کو نہیں بنتا جبکہ تاریخ بارہ (۱۲) ربیع الاوّل ہی بنتی ہے۔

اس کا جواب علامہ بازری نے دیا ہے: احتمال یہ ہے کہ تینوں مہینے مکمل گذرے ہوں لیکن اہل مکہ و مدینہ کا اختلاف ذوالحجہ کے چاند دیکھنے میں ہوا ہو چنانچہ اہلِ مکہ نے تو جمعرات والی رات کو دیکھا ہو، ۱۲ تاریخ اور پیر کا دن ہو لیکن اہل مدینہ نے اسے جمعہ کے علاوہ کسی اور دن نہیں دیکھا تھا، اب اہل مکہ نے تو دیکھا لیا اور پھر مدینہ پاک میں گئے تو وہاں چاند دیکھ کر تاریخ لکھی چنانچہ یکم ذی الحجہ کو جمعہ تھا، پھر یہ اور بعد والے مہینے مکمل تھے چنانچہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ جمعرات آئی اور ۱۲ ربیع الاوّل پیر کو آتی اب اس کے بعد جواب دینے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

سلیمان تیمی کا یقین ہے کہ آپ کا مرض ہفتہ، ۱۲ صفر کو شروع ہوا اور وصال مبارک پیر، ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوا، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ماہِ صفر ناقص تھا اور اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ صفر کی پہلی تاریخ کو ہفتہ ہو جب تک ذوالحجہ اور محرم ناقص نہ ہوں ورنہ لازم آئے گا کہ تینوں مہینے مسلسل ناقص ہوں اور جو بھی ربیع الاوّل کا نام لیتے ہیں تو دو ناقص بنتے ہیں اور ایک کامل اور یونہی اس قول کی حیثیت ہے جس نے نصف کا نام لیا ہے۔

علامہ بدر بن جماعہ نے کہا کہ جمہور کے قول "۱۲ راتیں گذرنے پر" (یعنی دنوں سمیت) میں احتمال رہے گا چنانچہ آپ کا وصال ۱۳ تاریخ کو بنے گا اور مہینے کامل گنے جائیں گے، یوں جمہور کا قول صحیح ہو جائے گا لیکن اس پر پھر وہی اعتراض آئے گا اہلِ زبان کی اس میں مخالفت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ جب "لا ثنتی عشرۃ" (بارہ) کہتے ہیں تو اس میں سے بارہ راتوں کا گذرنا مراد لیتے ہیں اور وہ جو بارہ تاریخ کو آتا ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر کہتے ہیں، قابلِ اعتماد اور ابومخنف کا قول ہے کہ ۱۲ تاریخ کو ہوا تھا۔

غسلِ نبوی

حضور علیہ السلام کی وصیت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آپ کو غسل دیا، حضرت عباس اور ان کے بیٹے

مدد کرتے رہے' حضرت قثم' اسامہ اور شقران پانی بہاتے رہے' آپ کو سحول سے منگوائے تین کپڑوں کا کفن دیا گیا جن میں نہ قمیص تھی نہ عمامہ' حضرت محمد سے روایت ہے کہ آپ کے لئے صحاری کے دو کپڑے بطور کفن استعمال کئے گئے جو عمان میں روئی سے بنتے تھے اور ایک چادر حبرہ کی تھی۔

اکلیل میں حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ کو سات کپڑوں کا کفن دیا گیا' اور بغیر امام کے حجرہ ہی میں آپ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔علامہ اقشہری نے حسین بن محمد صدفی سے روایت کی کہ حضور ﷺ کا جنازہ مسجد کے روضہ (ریاض الجنہ) کے درمیان ہوا اور پھر گھر کی طرف اُٹھا کر لے جایا گیا اور اسی میں دفن کئے گئے۔

(قلت) یوں صرف ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مشہور ہے جبکہ مستدرک اور بزار میں ہے کہ آپ نے وصیت فرمائی تھی' ان کا جنازہ ہاتھ باندھے بغیر پڑھا جائے' امام نہیں ہونا چاہئے۔

آپ کو بدھ کی رات یا کہتے ہیں بدھ کے دن دفن کیا گیا' کچھ کا کہنا ہے کہ آپ کے وصال کا ناخنوں سے اظہار ہونے لگا تھا تو منگل کے دن آپ کو دفن کیا گیا۔کچھ لوگوں نے کہا تھا کہ آپ کو مسجد میں دفن کیا جائے جبکہ دوسرے بقیع میں کہتے تھے پھر سب نے اتفاق کیا اور گھر میں دفنائے گئے چنانچہ گھر سے چارپائی اُٹھائی گئی اور اسی جگہ قبر انور کھو دی گئی۔

ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ نے بتایا' نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: جب بھی کوئی نبی وصال فرما گیا تو اسے وہیں دفن کیا گیا جہاں ان کی روح قبض کی گئی۔

مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا حکم

حضور ﷺ نے مرض کے دوران وصیت فرمائی کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے جیسے بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ نے یہ حکم دیا تھا' الفاظِ بخاری یوں ہیں: صحابہ کو تین چیزوں کا حکم فرمایا:

(۱) مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو (۲) وفد آنے پر وہی سلوک کرو جو میں کرتا رہا ہوں۔رہی تیسری بات تو یا پھر خاموش رہے یا خود میں اسے بھول گیا۔

علامہ داؤدی کہتے ہیں کہ تیسری بات قرآن کے بارے میں وصیت تھی لیکن مہلب کے مطابق یہ لشکر اسامہ کی تیاری کے متعلق تھی' ابن بطال نے اسی بات کو طاقت دی کہ صحابہ کرام نے جب حضرت ابوبکر کے لشکر اسامہ بھیجنے کی مخالفت کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے وصال کے وقت مجھ سے عہد لے لیا تھا۔

قاضی عیاض کے مطابق تیسری بات لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِی وَثَنًا (میری قبر کو بت نہ بنا لینا) والا قول بھی ہوسکتا ہے کیونکہ یہ فرمان مؤطا میں یہودیوں کو نکالنے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور وہ بھی مراد ہوسکتا ہے جو حضرت انس رضی اللہ

عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ: نماز کی پابندی کرنا اور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔

مشرک بحکمِ عمر جزیرہ سے نکلے

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے (بامر نبوی) مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکالا تھا چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں اور نصرانیوں کو سرزمین حجاز سے نکالا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر فتح فرمایا تو ارادہ فرمایا کہ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں' فتح خیبر پر زمین تو اللہ و رسول اور مومنین ہی کی تھی چنانچہ یہودیوں نے آپ سے درخواست کی ہمیں رہنے دیا جائے' ہم آدھا پھل دیتے رہیں گے' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تک ہم چاہیں گے' تمہیں یہاں رہنے دینگے' انہوں نے یہ بات مان لی اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں انہیں تیماء اور اریحا کی طرف نکال باہر کیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اہلِ خیبر نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کے جوڑوں کو نقصان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا کہ حضور ﷺ نے مال کے بدلے یہودیوں کو رہنے دیا تھا اور فرمایا تھا: ہم تمہیں اس وقت تک رہنے دیں گے جب تک اللہ کو منظور ہے' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وہاں اپنی زمین کی طرف گئے تو رات کو آپ کا مال چوری کر لیا گیا' آپ کے پاؤں اور ہاتھ خراب کر دیئے گئے' وہاں ان کے علاوہ وہ کوئی اور دشمن تو موجود نہ تھا چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہی ہمارے دشمن ہیں لہٰذا میں انہیں یہاں سے نکال رہا ہوں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر سب کو قائل کر لیا تو بنو حقیق میں سے ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! ہمیں حضرت محمد ﷺ نے برقرار رکھا ہے تو کیا آپ ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے ہمیں مال کی شرط پر رہنے دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے خیال میں میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھول چکا تھا: ''وہ وقت کیسا ہوگا جب تم انہیں خیبر سے نکالو گے تو ہر رات تمہیں تمہاری اونٹنی دوڑائے گی؟'' اس نے کہا یہ تو محمد کی ایک خوش طبعی تھی۔ آپ نے فرمایا: اے دشمنِ خدا! تم نے جھوٹ بکا ہے چنانچہ آپ نے انہیں جلا وطن کر دیا پھر ان کے پاس جو بھی مال' پھل' اونٹ' سامان وغیرہ تھا اس کی قیمت دے دی۔ ظاہر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی قصے کی بناء پر انہیں وہاں سے نکال دیا تھا۔

حضرت مالک بن شہاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جزیرۃ العرب میں دو دین اکٹھے نہیں چل سکیں گے۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات کھل گئی اور انہیں یقین و اطمینان ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ: جزیرۃ العرب میں دو دین نہیں چل سکیں گے۔ چنانچہ آپ نے خیبر کے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ حضرت مالک کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے نجران اور فدک کے یہودیوں کو بھی نکال دیا تھا۔

بیہقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو میں یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا۔ یہی روایت حضرت امام مسلم نے "اگر میں زندہ رہا" کے الفاظ کے بغیر نقل کی ہے۔ حضرت ابو عبیدہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخر دم یہ فرمایا تھا: حجاز کے یہودیوں اور اہلِ نجران کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔ (مسند احمد' بیہقی)۔

احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے فرمایا تھا: رسول اللہ ﷺ نے آخری بات یہ فرمائی تھی: "جزیرۃ العرب میں دو دین نہیں رہنے دیئے جا سکتے۔"

ہمارے (شافعی حضرات) میں سے جوینی اور قاضی حسین نے کہا کہ: جزیرہ' حجاز کو کہتے تھے لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ جزیرۃ العرب کا حصہ ہے۔

حضرت ابوبکر نے یہود و نصاریٰ کو کیوں نہیں نکالا تھا

جب نبی کریم ﷺ کا وصال مبارک ہو گیا تو اپنے دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انہیں نکالنے کا وقت نہیں مل سکا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں نکالا' یہ تقریباً چالیس ہزار تھے پھر یہ کہیں نہیں ملتا کہ خلفاءِ عظام نے انہیں یمن سے بھی نکالا ہو جبکہ وہ بھی تو جزیرہ ہی میں شامل تھا' جس سے معلوم ہوا کہ مراد صرف حجاز تھا۔

یہ لکھا ملتا ہے کہ یہودیوں نے ایک تحریر دکھائی تھی اور دعویٰ یہ کیا کہ حضور ﷺ کی تحریر ہے جس میں اہلِ خیبر سے جزیہ کی معافی کا ذکر تھا' اس پر صحابہ کرام کی شہادتیں درج تھیں' جب یہ تحریر ابوبکر خطیب بغدادی کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ نری جعل سازی ہے' کیونکہ اس میں حضرت معاویہ کی شہادت موجود ہے اور وہ تو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور اس تحریر کے وقت موجود نہ تھے۔ اس میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی بھی شہادت ہے جو خندق کے موقع پر بنو قریظہ میں تیر لگنے سے قتل ہو گئے تھے اور یہ واقعہ خیبر سے دو سال پہلے کا تھا۔ یہ فوائد علم تاریخ سے ملے ہیں۔ واللہ اعلم۔

چوتھا باب

اس میں ان امور کا ذکر کیا گیا ہے جو نبی کریم ﷺ کی مسجد مبارک سے تعلق رکھتے ہیں' پاکیزہ حجروں کا ذکر ہے اور پھر ان مکانوں کا ذکر ہے جو ان حجروں کے اردگرد تھے' پھر بازار مدینہ اور مہاجرین کے گھروں کا ذکر ہے اور دیواروں کی تعمیر بتائی گئی ہے۔اس میں ۳۷ فصلیں ہیں۔

پہلی فصل

اس میں یہ مذکور ہے کہ مسجد کی جگہ کیسے لی گئی اور تعمیر کیونکر ہوئی؟

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی جب مسجد کے دروازے کے سامنے بیٹھی تو آپ نے فرمایا تھا:
''انشاء اللہ یہی میرا ٹھکانہ ہوگا۔''

علامہ زھری سے ہے کہ وہ اونٹنی مسجد رسول اللہ ﷺ والی جگہ کے قریب بیٹھی' ان دنوں مسلمان اس مقام پر نماز پڑھا کرتے تھے' پہلے یہاں اونٹ بیٹھا کرتے تھے اور یہ جگہ دو یتیموں کی تھی جو حضرت اسعد بن زرارہ کی نگرانی میں تھے۔اونٹنی یہاں بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انشاء اللہ ہماری یہی منزل ہوگی'' پھر آپ نے یہ دعا بھی فرمائی: الٰہی! ہمیں برکت والی جگہ میں ٹھکانہ عطا فرما جبکہ ٹھکانہ دینے والوں میں تو سب سے بہتر ہے۔چار مرتبہ فرمایا تھا۔

رزین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایسی ہی روایت کی' الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انشاء اللہ یہی منزل ہوگی'' پھر سواری سے اُترے تو دعا فرمائی: ''الٰہی! مبارک ٹھکانہ میں رہنا نصیب فرما' سب سے بہتر جگہ دینے والا تو ہی ہے۔'' آپ نے چار مرتبہ کا ذکر نہیں کیا۔

علامہ زھری لکھتے ہیں کہ اونٹ بٹھانے کا یہ باڑہ سہل اور سہیل کا تھا' یہ دونوں ابو امامہ اسعد بن زرارہ کی پرورش میں تھے اور جب حضور ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی تو آپ نے فرمایا: ''انشاء اللہ یہی ٹھکانہ ہوگا۔'' پھر دونوں بچوں کو بلایا اور اس باڑے کی قیمت لگائی تاکہ اسے مسجد بنا سکیں' وہ دونوں بولے: یا رسول اللہ! ہم آپ کو ہبہ کئے دیتے ہیں' آپ نے یوں لینے سے انکار فرمایا اور پھر قیمت دے کر خریدا اور اسے مسجد بنا دیا۔

یحییٰ نے ابن زبالہ کی پیروی میں کہا: ''کچھ کہتے ہیں کہ یہ دونوں یتیم بچے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے غلام تھے' سہل اور سہیل نام تھے جو عمرو کے بیٹے تھے۔حضور ﷺ نے حضرت ابو ایوب سے وہ باڑا مانگا تو انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ! یہ باڑا دو یتیم بچوں کا ہے' میں انہیں رضا مند کر لوں گا چنانچہ انہوں نے انہیں راضی کر لیا' انہوں نے یہ

زمین رسول اللہ ﷺ کو دے دی تو آپ نے وہاں مسجد بنا دی۔

ابن اسحاق بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ یہ باڑہ کس کا ہے؟ معاذ بن عفراء نے عرض کی کہ یہ سہل و سہیل کا ہے جو عمرو کے بیٹے ہیں اور دونوں یتیم میرے پاس ہیں' میں جلد انہیں رضا مند کرلوں گا اور لے دونگا' آپ نے اسے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور اسے تعمیر کرنے کا حکم فرمایا۔

ابن زبالہ نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ مسجد سہل اور سہیل کی جگہ تھی جو ابو عمرو کے بیٹے تھے جن کا تعلق بنو غنم سے تھا' انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پیش کر دی تو آپ نے وہاں مسجد بنا دی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد کی جگہ کے بارے میں بنو نجار کے ایک گروہ کو پیغام بھیجا اور فرمایا اے بنو نجار! مجھ سے اس جگہ کی قیمت لے لو' انہوں نے عرض کی بخدا ہم قیمت نہیں لیں گے ہم اللہ کی رضا کے لئے پیش کریں گے۔ اسماعیلی کہتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ہم اللہ سے قیمت لے لیں گے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قیمت وصول نہیں کی تھی۔

صحیح بخاری کے باب الہجرۃ میں مسجد قباء کی بنیاد رکھنے کے بعد کی یہ روایت ملتی ہے: پھر رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے' ہمراہی ساتھ چلتے گئے اور وہ اونٹنی مدینہ میں مسجد نبوی کے پاس جا بیٹھی' وہاں ان دنوں مسلمان نمازیں پڑھا کرتے تھے' یہ کھجوریں سکھانے کا باڑا تھا' سہل و سہیل دو یتیم بچے اس کے مالک تھے جو حضرت اسعد بن زرارہ کی پرورش میں تھے' جب اونٹنی بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انشاء اللہ ہماری منزل یہی ہو گی۔ پھر دونوں لڑکوں کو بلایا اور وہ جگہ مسجد کے لئے بیچنے کو کہا' دونوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ہم بیچیں گے نہیں بلکہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ آپ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں قیمت دیئے بغیر نہیں لوں گا پھر خرید کر آپ نے مسجد بنا دی۔

ابن عیینہ کی روایت ہے کہ آپ نے دونوں کے چچا سے بات کی تھی (جس کی نگرانی میں تھے) کہ ان سے خرید دیں' اس نے ان سے مانگی تو انہوں نے کہا: اسے کیا کرو گے؟ اسے سچی بات کرنا پڑی' کہ رسول اللہ ﷺ لینا چاہتے ہیں۔ دونوں نے کہا کہ ہم انہیں بلا قیمت دے دیں گے چنانچہ دونوں نے پیش کر دی اور آپ نے اس جگہ مسجد بنا دی۔ (جندی)۔

ان روایتوں کو جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ (جیسے ابن حجر نے اشارہ کیا) جب انہوں نے کہا: ہم اس کی قیمت اللہ کے ہاں سے لے لیں گے آپ سے کچھ نہیں مانگتے تو پھر آپ نے خاص مالک پوچھے ہوں گے لہٰذا انہوں نے دو یتیم بچے معین کر کے بتا دیئے چنانچہ آپ نے ان سے یا ان کے نگرانوں سے (اگر وہ نابالغ تھے) وہ باڑا خرید لیا' ایسے وقت میں احتمال یہ ہے کہ جنہوں نے یہ الفاظ کہے تھے انہوں نے اپنی گرہ سے قیمت دینے کا ارادہ کر لیا ہو چنانچہ ابن عقبہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت اسعد نے ان بچوں کو بنی بیاضہ میں' اس کے عوض کھجوروں کا باغ دے دیا تھا۔ پھر پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت ابو ایوب نے کہا تھا " یہ میرے پاس رہنے والے دو یتیموں کی ہے' میں انہیں رضا مند کرلوں گا چنانچہ انہوں

نے انہیں رضا مند کر لیا۔ یونہی معاذ بن عفراء نے کہا تھا تو یہ بات خرید نے کے بعد ہوئی ہوگی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت اسعد' ابو ایوب اور ابن عفراء نے اپنے اپنے طور پر انہیں کچھ نہ کچھ دے کر رضا مند کرنے کی کوشش کی ہو چنانچہ رضا مند کرنے میں سب شامل ہوئے اور یہ جو آیا ہے کہ دونوں یتیموں نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابتداء میں ایسا ہوا ہوگا لیکن اس میں مشکل ہے جو ابن سعد کی تاریخ کبیر میں آئی ہے اور جو علامہ واقدی نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اسے عفراء کے دونوں بیٹوں سے دس سونے کے دیناروں کے بدلے خریدا تھا' یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ادا کئے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خرید درحقیقت عفراء کے دونوں بیٹوں سے کی گئی کیونکہ وہ دونوں ان یتیم بچوں کے ولی اور نگران تھے چنانچہ حضرت ابوبکر نے بھی نیکی کا رواج ویسے ہی ڈالا جیسے اسعد' ابو امامہ اور معاذ بن عفراء نے ڈالا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر نے انہیں دس دینار دے دیئے تھے جبکہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی طرف سے انہیں کچھ دیا تھا لیکن حضور ﷺ نے شروع میں بلا قیمت لینے سے انکار فرمایا تھا کیونکہ یہ یتیموں کی تھی لیکن ابن سید الناس نے بلا ذری سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آئندہ کلام کے بعد کہا:

''چنانچہ اسعد نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اسے قبول کرنے کی درخواست کی اور یتیموں سے بطور قرض لے لی' رسول اللہ ﷺ نے لینے سے انکار فرما دیا اور پھر ان سے دس دیناروں کے عوض خریدی جو حضرت ابوبکر کے مال سے ادا کر دیئے گئے۔ انتہی۔

تو اس میں احتمال ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے باڑے کا کچھ حصہ خریدا ہو اور پھر دوسرا حصہ خریدا ہو کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ آپ نے دوبارہ اس میں زیادتی کر لی تھی چنانچہ یہ ایک واقعہ نہ ہوا۔

میں نے اقشہری سے ایک روایت کے ذریعے ان کے قلم سے لکھا دیکھا ہے کہ یہ باڑہ عفراء ہی کے دونوں بیٹوں کا تھا۔

(قلت) احتمال یہ ہے کہ ان کی طرف نسبت اس لئے ہو کہ یہ دونوں ان یتیموں کے والی تھے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یتیموں کی ماں کا نام اس عفراء ہو' رہے عفراء (مرد) کے دونوں بیٹے تو وہ معاذ اور معوذ تھے جو حارث کے بیٹے تھے لیکن جو بخاری میں غلاموں کا نام سہل اور سہیل آتے ہیں' وہ زیادہ صحیح ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

یحیٰی کی کتاب میں جو لکھا ہے' اس کا مقصد یہ بنتا ہے کہ اس باڑے کو حضرت اسعد بن زرارہ نے مسجد کی شکل دی تھی جبکہ ابھی اسے مسجد الرسول کا نام نہیں دیا گیا تھا کیونکہ یحیٰی نے لکھا: میں نے اُم سعد بنت سعد بن ربیع کو کہتے سنا: مجھے نوار بنت مالک اُمِ زید بن ثابت نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے اسعد بن زرارہ کو یہاں پانچوں نمازیں پڑھاتے دیکھا۔

ان روایات کو اس مسجد میں جمع کیا جا سکتا ہے جیسے سہل و سہیل کے باڑے میں بنایا گیا تھا اور بنو رافع بن ابو عمرو بن عائذ بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار کے بیٹے تھے۔ وہ کہتی ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے آنے پر

دیکھا کہ اس مسجد میں نماز پڑھاتے تھے اور پھر اسے بنا دیا تو آج کی یہ مسجد وہی ہے۔

ابن سید الناس نے ابن اسحاق سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی مسجد کے دروازے کے قریب آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی' وہ جگہ ان دنوں بنو مالک بن نجار کے دو یتیموں کی تھی جو معاذ بن عفراء کی نگرانی میں تھے' یہ عمرو کے دو بیٹے تھے۔

پھر کہا: احمد بن یحییٰ بلاذری نے کہا: رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہرے' انصار نے ہر ممکن تعاون کیا اور عرض کی' یا رسول اللہ! آپ چاہیں تو ہم اپنے گھر پیش کرنے کو تیار ہیں' آپ نے دعا دی۔ انہوں نے کہا کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ اپنے اردگرد والوں کو جمع کرتے کہ مسجد میں آئیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ وہاں نماز پڑھتے رہے پھر آپ نے اسعد سے پوچھا کہ اس مسجد کے متصل وہ جگہ فروخت کر دیں جو ان کے قبضے میں تھی اور جو دو یتیم بچوں کی تھی جو ان کی نگرانی میں تھے اور جنہیں سہل و سہیل کہا جاتا تھا' وہ رافع بن ابو عمرو بن عائذ بن ثعلبہ بن غنم کے بیٹے تھے۔ بلاذری نے یونہی منسوب کیا ہے' یہ روایت ابن اسحٰق وغیرہ کی روایت کے خلاف ہے لیکن پہلی روایت زیادہ مشہور ہے۔ انتہی۔

پہلی روایت کی شہرت کہ وہ بچے عمرو کے تھے' پہلے گزر چکی لیکن دوسری روایت بھی (جو راجح ہے) گزر چکی ہے جو دوسرا مفہوم بتاتی ہے۔

علامہ مجد لکھتے ہیں: بیہقی نے مسجد کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کی خالی دیواریں تھیں' چھت نہیں تھی اور اس کا قبلہ بیت المقدس تھا' حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے اسے بنایا تھا' وہ اس میں اپنے ساتھی لے کر نماز پڑھا کرتے تھے اور حضور ﷺ کی آمد سے پہلے اس میں جمعہ کے لئے لوگوں کو اکٹھا کرتے تھے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس باغ اور غرقد میں سے کھجوروں کے درخت کاٹنے کا حکم دیا' وہاں دورِ جاہلیت کی قبریں بھی تھیں جو آپ کے حکم پر کھو دی گئیں اور آپ نے حکم فرمایا کہ ہڈیاں غائب کر دی جائیں۔

اس باڑے میں ایک جوہڑ تھا (جہاں پانی جمع رہتا) آپ نے اسے (نالی کھود کر) چلا دیا تو وہ ختم ہو گیا۔ انتہی۔

یہ بات میں نے بیہقی کی المعرفۃ نیز سنن کبیر اور دلائل میں بھی نہیں دیکھی مگر مشہور یہ ہے کہ یہ کھجوریں سکھانے کا گویا باڑہ تھا اور گویا اسے حدیقہ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں کھجور کے درخت تھےچنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اسے خریدا تھا تو اس میں کھجوریں' مشرکوں کی قبریں اور اونچی نیچی جگہ تھی' حضور ﷺ نے کھجوروں کے بارے میں فرمایا تو وہ کاٹ دی گئیں' قبروں کے بارے میں فرمایا تو وہ اکھاڑ دی گئیں اور اونچی نیچی جگہ کے بارے میں فرمایا تو اسے برابر کر دیا گیا چنانچہ قبلہ کی طرف ایک صف میں کھجوریں گاڑ دی گئیں اور پتھروں سے دو دروازے بنا دیئے گئےجبکہ ہم احکامِ حرم میں پہلے بتا چکے ہیں کہ کھجوروں کو کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا اور گویا آپ کے لئے قبلہ کی طرف کھجوریں لگانے کا مقصد یہ تھا کہ قبلہ کی طرف انہیں بطور ستون گاڑا گیا کہ اس پر چھت ڈالی جا سکے جیسے صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اینٹوں سے بنی تھی اور چھت پر کھجور کی باریک ٹہنیاں ڈالی گئی تھیں اور

ستون کھجور کے تنوں سے بنے تھے۔ یحییٰ کی روایت میں آگے آ رہا ہے کہ اس باڑے کے درمیان میں مشرکوں کی قبریں تھیں، حضورﷺ کے ارشاد پر کھود دی گئیں، ہڈیاں نکالی گئیں اور انہیں غائب کر دینے کا حکم دیا گیا، وہاں پانی جمع رہتا تھا، نالی کھود کر اسے چلایا گیا تو وہ نکل گیا۔

عطاف بن خالد کی روایت میں ہے کہ حضورﷺ نے اس جھونپڑی میں بارہ دن تک نمازیں پڑھیں، پھر اسے بنایا اور چھت ڈال دی، اس کی شہادت آگے آ رہی ہے۔

ابن زبالہ حضرت انس سے روایت لکھتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے پہلے یہ مسجد کھجور کی ٹہنیوں سے بنائی اور پھر ہجرت کے چار سال بعد اینٹوں سے بنائی۔ میرے خیال میں یہ بے مقصد بات ہے۔

ابن زبالہ ہی نے شہر بن حوشب سے روایت کی، انہوں نے کہا: جب رسول اللہﷺ نے مسجد کی بنیاد کا ارادہ کیا تو آپ سے عرض کی گئی: پتھر سے جھونپڑی بنایئے جیسے آپ کے بھائی موسیٰ علیہ السلام نے بنائی تھی، پیائش سات ہاتھ ہو۔ یحییٰ نے اور طریقے سے شہر کی روایت بتائی، الفاظ یہ ہیں: جب رسول اللہﷺ مسجد بنانے کا ارادہ فرمایا، رزین نے یہ الفاظ لکھے: جب رسول اللہﷺ مسجد کی بنیاد رکھنے کا ارادہ فرمایا تو فرمایا: مجھے کہا گیا: جھونپڑی بنایئے جیسے آپ کے بھائی موسیٰ نے بنائی تھی، پیائش سات ہاتھ تھی۔

یحییٰ نے حسن کے ذریعے بتایا کہ جب رسول اللہﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو فرمایا: میرے لئے مسجد بنا دو، بس چھپر ہو اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چھپر جیسا ہو، اسے ہمارے لئے کچی اینٹوں سے تیار کرو۔ علامہ نے ان الفاظ میں لکھا: جب آپ نے مسجد بنانا شروع کی تو فرمایا کہ میرے لئے ایک چھپر بنا دو جیسا موسیٰ علیہ السلام کا تھا، جس پر گھاس پھوس اور لکڑیاں ہوں، موسیٰ علیہ السلام کی طرح سائبان ہو۔ پوچھا موسیٰ علیہ السلام کا سائبان کیسا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ جب وہ کھڑے ہوئے تو ان کا سر چھت سے لگ جاتا۔

تعمیر میں آپ نے خود حصہ لیا تاکہ صحابہ میں کام کا شوق پیدا ہو سکے۔ صحیح بخاری کی پہلی روایت میں اس قول کے بعد ''اور پھر ان دونوں نے یہ زمین خرید لی'' رسول اللہﷺ نے کپڑے میں ڈال کر ان کے ساتھ اینٹیں لے جانا شروع کیں، اینٹیں اُٹھاتے وقت فرماتے:

''(اینٹوں کا) یہ بوجھ اُٹھانا خیبر جیسا نہیں، اے پروردگار! یہ بہت اچھا اور پاکیزہ ہے۔''

اور فرماتے:

''اے اللہ! اصل اجر تو آخرت میں ملے گا تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔''

ابن شہاب کہتے ہیں کہ آپ نے یہ شعر مسلمانوں میں سے کسی کے پڑھے تھے، احادیث میں ان مکمل شعروں کے علاوہ ہمیں مکمل شعر نہیں ملتے جو آپ نے پڑھے ہوں۔

یحییٰ نے زہری سے ان الفاظ ''یہ بوجھ خیبر جیسا نہیں'' کا معنی بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہودی جب کھجوریں اتار

لیتے تو دیہاتی لوگ اپنے تھیلے وغیرہ لے کر آ جاتے اور عمدہ کھجوریں تھوڑی تھوڑی شہروں کی طرف لے جا کر بیچا کرتے۔

صحیح بخاری کی پہلی روایت میں "انہوں نے دروازہ گاڑ کر دونوں طرف پتھر سے دیواریں بنا دیں۔" اس قول کے بعد لکھا ہے: وہ یہ پتھر اٹھاتے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ یوں گاتے جاتے:

"الٰہی! آخر کی بھلائی کے علاوہ اور کوئی بھلائی نہیں لہٰذا انصار اور مہاجرین کی مدد فرما۔"

کہتے ہیں کہ یہ اشعار عبد اللہ بن رواحہ کے تھے۔

زھری کہتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام یہ اشعار خوبصورت آواز سے پڑھتے اور رسول اللہ ﷺ اینٹیں اٹھاتے وقت خود یہی پڑھتے تھے۔ آپ درست طریقے سے اشعار نہیں کہہ سکتے تھے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَ مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهٗ ؕ (سورۂ یٰسین:۶۹)

"نہ ہم نے انہیں شعر سکھائے اور نہ ہی ان کے لائق تھے۔"

یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ ثواب کے ارادے اور بھلائی کا شوق پیدا کرنے کے لئے کرتے تھے تاکہ ہر شخص یونہی کیا کرے' اس لئے کسی بھی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ حضور ﷺ کی ذات سے اپنے آپ کو دور رکھے' اسی لئے ابن زبالہ کے مطابق مجمع بن یزید نے اس کے بعد کہا تھا: صحابہ نے یہ کام کیا اور رسم ڈال دی چنانچہ مسلمانوں میں سے کسی نے کہا تھا:

"اگر (بالفرض) ہم بیٹھ بھی جاتے تو رسول اللہ ﷺ کام کر ہی رہے ہوتے' اس وقت یہ کام بے مثال حیثیت کا ہوتا۔"

پھر انہوں نے حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی لکھا کہ مسجد کا کام کرتے وقت یہ گنگناتے جاتے:

"وہ شخص جو مسجد کی تعمیر کرتا اور کھڑے ہوتے' بیٹھتے اس میں مسلسل محنت کرتا ہے اور پھر وہ شخص جو گرد و غبار سے بچتے دکھائی دیتا ہے' برابر نہیں گنے جا سکتے۔"

پھر انہی حضرات نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: "حضور ﷺ نے اپنی مسجد بنائی جس کے لئے کچی اینٹیں اور ضرورت کا سامان قریب لاتے رہے چنانچہ آپ اُٹھے اور چادر بچھائی' قدیم مہاجرین و انصار نے دیکھا تو انہوں نے بھی اوپر نیچے کی چادریں بچھا دیں پھر گنگناتے ہوئے کام کرتے جاتے اور کہتے جاتے:

"اگر ہم بیٹھ بھی جاتے تو رسول اللہ ﷺ کام کر رہے ہوتے۔"

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نہایت صاف ستھرے اور بہت پاکیزہ رہنے والے تھے' وہ اینٹیں اُٹھاتے تو انہیں اپنے کپڑوں سے دور رکھتے اور اینٹیں لے جا کر رکھ دیتے تو آستین جھاڑ لیتے' کہیں مٹی لگ جاتی تو اسے گرا دیتے' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے انہیں دیکھا تو یہی پہلے اشعار "مسجدیں تعمیر کرنے والے برابر نہیں" پڑھتے جاتے۔

یہ اشعار حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے سنے تو انہوں نے بھی گنگنانا شروع کر دیا حالانکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس سے وہ کیا مراد لے رہے ہیں' پھر پڑھتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب سے گذرے تو کہتے: اے ابنِ سمیّہ! مجھے معلوم نہیں ہو رہا کہ کس کے بارے میں کہے جا رہے ہو' ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی' کہنے لگے: یا تو رُک جاؤ یا میں یہ تمہارے منہ پر دے ماروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ سن لیا' آپ میرے گھر کے سائے میں تشریف فرما تھے (یعنی اُم سلمہ کے)۔ یحییٰ کی کتاب میں الفاظ یہ ہیں: ''اپنے گھر کے سائے میں'' اس سے حضور ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ عمار بن یاسر میرے سامنے مضبوطی سے کام کئے جا رہے ہیں' اگر ایسے میں کسی نے کچھ کہہ دیا تو تکلیف وہ بات ہوگی پھر اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھ لیا چنانچہ لوگ اس بات سے رُک گئے۔ بعد میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کی وجہ سے حضور ﷺ نے ناراضگی فرمائی ہے' ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے متعلق کوئی آیت نہ اُتر آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں حضور ﷺ کو ویسے ہی رضا مند کرتا ہوں جیسے آپ نے ناراضگی فرمائی ہے' چنانچہ عرض کی' یا رسول اللہ! آپ کے صحابہ مجھ سے کیسا برتاؤ کر رہے ہیں؟ فرمایا کیا کرتے ہیں؟ عرض کی' یہ تو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ خود تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے ہیں لیکن مجھ پر دو دو یا تین تین لادتے ہیں۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور پوری مسجد میں لے کر پھرے' سر کے بالوں سے گرد جھاڑتے جاتے اور فرماتے: اے ابن سمیہ! میرے صحابہ تو تمہیں قتل نہیں کریں گے' تجھے ایک باغی فرقہ قتل کرے گا۔''

ابن اسحاق نے یہ قصہ بعینہٖ اسی طرح ذکر کیا ہے جیسے ابن ہشام کی ''تہذیب'' میں ہے: فرمایا:

''میں نے کئی اہلِ علم سے رجز کے اس شعر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضرت علی بن ابو طالب نے پڑھا تھا' اب یہ تو معلوم نہیں کہ شعر ان کا ہے یا کسی اور کا' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صرف خوش طبعی اور خوشدلی کے لئے پڑھا تھا جیسے لوگ اکٹھے کام کرتے ہوئے پڑھ لیا کرتے ہیں' بطور طعنہ نہیں پڑھا تھا۔''

ابو جعفر خطمی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ پڑھ رہے تھے:

''وہ شخص نجات حاصل کر گیا جو مسجدوں کی تعمیر کیا کرتا ہے۔''

جب یہ مصرعہ حضور ﷺ نے دھرایا تو ابن رواحہ نے آگے پڑھ دیا:

''وہ کھڑے بیٹھے قرآن پڑھا کرتا ہے۔''

پھر آپ نے بھی یونہی پڑھ دیا۔

مسجد کی تعمیر کے بارے میں بخاری شریف میں ہے: ''ہم تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے لیکن حضرت عمار دو دو اٹھاتے۔'' حضور ﷺ نے دیکھا تو ان سے مٹی جھاڑی اور فرمایا: ''عمار کے بارے میں افسوس ہے' اسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا' یہ تو انہیں جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے جب کہ وہ انہیں جہنم کی طرف کھینچتے ہوں گے۔ عمار نے جواب میں

کہا: ”میں فتنوں کے بارے میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں۔“

حضرت مجاہد کہتے ہیں: حضورﷺ نے انہیں مسجد تعمیر کرتے دیکھا کہ حضرت عمار پر پتھر لاد رہے تھے فرمایا: یہ عمار سے کیسا معاملہ کر رہے ہیں؟ یہ انہیں جنت کی طرف لے جانا چاہیں گے لیکن وہ انہیں جہنم کی طرف لے جانا چاہیں گے یہ کام بدبخت اور شریر لوگوں کا ہوگا۔

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا مزید بتاتی ہیں: حضورﷺ اور آپ کے صحابہ مسجد بنا رہے تھے آپ کے صحابہ تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے لیکن حضرت عمار دو دو اینٹیں اٹھاتے ایک ایک اپنی طرف سے اور ایک ایک حضورﷺ کی طرف سے اٹھاتے جاتے یہ دیکھ کر حضورﷺ اُٹھے اور ان کی پیٹھ سے گرد جھاڑی پھر فرمایا: اے ابن سمیہ! تمہارے لئے دو اجر ہیں جبکہ دوسروں کے لئے ایک اجر ہوگا تم دنیا سے جاتے وقت آخری وقت میں شربت پیو گے اور تمہیں ایک باغی فرقہ قتل کرے گا۔“

روضِ سہیلی میں ہے حضرت معمر بن راشد نے اسے اپنی جامع میں کچھ زیادتی کرتے ہوئے لکھا ہے اور وہ یوں:
”جب حضرت عمار صفین کے موقع پر قتل ہو گئے تو عمرو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے وہ گھبرائے ہوئے تھے کہنے لگے: عمار قتل ہو گئے انہوں نے کہا تو پھر کیا ہوا؟ حضرت عمرو نے کہا: میں نے رسول اللہﷺ سے سنا فرمایا تھا کہ اسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا! انہوں نے کہا: ”تم تو اپنے ہی پیشاب سے پھسلتے چلے ہو (اپنے گلے میں خود مصیبت ڈالنے لگے ہو یا جیسے کہتے ہیں: آ بیل ! مجھے مار) کیا ہم نے انہیں قتل کیا ہے؟ انہیں تو اس نے قتل کیا ہے جو انہیں ہمارے سامنے لے آیا ہے۔“

بیہقی میں عبدالرحمٰن سلمی کے بارے میں ہے کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے سنا کہ وہ اپنے باپ عمرو سے کہہ رہے تھے: ہم نے اس شخص کو قتل کر دیا ہے جبکہ رسول اللہﷺ نے اس کے بارے میں ایسے ایسے فرما رکھا ہے انہوں نے پوچھا: کونسا آدمی؟ انہوں نے بتایا کہ عمار بن یاسر! کیا تمہیں وہ وقت یاد نہیں جب رسول اللہﷺ مسجد تعمیر فرما رہے تھے ہم تو ایک ایک اینٹ اٹھاتے لیکن یہ دو دو اٹھا رہے تھے رسول اللہﷺ کے قریب سے گذرے تو آپ نے فرمایا: تم دو دو اینٹیں اٹھا رہے ہو اور پسینہ میں شرابور ہو سنو! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کر دے گا تمہیں جنت ملے گی۔

یہ سن کر حضرت عمرو حضرت معاویہ کے پاس گئے اور کہنے لگے: ہم نے اس شخص کو قتل کر دیا ہے جبکہ رسول اللہﷺ نے تو ان کے بارے میں یوں فرما رکھا ہے انہوں نے کہا: ”خاموش رہو بخدا تم کب تک الٹی سیدھی باتیں کرتے رہو گے؟ انہیں ہم نے قتل کیا ہے؟ انہیں تو علی اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے وہ انہیں لے آئے اور ہمارے سامنے کر دیا۔“

(قلت) اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمار کا یہ قول مسجد کی دوبارہ تعمیر کے وقت تھا کیونکہ حضرت

عمرو پانچویں ہجری میں اسلام لائے تھے جیسے گذر چکا۔

ابن زبالہ کے مطابق حسن بن محمد ثقفی کہتے ہیں: عین اس وقت جب رسول اللہ ﷺ مسجد کی بنیاد رکھ رہے تھے حضرت ابوبکر' عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی ساتھ ہی تھے تو ایک شخص وہاں سے گذرا' عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے ہمراہ یہی لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ لوگ میرے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہوں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جب حضور ﷺ مسجد مدینہ کی بنیاد رکھ رہے تھے تو ایک پتھر لا کر رکھ دیا پھر حضرت ابوبکر لائے اور رکھ دیا پھر حضرت عمر لائے اور انہوں نے بھی بنیاد میں رکھ دیا' حضرت عثمان آئے تو انہوں نے بھی رکھ دیا۔ آپ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: یہ میرے بعد خلافت کی ترتیب ہو گی۔ مسجد قباء کی بنیاد کے بارے میں ایسی ہی روایت گذر چکی ہے جس میں خلافت کا ذکر نہیں ہے۔

القشیری نے اپنی ''روضہ'' میں بغیر نام لئے لکھا' ایک صاحب نے کہا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا محمد! اللہ تعالیٰ آپ کو حکم فرما رہا ہے کہ اس کے لئے ایک گھر بنا دیں' اس کی بنیاد گارے اور پتھر سے رکھیں۔ آپ نے پوچھا اے جبریل! دیواریں کتنی بلند کروں؟ انہوں نے عرض کی سات بازو بھر' یہ بھی آتا ہے کہ پانچ بازو بھر۔ پھر جب آپ نے بنیاد رکھنا شروع کی تو پتھر لانے کو فرمایا' ایک پتھر ہاتھ میں پکڑا اور پہلے بنیاد میں رکھ دیا پھر حضرت ابوبکر کو حکم دیا' وہ بھی لائے اور آپ کے پتھر کے پہلو میں رکھ دیا پھر عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی یونہی رکھے اور پھر حضرت علی نے بھی لا رکھا انتہٰی۔ میں نے ان کے ہاتھ کے لکھے سے نقل کیا ہے۔

بیہقی نے دلائل میں حضرت سفینہ سے روایت کی جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے' انہوں نے کہا: جب نبی کریم ﷺ نے مسجد کی بنیاد رکھی تو ایک پتھر رکھا پھر فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ میرے پتھر کے پہلو میں پتھر لا رکھیں پھر عمر سے کہو کہ وہ حضرت ابوبکر کے پتھر کے پہلو میں پتھر لا رکھیں پھر فرمایا: عثمان سے کہو کہ وہ بھی عمر والے پتھر کے پہلو میں لا رکھیں۔ (سب نے رکھ دئے تو) فرمایا: یہ میرے بعد خلیفے ہوں گے۔

یحییٰ کے مطابق حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ایک پتھر اُٹھا رکھا تھا' اسید بن حضیر آگے سے ملے' عرض کی یا رسول اللہ! مجھے دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا: جاؤ اور دوسرا پتھر لے آؤ کیونکہ تمہیں مجھ سے زیادہ (ثواب) کی ضرورت نہیں۔

حضرت مکحول کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کافی تعداد میں ہو گئے تو انہوں نے عرض کی کہ ہمارے لئے کوئی مسجد بنا دیجئے' آپ نے فرمایا کہ لکڑیاں اور گھاس پھوس ہونی چاہئے' میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ جلدی کیجئے۔

رزین نے ذرا زیادہ لکھا ہے' فرمایا: صحابہ کرام اینٹیں اور ضروری سامان لاتے جاتے جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی ساتھ ساتھ اُٹھا کر لاتے' ایک آدمی ملا' آپ نے ایک اینٹ اُٹھا رکھی تھی' عرض کی' یا رسول اللہ! یہ مجھے دے دیجئے' آپ

نے فرمایا' اور اُٹھا لاؤ' کیونکہ تم مجھ سے زیادہ (ثواب کے) ضرورت مند نہیں ہو۔

علامہ مجد نے محمد بن سعد کی ایسی ہی روایت کی اور کہا: ایک آدمی آیا جو گارا اچھا بنا لیتا تھا' حضر موت کا رہنے والا تھا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے' اپنا کام اچھا کرتا ہے پھر حکم دیا کہ یہ کام تم کرتے رہو کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کام اچھا کر رہے ہو۔

علامہ زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایک آدمی تھا یمامہ کا رہنے والا' نام طلق تھا اور بنو حنیفہ سے تعلق تھا' اس نے بتایا: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ مسجد بنا رہے تھے' مسلمان بھی ان کے ساتھ کام کر رہے تھے' میں گارا بنانے کا ماہر تھا' میں نے بیلچہ پکڑا کہ گارا بناؤں' نبی کریم ﷺ دیکھ رہے تھے' فرمایا: یہ حنفی گارا بنانے کا ماہر ہے۔

احمد کے مطابق حضرت طلق بن علی رحمہ اللہ نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مسجد بنا رہا تھا' آپ نے فرمایا تھا کہ اس یمامی کو مٹی کے قریب کرو کیونکہ یہ تم سب سے زیادہ اچھا گارا بنانا جانتا ہے اور اس کے مونڈھوں میں سب سے زیادہ طاقت ہے۔

طلق ہی کہتے ہیں' میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کے صحابہ مسجد کی تعمیر کر رہے تھے' شاید حضور ﷺ کو ان کا کام اچھا نہیں لگ رہا تھا چنانچہ میں نے بیلچہ پکڑا اور مٹی میں پانی ملا کر گارا بنایا' شاید آپ کو میرا بیلچہ پکڑنا اچھا لگا اور میرا کام بھی بہتر لگا' اس لئے فرمایا یہ کام حنفی کے ذمے رہنے دو کیونکہ یہ گارا بنانے کا ماہر ہے۔

باڑا لینے کے بارے میں بات کرتے ہوئے ابن شہاب نے کہا: آپ نے اسے مسجد بنایا اور اینٹوں کے لئے مٹی بقیع خبخبہ سے ملی جو بیر ابو ایوب کی ایک جانب مناصع کے مقام پر تھا۔ خبخبہ وہ درخت تھے جو اس زمین میں اُگتے تھے۔

حضرت خارجہ بن زید بن ثابت رحمہ اللہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مسجد بنانا شروع کی جو ایک طرف سے ستر اور دوسری طرف ساٹھ ہاتھ تھی یا کچھ زیادہ تھی' اینٹیں اس مٹی سے بنائیں جہاں درخت اُگتے تھے' اس کی دیوار بنائی اور لکڑی پھاڑ کر اس کے ستون بنائے' درمیان میں صحن رکھا اور پھر اپنی دو بیویوں کے لئے دو گھر بنائے۔

عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے زید سے پوچھا کہ بقیع الخبخبہ کہاں تھا؟ انہوں نے بتایا کہ بیر ابو ایوب اور اس جانب کے درمیان تھا' یہ جگہ بقیع الغرقد کی تھی جو قبرستان کے لئے تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالعزیز سے بقیع الخبخبہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا' یہ خبخبہ راستہ پار کر جائیں تو بقیع غرقد کی بائیں طرف تھا اور مسجد یحییٰ کے پاس اس سے مل جاتا تھا۔ میں نے کہا مسجد والا وہ یحییٰ کون تھا جس کا تم نے ذکر کیا؟ انہوں نے بتایا کہ یحییٰ بن طلحہ بن عبید اللہ۔

(قلت) ہمارے شیخ المشائخ زین مراغی کے مطابق آج کل بقیع الخبخبہ کا ہمیں کچھ پتہ نہیں چل سکا لیکن بقیع الغرقد کے راستے سے نکلنے والا جب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزار کی طرف چلے' حضرت ابراہیم بن رسول اللہ

ﷺ کا مزار بائیں طرف ہو تو اس کی بائیں طرف ایک راستہ جاتا ہے جو ایک ٹیلے کی طرف نکل جاتا ہے' جب وہ اس راستہ پر چلے گا تو دائیں طرف موڑ کے بعد ایک باغ تک پہنچ جائے گا جو پہلے اور اب اولاد صیفی کے نام پر مشہور تھا' وہاں ایک کنواں تھا جس کی طرف ایک راستہ جاتا تھا' اسے پہلے اور اب بیرِ ابو ایوب کہتے تھے۔ پھر بقیع سے نکلنے والے کی بائیں طرف سے بھی چلنے والا جب سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی طرف جانے والے راستہ پر چلتا تو رومیہ نامی مشہور باغ کی شام والی جانب ایک اور باغ تھا جو رباطیہ کے نام سے جانا جاتا تھا' تو وہ رباط ایمنہ پر جا ٹھہرے گا' وہاں بھی ایک کنواں تھا۔ علامہ مراغی کہتے ہیں کہ یہ بھی بیرِ ابو ایوب کے نام سے مشہور تھا' لوگ اس سے تبرک حاصل کرتے تھے' یہ دار نخل میں مشہور باغ کے قریب تھا اور بقیع غرقد کی بھی بائیں طرف تھا۔ زین مراغی کہتے ہیں کہ شاید یہ مقصد کے زیادہ قریب ہے۔

میں بتاتا چلوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے' یہی مراد ہے جیسے آگے ہم بیان کر رہے ہیں۔

علامہ رزین کی کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں: جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کی مسجد رَدّہ لگا کر بنی تھی اینٹ کے اوپر اینٹ تھی پھر اینٹ اور اس کے ساتھ آدھی تھی۔

پھر جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اسے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ آپ نے اضافہ فرما دیا چنانچہ اینٹیں مختلف سمتوں میں لگائیں' اب اینٹ کے سامنے اینٹ لگائی' انہوں نے پتھر لگا کر دیوار تین ہاتھ (ساڑھے چار فٹ) اونچی کر دی' مسجد کا طول قبلہ کی طرف آخر تک سو بازو (۱۵۰ فٹ) کر دیا' عرض بھی اتنا ہی کر دیا' مسجد مربع شکل کی تھی۔

جعفر کی روایت میں ہے کہ اس پر چھت نہیں تھی' لوگوں نے گرمی کی شکایت کی تو انہوں نے لکڑیاں ڈال دیں اور ستون کھجور کے تنوں کے لگا دیئے' سائے کے لئے کھجور کے پتے وغیرہ ڈالے پھر چڑا ڈالا اور جب بہنے لگی تو اس پر گارا لگا دیا' مسجد کے درمیان میں صحن رکھا' سایہ کے انتظام سے پہلے دیواریں انسانی قد سے کچھ زیادہ تھیں۔ انتہی۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ ساری کلام جعفر کی نہیں کیونکہ اس کے درمیان میں "فی روایة جعفر" کے الفاظ آئے ہیں۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت جعفر نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے اینٹ اینٹ کا رَدّہ لگا مسجد کی تعمیر شروع کی' پھر مسلمان زیادہ ہو گئے تو گارے سے بنائی۔ اس موقع پر صحابہ نے عرض کی: اس میں زیادتی کے لئے کسی کو حکم فرما دیجئے' آپ نے فرمایا ٹھیک ہے پھر فرما دیا تو مسجد وسیع کر دی گئی پھر دیواریں ڈیڑھ اینٹ کی بنائیں' پھر سخت گرمی لگی تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! حکم فرمائیں تو اس پر سایہ کر دیا جائے۔ فرمایا ہاں' آپ نے حکم دیا تو ستون کھجور کے تنے والے لگا دیئے گئے پھر اس پر مختلف قسم کی گھاس پھوس رکھ دی گئی چنانچہ گذرا اوقات کرتے رہے پھر بارش ہوتی تو چھت ٹپکتی تھی' عرض کی یا رسول اللہ! اگر آپ حکم فرما دیں تو اس پر مٹی لگائی جائے' فرمایا نہیں بلکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا جھونپڑا ہے اور پھر مسجد حضور ﷺ کی زندگی تک ایسے ہی رہی' مسجد کی دیوار چھت ڈالنے سے پہلے انسانی قد بھر اونچی تھی چنانچہ جب اصلی سایہ ہاتھ بھر ہوتا اور دیوار کا سایہ دو قدم ہوتا تو آپ ظہر کی نماز پڑھتے اور دوگنا ہو جاتا تو عصر کی نماز

پڑھتے پھر ان سے "سمیط" سعید" اثی" ذکر کی اور تفسیر وہی گذشتہ بیان کی اور بازو کا ذکر نہیں کیا۔"

الاحیاء میں حضرت حسن رحمہ اللہ نے بتایا: جب حضورﷺ نے مدینہ طیبہ میں مسجد بنانے کا عہد کر لیا تو حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے' عرض کی کہ آسمان کی طرف اس کی دیواریں سات ہاتھ (ساڑھے دس فٹ) اونچی کیجئے' اسے نہ تو خوبصورت بنایئے نہ ہی نقش و نگار والی بنایئے۔انتہی۔اس سے قبل اقشہری حضرت جبریل کے حوالے سے سات ہاتھ اور پانچ ہاتھ کی بلندی بتا چکے ہیں۔

حضرت اسامہ بن زید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بتایا' رسول اللہﷺ تشریف لائے تو پتھر اٹھا رکھا تھا' انہیں اسید بن حضیر ملے' پھر پہلے والی بات ذکر کی اور کہا: حضرت زید نے فرمایا کہ زمین پر تین ہاتھ کے قریب پتھروں سے بنیاد اونچی کر لائے' اس زمین کے درمیان میں مشرکین کی قبریں تھیں' آپ نے حکم دیا تو وہ کھود دی گئیں' ان کی ہڈیاں پھینک دی گئیں اور انہیں گم کر دیا گیا پھر وہاں پانی کھڑا رہتا تھا' اس کے لئے راستہ بنایا تو وہ بہہ گیا۔

مسجد بنانے والوں نے قبلہ والی دیوار کا آخر تک طول سو بازو بھر رکھا اور دوسری طرفوں میں بھی اتنی ہی پیمائش تھی لہٰذا یہ مربع شکل کی بن گئی۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سو ہاتھ سے کم تھی' قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا' اس کے تین دروازے رکھے' ایک دروازہ تو آخری حصہ میں تھا جو آج کل قبلہ کی طرف ہے' ایک دروازہ عاتکہ کہلاتا تھا جسے باب الرحمہ بھی کہتے ہیں اور یہ وہ دروازہ تھا جس میں سے رسول اللہﷺ مسجد میں تشریف لاتے' آج کل اسے باب عثمان کہا جاتا ہے' یہ دونوں دروازے قبلہ تبدیل ہو جانے پر بھی آج تک نہیں بدلے اور جب قبلہ تبدیل ہو گیا تو آپ نے اپنی پچھلی جانب والا دروازہ بند کر دیا اور یہ کھول دیا' اس کے عین سامنے وہ دروازہ تھا جو بند کر دیا گیا۔ابن النجار نے اسے یوں لکھا ہے کہ جب قبلہ پھیر دیا گیا تو وہ دروازہ جو آپ کے پیچھے تھا' بند کر دیا گیا اور اس کے عین سامنے اور دروازہ کھول دیا گیا' علامہ مجد نے کہا کہ اس کے بالکل سامنے کھول دیا گیا۔انتہی۔

حضرت اقشہری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ روایت لکھی ہے جو اس کے خلاف ہے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ رسول اللہﷺ کے دور میں آپ کی مسجد کچی اینٹوں سے بنی تھی' چھت کھجور کی ٹہنیوں سے بنی تھی اور اس کے تین دروازے تھے' ایک دروازہ آخر میں تھا' ایک باب عاتکہ تھا جسے باب الرحمہ کہا جاتا ہے اور وہ دروازہ جس سے آپ مسجد میں تشریف لاتے' باب عثمان کہلاتا تھا' اسی دروازے کو آج کل باب جبرئیل کہا جاتا ہے اور جب قبلہ تبدیل کر دیا گیا تو آخری دروازہ بند کر کے دوسرا دروازہ کھول دیا گیا جسے باب النساء کہتے ہیں۔انتہی۔

ان کا یہ کہنا " یہ وہی دروازہ ہے جسے باب النساء کہتے ہیں" شاید ان کی اپنی طرف سے ہے جو انہوں نے حدیث کے مفہوم سے سمجھ لیا ہے' اسی لئے اس کے بعد انہوں نے ابو داؤد کی حدیث دی ہے کہ "کاش ہم نے یہ دروازہ عورتوں کے لئے کھول دیا ہوتا البتہ ابو داؤد نے واضح کیا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسے آگے آئے گا اور

جیسے انہوں نے ذکر کیا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے قبلہ تبدیل ہونے کے بعد انہوں نے پچھلی طرف دروازہ نہیں بنایا تھا۔ایک دروازہ نمازی کی دائیں جانب تھا' ایک بائیں جانب پھر اوپر تک پکی اینٹوں سے تعمیر کی' حضور ﷺ صحابہ کے ساتھ مل کر کچی اینٹیں چادر میں ڈال کر اُٹھاتے تھے اور فرماتے:

''اصل بوجھ اُٹھانا تو یہیں کا ہے' وہ نہیں جو خیبر (کی کھجوروں) کا ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ مسجد تک اینٹیں اُٹھا کر لاتے اور آپ ان کے ہمراہ اُٹھاتے' کہتے ہیں کہ حضور ﷺ پیٹ پر اینٹ اُٹھائے جا رہے تھے کہ میں سامنے آ گیا' مجھے محسوس ہوا کہ آپ کے لئے بھاری ہے لہٰذا عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے دیجئے۔فرمایا: اے ابوہریرہ! کوئی اور اُٹھا لاؤ کیونکہ (ثواب کے لحاظ سے) اصل زندگی تو آخرت والی ہے۔

حضور ﷺ کی طرف سے مسجد میں اضافہ

(قلت) یہ دوسری مرتبہ کی تعمیر تھی کیونکہ پہلی تعمیر میں تو حضرت ابوہریرہ شامل نہیں ہو سکے تھے کیونکہ آپ فتح خیبر کے موقع پر آئے تھے۔ (واللہ اعلم)۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت جعفر بن عمرو کہتے ہیں: یہ باڑہ عمرو کے دو بیٹوں سہل اور سہیل کا تھا' انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پیش کر دیا تو آپ نے تعمیر کی' اپنے صحابہ سے تعاون فرماتے رہے اور خود کام کرتے رہے' حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی گنگناتے ہوئے کام کرتے تھے۔بتاتے ہیں کہ آپ نے دو مرتبہ تعمیر فرمائی' پہلی مرتبہ کی پیمائش سو سو ہاتھ سے قدرے کم تھی اور خیبر فتح ہو گیا تو تعمیر کرتے وقت دیواریں دوگنا کر دیں۔

طبرانی میں حضرت ابو الملیح کے والد کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مکان کے بارے میں جو مسجد میں شامل کر لیا گیا' اس کے مالک سے فرمایا (یہ انصار میں سے تھے) کہ اس گھر کے بدلے میں تجھے جنت میں مکان ملے گا' انہوں نے (کسی وجہ سے) انکار کیا' اتنے میں حضرت عثمان آئے تو اس سے کہا: اس مکان کے تمہیں دس ہزار درہم دیتا ہوں چنانچہ اس سے خرید لیا اور پھر حضور ﷺ کی خدمت میں چلے آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھ سے وہ گھر خرید لیجئے جو میں نے انصاری سے خریدا ہے چنانچہ آپ نے جنت میں مکان کے وعدہ پر ان سے خرید لیا' حضرت عثمان نے بتایا کہ میں نے دس ہزار درہم کے بدلے میں خریدا ہے چنانچہ آپ نے بنیاد میں ایک اینٹ رکھ دی پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلایا تو انہوں نے اینٹ رکھی پھر حضرت عمر کو بلایا تو انہوں نے اینٹ رکھی اور پھر حضرت عثمان آئے اور اینٹ رکھ دی پھر دوسرے لوگوں سے فرمایا تو انہوں نے بھی رکھ دیں۔

امام ترمذی نے حضرت عثمان کے محاصرے کے دن دیوار پر چڑھ کر خطاب کے بارے میں حضرت ثمامہ بن حزن قشیری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''میں تمہیں اللہ اور اسلام کی قسم دیتا

ہوں کہ مسجد شریف نمازیوں کے لئے تنگ ہو چکی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کون ہے جو فلاں کا مکان خرید مسجد میں ڈال دے' ایسے شخص کو جنت میں مکان ملے گا چنانچہ میں نے اپنی گرہ سے وہ مکان خریدا تھا' لیکن آج تم اس میں مجھے دو رکعت بھی پڑھنے سے روک رہے ہو۔ انہوں نے کہا' ہاں یہ بات تو درست ہے الحدیث دار قطنی اور احمد نے بھی ایسی ہی روایت کی پھر ان دونوں نے حضرت احنف بن قیس سے ایک طویل حدیث بیان کی: اس میں لکھا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا علی یہاں موجود ہیں؟ انہوں نے کہا' ہاں پھر پوچھا: کیا طلحہ ہیں؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ آپ نے فرمایا: میں تمہیں اس ذات کی قسم دے رہا ہوں جس کے بغیر کوئی بھی لائق عبادت نہیں' تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: جو شخص فلاں شخص کا باڑا خرید کر دے گا' اللہ اسے بخش دے گا چنانچہ میں نے بیس ہزار یا (فرمایا) پندرہ ہزار میں خریدا تھا پھر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں نے خرید لیا ہے' فرمایا اسے مسجد میں ڈال دو' تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ اس پر محاصرہ والوں نے کہا تھا: بالکل ٹھیک ہے۔

خیثمہ بن سلیمان نے فضائل عثمان بیان کرتے ہوئے حضرت قتادہ سے روایت کی' انہوں نے کہا: کہ مسجد کی ایک جانب ایک مکان تھا' حضور ﷺ نے فرمایا: جو اسے مسجد کی توسیع کے لئے خرید دے گا' اسے جنت میں ایسا ہی مکان ملے گا' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے خرید لیا اور مسجد میں شامل کر دیا تھا۔

ابن زبالہ حضرت خالد بن معدان سے لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ عبداللہ بن رواحہ اور حضرت ابو الدرداء کے پاس پہنچے بانس وغیرہ کی ایک چھڑی تھی جو ہاتھ بھر کی تھی' اس سے وہ مسجد کی پیمائش کر رہے تھے' فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ دونوں نے عرض کی: ہمارا ارادہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد شام کی طرح تعمیر کریں تاکہ انصار کو تقسیم کر کے بنانے کا کہہ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: لاؤ مجھے دو! آپ نے وہ بانس کی چھڑی ان سے لے لی' پھر چلتے ہوئے دروازے تک آئے اور اسے پھینک دیا پھر فرمایا سب مل کر گارا اور اینٹیں لاؤ تاکہ موسیٰ علیہ السلام جیسا جھونپڑا بنا لیں' کہا گیا کہ یہ "ظلۃ موسیٰ" کیا ہے؟ فرمایا جب وہ کھڑے ہوتے تو ان کا سر چھت سے لگ جاتا۔

بیہقی نے دلائل میں حضرت عبادہ کے حوالے سے لکھا کہ: انصار نے مال جمع کیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے' عرض کی یا رسول اللہ! اس سے مسجد تعمیر کر لیجئے اور اسے خوبصورت کر لیجئے' کب تک ہم اس کھجور کی چھت کے نیچے نماز پڑھتے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے بھائی موسیٰ سے زیادہ اچھی نہیں بنا سکتا' یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جھونپڑے جیسی ہو گی۔

حضرت بیہقی نے "عریشِ موسیٰ" کے بارے میں حضرت حسن سے روایت کی کہ جب آپ ہاتھ اٹھاتے تو چھت سے لگتا تھا۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مسجد کے ستون کھجور کے تنوں کے تھے' چھت کھجور کی ٹہنیوں کی تھی اور گھاس پھوس شامل کی گئی تھی' اس پر زیادہ مٹی نہیں تھی' بارش ہوتی تو مسجد کیچڑ سے بھر جاتی' وہ جھونپڑے جیسی تھی۔

صحیح بخاری میں لیلۃ القدر کا بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے دکھایا گیا کہ میں پانی اور مٹی (کیچڑ) میں سجدہ کر رہا ہوں تو جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ٹھہرا ہوا ہے' چلا جائے چنانچہ ہم لوٹ آئے' آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا تک نہ تھا' اچانک بادل آیا اور بارش ہونے لگی' مسجد کی چھت بہہ پڑی کیونکہ کھجور کی لکڑیوں سے بنی تھی اسی دوران نماز کھڑی کر دی گئی چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے دیکھا کہ کیچڑ پر سجدہ کر رہے ہیں' میں پیشانی مبارک پر مٹی کا اثر دیکھ رہا تھا۔

دوسری فصل

آج کل مسجد کتنے ہاتھ ہے اور اس کی وہ حدود جن کے ذریعے پہلی تعمیر سے ممتاز ہے

یاد رکھئے کہ جب ''ذِرَاعٌ'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد انسان کا ہاتھ ہوتا ہے اور حرم کی حد بندی میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ ذراع مصر و مکہ میں استعمال ہونے والے لوہے کے ذراع سے مختلف ہوتا تھا' یہ تقریباً دو انگشت کا ہوتا تھا اور مسجد کی پیائش کے بارے میں ہمارے سامنے چار روایتیں آتی ہیں کہ ایک طرف سے ستر ذراع اور دوسری طرف ساٹھ یا کچھ زیادہ' دوسری میں ہر طرف سو سو ہاتھ' یہ مربع شکل بنتی تھی۔ تیسری روایت میں سو سے کم ہے' یہ پہلی کے مقابلہ میں سچی ہے' اسی پر دارو مدار رکھنا چاہئے۔ چوتھی یہ کہ پہلے تو سو سو ہاتھ سے کم بنائی تھی پھر اس میں زیادتی کی اور اتنی ہی دیواریں اور بڑھا دیں اور اس صورت میں قطعاً اس سے یہ مراد نہیں کہ ذراع کا حساب رکھا تھا ورنہ اس لحاظ سے دوسری مرتبہ کی تعمیر طول یا عرض میں ایک جانب تقریباً دو سو ہاتھ تھی اور دوسری طرف بھی اتنی ہی تھی اور اس میں شک نہیں کہ آپ کی مسجد شریف کی حد اخیر حجرۂ مبارکہ تک جاتی تھی جبکہ حجرہ کی دیوار سے مسجد کی مغربی دیوار تک (باوجودیکہ آج تک اس میں زیادتی بھی ہو چکی ہے پھر بھی) میری معلومات کے مطابق ڈیڑھ سو ہاتھ سے نہیں بڑھ سکی بلکہ یہ چھ ہاتھ سے زیادہ گھٹ چکی تھی حالانکہ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما نے اسی جانب سے توسیع کی تھی پھر دوسرے خلفاء نے بھی کی تھی لہٰذا اس روایت میں ظاہر ہے کہ انگشت مراد ہیں' ہاتھ نہیں جس پر اعتراض ہو سکے کہ دوسری تعمیر کے وقت مسجد نبوی کی پیائش دو سو ہاتھ ہوئی اور دوسری پیائش بھی یونہی بڑھی اور سو ہاتھ والی روایت کے موافق ہو گئی' علاوہ ازیں جو آخری علماء نے حد بندی بیان کی ہے (مختلف طریقوں سے) اس سے سو ہاتھ بھی نہیں بنتی' اس کا مقصد یہ ہو گا کہ پہلی روایت کو اہمیت حاصل ہے جس میں ستر ہاتھ اور ساٹھ ہاتھ کا ذکر ہے' لمبائی ستر ہاتھ ہو گی اور چوڑائی ساٹھ ہاتھ۔

علامہ نووی نے اپنے ''منسک'' میں حضرت خارجہ سے روایت کی ہے' یہ مدینہ کے سات فقہاء میں سے ایک تھے' ان کے الفاظ یہ ہیں: حضور ﷺ نے مسجد کی تعمیر ستر ہاتھ اور ساٹھ ہاتھ یا قدر سے زیادہ پیائش میں کی' ابن النجار اسی

پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے مسجد مبارک مربع شکل میں بنائی' قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا' طول ستر ہاتھ اور ساٹھ ہاتھ تھا یا کچھ زیادہ تھا۔انتھٰی۔

حضرت یحیٰی نے ازواج مطہرات کے حجروں کے بیان سے ذرا پہلے فرمایا: مجھے ہارون نے بتایا کہ ہمیں محمد بن یحیٰی (صاحب مالک) نے بتایا کہ جو کچھ نبی کریم کی مسجد کے ذراع کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ قبلہ کی طرف سے شام کی جانب چون ہاتھ اور ہاتھ کے دوثلث (ایک فٹ) تھی اور مشرق سے مغرب کی طرف تریسٹھ ہاتھ تھی جس کا رقبہ نکالا جائے تو تین ہزار چار سو چوالیس ہاتھ بنتا ہے۔انتھٰی۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دور میں آپ کی مسجد کی حدود قبلہ کی طرف سے وہ جنگلے تھے جو ان ستونوں کے درمیان تھے جو ریاض الجنہ سے قبلہ کی طرف واقع تھے اور شام کی طرف سے وہ دو لکڑیاں تھیں جو مسجد کے صحن میں گاڑی ہوتی تھیں' رہا مشرق سے مغرب کی طرف تو وہ حجرۂ نبی کریم ﷺ سے اس ستون تک تھی جو منبر کے بعد آتا ہے' یہ بلاط آخری حصہ تھا۔انتھٰی۔

جو کچھ ابن نجار نے ذکر کیا ہے' اس میں ایک طرح کے جھگڑے کی گنجائش ہے' انہوں نے قبلہ کی طرف سے جنگلوں کے ذریعے حد بندی اور شام کی طرف سے دو گڑی ہوئی لکڑیوں کی بناء پر حد بیان کی ہے' تو آج وہ لکڑیاں کسی کے علم میں نہیں' علامہ زین مراغی نے ان کی گمشدگی کی وضاحت کر دی ہے' کلام مطری سے بھی یہی سمجھ آتا ہے' اور پھر میں نے متقدمین کے کلام میں ان کا ذکر نہیں دیکھا ہاں ابن زبالہ نے ایسی کلام ذکر کی ہے جس میں پیچیدگی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی ایک جانب کی حد بندی ان دو لکڑیوں سے تھی جن میں سے ایک پر چھت کا حصہ نہ تھا اور دوسرے پر ان کے دور میں موجود تھا تو شاید اسی سے ابن نجار نے پیائش لی ہے اور ابن زبالہ کی عبارت بھی یہی بتاتی ہے کیونکہ انہوں نے ان دونوں کو جانب شام کی حد میں ذکر نہیں کیا' آج کل اس جانب سے حد (جیسا کہ ہمارے دور میں مشہور ہے) دو پتھر ہیں جن کا ذکر صحنِ مسجد کے بیان میں آ رہا ہے اور پھر ایسا مضمون آ رہا ہے جس سے اس کا رد ہوگا۔

اسے ابن جماعہ نے اپنے ''منسک'' میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: متاخرین علماء نے اس مسجد کی مقدار کا اندازہ بتایا ہے جو پہلے تعمیر ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ حجرۂ مبارکہ سے مغرب کی طرف ساتویں ستون تک اور پھر اس جنگلے سے جو دو ستونوں کے درمیان' مصلّٰی شریف کے سامنے مسجد شریف کے صحن میں گاڑے ہوئے دو پتھروں کے مقام تک صندوق سے متصل ہے' مربع شکل میں تھی۔ابن جماعہ کہتے ہیں لیکن یہ دونوں منبر شریف کی جانب پر نہیں ہیں بلکہ مشرق کی جانب چار ہاتھ یا کچھ کم مقدار میں اندر داخل ہیں اور یونہی قبلہ کی طرف اتنے ہی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ابن جماعہ مزید کہتے ہیں: اس لئے کہ میں نے ہاتھ سے پیائش کی ہے جو میرے اندازے کے مطابق پہلی مسجد کے ہاتھوں کے مطابق نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کا منبر کی طرف سے مشرق کی طرف داخل ہونا جیسے کہ ذکر ہوا' اس بات سے رکاوٹ

نہیں بنتا کہ یہ دونوں حد بن سکیں کیونکہ مراد یہ ہے کہ وہاں مغربی جانب ان دونوں کی سمت میں ہے جیسے یہ مراد ہے کہ شام کی جہت ان دونوں کی سمت میں ہے' وہ جہت نہیں جو صرف دو پتھروں کے سامنے ہے۔

اب ابن نجار سے نقل شدہ گزشتہ مضمون کی بناء پر' جہت مغرب کی ابتداء بتانے کی ضرورت نہیں جو اس جہت میں ستون سے ملنے والی جہت سے ہوتی ہے جیسے اس بات کی تحریر کی ضرورت نہیں کہ حجرۂ شریفہ کی حد مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے کیونکہ مشرقی کی جانب وہ حد ذکر نہیں کی گئی جو شام کی جانب دو پتھروں سے ملتی ہے اور درحقیقت جہت شام بیان کرنے کے سوا ان دونوں کا کوئی مقصد نہیں علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہے کہ مسجد کا اگلا حصہ پچھلے سے زیادہ چوڑا ہو جیسے آج کل بھی یونہی ہے تو اس صورت میں حقیقی طور پر مغرب کی جانب وہ دو پتھر حد بنیں گے۔

رہا ان کا یہ قول کہ یہ دونوں چار ہاتھ قبلہ کی طرف آگے ہیں اور یہ پہلی مسجد کے ہاتھوں کے مطابق نہیں ہیں یعنی ابن نجار کے مطابق ستر ہاتھ بھر نہیں ہیں تو انہوں نے اسے قبلہ کی طرف سے۔

کیونکہ قبلہ والی دیوار رسول اللہ ﷺ کے مصلّٰے کے برابر تھی اور یہ صندوق جو مصلّٰے شریف کے قبلہ کی طرف ہے (یعنی مصلّٰے اور جنگلوں کے درمیان) مقام شریف اور ستونوں کے درمیان ایک سُترہ (پردہ) ہے۔

یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ قبلہ کی دیوار اور منبر کے درمیان بکریاں گذرنے کا راستہ تھا جبکہ آج کل منبر اور جنگلوں کے درمیان سوا چار ہاتھ کا فاصلہ ہے اور قبلہ کی طرف سے منبر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی نہ ہی مصلّٰے شریف میں ہوئی ہے۔انتہٰی لہٰذا جنگلوں سے ہاتھ کی پیائش کا کوئی اعتبار نہیں۔

میں نے جنگلوں سے دونوں ذکر شدہ پتھروں تک خود جانچا ہے تو پورے ستر ہاتھ تھے جن کا پہلے ذکر ہوا۔جبکہ ابن جماعہ نے کہا' اسے جانچا گیا تو چھیالیس اور دو تہائی ہاتھ تھے چنانچہ وہ ہمارے ہاتھ کے بالکل موافق بلکہ قدرے زیادہ ہے کیونکہ زیر عمل ہاتھ (ذراع) ڈیڑھ ذراع ہے جو ہمارے ذراع سے بڑا ہے۔

رہا وہ ذراع جو علامہ مراغی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تو وہ ہمارے ذراع کے موافق نہیں کیونکہ اس میں' جیسے کہ تصریح کی گئی ہے' آج مدینہ میں رائج ذراع پر اعتماد کیا گیا ہے چنانچہ میں نے اسے جانچا تو دیکھا کہ ہمارے ہاتھ کے ذراع سے (جسے ہم ذکر کر چکے ہیں) قیراط بھر زائد تھا۔ہاں علامہ مطری کا یہ قول کہ" منبر اور آج کے جنگلے میں سوا چار ذراع کا فاصلہ ہے" ہمارے جانچ کئے ہوئے کے مخالف ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان ہمارے ذکر کردہ ذراع کے مطابق ساڑھے تین ذراع کا فاصلہ ہے لیکن عنقریب آ رہا ہے کہ آج کل منبر وہ نہیں اور پھر منبر کی بنیاد رکھنے کے لئے کھدائی کے وقت پتھر کے ٹکڑے دیکھنے پر ہمیں مطری کے قول کی سچائی معلوم ہوئی اور پتہ چلا کہ جو منبر ہم نے پایا تھا' اسے اصل منبر کے مقام سے قبلہ کی طرف آدھے ذراع سے زیادہ آگے کر دیا گیا ہے جیسے عنقریب ہم اس کی وضاحت کر دیں گے۔

ابن زبالہ اور یحیٰی نے کئی علماء کی طرف سے اس جہت میں مسجد کی حد ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: قبلہ میں اس کی

حد اس مرمر کے کنارے تھے جن کے درمیان منبر واقع تھا اور شام کی طرف سے اس کی علامت مشرق و مغرب کی جانب سے چار محرابیں تھیں اور ان چاروں محرابوں کی علامت یہ تھی کہ وہ اندر سے تمام کی تمام سبز رنگ کی تھیں۔

(قسلت) آج مرمر کا نام و نشان نہیں ملتا لیکن ابن زبالہ کے کلام سے اس مرمر کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ منبر کے گرد ہاتھ بھر اونچا چبوترہ تھا جو مغرب سے تین ذراع' مشرق سے بھی تین اور قبلہ کی طرف سے بھی تین ذراع تھا کیونکہ انہوں نے لکھا ہے: مجھے محمد بن اسماعیل رحمہ اللہ نے بتایا' میں نے ایک چٹائی دیکھی جو عبد اللہ بن حسن بن حسن کی تھی جو وہاں منبر کے سامنے موجود مَر مَر پر ڈالی ہوئی تھی۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن حسن ۱۴۰ھ میں قید کر دیے گئے' اُن کے بعد کچھ دن تک وہ چٹائی پڑی رہی اور پھر اُٹھا دی گئی۔ ابن زبالہ مزید کہتے ہیں کہ پھر حسن بن زید بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم ابو جعفر کی خلافت میں ۱۵۰ھ کو مدینہ کے والی بنے تو وہ مرمر ٹوٹ گیا اور آپ نے اس کی ہر طرف سے اسے وسیع کر دیا اور ستونوں کے ساتھ ملا دیا۔ اس سلسلے میں ابو مودود عبد العزیز بن ابو سلیمان نے کہا کہ میرے لئے مصلّٰی کی جگہ ترک کر دی جائے تو انہوں نے چھوڑ دی اور مرمر کو اگلے ستونوں سے نہ ملایا چنانچہ آج تک وہی مرمر موجود ہے جو منبر کے گرد اُبھرا دکھائی دیتا ہے اور جسے حضرت حسن بن زید رحمہ اللہ نے بنایا تھا اور وہ مرمر جو منبر کے گرد اس مرمر سے اُبھرا ہوا ہے جسے حسن بن زید نے بنایا تھا' وہ چھ ستونوں کے درمیان ہے' وہ تین ذراع قبلہ کی طرف' تین ذراع مشرق کی طرف اور تین ذراع مغرب کی طرف تھا اور وہ زمین سے ایک ذراع بھرا بھرا ہوا ہے۔ انتہٰی۔

ابن زبالہ نے ایک اور مقام پر کہا ہے کہ: منبر کے گرد مرمر کے فرش کی چوڑائی آٹھ ذراع (بارہ فٹ) اور لمبائی اٹھارہ ہاتھ (ستائیس فٹ) تھی' ایک اور مقام پر اسے رُخام کہا ہے' یہ بھی لغت میں مرمر کو کہتے ہیں اور عنقریب ابن نجار سے اس چبوترے کا ذکر آ رہا ہے جس کے درمیان منبر موجود تھا چنانچہ انہوں نے کہا: جس چبوترے پر منبر موجود ہے' اس کی اونچائی ایک انگشت اور قدرے زیادہ تھی تو گویا اندر کا فرش اونچا تھا کیونکہ یہ ابن زبالہ کے دور میں ایک ہاتھ اونچا تھا اور ابن نجار کے دور میں ایک بالشت سے قدرے زیادہ تھا پھر اسے اونچا کر دیا گیا لیکن آج اس کا کوئی وجود نہیں' اس کے نشانات کا اس وقت پتہ چلا جب منبر شریف کے اردگرد کھدائی کی گئی اور خود میں نے وہ مرمر دیکھا جو قبلہ کی طرف تھا جیسے آگے آ رہا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ منبر کے بعد مرمر قبلہ کی طرف تین ہاتھ تھا اور ظاہر ہے کہ مسجد کے عرض میں اس کا زیادہ حصہ شامل تھا چنانچہ یحییٰ نے ولید کا اضافہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے قریش کے کچھ آدمیوں کو بلا کر انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ شدہ حصہ دکھایا اور وہ حصہ بھی دکھایا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھایا تھا' حضرت عمر بن عبد العزیز کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں پہلی مسجد کی دیوار منبر کے اوپر کی طرف ایک ہاتھ سے کچھ زیادہ تھی پھر انہوں نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قبلہ کی دیوار اور منبر کے درمیان اتنی جگہ موجود تھی جہاں سے بکریاں گذر سکیں اور موڑ پر آدمی کے گذرنے کا راستہ تھا نیز صحیح بخاری میں

حضرت سہل سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے مصلّے اور دیوار کے درمیان بکریاں گذرنے کی جگہ تھی پھر اسی میں حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ منبر کے قریب مسجد کی دیوار اتنی دور تھی کہ بکریاں گذر سکتی تھیں تو وہ بات ثابت ہو گئی جو ہم نے کہی ہے کہ مسجد کی دیوار اس گذرگاہ میں شامل تھی جو قبلہ کی طرف علامت بنائی گئی تھی' رہے وہ چار طاق' جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے کہ شام کی طرف سے مسجد کی آخری حد تھے تو آج کل ان کا نام و نشان نہیں ملتا ہاں مرجانی نے حارث محاسبی سے ان کا جو مقام بیان کیا ہے وہ آگے آ رہا ہے۔

رہا علامہ مطری کے مطابق اس بات کا جواب کہ جنگلے آگے تھے تو لگتا ہے ابن نجار نے یہ سمجھا ہو گا کہ حضور ﷺ کے دور میں اس کی چوڑائی اس میں داخل تھی کیونکہ ہمارے ہاں یہ بات ثابت ہو چکی کہ مسجد کی دیوار مسجد ہی کا حصہ تھی جس کی تائید اس طرف مرمر لگے ہونے سے ہوتی ہے جیسے گذر چکا اور پھر آئندہ بارہویں فصل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے مسجد میں مصلّٰی شریف کے قریبی ستون سے مقصورہ شریف تک اضافہ کیا تھا کیونکہ یہی وہ برآمدہ ہے جو روضہ شریف کے قبلہ والے ستونوں اور ان ستونوں کے درمیان تھا جو قبلہ کی طرف جا ملتے تھے اور پھر علامہ مراغی نے کہا ہے کہ آپ نے مصلّٰے کے قبلہ میں موجود ڈاٹ آج کی قدیم دیوار میں بنا دی لیکن اس ڈاٹ کا عرض دو ہاتھ تھا' اس کے اور جنگلے کے درمیان آدھے ہاتھ سے زیادہ فاصلہ تھا اور یہ قدیم دیوار کی چوڑائی سے ایک ہاتھ زیادہ دکھائی دیتی تھی کیونکہ میں نے وہ اینٹ خود دیکھی تھی جسے پہلے ہم نے اس عمارت میں دیکھا تھا جو پہلے موجود تھی تو یہ ایک ہاتھ سے لمبی تھی جبکہ چوڑائی آدھا ہاتھ تھی اور موٹائی چوتھائی ہاتھ تھی (ساڑھے چار انچ) نیز اس میں ایک ایسی شے بلند تھی جس کی لمبائی' چوڑائی اور موٹائی ایک جیسی تھی' ان میں سے دو اینٹیں جوڑ دی جائیں تو وہ پہلی کی لمبائی بن جاتی تھی اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حجرہ شریفہ کی ان اینٹوں میں سے بچی ہوئی تھیں جن سے پہلی دیوار بنی تھی' یہ تبرک کے طور پر لی گئی تھیں' یہ ٹیڑھی تھیں جبکہ دیوار پتھروں سے بنی تھی جس میں چونا لگایا گیا تھا لہٰذا انہیں وہاں لگانا مناسب نہ تھا چنانچہ انہوں نے دیواروں کے اوپر پتھروں میں لگایا اور یہ گذر چکا ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں اینٹیں مختلف سمت میں لگائی گئی تھیں اور یہ اینٹیں وہ تھیں جنہیں ہم نے دیکھا تھا یا ایک اینٹ اور آدھی اینٹ کی تھیں' یہ تقریباً ڈیڑھ اینٹ کی تھیں چنانچہ یہ دیوار کی وہ چوڑائی تھی جو حضور ﷺ کے دور میں تھی' اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے حجرۂ مقدسہ کی دیوار کی چوڑائی میں دیکھی تھی جیسے آگے آ رہا ہے اور پھر صورت حال منبر کے قبلہ میں مرمر کے ظاہر ہونے سے ہو گئی کیونکہ ہم نے ملاحظہ کر لیا کہ اس کے اور جنگلے کے درمیان ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ دیکھا تھا جبکہ اس کے اور قبلہ کی طرف سے منبر کے اصلی مقام کی جانب کے درمیان تین برابر ہاتھ کا تھا جیسے ابن زبالہ نے بتایا چنانچہ یہ دیوار کی وہ چوڑائی تھی جس میں منبر اور اس کا درمیانی حصہ شامل تھا۔

رہا وہ جو ابن نجار نے اس ستون کے ذریعے حد بیان کی ہے جو مغرب کی طرف سے منبر کے ساتھ ملتا ہے اور جو آخری حصہ میں تھا اور مشرق کی طرف سے حجرۂ مبارکہ تک تھا تو جو پتھر انہوں نے یہاں بتائے ہیں' آج ان کا کوئی

وجود نہیں ملتا' شائد ان سے ان کا مقصد وہ مرمر تھا کہ جس کے درمیان میں منبر واقع تھا' ابن جماعہ نے اسے اپنے اس قول میں بیان کیا ہے: ''حجرۂ مبارکہ سے لے کر مغرب کی طرف سے ساتویں ستون تک'' کیونکہ ساتواں ستون' ان مذکورہ ستونوں میں وہی ہے جو مغرب کی طرف سے منبر سے ملا ہوا تھا' اور یہ اس صورت میں کہ ہم اس ستون کو شمار کریں جو حجرہ کے ساتھ ملتا تھا لیکن ابن نجار کے علاوہ میں نے مؤرخین میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس نے ابن جماعہ کی تائید کی ہو جس سے پتہ چلا کہ یہ ستون ہی مراد ہوگا چنانچہ میں نے منبر کے ساتھ والے ستون سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اضافہ تک (جس میں حجرہ مبارکہ داخل تھا) پیائش کی تو اس کی پیائش ساڑھے ستاون ہاتھ سے کچھ زیادہ تھی جبکہ اس اضافہ کی چوڑائی سوا ہاتھ تھی جیسے ٹوٹی دیوار کی تعمیر کے وقت مجھے معلوم ہوا' اس کے اور حجرہ کی اس طرف کی دیوار کے درمیان کوئی خلا نہ تھا' یہ بالکل اس کے ساتھ ملی تھی' درمیان میں سوئی گاڑ لینے کی گنجائش تک نہ تھی لیکن مؤرخین اس بات کو نہیں مانتے چنانچہ اس مذکورہ ستون اور حجرہ شریفہ کے درمیان انسٹھ ہاتھ سے ذرا کم فاصلہ تھا تو گویا ابن نجار نے اپنے سے پہلے مؤرخین کی اس بات میں پیروی کی ہے کہ اس اضافے اور اس طرف سے حجرے کی دیوار کے درمیان خلاء موجود تھا اور انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ اس اضافے کی چوڑائی اس سے زیادہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے چنانچہ انہوں نے مسجد کی چوڑائی بیان کرنے میں ان کا انتہائی قول منبر سے ملے ہوئے ستون تک ساٹھ ہاتھ یا کچھ زیادہ بتایا' یا یہ کہ پیائش کی یہ کمی ہاتھوں کے بڑے چھوٹے ہونے کی وجہ سے تھی علاوہ ازیں ظاہر یہ ہے کہ ابن جماعہ نے حجرے کے ساتھ ملے ہوئے ستون کا اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ساتویں ستون کو یہی سمجھا جو مغرب کی طرف اس ستون سے ملتا ہے جو منبر سے ملا ہوا ہے جبکہ یہ اس جانب منبر سے دوسرا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں: ساتویں ستون سے حجرۂ مبارکہ کی حد تک پیائش کی گئی تو معمول کے ہاتھ کی بناء پر بیالیس ہاتھ اور ہاتھ کا دو تہائی تھا۔

میں یہاں بتاتا چلوں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے' میں نے اس کا اعتبار معمول کے ہاتھ سے کیا ہے چنانچہ میں نے دیکھا کہ یہ پیائش مغرب کی طرف سے منبر سے دوسرے ستون تک ہوتی ہے اور پھر میں نے جب اس ہاتھ سے پیائش کی جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں تو وہ پینسٹھ ہاتھ تھی اور یہ عین اس کے مطابق ہے جسے ابن جماعہ نے ذکر کیا ہے اور جسے ہم نے معمول کے ہاتھ کے مطابق پایا' کیونکہ معمول کا ہاتھ' مصر میں استعمال ہونے والے لوہے کے ذراع (ہاتھ) کے مقابلے میں ایک ہاتھ اور ہاتھ کا تہائی حصہ تھا جبکہ وہ بتیس انگلی کا تھا جبکہ وہ ذراع جو ہم نے ذکر کیا' اکیس انگلیوں کا ہے چنانچہ معمول کا ہاتھ (ذراع) ہمارے لکھے ہاتھ کے مقابلہ میں ایک ہاتھ اور نصف انگلی ہے۔

علامہ مراغی اس طرف گئے ہیں کہ اس ستون (جو منبر سے دوسرا) کو حد بنایا جائے کیونکہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ آج وہ بلاط موجود نہیں ہے' پھر کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ کی روایت سامنے رکھ کر مشرق سے مغرب تک تریسٹھ ہاتھ کا اعتبار کیا ہے اور یہ سب سے کم پیائش بتانے والی روایت ہے چنانچہ یہ حجرۂ مبارکہ سے منبر کے قریب دوسرے ستون تک (نہ کہ اگلے ستون تک) تقریباً ساٹھ ہاتھ ہے۔ علامہ مراغی مزید کہتے ہیں کہ اس بناء پر حضرت عمر بن عبدالعزیز والی

دیوار، پھر اس کے اور حجرۂ مبارکہ کی اصلی دیوار کے درمیان تقریباً تین ہاتھ ہے۔انتھٰی۔

علامہ مراغی نے جو کچھ سمجھا ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں کیونکہ انہوں نے یہ پیائش تقریباً ساٹھ ہاتھ بنائی ہے حالانکہ وہ پینسٹھ ہاتھ ہے اور پہلے تاریخ دان حضرت عمر بن عبد العزیز کے اضافے اور حجرہ کی دیوار کے درمیان خلاء ثابت کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے تخمینہ (اندازہ) لگایا ہے کہ نہ اس اضافے کو ملا کر تین ہاتھ بنتی ہے جبکہ تم جانتے ہی ہو کہ اس اضافے کی چوڑائی سوا ہاتھ سے کچھ زیادہ ہے جبکہ اس کے اور حجرہ کی دیوار کے درمیان اور کوئی شے نہیں۔

ابن زبالہ اور یحیٰی نے اپنے طریقے سے مسجد کی حد اور اس کی ہاتھوں سے پیائش کے بارے میں ایسی چیزیں ذکر کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں مشرق کی طرف سے مسجد کی دیوار حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے اضافے تک نہیں پہنچتی تھی بلکہ وہ اضافہ اور مغرب سے کچھ حصہ ملا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ تک تھی جبکہ حضرت عائشہ کے حجرہ کی دیوار قبرِ انور کے ساتھ ملنے والے ستونوں اور ان ستونوں کے درمیان تھی جن کے درمیان وہ مقصورہ ہے جو حجرہ کو گھیرے ہوئے ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے اوّلاً مسجد بنائی تو اس کے تین ستون مغرب میں منبر کی دائیں طرف تھے اور تین ستون مشرق میں اس کی دائیں طرف تھے اور پھر اوّلاً اس کی انتہاء ستونِ توبہ تھا کیونکہ وہ تین ستونوں کے بعد دیوار کی جگہ پر تھا اور مشرق سے مغرب تک اس کی پیائش تریسٹھ ہاتھ تھی، کچھ کہتے ہیں کہ پچپن ہاتھ تھی اور پھر انہوں نے مشرق و مغرب کی طرف سے اس میں اضافہ کیا اور اس کے باوجود وہ اضافہ مشرق سے اضافۂ عمر بن عبد العزیز تک نہیں پہنچتا، انہوں نے قبلہ اور شام کی طرف اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس روایت کے موافق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ پیائش سو ہاتھ تھی، میرے نزدیک اسے اولیت اس بناء پر ملتی ہے کہ اس وقت منبر شریف مسجد کے درمیان تھا کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے صحابہ کے درمیان میں تو کھڑے نہ ہوں اور منبر پر ایک طرف کو ہو کر کھڑے ہوں اور آخری دور کے مؤرخین مسجد نبوی کے اس طریقے پر ہونے کے خلاف ہیں کہ وہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے اضافے تک نہیں پہنچتی لیکن یہ بہتر ہے کیونکہ یہ بات قابلِ تسلیم نہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز مسجد میں ایسا اضافہ کریں جس سے روضہ شریف کی حد میں کمی آ جائے، خدا پناہ دے اور صحیح بات یہ ہے کہ مبارک قبروں کا مقام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا صفہ ہے جبکہ اس کے لئے سہارے کی ضرورت ہے جس سے ظاہر ہے کہ اضافہ میں دیوار صفہ ہی کی دیوار ہے اور اس کا جو حصہ باہر ہے وہ گھر کا باقی حصہ ہے اور پھر تلاش کے بعد حارث محاسبی سے نقل شدہ علامہ مرجانی کا وہ کلام مل گیا جس میں اس کی وضاحت دیکھ لی کیونکہ آگے مسجد کی حد بندی کے ذکر میں آ رہا ہے کہ منبر کے مشرق کی طرف چھ ستون تھے، پھر کہا کہ ریاض الجنہ قبرِ انور اور منبر کے درمیان ہے تو جو حصہ چھٹے ستون کی دائیں طرف (جس کی میں نے منبر کی دائیں طرف حد بیان کی ہے) ہے وہ پہلی مسجد کا حصہ نہیں ہے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا حصہ ہے جس سے مسجد وسیع ہوئی اور یہ روضہ میں تھا۔انتھٰی۔

اب ہم ابن زبالہ کی عبارت لکھتے ہیں کیونکہ یحیٰی نے ان سے زیادتی اور مخالفت کے بغیر روایت کی ہے اور پھر

اس میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں آج کوئی نہیں جانتا تاہم ان کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے انہیں ذکر کر دینا چاہئے اگرچہ بعد کے مؤرخین نے انہیں ذکر نہیں کیا تو سنئے' ابن زبالہ عبید بن عمر ابن حفص بن عاصم سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی مسجد کے تین ستون مشرق کی طرف ملتے تھے اور تین ہی مغرب کی طرف تھے' یہ ستون ان ستونوں کے علاوہ تھے جو درمیانی صحن میں صحن سے قبلہ کی طرف ایک لائن میں تھے اور اگر یہ تصریح آگے نہ آ رہی ہوتی کہ ان چھ ستونوں میں سے تین تو منبر کی دائیں طرف اور تین بائیں طرف تھے (پہلی تعمیر کے وقت) تو ہم اس کا مطلب یہ نکالتے کہ ان چھ کی ابتداء منبر سے ملے ستون سے ہوئی تو یوں اس کی انتہاء وہ ستون ہوتا جو اسطوانہ توبہ سے ملا ہوا ہے' حجرہ کی دیوار بعد میں ہوتی چنانچہ یہ پہلی حد کے موافق ہو جاتا لیکن یہ لکھنے کے بعد انہوں نے کہا ہے: جمہور اہلِ علم وغیرہ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ان دو نشانوں تک تھی جو ان دو ستونوں کے قریب ہیں جو مغربی جانب اور قبرِ انور کے درمیان ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آج قدیم مسجد میں وہ چوکور مغربی ستون دکھائی نہیں دیتا البتہ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے (اس چوکور کا مقابلہ قبرِ انور والے کے ساتھ مقابلہ کرتے وقت پھر جو آگے بیان آ رہا ہے جہاں اس حائز کا ذکر ہے جو بارش کا پانی روکنے کے لئے قبلہ والی چھت کو ڈھانپنے کے لئے بنایا گیا) یہ وہی آٹھ گوشہ عظیم ستون تھا جو آج قبلہ کی طرف والی چھت میں دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ مغرب کی طرف اس چھت میں مسجد کی کھلی جگہ کا حصہ تھا جیسے قبرِ انور کا چوکور ستون مشرق کی طرف کھلی جگہ کا حصہ تھا۔

'اور لگتا یہ ہے کہ اس ستون کی آٹھ گوشہ تعمیر نئے سرے سے ہوئی تھی' پہلے چار گوشہ تھا جیسے انہوں نے قبرِ انور کے ستون کو آٹھ گوشہ کیا اور جو حجرہ سے ملتا ہے وہ اب بھی چار گوشہ ہی ہے اور قبرِ انور والا چوکور ستون وہی ہے جو شام کی طرف سے حجرے کو گھیرنے والی دیوار کے غربی جانب کے اخیر میں تھا' اسے اسطوانہ (ستون) جبریل کہا جاتا ہے جیسے آگے وضاحت آ رہی ہے اور وہ ستون جو اس کے قریب ہی اس جالی سے ملا ہوا ہے جو آج کل حجرہ کو گھیرے ہوئے ہے' یہ حصہ اسطوانہ وفود اور چکور ستون کے درمیان ہے چنانچہ اس بناء پر حجرہ کی دیوار اس حصے میں ہے جو قبرِ انور اور ساتھ والے ستون کے درمیان ہے۔

ابن زبالہ نے اپنی گذشتہ تحریر کے بعد لکھا ہے: انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ رسول اکرم ﷺ مسجد میں اس جگہ اعتکاف کرتے تھے جہاں بنو عبد الرحمٰن بن حارث بیٹھتے تھے اور یہ دلیل بھی دی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں بیٹھ کر حضور ﷺ کی مسجد میں بحالتِ اعتکاف کنگھی کیا کرتی تھیں۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مشرقی دیوار ان قندیلوں کے درمیان تھی جو اسطوانہ توبہ کی لائن اور ان ستونوں کے درمیان تھی جو قبر کے ساتھ ہیں اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے قبرِ انور والے ستون سے اوپر کی طرف اضافہ کیا تھا۔

میں کہتا ہوں' ابن زبالہ نے جو کچھ حضرت مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ اس بات کی خوب وضاحت کرتا

ہے جو ہم نے بیان کر دی کہ مسجد کی مشرقی دیوار قبرِ انور کے ساتھ ملنے والے ستونوں اور ان کے مقابلہ میں آنے والے ستونوں کے درمیان تھی چنانچہ یہ دیوار قبلہ کی طرف سے شام کی طرف ان ستونوں کے درمیان تھی جسے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے قبر کے ساتھ ملے ستون تک مؤخر کر دیا تھا۔عنقریب علامہ ابن زبالہ علامہ محاسبی سے اس کی تصریح بیان کریں گے۔

رہا ابن زبالہ کا قول ''و احتجوا آخر تک'' تو اس میں انہوں نے یوں دلیل بنائی ہے کہ آپ کے بیٹھنے کی جگہ آپ کے حجرہ کے ساتھ ملتی تھی' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گھر میں بیٹھے حضور ﷺ کو کنگھی کیا کرتی تھیں' آپ مسجد میں بیٹھے ہوتے تھے اور پھر اسی دلیل کی خاطر انہوں نے اس کے بعد یہ حدیث بھی بیان کر دی کہ: ''میری ماہواری کے دنوں میں آپ میرے قریب ہوجاتے تو میں کنگھی کیا کرتی' آپ مسجد ہی میں بیٹھے ہوتے۔''

آج کل اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جہاں بنوعبد الرحمٰن بن حارث بیٹھا کرتے تھے۔

ابن زبالہ اور یحییٰ نے حضور ﷺ کے جائے اعتکاف کے بارے میں کچھ چیزیں بتائی ہیں' ہم انشاء اللہ ان کا ذکر کریں گے' ان میں جو ہمیں پسند ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کھجور کی ایک چارپائی تھی جس میں شاخیں تھیں اور وہ قبرِ انور کے سامنے والے ستونوں اور قندیلوں کے درمیان رکھی ہوتی تھی جس پر آپ لیٹا کرتے تھے۔

ابن زبالہ کا یہ کہنا ''العی وجاہ القبر'' اس سے ان کی مراد وہ ستون ہیں جو قبرِ انور کے سامنے تھے' یہ وہ ستون ہیں جو استوانہ توبہ والی لائن میں آج حجرہ کے گرد جالی سے ملے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اسطوانہ توبہ تھا جیسے آگے آ رہا ہے اور یہ بات اس کے مطابق ہے جو مالک نے ذکر کی ہے کہ دیوار مذکورہ قندیلوں کی حد میں تھی۔

ابن زبالہ نے کئی اہلِ علم سے روایت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مسجد رسول اللہ ﷺ کے تین ستون تھے اور جب تم حضرت حسن بن زید کی جائے اعتکاف کی طرف منہ کرو تو منبر کی دائیں جانب واقع تھے اور دوسری طرف سے اسطوانہ توبہ تک تھے جن کے درمیان مشرق سے مغرب تک فاصلہ تریسٹھ ہاتھ تھا اور حضرت عبد الرحمٰن بن سعد اپنے بزرگوں سے سن کر بتاتے تھے کہ مسجد ہر طرف سے پچاس پچاس ہاتھ تھی۔

میں کہتا ہوں کہ وہ حجرے جو مسجد کی مشرقی جانب تھے آئندہ اضافے میں سارے یا ان میں سے چند مسجد میں ڈال دیئے گئے تھے۔

ابن زبالہ مزید کہتے ہیں ''نبی کریم ﷺ کی مسجد کی علامت (یعنی جب آپ مکہ سے تشریف لائے)'' پھر انہوں نے اس عنوان کے ماتحت جلی ہوئی چھت کے نشانات بتائے اور ان ٹکڑوں کا ذکر کیا جو اب نہیں رہے' پھر اس مسجد رسول اللہ ﷺ کی علامت (جسے آپ نے خیبر سے واپسی پر بنایا تھا) کے بارے میں بتاتے ہیں کہ آپ نے قبلہ کی طرف وہی بنیاد رہنے دی جو پہلی حد تھی اور مشرق کی طرف اُن ستونوں تک اضافہ کیا جو نزدیک قبرِ انور کے چوکور ستون کے پاس تھے'

ان ستونوں کی علامت یہ تھی کہ دو ستونوں کے درمیان کھلی جگہ ایک اُبھار تھا اور یونہی مغرب سے اس ستون تک جو چوکور ستون سے ملتا ہے' ستونوں کے درمیان اس میں بھی خالی مقام پر اُبھار تھا اور مسجد کی حد پتھر کے ٹکڑوں سے دکھائی دیتی تھی۔ علامہ یحییٰ کی عبارت یہ ہے: مسجد کی حد میں کنکروں کے نیچے مضبوط پتھر تھے اور وہاں استوانۂ توبہ اور قبر کے درمیان ان ستونوں کی صف میں اُبھار تھا جن کے درمیان ابھری ہوئی جگہ تھی اور مغرب میں یونہی زمین میں پتھر کا ابھار تھا جو گڑا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے شام والی جانب ترک کر دی تھی' اس میں زیادتی نہیں کی۔ انتٰہی کلام ابن زبالہ۔

ان کا قول ''مغرب سے بھی اسی طرح تھا'' یعنی یہ حدِ مسجد زمین میں لگے پتھر سے ظاہر ہوتی تھی۔

ابن زبالہ نے ایک اور مقام پر بھی نبی کریم ﷺ کی مسجد کی ہاتھوں کے ذریعے پیائش بتائی ہے یعنی وہ حصہ جو آج تک اسی طرح چلا آیا ہے۔ پھر کہا: اس کی حد منبر کے مشرق سے چار ستون تک ہے اور یونہی اس کے مغرب سے بھی چار ہی ستون تک ہے۔ انتٰہی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ابن نجار اور ان کے بعد کے مؤرخین نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا البتہ ابن نجار نے اپنی کتاب کی ابتداء ہی یہ عذر پیش کر دیا تھا کہ میں ان دنوں مدینہ میں چند دن کے لئے ٹھہرا ہوا تھا اور میری کتابیں پاس نہیں تھیں اور پھر واضح کر دیا کہ میں نے اسے اپنی سمجھ کے مطابق لکھا ہے۔ علامہ مطری بھی ان کے طریقے پر چل گئے جبکہ ابن زبالہ اور یحییٰ اس سلسلے میں اچھے رہے کیونکہ یہ دونوں' مدینہ پر کچھ لکھنے والوں میں سے اول درجہ رکھتے تھے ابن زبالہ تو حضرت امام مالک بن انس کے ساتھیوں (شاگردوں) میں تھے جن کا نام محمد بن حسن تھا اور ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ماہِ صفر ۱۹۹ھ میں لکھی تھی' رہے علامہ یحییٰ تو وہ ان کے شاگردوں کے شاگرد تھے جن کا وصال ۲۷۷ھ کو تریسٹھ سال کی عمر میں ہوا' رہے ابن شبہ تو وہ یحییٰ کے ہمعصر اور ذرا ان سے پہلے ہوئے تھے' مجھے ان کی کتاب کا وہ حصہ دیکھنے کو نہیں ملا جس میں مسجد نبوی کا ذکر ہے' اگر مل جاتا تو کئی اعتراضات کا جواب مل جاتا کیونکہ وہ ہر شے کی مکمل وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں کیونکہ وہ ٹھوس امام ہیں اور ابن زبالہ اگرچہ کمزور تھے تاہم وہ یحییٰ کی موافقت کر لینے سے قوی ہو جاتے تھے کیونکہ وہ ان کی روایت کے پیچھے متصل ہی روایت کرتے تھے۔ پھر کلام مرجانی میں محاسبی سے مجھے وہ نقل ملی جو ابن زبالہ کے کلام سے موافق تھی میرے نزدیک وہ اس معاملے میں عمدہ ہے۔ دیکھئے علامہ مرجانی کہتے ہیں: حارث بن اسد محاسبی نے کہا: پہلی مسجد کی حد' منبر کی دائیں طرف سے ان قندیلوں تک جو خوخہ (جھونپڑا) کے سامنے تھیں' چوڑائی میں چھ ستون تھے جس کے اگلے موڑ پر اس سے دائیں طرف تین ستون تھے جن کی لمبائی اس کے قبلہ سے آخر تک تھی اور آج یہ مسجد کی ڈاٹوں میں سے مکمل چار کے سامنے ہے (یعنی محاسبی کے دور میں) اور جو حصہ اس سے زائد ہے وہ پہلی مسجد سے خارج تھا۔

علامہ محاسبی مزید کہتے ہیں: امام مالک سے روایت ہے' انہوں نے کہا: مسجد کا آخری حصہ بابِ عثمان کہلانے والے دروازے سے دوسرے دروازے کی چوکھٹ کے سامنے آتا تھا اور وہ مسجد سے چار ڈاٹوں کے فاصلے پر تھا۔ علامہ

نے مزید کہا: اور ریاض الجنۃ' قبر اور منبر کے درمیان والا حصہ ہے۔

علامہ محاسبی کا یہ قول: ''منبر کی دائیں طرف سے'' اس کا مطلب ہے اس کے مشرق کی طرف' کیونکہ پہلے ان کی طرف سے ابن زبالہ کی کلام کی مخالفت گذر چکی ہے کیونکہ انہوں نے منبر کی دائیں طرف سے مراد منبر کے سامنے سے دائیں طرف لی ہے اور جن دو طاقوں کا ذکر علامہ محاسبی نے کیا ہے وہ ابن زبالہ اور یحییٰ کی کلام میں گذر چکا ہے جو آج کل موجود نہیں اور باب عثمان سے دوسرا دروازہ آج کل باب النساء کے نام سے مشہور ہے' چنانچہ ان کا کلام صراحۃً گذشتہ اس حد کا رد بنتا ہے جو مسجد کے صحن میں آج کل لگے دو پتھروں کے ذریعے شام کی طرف سے حد مذکور ہے اور اسی کلام سے ذراع والی گذشتہ روایت کی تائید ہوتی ہے اور وہ روایت یہ ہے کہ مسجد ہر طرف سے سو سو ہاتھ تھی کیونکہ یہ روایت اس کے قریب ہے۔

محاسبی کے اس قول سے چار باتیں حاصل ہوتی ہیں:

(۱) ایک قول یہ ملتا ہے کہ یہ انتہاء اس ستون تک تھی جو اس جانب سے منبر کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہ وہ انتہاء ہے جس پر ابن نجار اور ان کے پیروکاروں کا اعتماد ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ منبر کے ساتھ والے ستون تک تھی' یہ بھی اس طرف منبر سے دوسرے ستون تک تھی حالانکہ یہ دونوں دور ہیں۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ اس طرف منبر سے تیسرے ستون تک تھی۔ ابن زبالہ کی کلام سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کی یہ حد حضور ﷺ کے اضافہ سے پہلے کی ہے جبکہ محاسبی کا کلام اس کے خلاف ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ منبر سے چوتھے ستون تک تھی کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ منبر کے دائیں پہلو سے تین ستونوں پر تھی تو اس کی مغربی دیوار چوتھے ستون کی جگہ پر ہوئی' اس چوتھے ستون کی صف میں قبلہ کی طرف چوکور ستون تھا جو آدمی کے بیٹھنے کی مقدار زمین سے نیچا تھا اور اسی صف میں شام کی طرف محراب حنفیہ محدث کا محراب تھا۔

(۵) پانچواں قول یہ ہے کہ یہ منبر سے پانچویں ستون تک تھی کیونکہ پہلے آ چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر سے واپسی پر مغرب کی جانب ایک اور ستون جتنا اضافہ فرمایا تھا جیسے پچھلی روایت سے پتہ چلتا ہے یونہی ابن زبالہ کی بھی اس بارے میں وضاحت گذر چکی ہے کیونکہ انہوں نے اس حد کے بارے میں کہا تھا کہ: اس کے چار ستون ہیں چنانچہ مسجد کی حد منبر سے پانچویں ستون تک پہنچتی ہے اور یہ وہی ستون ہے جو جو مغرب کی طرف ایک صف میں کھڑے ستونوں سے ملتا ہے' یہ بھی نیچے سے بیٹھنے کی مقدار چوکور شکل میں تھا اور اسی صف میں شام کی طرف وہ ستون تھا جو مغرب کی طرف سے محراب حنفیہ سے ملتا تھا' چنانچہ یہی دو چوکور ستون وہ ہیں جن کے بارے میں مغرب کی طرف سے مسجد نبوی کی حد کے برابر مختلف روایات ملتی ہیں اور پھر مسجد میں آتش زدگی کے بعد ہمارے زمانے کی نئی تعمیر کے وقت انہیں چوکور ہی رکھا گیا اور دوسرا چوکور ستون یعنی منبر سے پانچواں'

وہی ہے جو میرے نزدیک بھی زیادہ راجح ہے کیونکہ اس کے سامنے قبلہ کی دیوار میں نقش و نگار ہیں جو نیچے تک آ جاتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ' اوپر والا حصہ درست کرنے کے موقع پر نیز اس عمارت کو سفید کرنے کے وقت جسے ہم نے پہلے دیکھا تھا' ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور ان دونوں کا درمیانی اور کچھ اوپر والا حصہ گر گئے تھے اور وہ حصہ رہ گیا جو اوپر والے عصابہ اور چھت کے درمیان تھا پھر اس کا باقی حصہ ہمارے زمانے میں لگنے والی آگ میں جل گیا' دیوار میں نقش و نگار کے قدرے رنگ رہ گئے تھے اور جب قبلہ کی دیوار بنی تو سب ختم کر دیئے گئے تو ظاہر یہ ہے کہ اس طرف سے یہ مسجدِ نبوی کی انتہاء تھی اور یہ انتہاء علامہ مطری کی بیان کردہ انتہاء کے مخالف ہے کیونکہ انہوں نے اسے کئی ذریعوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتہائی اضافے کی حد بتایا ہے:

(۱) میں نے منبر سے ملے ستون سے اس نقش و نگار کے سامنے والے ستون تک ہاتھوں سے پیائش کی تو وہ سینتیس ہاتھ تھی اور جب ہم اسے منبر سے ملنے والے ستون اور حجرہ والے ستون کے درمیانی ذراع سے ملاتے ہیں تو یہ ساٹھ ذراع (ہاتھ) ہو جاتا ہے جیسے گذر چکا اور یہ اس پیائش کے قریب ہو جاتا ہے جو پہلی روایت میں گذری۔

(۲) یہ بات بعید ہے کہ اس طرز (سجاوٹ) کو حضرت عثمان کی طرف سے کی گئی زیادتی بتایا جائے جیسے مطری نے کہا ہے:

ابن زبالہ نے کہا کہ ان کے لئے نقش و نگار میں علامات تھیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ زائل ہو گئیں تو یہ اس کا بدل بن گئے۔

(۳) آگے آ رہا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اضافہ کیا تو اس کی چوڑائی ایک سو بیس ہاتھ ہو گئی لیکن مشرق کی طرف سے انہوں نے کوئی اضافہ نہ کیا چنانچہ آپ کے دور میں مسجد کی انتہاء حجرہ مبارکہ ہی رہی اور تم جانتے ہی ہو کہ حجرۂ مبارکہ سے اس طراز کے سامنے والے حصے تک کی پیائش سو ہاتھ سے کم ہے تو یہ حضرت عثمان کی انتہائی زیادتی کیسے بن سکتی ہے جبکہ انہوں نے حضرت عمر کی توسیع پر مغرب کی طرف سے ایک ستون کا اضافہ کیا تھا اور اگر یہ طراز حضرت عثمان کی زیادتی کی انتہاء شمار ہو تو لازم آئے گا کہ حضرت عمر کے دور میں مسجد کی چوڑائی نوے ہاتھ تھی اور اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

(۴) آگے آ رہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مغرب کی طرف ایک ستون کے علاوہ اور اضافہ کیا جبکہ ولید کی مغرب میں زیادتی دو ستون تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس مذکور ستون سے مسجد کی مغربی دیوار تک پانچ ستون ہیں اور جب ان میں سے حضرت عثمان اور ولید کے اضافہ والے ستون نکال دیئے جائیں تو حضرت عمر کی زیادتی دو ستون رہ جاتی ہے اور یہ دونوں بیس ہاتھ کے قریب ہو جاتے ہیں جو حضرت عمر کی طرف سے

اضافہ تھا اور یہ اضافہ پہلے سو ہاتھ پر کیا گیا جیسے آگے آ رہا ہے۔

(۵) منبر کی جگہ تبدیل نہیں ہوئی اور یہ بات بہت بعید ہے کہ حضورﷺ منبر کی جگہ مسجد کے ایک کنارے پر بناتے اور کھڑے ہوتے وقت اپنے صحابہ کے درمیان کھڑے نہ ہوتے۔

(۶) آگے آ رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس کے گھر میں سے کچھ حصہ مسجد میں شامل کیا اور جو باقی رہا' اس میں سے بھی کچھ حصہ داخل کیا اور باقی مروان بن حکم کے گھر میں شامل کر دیا۔ علامہ یحییٰ نے اس گھر کی زیادتی کے بارے میں جو روایت کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مسجد نبوی کے بالکل متصل تھا بلکہ یہ بھی روایت ہے کہ اس گھر کا پرنالہ مسجد میں بہتا تھا اور یحییٰ نے نقل کیا ہے کہ یہ گھر ان چوکور ستونوں کے درمیان تھا جو مروان بن حکم کے متصل تھے یعنی دروازہ تھا جو مروان کے گھر سے ملا ہوا تھا کیونکہ پہلے بتا دیا گیا ہے کہ اس مکان کا کچھ حصہ مروان کے گھر میں شامل کیا گیا تھا لہٰذا لازم ہے کہ وہ چوکور ستون حضرت عباس کے گھر کا ابتدائی حصہ ہو اور مسجد نبوی کا آخری حصہ۔

(۷) یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب ''مربعہ غربیہ'' کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ستون ہوتا ہے جو مسجد کے صحن میں مغرب کی طرف' چھتے ہوئے حصے کی انتہاء پر ان دو برآمدوں کی زیادتی سے پہلے ایک رُکن ہوتا تھا جن کا ذکر آگے آ رہا ہے' آج کل یہ ستون آٹھ پہلو ہے چنانچہ جمہور کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ مسجد نبوی شریف مربعہ غربیہ ستون کے قریب دو ستونوں کے درمیان اور قبر والے ستون کے درمیان ہوتی تھی جیسے ابن زبالہ نے نقل کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ منبر سے پانچواں مغربی ستون اس مذکور ستون کے قریب ہی ہے کیونکہ یہ ستون منبر سے چھٹا ہے تو واضح ہوا کہ ''مربعہ غربیہ'' سے مراد یہی ہے' جمہور علماء اس بات پر ہیں کہ مسجد نبوی ہر طرف سے سو سو ہاتھ تھی نیز اس روایت کی تائید علامہ محاسبی کی گذشتہ روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے امام مالک سے نقل کرتے ہوئے پہلی مسجد کے آخری حصہ کی حد بیان کی ہے کہ بابِ جبریل سے دوسرے دروازے کی چوکھٹ تک تھی اور وہ جو آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بابِ رحمت (بابِ عاتکہ) میں تبدیلی نہیں کی تھی' یعنی انہوں نے نقل کی اور صرف آخری حصہ بتایا اور اسے پہلے دروازے کے سامنے قرار دیا کیونکہ آپ نے مغرب والی جانب سے زیادتی کی تھی' جبکہ باب الرحمہ اور ان دو پتھروں کے درمیان' جن کے بارے میں بتایا کہ شام کی طرف سے مسجد کی حد ہیں' فرق واضح ہے کیونکہ یہ ان دونوں کے سامنے سے بہت پیچھے ہے' گویا کہ وہ دونوں پتھر موری کے دو کنارے دکھانے کے لئے رکھے گئے ہیں چنانچہ جو صاف دکھائی دیتا ہے' وہ یہ ہے سو ہاتھ والی روایت راجح ہے اور وہی حد صحیح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ ابنِ نجار نے جب اس پیمائش کے بارے میں اختلاف دیکھا تو انہیں سوجھا کہ کم پیمائش کا ذکر کر دیں کیونکہ یہ تو بہر صورت ثابت ہی ہے چنانچہ انہوں نے گذشتہ پیمائش بیان کر دی اور بعد والوں نے ان کی

پیروی کی حالانکہ انہوں نے اپنی کتاب کی ابتداء میں اپنے پاس کتابیں نہ ہونے کا عذر پیش کر دیا تھا جبکہ انسانی حافظہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور جب یہ بات شاہین جمالی (حرم شریف کے محافظ، تعمیر کرنے والوں کے منتظم اور خادموں کے نگران) کو معلوم ہوئی تو اس نے قبلہ کی طرف ستونوں کی صف میں موجود منبر سے پانچویں ستون کی اوپر والی طرف طراز (نقش و نگار) بنا دیا جو چھت سے متصل تھا اور اس میں نقش تھا کہ مسجد نبوی کی انتہاء یہاں تک ہے، اللہ تعالیٰ انہیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ حدودِ مسجد کی ہمیشہ حفاظت کرتے رہیں اور اللہ اسے اپنے مقرب بندوں میں ملا دے۔

اسی بنیاد پر ایک اور مسئلہ اٹھتا ہے جسے علامہ نووی نے شرحِ مسلم اور مناسک وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ نماز کا کئی گنا ثواب اس مسجد میں ہوتا ہے جو حضور ﷺ کے دور میں تھی، یہ ثواب بعد میں زیادہ کئے گئے مسجد کے حصوں میں نہیں ہوتا حالانکہ یہ بات کسی اور عالم نے نہیں لکھی لیکن خطیب بن حملہ نے محبّ طبری سے نقل کیا ہے کہ کئی گنا ثواب حاصل ہونے والی مسجد جس کا حدیث میں بیان ہے، وہ ہے جو حضور ﷺ کے دور میں تھی اور اس میں اضافے بھی شامل ہیں کیونکہ اس بارے میں اخبار اور آثار موجود ہیں حالانکہ ابن حملہ نے علامہ نووی کو اپنی کتابوں میں خصوصی حیثیت دے رکھی ہے جبکہ برھان بن فرحون نے ابن حاجب فرعی کی کتاب کی شرح میں لکھا ہے کہ امام نووی کے علاوہ کسی اور نے اس مسئلہ میں مخالفت نہیں کی البتہ شیخ محبّ الدین طبری نے اپنی کتاب ''اِحکام'' میں لکھا ہے کہ علامہ نووی نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

آپ مزید لکھتے ہیں: ابوعبداللہ بن فرحون نے ''شرح مختصر المؤطا'' میں نقل کیا ہے کہ مجھے مالکی حضرات کی ایک کتاب سے پتہ چلا ہے کہ امام مالک سے کسی نے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: حضور ﷺ نے اپنے قول ''فِي مسجدي هٰذا '' میں آئندہ اضافہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں اضافے کی اطلاع دے دی تھی۔ انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں کہ برھان کا یہ قول کہ ''نووی کے علاوہ اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی'' صحیح نہیں کیونکہ ابن جوزی نے ''الوفا'' میں ابن عقیل حنبلی سے نقل کیا ہے اور جو کچھ انہوں نے طبری کی ''اِحکام'' سے نقل کیا ہے، میں نے اس کی طرف رجوع کیا تو دیکھا کہ انہوں نے اس فضیلت میں زیادہ شدہ حصے کو بھی شامل کیا ہے اور اسے اپنی کتاب کی بارھویں فصل کے آخر میں بیان کیا پھر کہا کہ جس عالم تک یہ روایت نہیں پہنچی، انہوں نے فضیلت کو اسی مسجد تک محدود رکھا جو حضور ﷺ کے دور میں تھی کیونکہ اشارہ (ھٰذہٖ سے) اسی طرف تھا، ایک اور عالم بھی اس طرف گئے لیکن جب انہیں پتہ چلا تو اس طرف مائل ہو گئے اور اسے قبول کر لیا۔ انتہیٰ تو گویا ابن فرحون نے سمجھ لیا کہ ان کے قول ''ایک عالم'' سے مراد علامہ نووی تھے۔

رہا وہ جو محبّ طبری نے امام مالک سے بیان کیا ہے تو علامہ اقشہری نے اپنی ''روضہ'' میں عبداللہ بن نافع (شاگردِ مالک) اور انہوں نے مالک سے روایت کیا تو کلام کے درمیان ان کے الفاظ یہ ہیں: '' امام مالک سے پوچھا

گیا کہ مسجد کی حد سے مراد آیا وہ ہے جو حضور ﷺ کے دور میں تھی یا اس سے مراد موجودہ مسجد ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اس سے مراد آج کی مسجد ہے اور بتایا کہ حضور ﷺ کو اس بات کی خبر دے دی گئی تھی جو ہونے والی تھی تو اس وقت جس نے ذہن میں رکھی' اسے یاد رہی اور جو بھول گیا سو بھول گیا' اگر یہ بات نہ ہوتی تو صحابہ کے ہوتے' خلفاء راشدین اسے جائز نہ جانتے' کسی نے بھی اس بات کا انکار نہیں کیا تھا۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں کہ مسجد نبوی کی تخصیص بتانے والے کے پاس دلیل مسجدی ھٰذا کا اشارہ ہے حالانکہ شاید حضور ﷺ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اس مسجد کے علاوہ مدینہ کی دوسری مسجد کو یہ فضیلت حاصل نہیں' یہ مطلب نہ تھا کہ آپ مسجد میں ہونے والی آئندہ زیادتی کو اس فضیلت سے نکال رہے تھے' حالانکہ امام نووی بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مسجدِ حرام کے اضافہ شدہ حصہ میں ثواب کئی گناہ ملتا ہے تو مسجد مدینہ کو بھی یونہی ہونا چاہئے جیسے ابن تیمیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ: ''یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں پہلے ائمہ کرام کہتے ہیں اور اسی پر ان کا عمل ہے' حضرت و عثمان رضی اللہ عنہما بھی یہی کرتے رہے کیونکہ دونوں ہی نے مسجد کے قبلہ کی طرف اضافہ کیا تھا اور پھر اسی اضافہ شدہ حصہ میں کھڑے ہوتے رہے اور یونہی وہ پہلی صف میں بھی کھڑے ہوتے رہے جو سب سے فضیلت والی ہوتی ہے حالانکہ یہ قابلِ تسلیم نہیں کہ آپ کی اس مسجد کے علاوہ کسی اور میں نماز افضل ہو اور یہ بھی ناممکن تھا کہ خلفاءِ کرام اس مسجد کو چھوڑ کر کسی اور مسجد میں نماز پڑھتے' پہلے بزرگوں سے مجھے کسی کا اس بارے میں اختلاف نہیں ملا البتہ بعض متاخرین نے ذکر کیا ہے کہ زیادتی' آپ کی مسجد نہیں کہلاتی' سلف میں سے کسی کا یہ قول نہیں ہے اور عنقریب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اضافہ کے بارے میں ایسی اخبار و آثار آ رہی ہیں جو اس بات کی قوت کا باعث ہیں۔

تیسری فصل

حضور علیہ وسلم ﷺ قبلہ بدلنے سے پہلے اور بعد میں کہاں کھڑے ہوتے تھے؟

ہمیں بخاری شریف میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت شدہ حدیث ملتی ہے' فرمایا: رسول اللہ ﷺ سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھاتے رہے' اس دوران آپ کی خواہش یہ رہی کہ کعبہ کو منہ کرنے کو حکم مل جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ (سورۃ البقرہ: ۱۴۴)

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا۔''

چنانچہ آپ نے چہرۂ انور کعبہ کی طرف پھیر لیا تو بے وقوفوں نے کہا (یہودی تھے):

مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ○ (سورۃ البقرۃ: ۱۴۲)

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ' کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے' جس پر تھے' تم فرما دو کہ پورب پچھم' سب اللہ ہی کا ہے' جسے چاہے' سیدھی راہ چلاتا ہے۔''

حضورﷺ کے ہمراہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور پھر نکل کھڑا ہوا اور نمازِ عصر انصار کے ساتھ پڑھی' وہ بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے تھے' کہنے لگا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے تو انہوں نے کعبہ کی طرف منہ کیا تھا چنانچہ انہوں نے مڑ کر اپنا رُخ کعبہ کی طرف کر لیا۔

حضرت یحییٰ کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بتاتے ہیں کہ رسول اللہﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی تبدیلی کے لئے حکمِ الٰہی کی انتظار کرتے' ان دنوں آپ اہلِ کتاب کو دیکھ کر کچھ ایسے کام کر لیتے جن کا حکم دیا جاتا اور نہ ہی روکا جاتا۔ ابن عباس کہتے ہیں' ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے تو جبریل علیہ السلام نے اشارے سے عرض کی: ''اے محمد! بیت اللہ کی طرف منہ کر لیجئے'' پھر جبریل نے بھی کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ چنانچہ آپ کعبہ کی طرف گھوم گئے اور اسی موقع پر یہ آیت اُتری:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ○ الآیہ۔

یہ سن کر منافقوں نے کہا: محمد اپنی زمین اور قوم کی طرف پھر گئے' مشرکوں نے کہا: محمد کا ارادہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے قبلہ ہی سے ملا لے اور ہمیں وسیلہ بنا لے اور اس نے جان لیا ہے کہ ہمارا دین زیادہ ہدایت دیتا ہے' یہودیوں نے مومنین سے کہا: کیا وجہ ہے کہ تم نے موسیٰ' یعقوب اور دیگر انبیاء کا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور مکہ کی طرف منہ کر رہے ہو؟ تم یہ کام بے فائدہ کرنے چلے ہو۔ یہ سن کر مومنوں نے کہا ہم میں کچھ آدمی فوت ہو چکے ہیں' معلوم نہیں' ہم اور وہ ایک قبلہ والے شمار ہوں گے یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ○ الآیہ۔

ابن زبالہ نے حضرت عثمان بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ سے روایت کی' انہوں نے فرمایا: حضورﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف منہ کئے حکم خداوندی کی انتظار فرماتے' آپ ان دنوں یہودیوں کو دیکھ کر کچھ ایسے کام کرتے جن کا آپ کو نہ حکم ہوتا اور نہ ہی منع کیا گیا ہوتا۔ ایک دن آپ اپنی مسجد میں نمازِ ظہر پڑھ رہے تھے' دو رکعتیں پڑھی تھیں کہ جبریل امین حاضر ہوئے اور اشارہ کیا کہ چہرہ بیت اللہ شریف کی طرف کیجئے اور پھر جبریل نے بھی اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔

حضرت یحییٰ کے مطابق رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضورﷺ نے اپنی مسجد میں مسلمانوں کو ظہر کی دو رکعت نماز پڑھائی کہ اسی دوران حکم ہوا' مسجد حرام کی کیطرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ آپ گھوم گئے۔ رافع کہتے ہیں کہ ہم

بنوعبد الاشہل کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا ہے۔رافع کہتے ہیں کہ ہمارے امام نے ہمیں کعبہ کی طرف گھوم جانے کا حکم دیا تو ہم ادھر گھوم گئے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بتاتے ہیں کہ' ہم قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آیا' کہنے لگا' رسول اللہ ﷺ پر آج رات حکم قرآن اُترا ہے اور انہیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا چہرے ادھر کر لو' اس سے پہلے قبلہ کا رُخ شام کی طرف تھا چنانچہ سب لوگ گھوم گئے اور کعبہ کی طرف متوجہ ہو گئے ایک جگہ الفاظ یہ ہیں کہ لوگ رکوع میں تھے اور نماز صبح کی تھی۔

حضرت عثمان بن محمد بن اخنس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسجد (قبلتین) میں ظہر کی نماز پڑھی' جب دو رکعت پڑھ لیں تو حکم ملا کہ کعبہ کی طرف رُخ کر لیں چنانچہ آپ کعبہ کی طرف گھوم گئے اور میزاب کی طرف رُخ کر لیا۔حضرت عثمان بن محمد کہتے ہیں کہ یہ ظہر کی نماز تھی جو ان دنوں چار رکعت پڑھی جاتی تھی۔

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور بدر سے دو ماہ قبل قبلہ تبدیل ہو گیا' ہمارے پاس ثبوت ہے کہ قبلہ مسجد قبلتین میں بوقت نماز ظہر تبدیل ہوا تھا۔

انہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں تشریف لا کر سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی اور پھر بدر سے دو ماہ پہلے قبلہ تبدیل ہو گیا۔

عبد اللہ مزنی کے دادا بتاتے ہیں کہ نصف رجب بروز پیر' سترہویں ماہ کے آخری دنوں میں قبلہ تبدیل کر دیا گیا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے سولہ ماہ تک حضور ﷺ کے ہمراہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تا آنکہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہو گئی:

وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

''جہاں کہیں بھی ہو' اس کی طرف منہ پھیر لو۔''

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ نماز پڑھ چکے تھے' ایک آدمی وہاں سے چلا اور اس مقام سے گذرا جہاں انصار نماز پڑھ رہے تھے' انہیں یہ بات بتائی تو انہوں نے اپنے چہرے کعبہ کی طرف پھیر لئے۔

تحویلِ قبلہ کی تاریخ

حضرت براء ہی سے ایک روایت سولہ یا سترہ ماہ کی بھی ہے' راوی کو شک پڑ گیا تھا۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ حضورﷺ مسجد بنو سلمہ (مسجد قبلتین) میں تھے کہ قبلہ تبدیل کر دیا گیا' وہاں آپ دو رکعت نماز پڑھا چکے تھے چنانچہ آپ پھر گئے اور میزاب (خانہ کعبہ کا پرنالہ) کی طرف ہو گئے' مرد' عورتوں کی جگہ پر آ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ۔

ابن ابی حاتم کے مطابق تویلہ بنت اسلم کہتی ہیں کہ میں نے ظہر وعصر کی نمازیں بنو حارثہ کی مسجد میں پڑھیں تو ہم نے اپنا رُخ مسجد ایلیاء (بیت المقدس) کی طرف کیا' ہم نے دو ہی سجدے کئے تھے یعنی دو رکعت پڑھی تھیں کہ ایک شخص نے آ کر اطلاع دی' رسول اللہﷺ نے بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر لیا ہے چنانچہ عورتیں' مردوں کی جگہ آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ اور بعد کی دو رکعتیں ہم نے بیت اللہ الحرام کی طرف منہ کر کے پڑھیں۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ گذشتہ حدیث ''وہ انصار کی ایک قوم کے ہاں سے گذرے جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔'' میں جن لوگوں کا ذکر ہے' وہ بنو حارثہ تھے اور ان کی طرف جانے والے عباد بن بشر تھے' اہل قباء کے پاس یہ اطلاع صبح کے وقت پہنچی تھی چنانچہ دونوں حدیثوں میں کوئی مقابلہ نہیں۔

مسجد قبلتین کے بارے میں آ رہا ہے' ابن زبالہ نے نقل کیا کہ قبلہ اس وقت تبدیل ہوا جب بنو سلمہ کے کچھ لوگ مسجد قبلتین میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے' اسی دوران ایک شخص آیا اور انہیں یہ اطلاع دی' وہ گھوم گئے اور اپنے چہرے کعبہ کی طرف کر لئے' یہی وجہ ہے کہ اس مسجد کا نام مسجد قبلتین پڑ گیا۔علامہ مجد کہتے ہیں کہ اس بناء پر یہ نام مسجد قباء کا ہونا زیادہ بہتر ہے۔

بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی مدت

علامہ ابو القاسم قشیری (رسالہ قشیریہ والے) لطائف التفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت قتادہ کے مطابق جب حضورﷺ ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لائے تو اس کے بعد سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' کچھ حضرات سترہ ماہ کہتے ہیں' یہ ابن عباس کی روایت ہے' حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مطابق نو یا دس ماہ پڑھی۔حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے تیرہ ماہ بتایا' اس سے غرض یہ تھی کہ یہودیوں کو دین کی رغبت ہونے کے لئے آپ کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی طرف مائل کیا جا سکے اور پھر آپ نے ان سے قبلہ کے بارے میں موافقت کرنا اس وقت سے مناسب نہیں سمجھا جب انہوں نے یہ کہہ دیا' اگر ہمارا دین سچا نہ ہوتا تو یہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھتے اور نہ ہی ہمارا طریقہ اپناتے۔

اس پر حضرت جبریل علیہ السلام سے آپ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے یہودیوں کے قبلہ سے کسی اور طرف پھیر دے۔جبریل نے عرض کی کہ میں تو ایک غلام سا فرشتہ ہوں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا' آپ یہ سوال اپنے پروردگار سے کیجئے۔

اس کے بعد جبریل تو آسمان کی طرف چڑھ گئے مگر حضورﷺ اُحد کی طرف صحراء میں چلے گئے' یہاں آپ نے دو رکعت ادھر اور کبھی دو رکعت ادھر پڑھنا شروع کیں' آپ اللہ سے اس بارے میں اجازت مانگ رہے تھے' نظر آسمان کی طرف تھی اور پھر آپ اُحد کے پہلو میں جا پہنچے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رجب کے اندر سورج کے زوال کے بعد ظہر سے پہلے یہ آیت اُتار دی:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ۝

اور قبلہ تبدیل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ بدر سے دو ماہ پہلے کا ہے۔ سیرت ابن حبان میں ہے کہ سترہ ماہ اور تین دن کے بعد قبلہ تبدیل ہوا تھا۔ شیخ شرف الدین دمیاطی نے کہا کہ نصف رجب کو ساڑھے پندرہ ماہ کے بعد تبدیل ہوا تھا۔ علامہ نووی نے ''سیر روضہ'' میں بتایا کہ قبلہ کی تبدیلی بروز منگل' نصف شعبان ۲ھ کو ہوئی۔ علامہ محمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بتایا کہ یہ تبدیلی نصف شعبان کو تیسری رکعت میں ہوئی تھی' کچھ نمازِ عصر کا نام لیتے ہیں' علامہ نحاس چند ماہ کہتے ہیں' عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جمادیٰ میں تبدیل ہوا تھا اور یہ سب اقوال سے درست قول ہے۔ ابن جریر نے حضرت معاذ سے لکھا کہ مدینہ میں تشریف آوری کے تیرہ ماہ بعد تبدیل ہوا۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ دس یا نو ماہ بعد تبدیل ہوا۔ انتہٰی۔

ابن سعد کہتے ہیں' کہا جاتا ہے کہ حضورﷺ نے اپنی مسجد میں مسلمانوں کو ظہر کی دو رکعتیں پڑھائیں۔ پھر انہیں حکم ہوا کہ مسجد حرام کی طرف پھر جائیں چنانچہ آپ گھوم گئے اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ گھومے۔ نیز یہ کہا جاتا ہے کہ حضورﷺ بنوسلمہ کی اُمِ بشر بنت براء بن معرور رضی اللہ عنہا کی زیارت کو تشریف لے گئے' انہوں نے آپ کے لئے کھانا پکایا اور اسی دوران ظہر کا وقت ہو گیا' حضورﷺ نے صحابہ کو دو رکعتیں پڑھائیں اور پھر کعبہ کی طرف گھوم جانے کا حکم دیا' میزاب کے سامنے آ گئے چنانچہ مسجد قبلتین اس کا نام پڑا' ابن سعد کے مطابق علامہ واقدی کہتے ہیں کہ یہ روایت ہمارے نزدیک زیادہ وزنی ہے۔

کعبہ کی طرف پہلی نماز

صحیح بخاری میں ہے کہ حضورﷺ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے سب سے پہلی نماز عصر کی پڑھی تھی۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں: تحقیق یہ ہے کہ آپ نے سب سے پہلی نماز بنی فلاں میں ظہر کی پڑھی تھی اور مسجد نبوی میں پہلی نماز عصر کی پڑھی تھی۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ گذشتہ تیرہ اور انیس ماہ والی روایات شاذ ہیں ان روایات کو جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس نے سولہ ماہ کا ذکر کیا ہے' اس نے آپ کی آمد اور تحویلِ قبلہ کے وقت کو ایک ماہ شمار کیا اور زائد دن شمار نہیں کئے' جس نے سترہ ماہ کہا ہے' اس نے سب جمع کر کے کہا ہے اور جسے شک ہوا وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہتا ہے' اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی آمد بلا خلاف ربیع الاوّل میں ہوئی اور صحیح قول کے مطابق قبلہ کی تبدیلی دوسرے سال ماہِ رجب کی نصف میں

ہوئی تھی۔ جمہور یہی کچھ کہتے ہیں۔ رہا ابن حبان کا قول: سترہ ماہ تین دن تو اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آپ کی آمد بارہ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی۔

حضرت ربیع کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہجرت کے ابتدائی دنوں میں بیت المقدس یا کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں صاحبِ اختیار تھے البتہ اللہ نے انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا چنانچہ اس طرف منہ کرنا فرض تھا اگرچہ آپ کو اختیار دے دیا گیا تھا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ قبلہ دو مرتبہ منسوخ ہوا تھا۔

مکہ میں ہجرت سے پہلے کس طرف نماز پڑھی جاتی تھی؟

ابن رشد، ''بیان'' میں لکھتے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مدینہ میں قبلہ تبدیل ہونے تک آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے' اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مدینہ میں آمد سے قبل آپ مکہ میں کس طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے' ایک اور روایت یہ ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کیا کرتے تھے' یہ روایت بھی ہے کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تو کعبہ درمیان میں ہوتا یعنی آپ رکن یمانی کے درمیان کھڑے ہوتے۔

ابن عبد البر نے بھی یہ اختلاف ذکر کیا ہے کہ مکہ میں آپ کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے یا بیت المقدس کی طرف؟ پھر کہا کہ سب سے بہتر وہ قول ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ دو قبلوں کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے' کعبہ کو آپ اپنے اور بیت المقدس کے درمیان لے لیتے۔

حضرت طبری وغیرہ کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ کی طرف ہجرت کر آئے تو یہودی یہاں بہت تھے' وہ بیت المقدس کی طرف منہ کرتے چنانچہ اللہ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا جس پر یہودی خوش ہوئے' آپ اس طرف منہ کر کے سترہ ماہ نماز پڑھتے رہے جبکہ آپ کی خواہش یہ رہی کہ قبلۂ ابراہیم علیہ السلام کی طرف منہ کر نماز پڑھیں چنانچہ آپ دُعا کیا کرتے اور آسمان سے حکم کے منتظر رہتے چنانچہ یہ آیت اُتری۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا وحی کی بناء پر تھا' اس میں نبی کریم ﷺ کے اجتہاد کا دخل نہ تھا' یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ مکہ میں آپ بیت المقدس کی طرف منہ کرتے جبکہ بیت اللہ سامنے ہوتا تھا تو ان دونوں روایتوں کو یوں جمع کیا جائے گا کہ جب آپ نے ہجرت فرمائی تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جاری رکھا گیا۔

طبری کے مطابق ابن جریج کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے پہلے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں پھر مکہ ہی میں تھے کہ بیت المقدس کی طرف پھیر دیئے گئے' تین حج یونہی پڑھے اور پھر ہجرت فرمائی تو وہاں آمد کے بعد سولہ ماہ تک

بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ نے انہیں کعبہ کی طرف متوجہ کر دیا۔

مسجد نبوی کا قبلہ کیسے درست کیا گیا؟

ابن نجار نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی مسجد میں سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' پھر کعبہ کی طرف پھر جانے کا حکم ہوا چنانچہ ایک گروہ' قبلہ درست کرنے کے لئے مسجد کے پہلوؤں پر کھڑا کر دیا گیا کہ اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی' یا رسول اللہ! کعبہ کی طرف دیکھتے ہوئے قبلہ کا نشان لگائیے' پھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے آپ کے اور قبلہ کے درمیان سے ہر پہاڑ کو ہٹا دیا' چنانچہ آپ نے قبلہ کا نشان کعبہ کو دیکھتے ہوئے لگایا' آپ کی نظر کے سامنے کوئی شے حائل نہ تھی اور جب آپ فارغ ہو گئے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے ویسے ہی ہاتھ ہلایا چنانچہ پہاڑ' درخت اور دوسری ہر شے اپنے اپنے مقام پر دوبارہ آ گئی اور قبلہ میزاب (رحمت) کی سیدھ میں ہو گیا۔

ایک انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے اطراف میں قبلہ درست کرنے کے لئے کچھ لوگ کھڑے کئے کہ اسی دوران حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے قبلہ کا نشان لگائیے پھر ہاتھ سے ایک اشارہ کیا تو آپ کے اور قبلہ کے درمیان سے ہر پہاڑ کو ہٹا دیا چنانچہ آپ نے کعبہ کو دیکھتے ہوئے قبلہ کا نشان لگا دیا' درمیان میں کوئی شے حائل نہ تھی۔ جب فارغ ہوئے تو جبریل نے پھر وہی اشارہ کیا چنانچہ پہاڑ' درخت اور دوسری چیزیں پھر آ موجود ہوئیں' آپ کا قبلہ میزاب کی طرف ہو گیا۔۔

حضرت نافع بن جبیر کی روایت میں فرمایا: میں نے اپنی اس مسجد کا نشان اس وقت تک نہیں رکھا جب تک کعبہ میری طرف اُٹھا نہیں لایا گیا چنانچہ میں نے اس کی سیدھ میں نشان لگایا۔

ابن عجلان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مسجد کے قبلہ کا نشان لگایا تو حضرت جبریل علیہ السلام کھڑے کعبہ کو دیکھ رہے تھے اور پھر درمیان سے ہر شے ہٹا دی گئی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے مدینہ میں قبلہ کا نشان دیا۔ حضرت مالک کہتے ہیں' میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام ہی نے مسجد رسول اللہ ﷺ' یعنی مسجدِ مدینہ کا نشانِ قبلہ لگایا تھا۔ انتہٰی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ کا قبلہ شام کی طرف تھا اور آپؐ کی مسجد میں آپ کا جائے نماز' نماز پڑھاتے وقت شام کی طرف ہوتا تھا۔ (اس کی پہچان کرنی ہو تو) آج موجود خلوق والے ستون کو اپنے پیچھے رکھو' پھر شام کی طرف چلو اور جب تم باب آلِ عثمان کی دائیں طرف ہو گے تو وہ آپ کا مقام قبلہ ہو گا۔

علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ قبلہ مسجد نبوی کے شمال میں تھا اور جب قبلہ تبدیل ہو گیا تو پہلے قبلہ کی دیوار رہ گئی جو

اہل صفہ کی جگہ پر تھی۔ انتہی اور مطری کے مطابق اسطوانۂ مخلقہ (جسے خوشبو لگائی جاتی تھی) وہی ہے جسے ستونِ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتے ہیں۔ ابن زبالہ سے آ رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبلہ تبدیل ہوتے پر اس ستون کی طرف دس سے کچھ زائد دن تک فرض نماز پڑھی تھی اس کے بعد آپ اپنے اس مصلّٰی کی طرف آگے بڑھے جو درمیانی صف میں محراب کے بالمقابل تھا۔ یہ انہی کے الفاظ ہیں۔

علامہ ذہبی نے جو "وجاہ المحراب" (محراب کے سامنے) لکھا ہے تو اس کا مطلب محراب عثمانی ہے جو قبلہ کی دیوار میں ہے۔

مطری کہتے ہیں کہ قبلہ والی دیوار (قبلۂ اول والی) نبی کریم ﷺ کے مصلّٰی کے برابر تھی کیونکہ یہ لکھا ملتا ہے کہ مصلّٰی رسول میں کھڑا ہونے والا منبر شریف کے عین درمیان میں اپنے دائیں کندھے کی طرف ہوتا ہے۔ مطری کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا مقام تبدیل نہیں ہوا اور اس پر اتفاق ہے اور یونہی منبر بھی قبلہ کی طرف سے اپنی پہلی جگہ سے نہیں بدلا کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ مسجد میں زیادتی شام کی طرف سے کی گئی تھی۔ مطری نے مزید کہا: یہ صندوق جو رسول اللہ ﷺ کے مصلّٰے کے درمیان تھا' اُسے مقامِ رسول اور ستونوں کے درمیان "سُتْرہ" بنایا گیا تھا۔ انتہی۔

عنقریب کھجور کے اس تنے کے بارے میں اختلاف آ رہا ہے جس کے سہارے آپ خطبہ دیتے تھے کہ آیا وہ مصلّٰے شریف کی دائیں طرف تھا یا بائیں طرف قبر انور کی جانب تھا۔

عنقریب اس سلسلے میں پہلی روایت کے بیان کے موقع پر ابن نجار کا قول آ رہا ہے' انہوں نے کہا: یہ تنا خلوق والے اس ستون کی جگہ پر تھا جو صندوق کے نزدیک محراب نبی کریم ﷺ کی دائیں طرف تھا۔ ابن نجار کی دوسری روایت یہ ہے کہ علماءِ مدینہ کے نزدیک بھی یہی مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ایک تنے سے لگ کر خطبہ دیتے تھے جس کی جگہ خلوق والے ستون کے پاس تھی جو قبرِ انور سے ملا ہوا ہے یعنی قبرِ انور کی طرف خلوق والے ستون (ستونِ عائشہ) کی بائیں طرف کہ نبی کریم ﷺ اس کے پاس نماز پڑھاتے تھے اور یہ صندوق کے پاس تھا۔

ابن نجار کی اپنے اس قول: "جو خلوق والے ستون کی بائیں طرف" کو یہاں لانے کی وجہ یہ بتانا ہے کہ جس ستون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہی ہے یعنی وہ ستون جس کی طرف حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے' وہ وہی ہے جو قبلہ کی طرف سے مصلّٰی شریف میں کھڑے ہونے والے کی دائیں طرف ہے اور معلوم ہو گیا کہ وہاں صندوق کا رکھا جانا زمانہ قدیم سے ہے لیکن یہ صندوق قرآن رکھنے کے لئے تھا' پھر اس ستون کو "مخلّقہ" سے موصوف کرنا تمہیں مشکل میں نہ ڈالے کیونکہ اسے اسطوانۂ مہاجرین کہتے ہیں (اور یہی اسطوانۂ عائشہ کہلاتا ہے) اسے مخلقہ بھی کہا جاتا ہے چنانچہ مخلّقہ کو اس کی صفت بنانا کئی ستونوں کی صفت بنتا ہے' اسی وجہ سے اس کلام میں ان دونوں ستونوں کو مخلّقہ کہا جاتا ہے۔

مرجانی نے کہا کہ رسول اکرم ﷺ کی مسجد میں نفل پڑھنے کی بہترین جگہ آپ کا مصلّٰے ہے جہاں ستونِ مخلّق ہے۔ انتہی۔

ابن قاسم کہتے ہیں' حضورﷺ کی مسجد میں نفلوں کے لئے سب سے پیاری جگہ ستونِ مخلق ہے اور فرض پڑھنا ہوں تو صفِ اول بہترین جگہ ہے۔ابن رشد اس ستون کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ حضورﷺ کا قبلہ تھا یا قبلہ کے قریبی جگہ تھی جسے ابن القاسم نے بیان کیا۔

میں کہتا ہوں' اس سے پتہ چلا کہ یہ ستون وہی ہے جو مصلّے شریف کے قریب ہے' اسی لئے ابن وہب نے مالک کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے رسول اللہﷺ کی مسجد کے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک نماز کے لئے بہترین جگہ کونسی ہے؟ انہوں نے کہا کہ نفلوں کے لئے تو آپ کا مصلّے اور فرضوں کے لئے پہلی صف بہترین ہے۔انتہٰی۔تو انہوں نے یہاں ستونِ مخلق کو مصلّے کہا ہے۔ ابن رشد کہتے ہیں' حضرت مالک نے کہا: یہ ستونِ مخلق نبی کریمﷺ کا قبلہ نہ تھا' آپ کا قبلہ' امام کے قبلہ کے سامنے تھا'

بعد ابن رشد اس کے کہتے ہیں: ابن قاسم سے کتاب الصلوٰۃ میں گذرا کہ نبی کریمﷺ کا مصلّے' ستونِ مخلق تھا جبکہ یہ بات امامِ مالک کے خلاف ہے۔انتہٰی۔

امام مالک اپنے قول ''قبلہ کو آگے کیا گیا'' میں اس محراب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو حضرت عثمان کے اضافے کے وقت قبلہ کی دیوار میں تھا اور یہ جو انہوں نے ذکر کر دیا ہے' قطعی ہوگا اور ابن قاسم کی صرف یہ مراد ہے کہ ستونِ مخلّق نبی کریمﷺ کے قبلہ سے قدرے قریب تھا چنانچہ اسی نام سے مشہور ہے۔اسی لئے ابن نجار نے مالک سے وہ کچھ نقل کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ستون حضورﷺ کے مصلّے کی علامت تھا کیونکہ انہوں نے کہا ہے: مالک بن انس کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے نمایاں شہروں کی طرف قرآنِ کریم بھیجے جن میں سے ایک بڑا قرآن مدینہ میں بھیجا' وہ اس صندوق میں تھا جو اس ستون کی دائیں طرف تھا جو مقامِ نبیﷺ کی علامت تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ جب مسجد کو خوشبو دار کرنے کا حکم دیا گیا تو ابراہیم بن فضل نے اشارہ کیا جس پر انہوں نے ستون توبہ کی خوشبو میں اضافہ کیا اور اس ستون میں بھی جو مصلائے نبی کی علامت تھا' انہوں نے اسے خوشبو لگا دی اور نیچے تک لے گئے اور پھر انہوں نے اوپر کی طرف بھی خوشبو لگائی انتہٰی۔

یہ ایک جماعت کا وہم ہے کہ ابن قاسم کے کلام سے مراد اور مالک کسے کے ہوئے کا مقصد وہ ستون ہے جو آج کل مخلّقہ کے نام سے مشہور ہے اور یہ وہی ستون ہے جو ریاض الجنہ کے درمیان ہے' حالانکہ یہ بات قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ یہ ستون بالاتفاق رسول اکرمﷺ کا مصلّے نہیں۔انہیں وہم اس بات سے ہوا کہ شاید یہ ستون ہی مخلّقہ کہلاتا ہے۔دراصل یہ وہم ابن حجر کو ہوا ہے کیونکہ یزید بن عبید کے ان الفاظ: ''میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کرتا تو وہ اس ستون کے پاس نماز پڑھتے جو مصحف کے پاس تھا'' انہوں نے یہ الفاظ کہہ دئے تھے: ''اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصحف کے لئے ایک خاص جگہ مقرر تھی۔'' امام مسلم سے یہ الفاظ ملتے ہیں: ''آپ صندوق کی پچھلی طرف نماز پڑھتے اور لگتا ہے کہ مصحف کے لئے ایک صندوق رکھا ہوا تھا جس میں یہ رکھا جاتا تھا۔'' پھر بتایا کہ اس ستون کے متعلق

ہمیں ہمارے مشائخ نے ٹھوس طریقے پر بتایا کہ یہی ریاض الجنہ میں موجود ہے اور اسے اسطوانۃ مہاجرین کے نام سے جانا جاتا ہے' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے لئے اس کی نشاندہی کی تھی۔ پھر میں نے ابن نجار کی ''تاریخ المدینہ'' میں دیکھا' ان سے پہلے محمد بن حسن نے اسے ''اخبار مدینہ'' میں لکھا تھا۔ (ابن حجر)۔

محمد بن حسن سے ابن حجر کی مراد ابن زبالہ ہیں جبکہ ان کے اور ابن نجار کے کلام میں کہیں نہیں ملتا کہ صندوق کے قریب والا ستون ہی اسطوانۃ مہاجرین ہے' ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان دونوں کو مخلقہ کہہ لیتے ہیں جس کی بناء پر انہیں وہم ہوا کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں حالانکہ یوں نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

محرابِ مسجد نبوی کب بنایا گیا؟

آگے جلد آ رہا ہے کہ حضور ﷺ اور دورِ خلفاء میں مسجد کا کوئی محراب نہ تھا' سب سے پہلے اسے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے ولید کے حکم سے بنایا تھا۔ علامہ اقشہری نے ''روضہ'' میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مصلّٰے صندوق والی جگہ پر تھا' آج کل اس کی جگہ پر ایک محراب بنا دیا گیا ہے جو اصل مصلّٰے کی جگہ سے اوپر بنایا گیا ہے کیونکہ انہوں نے خود کہا ہے۔ جسے میں نے نقل کر دیا ہے: ''کہا یہ گیا ہے کہ منبر نبوی میں آگے پیچھے کرنے کی تبدیلی نہیں ہو سکی' اضافہ صرف اس کے شمال کی طرف ہوا ہے' کسی اور طرف نہیں ہوا' آج کل اصلی منبر کی حد امام کے مصلّٰے کے برابر ہے' رسول اللہ ﷺ کا مصلّٰے آج کل صندوق کی جگہ اس کے آگے ہے چنانچہ وہ منبر کی حد سے باہر ہے۔ انتہٰی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دائیں بائیں سے صندوق کے بالمقابل تھا۔ مزید کہا: یہ وہ اضافہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ریاض الجنہ میں کیا۔ پھر کہا کیونکہ مصلّٰی شریف بلاشبہ روضہ کہلاتا ہے' مقصد یہ کہ جو اس کی سیدھ میں ہے وہ بھی یونہی ہوگا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ جسے میں نے اس سے پہلے کسی سے لکھا نہیں دیکھا۔ پھر وہ جو انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ منبر کی حد (قبلہ سے) آج کل کے مصلائے امام کے برابر ہے تو اس سے ان کا مقصد یہ بنتا ہے کہ آج کل مصلائے امام کی انتہاء قبلہ کی طرف سے منبر کی انتہاء کے برابر ہے کیونکہ جیسے ہم نے ذکر کیا' انہوں نے نقشہ بنا کر اسے واضح کیا ہے گویا ان کا وہم ہے کہ حضور ﷺ کی جائے نماز (مصلّٰے) محراب میں تھی جو مسجد کی طرف سے صاف نظر آتی ہے کیونکہ انہوں نے اس کی دائیں بائیں جانب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ گنا ہے حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں اور پھر جو انہوں نے ''برابری'' کا گمان کیا ہے' یہ عقل و نقل کے خلاف ہے کیونکہ علامہ اقشہری کے دور کا منبر ہی وہ منبر ہے جو علامہ مطری کے دور میں موجود تھا کیونکہ یہ دونوں ہمعصر تھے جبکہ اس سے پہلی فصل میں مطری سے گذرا کہ منبر اور اس جنگلے کے درمیان جو قبلہ میں تھا' سوا چار ہاتھ کا فاصلہ تھا' اور یہ کہ انہوں نے جو کچھ کہا' صحیح کہا ہے اور یہی منبر نبوی کی جگہ ہے جسے آئندہ ہم واضح کریں گے پھر صندوق مذکور اور اس کے بعد مذکورہ جنگلے تک چوڑائی اڑھائی ہاتھ سے کچھ زیادہ ہی تھی اور جو منبر ہم نے پہلے دیکھا' اس کے اور قبلہ والے جنگلے کے درمیان ساڑھے تین ہاتھ ہی کا فاصلہ تھا اور پھر اس کے باوجود منبر کی حد'

امام کے مصلّے کی حد سے قبلہ کی طرف ایک ہاتھ پیچھے تھی اور جو مطری نے لکھا ہے (درست بھی یہی ہے) اس سے زیادہ پیچھے ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ منبر اور قبلہ والی دیوار میں اتنا ہی فرق ہے۔ پھر ان کا اس سے بھی زیادہ دورہ ہے جو یحییٰ نے محمد بن یحییٰ (امام مالک کے شاگرد) سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا: ہم نے مسجد نبوی سے قبلہ کی موجودہ دیوار تک جس میں محراب موجود ہے سوا بیس ہاتھ کا فاصلہ دیکھا اور یہ وہ زیادتی ہے جو نبی کریم ﷺ کے بعد ہوئی تھی۔ انتہٰی۔

علامہ مراغی کہتے ہیں: میں نے اسے دیکھا تو مصلّائے نبی کریم ﷺ کے سُترہ سے قبلہ کی دیوار تک یونہی تھا' اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصلّے شریف کی جگہ تبدیل نہیں ہوئی اور صندوق پہلی دیوار کے مکان میں رکھا گیا تھا۔ انتہٰی پھر انہوں نے قبلہ والی دیوار سے مصلّے شریف تک اندازہ لگایا جو صندوق کے برابر تھا تو وہ تقریباً پونے بائیس ہاتھ سے قدرے زائد تھا اور جب اس پیائش میں سے تقریباً ڈیڑھ ہاتھ نکال دیا گیا تو باقی سوا بیس ہاتھ رہ گیا جیسے یحییٰ نے ذکر کیا' اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس مذکور صندوق کی یہاں جگہ قدیم سے چلی آتی ہے تو پھر اس کا مصلّی کی جگہ پر ہونا اور کسی کا اسے نہ جاننا کیسے ممکن ہے؟ بلکہ علماء نے اس کے خلاف ذکر کیا ہے اور وہ ایسا کیونکر کرتے اور کیسے لوگوں کو اس کی برکت سے محروم کرتے؟ یہ ناممکن سی بات ہے۔

علامہ نووی نے اپنے ''مناسک'' میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ''احیاءِ علوم الدین میں ہے کہ نمازی منبر کے پائے کی لکڑی کو اپنے داہنے کندھے کے سامنے رکھے اور اس ستون کی طرف متوجہ ہو جس کی ایک طرف صندوق ہے اور مسجد کے قبلہ والا احاطہ اس کے سامنے ہو تو یہ جگہ رسول اللہ ﷺ کے کھڑے ہونے کا مقام ہے۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ گویا اس ستون کے سامنے ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسے اپنی داہنی طرف رکھے جیسے آج کل مصلّے موجود ہے۔ اس ستون کا ذکر ابن زبالہ نے کیا ہے کہ حضرت خارجہ کہتے ہیں: جب تم اس (ستونِ مذکور) سے تھوڑا سا ایک طرف ہو گئے مقامِ رسول اللہ ﷺ میں موجود تنے کو سامنے رکھو گے اور منبر والے رمانہ کو اپنے کان کی کونپل کی طرف رکھو گے تو مقامِ رسول اللہ ﷺ پر کھڑے ہو گے تو گویا مذکورہ رمانہ منبر نبوی پر سیدھا اوپر ہوتا تھا۔

عنقریب آگے آ رہا ہے کہ جب دوسری آتش زدگی کے بعد منبر کی بنیاد کے لئے رخام کی کھدائی کی گئی تو کھودنے والوں نے اصلی منبر کی جگہ پتھر کا حوض دیکھا اور اس کی دائیں بائیں جانب مشرق و مغرب میں پتھر کھودے ہوئے تھے جن میں سکہ لگا تھا' ان کی صورت ایسی تھی کہ منبر نبوی سے واقف کار کے سامنے سکہ جڑے دو ستون اس سے پوشیدہ نہیں جنہیں سکہ سے مضبوط کیا گیا تھا' میں اس کے آخری حصے سے مقام مصلّے میں اُترا اور روضہ سے ملنے والے حصے میں غور کیا تو دیکھا کہ وہ داہنی طرف کے برابر ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ وہی ہے۔

رہا کھجور کا تنا تو اس بارے میں علامہ مطری نے لکھا ہے کہ یہ قبلہ والے محراب میں تھا جو مصلّے شریف کے مقابل تھا اور اب اسے وہاں سے الگ کر دیا گیا ہے۔

علامہ مطری کہتے ہیں: علامہ غزالی نے مصلّے شریف کے ذکر میں یوں کہہ کر جو تحقیق بیان کی ہے:

''جب نمازی مقامِ رسول پر کھڑا ہو' منبر کا رمانہ اس کے دائیں کندھے کے برابر ہو اور قبلہ والا تختہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو تو وہ مصلائے نبی ﷺ پر کھڑا ہو گا۔'' یہ مسجد میں آتشزدگی سے پہلے کا واقعہ تھا اور اس سے بھی پہلے جب مصلائے نبی کے قبلہ میں یہ لوح رکھی گئی تھی یعنی یہ یوں ہو گئی تھی کہ محرابِ قبلہ میں جو کچھ تھا اس کے لئے پردہ بن گئی تھی۔ مزید کہتے ہیں: آتش زدگی کے بعد اسے رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہاں عظیم فتنہ برپا ہوا تھا اور وہاں کے مجاوروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں مرد و زن اکٹھے ہوتے اور کہا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نگینہ ہے' یہ بلند تھا ہاتھ اس تک نہیں پہنچتے تھے' عورت ایک عورت کے سہارے اس کے اوپر چڑھتی یا پھر اس کے کندھوں پر چڑھ کر اوپر ہو جاتی' بسا اوقات یوں ہوتا کہ عورت گر جاتی اور وہ بے پردہ ہو جاتی اور کبھی دونوں ہی گر جاتیں۔''

جب ۷۰۱ھ آیا تو زین الدین احمد بن محمد' ابن حبا مصری مجاور بنے اور اسے دیکھا' اسے عظیم جانا اور تختہ اکھیڑنے کا حکم دیا تو اکھیڑ دیا گیا' اس نے کہا کہ اب وہ حرم کے ایک حصے میں ہے پھر وہ اسی دوران مکہ کی طرف متوجہ ہوا تو بیت الحرام میں داخلے کے لئے فتنہ ہوتے دیکھا' لوگ ایک دوسرے سے چمٹتے تھے اور عورتیں مردوں کے گردنوں پر سوار ہوتیں تا کہ ان کے گمان میں عروۂ وثقیٰ (ملتزم) کو تھام سکیں چنانچہ اس نے وہ مثال اکھاڑنے کا حکم دیا اور وہ بدعت بھی زائل ہو گئی' واللہ الحمد۔

میں کہتا ہوں' ظاہر یہ ہے کہ یہ مہرہ وہی تھا جس کا ذکر ابن جبیر نے ۵۷۸ھ کے سفر میں کیا ہے جب وہ مدینہ آیا تھا' اس نے کہا: میں نے محراب پر ایک میخ سی چیز گڑھی دیکھی' اس کی دیوار میں ایک شکل تھی جس کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس چیز سے بنی ہے' ان کا گمان تھا کہ کسریٰ (شاہِ روم) کا پیالہ ہے پھر میں نے محراب کے سرے پر ایک چوکور پتھر تھا' رنگ زرد اور ہر طرف سے ایک بالشت تھا' وہ ہر طرف سے چمکتا تھا' کہا جاتا تھا کہ یہ کسریٰ کا آئینہ تھا۔ واللہ اعلم۔

پھر میں نے ابن عبد ربہ کی ''عقد'' میں دیکھا (ابن جبیر سے پہلے ہوئے) کہ محرابِ عثمانی میں موٹی تہ کی چاندی تھی' اس کے درمیان مربع شیشہ تھا' اس کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تھا اس کے اوپر چادر تھی جس میں نقش و نگار تھا' اس میں بچے کی کھوپڑی جیسی کوئی چیز تھی پھر نیچے تک ایک خوشبودار چادر لگی تھی جس میں ایک میخ تھی کہ محراب اوّل میں آپ اس کا سہارا لیتے تھے۔ انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں کہ اس مہرہ کے بارے میں میں نے حرم کے نگران اور دربان سے (جو عرصہ سے یہاں مقیم تھا) اور دیگر لوگوں سے پوچھا: تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں' شاید امیر حجاز اسے اس وقت لے گیا ہو جب اس نے حرم کے کچھ حصے توڑے تھے' قبلہ والا محراب وسیع کیا تھا اور دوسری آتش زدگی بعد قبلہ والی دیوار گرا کر

اس کی لمبائی میں اضافہ کیا تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ منبر اور مقامِ نبی ﷺ (جہاں آپ آخر دم تک نماز پڑھاتے رہے) کے درمیان چودہ ہاتھ اور ایک انگشت کا فاصلہ تھا۔

میں کہتا ہوں کہ دوسری آتشزدگی سے پہلے والے منبر اور اس گڑھے کی اعلیٰ جانب جس کی طرف سے مصلّٰی کے اخیر سے اس کی سیڑھی کی طرف اترتے ہیں' میں نے اس کی پیائش کی تو وہ فاصلہ چودہ ہاتھ تھا اور سیڑھی کا عرض ایک انگشت سے زیادہ تھا چنانچہ یہ صحیح نکلا' رہی مشرق کی طرف سے اس کی حد تو اس کے بارے میں آ رہا ہے کہ اسے نئی موجودہ شکل میں بنانا ایک نیا کام ہے۔

ابن زبالہ نے کہا کہ مصلائے نبی ﷺ (پہلی مسجد والا) اور استوانۂ توبہ کے درمیان سترہ ہاتھ کا فاصلہ تھا جبکہ استوانۂ توبہ مشرق میں تھا چنانچہ میں نے اس کے اور مشرق والے گڑھے کی سیڑھی سے پیائش کی تو وہ سولہ ہاتھ کا فاصلہ تھا جس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ مصلّٰے شریف غربی گڑھے کی جانب تھا اور جو مشرق سے اس کے ساتھ ملتا ہے' وہ اس کا حصہ نہیں اور اس کی شہادت گذشتہ کلام مالک اور احیاء سے بھی ملتی ہے کیونکہ انہوں نے اس ستون کا ذکر کیا ہے جس کے پاس صندوق ہے بلکہ اقشہری کی کتاب میں ابن زبالہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصلّٰی شریف اور اسطوانۂ توبہ کے درمیان انیس ہاتھ کا فاصلہ تھا اور میں نے پیائش کی تو مشرقی اسطوانۂ توبہ اور غربی گڑھے کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا۔

علامہ اقشہری نے بھی ابوغسان (امام مالک کے ایک شاگرد) سے نقل کیا ہے کہ حجرہ شریفہ اور اس مقامِ نبی ﷺ کے درمیان جہاں آپ کھڑے ہوتے تھے اڑتیس ہاتھ کا فاصلہ تھا اور میری رائے بھی ابن زبالہ سے ملتی ہے کہ اس کے اور منبر شریف کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا پھر میں نے غربی گڑھے اور حجرہ شریف کی دیوار کے پتھر سے ناپا تو اڑتیس ہاتھ کا فاصلہ تھا جس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ مصلّٰی شریف کی محفوظ حد غربی گڑھے تک تھی' زمانۂ قدیم میں یہ گڑھا موجود نہ تھا اسی لئے مجد نے کہا تھا:

> "ابن نجار نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ مصلّٰے شریف کو آگے پیچھے تبدیل نہیں کیا گیا' اس آخری دور میں اس کی صورت تبدیل کی گئی ہے اور مصلّٰے کو گڑھے یا چھوٹے حوض کی شکل دی گئی ہے اور اسے نمازیوں کے کھڑا ہونے کی جگہ سے ایک ہاتھ نیچا کیا گیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ آج وہ چوکور حوض جیسا ہے جس پر ایک سیڑھی اُتر کر جاتے ہیں' اس کی لمبائی اڑھائی ہاتھ اور ہاتھ کا آٹھواں حصہ ہے جبکہ اس کی چوڑائی اڑھائی ہاتھ اور ہاتھ کا سولہواں حصہ ہے لیکن آتش زدگی کے بعد والی تعمیر کے وقت اس کی لمبائی میں ہاتھ کے تقریباً آٹھویں حصے کے نصف کا اضافہ کیا گیا اور اتنا ہی عرض ہیں۔

بدر بن فرحون وغیرہ کہتے ہیں کہ علماء اس کوتاہی سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں' قاضی سراج کے دنوں میں (اہلِ سنت کے پہلے قاضی) اور ان کے بعد وہ گڑھا ریت سے اونچا کیا جاتا رہا تاکہ کراہت زائل ہو سکے اور یہ سلسلہ

شرف اسیوطی کے دور تک رہا' اس نے اسے مٹانے یا بلند کرنے اور نقش والی لکڑیوں کو زائل کرنے کا ارادہ کیا تو کچھ خدامِ مسجد اس کے خلاف ہو گئے اور اس کے خلاف اشراف سے مدد مانگی چنانچہ وہ رُک گیا اور محراب سے ہٹ گیا' اس ستون کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا رہا جو اسطوانۂ وفود کے مقابل تھا (یعنی ریاض الجنہ کے آگے) پھر فوت ہونے تک یہی کچھ کرتا رہا اور ان فقہاء سے ہو گیا جو حضور ﷺ کے مقام اور قدم والی جگہ کے قرب سے کراہت کو دور کرتے رہے' یہ ایک طعن تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ گڑھا زمین کی اونچائی کی بناء پر حضور ﷺ کے ٹھہرنے کی جگہ سے دور تھا کیونکہ بدر بن فرحون سے آ رہا ہے کہ لوگوں نے باب السلام (باب مروان) کے ساتھ والے منار کی نئے سرے سے تعمیر کے موقع پر بر باب مروان دیکھا تھا' اس وقت انہوں نے قدِ انسانی تک گڑھا کھودنے کے بعد قدیم مسجد میں کنکر بھی بچھائے تھے اور پھر یہ سب کچھ واضح ہو گیا تو میں نے حجرہ شریف کی زمین اور مسجد کی زمین کا اندازہ لگایا تو دونوں کے درمیان اڑھائی ہاتھ سے زیادہ کا فاصلہ تھا کیونکہ اس گڑھے اور مذکور پتھر کے درمیان آدھے ہاتھ کی نسبت تھی۔

میں نے مصلّٰے شریف کو نیچے کرنے کی مسئلہ کی تحقیق اپنی کتاب ''کشف الجلباب و الحجاب عن القدوۃ فی الشباک و الرحاب'' میں کی ہے' میرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے مصلّٰی شریف میں مرمر لگانے اور اسے اس شکل پر بنانے کی ابتداء کا پتہ چل سکے' ابن جبیر نے اپنے سفر نامے میں اسے رَوضۂ صغیرہ کا نام دیا ہے اور کہا ہے: امام اس روضۂ صغیرہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے جس کی ایک جانب صندوق ہے جبکہ اس سے قبل انہوں نے اس کی وضاحت میں کہا ہے: اس کے سامنے قبلہ کی طرف ایک طباق والا عمود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس تنے کے بقیہ حصے پر ہے جو حضور ﷺ کی خاطر رویا تھا اور قبلہ میں اس کے کنارے پر صندوق تھا۔ انتہی انہوں نے یہاں نہ تو اس کے نیچے ہونے کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی مرمر لگانے کا حالانکہ وہ اس مقام کا ذکر کر رہے ہیں جس پر منبر موجود تھا۔ ظاہر یہ ہے کہ مصلّٰے شریف اور اس کے اردگرد کا حصہ اس وقت نیچے کیا گیا ہو گا جب پہلی بار آتش زدگی ہوئی تھی جبکہ دوسری آتشزدگی کے بعد نئی تعمیر کے نگران کی رائے کا تقاضا یہ تھا کہ مسجد کی زمین اتنی نیچی کی جاتی کہ وہ مصلّٰی شریف کے مساوی ہو جاتی چنانچہ زمین سے ہاتھ بھر زمین کھرچ لی گئی چنانچہ زمین کی ایک تہ مٹی کی اور دوسری ریت کی تھی اور وہ اس زمین تک جا پہنچے جو مصلّٰے کے برابر تھی' اس دوران ان کے سامنے وہ پتھر کے ٹکڑے آ گئے جس پر ہاتھ بھر کھدائی کے بعد منبر رکھا گیا تھا اور یوں اس بدعت کا ازالہ ہو گیا۔

مصلّٰے شریف کے قبلہ میں لکڑی کا نہایت بہترین صندوق تھا جس پر محراب تھا جس میں بڑھئی نے نہایت نفیس کام کیا تھا' یہ محراب دروازے کی طرح تھا جس کے اندر سامنے کی طرف بسم اللہ شریف کے بعد آیۃ الکرسی لکھی تھی اور اس مضبوط دروازے کے باہر کی طرف بسم اللہ شریف کے بعد یہ آیت لکھی تھی:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا

اس میں بہترین کاریگری سے کام کیا گیا تھا رنگوں کی خوبصورت آمیزش تھی لاجوردی رنگ استعمال ہوا تھا اور سونے کی ملمع سازی ایسے کی گئی تھی کہ دل کو معروف کر دیتی تھی اور خیالات منتشر کرتی تھی کیونکہ کوئی دل حضور علیہ السلام کے دل سے زیادہ مضبوط' اعلیٰ اور بلند مرتبہ نہیں ہے تاہم آپ نے بھی خمیصہ (نشانات والا سیاہ وسفید کپڑا) کے بارے میں فرمایا تھا: میری یہ چادر ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور میرے پاس اس کی انبجانیہ لے آؤ کیونکہ اس نے ابھی ابھی مجھے نماز سے غافل کر دیا ہے۔''

پھر آگے آ رہا ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مسجد کو سجانے کے بعد حضرت عمرو بن عثمان سے کہا تھا کہ ہماری تعمیر خوبصورت ہے یا آپ کی؟ تو انہوں نے کہا تھا: ہم نے تو اسے مسجد کی طرح بنایا ہے لیکن آپ نے گرجوں کی طرح بنا دیا ہے۔

پھر صاحب تبصرہ نے مالک سے نقل کیا ہے کہ: مدینہ کی مسجد کے قبلہ میں جو آرائش کی گئی' اسے لوگوں نے ناپسند کیا کیونکہ وہ لوگوں کی نماز میں خلل ڈالتی تھی اور میرے خیال میں مسجد سے ہر ایسی شے کو دور کر دینا چاہیے جو لوگوں کو نمازوں سے غافل کر دے خواہ اس چیز پر بہت خرچ ہوا ہو' اللہ تعالیٰ اس مصلّٰی شریف کے لئے ایسا شخص بھیجے جو اس سے اس قسم کی آرائش دور کر دے اور اسے برابر کر دے جیسے رسول اللہ علیہ السلام کے زمانے میں تھا' لکڑی کے اس محراب کو پیچھے سے عظیم تاج جیسے کھمبے سے سہارا دیا گیا تھا حتیٰ کہ وہ اس جنگلے سے جا ملا تھا جو ریاض الجنہ سے قبلہ کی طرف ستونوں کے درمیان تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا پھر اس کے اوپر' دائیں اور بائیں ریاض الجنہ کی پیمائش کے مطابق میخیں گاڑ دیں تاکہ قندیلیں لٹکائی جا سکیں جنہیں بزاقات کا نام دیتے تھے' یہ قندیلیں زیارات کی راتوں میں روشن کی جاتی تھیں اور اس کے اندر کی طرف شاندار ریشم کی پوشاک تھی جو حجرۂ مبارک والی چادر جیسی تھی' پھول دار اور بُنی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ دوسری آتشزدگی کے موقع پر جل گیا تھا جبکہ یہ تالیف (وفاء) پوری ہو چکی تھی چنانچہ نئی تعمیر کے نگران کی رائے یہ تھی کہ اسے مَرمَر کے محراب میں بدل دیا جائے جو صندوق مذکور کی جگہ پر ہو چنانچہ انہوں نے وہاں اس کی بنیاد کے لئے قد آدمی جتنا گڑھا کھودا' اسی دوران انہوں نے وہاں ایک قبر دیکھی جس کی لحد نظر آنے لگی وہ اینٹوں سے بند تھی' انہوں نے اس سے کچھ ہڈیاں نکالیں اسے اسی حال پر چھوڑ دیا' مذکور محراب کی بنیاد رکھ دی' پھر اس محراب میں عجیب قسم کے پتھر لگائے اور ان پر سونے وغیرہ کی پالش کر دی جس کی بناء پر وہ پہلے سے بھی خوبصورت ہو گیا' محراب کو مصلّٰی شریف سے قدرے اونچا کر دیا کیونکہ وہ اس صندوق کی جگہ پر بنایا گیا تھا جو مصلّٰی شریف کے سامنے تھا۔ (واللہ اعلم)۔ ان سب چیزوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

تنبیہات

تنبیہ نمبر ا:

امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے: ”نمازی اور سُترہ کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔“ پھر حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی' انہوں نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ کے مصلّٰی اور دیوار کے درمیان بکری گزرنے کی راہ جتنا راستہ تھا۔“ پھر حضرت سلمہ (بن اکوع) رضی اللہ عنہ سے روایت بتائی' انہوں نے کہا: ”مسجد کی دیوار منبر سے اتنے فاصلے پر تھی کہ جہاں سے بکری کا نکلنا مشکل تھا۔“

امام بخاری کا پہلی حدیث میں یہ قول ہے: ”مصلّائے رسول اللہ ﷺ کے درمیان“ اس سے مراد نماز میں آپ کے کھڑا ہونے کی جگہ ہے اور یونہی ابو داؤد کی روایت میں بھی ہے پھر ان کے ”دیوار کے درمیان“ کہنے کا مطلب ہے' مسجد کی دیوار جو قبلہ کی طرف تھی اور مسلم میں قولِ نووی کا بھی اسی سے پتہ چل جاتا ہے' انہوں نے کہا ہے: مصلّٰے سے ان کا مقصد سجدہ کی جگہ ہے۔

دوسری حدیث اسماعیلی سے ان الفاظ سے بیان کی ہے: حضور ﷺ کے دور میں منبر یوں تھا کہ اس کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان بکری گذرنے کی جگہ تھی۔ علامہ کرمانی نے اس حدیث کی باب سے مناسبت یوں بتائی: بلاشبہ یہ اس حیثیت سے ہے کہ نبی کریم ﷺ منبر کی ایک جانب کھڑے ہوتے' مسجد کا محراب نہ تھا چنانچہ آپ کے اور دیوار کے درمیان تقریباً اتنا فاصلہ ہوتا جتنا منبر اور دیوار کے درمیان تھا تو گویا انہوں نے کہا کہ: مناسب یہ ہے کہ نمازی اور اس کے سُترہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے جتنا آپ کے منبر اور دیوار کے درمیان تھا۔

میں کہتا ہوں: گویا کہ علامہ کرمانی نے اس کی بنیاد عام مسجد کو سامنے رکھ کر بتائی ہے کہ امام کا مصلّٰے منبر کی ایک طرف ہوتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان دونوں کے درمیان مسافت کتنی ہونی چاہئے اور بتایا جا چکا ہے' اس پر اجماع ہے کہ منبر اپنی جگہ سے نہیں بدلا اور پھر یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے منبر کی طرف نماز پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے اور دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ ہو جتنا منبر اور دیوار کے درمیان ہوتا ہے جیسے کہ ڈھکا چھپا نہیں اور ابن حجر کے مطابق اس سے زیادہ واضح ابن رشد کی بات ہے کہ امام بخاری نے سہل بن سعد کی اس حدیث کا اشارہ دیا ہے جو ”باب الصلوٰۃ علی المنبر“ میں آئی ہے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کام کرتے وقت منبر پر تھے تو وہیں نماز پڑھی تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ منبر اور دیوار کے درمیان جو فاصلہ ہے' اس سے نمازی کے قیام کی جگہ کا پتہ لگا لینا چاہئے۔

میں کہتا ہوں' اس سے تو پیچھے ہٹ کر سجدہ کرنا لازم آتا ہے کیونکہ اتنی مقدار میں سجدہ ہو ہی نہیں سکتا اور پھر حضور ﷺ کا سجدے کی وجہ سے اس وقت پیچھے ہٹنا ثابت ہے جب آپ نے نماز پڑھی کیونکہ سجدہ ہو نہیں رہا تھا۔

ابن بطال کہتے ہیں یہ وہ کم از کم فاصلہ ہے جو نمازی اور سترہ کے درمیان ہونا چاہئے یعنی بکری گذرنے کی مقدار راستہ' کچھ کہتے ہیں کہ یہ فاصلہ تین ہاتھ ہونا چاہئے کیونکہ حدیث بلال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ”کعبہ میں نماز

پڑھی تو آپ کے اور دیوار کعبہ کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ تھا جیسے صحیح بخاری میں ہے۔

علامہ داؤدی نے دونوں حدیثوں کو یوں جمع کیا ہے کہ کم سے کم فاصلہ تو بکری گذرنے کی گنجائش جتنا ہونا چاہئے جبکہ اکثر فاصلہ تین ہاتھ ہونا چاہئے۔ کچھ علماء نے دونوں حدیثوں کو یوں جمع کیا ہے کہ پہلا فاصلہ تو قیام اور قعود کے لئے ہے اور دوسرا رکوع و سجود کے لئے (ابن حجر)۔

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کے نزدیک ٹھہرنے کی پہلی جگہ سے ذرا پیچھے ہٹ جانا لازم آتا ہے جیسے ہم بتا چکے اور یہ بات پکی ہے کیونکہ تین ہاتھ سے کم فاصلے میں سجدہ ہوتا ہی نہیں لہٰذا نمازی کے لئے ہمارے نزدیک لازم ہے کہ اس کے اور اس کے سترہ کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ ہو۔

ابن صلاح کہتے ہیں کہ علماء نے تین ہاتھ پیمائش کا اندازہ لگانے کے لئے بکری گذرنے کی جگہ سے اندازہ لگایا' حافظ ابن حجرہ کہتے ہیں کہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

(قلت)(میں کہتا ہوں) ظاہراً تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بخاری نے حضرت سلمہ کی حدیث اس لئے بیان کی ہے تاکہ بکری گذرنے کے راستہ بتانے کا اندازہ لگایا جا سکے کیونکہ اس میں منبر اور دیوار کے درمیانی فاصلے کا بیان ہے کیونکہ ان دونوں کا درمیانی فاصلہ تو ان کے ہاں طے شدہ ہے اور پھر عتبیہ سے بھی بتایا جا چکا ہے کہ دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ آدمی ایک طرف کو ہو کر گذر سکے اور ابن صلاح کے بکری کے گذرنے کے راستے کا بیان کرنا اس مقصد کے لئے ہے کہ وہ فاصلہ بتایا جا سکے جس میں سجدہ ممکن ہو۔

علامہ بغوی کہتے ہیں کہ علماء نے سترہ کے قریب کھڑے ہونے کو مستحب قرار دیا ہے اور وہ یوں کہ اس کے اور سترہ کے درمیان اتنی جگہ ہو کہ اس میں سجدہ ممکن ہو اور یہی فاصلہ صفوں کے درمیان ہونا چاہئے اور اس کا حکم بھی ہے پھر اس کی حکمت بھی بیان کی جا چکی ہے اور وہ یہ ہے: امام ابو داؤد وغیرہ نے بتایا: ''جب کوئی سترہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو اس کے قریب کھڑا ہو کیونکہ اس طرح شیطان اس کی نماز نہیں توڑتا۔'' (واللہ اعلم)۔

وہ لکڑی جو مصلّے شریف میں تھی

تنبیہ نمبر۲:

کتاب میں ہمیں حضرت مصعب بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حدیث ملتی ہے: انہوں نے کہا: ''ہم نے اس لکڑی (سترہ) کی تلاش شروع کی جو مقامِ نبی ﷺ میں ہوتی تھی لیکن ہمیں ایسا کوئی شخص نہ مل سکا جو اس کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ حضرت مصعب کہتے ہیں کہ آخرکار مقصورہ والے محمد بن مسلم بن سائب نے بتایا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ میرے پاس بیٹھے تھے' مجھے بتایا کہ جانتے ہو' یہ لکڑی کس لئے بنائی گئی تھی؟ میں نے خود ان سے نہ پوچھا تھا' چنانچہ میں نے کہا: بخدا مجھے تو معلوم نہیں کہ کس لئے بنائی گئی تھی' انہوں نے کہا: حضور ﷺ اس پر دایاں پہلو رکھتے تھے اور پھر

ہماری طرف متوجہ ہو جاتے اور فرماتے: لائن میں ہو جاؤ اور صفیں درست کر لو۔

حضرت انس بن مالک بتاتے ہیں کہ جب وہ لکڑی چرا لی گئی جو محراب میں ہوا کرتی تھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے تلاش نہ کر پائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قباء میں ایک انصاری کے پاس اس کا پتہ چلا لیا جس نے اسے زمین میں دفن کر دیا تو مٹی اسے کھا گئی تھی' آپ نے اس کے لئے ایک لکڑی لی' اسے دو حصے کیا اور اس میں ڈال کر بند کر دیا اور پھر دیوار میں لگا دیا' یہی وہ لکڑی تھی جسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے قبلہ میں رکھا تھا اور وہی آج تک قبلہ میں موجود ہے۔

ابو داؤد میں محمد بن اسلم ہی کا بیان ہے' کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت انس بن مالک کے پہلو میں نماز پڑھی تو انہوں نے کہا: جانتے ہو کہ یہ لکڑی کس لئے بنائی گئی تھی؟ میں نے کہا: بخدا مجھے تو معلوم نہیں' انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ اس پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کرتے تھے' سیدھے ہو جاؤ اور صفیں برابر کر لو۔

میں کہتا ہوں: عنقریب تنے کے بارے میں گفتگو کے درمیان آ رہا ہے کہ وہ ستون جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے' مصلّٰے شریف کی علامت تھا' وہاں ایک لکڑی تھی جسے سکے سے مضبوط کیا گیا تھا' لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ اس تنے سے ہے جو نبی کریم ﷺ کی جدائی میں رویا تھا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ معاملہ یوں نہیں بلکہ عز بن جماعہ نے اسے دور کر دینے کا حکم دیا تھا چنانچہ ۷۵۵ھ میں ہٹا دی گئی۔

علامہ وجد کے مطابق ایک عالم لکھتے ہیں کہ اسے دور کرنا ان کا وہم ہے اور وہ اس لئے کہ اس لکڑی کا پختہ ہونا' ستون کے درمیان اسے سکہ سے مضبوط لگانا اور ظاہر کرنا بے مقصد نہ تھا (یہ پکی نہیں تھی) ایک واقف حال کا کہنا ہے کہ یہ کام حضرت عمر بن عبد العزیز نے کرایا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ کھجور کے اسی تنے سے بنی تھی۔

میں کہتا ہوں' بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ اس سے نہیں بنی تھی کیونکہ اس تنے میں سے کوئی بھی شے بچ نہیں سکی تھی بلکہ یہ وہ لکڑی تھی جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور آگے ابن نجار سے بیان آ رہا ہے۔

علامہ زینی مراغی کا یہ قول: احتمال یہ ہے کہ یہ آتش زدگی سے پہلے کی بات ہو' اور بعد والی بات قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ آتشزدگی کے بعد بہت سی لکڑیاں بچ رہی تھیں جیسے ہم تحقیق بیان کریں گے۔ رہا مؤرخین کا یہ قول: ''ایک بھی لکڑی بچ نہ سکی تھی'' قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ خود میں نے اس وقت مشاہدہ کیا تھا جب جلا ہوا سامان نکالا جا رہا تھا تو حجرہ شریفہ سے کچھ جلی ہوئی لکڑیاں نکلی تھیں' حجرہ شریفہ کا پرنالہ دیکھا تو غالباً وہ عرعر کا تھا' اس کا کچھ حصہ تو جل گیا تھا مگر بازو بھر حصہ بچ رہا تھا۔ لوگوں نے بہت سی لکڑیاں وہاں سے اٹھائی تھیں اور مسجد کے متولی وغیرہ سے بھی وہاں سے گذارے کے لئے بہت سی لکڑیاں اٹھائی تھیں۔

جو کچھ ہم نے ذکر کیا' اس سلسلے میں ابن نجار کی عبارت بڑی واضح ہے کہ وہ لکڑی اس مذکور ستون میں لگی تھی

کیونکہ انہوں نے لکھا ہے: یہ وہ لکڑی ہے جو اس ستون میں ہے جو قبلہ کی دائیں جانب ہے۔

قدیم سے یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ اسی تنے سے بنی ہے چنانچہ ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ: ریاض الجنۃ کے سامنے (مصلّے میں) قبلہ کی طرف سیدھی اوپر کو لکڑی ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اسی لکڑی کا باقی حصہ ہے، جو حضور ﷺ کی جدائی میں رویا تھا' اسی کا ٹکڑا دکھائی دیتا ہے جسے لوگ چومتے ہیں' اسے ہاتھ لگانا تبرک خیال کرتے ہیں اور اس سے اپنے چہرے ملتے ہیں اور قبلہ کی طرف ایک پہلو میں صندوق ہے۔انتہی۔

اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ صندوق وہاں آپ کے دور میں مسجد کی آتشزدگی سے پہلے رکھا گیا تھا اور اس لکڑی کے بارے میں شہرت کی وجہ آگے آ رہی ہے کہ وہ تنا مذکورہ ستون کے قریب تھا اور ظاہر یہ ہے کہ مذکورہ لکڑی دیوار میں اس کے قریب تھی چنانچہ اس ستون میں رکھی گئی کیونکہ وہ پہلی جگہ کے قریب تھی' حضرت یحیٰی نے بھی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ اس لکڑی کو ہاتھ لگاتے تھے جو قبلہ میں تھی اور پھر دائیں بائیں دیکھتے تھے اور جب صفیں درست ہو جاتیں تو تکبیر کہہ دیتے۔

ابن زبالہ نے عمرو بن مسلم سے روایت کی' انہوں نے کہا کہ جب رسول اکرم ﷺ عمر رسیدہ ہو گئے تو آپ کے لئے وہ لکڑی بنائی گئی جو مقام نماز میں تھی' جب بھی نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اس کا سہارا لیتے۔

حضرت مسلم بن خباب کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ قبلہ کی طرف بڑھے تو انہیں دیوار میں لگی وہ لکڑی دکھائی نہ آئی' اسے تلاش کرنے لگے' آخر انہیں بتایا گیا کہ وہ مسجد بنو عمرو بن عوف میں ہے چنانچہ وہاں سے لے آئے تو حضرت عمر نے پکڑ کر اسے محراب میں رکھ دیا۔

حضور ﷺ جب نماز کے لئے اُٹھتے تو اسے ہاتھ میں پکڑتے اور اس کا سہارا لیتے' پھر اپنی دائیں طرف متوجہ ہو کر فرماتے' اپنی صفیں درست کر لو پھر بائیں طرف توجہ فرماتے تو بھی یونہی فرماتے اور پھر تکبیر کہتے۔یہ لکڑی طرفاء الغابہ سے آئی تھی۔

کیا آپ کا مصلاّ عین قبلہ کی طرف تھا یا اس کی ایک طرف تھا؟

تنبیہ نمبر۳:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مسجد میں میں حضور ﷺ کا دایاں رخسار دیکھتا تو قدرے داہنی طرف ہوتا۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں: حضرت زبیر بن عوام اور رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ دائیں طرف دیکھ کر کہتے کہ "یہ گھر تمہاری ہے" یحیٰی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے کئی قابل اقتداء اساتذہ سے سنا کرتے کہ منبر سیدھا قبلہ کی طرف تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو انہوں نے داہنی طرف دیکھنے کا کہا ہے تو شاید یہ مصلّی شریف کے علاوہ جگہ تھی اور جو کچھ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ محراب نبوی میں کوشش نہ کرے' کیونکہ وہ درست ہی ہے' اس میں کوشش کی ضرورت نہیں' نہ

ہی اسے دائیں بائیں جانے ہاں مسلمانوں کے دوسرے محرابوں میں ایسا کیا کرے، اس محراب کو حضور ﷺ نے مقرر کیا تھا حضرت جبریل آپ کو بیت اللہ دکھا رہے تھے۔

آپ کے محراب کا مقصد ہے آپ کی جائے نماز کیونکہ آپ کے زمانہ میں محراب تو تھا ہی نہیں، ہاں اگر داہنی طرف کو ثابت ہو جاتا ہے تو اس کی کوئی وجہ ہو گی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جو چبوترہ منبر کے مقام پر دکھائی دیا اور اس میں منبر نبوی کے پائے دکھائی دیئے تو وہ داہنی طرف مائل تھا اسی وجہ سے انہیں اسی حال پر باقی رکھنے کی ترغیب دی گئی اور وہ اپنے حال پر ہیں البتہ انہوں نے ان پر منبر رکھا جو دائیں طرف نہ تھا لہٰذا اپنی جگہ ایک طرف ہو گیا۔

علامہ نووی کی ''تحقیق'' میں یہ عبارت ہے: ہر وہ مقام جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی، اس کی جگہ معین ہے لہٰذا اسے دائیں بائیں کرنے کی کوشش نہ کرے۔ انتہی۔

علامہ محب الدین طبری ''شرح التنبیہ'' میں لکھتے ہیں: گر کہا جائے کہ آپ کا محراب عین کعبہ کی طرف ہے کیونکہ اس میں غلطی ممکن نہیں تو تمہارے کہنے پر لازم آتا ہے کہ نماز کعبہ کے علاوہ کسی جانب جھکاؤ کی صورت میں صحیح نہ ہو سکے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں کہاں سے ثابت ہوا کہ وہ کعبہ کی دائیں طرف ہے؟ کہ اس سے جائز ثابت ہو اور خطا نہ ہو، اصل کام تو جہت مقرر کرنا ہے۔ ہاں بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ آپ نے اسے سیدھا کعبہ کی طرف رکھا تھا تو ہم کہیں گے کہ تمہاری مذکورہ دلیل میں دو قول ہیں: یا تو یہ عین کعبہ کی طرف ہے تو پھر ظاہر ہے یا پھر کعبہ کی جہت میں ہے، یہ بات وہاں ہے جہاں مشاہدہ نہیں، یہ محراب کعبہ کے درجے میں اتارا گیا ہے تو اس کا مشاہدہ کعبہ ہی کا مشاہدہ ہے مگر صحابہ کا مسجد کے وسیع کرنے اور بغیر ادھر اُدھر ہوئے ہر جگہ نماز پڑھنے پر اجماع اس بات پر دلیل ہے کہ کعبہ سے دور ہونے کی صورت میں ہر مقام پر یہی حکم ہے خواہ جہت کعبہ کی طرف ہو سکے یا نہ ہو سکے کیونکہ اس حکم میں کھلی چھٹی ہے اور اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ دور سے صرف جہت کا دھیان رکھنا فرض ہوتا ہے۔ اس بارے میں میں نے کسی کو کچھ کہتے نہیں سنا اور جو میں نے ذکر کر دیا ہے ظاہر ہے کہ حکم یہی ہے۔ انتہی لیکن اس پر اعتراض کی گنجائش ہے بلکہ اس شخص کی نماز کہ اس کے اور مصلّے کے درمیان تقریباً کعبہ کی طرف رُخ ہو، انحراف نہ کرے، صحیح ہو گی کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دوری کی صورت میں سمت کعبہ کے لحاظ رکھنے میں گنجائش ہوتی ہے، آپ دیکھتے نہیں کہ جب دائرہ بڑا ہو جاتا ہے تو درمیان سے نکلنے والے خطوط باہر نکل کر پھیل جاتے ہیں چنانچہ اس موقع پر کعبہ کی سمت صرف اندازے پر ہوتی ہے اور کعبہ سے دوری کی صورت میں اسی اندازے پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے ہاں اس سے پتہ چلتا ہے کہ دائیں بائیں کا لحاظ رکھنا جائز ہے اور یہ اس شخص کے لئے جائز ہے جس کے اور مصلّے شریف کے درمیان کعبہ کی سمت کا فاصلہ زیادہ ہو، البتہ حضور ﷺ کے دور میں صحابہ سے اگر اس کا نہ ہونا منقول ہو حالانکہ آپ نے صحابہ کرام کو اس بات پر ثابت قدم فرما دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

بحمدہ تعالیٰ 25-6-2007 بروز پیر بوقت 11 بجے دن پہلا حصہ مکمل ہوا

وفاء الوفا

باخبار دار المصطفیٰ ﷺ

تالیف

الشیخ العلامۃ نور الدین علی بن احمد السمہودی

المتوفی ۹۱۱ھ

مترجم:

شاہ محمد چشتی

نظر ثانی:

محمد محسن

حصہ دوم

ادارہ پیغام القرآن

۴۰۔ اردو بازار ٥ لاہور ☎ 042-7323241
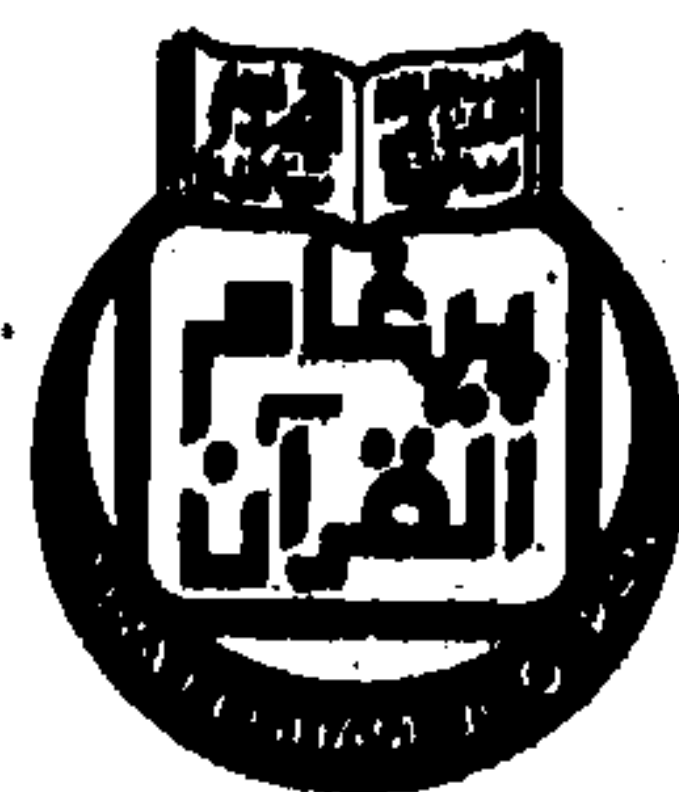
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اس اللہ کی حمد و ثناء ہمیشہ ہوتی رہتی ہے جس نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو پاکیزہ ترین لوگوں میں نمایاں ہستی بنا رکھا ہے' کائنات میں سب سے اشرف و اعلیٰ کمل پر درود و سلام ہمیشہ سے نازل ہوتے چلے آ رہے ہیں اور جاری رہیں گے نیز آپ کے ان آل و اصحاب پر جنہوں نے اپنے مال و جان اور ماں باپ تک آپ پر قربان کر دیئے پھر ان لوگوں پر بھی جو آپ اور ان سب کی اتباع کرنے والے ہیں ان سب کی اتباع ان کی طرف سے بہترین طریقہ پر تا قیامت جاری رہے گی۔

فصل نمبر ٤

کھجور کے تنے کا رونا

اس فصل میں کھجور کے اس تنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ سہارا لے کر حضور ﷺ خطبہ دیا کرتے' آپ کے منبر بنوانے کا ذکر ہے' منبر کے بارے میں گفتگو ہو گی' اس کے جل جانے کے بعد اس کا بدل کیا چیز بنائی گئی اور اس پر کپڑے ڈالنے کا ذکر ہو گا۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ حضور ﷺ ایک تنے کے سہارے خطبہ ارشاد فرماتے اور جب منبر تیار کر دیا گیا تو آپ اس پر تشریف لے گئے جس پر وہ تنا رونے لگا' آپ اس کے پاس تشریف لائے اور اس پر ہاتھ مبارک پھیرا۔ (بخاری شریف)۔

اِسی میں ہے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن ایک درخت یا (فرمایا) کھجور کے درخت کی طرف اُٹھتے' ایک دن ایک انصاری عورت نے عرض کی (یا کوئی آدمی تھا) یا رسول اللہ! ہم آپ کے لئے ایک منبر نہ بنوا دیں؟ آپ نے فرمایا: تمہاری مرضی' چنانچہ انہوں نے منبر بنوا دیا' جمعہ آیا تو آپ اس پر تشریف لے چلے' کھجور کا درخت بچوں کی طرح رونے لگا' آپ منبر سے نیچے تشریف لائے' اسے گلے لگا لیا' وہ یوں رو رہا تھا جیسے بچہ رو رہا ہوتا ہے (ہچکیاں لینے لگا)۔ حضرت جابر بتاتے ہیں' وہ اس ذکر کی وجہ سے روتا تھا جو اس کے قریب ہوا کرتا تھا۔

اسی میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ مسجد کی چھت کھجور کے تنوں پر ڈالی گئی تھی' حضور ﷺ خطبہ دیتے وقت ان میں سے ایک کے پاس تشریف لے جاتے اور جب آپ کے لئے منبر بنا دیا گیا تو آپ اس پر تشریف لے گئے چنانچہ اس تنے سے ہم نے ایسی آواز سنی جیسے عشار (دس ماہ کی بچہ جننے والی اونٹنی) رویا کرتی ہے۔ الحدیث۔

امام نسائی کے مطابق حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ وہ ستون اس طرح بے چین ہوا جیسے بچہ چھن

جانے والی اونٹنی بے چینی میں رویا کرتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' وہ لکڑی عقل و ہوش اُڑ جانے والی کی طرح روئی اور دارمی میں ہے کہ وہ تنا رونے والے بیل کی سی آواز نکالنے لگا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ آپ جب اس سے آگے تشریف لے گئے تو وہ پھٹ پڑا۔ اسی حدیث میں ہے کہ حضرت ابی نے وہ تنا اس وقت پکڑ لیا تھا جب مسجد گرائی گئی' وہ آپ کے پاس اس وقت تک رہا جب تک گل کر چورہ نہیں ہو گیا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے' اس کے بارے کہا گیا کہ گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا جائے۔ عنقریب اس کے بارے میں کئی احادیث آ رہی ہیں' ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے کیونکہ احتمال یہ ہے کہ یہ مسجد گرانے کے بعد اس وقت دکھائی دیا ہو جب صفائی کی جا رہی ہو اور تب حضرت ابی بن کعب نے اسے لے لیا ہو۔

ابو الیمن بن عساکر اپنی ''تحفہ'' میں لکھتے ہیں: ایک روایت میں ہے کہ جب آپ منبر پر جلوہ افروز ہو ہو گئے تو وہ لکڑی یوں روئی جیسے بچے پر اونٹنی روتی ہے' اس پر آپ منبر سے اُتر آئے اور اس پر اپنا ہاتھ مبارک رکھ دیا۔ اگلا دن آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ لکڑی وہاں نہیں تھی' ہم نے کہا: یہ کیا ہوا؟ تو راوی نے بتایا: حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما آئے تو انہوں نے اسے یہاں سے اور جگہ تبدیل کر دیا۔ انتہی۔

حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ خطبہ دیتے تو دیر تک کھڑے رہتے' اتنی دیر کھڑا رہنے میں دشواری ہوا کرتی چنانچہ کھجور کا ایک تنا پیش کیا گیا' گڑھا کھود کر آپ کے پہلو میں گاڑ دیا گیا تاکہ آپ اس کے سہارے کھڑا ہو سکیں پھر جب بھی خطبہ دینا ہوتا اور دیر تک کھڑے کھڑے آپ تھک جاتے تو اس کا سہارا لیتے۔ کسی باہر سے آنے والے نے دیکھ لیا کہ آپ اس کا سہارا لے رہے ہیں تو اس نے اپنے قریب بیٹھے شخص سے کہا: اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ محمد ﷺ کسی آرام دہ چیز لانے پر مجھ سے خوش ہوں گے تو میں آپ کے بیٹھنے کے لئے کوئی شے بنا کر لے آؤں پھر جتنی دیر چاہیں اس پر بیٹھا کریں یا کھڑے ہوا کریں۔ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی تو آپ نے فرمایا: اسے میرے پاس لاؤ! اسے حاضر خدمت کیا گیا تو آپ نے اسے تین یا چار سیڑھیوں والی چیز بنا کر لانے کا حکم فرمایا' اب وہ چیز مسجد میں آ چکی تھی۔ آپ نے اس پر سکون محسوس فرمایا اور جب آپ تنے سے الگ ہوئے اور اس بنی چیز کی طرف جانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اونٹنی کی طرح رونے لگا۔

حضرت ابن بریدہ نے اپنے والد سے سن کر گمان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے جب تنے کو روتے سنا تو اس کے پاس واپس تشریف لائے' اپنا دستِ اقدس اس پر رکھا اور فرمایا: دو چیزوں میں سے جو چاہو' میں ویسے ہی کر دیتا ہوں' چاہو تو تجھے اسی جگہ لگا دیتا ہوں جہاں تم پہلے تھے پھر یونہی رہو گے اور اگر چاہو تو تمہیں جنت میں لگا دیتا ہوں' تمہیں وہاں کی نہروں اور چشموں کا پانی ملے گا' تم خوبصورت ہو جاؤ گے اور پھل دینے لگو گے' تمام اولیاء تمہارا پھل کھائیں گے اور پھر تو ہمیشہ وہاں رہے گا' جو چاہو میں کرتا ہوں۔ ابن بریدہ کا خیال ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا' وہ اس

سے فرما رہے تھے' ہاں میں نے یوں کر دیا (دو مرتبہ) اس بارے میں حضور ﷺ سے پوچھا گیا تو فرمایا: اس نے چاہا ہے کہ میں اسے جنت میں گاڑ دوں۔

قاضی عیاض کے اس بارے میں یہ الفاظ ملتے ہیں: اگر تم چاہو تو تجھے اسی باغ میں لگا دوں جہاں تم تھے پھر تمہاری جڑیں پھوٹ آئیں گی اور تم پوری طرح کھجور کا درخت بن جاؤ گے' نئے سرے سے ٹہنیاں اور پھل لگ جائیں گے اور اگر چاہو تو تمہیں جنت میں لگا دیتا ہوں' اولیاء اللہ تمہارا پھل کھایا کریں گے۔

اس کے بعد آپ نے اس کی طرف کان دھرا کہ سنیں وہ کیا کہتا ہے تو اس نے عرض کی' آپ مجھے جنت ہی میں لگا دیں' اولیاء اللہ میرا پھل کھایا کریں میں ایسے مکان میں ہونگا جہاں گل نہ سکوں گا۔ ایک قریبی آدمی نے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں نے یوں کر دیا اور پھر بتایا کہ اس نے دارِ فناء کے مقابلے میں دارِ بقاء کو پسند کیا ہے۔

حضرت حسن یہ حدیث بیان کرتے تو رونے لگتے اور فرماتے: اے اللہ کے بندو! ایک لکڑی تو حضور ﷺ کے سامنے عشق میں روتی ہے کیونکہ وہ آپ کا مقام جانتی ہے' ایسا شوقِ ملاقات تو تمہیں ہونا چاہئے تھا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم کو اس لکڑی کے رونے پر تعجب نہیں ہوا' اس پر لوگ متوجہ ہوئے اور اس کے رونے کی آواز سنی' پھر خوب روئے۔

ابن عبد البر کے الفاظ یہ ہیں: جب آپ اس کے قریب سے آگے گذر گئے تو وہ رونے لگا اور پھٹ پڑا' حضور ﷺ واپس اس کے پاس تشریف لائے' اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ پرسکون ہو گیا' پھر منبر کی طرف تشریف لے گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ جب بھی آپ نماز پڑھتے' اسی کی طرف رُخ ہوتا اور جب مسجد گرائی گئی تو وہ تنا حضرت ابی بن کعب نے لے لیا' وہ ان کے پاس اس وقت تک رہا جب تک مٹی نے اسے کھا نہیں لیا اور وہ چور چور نہیں ہو گیا۔ یہ روایت پہلے والی تاویل سے بے نیاز ہے کیونکہ بظاہر وہ دفن نہیں کیا گیا اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ معاملہ دفن کرنے کے بعد ہوا ہو۔ آپ اس کی طرف چلے اور قریب ہی نماز پڑھی کیونکہ وہ آپ کی نماز کی جگہ کے قریب ہی تھا جیسے ہم تحقیق کریں گے۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ خطبہ دیتے وقت کھجور کے تنے کا سہارا لیتے' اسی دوران ایک رومی شخص آیا اور عرض کی' میں آپ کے لئے منبر بنا دیتا ہوں' آپ اس پر خطبہ دیا کریں چنانچہ اس نے یہ منبر بنا دیا جو تمہارے سامنے ہے۔ جب آپ اس پر کھڑے ہوئے اور خطبہ شروع فرمایا تو تنا ایسے رونے لگا جیسے اونٹنی اپنے بچے کے لئے روتی ہے' آپ منبر سے نیچے اُترے اور اسے گلے لگا لیا' وہ پرسکون ہو گیا' پھر آپ نے اسے دفن کرنے کا حکم دیا چنانچہ اس کے لئے گڑھا کھودا گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں' رسول اللہ ﷺ خطبہ دیتے تو ایک تنے سے سہارا لیتے' اسی دوران ایک رومی کا وہاں سے گذر ہوا تو وہ کہنے لگا: اگر محمد مجھے بلا کر حکم فرمائیں تو میں آپ کے لئے ایسی چیز بنا دیتا ہوں اس سے بہتر رہے گی' صحابہ نے آپ نے عرض کی تو آپ نے پیغام بھیج کر اسے منگوایا چنانچہ اس نے منبر تیار کر دیا۔ راوی کے

مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ اس کے بعد ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: فرمایا تھا: ہاں چنانچہ وہ تنا دھنس گیا اور آپ چلے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تنے سے لگ کر خطبہ دیتے اور جب منبر بنوا لیا گیا اور آپ اس کی طرف مڑے تو وہ تنا رونے لگا' آپ اس کی طرف تشریف لائے' گلے لگایا تو وہ چپ ہو گیا' آپ نے اس دوران فرمایا: اگر میں یوں نہ کرتا تو یہ قیامت تک روتا رہتا۔

علامہ اسفرائنی نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے پاس بلایا تھا' وہ زمین چیرتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ سے لپٹا اور پھر اپنی جگہ پر چلا گیا۔

منبر کس نے بنایا؟

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضور ﷺ کو دیکھتے تو آپ کو دونوں رانوں میں تکلیف محسوس ہوتی جسے زجر کہتے تھے۔ حضرت تمیم نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا میں آپ کے لئے منبر نہ بنا دوں جس پر آپ کھڑے ہو جایا کریں کیونکہ یہ بیٹھتے اُٹھتے وقت آپ کو آرام دے گا؟ فرمایا: یہ منبر کیسے بنتا ہے؟ اس نے عرض کی یا رسول اللہ! میں آپ کو بنا دوں گا۔ وہ جنگل کی طرف گئے اور اَثل کی لکڑی کاٹی اور اس سے (منبر کے) بیٹھنے کے علاوہ دو زینے بنائے چنانچہ آپ اس لکڑی سے الگ ہو گئے جس سے خطبے کے دوران سہارا لیتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ اسے منبر کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ مطلب بن حطب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تنے کے بارے میں حکم دیا چنانچہ منبر کے نیچے گڑھا کھودا گیا اور اسے وہیں دفن کر دیا گیا۔ مطلب کہتے ہیں کہ منبر بنانے والا نصیبہ مخزومی کا غلام تھا اور منبر اُثلہ نامی درخت سے بنایا گیا تھا جو مسجد کے قریب تھا۔

حضرت سہل بن سعد کے پاس کچھ لوگ آئے' وہ اس شک میں مبتلا تھے کہ یہ کس لکڑی سی بنایا گیا تھا ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا: بخدا میں جانتا ہوں کہ یہ کس لکڑی سے بنا تھا' میں نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ رکھا گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ پہلے دن آپ اس پر کب بیٹھے۔ حضور ﷺ نے فلاں انصاری عورت کی طرف پیغام بھیجا (سہل نے اس کا نام بھی لیا) کہ اپنے بڑھئی غلام کو حکم دو کہ میرے لئے کچھ لکڑیاں تیار کر دے جن پر خطبہ دیتے وقت میں بیٹھا کروں' اس نے بڑھئی سے کہا تو اس نے طرفاء الغابہ سے لکڑی لا کر بنا دیا اور اس کے پاس لے آیا' اس نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا' آپ نے اسے حکم دیا تو وہ یہاں لا کر رکھ دیا گیا پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اس پر نماز پڑھی اور اسی پر تکبیر کہی تھی' رکوع اسی پر کیا پھر پچھلے پاؤں واپس ہوئے اور منبر کی بنیاد میں سجدہ کیا۔

یحییٰ کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اُثل سے بنایا گیا اور میں ان میں شامل تھا جس نے اس کی یہ سیڑھی اُٹھائی تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے (کتاب الھبہ) وہ منبر لے کر آئے تو نبی کریم ﷺ نے اُٹھا کر اسے اس مقام پر رکھا

جہاں تم دیکھ رہے ہو۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ایک راوی نے ان کے قول "فلاں انصاری عورت" میں غلط فہمی دکھائی اور علاثہ کا نام لیا لیکن یہ غلط ہے' اس عورت کا نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔

حضرت مالک کہتے ہیں کہ وہ بڑھئی حضرت سعد بن عبادہ کا غلام تھا تو احتمال یہ ہے کہ اصل میں اس کی بیوی کا غلام ہی ہو اور سعد کی طرف نسبت مجازی ہو' ان کی بیوی کا نام فکیہہ بنت عبید بن دلیم تھا اور وہ ان کی چچا زاد تھیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ عورت یہی ہو لیکن ابن راھویہ نے اسے بنو بیاضہ کا غلام قرار دیا ہے' کرمانی کے نزدیک عورت کا نام عائشہ تھا' میرا خیال ہے کہ راوی کی جعل سازی ہے پھر اوسط میں حضرت جابر کی حدیث میں نے دیکھی کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ایک ستون کے ساتھ نماز پڑھتے اور اسی کے سہارے خطبہ دیتے' عائشہ کو حکم ملا تو اس نے آپ کا یہ منبر بنایا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خطبہ دیتے تو ایک تنے کا سہارا لیتے' پھر فرمایا: میں اس سے تکلیف محسوس کرتا ہوں' اس پر تمیم داری نے عرض کی' کیا میں آپ کے لئے منبر نہ بنا دوں جیسے شام میں بنتے ہیں؟ حضور ﷺ نے اس بارے میں مسلمانوں سے مشورہ لیا تو انہوں نے بنوانے کا مشورہ دیا' حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: میرے پاس ایک غلام ہے جو کلاب نام والا ہے' وہ لوگوں کے ایسے کام کرتا ہے' فرمایا: اسے کہہ دو کہ بنا دے۔ الحدیث

تنے کا مقام

ابن ابی الزناد وغیرہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن مسجد میں ایک تنے کے سہارے خطبہ دیتے تھے' اس کی جگہ اس اسطوانہ مخلقہ کے پاس تھی جو قبر انور کے قریب تھا جو اس اسطوانہ مخلقہ کے بائیں طرف تھی جس کے پاس نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے اور جو صندوق ہی تھا' نبی کریم ﷺ نے فرمایا' کھڑا ہونا میرے لئے دشوار ہو گیا ہے پھر پاؤں میں تکلیف کا ذکر کیا۔ کہتے ہیں کہ اس پر تمیم داری نے عرض کی (وہ اہل فلسطین کے لخم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے) یا رسول اللہ! میں آپ کے لئے ویسا منبر بنا لاتا ہوں جیسے میں نے شام میں بنتے دیکھے ہیں۔ جب حضور ﷺ نے مشورہ کے لئے رائے دینے والے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تو حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: میرے پاس ایک غلام ہے جس کا نام کلاب ہے' وہ لکڑی کا کام کرتا ہے' حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسے بنانے کا کہہ دو۔

انہوں نے غلام کو اثلہ درخت کی طرف بھیجا' اس نے اسے کاٹا اور دو سیڑھیاں بنا دیں اور ایک جگہ بیٹھنے کے لئے بنائی پھر وہ یہ منبر لے کر آیا اور وہاں رکھ دیا جہاں آج کل موجود ہے۔ حضور ﷺ خوش ہوئے اور جمعہ کے دن منبر تک پہنچنے کے لئے اس سے آگے گذرے تو تین مرتبہ وہ تنا رویا' لگتا تھا بیل رو رہا ہے' لوگ ڈر گئے' کئی بھاگ گئے' حضور ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے' اپنا ہاتھ لگایا تو وہ چپ ہو گیا اور اس کے بعد وہ رویا نہیں' رسول اللہ ﷺ دوبارہ منبر

کی طرف تشریف لے گئے اور اس پر کھڑے ہو گئے چنانچہ حضورﷺ ' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں یونہی ہوتا رہا اور جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد گرانے کا حکم دیا تو تنے کے بارے اختلاف ہوا' ایک نے کہا کہ اسے ابی بن کعب نے لیا ہے' وہ انہی کے پاس رہا حتیٰ کہ مٹی اسے کھا گئی۔ ایک اور نے کہا کہ وہ اپنی ہی جگہ پر دفن کر دیا گیا۔

تنا رونے کی حدیث اور اس کی شہرت

حضرت عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ تنا رونے کی حدیث مشہور ہے اور ہر طرف بکھر چکی ہے' یہ خبر متواتر ہے اور اسے دس سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہے۔

بیہقی فرماتے ہیں کہ تنے کے رونے کا قصہ اتنا ظاہر ہے کہ اسے سلف سے سن کر پچھلے لوگ بیان کر رہے ہیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ جمادات میں بھی اللہ تعالیٰ ایسی سوجھ بوجھ پیدا فرما دیتا ہے جیسے انسان میں۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت محمدﷺ کو عطا فرمایا ہے' وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا' عمرو بن سواد کہتے ہیں' میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو مردہ زندہ کرنے کی شان دی تھی' اس پر انہوں نے کہا: حضرت محمدﷺ کو یہ کمال عطا فرمایا کہ تنا رونے لگا' لوگوں نے اس کی آواز سنی' یہ اس سے بھی بڑا کمال ہے۔

وہ مقام جہاں تنا دفن کیا گیا

ابن زبالہ نے اس کی لکڑی کے دفن کے بارے میں اختلاف ذکر کیا ہے چنانچہ عثمان بن محمد کہتے ہیں کہ اسے منبر کے بالکل قریب اس کی بائیں طرف دفن کیا گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ منبر کی مشرقی جانب اس کے پہلو میں دفن کیا گیا' ایک نے کہا کہ منبر کے نیچے دفن کیا گیا اور پہلے روایت گذر چکی ہے کہ جہاں تھا' وہیں دفن کیا گیا اور کلامِ یحییٰ والی روایت کا حاصل یہ ہے کہ مشرق میں مصلّے کی بائیں طرف دفن کیا گیا۔

عبد العزیز بن محمد کہتے ہیں کہ خوشبودار اسطوانہ اس کے دو ثلث تھا یا اتنا ہی' محراب اس تنے کی جگہ تھا جس کے سہارے آپ خطبہ دیتے' اس کے اور قبلہ کے درمیان ایک ستون تھا اور پھر اس کے اور منبر کے درمیان بھی ایک ستون تھا۔

تنے کی وجہ سے لوگوں نے بدعت گھڑ لی

میں کہتا ہوں کہ یہ اسطوانہ وہی ہے جس کے بارے میں آتا ہے کہ مصلّے شریف کی علامت تھا' یہ اس کی دائیں طرف تھا اسی لئے عقبہ نے وہ روایت کی ہے جسے ہم نے پہلے بیان کیا یعنی حضورﷺ کے مقام میں نماز کے اندر قیام کرنا' ذرا اس سے ہٹ کر ہونا چاہئے' یہ روایت مطری کے لئے ان کے اس قول کی سند ہے کہ: یہ تنا مصلائے رسولﷺ

کی دائیں طرف مسجد کی قبلہ والی دیوار کے ساتھ ملا ہوا' بائیں طرف والی شمع کی کرسی والی جگہ پر تھا جو نماز پڑھانے والے امام کی دائیں طرف نبی کریم ﷺ کے قیام کی جگہ پر واقع تھا اور اس کرسی سے پہلے والا قبلہ کی جانب کا ستون تنا کی جگہ سے آگے تھا' لہٰذا ان کے اس قول کے ہوتے ہوئے اس شخص کے قول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جس نے اسے تنے کی جگہ پر بتایا ہے۔عقبہ نے کہا: اس میں ایک ظاہر لکڑی ہے جو سکّے سے مضبوط ہے اور اس جگہ کی طرف سیدھی ہے جو اسطوانہ کے پتھروں میں سے ایک پتھر میں کھلتی ہے اور جس پر سفیدی کی گئی ہے اور یہ لکڑی ظاہر ہے' عام لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ لکڑی ہے جو نبی کریم ﷺ کے لئے روئی تھی' ایسا ہے نہیں بلکہ یہ ان بدعتوں میں سے ہے جن کا ازالہ ضروری ہوتا ہے تاکہ لوگ آزمائش میں نہ پڑ سکیں جیسے وہ جزعہ (چھری کا دستہ) اُتار دیا گیا جو قبلہ والے محراب میں تھا۔

علامہ مجد لکھتے ہیں کہ اس لکڑی کے پاس لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جو اس کی زیارت کرتے اور ہاتھ لگایا کرتے اور عام لوگ یہی خیال کرتے کہ یہی وہ تنا ہے' اس پر بعض فقہاء نے خیال کیا کہ یہ ایک انوکھی چیز ہے جس کو دور کر دینا ضروری ہے اور کتابوں میں اس کے خلاف لکھا ہے' آخرکار ہمارے شیخ عز بن جماعہ کو پتہ چل گیا تو اسے دور کرنے کا حکم دیا۔مجد کہتے ہیں کہ اس لکڑی کی جگہ اس ستون میں زمین سے دو ہاتھ بلند تھی اور اس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں' ظاہر یہ ہے کہ یہ لکڑی اس کی تھی جس پر نبی کریم ﷺ ہاتھ رکھا کرتے اور فرمایا کرتے تھے: اپنی صفیں درست کر لو۔واللہ اعلم۔

منبر بنانے والے کے بارے میں دوبارہ گفتگو

ابن زبالہ نے منبر بنانے والے شخص کے بارے میں اختلاف کا ذکر کیا ہے چنانچہ کہا گیا کہ وہ نصیبہ مخزومی کا غلام تھا' کچھ کہتے ہیں' عباس کا غلام' کسی نے کہا کہ سعید بن عاص کا غلام تھا اور اسے باقول کہا جاتا تھا اور کسی نے کہا کہ قبیلۂ بنو ساعدہ کی ایک انصاری عورت کا غلام تھا یا کہا گیا کہ انصار کے ایک آدمی کی عورت کا غلام تھا جس کا نام "مینا" تھا۔

ابن زبالہ کا قول "اسے مینا کہا جاتا تھا" احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد غلام اور عورت کا شوہر ہو' لیکن اسماعیل بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ جس نے منبر بنایا وہ انصاری عورت کا غلام تھا جس کا نام مینا تھا۔ابی بن اویس کہتے ہیں: ایک انصاری عورت کے غلام نے منبر بنایا تھا جس کا نام مینا تھا' وہ عورت بنو سلمہ یا بنو ساعدہ سے تعلق رکھتی تھی یا ان میں سے ایک عورت کے غلام نے بنایا تھا جس کا نام مینا تھا اور اس میں بھی پہلے کی طرح وہی احتمال موجود ہے۔کسی نے کہا کہ اسے تمیم داری نے بنایا۔یہ ابن زبالہ کی تحریر کا حاصل ہے۔

یحیٰ سے ایک روایت ہے کہ منبر بنانے والا صباح تھا جو عباس کا غلام تھا حالانکہ پہلے اس کا نام کلاب گذر چکا ہے' علامہ مراغی نے اپنے ایک شیخ سے لکھا ہے کہ اس کا نام باقوم تھا جس نے قریش کے لئے کعبہ بنایا تھا۔استیعاب میں

باقوم رومی نے بتایا: میں نے طرفاء سے لکڑی لا کر حضور ﷺ کے لئے منبر بنایا جس کے تین درجے تھے' ایک بیٹھنے کی جگہ اور دو سیڑھیاں تھیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! لوگ زیادہ ہو گئے ہیں تو کاش آپ کوئی ایسی شے بنا لیتے جس پر خطبہ دیتے وقت کھڑے ہو جایا کرتے' آپ نے فرمایا: جو چاہو کرو۔ حضرت سہل کہتے ہیں کہ مدینے میں صرف ایک بڑھئی تھا چنانچہ میں اور وہ بڑھئی غابہ کی طرف گئے تو اثلہ درخت سے ہم نے اس منبر کے لئے لکڑی کاٹی پھر سہل نے ان لکڑیوں میں سے ایک لکڑی اُٹھائی' علامہ مجد اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی سند صحیح ہے۔ قاسم بن اصبغ کہتے ہیں کہ مدینہ میں صرف ایک بڑھئی تھا جسے میمون کہتے تھے۔

علامہ طبرانی' سہل سے روایت کرتے ہیں: میں اپنے انصاری خالو کے پاس بیٹھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غابہ کی طرف جاؤ اور اس کی لکڑی لے آؤ اور میرے لئے منبر بناؤ۔ طبرانی کے مطابق اس کا نام ابراہیم تھا اور ابن شبہ کی ''اسماء الصحابہ'' میں اس کا نام قبیصہ یا قصیبہ مخزومی تھا جو ان کا غلام تھا۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ عمر بوجھل ہو گئے تو تمیم داری نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے لئے منبر نہ بنا دیں جو آپ کو سہارا دے سکے' آپ نے فرمایا' ضرور بنا دو چنانچہ انہوں نے ایک منبر بنایا جس میں بیٹھنے کی جگہ کے علاوہ دو زینے تھے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جن روایات میں بڑھئی کا نام ملتا ہے' ان میں سے یہ قوی سند ہے لیکن اس میں یہ وضاحت نہیں کہ جس نے منبر بنایا وہ تمیم تھا بلکہ ابن سعد کی پہلی روایت سے ظاہر ہے کہ تمیم نے اسے نہیں بنایا تھا سب سے زیادہ بہتر قول یہ ہے کہ وہ میمون تھا۔

میں کہتا ہوں کہ مقدمہ الشرح میں یہ قول اس کے قول منافی نہیں ''مشہور قول میں اس کا نام باقوم ہے'' کیونکہ کبھی غلط بات مشہور ہو جاتی ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''منبر بناؤ کیونکہ میرے باپ ابراہیم نے بھی بنایا تھا پھر فرمایا عصاء بناؤ کیونکہ میرے باپ ابراہیم نے بنایا تھا۔''

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ جمعہ کے دن ایک لکڑی سے پیٹھ لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے اور جب لوگ زیادہ ہو گئے تو فرمایا: میرے لئے ایک منبر بنا دو چنانچہ انہوں نے آپ کے لئے ایک منبر بنایا جس کی دو سیڑھیاں تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے لئے منبر بنایا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے لکڑیوں کے جوڑنے پر اسے بنانے کا نام دیدیا ہو لیکن حافظ ابن حجر کہتے ہیں' ایک اہل سیرت نے لکھا ہے کہ آپ مٹی سے بنے منبر پر اس وقت خطبہ دیتے تھے جب ابھی لکڑی کا منبر نہیں بنا تھا۔

میں کہتا ہوں' احتمال یہ ہے کہ مٹی سے بنا وہ منبر تنے کی ایک جانب تھا اور شاید وہ صرف ایک اونچی جگہ تھا' نہ اس کی سیڑھیاں تھیں اور نہ اس پر بیٹھنے کی جگہ' صرف آرام وہ جگہ تھی لہٰذا یہ اس کے منافی نہیں جس میں لکڑی کے سبب منبر

بنانے کا ذکر ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو صحیحین کے اندر حدیث افک کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں: اوس و خزرج بھڑک اُٹھے، لگتا تھا کہ ابھی ایک دوسرے کو قتل کریں گے اور رسول اللہ ﷺ منبر پر تھے۔ الحدیث یہ قصہ پہلے گذر چکا ہے جس میں منبر کو لکڑی سے بنانے کا ذکر ہے۔ ابن نجار نے کہا ہے کہ اسے ۸ھ میں بنایا گیا تھا اور ابن سعد نے یقین سے کہا ہے کہ یہ ۷ھ میں بنا تھا علاوہ ازیں تمیم اور عباس کے اسے بنانے میں یہ ذکر بتاتا ہے کہ یہ ان کے بعد بنا تھا کیونکہ حضرت عباس کی آمد فتح مکہ کے بعد ۸ھ کے آخر میں ہوئی تھی جبکہ تمیم ۹ھ میں آئے تھے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں بیٹھے ہوتے، کوئی پردیسی آ جاتا تو اسے پتہ نہ چلتا کہ آپ کون سے ہیں چنانچہ ہم نے مطالبہ کیا کہ ان کے لئے بیٹھنے کے لئے کوئی شے بنا دیں تاکہ آنے والا آپ کو پہچان سکے اس لئے ہم نے آپ کے لئے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر آپ بیٹھا کرتے۔ ایک اور طریقے سے حدیث میں آیا ہے کہ وہ شخص آیا تو نبی کریم ﷺ اس چبوترے پر بیٹھے خطبہ دے رہے تھے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی الزناد کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ منبر کی بیٹھنے والی جگہ پر بیٹھا کرتے اور دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھتے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو دوسری سیڑھی پر کھڑے ہوتے اور نچلے درجہ پر پاؤں رکھتے اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو تیسرے درجہ پر کھڑے ہوتے اور بیٹھتے وقت پاؤں زمین پر رکھتے اور پھر جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو خلافت کے چھ سال تک یونہی کرتے رہے اور پھر حضور ﷺ کی جگہ اختیار کر لی۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی بنے تو انہوں نے منبر میں زیادتی کر دی چنانچہ اس کے چھ درجے بڑھا دئے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے منبر پر قبطیہ چادر چڑھائی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے منبر کو شام میں لے جانے کی کوشش

کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے موقع پر آئے تو انہوں نے منبر کو حرکت دی، ارادہ یہ تھا کہ اسے شام لے جائیں جس کی بناء پر اس دن سورج کو گہن ہو گیا اور ستارے دکھائی دینے لگے، انہوں نے لوگوں سے معذرت کی اور کہا میرا ارادہ یہ دیکھنا تھا کہ اس کے نچلے حصے کی حالت کیا ہے، ڈر تھا کہ کہیں اسے مٹی نے کھا نہ لیا ہو۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ اسی دن انہوں نے منبر پر قبطی یا لینی چادر چڑھائی تھی۔ علامہ یحییٰ کہتے ہیں کہ ہمارے یقین کے مطابق سب سے پہلے یہ چادر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چڑھائی تھی، ابن نجار نے واقدی سے بذریعہ ابن ابی الزناد نقل کیا، کہتے ہیں: یہ چادر کسی عورت نے چوری کر لی، اسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا تم نے یہ چوری کی ہے؟ وہ مان گئی تو آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔

تاریخ واقدی کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۵۰ھ میں منبر کو دمشق میں لے جانے کا ارادہ کیا

تو اسی دن سورج گہنا گیا' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سلسلے میں ان سے بات کی تو انہوں نے اسے وہیں رہنے دیا' عبدالملک نے ارادہ کیا تو ان سے قبیصہ نے بات چنانچہ انہوں نے رہنے دیا' ولید کا دور آیا تو اس نے لے جانے کا ارادہ کیا' اس پر حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس بارے میں پیغام بھیجا' انہوں نے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے بھی ارادہ ترک کر دیا اور جب سلیمان سے منبر لے جانے کے بارے میں کہا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا: خدا کی پناہ' ہم تو دنیا دار ہیں' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اسلام کی ایک عظیم علامت کو یہاں سے لے جائیں' یہ کام میں تو نہیں کروں گا' نہ ہی میں چاہوں گا کہ اس بارے میں عبدالملک یا ولید سے بات کروں' اس سے ہمارا کیا مطلب؟

منبر کے چھ زینے

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے مروان کو کہلا بھیجا کہ منبر نبوی ان کے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ انہوں نے اسے اُٹھانے کا حکم دیا جس پر مدینہ میں تاریکی چھا گئی اور سخت آندھی چلی چنانچہ مروان باہر نکلا اور اس نے خطبہ دیا' کہنے لگا: اے اہلِ مدینہ! تمہارا خیال یہ ہوگا کہ امیر المؤمنین نے رسول اللہ ﷺ کا منبر اُٹھا لانے کا کہا ہے' امیر المؤمنین تو خوب جانتے ہیں کہ منبر رسول اللہ ﷺ کو اس کے مقام سے اکھاڑنا کیسا ہے' مجھے انہوں نے صرف یہ حکم دیا ہے کہ اس کا احترام کروں اور اسے اونچا کر دوں۔ کہتے ہیں' چنانچہ اس نے بڑھئی کو بلا کر اس میں وہ زیادتی کر دی جو آج دکھائی دیتی ہے اور اسے وہاں رکھا جہاں آج موجود ہے۔

ابن قطن کہتے ہیں کہ مروان بن حکم نے منبر رسول کو اُکھاڑنے کا ارادہ کیا' اس وقت اس کے دو زینے اور اوپر بیٹھنے کی جگہ الگ تھی' اس کا ارادہ تھا کہ اسے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیج دے' اس پر سورج گہنا گیا اور ہم تارے نکلے دیکھے۔ کہتے ہیں کہ اس نے اس میں چھ زینوں کا اضافہ کیا اور پھر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے لوگوں کی کثرت دیکھ کر اسے اونچا کیا ہے۔

یحییٰ کی ایک اور روایت ہے کہ مدینہ میں مروان گورنر تھا' اسی دوران حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا منبر میرے پاس بھیج دو' مروان نے نکل کر اسے اکھاڑا تو ہمیں سیاہ آندھی نے آلیا اور دن میں تارے نظر آنے لگے' آدمی دوسرے آدمی سے بھڑ جاتا لیکن پہچان نہ سکتا تھا۔ اس کے بعد یحییٰ نے مروان کی پہلی معذرت بیان کی' اس نے کہا: مجھے انہوں نے صرف یہ کہلا بھیجا ہے کہ اسے اونچا کر دوں' پھر اس کے لئے بڑھئی منگوائے اور یہ زینے بنائے اور پھر منبر اس کے اوپر رکھ دیا۔ یہ اضافہ چھ زینوں کا تھا' راوی کہتے ہیں کہ ان سے پہلے اور بعد کسی اور نے اضافہ نہیں کیا۔

ابن زبالہ کی ایک روایت بذریعہ مطلب ہے کہ: جس شخص نے منبر کے زینے بڑھائے وہ معاویہ بن ابوسفیان

رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔

سفیان کہتے ہیں: کثیر کہتے ہیں' مجھے ولید بن رباح نے بتایا کہ جس دن حضرت معاویہ نے زینوں میں اضافہ کیا' اس دن سورج گہنا گیا اور ستارے دکھائی دینے لگے۔

ابن نجار نے مروان کی زیادتی کا ذکر کیا ہے جس سے بیٹھنے والے جگہ سمیت منبر کے نو زینے بن گئے پھر بتایا کہ جب ۱۶۱ھ میں مہدی مدینہ میں آیا تو حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: میرا ارادہ یہ ہے کہ منبر کو اس کی سابق حالت کے مطابق بنا دوں۔ اس پر مالک نے کہا' یہ طرفاء (جھاؤ) سے بنا ہے' مجھے یہ دونوں کھڑیاں دکھائی دے رہی ہیں' یہ بندھی ہوئی ہیں لہٰذا اسے جب الگ کرو گے تو خدشہ ہے کہ گر کر برباد ہو جائیں گی' اس لئے میرا نہیں خیال کہ اسے تبدیل کرو چنانچہ مہدی نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور چلا گیا۔

منبر شریف کے کُل زینے

میں بتاتا ہوں کہ اب تک مؤرخین کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا منبر کے بیٹھنے کی جگہ کے علاوہ دو زینے ہونے پر اتفاق ہے لیکن دارمی کی گذشتہ روایت میں آ چکا ہے کہ ''یہ تین یا چار زینے تھے'' ایسا انہوں نے شک کی بناء پر کہا جبکہ مسلم میں ہے کہ ''یہ تین درجے تھے'' اُنہوں نے شک کا ذکر نہیں کیا پھر شرح المنہاج میں کمال دمیری نے لکھا: منبر کے تین زینے آرام وہ جگہ کے علاوہ تھے' شاید اس کا ماخذ ظاہر ہے اور یہ حدیث بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ منبر پر چڑھے' پہلے زینے پر قدم رکھا تو فرمایا: آمین' پھر دوسرے دوسرے زینے پر قدم رکھا تو فرمایا: آمین' پھر تیسرے زینے پر رکھا تو پھر آمین فرمایا' اس پر صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابھی ہم نے سنا کہ آپ نے تین مرتبہ آمین کہی ہے۔ آپ نے فرمایا: میں جب پہلے زینہ پر چڑھا ہوں تو جبریل آئے اور کہنے لگے: وہ شخص بدبخت ہے کہ جس کے ہوتے رمضان المبارک آئے اور اس کی بخشش ہوئے بغیر گذر جائے' اس پر میں نے آمین کہی' اگلے زینے پر اس نے کہا: وہ شخص بھی بدبخت ہوگا جس کے پاس آپ کا ذکر ہوا اور وہ درود نہ پڑھے' اس پر میں نے آمین کہی' پھر کہنے لگا بدبخت ہوگا وہ شخص جس کے ماں باپ یا ان میں سے ایک موجود ہوں اور وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکیں' تو میں نے آمین کہہ دی۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ منبر کے پاس آ جاؤ' ہم جمع ہو گئے' آپ نے پہلے زینہ پر قدم رکھا تو فرمایا' آمین۔ پھر دوسرے پر قدم رکھ کر فرمایا' آمین اور پھر جب تیسرے درجے پر چڑھے تو فرمایا آمین پھر آپ اُتر آئے تو ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ آج ہم نے آپ سے ایسی بات سنی ہے جو پہلے کبھی نہیں سنی۔ فرمایا: جبریل سامنے آئے اور کہنے لگے: وہ شخص رحمت سے دور ہوا جسے رمضان دیکھنا نصیب ہوا لیکن اس کی بخشش نہ ہو سکی۔ میں نے آمین کہی۔ پھر جب میں دوسرے زینہ پر چڑھا تو اس نے کہا: وہ شخص رحمت خداوندی سے دور ہو گیا جس کے پاس آپ کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے۔ میں نے آمین کہا اور جب میں تیسرے زینہ پر چڑھا تو وہ کہنے لگا:

وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے جس کے پاس اس کے بوڑھے والدین یا ان میں سے ایک ہو اور وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا پائیں' میں نے کہہ دیا: آمین۔ ممکن ہے کہ اس وقت (پہلی آمین کے وقت) آپ بیٹھنے کی جگہ پر چڑھے ہوں اور یہ تیسرا زینہ تھا۔

منبر کا پھیلاؤ

ابن زبالہ کے مطابق آسمان کی طرف منبر کی اونچائی دو ہاتھ تھی اور چوڑائی ہر طرف سے ہاتھ بھر تھی اور وہ مربع شکل کا تھا' اسی میں ہے کہ آپ کی پچھلی طرف تین گول ٹہنیاں تھیں' ایک ضائع ہوگئی اور دوسری ۱۹۸ھ میں اکھڑ گئی جو داؤد بن عیسےٰ کے حکم پر دوبارہ لگا دی گئی اور منبر کی دیوار میں مروان نے جو کچھ کیا' وہ دس چھڑیاں تھیں جو حرکت نہ کرتی تھیں۔ مروان کی لگائی چھڑی سمیت نبی کریم ﷺ کے منبر کی اوپر کو لمبائی ساڑھے تین ہاتھ تھی۔

پھر اس نے آج کی پیائش کے بارے میں گفتگو کے بعد لکھا کہ بیٹھنے کی جگہ مربع شکل کی تھی' وہ ہر طرف سے دو بالشت اور چار انگل تھی چنانچہ ان کے پہلے قول "اس کی چوڑائی ایک ہاتھ مربع تھی" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے منبر کی بیٹھنے والی جگہ مراد لی ہے کیونکہ انہوں نے دو زینوں کا ذکر نہیں کیا اور اس لئے بھی کہ گذشتہ مضمون کے بعد انہوں نے لکھا: منبر نبی کے پائیوں کے نیچے سے اُوپر کے کنارے تک پانچ بالشت سے قدرے زیادہ تھی' اس کے زینوں کا عرض دو بالشت اور لمبائی ایک بالشت تھی جبکہ سہارا لگانے کی جگہ تک پیائش دو بالشت سے کچھ زیادہ تھی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منبر نبوی کی پیائش قبلہ کی طرف سے شام کی طرف چار بالشت سے کچھ زیادہ تھی کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ زینے کا عرض دو بالشت اور بیٹھنے کی جگہ دو بالشت چار انگل تھی اور ان کے اس قول "منبر نبوی کے نچلے پائیوں کی طرف سے الخ" کا مطلب یہ ہے منبر نبوی کی زمین کی طرف سے اوپر والی جگہ جہاں آپ ہاتھ مبارک رکھتے تھے پانچ بالشت سے قدرے زیادہ تھی اور یہ پیائش اڑھائی ہاتھ بنتی ہے اور پھر پہلے بتایا جا چکا ہے کہ منبر نبوی کی بلندی دو ہاتھ تھی چنانچہ جالی کی بلندی آدھا ہاتھ ہوئی۔

ابن نجار کا کہنا ہے کہ منبر نبوی کی لمبائی دو ہاتھ ایک بالشت اور تین انگشت تھی اور چوڑائی ہاتھ سے قدرے زیادہ تھی جبکہ آپ کے سہارا لگانے کی اونچائی ہاتھ بھر تھی اور انار جیسے ان دو نشانوں کا طول جن پر آپ بیٹھتے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے' ایک بالشت دو انگشت تھا اور چوڑائی مربع ہاتھ تھی۔ یہ بات ابن زبالہ کے خلاف ہے۔

ابن زبالہ نے قبر انور اور منبر کی درمیانی جگہ کی فضیلت بتاتے ہوئے منبر کے گرد لگے مرمر کا ذکر کرنے کے بعد یہ الفاظ لکھے ہیں: منبر میں نیچے سے اوپر کی طرف تین مقامات پر بکھری ہوئی سات سات دراڑیں تھیں اور مشرق کی طرف مروان کے بنائے حصے میں اٹھارہ گول سے سوراخ تھے اور مغرب میں بھی اتنے ہی سوراخ تھے' اس کے اندر گولائی میں پانچ چھڑیاں تھیں جن میں سے کچھ تو ختم ہوگئیں اور دو باقی بچی تھیں جن میں سے ایک' داؤد بن عیسےٰ کی مدینہ میں گورنری

کے موقع پر ۱۹۸ھ میں' گر گئی چنانچہ اس کے حکم سے دوبارہ لگا دی گئی۔

ایک اور مقام پر کہا: منبر کی دیوار میں مروان نے جو کچھ کیا وہ دس چھڑیاں تھیں جو حرکت نہیں کرتی تھیں' پھر کہا کہ بالخصوص منبر نبوی میں اس کی تینوں جانب پانچ چھڑیاں تھیں جن میں سے کچھ ضائع ہو گئیں۔ پھر منبر کی پیائش کے بعد ان کے الفاظ یہ ملتے ہیں: آج کل منبر کی لمبائی چار ہاتھ ہے جبکہ چوڑائی ایک ہاتھ سے کچھ زیادہ ہے پھر آخری رمانہ اور منبر نبوی کے قدیم رمانہ کے درمیان ایک ہاتھ سے کچھ زیادہ فاصلہ ہے' پھر منبر نبوی کے رمانہ اور منبر کے اگلے حصے کے نئے رمانہ کے درمیان دو ہاتھ سے کچھ زیادہ پیائش ہے پھر رمانہ اور زمین کے درمیان تین ہاتھ سے کچھ زیادہ پیائش ہے پھر آج کے منبر کی لمبائی زینہ کے نیچے سے آخر تک سات ہاتھ اور ایک بالشت ہے جبکہ اس کے زمین سے آخر تک کی لمبائی چھ ہاتھ ہے' اب یہ بات طے ہے کہ ان کے کلام کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین میں منبر کی مرمری زینے کے نچلی طرف' سامنے سے منبر کے آخر تک لمبائی سات ہاتھ اور ایک بالشت ہے اور زمین میں آخر تک کا پھیلاؤ چھ ہاتھ ہے جس میں سیڑھی شامل نہیں' یوں ان کی کلام کا تسلسل صحیح ہو جائے گا پھر انہوں نے ذکر کیا ہے کہ منبر کے گرد مرمر لگا ہوا ہے جو ہاتھ بھرا بھرا ہوا ہے اور اس کا کچھ نیا حصہ بلند نہیں ہے۔

ایک اور مقام پر انہوں نے کہا کہ منبر مرمر کے اوپر بنا ہے اور اس کے درمیان واقع ہے چنانچہ مرمر کا نام رخام رکھا گیا ہے۔ نیز کہا: اس مرمر کی حد منبر کے قبلہ میں واقع دو ستونوں سے شام کی جانب والے ستونوں (منبر کے سامنے والے) تک ہے۔ ابن نجار نے اس مرمر کا نام "دَکّہ" رکھا ہے جس پر منبر رکھا ہوا ہے پھر کہا ہے کہ اس کی اوپر کو لمبائی ایک بالشت اور ایک پورا ہے' اسے حسین بن جبیر نے اپنے سفر نامے میں اسے حوض کہا ہے اور شائد انہوں نے یہ نام اس روایت سے لیا ہے کہ منبر حوض پر ہوگا اور پھر اس مرمر کی لمبائی چوڑائی ہماری بتائی ہوئی کے قریب ہے جسے ہم مسجد نبوی کی حدود کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں پھر کہا کہ اس کی بلندی ڈیڑھ بالشت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب ہمارے دور میں تعمیر کے نگران نے مسجد شریف کی زمین کھدوائی اور اسے مصلّے کے برابر کرنا شروع کیا تو یہ مرمر وہاں موجود تھا اور مصلّے کی زمین سے اس کی بلندی ابن نجار اور ابن جبیر کے لکھے کے مطابق تھی پھر جب انہوں نے اس مرمر پر بنیاد رکھنے کا ارادہ کیا تو اس پتھر کے اردگرد کھدائی کی جس کے دوران پتہ چلا کہ یہ مصلّے شریف کی اس زمین سے ذرا نیچے تھا جس پر آج کل منبر بنا ہوا ہے اور اس کے پیچھے قبلہ کی طرف تین ہاتھ کی کانس تھی' جس کی لمبائی سات ہاتھ اور ایک بالشت تھی' وہ اندر سے خالی تھی اور حوض کی شکل والی تھی چنانچہ ابن جبیر کا اسے حوض کہنا اس وقت معلوم ہوا اور آئندہ آنے والی یہ بات بھی سچ ہو گئی کہ منبر پانچ بالشت وسیع تھا کیونکہ اس دکھائی دینے والے اندر سے خالی حوض کی اوپر سے نیچے پتھروں تک پیائش پانچ بالشت تھی۔

رہا ابن زبالہ کے پہلے قول: "آج کل منبر کی لمبائی چار ہاتھ ہے" سے مراد یہ ہو کہ یہ ہوا میں اس کی لمبائی ہے جس میں وہ چھ زینے بھی شامل تھے جنہیں مروان نے بڑھا دیا تھا چنانچہ چھ زینوں کا طول دو ہاتھ ہوا تو ہر زینہ تین ہاتھ کا

ہوا جو ابن زبالہ کی طرف سے بتائے منبر نبوی کے زینوں کی لمبائی کے قریب ثابت ہوا اور مناسب بھی یہی تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ منبر نبوی' چار ہاتھ کی زیادتی کو شامل کر کے' زمین سے اوپر تک نو ہاتھ اور ایک انگشت بلند تھا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ زین کی تحریر میں میں نے یونہی دیکھا اور انہوں نے ''نو ہاتھ'' کا قول محفوظ رکھا جو اس نسخہ میں غلط ہے جو میں نے دیکھا کیونکہ جو ہم نے ابن زبالہ سے بیان کیا' وہ زینہ کی سیڑھی سے آخر تک تھا اور پہلے کی بناء پر اس کا ثبوت بھی دے چکے اور ہمارے غلط کہنے کا فیصلہ اس لئے ہے کہ ایسے میں ان کی کلام کے دونوں اطراف مل نہیں پاتے اور پھر ایسے میں ہوا کے اندر اس کی بلندی نو ہاتھ اور ایک بالشت بنتی ہے اور جب ایسی کوئی عمارت کھڑی ہو گی تو وہ چھت کے قریب ہو جائے گی جبکہ اس زمانے میں منبر کا اس قدر بلند ہونا نہایت دور کی بات تھی اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ابن زبالہ یہ تصریح کر چکے ہیں کہ مروان کی طرف سے اضافہ چھ زینے تھے جس سے لازم آتا ہے کہ ہر زینہ ایک ہاتھ سے قدرے زائد ہو اور یہ انتہائی بعید بات ہے اور جو کچھ ہم نے ابن زبالہ سے نقل کیا وہ ابن نجار کے ذکر کردہ کے قریب قریب ہے کیونکہ انہوں نے منبر کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا: آج کل منبر کی لمبائی تین ہاتھ' ایک بالشت اور تین انگشت ہے اور وہ مرمر جس کے یہ اوپر ہے اس کی لمبائی بالشت سے قدرے زیادہ ہے اور منبر کے سرے سے مرمر کے نزدیک زمین تک پانچ ہاتھ' ایک بالشت اور چار انگل ہے' آج کل اس میں دو زینے بڑھا دئے گئے ہیں اور ان پر دروازہ لگا دیا گیا ہے جو جمعہ کے دن کھلتا ہے۔انتہی چنانچہ یہ پیمائش ابن زبالہ کی ذکر کردہ اس پیمائش کے قریب ہے کہ منبر کا ہوا میں طول چار ہاتھ ہے اور زمین میں سیڑھی سے آخر تک اس کا پھیلاؤ چھ ہاتھ کا ہے اور پھر فقیہ ابوالحسین محمد بن جبیر کے ذکر کردہ کے مطابق ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا: میں نے مدینہ شریف کا منبر ۵۷۸ھ میں دیکھا تھا' زمین سے قد انسانی یا اس سے قدرے زیادہ بلند تھا' اس کی فراخی پانچ انگشت تھی' لمبائی پانچ قدم (۲۵ فٹ) تھی اور آٹھ زینے تھے' دریچی کی طرح اس کا دروازہ تھا' جس پر تالا لگا تھا جو جمعہ کے دن کھولا جاتا تھا' دروازے کی لمبائی ساڑھے چار بالشت تھی۔ یہ وہی منبر تھا جس کی وضاحت ابن نجار نے کی تھی کیونکہ انہوں نے اس کی تاریخ ۵۹۳ھ مقرر کر دی تھی اور پھر وہ مسجد میں آتشزدگی سے پہلے ۶۴۳ھ کو فوت ہو گئے جبکہ مسجد میں آتشزدگی ۶۵۴ھ کو ہوئی جیسے آگے آ رہا ہے اور اسی میں یہ منبر جل گیا تھا جس کی وجہ سے لوگ اس کی برکت سے محروم ہو گئے۔

ابن جبیر نے ابن نجار سے بڑھ کر اس منبر کی تعریف کرتے ہوئے کہا: وہ آبنوس کی چھتری سے ڈھانپا ہوا تھا اور حضور ﷺ کی نشست گاہ اوپر سے صاف دکھائی دیتی تھی' اس پر آبنوس کی بنی تختی لگی تھی جو اس سے ذرا فاصلے پر تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی اس پر بیٹھ نہ سکے کیونکہ ایسے میں لوگ اس کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے بطور تبرک اس نشست گاہ کو چھو سکیں گے اور منبر کے داہنے پائے کے سرے پر (جہاں خطیب خطبہ کے موقع پر ہاتھ رکھتا تھا) چاندی کا اندر سے خالی گولائی والا مستطیل حلقہ تھا (چھلا) جو درزی کے اس چھلے کی طرح کا تھا جسے وہ انگلی میں پہنا کرتا ہے البتہ یہ اس سے بڑا

تھا' یہ ایک کھلونا تھا' اپنی جگہ میں گھوم سکتا تھا۔انتہٰی۔
ظاہر یہ ہے کہ یہ منبر وہ نہیں جس کا ابن زبالہ نے ذکر کیا ہے کیونکہ انہوں نے اس کی یہ صورت نہیں بتائی کیونکہ "طراز" میں وہ یوں لکھتے ہیں کہ منبر والی جگہ کے اوپر غلاف کی طرح کا خول چڑھایا گیا ہے اور منبر کی اعلیٰ جانب المارى تھی جو ریاض الجنہ سے ملتی تھی چنانچہ لوگ اس میں اپنا ہاتھ ڈالتے' منبر نبوی کو چھوتے اور اس سے تبرک حاصل کرتے تھے۔انتہٰی یہ سب کچھ ابن زبالہ کے بعد ہوا۔
مطری کہتے ہیں' مجھے مجاوروں کی اولاد میں سے یعقوب بن ابوبکر نے بتایا' ابوبکر مسجد کے نگرانوں کی طرف سے فرش کی صفائی پر مقرر تھے' اسی کے ہاتھ سے مسجد میں آتشزدگی کا واقعہ ہوا تھا' کہ وہ منبر جسے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑھایا اور اسے بلند کر دیا' اس میں وقت گذرنے کی بناء پر کمزوری آ گئی' پھر بنو عباس کے ایک خلیفہ نے اسے از سرِ نو بنایا اور منبر نبوی کی بچی ہوئی چھڑیوں میں سے کچھ ٹوٹی پھوٹی بطور تبرک رکھ لیں اور وہ منبر بنایا کہ ابن نجار سے پہلے جس کا ذکر کیا ہے۔
یعقوب کہتے ہیں کہ یہ بات میں نے مدینہ کے کئی قابلِ بھروسہ لوگوں سے سنی اور یہ بھی سنا کہ اس جلے ہوئے منبر کو مذکور خلیفہ نے بنایا' اسی منبر کو ابن نجار نے دیکھا کیونکہ ان کی وفات آتشزدگی سے پہلے ہو گئی تھی۔
میں کہتا ہوں کہ "تحفہ" میں ابن عساکر کے کلام کا ظاہری معنٰی یہ بنتا ہے کہ منبر شریف کے جلنے تک صرف کچھ ہی چیزیں بچی تھیں اور یہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے آتشزدگی دیکھی تھی۔پھر اپنے شیخ ابن نجار کے یہ الفاظ لکھے: منبر نبوی کی بقایا پرانی اشیاء جل گئیں اور زائرین اس منبر کے سرے کو ہاتھ لگانے سے محروم ہو گئے جس پر حضور ﷺ بیٹھتے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے اور اس جگہ کو بھی ہاتھ لگانے سے محروم ہو گئے جہاں آپ دو خطبوں کے درمیان اور ان سے پہلے بیٹھا کرتے تھے جبکہ آپ کے مبارک قدموں کے چھونے میں عام برکت تھی اور یہ کام فائدہ مند تھا۔اس میں ہر جانے والے کو بدلہ ملتا اور یہ ہر فوت ہونے والی نیکی کا بدلہ ہوتا۔انتہٰی۔
یہ قول اس بات میں بڑا واضح ہے کہ آتشزدگی تک اُن کی ذکر کردہ اشیاء باقی تھیں اور پھر اس کی تائید ابن جبیر کے سفرنامے سے بھی ہوتی ہے اور مصنف طراز سے بھی بلکہ ہمیں اس کی صحت پر مزید دلیل بھی مل گئی جو اس بات کی شہادت بنتی ہے کیونکہ تعمیر کے نگران نے جب منبر کی بنیاد کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس مرمر پر' جس کا ذکر گذر چکا اور جس کے بارے میں کہا گیا کہ منبر اس پر تھا تو دیکھا گیا کہ وہ اندر سے حوض کی طرح خالی تھا۔ابن جبیر نے اس بارے میں یونہی لکھا ہے چنانچہ انہوں نے قبلہ والی جگہ میں جلے ہوئے منبر کی بہت سی لکڑیاں دیکھیں (یعنی جو منبر نبوی سے بچی ہوئی تھیں) چنانچہ پہلے لوگوں نے برکت حاصل کرنے کے لالچ میں انہیں اس جگہ کے درمیان میں رکھ دیا اور پھر اس پر اینٹیں لگا کر اس حوض کا پیٹ پوری طرح بند کر دیا اور وہ عین برابر تھڑا سا بن گیا اور پھر اس پر وہ منبر رکھ دیا جس کا آگے ذکر آ رہا ہے۔

خود میں نے منبر کے وہ دو پائے دیکھے ہیں جن کے اوپر کی طرف دو انار جیسی دو چیزیں تھیں دونوں پائیوں کے لئے حوض کو احاطہ کرنے والے پتھر میں سے قبلہ کی طرف حوض مذکور کے باطن میں ایک ہاتھ اور تہائی ہاتھ گڑھے کھودے گئے' وہ حوض پانچ بالشت فراخ تھا جیسے ابن جبیر نے لکھا اور حوض کی چوڑائی منبر کی پچھلی طرف آدھا ہاتھ تھی چنانچہ ان میں سے جو لکڑیاں ملیں' انہیں اپنے مقام پر رکھنے کا مجھے بھی شوق ہوا چنانچہ باقی بچ جانے والی لکڑیاں حوض میں اپنے مقام پر رکھ دی گئیں اور پھر انہوں نے اس پر تعمیر کی۔ (واللہ اعلم)

جب وہ منبر دیگر چیزوں کے ساتھ جل گیا تو والی یمن ملک مظفر نے ۶۵۶ھ میں منبر بھیجا جس پر صندل سے بنے انار جیسے دولٹو سے لگے تھے چنانچہ اسے منبر نبوی کے مقام پر نصب کر دیا گیا' اس پر دس سال تک خطبہ دیا جاتا رہا اور ۶۶۶ھ آیا تو ملک ظاہر رکن الدین بیبرس بندقداری نے آج کل کا موجود منبر بھیجا (یعنی مطری کے زمانے میں) چنانچہ یمن والا منبر ہٹا دیا گیا' اسے حرم کے سٹور میں رکھ دیا گیا اور یہ منبر اس جگہ نصب کر دیا گیا' آسمان کی طرف اس کی اونچائی چار ہاتھ اور اس کے سرے سے زمین والی سیڑھی کا فاصلہ سات ہاتھ سے کچھ زائد تھا اور اس کے زینے نشست گاہ سمیت نو تھے۔

علامہ مجد کہتے ہیں کہ اس کے دروازے کے دو کواڑ تھے اور ہر دروازے میں چاندی کے دو انار سے جڑے ہوئے تھے' اس کی دائیں طرف کاریگر کا یہ نام لکھا تھا ''ابوبکر بن یوسف نجار'' یہ نہایت اکابر صالحین میں شمار ہوتے تھے اور یہ منبر خود لے کر مدینہ آئے تھے اور اسے اپنے مقام پر رکھ دیا تھا اور نہایت سلیقے سے رکھا تھا' اس میں بڑی کاریگری سے کام کیا تھا۔ پھر وہ یہیں کے ہو رہے۔

علامہ زین مراغی لکھتے ہیں کہ بیبرس کا یہ منبر ۶۶۶ھ سے ۷۹۷ھ تک وہیں رہا اور اس پر خطبہ دیا جاتا رہا' خطبہ کی مدت تقریباً ایک سو بتیس سال تھی پھر اسے مٹی کھانے لگے چنانچہ سلطان باقوق والئی مصر نے وہ منبر بھیجا جو آج کل موجود ہے (یعنی مراغی کے دور میں) اس نے یہ منبر ۷۹۷ھ کے آخر میں بھیجا تھا پھر سلطان بیبرس کا منبر الگ کر دیا گیا۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ منبر ۸۲۰ھ سے بعد تک رہا' یہ بات مجھے کئی مشائخ حرم نے بتائی جن میں سے ایک الشیخ صالح المعمر جمال عبداللہ بن قاضی القضاۃ عبدالرحمٰن بن صالح بھی تھے۔

کہتے ہیں کہ پھر سلطان مصر' الملک ''موید شیخ'' نے یہ منبر بھیجا جو آج کل موجود ہے یعنی ۸۸۲ھ میں۔

میں نے ابن حجر کی کلام میں پڑھا کہ آج کل موجود منبر سلطان موید نے ۸۲۰ھ میں بھیجا تھا۔ یہ بات قابل اعتماد ہے لیکن ابن حجر کو مراغی کے ذکر کردہ سلطان برقوق کے بھیجے منبر کا علم نہیں چنانچہ انہوں نے سلطان مؤید کے لائے ہوئے منبر کو سلطان بیبرس کے منبر کا بدل بنا دیا حالانکہ اس بارے میں علامہ مراغی کی بات زیادہ قابل بھروسہ ہے کیونکہ اس وقت وہ مدینہ پاک میں تھے چنانچہ اس بناء پر سلطان برقوق کے منبر پر خطبہ کی مدت تیئیس یا چوبیس سال بنتی ہے اور

پھر سلطان موید کا منبر رکھ دیا گیا۔

مجھے سراج نفطی نے بتایا کہ اسے اہل شام نے بنایا تھا' وہ لے کر سلطان مؤید کے پاس پہنچے کہ اسے اپنے مدرسے مؤید یہ میں رکھ لیں پھر انہیں پتہ چلا کہ اہلِ مصر نے اس مدرسہ کے لئے پہلے ہی بنایا ہوا ہے چنانچہ مؤید نے اہل شام کا منبر مدینہ شریف کی طرف روانہ کر دیا۔ مجھے جمال عبد اللہ بن صالح نے بتایا کہ میں نے اسے پہلے منبر کی جگہ پر انہیں رکھتے دیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس منبر اور مصلّٰے شریف کے درمیانی فاصلے کو ماپا تو اس قول کی صحت کا اندازہ ہوا جیسے ہم پہلے بتا چکے کیونکہ نقل یہ ہے کہ دونوں کے درمیان چودہ ہاتھ ایک بالشت کا فاصلہ ہے اور پھر میں نے مصلّٰے شریف کی طرف سے مغرب میں منبر کے مقابل بھی اتنا ہی اندازہ لگایا چنانچہ منبر کو اس طرف سے رکھنا بالکل صحیح ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ رہا قبلہ کی طرف سے تو مطری کہتے ہیں کہ جو منبر انہوں نے دیکھا ہے اس کے اور کٹہرے کے درمیان (جو ریاض الجنہ کی طرف ہے) سوا چار ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ علامہ زین مراغی نے بھی اپنی کتاب میں یہی فاصلہ لکھا ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں لکھا جس کا تقاضا یہ ہے کہ جو منبر اُن کے وقت میں رکھا گیا تھا وہی اسی منبر کی جگہ رکھا گیا جو مطری کے دور میں تھا اور پھر انہوں نے مطری کے حدودِ مسجد کے بارے میں اس قول کو برقرار رکھا کہ یہ منبر اپنی پہلی جگہ سے تبدیل نہیں ہوا۔

ابن جماعہ نے بھی منبر اور کٹہرے کے درمیان والا فاصلہ لکھا' ان کے نزدیک بھی وہ منبر مراد ہے جو مطری کے دور میں موجود تھا چنانچہ کہا: کہ ان دونوں کے درمیان زیرِ استعمال ذراع کے مطابق تین ہاتھ کا فاصلہ ہے اور یہ مطری کے بیان کردہ سے چوتھائی ذراع سے زیادہ ہے کیونکہ یہ ذراع ڈیڑھ ذراع جتنا ہے تو گویا علامہ مطری آج کل مدینہ میں استعمال ہونے والا مراد لیتے ہیں جیسے کلام مراغی سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ یہ ابن جماعہ کے کہنے کے مطابق ہے اور وہ جو آج کے دن موجود منبر اور مذکورہ کٹہرے کے درمیان ہے وہ معمول کے ذراع کی بناء پر دو ہاتھ اور تہائی ہاتھ ہے اور یہ فاصلہ ساڑھے تین ہاتھ اس ذراع سے بنتا ہے جس کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے کہ مطلق بولا جائے تو یہی مراد ہوتا ہے تو احتمال یہ ہے کہ یہ منبر پہلے والے منبر سے قبلہ کی جانب رکھے جانے کی جگہ سے آگے ہے اور پختہ لوگ یہی کچھ کہتے ہیں لیکن میں اسے سے بعید جانتا ہوں کیونکہ مجھے ان سے خبر ملی ہے جو اسے وہاں رکھنے والوں میں شامل تھے۔

پھر جب وہ مرمر کھلا جس کا پہلے ذکر اس سامان میں ہو چکا جو جلے ہوئے منبر سے بچ گیا تھا تو اس سے ہمیں مطرٰی کے قول کی صحت معلوم ہوئی کہ یہ منبر اس سے پہلے کا رکھا ہوا ہے جو قبلہ میں اس سے پہلے رکھا تھا اور جو ہاتھ بھر کے فاصلے پر تھا اور یونہی شام کی طرف سے اس کی زیادتی کا پتہ چلا جو اس اصل مرمر پر کی گئی تھی' یہ ہاتھ بھر تھی اور وہ شام کی طرف سے بالشت بھر مغرب کی طرف مائل تھا کیونکہ اس میں اس دا ہنی طرف کا ذکر ہے جس کی طرف گذشتہ فصل کی تنبیہ ثابت میں اشارہ گذر چکا ہے' مجھے اس کے رکھے جانے کی بایں طور تائید حاصل ہوئی کہ یہ منبر اور قبلہ والی

دیوار کے بارے میں ملنے والی روایات میں سے قریب تر ہے جیسے آ رہا ہے چنانچہ دو آنکھیں رکھنے والوں کے سامنے حق کھل گیا اور جس سے ہماری ملاقات ہوئی اور جنہوں نے بتایا کہ اس منبر کو پہلے والے منبر کے مقام پر رکھا گیا' ان کا نام جمال بن صالح تھا' وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے اور ان کی یادداشت جواب دے چکی تھی پھر ان کی تائید مجھے یوں ملی کہ جب اس صندوق کی طرف آئے' جو مصلّٰے شریف کے قبلہ کی طرف دیوار کی چوڑائی میں تھا اور یہ بھی پتہ چلا کہ مصلّٰے شریف بالاتفاق بدلا نہیں گیا نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے منبر اور قبلہ والی دیوار کے درمیان بکری گذرنے کا راستہ تھا یا آدمی کے ایک طرف کو ہو کر گذرنے کا راستہ تھا اور زیادہ سے زیادہ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ ایک ہاتھ سے کچھ زیادہ فاصلہ تھا اور واقعی جب مصلّٰے شریف کے کنارے اور اس کٹہرے کے درمیان جو سامنے تھا اور جو آج کے منبر اور کٹہرے کے درمیان کا فاصلہ یعنی تین ہاتھ گھٹا دیا جائے تو باقی ایک ہاتھ ہی رہ جاتا ہے اور یہ فاصلہ قدیم منبر اور مسجد شریف کی دیوار کے درمیانی فاصلہ جتنا ہے پھر ہمیں مسجد نبوی کی گذشتہ حدود اور منبر کے قبلہ میں موجود مرمر کے کھلنے سے پتہ چلا کہ مذکورہ کٹہرا ابتدائے مسجد نبوی سے ہاتھ بھر سے قدرے زائد آگے ہے چنانچہ درست وہی ہے جو مطری اور ان کے بعد والوں نے لکھا۔

پھر آسمان کی طرف اس کی اونچائی' اس کے قبہ اور پائیوں کو چھوڑ کر بلکہ زمین سے نشست گاہ تک چھ ہاتھ اور ایک تہائی ہاتھ تھی اور نشست گاہ سے دائیں بائیں دونوں نشانوں کی بلندی ایک ہاتھ اور تہائی ہاتھ تھی اور زمین میں منبر کا پھیلاؤ اس کے دروازے سے آخر تک ساڑھے آٹھ ہاتھ سے کچھ زیادہ تھا' زینے آٹھ تھے اور ان کے بعد نشست گاہ تھی جس کی بلندی ڈیڑھ ہاتھ اور اس کا قبہ اونچا تھا' اس پر ہلال لگا ہوا تھا اور وہ بھی بلند تھا اور میرے خیال میں اس سے قبل کوئی منبر اس سے اونچا نصب نہیں کیا گیا اور اس کا دروازہ بھی تھا۔

یہ منبر دوسری آتشزدگی کے دوران جل گیا جو ماہ رمضان ۸۸۶ھ میں لگی تھی چنانچہ اس پر خطبہ کی مدت تقریباً ستاسٹھ سال تھی۔

جب اہل مدینہ نے منبر کی جگہ صاف کر دی تو اس کی جگہ اینٹوں سے منبر بنا دیا اور اس پر چونے کا پلستر کر دیا اور پھر اس پر ماہِ رجب ۸۸۸ھ تک خطبہ دیا جاتا رہا چنانچہ اسی ماہ کی چار تاریخ کو اسے گرا دیا گیا اور پھر منبر کے لئے بنیاد کھودی گئی تو وہ نیچے سے اسی طرح تھا قد انسانی کے مطابق اسے کاٹا گیا لیکن انتہاء تک نہ پہنچ سکے' دیکھا تو وہ زمین میں مضبوط بنیاد کی شکل میں تھا چنانچہ اسے پہلے کی طرح دوبارہ بنا دیا گیا البتہ اس کے اوپر آدھ بازو سے زائد اینٹیں لگی رہنے دیں پھر جو اس کا حوض کی طرح خالی حصہ تھا اسے برابر کر دیا اور پہلے آتشزدگی سے بچے سامان کو پہلے لگا دیا گیا۔

لوگوں نے مجھ سے قدیم منبر کے بارے میں پوچھا کہ قبلہ اور ریاض الجنہ کی طرف سے قدیم منبر کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے تو میں نے انہیں بتایا چنانچہ انہوں نے منبر کا مرمر اس پر رکھنا شروع کیا اور اس طرف رکھا جہاں حوض میں خلا نظر آیا اور عین اس کے اوپر رکھا' فرق نہیں رہنے دیا' اس کے اور مشرقی جانب والے چبوترے کے درمیان پانچ

انگلیوں کا فرق رکھا کیونکہ یہ دکھائی دے رہا تھا کہ اصلی منبر حوض پر تھا' اس کے پائے پتھر کھود کر رکھے گئے تھے اور سکے سے اس کے پائے مضبوط کئے گئے تھے اور جو کچھ مؤرخین نے اصلی منبر کی نشانیاں بتائیں وہ اس پر گواہ تھیں اور یہ بات معلوم تھی کہ جو موجودہ حوض اس چبوترہ کے باطن میں تھا اس پر منبر رکھنا ممکن نہیں تھا' ہاں سیدھا اسی پر رکھا جا سکتا تھا خصوصاً اس وقت جب کہ اس کا پھیلاؤ اس کے مطابق ہو جیسے ابن جبیر نے اصلی منبر کے بارے میں ذکر کیا اور اس مرمر کا مضبوط کرنا اس حیثیت سے تھا کہ اس میں سے قد انسانی کے مطابق گڑھا کھودا اور اس کے آخر تک نہیں گئے اور حوض کے خلاء کو سکے سے مضبوط کر دیا' اس مرمر کو قدیم سے گھٹا دیا تھا' یہ سب چیزیں فیصلہ کرتی ہیں کہ اسے منبر رکھنے کے لئے تیار کیا تھا جیسے مؤرخین نے وضاحت سے بتا دیا ہے' سلف کا یہ کام نہیں تھا کہ باوجود مضبوط ہونے کے اسے منبر بنانے کے لئے تیار کریں اور اسے اپنی جگہ سے ایک طرف کر دیں کیونکہ اس کا رکھنا اس کے رکھنے کے تابع تھا کیونکہ یہ اسی کے لئے بنایا گیا تھا' اس کا رکھنا ان کے مشاہدے میں تھا کیونکہ منبر نبوی ان کے سامنے تھا اور اس کی مضبوطی بھی نظر میں تھی اور جو کچھ متقدمین سے اس کی ترخیم میں گذر چکا وہ مسجد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی تعمیر میں دکھائی دیتا تھا' وہ دور معاویہ میں نہیں ہوا تھا' انہوں نے بھی اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا تھا اور یحییٰ نے اپنی گذشتہ عبارت میں (جو تیسری تنبیہ میں آ چکی) اشارہ کیا تھا کہ اس کا رکھنا صحیح تھا اور حضور ﷺ نے بھی اسے داہنی طرف رکھا تھا جیسے ہم نے اپنے رسالے ''نصیحت'' میں ذکر کیا اور منبر تو ایک جامد چیز ہوتی ہے یہ کوئی نمازی تو نہیں چنانچہ انہوں نے منبر کا مرمر اس طریقے پر رکھنا شروع کیا جیسے میں نے ذکر کیا لیکن انہوں نے اس کی دیوار مشرق کی طرف رکھی ان پتھروں پر جو قبلہ کی طرف سے حوض کے پیچھے تھی کیونکہ ان کی نظر اسے دیکھ رہی تھی اور اگر اس معاملے میں میرے سامنے کوئی معاملہ ہوتا تو اس کی موافقت نہ کرتا پھر میں نے دیکھا کہ ایک اور شخص نے بھی وہی کچھ لکھا جو ہم نے اپنے رسالہ ''النصیحۃ الواجبۃ القبول فی بیان وضع منبر الرسول'' میں لکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اسے ڈھا دیا اور حوض مذکور کی پچھلی جانب انہوں نے ہاتھ کا چوتھائی حصہ بڑھا دیا اور وہ قبلہ کی طرف سے اسے جلے ہوئے منبر کے اس حصہ کے برابر ہو گیا اور اس منبر کو انہوں نے قبلہ کی طرف سے جلے ہوئے منبر کی جگہ رکھا اور قبلہ ہی کی طرف سے اسے مشرقی جانب کے برابر کر دیا جو قبلہ ہی کی جانب تھی اور پچھلے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قبلہ کی طرف اصلی منبر کی جگہ سے لوہے کے ہاتھ کی بناء پر بیس قیراط بھر مقدم تھا جو دستی ہاتھ جتنا ہوتا ہے اور منبر نبوی میں تغیر نہ ہوا تھا البتہ ہمارے زمانے میں رکھے ہوئے جلے منبر کے رکھنے کی تاریخ میں تبدیلی ہوئی کیونکہ جو کچھ چبوترے میں موجود تھا وہ رکھنے والے کی نظر سے پوشیدہ رہا اور اسے کسی بھی مؤرخ مدینہ نے بیان نہیں کیا' یہ زیادہ لمبا تھا اور روضہ کی باقی صف کو کاٹتا تھا۔ اس منبر کو رکھنے والے نے اپنے بڑوں کی پیروی کی تھی اور نگرانِ عمارت نے منبر رکھتے وقت شگاف کی پرواہ نہ کی تھی' اسے یونہی رہنے دیا اور یہ منبر زمین میں جلے ہوئے منبر سے تین چوتھائی چھوٹا تھا اور جلے ہوئے منبر کی طرح بیٹھنے کی جگہ سمیت اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔

منبر پر غلاف

جمعہ کے دن منبر کے دروازے پر سیاہ ریشمی پردہ ڈالا جاتا ہے جس پر سفید ریشم کی لکھائی کی گئی ہوتی ہے اور یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ پہلے منبر پر کس نے غلاف چڑھایا تھا۔

حضرت ہشام بن عروہ کے مطابق حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ کے منبر شریف پر قبطی چادر ڈالا کرتے تھے' ایک عورت نے اسے چرا لیا اور ٹکڑے کر دیا تھا۔

ابن نجار نے بتایا کہ آج تک جتنے بھی خلفاء ہوئے ہیں' ہر سال سیاہ ریشمی چادر بھیجا کرتے تھے جس پر سونے کا کام کیا ہوتا اور وہ منبر پر چڑھائی جاتی تھی۔ ابن نجار کہتے ہیں کہ جب پردے بہت سے جمع ہو گئے تو انہوں نے لے کر انہیں حرم کے دوسرے دروازوں پر لٹکا دیا۔

دروازوں پر پردے

میں بتاتا ہوں کہ خلیفہ معتصم کے قتل کے بعد مصر سے پردہ لانے کا حکم صادر کر دیا گیا جیسا کہ زین مراغی نے لکھا ہے کہ ''آج کل دروازوں پر پردے ڈالنے مستقل کر دئے گئے ہیں۔'' راوی کہتے ہیں کہ پردوں کی نمائش وہ اس وقت کرتے تھے جب امیر مدینہ نے حاضری دینا ہوتی تھی۔ عنقریب ذکر آ رہا ہے کہ حجرہ مقدسہ اور کعبہ شریفہ پر پردہ ڈالنے کے لئے مصر کا ایک گاؤں وقف کر دیا گیا تھا چنانچہ کعبہ شریف پر غلاف تو سال میں ایک مرتبہ ڈالا جاتا ہے مگر منبر اور حجرہ مبارکہ پر ہر چھ سال میں ایک مرتبہ ڈالا جاتا ہے۔

علامہ مجد کہتے ہیں کہ منبر کے لئے تقریباً ہر سات سال بعد مصر سے سلطان معظم لباس بھیجتے ہیں جسے ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ڈالا جاتا ہے پھر دو سیاہ خوبصورت بنے ہوئے جھنڈے خطیب کے سامنے منبر کی دونوں جانب دروازے کے قریب بلند کئے جاتے ہیں۔

(قلت) ہمارے اس زمانے میں سات سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ وہ چادر نہیں پہنچی اور جو ان دنوں منبر پر ڈالی گئی ہے' وہ ایسا پردہ ہے جس کا ذکر ان دو جھنڈوں کے ساتھ اوپر گذرا جن کا ذکر علامہ مجد نے کیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

فصل نمبر ۵

مسجد شریف کے فضائل

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ٥

"بے شک وہ مسجد کہ پہلے ہی دن سے جس کی بنیاد پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو اس میں وہ لوگ ہیں کہ خوب ستھرا ہونا چاہتے ہیں اور ستھرے اللہ کو پیارے ہیں۔"

تقویٰ پر رکھی گئی بنیاد والی مسجد

مسلم شریف کے مطابق حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اپنی ایک زوجۂ محترمہ کے گھر میں تھے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کہ دو مسجدوں (بیت اللہ اور مدینہ کی مسجد) میں سے کونسی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے؟ آپ نے کنکروں سے بھری مٹھی زمین پر دے ماری اور فرمایا: وہ تمہاری یہی مسجد ہے یعنی مسجد مدینہ!

احمد و ترمذی میں انہی سے روایت ہے: دو شخص اس مسجد کے بارے میں بحث کرنے لگے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی ایک نے کہا کہ وہ حضور ﷺ کی مسجد ہے چنانچہ دونوں نے اس بارے میں آپ سے پوچھا تو فرمایا وہ یہی مسجد (مدینہ) ہے اور اس مسجد (قباء) میں بڑا ثواب ملتا ہے۔

حضرت مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ مسجد جس کے بارے میں آتا ہے کہ پہلے ہی دن اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی رسول اللہ ﷺ کی مسجد تھی یعنی مسجد مدینہ پھر بتایا: حضور ﷺ کہاں کھڑا ہوا کرتے تھے؟ کیا یہاں کھڑے نہ ہوتے تھے؟ اور یہ لوگ ان کے پاس وہاں سے آتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا○

"اور جب انہوں نے کوئی تجارت یا کھیل دیکھا اس کی طرف چل دئے اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے۔"

چنانچہ رسول اللہ ﷺ ہی کی مسجد ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھتا یا فرمایا کہ نہ سنتا (حضرت عمر نے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا کہ یوں!) تو میں بھی اسے مقدم نہ کرتا اور پھر اسے آج کے مقصورہ کی جگہ مقدم کر دیا۔ انتہٰی۔

ابن رشد کا بیان ہے (امام مالک نے جو کچھ لکھا ہے) یہ حضور ﷺ سے روایت ہے۔

ایک گروہِ علماء کا کہنا یہ ہے کہ یہ مسجد (تقویٰ پر بنیاد والی) قباء ہے اور اس پر اس روایت کے ذریعہ انہوں نے دلیل لی ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے اگروہِ انصار! اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں بہتری کا بیان کیا ہے۔ الحدیث

ابن رشید نے کہا کہ اس میں تو کوئی بھی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ تو اس وقت رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں تھے کیونکہ وہ مہاجرین و انصار اور دیگر لوگوں سے بھری تھی۔ انہوں نے کہا کہ امام مالک کا حضرت عمر کے قول سے دلیل پکڑنا ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ذکر کیا کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب آیت میں ذکر فرمایا کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے تو اس کی تعمیر توڑنا اور قبلہ تبدیل کرنا جائز نہیں جانا' ہاں صرف اس صورت میں جائز قرار دیا ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ سے سنا ہے اور دیکھا کہ آپ نے اس چیز کا ارادہ کیا ہے۔

(قلت) یہ جو امام مالک نے ذکر کیا ہے کہ اس سے مسجد مدینہ ہی مراد ہے یہ بات ہمارے گذشتہ بیان سے ظاہر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ (پہلے ہی دن سے) یہ چاہتا ہے کہ وہ مسجد قباء تھی کیونکہ اوّل یوم کہنے کا یہ مقصد تو بنتا ہی نہیں کہ دنیا میں پہلا دن مراد ہے بلکہ وہ دن مراد ہے جس میں آپ دار الہجرت میں داخل ہوئے تھے اور اس دن میں تو مسجد قباء ہی بنتی ہے ہاں اگر وہ دعویٰ کریں کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں آمد پر پہلے ہی دن مسجد مدینہ کی بنیاد رکھی تھی (تو پھر اس کی اولیت ثابت ہوسکتی ہے) یا یہ کہا جائے کہ پہلے دن سے مراد اس کی بنیاد کا دن ہے۔ مسجد قباء کے بارے میں تو کچھ ایسی چیزیں آ رہی ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ اس سے یہی مراد ہے لہٰذا دونوں روایتوں کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کے بارے میں یہ کہنا سچا ہے کہ دونوں ہی کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی تھی اور یہ بات ہر ایک ہی جانتا ہے اور یہی اس آیت سے مراد ہے لیکن اس میں یہ مشکل ضرور پیش آتی ہے کہ جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا تھا تو جواب میں آپ نے مسجد مدینہ کو معین فرما دیا تھا' ہاں اس میں راز کی بات یہ ہے کہ آپ نے اس وقت یہ وہم دور کرنے کا ارادہ فرمایا تھا کہ یہ آیت مسجد قباء کے ساتھ خاص ہے جیسے ظاہر ہے کہ سائل یہ بات جانتا ہے اور چونکہ یہ مسجد بہت فضیلت رکھتی ہے لہٰذا اس کا مرتبہ بلند دکھانے کے لئے ارادہ فرمایا تھا۔ (واللہ اعلم)

مسجد رسول اللہ ﷺ کی فضیلت

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے: ''تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سواری لے کر نہ جایا کرو' ایک تو میری یہ مسجد (مدینہ)' مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔''

امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سفر صرف تین ہی مسجدوں کی طرف کیا جائے' وہ کعبہ' میری مسجد اور مسجد ایلیاء ہے۔ (بیت المقدس) امام ابو داؤد نے یہ الفاظ لئے ہیں: ''کہ میری اس مسجد کی طرف۔''

صحیح ابن حبان وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے: جن مسجدوں کی طرف لوگ سواریوں پر جاتے ہیں' ان میں میری یہ مسجد اور بیت العتیق (مسجد کعبہ) شامل ہے۔

بزاز کے الفاظ یہ ہیں: ''لوگ جس طرف سواریوں پر جاتے ہیں' ان سب سے بہتر مسجد ابراہیم علیہ السلام اور مسجد محمد ﷺ ہیں۔''

مسجد رسول اللہ ﷺ میں نماز پڑھنے کی فضیلت

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لینا' مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ہزار نماز پڑھنے سے زیادہ درجہ رکھتا ہے۔ یہ الفاظ بخاری شریف کے ہیں اور مسلم شریف میں ہے: ''کیونکہ میں انبیاء سے آخر میں آیا ہوں اور میری یہ مسجد' مسجدوں میں سے آخری ہے۔''

میں کہتا ہوں کہ ''مسجدوں میں سے آخری'' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انبیاء میں سے کسی بھی نبی کی یہ آخری مسجد ہے کیونکہ یہ معنٰی مراد نہ ہوں تو یہ فرمان صحیح نہ ہوگا کیونکہ اُمت کے لئے تو مسجد سب سے پہلی ہے اور جب ثابت ہوگیا کہ ''آخر المساجد'' کے الفاظ میں الف اور لام ''عہد'' کے لئے ہے اور معنٰی نبیوں کی مسجدیں ہیں تو پھر ساتھ والی پہلی حدیث کے الفاظ ''ما سواہ من المساجد'' میں بھی یہ الف لازم ''عہد'' کے لئے ہوگا اور معنٰی یہ ہوگا کہ آپ کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب دوسرے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کی مسجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ہوگا جس کا صاف مقصد یہ بنا کہ آپ کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب' بیت المقدس کی مسجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے زیادہ ہے کیونکہ یہ تو ان انبیاء کی مسجدوں ہی میں سے ایک مسجد ہے' اسے ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور پھر حضرت ابو سعید کی بزاز والی حدیث بھی اس کی دلیل بنتی ہے' انہوں نے کہا: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو الوداع کہا تو آپ نے پوچھا' کہاں کا ارادہ ہے؟ تو انہوں نے عرض کی: بیت المقدس کو جا رہا ہوں' اس پر آپ نے فرمایا: میری اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب' مسجد حرام کے علاوہ کسی بھی مسجد میں ایک ہزار نماز کے ثواب سے زیادہ ملتا ہے۔ یحییٰ نے اسی حدیث میں اضافہ کرتے ہوئے اس آدمی کا نام بتایا ہے کہ وہ ارقم تھے کیونکہ ادھر جانے کی تیاری انہوں نے ہی کی تھی اور جب وہ تیاری کر چکے تو الوداع کہنے کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اسی حدیث میں آگے آتا ہے کہ وہ ارقم بیٹھ گئے اور گئے نہیں۔ ابن نجار نے حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ دئے ہیں: ''میں بیت المقدس کو جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: کیوں؟ میں نے عرض کی' اس میں نماز پڑھنے کا ارادہ ہے' اس پر فرمایا: یہاں (مسجد نبوی) کی ایک نماز' وہاں کی ہزار نماز سے زیادہ ثواب رکھتی ہے۔ طبرانی نے بھی حضرت ارقم سے روایت کی کہ فرمایا: یہاں ایک نماز کا ثواب وہاں کی ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

ابو یعلی نے حضرت سیّدہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت یہ دی' انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! ہمیں بیت المقدس کے بارے میں کچھ بتایئے' آپ نے فرمایا کہ یہ محشر بپا ہونے کی زمین ہے اور یہیں سے لوگ اُٹھائے جائیں گے' اس لئے یہاں آؤ اور اس میں نماز پڑھو کیونکہ اس میں ایک نماز کا ثواب دیگر انبیاء کی مسجدوں میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے زیادہ ہے (یعنی دیگر انبیاء کی مسجدوں کے علاوہ اور ان کی مسجدیں ان دو مسجدوں سے الگ شمار ہوتی ہیں' (بیت اللہ و

بیت المقدس) کیونکہ اس کے لئے دلیل موجود ہے لہٰذا مدینہ کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب' مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ دوسری مسجدوں میں نماز پڑھنے سے دس لاکھ گنا زیادہ ہے جبکہ مسجد اقصیٰ کے مقابلہ میں مسجد مدینہ ہزار گنا زیادہ ثواب رکھتی ہے اور پھر اس سے زیادہ ثواب تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا زیادہ ہے' یہی وجہ ہے کہ اس کی طرف سفر کا حق بتایا گیا ہے' اب احمد کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کردہ حدیث کے ذریعہ اس پر یہ اعتراض نہیں ہونا چاہیے جس میں انہوں نے بتایا: حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''میری اس مسجد میں ایک نماز کا ثواب مسجد اقصیٰ کے علاوہ دوسری مسجدوں سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے'' کیونکہ مسجد حرام کا ثواب بتانا ابھی باقی ہے اور پھر بخاری میں یہ حدیث ان الفاظ کے علاوہ موجود ہے: ''مگر مسجد اقصیٰ'' اور یہ پہلی روایت سے ٹکراتی ہے اور پھر ہیثمی نے بھی یہ حدیث مجمع الزوائد میں ذکر کر کے کہا کہ اسے احمد نے روایت کیا ہے اور پھر بیان بھی کر دیا اور کہا: ''مسجد حرام کے علاوہ'' جس سے ہمارا کہا واضح ہو گیا۔

رہی مسجد حرام تو اس کو الگ کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ حضرت مالک کہتے ہیں کہ اسے الگ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسجد رسول میں ایک نماز کا ثواب مسجد حرام کے علاوہ باقی تمام مسجدوں میں نماز سے ہزار گنا زیادہ ہے کیونکہ مسجد نبوی میں نماز افضل تو ہے مگر ہزار گنا نہیں۔

کچھ علماء فرماتے ہیں کہ مسجد مدینہ میں ایک نماز کا ثواب مسجد مکہ سے ایک سو گنا زیادہ ہے اور پہلی حدیث میں اس استثناء کا مطلب انہوں نے یہی لیا ہے' ان کے پاس دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی کہ: ''مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے سے سو گنا زیادہ ہے'' تو مسجد حرام پر مسجد رسول کی فضیلت نو سو گنا ہوئی جبکہ دوسری مسجدوں پر ہزار گنا زیادہ ہے اور اس کے پیچھے یہ حدیث ہے کہ: مسجد حرام میں نماز کا ثواب دوسری مسجدوں کے مقابلہ میں ہزار گنا ہے البتہ مسجد رسول الگ ہے کیونکہ اسے اس پر سو گنا فضیلت حاصل ہے۔

میں کہتا ہوں' طبرانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث ملتی ہے کہ: مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے سے ایک سو گنا زیادہ ہے' لیکن اس میں سوید بن عبد العزیز راوی موجود ہے جس کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ اس کی حدیث محل نظر ہے جس میں احتمال نہیں ہے اور اس میں دوسرے علماء کی روایت کا رڈ ہے چنانچہ بزاز اور ابن خزیمہ کے مطابق حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں: ''میری مسجد میں ایک نماز کا ثواب مسجد حرام کے علاوہ دیگر مسجدوں میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ہے اور مسجد حرام میں نماز کا ثواب اس میں نماز سے سو گنا زیادہ ہے۔'' لیکن بزاز کے الفاظ یہ ہیں: میری اس مسجد میں نماز کا ثواب مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں سے ہزار گنا زیادہ ہے کیونکہ یہاں کی نماز کا ثواب اس سے سو گنا زیادہ ملتا ہے' اس میں تو احتمال موجود ہے کہ ''فانّہ یزید'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر آپ کی مسجد کی طرف لوٹتی ہو یا پھر مسجد حرام کی طرف' یہاں

ابن عبد البر نے حدیث احمد کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ: جھگڑے کی صورت میں یہی حدیث ہماری دلیل بنتی ہے اور اختلاف کے ایسے موقع پر یہ ہمارے لئے نص ہے' یہ ایسے شخص کو دلاتی ہے جس کے دل میں ہدایت ہے اور وہ عصبیت سے بچا ہوا ہے۔ابن عبد البر کہتے ہیں کہ حدیث احمد میں صرف ایسے شخص ہی کو اعتراض ہوسکتا ہے جو حبیب ﷺ کی روایت کو اہمیت نہیں دیتا' حضرت امام احمد تو ان کی تعریف کرتے تھے' انہیں پختہ جانتے تھے اور ان کی ثناء کیا کرتے تھے اور پھر عبد الرحمٰن بن مہدی ان سے روایت بھی کرتے تھے البتہ قطان نے ان سے روایت نہیں کی' مزید برآں قابل تقلید ائمہ و علماء نے ان سے روایت کی ہے۔ان میں سے بعض علماء وہ ہیں جنہوں نے اسے عطاء کی مخالفت کا سبب بنایا ہے کیونکہ کچھ علماء اسے انہیں سے بذریعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں اور دوسرے بذریعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور پھر کچھ بذریعہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں' کچھ علماء ایسے بھی ہیں کہ جو ایسی حدیث کو حدیث کے معاملے میں سبب قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسا ہونہیں سکتا کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت عطاء کی حدیث ان سے روایت ہو کیونکہ لازم یہ آتا ہے کہ عادل لوگوں کی خبر دلیل کے بغیر نقل نہ کی جائے۔

علامہ بزاز کہتے ہیں کہ یہ حدیث عطاء سے روایت ہے جس میں ان سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہمیں ابن زبیر کے علاوہ ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ یہ مدینہ کی مسجد سے سو درجہ زیادہ ہے' عبد الملک بن ابو سلیمان نے ابن عمر کے ذریعے اسے عطاء سے نقل کیا ہے' ابن جریج نے حضرت ابوہریرہ یا سیّدہ عائشہ کے ذریعے اسے عطاء سے نقل کیا اور ابن ابو لیلیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعے عطاء سے روایت کیا ہے۔انتہی۔

علامہ ذہبی نے مختصر سنن بیہقی میں اسی سند کو اچھا کہا ہے جبکہ سنن والوں نے اسے روایت نہیں کیا۔میں کہتا ہوں کہ یہ دوسری بات ہے اور وہ یوں کہ جب حدیث مذکور کے الفاظ میں اختلاف نظر آیا تو اس کی دو وجہیں ہیں' ایک یہ کہ یہ دلالت میں نص نہیں بنتی جیسے ہم بیان کر آئے' احتمال یہ ہے کہ روایت حقیقۃً یونہی ہو اور جس نے دوسرے طریقے سے روایت کی' اس نے اپنی سمجھ کے مطابق اسے اور معنٰی پہنائے البتہ دوسرے طریقے سے ان الفاظ کا آنا اس احتمال کو کمزور کرتا ہے اور یہ ثابت ہے تو پھر یہ ابن زبیر سے روایت شدہ ہے جنہیں اپنی روایت کی پوری سمجھ ہوتی ہے کیونکہ عبد الرحمٰن نے ابن جریج سے روایت کی ہے' وہ کہتے ہیں مجھے سلیمان بن عتیق اور عطاء نے بذریعہ ابن زبیر بتایا کہ انہوں نے ان دونوں سے سنا کہ: ''مسجد حرام میں ایک نماز مسجد نبوی سے سوگنا زیادہ ثواب رکھتی ہے جبکہ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے راوی جلیل القدر علماء ہیں پھر ابن وضاح نے خود کلام عمر بن خطاب کے کلام سے اسے بذریعہ ابن زبیر روایت کیا' ابن حزم کہتے ہیں کہ صحیح ہونے میں اس کی سند سورج کی طرح واضح ہے۔پھر ابن ابی خیثمہ اپنے والد سے راوی' انہوں نے کہا: مجھے مسلم نے حجاج سے' انہوں نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی' فرمایا: مسجد حرام میں نماز پڑھنا مسجد نبوی میں نماز سے سوگنا دوگنا اجر رکھتی ہے۔فرماتے ہیں' ہم نے حساب لگایا تو یہ تمام مسجدوں سے ایک لاکھ گنا اجر والی بنتی ہے۔ابن عبد البر کہتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات

جلیل القدر صحابی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسجد حرام' مسجد نبوی پر فضیلت رکھتی ہے اور پھر صحابہ میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی چنانچہ یہ ان کی طرف سے اس بات پر گویا اجماع ہے۔

ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ ''میری مسجد میں ایک نماز' مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں سے ہزار گناہ افضل ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز دوسری مسجدوں کے مقابلے میں ایک لاکھ گناہ زیادہ اجر رکھتی ہے' کچھ نسخوں میں الفاظ یہ ہیں: دوسری مسجدوں سے سوگنا زیادہ ہے چنانچہ پہلی روایت کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ مسجد مدینہ کو چھوڑ کر یہ اجر ہے اور دوسری روایت کے مطابق معنی ہوگا: ''مسجد مدینہ میں سونماز پڑھنے سے'' چونکہ حضرت جابر سے یہ روایت گذر چکی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یحییٰ نے بخاری و مسلم کی حدیث حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے ان الفاظ میں روایت کی ہے: میری اس مسجد میں ایک نماز' کعبہ کے علاوہ دوسری مسجدوں سے ہزار گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔نسائی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ ''مسجد کعبہ کے علاوہ'' اور یہی وجہ ہے کہ کچھ علماء یہ بتاتے ہیں کہ مسجد حرام سے مراد کعبہ ہے' ہمارے شافعی حضرات میں سے علامہ عمرانی کا بھی یہی کہنا ہے۔پھر بزاز نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے: ''میں خاتم الانبیاء ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مسجدوں کے لئے خاتم ہے' تمام مسجدوں سے مسجد حرام اور میری مسجد کا یہ حق ہے کہ ان کی زیارت کی جائے اور تیاری کر کے ان کی طرف سفر کیا جائے اور میری مسجد میں ایک نماز کا اجر مسجد حرام کو چھوڑ کر باقی مسجدوں سے ہزار گنا زیادہ ہے۔''

ابن ماجہ نے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ: ''گھر میں آدمی نماز پڑھے تو ایک نماز کا ثواب ہوگا' قبیلوں کی مسجد میں پچیس کا' جمعہ والی مسجد میں سو نماز کا' مسجد اقصیٰ میں پچاس ہزار کا' میری مسجد میں بھی پچاس ہزار کا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ کا اجر ملے گا۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد مدینہ میں نماز کا اجر مسجد بیت المقدس کے برابر ہے اور دونوں میں نماز کا ثواب مسجد حرام سے آدھا ہے حالانکہ یہ روایت صحیح بخاری کے خلاف ہے اور پھر گنتی کا مفہوم شمار میں نہیں ہوتا لہٰذا یہ اس ثواب کی نفی نہیں کر سکتا جو مسجد بیت المقدس کے مقابلے میں مسجد مدینہ کو حاصل ہے اور خصوصاً اس طریقے پر جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

طبرانی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: مسجد حرام میں نماز کا ثواب ایک لاکھ ملتا ہے' میری مسجد میں ایک ہزار اور مسجد بیت المقدس میں پانچ سو ملتا ہے۔علامہ مجد کہتے ہیں کہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث ترمذی میں مجھے نہیں مل سکی البتہ ابن عبد البر نے اسے اپنی دلیل بنایا ہے اور یہ ہماری ذکر کردہ اس حدیث کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی بس میں آتا ہے کہ: مسجد مدینہ میں نماز کا ہونا بیت المقدس میں نماز سے ہزار گنا سے افضل ہو کیونکہ گنتی' زائد کی نفی نہیں کرتی یونہی طبرانی کی اوسط میں حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث

ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں تھے' فضیلت کا ذکر چھڑ گیا کہ مسجد رسول اللہ ﷺ اور بیت المقدس میں سے کونسی افضل ہے؟ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں نماز' بیت المقدس میں بڑھی ہوئی چار نمازوں سے افضل ہے اور ایسا نمازی اچھا ہوگا'' اور اس معاملے میں بھی وہی کچھ کہا جائے گا جو ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ: احتمال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے وحی کی بناء پر پہلے کچھ ثواب کی خبر دی اور پھر بعد میں یہ ثواب بڑھا دیا گیا چنانچہ قلیل ثواب والی حدیث اکثر ثواب والی سے پہلے ہوگی اور پھر مساجد میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑی تھوڑی کر کے فضیلت دی اور ہماری تحقیق کے مطابق زیادہ ثواب والی حدیث کو لیا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نمازوں کی یہ گنتی حالات کے بدلنے پر گھٹتی بڑھتی ہو کیونکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

کیا تین مسجدوں کی یہ فضیلت صرف فرض نمازوں سے تعلق رکھتی ہے؟

علامہ زرکشی کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز دس ہزار نمازوں کے برابر ہے' مسجد حرام میں اس سے دس گنا یعنی ایک لاکھ کے برابر ہے' بیت المقدس میں ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر ہے اور گھر میں اس جگہ ان سب سے زیادہ ہے جہاں اسے کوئی نہ دیکھے۔''

میں کہتا ہوں کہ یہ ضعیف ہے ان تین مسجدوں میں نماز کی فضیلت بتاتے ہوئے مجمع میں علامہ ہیثمی نے اسے بیان نہیں کیا ہے۔ یہ دوگنا مذکورہ ثواب' ان مسجدوں میں فرض نمازوں سے خاص نہیں ہے بلکہ فرض ہوں یا نفل سب میں دوگنا ہوتا ہے جیسے علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسے اپنا مذہب قرار دیا ہے۔

حنفی حضرات میں سے علامہ طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ خصوصیت صرف فرضوں کو حاصل ہے جبکہ نوافل گھر ہی میں پڑھنا افضل ہیں' مالکیوں میں سے ابن ابی زید کا بھی یہی بیان ہے' ان کے نزدیک اسی کو ترجیح حاصل ہے لیکن کچھ حضرات فرق بتاتے ہیں کہ مسجد کے خالی ہونے اور نہ ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ (خالی میں زیادہ اور دوسری میں کم ثواب ہوتا ہے)۔

اگر کہا جائے کہ تم کیونکر یہ کہتے ہو کہ دوگنا ثواب ہونا فرض اور نفل دونوں میں ہوتا ہے جبکہ ہمارے ساتھیوں کا اتفاق ہے اور حدیث صحیح واضح طور پر بتاتی ہے کہ نفل گھر میں پڑھنا انسان کے لئے افضل ہوتا ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ مسجد میں دوگنا ثواب ملنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گھر سے افضل ہے جیسے زرکشی وغیرہ نے کہا' زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز پر فضیلت ہے وہ صاحب فضیلت سے بڑھ گئی ہے لہٰذا اس بناء پر اسے افضل تو نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اگر اس چیز کو کچھ فضیلتیں حاصل جس پر دوسری شے افضل ہے تو اس افضل میں بھی فضیلتیں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے تاج سبکی کی اپنے والد سے قربانی والے دن منی میں ظہر کی نماز کے بارے بحث ہوگئی تھی کہ ہم نے اسے دوگنا بنانے سے خارج کر رکھا ہے' بحث یہ تھی: کیا ظہر کی نماز مسجد میں دوگنا ثواب والی ہوگی؟ کیونکہ حضور ﷺ

نے اسے منی میں ادا کیا تھا یا پھر مسجد میں؟ ان کے والد نے کہا تھا کہ منی میں افضل ہے اگرچہ اس میں دوگنا ثواب نہیں ملتا کیونکہ حضورﷺ کے افعال کی اقتداء کو وہ حیثیت حاصل ہے جو دوگنا ثواب سے بڑھ سکتی ہے علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے وہ بات ذکر کی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ یا مدینہ کے اندر گھروں میں نفل پڑھنا دوگنا ثواب دیتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا یہ فرمان (مکہ و مدینہ) کے لئے عام ہے کہ: ''فرض کے علاوہ انسان کی افضل نماز وہ ہے جو وہ گھر میں پڑھا کرے۔'' جبکہ اس سے پہلے علامہ طحاوی سے وغیرہ سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ دوگنا ثواب صرف فرائض سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس کے لئے یہ حدیث ہے: آدمی کے لئے فرائض کے علاوہ اس نماز کا ثواب زیادہ ہوتا ہے جو وہ گھر میں پڑھے۔'' یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کا عام معنٰی مراد لینا منع نہیں ہے کیونکہ مدینہ اور مکہ میں گھر کے اندر نفل نماز پڑھنا ان دونوں کے علاوہ اور گھروں میں پڑھنے سے افضل ہے' یوں ان دونوں میں پڑھنا (بہرحال افضل ہے) اگرچہ مطلقاً گھروں میں پڑھنا فضیلت رکھتا ہے۔

نماز کا ثواب کیسے بڑھتا ہے؟

یہ ثواب کا بڑھنا یوں ہوتا ہے کہ ایک پوری نماز کی گنتی کے مطابق ثواب بڑھایا جائے گا' اس میں نماز کے اجزاء (رکعتیں) مراد نہیں ہوتیں اور اس پر علماء کا اتفاق ہے جیسے علامہ نووی نے وغیرہ نے ذکر کیا ہے لہٰذا اگر کئی نمازیں ہوں اور وہ ان دونوں مسجدوں میں سے ایک کے اندر ایک نماز پڑھے تو اسے ایک ہی ثواب ملے گا اور ابوبکر نقاش کی اپنی تفسیر میں گفتگو اس کے خلاف ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: میں نے مسجد حرام میں نماز کا حساب لگایا تو مسجد حرام میں پڑھی جانے والی ایک نماز کا ثواب پچپن سال چھ ماہ اور بیس راتوں کی نمازوں جتنا ہو جاتا ہے (اھ) اور یہ اجر جماعت کے ساتھ ثواب بڑھنے اور مسواک وغیرہ کرکے پڑھنے سے قطع نظر کرکے ہے لیکن کیا ثواب کا یہ بڑھنا جمع ہو سکتا ہے یا نہیں تو اس میں بحث کی گنجائش باقی ہے۔

کیا کئی گنا ثواب کا ہونا صرف نماز سے تعلق رکھتا ہے؟

میں کہتا ہوں ثواب کا یہ بڑھنا صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر قسم کی عبادات میں یونہی ہونا چاہیے کیونکہ ہم اسے اس پر قیاس کریں گے جو نماز میں ثابت ہوا ہے جیسے علماء نے مکہ مکرمہ کی مسجد میں اسے وضاحت سے لکھا ہے اور پھر صاحب ''الانتصار'' علامہ ابوسلیمان داؤد مالکی نے بھی مدینہ سے متعلق چیزوں میں صراحت سے لکھا ہے پھر احیاء میں غزالی سے بھی میں نے یہی کچھ لکھا دیکھا ہے جیسے ہم فصل خصائص میں بتا چکے ہیں اور پھر طبرانی نے بھی اسے بلال بن حارث سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مدینہ میں رمضان کا ثواب دوسرے شہروں کے مقابلے میں ہزار گناہ زیادہ ہوتا ہے یونہی مدینہ منورہ میں جمعہ پڑھنا دوسرے شہروں میں پڑھنے کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اجر رکھتا ہے۔''

میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن جوزی نے بھی "شرف المصطفیٰ" میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ الفاظ دئے ہیں: مدینہ میں ماہِ رمضان کے روزے رکھنا یوں ہے جیسے دوسری جگہ ایک ہزار ماہ کے رکھے اور مدینہ میں نماز جمعہ پڑھنا یوں ہے جیسے اس نے کسی دوسری جگہ ہزار جمعہ پڑھا۔

حضرت بیہقی بذریعہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری اس مسجد میں نماز پڑھنا مسجد الحرام کے علاوہ کہیں اور پڑھنے کے مقابلے میں ہزار گنا ثواب کا باعث ہے اور میری اس مسجد میں جمعہ پڑھنا مسجد حرام کے علاوہ کہیں اور جمعہ پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ثواب کا باعث ہے پھر میری مسجد میں ماہِ رمضان کی عبادت مسجد الحرام کو چھوڑ کر کہیں اور کرنے سے ہزار گنا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔"

یہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں لیکن جب ہم انہیں نماز پر قیاس سے ملا کر دیکھیں تو استدلال پورا ہو جائے گا۔ ہم حضور ﷺ کی مسجد کی حد بندی میں یہ اختلاف اس حدیث کے ماتحت لکھ چکے ہیں "صلوٰۃ فی مسجدی ھذا" اور یہ بتا چکے ہیں کہ ترجیحی طور پر یہ ثواب ہر عبادت میں بڑھتا ہے۔

احمد و طبرانی نے اوسط میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث بیان کی ہے: "جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں پڑھیں (اس پر طبرانی نے مزید لکھا کہ اس دوران اس کی کوئی نماز رہ نہ جائے تو وہ آگ سے بچایا جائے گا' اسے عذاب نہیں ہوگا اور وہ منافق نہیں رہے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب بھی تم میں سے کوئی میری مسجد کو روانہ ہوتا ہے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک قدم ہر گناہ ختم کر دیا جاتا ہے۔"

فضیلت قباء بیان کرنے کے بعد علامہ بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "جو پاک صاف ہو کر میری اس مسجد کی طرف نماز پڑھنے چلا تو اسے حج کا ثواب ملے گا۔"

ابن زبالہ کے الفاظ یہ ہیں: جو پاک صاف ہو کر گھر سے میری مسجد کی طرف چلا اور نماز کے علاوہ اس کا اور کوئی ارادہ نہ ہو' وہ نماز پڑھے تو اسے حج کا ثواب ملے گا۔

حضرت سہل بن سعد کی حدیث ہے: "جو شخص میری مسجد میں بھلائی سیکھنے یا سکھانے کے لئے داخل ہو تو وہ ایسے ہو گا جیسے راہِ خدا میں جہاد کرنے والا ہوتا ہے اور جو اس کے علاوہ صرف لوگوں سے باتیں کرنے گیا تو وہ ایسے شخص کی طرح ہوگا جو غیر کے ہاتھوں میں ہو کر عجیب بات دیکھے۔"

ابن ابو حازم کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تھا: جو شخص میری مسجد میں بھلائی یا کچھ سیکھنے کے لئے داخل ہو' کوئی اور ارادہ نہ ہو تو وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہوگا اور جو لوگوں سے باتیں کرنے کی خاطر گیا تو وہ ایسے نامناسب کام دیکھے گا جو غیر کے ہاتھ میں ہوتے ہوئے دیکھے۔"

ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: ''جو بھی شخص میری اس مسجد میں آئے' بھلائی سیکھنے اور سکھانے کا ارادہ ہو تو وہ راہِ خدا میں مجاہد کا درجہ لے گا اور جو اس مقصد کے علاوہ آنے کا ارادہ کرے تو وہ ایسا ہوگا جو غیر کے سامان کی طرف دیکھنے والا ہوتا ہے۔''

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص میری اس مسجد میں نماز' ذکر خدا' بھلائی سیکھنے یا سکھانے کے لئے داخل ہوتا ہے تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: کوئی بھی مومن صبح یا شام مسجد کو آتا ہے اور ان اوقات میں اس کا مقصد بھلائی سیکھنا یا سکھانا یا ذکر اللہ کرنا یا کرانا ہوتا ہے تو کتاب اللہ میں اس کی مثال اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے جیسی ہوتی ہے اور جو شخص مسجد میں صبح و شام لوگوں سے باتیں کرنے سننے کے لئے آتا ہے تو کتاب اللہ میں اس کی مثال ایسے شخص کی طرح ہوتی ہے جو کوئی عجیب شے دیکھ رہا ہے اور نمازیوں کو دیکھتا ہے حالانکہ ان میں شمار نہیں ہوتا پھر ذکر کرنے والوں کو دیکھتا ہے حالانکہ خود ذکر نہیں کرتا۔

حضرت ابوسعید مقبری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے خیال میں تم میں سے ہر ایک کے گھر میں مسجد تو نہیں ہوتی۔ صحابہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا بخدا! تو پھر اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے تو اپنے نبی کی مسجد کو چھوڑ بیٹھو گے' اگر تم نے اپنے نبی کی مسجد چھوڑ دی تو ان کی سنتیں بھی چھوڑو گے اور اگر تم نے ان کی سنتیں ترک کر دیں تو گمراہ ہو جاؤ گے۔''

بخاری شریف میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: (یہ خیبر کا موقع تھا) ''تم میں سے جو اس تھوم کو کھائے' وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آیا کرے۔''

کرمانی ذکر کرتے ہیں کہ یہ روکاوٹ صرف رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے بارے میں ہے کیونکہ یہاں وحی لانے والے فرشتے ہوتے ہیں لیکن اکثر علماء کہتے ہیں کہ ہر مسجد کے بارے میں یہی حکم ہے۔ انتہیٰ۔

فصل نمبر۶

بلند مرتبہ منبر اور ریاض الجنہ کی فضیلت

بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مازنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے' رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے گھر اور منبر کے درمیان جنت کی ایک کیاری موجود ہے۔'' امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے ذریعے اس میں یہ اضافہ نقل کیا ہے: ''میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہوا ہے۔''

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق آپ فرماتے ہیں: ''میرے گھر سے میرے منبر تک جنت کی ایک کیاری موجود ہے اور میرا منبر جنت کے ایک دروازے پر ہے۔''

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرا منبر جنت کے دروازے پر ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے یحییٰ نے یہ الفاظ لئے ہیں: ''(منبر) جنت کے کھلے سبزہ زار (چراگاہ) میں ہے۔'' ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''جب بھی تم جنت کی کیاریوں پر پہنچو تو اس میں چرا کرو۔''

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: میرے منبر کے پائے جنت میں درجے (سیڑھیاں) ہوں گے۔ ابن عساکر کی روایت ہے: میرا منبر جنت کے دروازے پر ہے۔

حضرت ابو المعلّٰی انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''میرا یہ قدم جنت کے دروازے پر رکھا ہے۔''

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''اس وقت میں جنت کی نالی پر کھڑا ہوں'' ایک اور روایت میں ہے: ''اس وقت میں حوض پر کھڑا ہوں۔''

حضرت جبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میرے منبر کی ایک جانب حوض کی نالی پر ہے لہٰذا جو اس کے نزدیک بری قسم کھائے گا جس سے وہ کسی مسلمان کا حق چھین لے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں دیکھ لے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی انسان میرے اس منبر کے پاس برے کام کی قسم کھائے گا خواہ وہ سبز مسواک ہی پر کیوں نہ ہو، تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں دیکھ لے یا فرمایا کہ اس کے لئے لازماً دوزخ کا ٹھکانہ ہوگا۔

حضرت ابو امامہ بن ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق آپ نے فرمایا: ''جو شخص میرے اس منبر کے قریب ایسی قسم کھائے کہ جس سے کسی مسلمان کے مال کو اپنے لئے حلال بنا رہا ہو تو اس پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہوگی، اس کا کیا ہوا خرچہ اور انصاف اللہ کو قبول نہ ہوگا۔

اوسط میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، آپ نے فرمایا: میرا منبر جنت کے دروازے پر ہے، میرے منبر اور سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے درمیان جنت کی ایک کیاری موجود ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے: فرمایا: ''میری قبر اور منبر کے درمیان جنت کی ایک کیاری ہے۔''

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ حدیث ملتی ہے، فرمایا: ''میرے گھر اور منبر کے درمیان جنت کی کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔''

حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ: ''میرے گھر اور منبر یا فرمایا: میری قبر اور میرے

منبر کے درمیان جنت کی کیاری ہے۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا: "میرے حجرے اور مصلّٰے کے درمیان جنت کی کیاری ہے۔" حضرت سعد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: "میرے منبر اور مصلّٰے کے درمیان۔" ایک اور روایت میں ہے: "میری مسجد سے مصلّٰے تک درمیان میں جنت کی کیاری ہے۔"

ابو یحییٰ نے نیز یحییٰ نے اخبار مدینہ میں لکھا: "میرے گھر اور مصلّٰے کے درمیان جنت کی ایک کیاری ہے۔" علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد "مصلائے عید" ہے اور کچھ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ آپ کا مصلّٰے وہ جگہ ہے جہاں مسجد میں آپ نماز پڑھتے رہے۔

میں کہتا ہوں، پہلی روایت کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ طاہر کے اپنے باپ یحییٰ کے نسخے سے نقل کرتے ہوئے اس حدیث کے بعد الفاظ یہ ہیں: "میرے والد نے کہا: میں نے بہت سے لوگوں کو کہتے سنا کہ حضرت سعد نے جب یہ حدیث نبی کریمﷺ سے سنی تو انہوں نے اپنا گھر مسجد اور مصلّٰے (عید) کے درمیان بنایا۔

مصنف کے نزدیک ریاض الجنۃ سے مراد؟

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت اس بات کی تائید کرتی ہے جو آگے آ رہا ہے کہ "روضہ" کے لفظ سے عام معنٰی مراد ہے جس میں نبی کریمﷺ کی ساری مسجد اور وہ حصہ بھی آ جاتا ہے جو مغرب کی طرف بڑھایا گیا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن زید مازنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: "میرے ان گھروں سے لے کر منبر تک (درمیان میں) جنت کی ایک کیاری ہے اور میرا منبر جنت کے ایک دروازے پر ہے۔

منبر کے حوض پر ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس کے معنٰی میں علماء مختلف خیالات کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ علامہ خطابی کہتے ہیں کہ "میرا منبر میرے حوض پر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ منبر کے پاس جانا اور یہ بتایا کہ نیک اعمال کرنے کے لئے اس کے پاس ہونا آدمی کو حوض پر لے جائے گا اور حوض سے اس کا پینا لازمی ہو جائے گا۔ باقی حضرات کا بھی قول یہی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا وہ منبر جس پر آپ کھڑے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ اسے بھی دوبارہ ویسے ہی پیدا کر دے گا جیسے دوسری مخلوق کو دوبارہ لے آئے گا اور پھر یہ منبر آپ کے حوض پر ہوگا۔ اس قول پر ابن نجار کا بھروسہ ہے۔

ابن عساکر کے مطابق مراد بعینہٖ آپ کا وہی منبر ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ پھر کہا کہ یہ بہت ظاہر بات ہے اور دیگر حضرات اسی کا اعتبار کرتے ہیں، ان کے شیخ ابن نجار اسی بات میں ان کے پیچھے ہیں۔

تیسرے یہ کہ اس سے مراد وہ منبر ہے جسے اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اس دن پیدا فرمائے گا اور آپ کے حوض پر رکھ دے گا۔

میں کہتا ہوں کہ مجھے ایک چوتھا معنی واضح معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ زمین کے جس ٹکڑے پر یہ منبر موجود ہے' بعینہٖ اسے دوبارہ جنت میں بنا دیا جائے گا اور پھر آپ کے منبر کو جنت کے اندر مناسب شکل میں ایک صورت شکل دے دی جائے گی چنانچہ حوض کی نالی پر یہ منبر رکھ دیا جائے گا' یہ اس کے آخری حصہ میں ہوگا' اسی وجہ سے اسے جنت کے دروازے کا نام دیا گیا ہے۔

حضور ﷺ نے اُمت کے لئے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ نیک عمل کیا کریں کہ جنت تک پہنچ سکیں اور یہ بات درحقیقت پہلے دونوں اقوال کو جمع کرنے کی صورت ہے اور عنقریب زیارت کے بیان میں ابن عساکر کی طرف سے آ رہا ہے کہ زیارت کرنے والا منبر شریف کی طرف آئے' اس کے نزدیک کھڑا ہو اور دُعا کرے۔

جنت کی کیاری کا مطلب؟

ریاض الجنہ کے معنے میں بھی علماء کا اختلاف ہے چنانچہ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: اس سلسلے میں علماء نے جو کچھ کہا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا جنت کے ایک باغ کا ٹکڑا ہے یعنی جیسے وہاں رحمت ہوگی' یہاں بھی ہوتی ہے' یہاں ذکر کے حلقے بنانے پر نیک بختی حاصل ہوتی ہے اور خاص طور پر یہ سلسلہ حضور ﷺ کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔چنانچہ یوں اسے جنت کی کیاری کہنا مجاز ہے' یا یہ مطلب ہے کہ اس میں عبادت کرنا جنت تک لے جاتا ہے' اس معنی کی بناء بھی پر یہ کہنا مجاز ہے یا پھر اس کا معنی ظاہری مراد ہے اور مراد یہ ہے کہ حقیقۃً یہ کیاری ہے جسے جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ تمام ترتیب وار اقوال قوی ہیں اور احتمال یہ ہے کہ پہلا اور آخری قول زیادہ قوی ہوں اور آخری میرے نزدیک سب سے قوی ہے' ابن نجار کا قول یہی ہے چنانچہ برہان بن فرحون نے اپنی ''منسک'' میں اسے ابن جوزی وغیرہ سے اور انہوں نے حضرت مالک سے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ''میری قبر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی ایک کیاری ہے۔''

حضرت مالک نے اس کے ظاہری معنٰی مراد لئے ہیں چنانچہ ابن جوزی نے ان سے نقل کیا ہے کہ یہ جنت کی ایک کیاری ہے جسے جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور یہ باقی زمین کی طرح نہیں کہ ختم اور فنا ہو جائے۔بہت سے علماء نے آپ سے اتفاق کیا ہے۔انتہٰی۔

اس کے بعد میں نے دیکھا تو ایک اور مقام پر ابن حجر نے اسے اوّلیت دی ہے چنانچہ حوض کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے: ''اس جگہ کا نام روضہ (کیاری) رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ٹکڑا جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور وہاں جنت کی ایک کیاری ہوگا یا اس کا مجازی معنٰی مراد ہوگا کہ اس میں عبادت کرنے والے کو یہ جنت کی کیاری تک پہنچا دے گا۔پھر کہا کہ یہ قابلِ غور بات ہے کیونکہ یہ خصوصیت صرف اسی ٹکڑے کو حاصل نہیں بلکہ حدیث تو صرف

یہ بتا رہی ہے کہ یہ ٹکڑا دوسری زمین سے زیادہ مرتبہ والا ہے۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی بہتر وہ بات ہے جس کی طرف ابن ابی جمرہ گئے ہیں کہ انہوں نے اس روایت اور پہلی روایت کو جمع کر دیا ہے اور جو کچھ ہم نے منبر کے بارے میں پہلے بیان کیا ہے' اسی سے لیا ہے کیونکہ انہوں نے پہلے معنٰی ذکر کرنے پر بھروسہ نہیں کیا اور اخیر والے دونوں معنےٰ ذکر کر کے لکھا ہے کہ: ''زیادہ واضح (واللہ اعلم) بات دونوں صورتوں کو جمع کرنا ہے کیونکہ ان دونوں کے لئے ایسی دلیل موجود ہے جو اسے طاقت دیتی ہے' بہرحال اس بات پر دلیل کہ اس میں عمل کرنا جنت دلاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی مسجد کو بھی یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں کئی گناہ ثواب ملتا ہے اور خصوصاً اس ٹکڑے کو زمین کے دوسرے ٹکڑوں سے زیادہ فضیلت حاصل ہے اور رہی اس بات پر دلیل کہ بعینہٖ یہی ٹکڑا جنت میں ہوگا تو اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان موجود ہے کہ یہ منبر حوض پر ہوگا علماء کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کا معنےٰ ظاہری مراد ہے اور یہ حق ہے' محسوس ہوتا ہے کہ یہ آپ کے حوض پر موجود ہوگا۔

ابن ابی حمزہ نے کہا: قواعدِ شریعت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس مبارک ٹکڑے کی برکت کا ہمیں کیا فائدہ ہے اور اس کے بارے میں احادیث بھی آئی ہیں ہاں اسے عبادتوں کے ذریعے آباد کیا جائے۔ پھر کہا کہ یہاں تیسری وجہ کا بھی احتمال رکھتا ہے اور وہ یہ کہ بعینہٖ یہ ٹکڑا جنت کی ایک کیاری ہے جیسے حجر اسود جنت سے آیا ہے چنانچہ یہ جگہ اب جنت کی کیاری ہے اور جنت میں یہ اسی طرح کیاری ہوگی جیسے پہلے تھی اور جو اس میں نیک عمل کرے گا اسے جنت میں کیاری ملے گی۔ پھر کہا کہ یہ بہت ظاہر ہے کیونکہ اس میں حضور ﷺ کے مرتبہ کی بلندی ہے اور پھر آپ کے اور آپ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ ہونے میں ایک جیسی صورت پائی جاتی ہے اور وہ یوں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت سے پتھر (حجر اسود) عطا فرمایا تو اپنے حبیب کو اللہ تعالیٰ نے جنت کی ایک کیاری عطا فرما دی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ معنٰی نہایت نفیس ہے اور پھر اس میں لفظ کو اپنے حقیقی معنٰی پر بولا جا رہا ہے کیونکہ ایسی کوئی چیز نہیں جو یہ معنٰی لینے سے رکاوٹ بنے' اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اسے دنیا میں جنت کی کیاری دکھائی دینا چاہئے کیونکہ جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے' اُس جہان کے حقائق اس پر کھل نہیں سکتے کیونکہ درمیان میں بڑے بھاری پردے موجود ہیں' واللہ اعلم پھر اس مقام کو یہ مرتبہ یا تو اس میں عبادت کرنے کی وجہ سے حاصل ہے اور یا اس وجہ سے کہ حضور ﷺ نے بار بار اپنے گھر اور اس منبر کا ذکر فرمایا ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ اسے آپ کی قبر انور سے قریب ہونے کا شرف حاصل ہے' وہ قبرِ انور جو جنت کی سب سے عظمت والی کیاری ہے جیسے ابن ابی جمرہ نے بھی یہ اشارہ کیا ہے۔

پھر علامہ جمال محمد راسانی ریمی کہتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ معقول معنٰی والا ہے اور یہ دانائی کی بات ہے البتہ انہوں نے یہ اختلاف کیا ہے کہ یہ معنٰی ہے کیا؟ چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ اپنے حقیقی معنٰی دیتا ہے اور واقعی یہ ٹکڑا جنت کی کیاری ہے اور وہ یوں کہ یہ جنت سے لایا گیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جلد جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں معنٰی مجازی مراد ہیں' معنٰی یہ ہے کہ اس میں عبادت کرنا جنت میں جانے کا سبب بنے گا یا اس لئے

کہ اس میں رحمت نازل ہوتی ہے اور بخشش حاصل ہوگی جیسے ذکر کی محفلوں کو جنت کی کیاریاں کہا گیا ہے چنانچہ حدیث پاک میں ہے: کہ ''جب تم جنت کی کیاریوں سے گذرو تو اس میں سے کھاؤ اور پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے آپ نے پوچھا کہ یہ ریاض الجنہ کیا ہے؟ تو فرمایا یہ مسجدیں' میں نے پوچھا کہ یہ رتع (چرنا) کیا ہے؟ تو فرمایا: یہاں سُبْحٰنَ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ پڑھنا ہے۔

ابن عبد البر کہتے ہیں: چونکہ حضورﷺ اس جگہ بیٹھتے اور لوگ کچھ سیکھنے کے لئے حاضر ہوتے تھے اس لئے اسے روضہ (کیاری) سے تشبیہ دی گئی کیونکہ وہ میں سے کچھ لیتے ہیں اور پھر اسے جنت کی طرف منسوب کیا کیونکہ جنت میں جانے کا سبب ہے جیسے کہتے ہیں ''جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' یعنی یہ ایسا عمل ہے جو جنت میں داخل کردے گا۔

علامہ خطابی کہتے ہیں: جنت کی کیاری بایں طور ہے کہ اس میں عبادت کی جاتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ ''مریض کی بیمار پرسی کرنے والا جنت کے باغ میں ہوگا۔ یعنی اس کے بارے میں اُمید ہوگی کہ اسے جنت کا باغ ملے گا چنانچہ مسبب (جس کا یہ سبب ہے) پر سبب کا نام بولا گیا جیسے کہتے ہیں کہ جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

یہ وہ معنے ہیں جو خطیب بن حملہ نے نقل کئے ہیں پھر آخری کو پیچھے لائے کیونکہ اس وقت اس ریاض الجنہ کو کوئی درجہ حاصل نہیں ہوگا۔ لوگوں کو اس عظیم عزت سے پتہ چلا کہ حضرت مالک نے اسے تمام زمینی ٹکڑوں پر مرتبہ کیوں دیا تھا۔

اس مفہوم میں جمال ریمی نے خطیب کی پیروی کی ہے اور کہا ہے کہ سب سے زیادہ ظاہر معنٰی عبادتوں کا کئی گنا اجر ملنا ہوتا ہے اور لوگوں کو بھلائی کے کام بتانا ہوتا ہے کیونکہ خطابی اور ابن عبد البر اس پر اتفاق کئے ہوئے ہیں اور وہ دونوں ہی حدیث سمجھنے میں اُمت کے بہترین لوگ ہیں اور اس لئے بھی کہ اس جیسی اور مثالیں اس کی تائید کرتی ہیں' رہے دوسرے دو معنٰی تو خطیب نے انہیں کسی (ثواب) طرف منسوب نہیں کیا جس سے پتہ چلا کہ یہ ضعیف ہیں جبکہ قاضی عیاض نے یہ قول نقل نہیں کیا کہ بعینہٖ یہ جگہ جنت سے لائی گئی ہے البتہ اس کے علاوہ اور کا ذکر کیا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ یہ معنٰی بہت کم لوگوں نے لیا ہے کیونکہ اس طرح کا معنٰی اللہ کے دستِ قدرت میں ہے جیسے رُکن اور مقام کے بارے میں آتا ہے علاوہ ازیں یہ قول محسوس یا ضروری چیزوں کے انکار کی طرف لے جاتا ہے اور خطیب کا جواب یہ ہے کہ یہ مرتبہ تو ظاہر ہے اور وہ یوں کہ پہلی مثالوں پر عمل کرنا جنت کی کیاری کی طرف لے جائے گا اور اس مقام پر عمل کرنا اس کیاری کی طرف لے جائے گا جو اس سے اعلیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ معنٰی بیان کرنے میں جمال ریمی اس طرف گئے ہیں کہ ''روضہ'' کا لفظ تمام مسجد نبوی کا احاطہ کرتا ہے اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس میں ثواب کئی گنا ملتا ہے اور انہوں نے یہ بات کہہ دی تو اس کا یہ مجازی نام اختیار کرلیا اور اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''دلالات المسترشد علی ان الروضۃ ھی المسجد'' رکھا اور پھر شیخ صفی

الدین الکازرونی المدنی نے ان کے ردّ میں ایک تصنیف کی' میں نے انصاف کرتے ہوئے کتاب ''دفع التعرض والا نکار لبسط روضۃ المختار'' میں دونوں کا خلاصہ بیان کیا ہے' عنقریب ان میں سے درست کا ہم بیان کریں گے۔

رہا قاضی کے قول کے ضعیف ہونے پر ان کا یہ استدلال کہ قاضی عیاض نے اسے ذکر نہیں کیا' عجیب معلوم ہوتا ہے' ممکن ہے قاضی عیاض کو اس کا علم ہی نہ ہوا ہو' پھر ان کا یہ کہنا کہ یہ توقیف (قابلِ سکوت) کے طریقے پر بولا گیا ہے جیسے کتاب الرکن میں لکھا ہےتو ہم کہیں گے کہ صادق و مصدوق ﷺ کے اس بارے میں توقیف سے کون سی توقیف بڑی ہے' انہوں نے تو رکن اور مقام کا مفہوم بتا دیا ہے۔ اصل یہ ہوتا ہے کہ لفظ بول کر حقیقی معنٰی مراد لیا جائے' علامہ ریمی نے الرکن والمقام میں اس بات کو تسلیم کیا ہے لیکن یہاں تسلیم کیوں نہیں کر رہے' حدیث سے علماءِ کرام نے جو کچھ سمجھا ہے' وہ یہی ہے کہ یہی مقام روضہ کہلاتا ہے' کوئی یہاں نماز پڑھے اور نماز پڑھے یا نہ پڑھے' ہاں ذکر کے حلقوں کی بات اور ہے کیونکہ وہ تو لوگوں کے اُٹھنے سے ختم ہو جاتے ہیں چنانچہ روضہ میں وہ ایسے نہیں بخلاف اس کے' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رَتع کی تفسیر ذکر سے کی ہے۔اور حدیث ''جنت ماؤں کے قدموں میں ہے'' سے مراد یہ ہے کہ ماؤں کی خدمت انہیں جنت کی طرف لے جائے گی۔ پھر علامہ ریمی کا یہ قول ''ان کا یہ قول اس طرف لے جاتا ہے جو انہوں نے ذکر کیا ہے۔'' بھی بڑا عجیب ہے حالانکہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حقیقی معنیٰ لینے سے رکاوٹ موجود ہے' اور وہ اچھی بات کونسی ہو سکتی ہے جو اس قول سے پسندیدہ کہلا سکے کہ یہ ٹکڑا جنت کی کیاری ہے' اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے نوازا ہے؟ اور پھر گذشتہ منبر کی حدیثیں اس کی تائید کر رہی ہیں اور آگے اُحد و عیر کے بارے میں بھی آ رہی ہیں کیونکہ اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں کہ اُحد اپنے نزدیک بتکلّف عبادت کرنے والے کو جنت کی طرف لے جائے گا اور عیر اپنے پاس عبادت کرنے والے کو جہنم کی طرف لے جائے گا۔

رہا مرتبہ بیان کرتے ہوئے ان کا یہ قول کہ: ''اس مقام میں نیک عمل اعلیٰ کیاری کی طرف لے جانے کا سبب بنے گا'' تو حدیث پاک میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ وہ ریاض سے اعلیٰ ہے بلکہ وہ مطلق ریاض ہے اور جب یہ بات کسی اور کے لئے ثابت ہو گئی تو خصوصیت نہیں رہے گی بلکہ مکہ کی افضیلت کا قائل بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس مین عمل کرنے کی بناء پر انسان اعلیٰ اور افضل روضہ کی طرف پہنچ سکتا ہے' چنانچہ اس ٹکڑے کے دوسروں پر فضیلت کی وجہ سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ مدینہ منورہ مکہ سے افضل ہے' حدیث یہ موجود ہے: ''جنت میں تمہارا کمان کے دوسروں کے فاصلے جتنا قرب دنیا و ما فیہا سے بہت بہتر ہے۔'' اور ابن حزم نے پیروی کرتے ہوئے اس ٹکڑے کو جنت کا ٹکڑا قرار دے دیا ہے اور یہ مجاز ہے کیونکہ اگر یہ حقیقی معنٰی ہوتا تو یوں ہوتا جیسے جنت کی تعریف کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ○ (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۸)

''بے شک تیرے لئے جنت میں یہ ہے کہ نہ تو بھوکا ہو' نہ ننگا ہو۔''

ابن حزم نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں نماز پڑھنے سے انسان جنت کو جاتا ہے جیسے خوشگوار دن کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو جنت کا دن ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر جنت میں داخل ہونے والے کے لئے بھوکا اور ننگا ہونے کا ثبوت نہیں ملتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کسی شے میں داخل ہو جاتا ہے' وہاں سے نکالا جائے گا کیونکہ اس سے جنت میں اس کے حقیقۃً ہونے کی نفی ہو گی کیونکہ وہ وہاں سے نکل گیا اور اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں۔

پھر یہ مسئلہ کہ روضہ کا لفظ تمام مسجد رسول ﷺ کو شامل ہے' اختلاف والا ہے چنانچہ علامہ اقشہری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ: ابو جعفر بن نصر داؤدی مالکی سے حضور ﷺ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا: ''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ایک کیاری ہے'' تو انہوں نے بتایا: یہ مسجد ساری ہی کیاری ہے اور ادھر علامہ ریمی نے خطیب بن حملہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آپ کا یہ فرمان ''میرے گھر کے درمیان'' مفرد ہے' اس سے آپ کے تمام گھر مراد ہو سکتے ہیں' اس کے بعد ریمی نے آپ کے گھروں کے مقامات بیان کئے اور پھر کہا: اسی لئے سمعانی نے اپنی ''آمالی'' میں کہا جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد کو فضیلت عطا فرمائی' شرف دیا' اس کے اندر عمل میں برکت فرمائی اور اسے کئی گنا بڑھایا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے جنت کی کیاری ہونے کا نام دیدیا' تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ علامہ ریمی نے ساری مسجد کو کیاری کہہ دیا ہے حالانکہ مشہور ایک خاص گھر ہے اور وہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر ہے کیونکہ دوسری روایت ہے: ''میری قبر اور منبر کے درمیان۔'' چنانچہ ابن خزیمہ نے کہا کہ آپ نے ''میرا گھر'' کہہ کر وہ گھر مراد لیا جس میں آپ کی قبرِ انور ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی قبر آپ کے اس گھر میں بنی تھی جہاں سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رہا کرتی تھیں۔ خطیب کہتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ریاض الجنہ کی سمت حجرہ مقدسہ کی اس دیوار سے لی جاتی ہے جو حجرہ کے قبلہ اور شمال کی طرف ہے اور منبر کی طرف یہ دیوار پیچھے ہٹتی رہی۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے تین آراء سامنے آئیں:

۱۔ ایک یہ کہ ریاض الجنہ وہی مسجد ہے جو نبی کریم ﷺ کے دورِ مبارک میں تھی۔

۲۔ دوسری یہ کہ یہ روضہ وہ مقام ہے جو صرف منبر اور حجرہ کی سمت میں ہے جو حجرہ کی طرف سے بڑھتا رہا اور منبر کی طرف سے گھٹتا رہا جیسے گذشتہ اوراق میں اس کی مقدار کے موقع پر بتا دیا گیا' یوں اس کے سارے ضلعے سیدھی لائن سے ہٹ کر بنتے ہیں کیونکہ منبر قبلہ کی طرف سے آگے ہوا اور شام کی طرف سے پیچھے ہٹا' یوں مثلث کی شکل کا بن گیا جس کے دو ضلعے منبر کے اندازے پر پورے بیٹھتے ہیں۔

۳۔ تیسری رائے یہ ہے کہ یہ سارے کی ساری کیاری حجرہ کی دونوں حدوں کے سامنے ہے چنانچہ یہ قبلہ کی طرف سے مسجد کی اگلی طرف سے منبر کے سامنے ہے اگرچہ حجرہ کے سامنے نہیں اور شمال کی طرف سے حجرہ کے سامنے ہے اگرچہ منبر کے سامنے نہیں چنانچہ یہ مربع شکل کی ہوئی' یہاں تین سائبان ہوئے' ایک تو مصلّٰی شریف والا اور دو اس کے بعد اور یہ حصہ حضور ﷺ کے دور میں چھتا ہوا تھا کیونکہ اس عمارت کے بارے میں جسے ہم نے

دیکھا' یہ معلوم ہوا ہے کہ اسطوانۂ وفود اس مقام پر واقع ہے جو حجرہ مبارکہ کے برابر ہے چنانچہ وہ اسطوانۂ مبارک جو قبرِ انور کے چوکور حصے کو ملتا ہے' اس کا کچھ حصہ حجرہ شامی کی دیوار میں داخل ہے جیسے آگے بیان کیا جائے گا۔

رہیں ان اقوال کی دلیلیں تو علامہ ریمی نے ان میں سے پہلے کے بارے میں ایسے دلائل دیئے ہیں جو اکثر کمزور ہیں جن کی بنیاد یہ ہے کہ روضہ کے لفظ کا استعمال بطور مجاز ہوا ہے کیونکہ اس میں اجر وغیرہ بڑھایا جاتا ہے اور ان سب سے بہتر وہ ہے جس کی طرف خطیب بن حملہ نے اشارہ کیا اور ریمی نے کئی طرح سے تائید کی ہے چنانچہ انہوں نے کہا: آپ کے ''ما بین بیتی'' والے فرمان میں بیت کا لفظ مفرد ہے اور مضاف ہے' اس سے مراد آپ کے سارے گھر ہوں گے' آپ کے یہ گھر مسجد کے قبلہ' مشرق اور شام کی طرف والی جانب کے گرد تھے (انہیں میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر بھی تھا) جیسے ابن نجار وغیرہ کی وضاحت آ رہی ہے' مغرب کی طرف آپ کا کوئی گھر موجود نہ تھا لہٰذا ادھر سے حد کا پتہ منبر شریف ہی سے چلتا تھا کیونکہ وہ مغرب کی جانب تھا' اس کے اور دیوار کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا کیونکہ ادھر اس کی آخری حد وہ ستون تھا جو منبر سے ملا ہوا تھا جبکہ منبر جنت کے ایک دروازے پر ہے چنانچہ ریاض الجنہ کی حد پوری مسجد کو شامل ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ اس وضاحت کی بنیاد ابن نجار کا قول ہے جو انہوں نے مغرب کی طرف سے مسجد کی حد بندی بتاتے ہوئے کیا ہے اور حد مسجد جو پہلے میرے سامنے تھی' میں اپنی تالیفات میں اسی کے مطابق چلا ہوا' علامہ زینی مراغی نے بھی وہی کچھ لکھا ہے چنانچہ کہا: کیاری کے بارے میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ویسا نہیں رہے گی جیسے آج ہے بلکہ شام کی طرف حضور ﷺ کے گھروں تک وسیع ہو گی اور حضور ﷺ کے دور میں مسجد کا یہ آخری حصہ تھا چنانچہ یہ سارا ہی کیاری ہو گا اور یہ اس وقت ہے کہ ہم نے اس مفرد کو بنیاد بنایا ہے جو مضاف ہے اور عموم کا معنیٰ دیتا ہے اور اسی کو علماءِ اُصول نے اپنی کتابوں میں ترجیح دے رکھی ہے۔

(قلت) ان حضرات میں سے کسی نے بھی گذشتہ حدیث کو دلیل نہیں بنایا کہ ''ان گھروں کے درمیان سے گھر (یعنی آپ کے گھروں سے) میرے منبر تک جنت کی ایک کیاری ہے۔'' اور پھر تعجب یہ ہے کہ روضہ کے بارے میں معلومات رکھنے والوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ اس میں یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ''مفرد مضاف عام معنیٰ دیتا ہے چنانچہ علامہ گازرونی نے اس بارے میں کئی اعتراض کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ روایتِ ''ما بین قبری و منبری'' مضاف ''بیت'' کا مطلب بتا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کی جگہ یہ کہا ہوتا تو بہتر تھا کہ روایت ''ما بین المنبر و بیت عائشة'' کیونکہ اس پر یہ لازم آتا ہے کہ ریاض الجنہ منبر کی صرف چوڑائی کی جانب ہو حالانکہ یہ تخصیص بعید سی بات ہے اور جس نے یہ کہا کے بیت سے مراد قبر ہے تو واللہ اعلم اس کا یہ مقصد نہیں ہے البتہ قبر کی روایت میں چونکہ ابہام نہیں لہٰذا یہ بیعت کا معنیٰ معین کرتی ہے اور شاید علامہ صفی کی مراد بھی یہی ہے اور اسی بناء علامہ طبری نے کہا

ہے: اور جب حضورﷺ کی قبرِ انور گھر میں ہے تو سب روایتوں کا معنٰی ایک ہو گیا اور اختلاف بالکل نہ رہا۔ انتہٰی۔

ان میں سے ایک اور اعتراض یہ ہے علامہ قرافی نے عموم اسمِ جنس کو قلیل و کثیر پر بولا ہے جیسے ماء اور مال کے الفاظ ہیں' ان پر نہیں بولا جو صرف ایک پر بولے جاتے ہیں جیسے ''عبدؔ بیت اور زوجہ کا لفظ کیونکہ یہ عام نہیں' یہی وجہ ہے کہ جب کسی نے کہا: عبدی حرٌّ یا کہا اِمْرَاَتِیْ طَالِقٌ تو یہ الفاظ سارے غلاموں اور ساری عورتوں کو شامل نہیں ہونگے اور نہ میں نے کسی کو اسے نقل کرتے دیکھا۔

میں کہتا ہوں: علامہ تاج سبکی کہتے ہیں: کچھ علماء نے اسمِ جنس معرف باللام اور مضاف ہونے کی صورت میں اس کے عام ہونے کی مخالفت کی ہے جبکہ صحیح بات اس کے خلاف ہے۔

چنانچہ انہوں نے قرافی کی بحث کو تیسری تفصیلی وجہ قرار دیا ہے اور یہ بات دو مطلق لفظوں کے اس پر بولنے کا انکار کرتی ہے چنانچہ ان کی نقل ملتی ہے لیکن صحیح اس کے خلاف ہے اور جو انہوں نے استدلال کیا ہے کہ عبدی حرٌّ اور امراتی طالق میں عموم نہیں ہے تو اس کا جواب کئی وجہ سے دیا جا سکتا ہے جن کا ذکر ہم اعتراضات کے دفع کرنے کے موقع پر کر چکے ہیں' ان سب سے بہتر وہ ہے جس کی طرف علامہ اسنوی نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے: اس میں عموم کا نہ ہونا اس لئے ہے کہ یہ قَسموں سے تعلق رکھتا ہے اور اَیمان (قسمیں) میں تو عرف کا لحاظ لکھ کر چلنا ہوتا ہے۔

علامہ ازرقی نے اپنی ''نفائس'' میں ابن عبد السلام سے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا: جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اس کے مطابق سب کو طلاق ہو جائے گی اور سبھی آزاد ہو سکیں گے اور پھر حنبلیوں کی طرف سے حضرت امام احمد کی نص یعنی واضح بیان موجود ہے کہ اگر دو بیویوں اور کچھ غلاموں والا کہہ دے کہ: زوجتی طالق یا عبدی حرٌّ اور کسی خاص کو معین نہ کرے تو سب کو طلاق واقع ہو جائے گی یا سبھی آزاد ہو جائینگے چونکہ قاعدہ مذکورہ موجود ہے چنانچہ ابن عبد السلام اور حنبلی حضرات اسی قاعدے کے مطابق چلے ہیں لہٰذا یہ طریقے صحیح دلیل بنتے ہیں لیکن ریاض الجنہ کو شامل کر کے ''یہ منبر اور گھروں کے درمیان موجود ہے'' عموم مراد لینا تو یہ ایک اور رائے ہے اور پہلے ہم ایسی حدیث ذکر کر چکے ہیں جس میں یہ صراحت موجود ہے اور اس کی تائید علامہ ریمی کے اس اشارے سے ہوتی ہے جو انہوں نے کہا ہے کہ اس کا روضہ (کیاری) ہونا اس بناء پر ہے کہ حضورﷺ نے اس کا ذکر بار بار فرمایا ہے اور قبلہ بدلنے سے پہلے آپ اس کی اس جانب نماز پڑھتے تھے جو شام سے ملتی ہے اور یہ جائے تہجد تھی اور آپ کا منبر انور مغرب کی طرف سے اس کی حد کے آخر میں واقع تھا جبکہ مصلّٰے شریف آپ کے آگے تھا اور اسی کے ساتھ ستون واقع تھے جن میں فضیلت پائی جاتی ہے۔

رہا دوسری رائے کا سوال تو اس کی دلیل کے لئے بظاہر حقیقی طور پر درمیان میں ہونے کے لفظ کا سہارا لینا ہو گا اور بیت سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر لینا پڑے گا' اسے یہ بات کمزور کرتی ہے کہ مصلّٰی شریف کے اگلے حصے کو اس وقت ریاض الجنہ کے نام سے نکالنا پڑے گا کیونکہ یہ منبر اور روضہ کی دونوں جالیوں کے سامنے اور برابر نہیں آتا حالانکہ اس کے ریاض الجنہ ہونے کا بڑا سبب یہی ہے کہ حضورﷺ کے چہرۂ انور کے سامنے آتا ہے تاہم یہ قول

میں نے کسی کا نہیں دیکھا' اسے میں نے خطیب بن حملہ کے تردد سے لیا ہے جس کا ذکر گذر چکا۔

رہی تیسری رائے تو وہ ظاہر ہے کہ یہ وہی ہے جس پر علماء کی بڑی تعداد اور لوگوں کی اکثریت کار بند ہے' وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے بیت سے مراد' دوسری روایت کے مطابق حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لیا ہے اور انہوں نے گذشتہ اس امر کو' ''مصلّٰی شریف کا اگلا حصہ خارج ہے'' اس بات پر دلیل بنایا ہے کہ درمیان میں ہونے سے مراد وہ حصہ ہے جو ان دونوں طرفوں میں سے کسی ایک کے برابر آتا ہے اور یہ کہ اس سے مراد اسطوانۂ وفود کی لائن میں حجرہ شریفہ کے آخری حصے کی طرف سے انتہائی ہے جو مسجد کا اگلا حصہ ہے اور علامہ اقشہری کا اس طرف اشارہ موجود ہے۔اس بات کا علم ہمیں اس عمارت سے ہوا ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے' اس سے قبل ہمیں کچھ معلوم نہ تھا اور اسی وجہ سے علامہ مجد نے اپنی کتاب کے پہلے باب کی فضل الزیارہ میں کہا ہے' الفاظ یہ ہیں: ''پھر (زائر) روضۂ مقدسہ کی طرف آئے (ریاض الجنہ) اور یہ لمبائی میں قبر اور منبر کے درمیان ہے' چوڑائی میں ہونے کا کسی نے ذکر نہیں کیا اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ محراب اور اس ستون کے درمیان ہے جو اس کے سامنے ہے جبکہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا' میں نے اسے کتاب ھذا میں اس کے مقام پر بیان کیا ہے' وہاں میں نے بتایا ہے: لفظ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے زیادہ ہونا چاہئے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا گھر اپنے تمام پہلو شامل کر کے اس مقدار سے بڑھ جاتا ہے۔انتہی۔انہوں نے اس جگہ میں اسے ذکر نہیں کیا جس پر کسی شے کا حوالہ دیا جا سکے۔

ان کا یہ قول: ''محراب سے اس ستون تک جو اس کے سامنے ہے۔'' تو اس سے لگتا ہے کہ وہ ستون مخلق اور اس کے سامنے کا حصہ مراد لے رہے ہیں تو اس صورت میں ریاض الجنہ صرف پہلے سائبان تک ہوگا اور یہ غلط ہے کیونکہ شام کی جانب سے حجرہ مقدسہ ذرا پیچھے ہے جبکہ اس ستون کی لائن اس کے قبلہ والی دیوار کی جانب برابر میں ہے۔

ابن جماعہ کہتے ہیں' مجھے ریاض الجنہ کے طول کا تو پتہ چل گیا لیکن عرض کا پتہ نہیں چل سکا' ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کا طول' منبر سے حجرے تک ہے جو ابن زبالہ کے مطابق ترپن ہاتھ اور ایک بالشت ہے' ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ چون ہاتھ اور ہاتھ کا چھٹا حصہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جہاں تک ہمیں پتہ چلا ہے' پہلی پیمائش تقریباً درست ہے کیونکہ میں نے رسّی سے ناپا تھا تو قبلہ والی جانب سے حجرہ کی قبلہ والی دیوار تک ترپن ہاتھ تھی جبکہ ابن جماعہ نے اس سے کم بتایا تھا' شاید انہوں نے سیدھی جانب ناپی تھی اور دوسری دونوں طرفوں کا لحاظ نہیں رکھا۔چنانچہ انہوں نے کہا: میں نے حجرہ شریفہ کی دیوار اور منبر کے درمیان ناپا تو معمول کے ہاتھ سے چونتیس ہاتھ اور ایک قیراط تھا۔میں کہتا ہوں کہ یہ باون ہاتھ تھا' اس پیائش کے مطابق جس کا میں نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔رہا اس شخص کا قول کہ جس نے کہا: آج کل ریاض الجنہ کا طول پچاس ہاتھ سے دو تہائی ہاتھ گھٹ گیا ہے تو اس کی کوئی وجہ نہیں' ہاں یہ اس صورت میں ممکن ہے جب اسے اپنے ہاتھ سے ناپیں جس کی لمبائی زیادہ ہے۔واللہ اعلم۔

رہی حجرہ مبارکہ کی انتہاء تو یہ ابن جماعہ وغیرہ کو معلوم نہ تھی اور اسی پر چوڑائی کا بیان موقوف ہے' اسی لئے ریچی نے کہا: ہمیں تو معلوم نہیں کہ حجرہ مبارکہ اس عمارت کے درمیان ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے یا اس کے درمیان میں نہیں ہے؟ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی پیائش کہاں تک جاتی ہے؟ البتہ لوگوں کی اکثریت کا گمان ہے کہ اس کی نہایت ستونِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابل تک ہے اور اسی لئے انہوں نے اس کٹہرے کو جو ستونوں کے درمیان ہے' ان کی صف میں گنا ہے اور صرف اسی کے لئے انہوں نے فرش بنایا لیکن درست وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں چنانچہ معاملہ واضح ہو گیا' فالله الحمد۔

فصل نمبر ۷

با برکت ستون اور استوانہ مُخَلَّق

ان میں سے ایک وہ ستون ہے جو مصلّٰے شریف کی علامت ہے اور اسے مخلّق کہتے ہیں۔ ابن قاسم کہتے ہیں کہ مصلّٰے شریف وہاں تھا جہاں ستونِ مخلّق ہے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد سب سے قریبی ستون ہے اور جس تنے کے ساتھ آپ خطبہ دیتے اور اس کا سہارا لیتے' وہ وہیں تھا اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ آج جہاں یہ ستون موجود ہے وہ جگہ پہلی سے آگے ہے اور اس کا اصلی مقام شمع رکھنے کی وہ جگہ ہے جو مصلّٰے شریف میں کھڑا ہونے والے امام کی دائیں طرف ہے چنانچہ جسے اس سے تبرک حاصل کرنا ہو' وہاں نفل پڑھے۔

ابن زبالہ کے مطابق یزید بن عبید' حضرت سلمہ بن رکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ سبحۃ الضحیٰ (نفل پڑھنے کی جگہ) کے مقام پر آتے تو ستون کا ارادہ کرتے' مصحف کا نہ کرتے اور دونوں کے قریب نماز پڑھتے' میں کہتا کہ آپ یہاں نماز نہیں پڑھیں گے' میرا اشارہ مسجد کی ایک طرف کو ہوتا' وہ کہتے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو اس مقام پر آتے دیکھتا رہا ہوں۔ یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہے' بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ''میں سلمہ بن اکوع کے ساتھ آیا کرتا تو وہ مصحف والے ستون کے پاس نماز پڑھا کرتے' میں نے پوچھا تھا: اے ابو سلمہ! میں دیکھتا ہوں کہ آپ نماز کے لئے اسی ستون کا ارادہ کئے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' مسلم شریف میں حضرت سلمہ ہی سے ہے کہ وہ مصحف والی جگہ کا قصد کرتے اور وہیں نفل پڑھتے' پھر بتاتے کہ نبی کریم ﷺ اسی جگہ کا قصد کرتے تھے۔ ہم نے مصلّٰے شریف کا بیان کرتے وقت یہ بیان کر دیا تھا کہ اس سے مراد یہی ستون ہے۔

استوانہ قرعہ (ستونِ قرعہ)

ایک ان میں سے استوانہ قرعہ ہے جو استوانہ عائشہ کے نام سے مشہور ہے' اسے استوانہ مخلّق اور استوانہ مہاجرین بھی کہا جاتا ہے۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت اسماعیل اپنے والد کے بارے بتاتے ہیں' وہ کہتے تھے کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' مروان بن حکم اور ایک تیسرا شخص حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے' وہ مسجد کا ذکر کر رہے تھے کہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: میں مسجد کا وہ ستون جانتی ہوں کہ اگر اس کے بارے میں لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس کی طرف نماز پڑھنے کا کیا اجر ہے تو وہ قرعہ ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ بعد ازاں دو تو چلے گئے لیکن ایک ابن زبیر ان کے پاس رہ گئے۔ دونوں نے آپس میں بات کی کہ یہ صرف اس ستون کا پتہ چلانے کے لئے پیچھے رہ گئے ہیں اور اگر انہوں نے پوچھ لیا تو وہ ضرور بتا دیں گی اور اگر انہوں نے انہیں بتا دیا تو یہ ہمیں نہیں بتائیں گے اور اگر انہوں نے بتا دیا تو یہ ابھی اس ستون کی طرف جا کر نفل ضرور پڑھیں گے لہٰذا ہمیں وہاں بیٹھنا چاہئے جہاں ہم انہیں دیکھ سکیں لیکن وہ نہ دیکھ سکیں چنانچہ انہوں نے یونہی کیا۔

لمحہ بھر کے بعد وہ تیزی سے باہر آئے' اس ستون کے طرف متوجہ ہوئے اور اس کی دائیں طرف مائل ہو کر نفل شروع کر دئے جس سے معلوم ہو گیا کہ وہ یہی ستون ہے چنانچہ اس کا نام اسطوانۂ عائشہ مشہور ہو گیا۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ اس کے قریب دُعا قبول ہوتی ہے۔

اوسط میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اس مسجد میں اس ستون کی ایک طرف زمین کا ایک ٹکڑا ہے کہ اگر اس کے بارے میں لوگوں کو پتہ چل جائے تو وہ اس میں نماز پڑھتے وقت قرعہ ڈالا کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس صحابہ کے بیٹوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی' کہنے لگے: اے اُم المؤمنین! وہ کہاں ہے؟ آپ نے ان لاعلمی پر تعجب کیا چنانچہ وہ کچھ دیر ٹھہرے اور پھر چلے گئے' صرف حضرت عبد اللہ بن زبیر رہ گئے۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ ابھی انہیں وہ جگہ بتا دیں گی لہٰذا یہیں مسجد میں ٹھہرو تا کہ دیکھ سکو کہ وہ کہاں نماز پڑھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ نکل آئے اور اس ستون کے نزدیک نفل پڑھنے لگے جہاں عامر بن عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پڑھے تھے' چنانچہ اسے اسطوانۂ قرعہ کہا جانے لگا۔

علامہ عتیق کہتے ہیں' یہی وہ ستون ہے جو قبرِ انور اور منبر کے عین درمیان ہے' اس کی دائیں طرف منبر تک دو ستون ہیں اور پھر اس کے اور قبرِ انور کے درمیان دو ستون ہیں پھر اس کے اور کھلی جگہ کے درمیان دو ستون ہیں' یہ ستون ان کے درمیان میں ہے' اسے اسطوانۂ قرعہ کہا جاتا ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ بہت سے علماء نے بتایا جن میں زبیر بن حبیب بھی تھے کہ جس ستون کو اسطوانۂ عائشہ کہا جاتا ہے' یہ منبر سے تیسرے نمبر پر ہے اور قبر سے بھی اور قبلہ کی طرف سے بھی تیسرے نمبر پر ہے جبکہ رحبہ (کھلی جگہ) سے بھی تیسرے نمبر پر ہے' یہ اس وقت کی بات ہے جب دو دالان نہیں بنے تھے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے اور یہ ریاض الجنہ کے درمیان تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے پاس دس سے کچھ زیادہ تک فرض نمازیں پڑھی تھیں پھر اپنے اس محراب کی طرف بڑھ گئے تھے جو درمیان صف میں ریاض الجنہ کے درمیان تھا یعنی درمیانے دالان میں' حضرت ابوبکر' حضرت عمر'

حضرت زبیر بن عوام اور حضرت عامر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے' قریش کے مہاجرین یہاں جمع ہوا کرتے تھے' اسی لئے اسے مجلسِ مہاجرین کہا جاتا تھا۔انتہیٰ۔

ابن نجار نے حضرت زبیر بن حبیب سے یہ روایت کچھ اضافہ سے بیان کی: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر اس کے بارے میں لوگوں کو پتہ چل جائے تو اس کے پاس نماز کے لئے قرعہ اندازی پر مجبور ہو جائیں' انہوں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے نہیں بتایا' اتنے میں ابن زبیر نے سرگوشی سے پوچھا تو چپکے سے انہوں نے کچھ فرمایا چنانچہ وہ اُٹھے اور اس ستون کے پاس نماز پڑھی جسے اسطوانۂ عائشہ کہا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ ان کے ساتھی نے گمان کیا کہ حضرت عائشہ نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ ستون ہے چنانچہ اس کا نام اسطوانۂ عائشہ رکھ دیا گیا۔راوی کا بیان ہے' مجھے میرے ساتھیوں نے زید بن اسلم سے بتایا کہ انہوں نے کہا: میں نے اس جگہ رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک کی جگہ دیکھی تھی' پھر اس کے قریب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیشانی رکھنے کی جگہ دیکھی پھر ان کے قریب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیشانی کی جگہ دیکھی۔

کہتے ہیں کہ یہاں دُعا قبول ہوتی ہے۔

ابن نجار ابن زبالہ کی اس تحریر: ''نبی کریم ﷺ نے وہاں دس سے کچھ زائد دن تک نماز پڑھی تھی' پھر آگے اپنے آج کل کے مصلّٰی کی طرف بڑھ گئے تھے۔'' کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن نجار کے الفاظ یہ ہیں: آپ اسے اپنے پیچھے رکھتے۔میں کہتا ہوں کہ ان کے علاوہ میں نے کسی اور کے کلام میں یہ نہیں پڑھا۔ظاہر یہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کا سہارا لیتے تھے جب وہاں بیٹھتے تھے' یہ نہیں کہ اسے اپنی پچھلی طرف کرتے تھے کیونکہ انہوں نے زید بن اسلم سے ذکر کیا کہ انہوں نے حضور ﷺ کی پیشانی مبارک کی وہاں جگہ دیکھی تھی۔

اس اسطوانۂ کا نام مخلّقہ بولا گیا' انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے یہ نام لیا کہ حضور ﷺ لوگوں کو مسجد میں شام کی طرف منہ کرکے نماز پڑھاتے (اس کی جانچ کے لئے) تم اسطوانۂ مخلقہ کی جگہ کو اپنی پشت کے پیچھے رکھو اور پھر شام کی طرف چلو۔(آخر تک)

میں کہتا ہوں کہ یہ ستون ان ستونوں کی صف میں ہے جو مصلّٰی شریف پر کھڑے امام کی پچھلی طرف ہیں' یہ قبلہ کی طرف تیسرے نمبر پر ہے اور کھلی جگہ سے بھی تیسرے ہی نمبر ہے جیسے گذرا اور یہ اس وقت تھا جب مسجد کی اگلی طرف کی چھت کے دالان نہیں بنے تھے' اس پر وہ خالی جگہ سے پانچویں نمبر پر ہو گیا۔

اسطوانۂ توبہ

انہی میں سے اسطوانۂ توبہ ہے' یہ اسطوانۂ ابولبابہ بن عبدالمنذر کے نام سے معروف ہے جو بنوعمرو بن عوف اوسی (نقباء میں ایک سے) تھے' نام رفاعہ تھا' اور یہ بھی لکھتے ہیں: یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ غزوۂ بنوقریظہ کے موقع پر

انہوں نے اپنے آپ کو اس سے باندھ لیا تھا اور پھر توبہ قبول ہونے تک بندھے رہے۔

علامہ القشیری لکھتے ہیں کہ اہلِ سیرت و اہلِ تفسیر کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آخر ان کی غلطی کیا تھی؟ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ابولبابہ ان لوگوں میں شامل تھے جو غزوۂ تبوک میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے جبکہ ابن ہشام نے ابن اسحاق کی پیروی میں کہا کہ اس کا سبب بنو قریظہ کا قصہ تھا اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا تھا چنانچہ عبد الرحمٰن بن یزید ان کا بنو قریظہ سے واقعہ بتاتے ہیں' انہوں نے ان سے کہا تھا: کیا ہم حکم محمد پر عمل کریں تو رعایت ہو گی؟ انہوں نے گلے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ ہاں اور ساتھ ہی گلے کی طرف اشارہ کیا تھا (ذبح کر دیئے جاؤ گے) ایک اور روایت میں ہے کہ ابولبابہ جب بنو قریظہ کے پاس گئے تو آدمی ان کے سامنے آ گئے' عورتیں اور بچے رونے لگے چنانچہ آپ کے دل میں نرمی آ گئی اور آپ سے کوتاہی ہو گئی تھی۔

حضرت ابولبابہ کہتے ہیں کہ ابھی میں اپنے قدم بھی نہیں اُٹھائے تھے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کر لی ہے۔

گذشتہ روایت میں یحییٰ نے کہا: وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں نہیں گئے' سیدھے مسجد کو گئے اور اپنے آپ کو اسطوانۂ توبہ کی جگہ ایک تنے سے باندھ لیا' اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ اُتاری:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

(سورۂ انفال: ۲۷)

"اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے دغا نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں دانستہ خیانت۔"

ایک اور روایت میں ہے: آپ نے اپنے آپ کو ستون سے باندھ لیا اور قسم کھا لی کہ اس وقت تک اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے جب تک حضور علیہ السلام نہیں کھولتے یا پھر اللہ کی طرف سے توبہ نازل نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہیں کھولنے تشریف لائیں تو انہوں نے انکار کیا کہ رسول اللہ علیہ السلام کے کھولنے تک آپ نہ کھولیں۔ یہ سن کر رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے۔

ابن نجار کی روایت ہے کہ ابولبابہ نے اللہ سے عہد کر لیا کہ میں بنو قریظہ کو روندوں گا نہیں' اور پھر کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس شہر میں نہ دیکھے جہاں میں نے اللہ و رسول علیہ السلام سے خیانت کی۔ جب نبی کریم علیہ السلام کو پتہ چلا (یہ آپ کے پاس حاضر نہ ہو سکے تھے) تو آپ نے فرمایا اگر یہ پہلے میرے پاس آ جاتے تو میں ان کے لئے اللہ سے بخشش مانگتا اور اب تو انہوں نے جو کرنا تھا کر لیا' اب میں اس وقت تک نہیں کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ ان کی توبہ نہ اُتار دے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ اُتار دی' تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے سحری کے وقت رسول اللہ علیہ السلام کے ہنسنے کی آواز سنی' عرض کی یا رسول اللہ! اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے' ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ابولبابہ کی توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ میں نے عرض کی

یا رسول اللہ! تو پھر میں انہیں بشارت نہ دیدوں؟ آپ نے فرمایا' جیسے تمہاری مرضی؟ وہ اپنے حجرہ کے دروازے پر کھڑی ہوئیں (ابھی پردے کا حکم نہیں ہوا تھا) اور کہنے لگیں! اے ابولبابہ خوشیاں مناؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر انہیں کھولنے کے لئے بھاگے تو انہوں نے انکار کیا' آپ نے کہا اب رسول اللہ ﷺ ہی اپنے دستِ مبارک سے مجھے کھولیں گے۔رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز کے لئے تشریف لے گئے تو انہیں کھول دیا۔

بیہقی کے مطابق لکھا ہے کہ حضرت ابولبابہ غزوہَ تبوک میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے' رسول اللہ ﷺ جب واپس تشریف لائے تو یہ سلام کے لئے حاضر ہوئے' آپ نے منہ پھیر لیا جس سے ان پر خوف طاری ہوگیا' انہوں نے اپنے آپ کو زوجہَ رسول حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے کے قریب استوانہ توبہ سے باندھ لیا' سات دن تک بندھے رہے' گرمی سخت تھی' نہ کچھ کھایا اور نہ ہی قطرہ بھر پانی پیا۔

حضرت مالک کے مطابق حضرت ابولبابہ نے اپنے آپ کو ستون کے ساتھ بھاری لوہے سے باندھ لیا' دس راتوں سے زیادہ تک بندھے رہے' سننے کی طاقت ختم ہوگئی' بینائی ختم ہونے کو ہوگئی۔آپ کی بیٹی نماز اور قضاء حاجت کے وقت انہیں کھول دیتیں اور واپس آنے پر انہیں پھر باندھ دیتیں۔

علامہ زمخشری نے حضرت ابولبابہ کا قصہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ اور اس میں لکھا ہے کہ ابولبابہ نے بیان کیا' میں انہی قدموں پر کھڑا تھا' مجھے معلوم ہوگیا کہ میں نے اللہ و رسول سے خیانت کی ہے' اس پر یہ گذشتہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے مسجد کے ایک ستون سے اپنے آپ کو باندھ لیا' کہنے لگے' بخدا نہ میں کھانا چکھوں گا' نہ ہی کچھ پیوں گا' یا تو مر جاؤں گا یا پھر اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے گا' وہ سات دن تک اسی حالت میں رہے' اسی دوران (بھوک پیاس سے) آپ پر غشی طاری ہوگئی اور وہ گر گئے' پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔پھر قصہ کے دوران لکھا کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور انہیں کھول دیا' اس پر انہوں نے عرض کی: میری توبہ تب مکمل ہوگی جب میں اس جگہ کو چھوڑ دوں جہاں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے اور اپنا مال لٹا دوں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک تہائی مال صدقہ کردو' کافی ہے۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ وہ ستون جس سے ثمامہ بن اثال حنفی نے اپنے آپ کو باندھا تھا' یہ وہی تھا جس سے ابولبابہ نے اپنے آپ کو باندھ لیا تھا۔

بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت اس آیت کے تحت لکھی:

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ○ (سورہَ توبہ: ۱۰۲)

''اور کچھ اور ہیں جو اپنے گناہوں کے مقِر ہوئے۔''

حضرت ابن عباس بتاتے ہیں کہ یہ دس لوگ تھے جو غزوہَ تبوک کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ جانے سے رہ

گئے تھے' جب حضور ﷺ کی واپسی کا وقت آیا تو ان میں سے سات نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا' رسول اللہ ﷺ نے آ کر انہیں دیکھا تو پوچھا: یہ لوگ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں جو آپ کے ہمراہ جانے سے رہ گئے تھے الحدیث۔ پھر ان کی توبہ کا ذکر کیا' آپ نے کسی کو بھیجا اور انہیں آزاد کر دیا۔

حضرت محمد بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ استوانۂ توبہ کے پاس نوافل پڑھا کرتے تھے۔

ایک اور روایت میں انہوں نے عمر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بتایا کہ انہوں نے استوانۂ توبہ کے بارے میں کہا کہ اکثر اوقات نبی کریم ﷺ اسی کے پاس نوافل پڑھا کرتے' صبح کی نماز کے بعد آپ اس کی طرف تشریف لے جاتے' پہلے یہاں ضعیف' مسکین' تکلیف والے' حضور ﷺ کے مہمان' جن کے دلوں کو اطمینان کی ضرورت ہوتی اور جس کا مسجد کے علاوہ رات گذارنے کے لئے کوئی اور ٹھکانہ نہ ہوتا' ایسے لوگ آیا کرتے تھے' یہ لوگ وہاں حلقے بنا کر بیٹھا کرتے' کوئی یہاں' کوئی وہاں۔ آپ صبح کی نماز کے بعد اپنے مصلّے سے اُٹھ کر ان کے پاس تشریف لے جاتے' انہیں آیات قرآنیہ سناتے' پھر آپس میں باتیں ہوتیں اور جب سورج طلوع ہو جاتا تو صاحب حیثیت' شرف والے اور غنی قسم کے لوگ آ جاتے' انہیں وہاں جگہ نہ ملتی' انہیں آپ سے ملنے کا شوق تھا اور آپ کو ان سے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ۝

(سورۂ کہف: ۲۸)

"اور اپنی جان ان سے مانوس رکھو جو صبح و شام اپنے ربّ کو پکارتے ہیں' اس کی رضا چاہتے ہیں۔"

اور جب یہ آیت اُتری تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! انہیں یہاں سے نکال دیجئے' ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں گے' ہم آپ کے بھائی بند ہیں' ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ۝ (سورۂ انعام:۵۲)

"اور دور نہ کرو انہیں' جو اپنے ربّ کو پکارتے ہیں' صبح اور شام' اس کی رضاء چاہتے ہیں۔"

حضرت مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسطوانۂ توبہ کو مخلّقہ کہتے تھے۔ ابن زبالہ حضرت مالک بن انس کا ذکر کرتے ہوئے اس میں لکھتے ہیں: یہ وہی اسطوانۂ مخلقہ ہے' جسے اسطوانۂ توبہ کہتے ہیں' اسی سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابولبابہ کو اس وقت کھولا تھا جب ان کی توبہ اُتری تھی۔ اس کے اور قبرِ انور کے درمیان دو ستون ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس ستون کے بارے میں فرماتے ہیں جس سے ابولبابہ بندھے تھے کہ یہ قبرِ انور سے دوسرا ہے اور کھلی جگہ سے تیسرا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تینوں کھلی جگہ پر اس وقت تھے جب ان دو ستونوں کو جدید بنایا گیا جن کی طرف اسطوانۂ قرعہ میں اشارہ گذرا' سبب یہ تھا کہ دونوں والان نئے بنائے گئے تھے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے اور یہ ستون' پہلے ذکر شدہ مشرق کی طرف والے ستون کی ایک جانب تھا چنانچہ یہ منبر سے چوتھا ہے' قبرِ انور سے دوسرا' قبلہ کی طرف سے تیسرا اور آج

ہمارے دور میں مسجد کی جگہ سے پانچواں ہے' اسی میں آج کل چونے سے بنے محراب کی شکل موجود ہے جس کی بناء پر یہ سب ستونوں سے الگ دکھائی دیتا ہے لیکن دوسری آتش زدگی میں اسے گرا دیا گیا تھا۔

بدر بن فرحون نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس سابقہ روایت سے یہ سمجھا کہ یہ وہی ستون ہے جو مشرق کی طرف اس اسطوانہ سے ملتا ہے اور یہی آج کل جالی سے متصل ہے جیسے آگے آئے گا چنانچہ ابن فرحون کہتے ہیں کہ اسطوانۂ توبہ وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق شباک کھڑکی سے متصل ہے' حضرت مالک بن انس نے بھی انہی کی پیروی کی ہے اور وہ جو کہا گیا ہے کہ اس کے علاوہ ہے' وہ غلط ہے۔اس میں اس قائل نے کئی اشیاء کا ذکر کیا ہے' جن کا ذکر کرنا' طول دینا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دراصل صحیح وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے' غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قبرِ انور کے ساتھ ملے ہوئے ستون کو یہی ستون سمجھا ہے چنانچہ انہوں نے ابن عمر کے قول کا مطلب یہ لیا کہ یہ قبر سے دوسرے نمبر پر ہے اور مالک کے قول سے سمجھا کہ اس کے اور قبرِ انور کے درمیان ستون ہے جو آج کل کھڑکی سے ملے ستون کے علاوہ ہے جبکہ اسطوانۂ قرعہ کے بیان میں ان کی کلام سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ قبر کی دیوار سے ملے کو شمار نہیں کرتے کیونکہ پہلے ان کا یہ قول گذر چکا ہے کہ یہ منبر سے تیسرا ہے اور قبرِ انور سے بھی تیسرا ہے اور اگر وہ قبر انور سے متصل کو گنتے تو یہ قبرِ انور سے چوتھا ہوتا اور پھر یہ بات بھی ہے کہ قبرِ انور سے ملے ستون کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نیا بنایا تھا (پہلے کا ہے ہی نہیں) جس کا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو علم ہی نہیں پھر اس سے بھی بڑھ کر واضح وہ ہے جو ابن زبالہ نے کہا کہ اسطوانۂ توبہ اور قبر شریف کی دیوار کے درمیان بیس ہاتھ کا فاصلہ ہے چنانچہ میں نے بھی اس اسطوانہ سے اندازہ لگایا جس کا ہم ذکر کر چکے تو ویسے ہی تھا اور ابن زبالہ سے جو کچھ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' اس میں کہا تھا: مصلّائے نبی ﷺ اور اس ستون کے درمیان سترہ ہاتھ کا فاصلہ ہے جبکہ مصلّٰے شریف کے بیان میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں' اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کیونکہ ہمیں ان کے درمیانی فاصلے کا پتہ چل چکا ہے پھر ہم نے یہ بیان بھی کیا ہے کہ مصلّٰے شریف اس گڑھے کی جانب ہے جو مغربی جانب ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مصلّٰی شریف اس حالت میں نیا نیا ہے۔

ابن زبالہ کے ایک نسخہ میں یہ فاصلہ انیس ہاتھ لکھا ہے اور اگر یہ بات صحیح ثابت ہو جاتی ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصلّٰے شریف عہد ابن زبالہ میں اس شکل میں موجود نہ تھا بلکہ یہاں زمین برابر تھی تو گویا انہوں نے ہاتھوں کا اعتبار مصلّٰے شریف کی غربی جانب سے ابتداء کرتے ہوئے کیا تھا اور وہاں سے مذکور اسطوانہ انیس ہاتھ ہی ہے' رہا مصلّٰے شریف اور اس اسطوانہ کا فاصلہ جو بدر نے مراد لیا ہے' تو وہ پچیس ہاتھ تھا لہٰذا ان کا یہ ارادہ کسی بناء پر صحیح نہیں۔

ابن زبالہ اور یحییٰ حضور ﷺ کے مقامِ اعتکاف کا بیان کرتے ہوئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ جب اعتکاف کرتے تو آپ کا بستر لگا دیا جاتا اور اسطوانۂ توبہ کے پیچھے چارپائی بچھا دی جاتی۔

ابن ماجہ کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے انہیں وہ مکان دکھایا جہاں رسول اللہ ﷺ اعتکاف کیا کرتے تھے پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب اعتکاف فرماتے تو بستر لگا دیا جاتا' چارپائی بچھا دی جاتی جو اسطوانۂ توبہ کی پچھلی طرف ہوتی۔ بدر بن فرحون کہتے ہیں کہ طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ وہ قبلہ کی جانب جا ملتا تھا جس سے آپ سہارا لگاتے۔

میں کہتا ہوں کہ اسے بیہقی نے روایت کیا' الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف فرماتے تو آپ کے لئے فرش لگایا جاتا یا چارپائی بچھائی جاتی' یہ اسطوانۂ توبہ کے قبلہ والی طرف ہوتی' اس اسطوانہ سے آپ سہارا لگاتے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے مسجد میں ایک جگہ مقرر تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں رسول اللہ ﷺ کا بستر لگایا جاتا تھا جب آپ اعتکاف فرماتے تھے۔

اسطوانۂ سریر

انہی ستونوں میں سے ایک اسطوانۂ سریر ہے' حضرت محمد بن ایوب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کھجور کا بچھونا ہوتا جس میں اس کے خشک پتے لگائے گئے ہوتے تھے' یہ اس اسطوانہ اور قندیلوں کے درمیان ہوتا جو قبرِ انور کے سامنے ہوتا تھا' آپ اس پر آرام فرمایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہی وہ اسطوانہ ہے جو آج کل اسطوانۂ توبہ کے مشرق میں جالی سے ملا ہوا ہے اور ابن فرحون اسے اسطوانۂ توبہ سے ملاتے ہیں اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے جو اسطوانۂ توبہ میں گزری کہ حضور ﷺ کا بستر اسی کے پاس لگایا جاتا' ہاں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ بستر کبھی اس اسطوانہ کے پاس لگایا جاتا اور کبھی اس کے پاس اور اس کی دلیل وہ ہے جو اسطوانۂ توبہ میں گذرا کہ بستر قبلہ والی جانب میں لگایا جاتا' آپ اس پر آرام فرماتے اور اس میں ذکر ہوا ہے کہ وہ اس کے اور قندیلوں کے درمیان لگایا جاتا حالانکہ یہ تو مشرق میں تھا۔

بدر بن فرحون کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف فرماتے تو آپ کے لئے تکیہ لگایا جاتا اور کھجور سے بنی چارپائی رکھ دی جاتی جس میں کھجور کی شاخیں ہوتیں' اسے قبر شریف کے سامنے والے اسطوانہ اور قندیلوں کے درمیان لگا دیا جاتا' حضور ﷺ اس پر آرام فرماتے۔

اسطوانۂ محرّس

ان ستونوں میں سے ایک اسطوانۂ محرس ہے' اسے اسطوانۂ امیر المؤمنین علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں۔

حضرت موسےٰ بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر بن عبد اللہ بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسطوانۂ علی

بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ محرس کہلاتا ہے' کیونکہ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے اس پہلو میں بیٹھا کرتے تھے جو قبرِ انور سے ملتا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کے دروازے کی طرف ہے' یہاں آپ حضور ﷺ کی حفاظت کے لئے ہوتے تھے۔

جمال مطری کہتے ہیں کہ یہ اس کھڑکی کے بالمقابل تھا کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں ہوتے تو اس سے ریاض الجنہ کی طرف نماز کے لئے نکلتے' یہ شمال کی طرف سے اسطوانۂ توبہ سے پیچھے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ وہی ستون ہے جس کے قریب امیر مدینہ نماز پڑھتے اور اسے اپنی پیٹھ کی طرف رکھتے اسی لئے اقشہری نے کہا کہ آج کل حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے مصلّٰے والا ستون اتنا مشہور ہے کہ اہلِ حرم میں سے کسی سے پوشیدہ نہیں' اس کے پاس امراء بیٹھتے رہے ہیں اور آج تک اس کے قریب نمازیں پڑھتے رہے ہیں۔یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ اسے ''مجلس القلادہ'' کہتے ہیں کیونکہ یہ ان لوگوں کے لئے عزت کا باعث تھا جو یہاں بیٹھا کرتے تھے اور یہ کام صرف اسطوانۂ وفود میں ہوتا تھا۔

اسطوانۂ وفود

انہی ستونوں میں سے ایک اسطوانۂ وفود ہے۔علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ شمال کی طرف سے اسطوانۂ محرس کے پیچھے ہے' حضور ﷺ یہاں اس وقت بیٹھا کرتے جب عرب کے وفد آپ کی خدمت میں آتے اور جب قبلہ کی طرف والی چھت میں دو سائبان بڑھائے گئے تو یہ مسجد کی کھلی جگہ سے ملتا تھا' اسے بھی مجلس القلادہ کہا جاتا تھا' سردار اور فاضل صحابہ کرام اس کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

علامہ اقشہری کہتے ہیں (میں نے انہی کے قلم کے لکھے سے نقل کیا ہے) کہ رہا وہ ستون کہ عرب کے وفد آنے پر جس کے پاس آپ بیٹھا کرتے تھے' جب تم اس ستون کو شمار کرو جس میں مقام جبریل ہے تو یہ تیسرا بنتا ہے۔انتہٰی۔

یہ اس کے مطابق ہے جو مطری سے گذر چکا کیونکہ وہ ستون جس میں مقامِ جبریل ہے وہ ستونِ مربعۃ القبر ہے' اس کے اور اسطوانۂ وفود کے درمیان ایک ستون ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں' میں نے کافی اہلِ علم حضرات سے سنا جن میں سے ایک عبدالعزیز بن محمد ہیں کہ وہ ستون جو اس کھلی جگہ کی طرف ہے جو اسطوانۂ توبہ کی لائن میں ہے' اس کے اور اسطوانۂ توبہ کے درمیان حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مصلّٰے تھا اور بیٹھنے کی وہی جگہ تھی کہ جسے مجلس قلادہ کہتے تھے' قدیم سے وہاں سردار قسم کے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔علامہ مجد کہتے ہیں' اسے ''قلادہ'' کہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں بیٹھنے والے بنو ہاشم وغیرہ عظیم لوگ ہوا کرتے تھے۔

اسطوانۂ مربعۃ القبر

ان ستونوں میں سے ایک اسطوانۂ مربعۃ القبر بھی ہے' آگے آ رہا ہے کہ اسے مقامِ جبریل علیہ السلام بھی کہتے ہیں۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کے گھر کا دروازہ اس مربعہ میں تھا جو قبرِ انور میں ہے۔ سلیمان کہتے ہیں' مجھے مسلم نے کہا تھا کہ اس کے پاس نماز پڑھنا نہ بھولنا کیونکہ یہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کا وہ دروازہ تھا جہاں سے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ آپ کے پاس جایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی تعمیر کی حد تھی جس کے مغربی چبوترے کی ایک طرف یہ شمال کی طرف واقع تھا اور اس لائن میں تھا جس میں اسطوانۂ وفود ہے' ان دونوں کے درمیان وہ ستون ہے جو جالی سے ملا ہوا ہے اور اسطوانۂ وفود کے مشرق میں ہے۔

اس ستون کی فضیلت و عظمت یہ ہے کہ ابو الحمراء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو چالیس دن تک صبح کے وقت حضرت علی' سیّدہ فاطمہ' حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دروازے پر آتے دیکھا' تشریف لا کر آپ دروازے کے دونوں کواڑ تھام لیتے اور فرماتے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (اے اہلِ بیت تم سدا سلامت رہو) پھر یہ آیت تلاوت فرما دیتے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۝

''اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو! کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرما دے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔''

انہی سے ایک اور روایت ہے' کہتے ہیں کہ مدینہ میں میرے سات ماہ' ایک دن کی طرح گذر گئے' رسول اللہ ﷺ حضرت علی کے دروازے پر بلا ناغہ تشریف لا کر فرماتے الصلوٰۃ الصلوٰۃ انّما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الآیۃ۔

لوگ اس ستون کے پاس نماز نہیں پڑھا کرتے تھے کیونکہ اس کے گرد جالی (لوہے کی) لگی ہوئی تھی جس نے حجرہ مقدسہ کو گھیر رکھا تھا اور اس کے دروازے بند تھے۔

اسطوانۂ تہجد

انہی میں سے ایک ستونِ تہجد ہے۔ یحیٰی کے مطابق حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ بوریا لے کر روزانہ اس وقت نکلتے جب لوگ گھروں میں ہوتے' لا کر اسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کی پچھلی طرف ڈال دیتے اور تہجد کی نماز پڑھتے' ایک آدمی نے دیکھ لیا تو اس نے بھی آپ کے ہمراہ نفل پڑھے' ایک اور نے دیکھا تو اس نے بھی پڑھے' یوں بہت سے لوگ جمع ہو گئے' رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو حکم فرمایا' بوریا لپیٹ دیا گیا

اورآپ اندر چلے گئے۔

صبح ہوئی تو وہ لوگ حاضر ہوئے' عرض کی یا رسول اللہ! آپ رات کے نوافل پڑھ رہے تھے تو ہم نے آپ کے ہمراہ پڑھے' فرمایا: خدشہ تھا کہ کہیں رات کے نوافل (تہجد) تم پر لازم نہ کر دئے جائیں اور پھر تم ادا نہ کر سکو۔ حضرت عیسیٰ بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس ستون کی جگہ تھی جو زوراء سے ملتی اور نبی کریم ﷺ کے راستے میں تھا۔

میں بتاتا چلوں کہ لفظ ''زوراء'' کو بعض لوگوں نے غلطی سے ''دور'' پڑھا چنانچہ میں نے اقشہری کے قلم سے لکھا دیکھا: **لعلّه مما يلي دوره** انتہی اور ظاہر یہ ہے کہ روایت میں لفظ **مما يلي الزّور** ہے یعنی جہاں موڑ تھا' یہ اس اضافہ میں تھی جو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔

حضرت عیسیٰ کے مطابق حضرت سعید بن عبد اللہ نے بتایا کہ مجھے محمد بن حنفیہ ملے' میں اس ستون کے پاس نماز پڑھ رہا تھا' مجھ سے کہنے لگے' میں دیکھتا رہتا ہوں کہ تم مسلسل اس ستون کے پاس ہوتے ہو' کیا کوئی خاص ثبوت موجود ہے؟ میں نے کہا' نہیں' انہوں نے کہا تو پھر یہ کام جاری رکھو کیونکہ رسول اللہ ﷺ تہجد کے لئے یہاں مصلّے بچھایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں' مسجد نبوی کی حدود کے بیان میں وہ مضمون گذر چکا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ مسجد سے باہر' بابِ جبریل کے سامنے قبلہ بدلنے سے پہلے اسی مقام پر تھی جہاں اب ہے اور وہ اس جگہ کے عین مطابق ہے جسے آئندہ صفحات میں مؤرخین اس ستون کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے اور پھر مشہور یہ ہے کہ رمضان کے علاوہ آپ گھر ہی میں نوافل پڑھتے تھے اور یہ جگہ اس میں سے نہیں ہے اور گذشتہ اوراق میں رمضان سے متعلق احادیث قیامِ رمضان میں جو کچھ بیان ہوا' اس سے وہم پڑتا ہے کہ یہ قصہ اسی میں ہوا چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے موقع پر ایک حجرہ میں بوریا رکھا تھا جہاں رات کے نفل پڑھتے' لوگ بھی شامل ہو گئے الحدیث۔ مسلم نے یہ الفاظ لئے ہیں: حضور ﷺ نے مسجد میں ایک حجرہ سا بنا رکھا تھا' آپ وہاں رات کے نفل پڑھتے' دیکھتے دیکھتے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رمضان کے اندر حضور ﷺ حجرہ مقدسہ میں بوریا بچھا رکھتے اور شاید یہ وہی گنبد سا تھا جہاں آپ رمضان میں اعتکاف فرماتے چنانچہ ابو یعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھجور سے بنے گنبد میں اعتکاف کرتے دیکھا۔ حضرت معیقیب فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے بنے پتوں کے قبہ میں اعتکاف فرمایا جس کا دروازہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنا تھا' لوگ مسجد میں موجود تھے۔ ابو حازم کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں مسجد کے اندر ایک قبہ میں اعتکاف فرمایا جس کے دروازے پر کھجور کے پتے (یا ٹہنیاں) تھیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں کھجور کا ایک جھونپڑا بنایا' یہ رمضان کے آخری دن تھے' آپ اس میں نماز پڑھا کرتے۔

علامہ مطری نے اس ستون کی جگہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی پچھلی طرف تھا' اس کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو بابِ جبریل دائیں طرف آتا ہے' جسے قدیم دور میں بابِ عثمان کہتے تھے' اس کے اردگرد جھونپڑے تھے یعنی دائیں بائیں متصل تھے اور وہ جالی تھی جو حجرہ شریفہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کو گھیرے ہوئے تھی' اس میں پتھر سے لکھا ہوا کہ:

هٰذَا مُتَهَجَّدُ النَّبِيِّ

''یہ حضور ﷺ کا مقامِ تہجد ہے''۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ یہ ستون حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے شمال میں' ان کے گھر کی پچھلی طرف ہے اس میں ایک محراب ہے' جب نمازی اس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو تو اس کا بایاں پہلو بابِ عثمان کی طرف ہوتا ہے جسے آج کل بابِ جبریل کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو عمارت ہم نے دیکھی تھی اس میں یہ محراب نئے سرے سے بنایا گیا ہے اور پہلے محراب پر مرمر لگا دیا گیا ہے جس پر مرمر سے لکھا ہے کہ

''بروز الامر بتجديد عمارة الجحرة الشريفة من السلطان الاشرف قايتبائی' اعز الله انصاره

''حجرہ شریفہ کی نئی عمارت کا حکم سلطان اشرف قایتبائی نے دیا اللہ ان کے مددگاروں کو عزت دے''۔

یہ خواجہ جناب شمسی بن الزمن کی نگرانی میں بنا' آگے تاریخ لکھی (۸۸۸ھ)۔''

یہ سب کچھ مرمر سے لکھا جو اسی ستون کے محراب کی اوپر والی طرف تھا پھر جب یہ تعمیر مکمل ہو چکی تھی تو بعد والی آتش زدگی نے یہ سب کچھ جلا دیا پھر باہمی مشورہ سے ان قبہ کے لئے بنے ستونوں کے پاس حجرہ کے برابر سب کچھ ختم کر کے ستون کو نئے سرے سے پایوں پر بنا دیا گیا جس میں محراب بنائی گئی۔

یہ سب ستونوں میں سے آخری تھا جس کے لئے اہل تاریخ نے بڑی تعریف لکھی ہے ورنہ مسجد کے سب ستون ہی فضیلت رکھتے ہیں چنانچہ بخاری شریف میں ہے' حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کرام کو دیکھا کہ مغرب والے ستونوں کی طرف تیزی سے جایا کرتے تھے۔

ابن نجار کہتے ہیں' اس سے ثابت ہوا کہ مسجد کے تمام ستونوں کے قریب نوافل پڑھنا مستحب ہیں کیونکہ صحابہ کرام یہاں نفل پڑھتے اور ناغہ نہیں کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۸

مقامِ صفّہ اور اہلِ صفّہ' مسجد کے قریب ان کے لئے چھپّر' صفّہ کیا اور اس کا مقام کونسا؟

قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ "صفہ" مسجد کے آخر میں ایک سایہ دار جگہ تھی جہاں مسکین لوگ ٹھہرے ہوئے تھے اسی وجہ سے انہیں اھل صفہ کہتے تھے۔

حافظ ذہبی کے مطابق قبلہ کی تبدیلی سے پہلے یہ مسجد کی شمالی جانب تھا اور جب یہ تبدیل ہو گیا تو صفہ کے اس مقام پر ایک بلند دیوار باقی رہ گئی تھی۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ صفہ' مسجد نبوی کے آخر میں ایک سایہ دار جگہ تھی' یہ ان غریب لوگوں کے لئے بنائی گئی جن کا مدینہ میں نہ کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ ہی اہل و عیال' یہ لوگ گھٹتے بڑھتے رہتے تھے چنانچہ کسی کی شادی ہو جاتی' کوئی فوت ہو جاتا یا سفر پر چلا جاتا۔

دارقطنی سے مجد نے لکھا: صفہ' مسجد کے آخر میں ایک سایہ دار جگہ تھی۔ علامہ مجد مزید لکھتے ہیں:

"ابن جبیر اپنے سفر نامے میں قباء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: شہر کے آخر میں ایک اُبھرا ہوا ٹیلہ تھا جسے عرفات کہتے تھے' ادھر سے مقام صفہ کو جانے کے لئے حضرت عمار' سلمان اور ان کے اہل صفہ کے نام پانے والے لوگ داخل ہوا کرتے۔ یہ صرف ایک وہم ہے' واللہ اعلم۔"

میں کہتا ہوں ہمارے پہلے بیان کردہ عیاض کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ (مشہور قول کی بناء پر) اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ ابن نجار کا یہ قول بھی انہی میں سے ایک شمار ہو گا لیکن یہ قول مرجوح یا مؤوّل ہے' تاویل یہ کہ جن اھل صفہ کا ذکر ہوا انہوں نے بعد میں یہاں ٹھکانہ کیا اور اسی سے مشہور ہوئے۔

اھلِ صُفّہ

ابن سعد کے مطابق اہلِ صفہ فقیر لوگ تھے جن کا ٹھکانہ نہ تھا' وہ مسجد ہی میں سویا کرتے کیونکہ رہنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔

بیہقی کے مطابق حضرت عثمان بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ مدینہ میں مہاجرین بہت سارے جمع ہو گئے' نہ تو وہاں ان کے گھر تھے اور نہ ہی رہنے کی جگہ جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انہیں مسجد میں ٹھہرا لیا اور انہیں اصحابِ صفہ کا نام دیا' آپ ان کے پاس بیٹھا کرتے اور اُنس و محبت فرماتے۔

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نمازیں پڑھتے تو ان میں سے کچھ کمزوری کی وجہ سے گر جایا کرتے' دیہاتی انہیں دیوانہ تک کہہ جاتے حالانکہ وہ اہلِ صفہ تھے' حضور ﷺ نماز پڑھنے تشریف لاتے اور ٹھہر جاتے اور فرماتے: اگر تمہیں اللہ کے ہاں ان کے مرتبہ کا پتہ چل جائے تو تم ان سے بھی زیادہ محتاج اور ضرورت مند بننا پسند کرتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اصحابِ صفہ فقر لوگ تھے' ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہوا کرے' وہ ان میں سے ایک کو لے جایا کرے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچواں اپنے ہمراہ لے جایا کرے۔

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے' فرمایا: میں نے ستر اہلِ صفہ دیکھے جن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس تہبند اور اوپر لینے کی چادر ہوتی تو وہ گلے میں باندھ کر لٹکا لیتے' کسی کی پنڈلی کے نصف تک ہوتی اور کسی کی ٹخنوں تک' وہ اسے تھامے ہوتے کہ کہیں بے پردہ نہ ہو جائیں۔

بخاری ہی میں انہی ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے: فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے بغیر کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں' بھوک کی شدت پر میں پیٹ زمین پر رکھ دیتا اور کبھی پیٹ پر پتھر باندھ لیتا۔ ایک دن میں صحابہ کے اس راستے میں جا بیٹھا جہاں سے وہ گذرتے تھے' اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گذرے' میں نے ان سے ایک آیت کا مطلب پوچھا' مقصد صرف یہ تھا کہ شاید اس بہانے مجھے ساتھ لے جائینگے' وہ چلے گئے لیکن ایسا نہ کیا پھر حضور ﷺ گذرے تو تبسم فرمایا' میری حالت اور چہرہ دیکھ کر میرا ارادہ بھانپ لیا' پھر فرمایا اے ابوہریرہ! میں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ فرمایا: آؤ میرے ساتھ چلو' میں پیچھے ہو لیا' آپ گھر میں داخل ہوئے تو میں نے بھی اجازت مانگی' آپ نے اجازت فرمائی' میں اندر چلا گیا' دیکھا تو ایک پیالے میں دودھ رکھا تھا' پوچھا یہ کہاں سے آیا ہے؟ بتایا گیا کہ فلاں شخص یا بتایا کہ فلاں عورت کی طرف سے آپ کو ہدیہ پیش کیا گیا ہے' فرمایا: اباھر! (ابھی پورا نام بھی نہ لیا کہ) میں نے عرض یا رسول اللہ! حاضر ہوں' فرمایا: جاؤ اور اہلِ صفہ کو بلا لاؤ' یہ لوگ اسلام کے مہمان تھے' وہ نہ تو کسی کے گھر جاتے' نہ مال ہوتا اور یہاں بنتے' کہیں سے صدقہ آ جاتا تو انہیں بھیج دیا جاتا' آپ خود اس میں سے کچھ نہ کھاتے' کوئی تحفہ بھیج دیتا تو آپ خود بھی کچھ لیتے اور انہیں بھیج دیتے اور ان کے ساتھ مل کر بھی کھا لیتے۔

یہ بات مجھے بوجھ محسوس ہوئی' میں نے دل میں کہا کہ یہ دودھ اہلِ صفہ کا گذارا کیا کرے گا؟ حق تو یہ تھا کہ مجھے مل جاتا تاکہ مجھ میں کچھ قوت آ جاتی۔

جب اہلِ صفہ آئینگے تو آپ مجھے حکم فرمائیں گے کہ تقسیم کروں' لگتا نہیں کہ میرے لئے بھی کچھ بچے گا' ادھر اللہ و رسول اللہ ﷺ کا حکم ماننا بھی لازم تھا۔ میں چلا گیا اور انہیں آنے کو کہا' وہ حاضر ہو گئے' اجازت مانگی تو آپ نے اجازت دیدی' گھر میں اپنی اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گئے' آپ نے فرمایا: اے ابوہریرہ! میں نے عرض کی' یا رسول اللہ! میں

یہیں ہوں۔ فرمایا: اسے لے لو اور انہیں پلاؤ' میں نے پیالہ پکڑا' ایک آدمی کو دیا' اس نے خوب سیر ہو کر پیا' پھر مجھے واپس دیدیا' میں نے اگلے کو دیا' اس نے بھی سیر ہو کر پی لیا آخر میں حضور ﷺ تک لے پہنچا' سب سیر ہو چکے تھے۔ آپ نے پیالہ پکڑا' اسے ہتھیلی پر رکھا' میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا' اے ابوھر! میں نے عرض کی یا رسول اللہ! حاضر ہوں' فرمایا: اب تم ہو یا میں رہ گیا ہوں' میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کا ارشاد درست ہے' فرمایا: تو بیٹھ کر پی لو' میں بیٹھ گیا اور پینے لگا' پھر فرمایا: اور پیو' میں نے پھر پیا' آپ فرماتے چلے گئے' آخر میں نے عرض کی' یا رسول اللہ! بس! اب تو گنجائش نہیں رہی۔ فرمایا: لاؤ' مجھے دکھاؤ' میں نے پیالہ پیش کر دیا' آپ نے حمد الٰہی فرمائی بسم اللہ پڑھی اور باقی پی لیا۔

ابن حبان کے مطابق حضرت حیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ تین دن گذر گئے کہ میں کچھ کھا پی نہیں سکا' میں نے اہلِ صفہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا' چلا تو گر پڑا' بچوں نے دیکھا تو کہنے لگے: ابوہریرہ گر گئے' لے دے کر میں اہلِ صفہ کے پاس پہنچ گیا' رسول اللہ ﷺ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو ان کے پاس ثرید (ایک کھانا) لایا گیا' آپ نے اہلِ صفہ کو کھانے کے لئے فرمایا تو وہ کھانے لگے۔ میں اوپر ہوتا کہ کہیں مجھے بھی بلا لیں' وہ کھا کر اُٹھ گئے' پیالہ میں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف تھوڑا بہت اس کے کناروں سے کچھ لگا تھا' حضور ﷺ نے جمع فرمایا تو ایک لقمہ کی مقدار تھا' آپ نے انگلیوں پر رکھ فرمایا: اللہ کا نام لے کر کھا لو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں آہستہ آہستہ کھاتا اور خوب سیر ہوتا گیا۔

ابو نعیم کے مطابق حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں صفہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں حاضر تھا' آپ انصار کے ساتھ ایک ایک' دو دو اور تین تین آدمیوں کو بھیجتے جاتے' آخر ہم چار آدمی رہ گئے اور پانچویں خود حضور ﷺ تھے۔ فرمایا: آؤ میرے ساتھ چلو' جا کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ کھانا لاؤ۔ الحدیث۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ میں اہل صفہ میں تھا' رات ہو جاتی تو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے' آپ ہر (انصاری) کو حکم فرماتے' وہ ایک یا زیادہ آدمی ساتھ لے جاتا' باقی دس' اس سے کم یا کبھی زیادہ بچ جاتے' حضور ﷺ کے پاس کھانا لایا جاتا' آپ ان کے ساتھ مل کر کھاتے' ہم فارغ ہوتے تو ارشاد ہوتا۔ مسجد میں سو جاؤ۔

طلحہ بصری کہتے ہیں' جو لوگ مدینہ پہنچتے' اگر وہاں کوئی جان پہچان والا ہوتا تو اس کے پاس چلے جاتے' نہ ہوتا تو صفہ میں ٹھہرتے' میں بھی صفہ میں ٹھہرنے والوں میں تھا' میں دو آدمیوں کے ساتھ تھا' روزانہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دو مدّ بھر کھجوریں آتیں' حضور ﷺ تشریف لائے تو ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! کھجوروں نے تو ہمارے پیٹ جلا دیئے اور پیٹ ساتھ جا لگے ہیں۔

حضور ﷺ منبر پر چڑھے' اللہ کی حمد و ثناء کی اور صحابیوں کی طرف سے شکایت کا ذکر کیا پھر بتایا کہ میرے اور میرے دو ساتھیوں پر ایسے دن بھی آتے رہے کہ دس دس دن سے بھی زیادہ گذر جاتے' کھانے کو صرف کھجوریں ہوتیں'

ہم یہاں اپنے انصار بھائیوں کے پاس آئے ہیں' ان کی گذر اوقات کھجور پر ہے' انہوں نے ہم سے ہمدردی کی' اگر میرے پاس روٹی اور گوشت ہوتا تو میں تمہیں ضرور کھلاتا لیکن یاد رکھو' عنقریب وہ وقت آ رہا ہے یا فرمایا کہ اگر تم اسے پا سکو' تو دیکھو گے کہ تم لوگ کعبہ کے پردوں جیسے کپڑے پہنو گے اور صبح و شام تمہارے پاس کھانے کے پیالے آئیں گے۔

کھجور کے گچھے لٹکانے کی ابتداء

ابن نجار کہتے ہیں' اہلِ سیرت لکھتے ہیں کہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کچھ مہمان دیکھے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں تھے' انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم انہیں انصار کے گھروں میں بکھیر نہ دیں؟ اور ہر باغ میں آپ کے لئے کچھ گچھے مقرر نہ کر دیں جو ان آنے والے مہمانوں کو کام دے سکیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے' جب مال تیار ہو گیا تو ایک شخص گچھا لایا اور مسجد میں اسے دو ستونوں کے درمیان (رسّی سے) لٹکا دیا چنانچہ اور لوگوں نے بھی ایسا کرنا شروع کر دیا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نگران تھے' وہ دو ستونوں کے درمیان رسّی باندھ دیتے اور پھر ان پر یہ گچھے لٹکا دئے جاتے' بیس یا اس سے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے تو آپ چھڑی سے ان گچھوں کو جھاڑتے اور لوگ کھا کر سیر ہو جاتے' پھر واپس چلے جاتے اور دوسرے آ جاتے' آپ یونہی کرتے جاتے اور رات ہو جاتی تو بھی یونہی کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے "باب القسمة وتعليق القنو في المسجد" لیکن اس باب میں واضح طور پر گچھے لٹکانے کا ذکر نہیں کیا' انہوں نے اشارہ کیا ہے جیسے امام نسائی نے کیا ہے' آپ حضرت عوف بن مالک اشجعی سے روایت کرتے ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہاتھ میں چھڑی لئے باہر نکلے: کسی نے ناقص کھجور کا گچھا لٹکا رکھا تھا' آپ نے اسے ٹھوکر مارنا شروع فرمائی اور فرماتے گئے: کاش اس گچھے والا اس سے بہتر لے آتا' اب یہ قیامت کے دن ایسا ہی کھائے گا۔

ابن زبالہ کے مطابق آتا ہے کہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کے لئے کچھ نہ ہوتا' انصار نے عرض کی یا رسول اللہ! کیوں نہ ہم ان لوگوں کے لئے ہر باغ سے پہلا پھل منگوا لیا کریں' فرمایا ٹھیک ہے' یوں کر لیا کرو' انہوں نے یونہی کیا چنانچہ یہ عادت آج تک جاری ہے تو یہ وہ گچھے ہیں جو مسجد میں کھجور کی دیوار کے پاس لٹکائے جاتے ہیں اور مسکینوں کو دئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس کام پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر تھے۔

یحییٰ کے مطابق اہلِ مدینہ نے بتایا کہ لوگوں کے پھل کو آفت زدہ ہو گئے' یہ رسول اللہ ﷺ کا دور تھا' آپ نے فرمایا: اگر تم لوگ مسکینوں کے لئے اپنی کھجوروں میں سے کچھ گچھے لے آیا کرو تو تمہارا کیا نقصان ہے چنانچہ لوگوں نے بھیج دئے' ان گچھوں پر آپ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نگران مقرر فرما دیا چنانچہ آپ تنوں کے درمیان رسّی

لٹکا کر اس پر وہ گچھے لٹکا دیتے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ آفت دور فرما دی۔ایک سال تک یہ آفت رہی اور پھر آج تک ائمہ کرام اسی طریقے پر چل رہے ہیں۔

حضرت سوید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ حضرت عویم بن ساعدہ ایک گچھا لے کر مسجد رسول اللہ ﷺ میں آئے چنانچہ مدینہ کے بالائی اور نچلے حصے والوں نے اس کی پیروی کی۔

حضرت ثابت نے دلائل میں لکھا کہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ ہر باغ میں سے گچھا لایا جائے جو مسجد میں لٹکا دیا جایا کرے' ایک روایت میں ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ حفاظت پر مقرر تھے یا تقسیم کیا کرتے تھے۔

فصل نمبر۹

حجرہ مبارکہ اور مغرب کی طرف چھوڑ کر یہ مسجد کے گرد تھا

پہلے گذر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب مسجد کی بنیاد رکھی تو اپنی دو بیویوں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے اسی طرح کچی اینٹوں اور کھجور سے دو گھر بنوائے جیسے یہ سامان مسجد میں لگا تھا۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کا ایک دروازہ تھا جو عرعر یا ساج کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ ابن نجار کہتے ہیں کہ جب آپ نے اپنی بیویوں سے نکاح فرما لئے تو ان کے لئے مکانات تعمیر کرائے' یہ کل نو گھر تھے اور یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے شروع ہو کر اس دروازے تک بنائے گئے تھے جو باب النبی کہلاتا ہے۔انتہی۔اس دروازے سے آپ کی مراد وہ دروازہ تھا جو مغرب کی جانب اس کے مقابلے میں تھا' آج کل اسے باب الرحمہ کہتے ہیں۔اپنی گفتگو میں ہم یہی مراد لیا کریں گے کیونکہ ان کے کلام میں ''الباب الذی یلیہ'' کے الفاظ واقع ہوئے ہیں اور اس کا معنی یہ ہے کہ جو اس کے مقابل ہے یعنی سامنے ہے اور اس لئے کہ انہوں نے اس کے بعد کہا ہے: اہلِ سیرت کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے حجرے بنائے' اس کے قبلہ اور مشرق سے شام کی طرف' مغرب میں نہیں بنائے تھے' یہ سب حجرے مسجد سے باہر تھے' مسجد کو گھیرے ہوئے تھے' صرف مغرب کی جانب کوئی حجرہ نہ تھا۔ان کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔انتہی۔

لگتا ہے کہ خطیب بن حملہ نے اس سے حجروں کے بارے میں اختلاف رائے سمجھ لیا چنانچہ کہا: کہتے ہیں کہ یہ تمام حجرے مشرق کی طرف تھے اور کچھ کہتے ہیں کہ مغرب کی طرف چھوڑ کر ہر طرف تھے۔

میں کہتا ہوں اوّلیت اسی کو حاصل ہے جسے ہم نے تسلیم کیا کہ ابن جوزی نے اپنی شرف المصطفیٰ میں سے لکھا' راوی محمد بن عمر ہیں۔ کہتے ہیں' میں نے مالک بن ابو الرجال سے پوچھا' حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کے حجرے کہاں واقع تھے؟ تو انہوں نے بتایا کہ سب دائیں جانب تھے' یعنی جب تم ''امام کی طرف'' نماز پڑھنے کے لئے جاتے وقت ''منبر سامنے'' رکھو۔یہ منبر سب سے بعید تھا اور جب حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا وفات پا گئیں تو نبی کریم

ﷺ نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس میں داخل فرما دیا۔ انتہٰی۔

روایت میں ''وجہ الامام اور وجہ المنبر'' سے ان کی مراد یہ ہے کہ جب منبر پر شام کی طرف کھڑا ہو اس دروازے کی طرف ہو جو آج کل باب الرحمۃ کے نام سے مشہور ہے قبل اس کے کہ اسے آج کے دن جہاں تبدیل کر دیا گیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ قبلہ کی طرف کوئی بھی حجرہ موجود نہ تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق محمد بن ھلال کہتے ہیں: میں نے دیکھا تو حضور ﷺ کی بیویوں کے گھر کھجور سے بنے تھے جنہیں بالوں سے بنے ٹاٹ سے ڈھانکا گیا تھا' یہ قبلہ' مشرق اور شام کی طرف ایک لائن میں تھے' ان میں سے مغرب میں کوئی بھی گھر نہ تھا' حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا دروازہ شام کی طرف تھا اور اس کا ایک ہی دروازہ تھا جو عَرعَر اور ساج کی لکڑی سے بنا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن یزید ھذلی کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھر دیکھے تھے جب حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں گرایا تھا' وہ کچی اینٹوں سے بنے تھے' ان کے حجرے کھجور سے بنے تھے جن پر مٹی لگائی گئی تھی' میں نے شمار کیا تو نو تھے اور حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس دروازے تک پھیلے ہوئے تھے جو نبی کریم ﷺ کے دروازے سے ملے تھے اور آج کل حضرت اسماء بنت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تک تھے۔

میں کہتا ہوں کہ عبد اللہ کے قول: ''الی الباب الذی یلی باب النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے مراد وہی ہے جو پہلے گذر چکا اور جس سے مراد باب الرحمہ ہے اور ان کے قول ''اسماء کے گھر تک'' کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ان گھروں میں سے کچھ مسجد کے راستے سے خارج تھے کیونکہ اسماء کا مذکورہ گھر اس دروازے کے سامنے تھا جو باب النساء کی طرف شامی جانب ملتا تھا اور یہ بات بعید ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں مسجد نبوی اس حد تک پھیلی ہو لیکن حضرت فاطمہ کے گھر کے بیان میں عنقریب آئے گا جس سے واضح ہو گا کہ ان کا گھر اس دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا لہٰذا یہ احتمال باقی ہے کہ مسجد وہاں تک وسیع ہو علاوہ ازیں امام بخاری نے یہ حدیث روایت کی ہے: ''حضور ﷺ مسجد میں تھے' بیویاں آپ کے پاس تھیں' وہ لوٹ آئیں تو آپ نے صفیہ بنت حیی سے فرمایا' جلدی کی ضرورت نہیں' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ان کا گھر اُسامہ کے حویلی میں تھا چنانچہ حضور ﷺ ان کے ساتھ نکلے۔الحدیث۔

حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک روایت ہے' بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اعتکاف میں تھے میں رات کو زیارت کی خاطر حاضر ہوئی' کچھ دیر گفتگو کی اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور واپسی کی تیاری کی چنانچہ آپ مجھے چھوڑنے تشریف لائے جبکہ وہ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر میں قیام رکھتی تھیں چنانچہ انصار کے دو آدمی گذرے۔الحدیث۔

ایک روایت یہ ہے کہ وہ زیارت کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں جبکہ آپ رمضان کے

آخری دس دنوں کے لئے مسجد میں اعتکاف کیے ہوئے تھے اور پھر اُٹھ کر واپس آنے لگیں تو رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب آپ اُم المؤمنین اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے پر مسجد کے دروازے کے قریب پہنچے تو آپ کے نزدیک سے انصار کے دو شخص گذرے۔الحدیث۔اس روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت صفیہ کا گھر ان میں شامل نہیں تھا جو مسجد کے اردگرد تھے۔

ابن شبہ نے اُسامہ کے گھر کے بارے میں کچھ نہیں کہا' یہ ذکر کیا ہے کہ ان کے والد نے دو گھر بنائے تھے جن میں سے ایک مسجد میں توسیع کے وقت شامل ہو گیا اور شاید یہی مراد ہے۔واللہ اعلم۔

آیئے یحییٰ کے مطابق عبد اللہ بن زید کی روایت دوبارہ لیتے ہیں' وہ کہتے ہیں' میں نے اُمّ المؤمنین اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر دیکھا' ان کا حجرہ کچی اینٹوں سے بنا تھا' میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا: جب نبی کریم ﷺ نے غزوہ دومۃ الجندل کے لئے تشریف لے گئے تو اُم سلمہ نے کچی اینٹوں سے اپنا گھر بنایا' حضور ﷺ واپس تشریف لائے تو اینٹوں کی طرف دیکھا' ایسے گھر میں آپ کی پہلی بیوی داخل ہوئیں' آپ نے پوچھا: یہ کیسی عمارت ہے؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے ارادہ کیا کہ لوگوں کی آنکھوں کو اس طرف دیکھنے سے باز رکھوں۔آپ نے فرمایا اے اُم سلمہ! سب سے بری وہ چیز جس میں مسلمان کا مال ضائع ہوتا ہے' یہی تعمیر ہے۔

علامہ واقدی کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث معاذ بن محمد انصاری کو بتائی تو انہوں نے کہا کہ میں نے عطاء خراسانی سے سنا (وہ اس وقت قبر انور اور منبر کے درمیان تھے وہی عمران بن ابی انس بھی تھے) انہوں نے کہا: میں نے ازواجِ رسول ﷺ کے حجرے دیکھے تو وہ کھجور کے بنے تھے' ان کے دروازوں پر سیاہ بالوں سے بنے کمبل پڑے تھے پھر میں اس جگہ گیا جہاں ولید بن عبد الملک کا خط پڑھا جا رہا تھا' اس نے کہا تھا کہ ازواجِ نبی ﷺ کے سب حجرے گرا دو' اس دن لوگوں کو میں نے اتنا روتے دیکھا کہ کبھی نہیں روئے ہونگے۔

حضرت عطاء کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن میسّب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا' فرمایا: بخدا' مجھے تو یہ بات پسند تھی کہ انہیں اسی حال پر رکھا جاتا تاکہ مدینہ میں پیدا ہونے والے اور باہر سے آنے والے لوگ یہ دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں کتنے پر گذارہ فرمایا' یہ مکان مالداروں اور فخر کرنے والوں کو زھد کی تعلیم دیتے۔

حضرت عطاء خراسانی جب بات کر چکے تو حضرت عمران بن ابی انس نے بتایا کہ یہاں چار گھر تھے جو کچی اینٹوں سے بنے تھے اور ساتھ کھجور سے بنا حجرہ تھا جبکہ پانچ گھر کھجور سے بنے تھے جن کے ساتھ حجرہ نہ تھا اور دروازوں پر بالوں کا بنا پردہ تھا' میں نے پردہ کی پیمائش کی تو یہ تین ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا نیز اس چوڑائی میں ہاتھ کی موٹائی بھی شامل تھی۔

رہا وہ جو میں نے بہت رونے کا ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں مسجد میں موجود تھا' اس میں صحابہ کرام کے لڑکے حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن' حضرت ابو امامہ بن سہل اور حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود تھے' وہ

روئے جارہے تھے اور روتے روتے داڑھیاں بھیگ گئی تھیں۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دن فرمایا: کاش انہیں اسی طرح رہنے دیا جاتا تاکہ لوگ تعمیرات میں اتنا خرچ نہ کرتے اور لوگ دیکھتے کہ اللہ اپنے نبی کے بارے میں کس قدر پر راضی ہے حالانکہ دنیا بھر کے خزانوں کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔

علامہ رزین کے مطابق عبد اللہ بن یزید ھلالی نے بتایا کہ جب مسجد میں ملانے کے لئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے مکانات گرائے تو وہ کچی اینٹوں سے بنے تھے۔

حضرت محمد بن عمر کہتے ہیں کہ حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اراضی مسجد کے قرب و جوار میں تھی' جب بھی رسول اللہ ﷺ نکاح فرماتے تو حضرت حارثہ زمین پیش کرتے' یوں ان کی ساری زمین رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے کام آئی۔

میں کہتا ہوں' اس روایت میں بظاہر گزشتہ اس روایت سے اختلاف ہے جس میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے اپنی دو بیویوں کے مکان بنائے تھے اور جب بھی آپ نکاح فرماتے ان کے لئے مکان تیار کراتے جاتے اور نظر یہ آتا ہے کہ جب بھی نکاح فرماتے' اس زوجۂ محترمہ کے لئے مکان بنوا دیتے' یہاں یہ مطلب ہوگا کہ حضرت حارثہ نے آپ کو اراضی فراہم کر دی اور آپ بناتے چلے جاتے۔

زرکشی کہتے ہیں کہ ہمیں یہ روایت نہیں پہنچ سکی کہ مسجد بناتے وقت آپ نے نو مکان بنائے ہوں' لگتا بھی نہیں کہ آپ نے بنوا دئے ہوں' آپ نے ایک مکان کا ارادہ فرمایا یہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے تھا پھر ضرورت نہ رہی' پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے بنوایا' یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے تو گویا آپ نے مختلف اوقات میں یہ مکانات بنوائے تھے۔ انتہی۔

یہ وہی بیان ہے جو ہم بتا چکے البتہ یہ اس کے خلاف ہے جو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے بارے میں بتا چکے' کیونکہ اس کے بارے میں آیا ہے کہ مسجد کی تعمیر کے ساتھ ہی تعمیر فرمایا تھا' یہی بات ظاہر ہے کیونکہ اس وقت وہ آپ کی زوجہ بن چکی تھیں لیکن ابھی تک مکان نہیں بنوایا تھا لہٰذا اس کی تیاری کی اور ایک حجرہ بنوا دیا۔

علامہ اقشہری کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب مدینہ منورہ میں پہنچیں تو اس سلسلے میں فرمایا: ''پھر ہم مدینہ پاک پہنچے' میں آل ابوبکر کے پاس ٹھہری' آلِ رسول بھی وہیں تھے' نبی کریم ﷺ مسجد اور کچھ گھر تعمیر فرما رہے تھے جو مسجد کے گرد تھے' ان میں اپنے بیوی کو رکھا' ہم کچھ دن وہاں ٹھہرے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اپنے بیوی بسانے میں آپ کو کیا رکاوٹ ہے؟ آپ نے فرمایا: مہر کی' چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ساڑھے بارہ اوقیہ دئے (بارہ درہم) جو آپ نے ہماری طرف بھیج دئے اور آپ نے اس گھر میں میرے ساتھ مباشرت فرمائی جس میں میں اب ہوں اور یہی وہ گھر ہے جس میں آپ کا وصال ہوا اور دفن ہوئے۔

مَشْرَبہ

میں کہتا ہوں کہ میں نے کسی مؤرخ کے کلام میں نہیں دیکھا کہ انہوں نے اس مشربہ (بالا خانہ) کا ذکر چھیڑا ہو جس میں رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں سے مہینہ بھر ایلاء کے موقع پر ٹھہرے ہوں اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس بالا خانہ کے لئے ان میں سے کسی ایک کے گھر سے دروازہ نہ تھا تاکہ یہ بات حاصل ہوتی کہ آپ ان کے پاس نہ جا سکیں، صحیح بخاری میں قول حفصہ موجود ہے:

ایک روایت میں اس بالا خانہ کا نام ''علّیہ'' اور ایک میں ''غرفہ'' ہے، امام بخاری نے اس پر باب باندھا ہے ''باب هجرة النّبی صلی اللّٰه علیه وسلم نسائه فی غیر بیوتهنّ'' ایک روایت میں ہے کہ آپ اپنے بالا خانے میں ٹھہرے تھے۔ ایک روایت ہے ''اچانک حضور ﷺ بالا خانے پر تیزی سے چڑھ گئے۔'' ایک روایت میں ہے کہ میں داخل ہوا تو رباح نظر آئے جو حضور ﷺ کے غلام تھے، وہ بالا خانے کے دروازے پر کھدی ہوئی لکڑی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے، وہ ایک تنا تھا جس پر آپ چڑھتے اُترتے تھے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں داخل ہو جایا کرتا کیونکہ ابھی میں نوخیز بچہ تھا، چھت پر ہاتھ ڈال سکتا تھا، ہر گھر کا ایک حجرہ تھا اور وہ حجرہ عرعر کی لکڑی سے بنا تھا۔ یہ لکھا ملتا ہے کہ آپ کا دروازہ ناخن سے کھٹکھٹایا جاتا کیونکہ کنڈا نہیں تھا۔

حضرت مالک کہتے ہیں کہ مسجد تنگ ہوگئی تھی، ازواجِ مطہرات کے حجرے مسجد میں سے نہ تھے البتہ ان کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا مکان حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دینے کی نصیحت کر دی تھی، حضرت صفیہ کے اولیاء نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ وہ مکان ایک لاکھ اسّی ہزار درہم میں بیچ دیا تھا جبکہ حضرت معاویہ نے حضرت عائشہ سے ان کا گھر بھی ایک لاکھ اسّی ہزار درہم کے عوض خریدا تھا، کچھ کہتے ہیں کہ دو لاکھ کا خریدا تھا اور یہ شرط لگائی تھی کہ آپ اس میں زندگی بھر رہیں گی اور پھر مال پیش کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ابھی مجلس سے اُٹھنے بھی نہیں پائی تھیں کہ سارا راہِ خدا میں تقسیم فرما دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ نے نہیں بلکہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آپ سے خریدا تھا اور مال سے لدے پانچ اونٹ آپ کے ہاں بھیج دئے تھے، شرط یہ تھی کہ زندگی بھر آپ یہیں ٹھہر سکیں گی چنانچہ انہوں نے سب کچھ تقسیم فرما دیا۔

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن زبیر کو دو اعزاز ملے، کسی اور کو ان جیسا اعزاز نہ مل سکا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کے لئے اپنے مکان اور حجرہ کی وصیت فرما دی تھی اور اُدھر حضرت سودہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان بھی آپ ہی نے خریدا تھا۔

میں بتاتا چلوں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ حجرے آپ کی بیویوں کی ملکیت تھے' اس کی تائید گذشتہ واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ حضورﷺ کی عدم موجودگی میں انہوں نے حجرہ کی تعمیر فرمائی تھی البتہ یہ واقعہ اس کے خلاف ہے جس میں ہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وصال ہوا تو حضورﷺ نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے گھر میں داخل فرما دیا تھا۔ہاں قرآنِ کریم میں کبھی تو ان گھروں کی نسبت حضورﷺ کی طرف آئی ہے اور کبھی ان کی طرف اور بظاہر تو پہلی نسبت حقیقی ہے کیونکہ پہلے آ چکا ہے کہ انہیں آپ ہی نے بنایا تھا اور دوسرے یہ کہ آپ پر انہیں رہائش فراہم کرنا لازم تھا ہاں البتہ آپ کے وصال کے بعد انہیں ان میں رہنے کا حق تھا کیونکہ وہ آپ کے حق میں رُکی ہوئی تھیں۔

ابن زبیر بن منیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں: امام بخاری نے ایک باب کا ذکر کیا ہے: بَابُ مَا جَاءَ فِي بُيُوْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ اور اس میں ان کی طرف گھروں کی نسبت کی ہے اور فرمانِ الٰہی:

وَقَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ

''اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔'' پھر

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ إِلَّآ أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ

''اجازت کے بغیر نبی کریمﷺ کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو۔''

اس سے امام بخاری کا ارادہ یہ بتانا ہے کہ جب تک ازواجِ مطہرات حیات رہیں' ان کا حق تھا کہ ان میں ٹھہری رہیں کیونکہ ان کا نان نفقہ اور رہائش حضورﷺ کی خصوصیت تھی اور راز اس میں یہ ہے کہ وہ وہاں پابند رہیں۔ انتھٰی

اور یہ بھی تو احتمال ہے کہ کسی کو گھر کی ملکیت عطاء فرما دی ہو یا سبھی کو ملکیت دے دی ہو جیسے کچھ علماء نے کہا ہے۔

طبری کہتے ہیں' کہا گیا ہے کہ حضورﷺ نے اپنی ہر زوجہ کو اس مکان کی ملکیت دیدی تھی جس میں وہ رہتی تھیں چنانچہ اسی ملکیت کی وجہ سے وہ ان میں ٹھہری رہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں گھروں کے بارے میں اعتراض نہ تھا کیونکہ یہ سہولت انہیں اس بناء پر حاصل تھی جو آپ نے انہیں اپنی زندگی بھر میں دے رکھی تھی کیونکہ مکان آپ کے قبضہ میں تھے' آپ نے فرمایا تھا: اپنی بیویوں کے خرچہ اور کام کرنے والے والے کی دلجوائی سے جو بچ رہے' وہ صدقہ ہوگا۔ یہ زیادہ راجح ہے کیونکہ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ان کے وارث ان کی طرف سے ان کے گھروں کے وارث نہیں بنے اور اگر یہ ان کی ملکیت میں ہوتے تو وارثوں کو ضرور ملتے اور چونکہ ان کے وارثوں نے یہ حقوق ترک کر دیئے تھے تو پتہ چلا کہ وہ وارث نہ تھیں' یہی وجہ ہے کہ وہ مکان مسجد میں داخل کر دیئے گئے جس میں مسلمانوں کا نفع تھا۔ انتھٰی

البتہ یہ بات کہ ان کے وارث گھروں کے مالک نہ ہوئے تو اس میں اعتراض باقی ہے کیونکہ مکانات کے ان کے نام نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا حق ہی نہیں تھا' کیونکہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کو مسجد میں داخل کرنے کے معاملے میں آلِ عمر کی طرف جو کچھ ہوا' اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے وارث ان مکانوں کے وارث تھے

اور یہ بھی احتمال ہے کہ حجروں کو مسجد میں شامل کرنے کا معاملہ ان وارثوں سے شرائط طے کرنے کے بعد ہوا ہو اور اگر ان کی ملکیت میں ہوتے تو لازمی طور پر وارثوں کو ملتے۔ قبل ازیں اس پر ابن سعد کی شہادت گذر چکی انہوں نے اپنی طبقات میں کہا ہے: حضرت عامر کہتے ہیں: حضور علیہ السلام کا وصال ہوا تو آپ نے اپنی بیویوں کے مکانوں اور زمین کے علاوہ کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ انتہی اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے اپنی ازواج ہی کے بارے میں وصیت فرمائی ہو ہاں اور احتمال بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۰

نبی کریم علیہ السلام کی لخت جگر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارکہ

یحییٰ کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان اس کھڑکی کی طرف تھا جو قبرِ انور کی طرف تھی، نبی کریم علیہ السلام کے گھر اور اس کے درمیان ایک خوخہ (چھپّر) تھا۔

حضرت عمر بن علی بن عمر بن علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان اس مقام پر تھا جہاں سے آپ نکلا کرتے، اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی طرف ایک روشن دان تھا۔ حضور علیہ السلام جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خبر گیری کے لئے نکلتے تو اس روشن دان سے فاطمہؓ کے گھر میں جھانکتے اور یوں حالات کا پتہ چلا لیتے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت علی سے کہا کہ میرے دونوں بیٹے گذشتہ دو راتوں سے بیمار ہیں، اگر آپ تیل مہیا کر دیں تو میں گھر میں روشنی کر لوں، حضرت علی بازار گئے اور ان کے لئے تیل خرید کر سیّدہ فاطمہ کو لا دیا جس سے انہوں نے چراغ جلایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رات کو گھر سے طہارت کے لئے نکلیں تو ان کے پاس چراغ دیکھا تو کچھ گفتگو کی چنانچہ صبح ہونے پر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس بارے میں حضور علیہ السلام بات کی چنانچہ انہوں نے اسے بند کرا دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی، یا رسول اللہ! ہم آپ کے طہارت خانے میں دیکھا کرتے ہیں تو وہاں کوئی چیز نہیں ہوتی، آپ نے فرمایا کہ جو کچھ انبیاء علیہم السلام سے نکلتا ہے، زمین اسے نگل لیتی ہے، اسی لئے کوئی رڈی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اس دن حضرت یحییٰ کے ذہن میں آئی کہ حدیث میں مذکور لفظ "مخرج" سے مراد طہارت خانہ ہے، اسی موقع پر انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ طہارت خانہ حضرت عائشہ کے گھر کی پچھلی طرف تھا جو حضرت عائشہ کے گھر اور حضرت فاطمہ کے گھر کے درمیان تھا، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکان زور میں تھا اور ابن ابو مریم کی روایت اس کی شہادت دی رہی ہے، کہا: حضور علیہ السلام کی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی چوڑائی اس ستون تک تھی جو اس ستون کے پیچھے تھا جو زور کے سامنے تھا اور مسلم بن سالم نے کہا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ علیہ السلام کے پاس رات کے آخری حصے میں اس ستون تک آئے جو اس ستون کے پیچھے تھا جو زور کے سامنے تھا، ان کا

گھر اس مربعہ میں تھا جو قبر میں ہے۔ سلیمان نے کہا: مسلم نے کہا کہ یہاں نماز پڑھنے میں کوتاہی نہ کرنا' کیونکہ یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہ دروازہ ہے جس کی طرف سے آپ وہاں داخل ہوتے تھے اور پھر میں نے حضرت حسن بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہاں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

ہم نے ستون مربعۃ القبر کے بارے میں لکھا کہ نبی کریم ﷺ حضرت علی کے دروازے کی طرف تشریف لایا کرتے تھے۔ یحییٰ کی روایت میں یوں ہے: حضرت علی حضرت فاطمہ' حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھر تشریف لاتے اور دروازے کا کواڑ تھام لیتے اور فرمایا کرتے السلام علیکم اھل البیت' دوسری روایت میں ہے کہ تین مرتبہ فرماتے ''الصّلوٰۃ الصّلوٰۃ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ اے اہلِ بیت تم سے ہر قسم کی برائی دور فرمادے اور تمہیں خوب پاکیزہ بنادے۔'' اور یہ بھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ستونِ تہجد حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے پچھلی طرف تھا۔

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر سے تشریف لاتے تو مسجد کی طرف سے آتے' مسجد میں دو نفل ادا فرماتے' پھر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خیریت دریافت فرماتے اور پھر اپنی بیویوں کے گھروں میں تشریف لاتے۔ ایک جگہ الفاظ یہ ہیں کہ ''فاطمہ کے گھر تشریف لے جاتے اور پھر ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جاتے۔''

یحییٰ کے مطابق محمد بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سفر سے واپسی پر حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے جاتے اور کافی دیر قیام فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر پر تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے گھر کے دروازے پر مختلف قیمتی چیزیں ڈال کر اسے چھپا دیا کہ ان کے والد اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنا تھا اور جب آپ تشریف لائے تو صحابہ کو دروازے پر کھڑا فرمایا' دیر تک ان کے پاس ٹھہرے' صحابہ کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ یہیں ٹھہریں یا واپس چلے جائیں' اتنے میں آپ نکلے تو غضبناک دکھائی دیئے' سیدھے منبر پر تشریف لے گئے' سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سمجھا کہ یہ معاملہ دروازہ پر ہار اور پردہ ڈالنے کی وجہ سے ہوا ہے چنانچہ انہوں نے وہاں سے سب کچھ اُتار دیا اور پردہ بھی اُتار کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیج دیا اور پیغام بھیجا کہ آپ سے عرض کرو' آپ کی بیٹی سلام عرض کر رہی ہے اور عرض کرتی ہے کہ انہیں راہِ خدا میں دیدو۔ ایلچی پہنچا تو آپ نے فرمایا: فاطمہ نے اپنے باپ پر سب کچھ قربان کر دیا ہے' (تین مرتبہ) یہ دنیا نہ تو محمد کے کسی کام کی ہے اور اگر اس دنیا کی اللہ کے ہاں مچھر کے پَر جتنی بھی حیثیت ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ جتنی بھی نہ دی جاتی' پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے پاس تشریف لے آئے۔

حضرت جعفر کے والد محمد نے کہا' رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ لوگ آئے' جسم پر لباس نہ تھا روم سے جنگ کر کے آئے تھے۔ آپ سیّدہ فاطمہ کے پاس تشریف لے گئے' انہوں نے دروازے پر پردہ ڈال رکھا تھا' فرمایا: کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ تمہیں ڈھانپے رکھے؟ یہ مجھے دیدو' انہوں نے پردہ پیش کر دیا' لے کر باہر تشریف لائے اور پھاڑ کر ہر ایک کو دو ہاتھ لمبا' ایک ہاتھ چوڑا ٹکڑا دیدیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ہماری خیریت دریافت کرنے تشریف لائے' یہیں رات گذاری' اس وقت حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سوئے ہوئے تھے' اتنے میں حضرت حسین نے پانی مانگا' آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مشکیزہ پکڑ کر اسے نچوڑا' پیالے میں ڈالا' حضرت حسین پکڑنے لگے تو منع فرمایا اور حضرت حسن کو پہلے دیا' اس پر سیدہ فاطمہ نے عرض کی: لگتا ہے کہ آپ کو حسن سے محبت زیادہ ہے' فرمایا انہوں نے پہلے مانگا تھا' پھر فرمایا: میں' تم' یہ اور یہ یعنی حسن و حسین اور سوئے ہوئے علی' قیامت کے دن ایک مکان میں ہوں گے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ہمیں ملنے تشریف لائے تو ہم نے خزیرہ بنایا (ایک کھانا' گوشت اور آٹے سے تیار شدہ)' اُم ایمن نے دودھ کا پیالہ بھیجا اور کھجوروں کا ایک تھیلہ' آپ نے کھایا اور ہم نے بھی کھایا' پھر میں نے آپ کو وضو کرایا' آپ نے سر اور پیشانی پر ہاتھ لگایا اور پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر اتنی دیر تک دُعا کی جتنی اللہ کو منظور تھی' پھر زمین کی طرف جھکتے' آنسو گر رہے تھے تین مرتبہ یوں کیا' مارے خوف کے ہم آپ سے پوچھ نہیں رہے تھے' اتنے میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اچھل کر آپ کی پیٹھ پر جا بیٹھے اور رونے لگے۔آپ نے فرمایا: میرے ماں باپ فدا ہوں' کیوں روتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: ابا جان! میں نے آپ کو وہ کچھ کرتے دیکھا ہے کہ ویسا آج تک کرتے نہیں دیکھا۔فرمایا: اے بیٹا! آج تو میں تم پر اتنا خوش ہوں کہ اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی لیکن میرے دوست جبریل نے مجھے آ کر بتایا ہے کہ تم قتل کر دئے جاؤ گے اور تمہارے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوں گے جس سے مجھے نہایت غم ہوا ہے چنانچہ میں نے اللہ سے بھلائی کی دُعا کی ہے۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ آج کل حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گرد مقصورہ ہے اور اس میں محراب ہے' یہ مکان حضور ﷺ کے حجرہ کی پچھلی طرف تھا۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل جالیاں آپ کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ مبارکہ کے گرداگرد لگائی جا چکی ہیں اور جس محراب کی ابن نجار نے بات کی ہے' وہ زور کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی پچھلی طرف ہے' اس کے اور اس درمیان ایک جگہ ہے جس کا لوگ احترام کرتے ہیں' اس پر پاؤں نہیں رکھتے' یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر مبارک ہے جیسے آگے ایک قول آ رہا ہے' اور ہم پہلے جو کچھ لکھ چکے ہیں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر مربعۃ القبر اور ستونِ تہجد کے درمیان تھا اور رات کے آخری حصے میں آپ اس ستون کی طرف آئے جس طرف محراب تھا جو آج بھی ان کے گھر کے اندر ہے کیونکہ وہ ستون جو زور کے سامنے ہے' وہ وہی ہے جو ستونِ مربعہ کی لائن میں دیوار میں ملتا ہے جو حجرہ شریفہ سے ملی ہوئی ہے' اس کا کچھ حصہ شام والی جانب کی دیوار میں ہے اور جو عمارت ہم نے دیکھی ہے' اس میں یہ سب مسجد میں داخل کر دیا گیا ہے' اس کے پیچھے وہ ستون ہے جس میں زور کے دونوں کنارے آ ملتے ہیں اور اس کے پیچھے وہ ستون ہے جس کی طرف محراب مذکور واقع ہے چنانچہ اس پر وہ بات سچی آتی ہے جو کلامِ شبہ میں گذر چکی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کے

پچھلے حصہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اس ستون کی طرف تشریف لائے جو زور والے ستون کے پیچھے تھا لیکن اس سے قبل ابن شبہ کے یہ الفاظ ملتے ہیں: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مدینہ میں دو مکان بنائے' جن میں سے ایک تو مسجد نبوی میں شامل ہو گیا' یہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہ گھر تھا جس میں آپ رہائش رکھتی تھیں اور مسجد میں اس کی جگہ حضرت عثمان بن عفان کے (جو مسجد کے مشرق میں تھا) اور اس دروازے کے درمیان تھی جو حضرت اسماء بنت حسن بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھر کی مشرقی جانب تھا اور ان کا دوسرا گھر وہ تھا جو بقیع میں واقع ہے' وہ حضرت علی کی اولاد کے قبضہ میں تھا۔

یہ جو انہوں نے کہا ''دارِ عثمان کے درمیان'' تو اس کا مطلب ہے اس کے بالمقابل اور ''دارِ اسماء کے سامنے والے دروازے'' کا بھی یہی مطلب ہے۔

آئندہ صفحات میں آ رہا ہے کہ یہ دروازہ باب النساء کے بعد میں ہے اور رباط النساء کے مقابل ہے جسے آج کل رباط السبیل کہا جاتا ہے لیکن یہ بات کئی وجوہ سے قابل تسلیم نہیں:

(۱) ایک تو اس لئے کہ اسطوانِ تہجد کے بیان میں آ چکا کہ وہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی پچھلی طرف تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ بابِ جبریل (جو دارِ عثمان کے مقابل ہے) حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھا تو پھر حضرت علی کا یہ گھر اس مقام پر کیسے ہو سکتا ہے؟

(۳) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسجد میں اضافہ کیا اور باب النساء رکھا' وہ بابِ جبریل اور اس دروازے کے درمیان تھا جسے ابن شبہ نے ذکر کیا ہے' حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر مسجد میں ولید نے شامل کیا تھا۔ ہم عنقریب بتائیں گے اسے مسجد میں داخل کرتے وقت کیا کچھ ہوا تھا۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ مسجد نبوی اور فاطمہ کے گھر کی پچھلی طرف کھلا راستہ تھا تو اس صورت میں سیّدہ فاطمہ کے گھر کا دھیان کئے بغیر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر ہی نے باب النساء بنایا تھا' یونہی بابِ جبریل کے بارے میں بھی کہا جائے گا کہ وہ آج کل اس کے عین مقابل ہے لیکن اس کے اور حضرت فاطمہ کے گھر کے درمیان کھلا راستہ اس طرف سے ہے' اور اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ جب انہوں نے اس غربی ستون کے لئے زمین کھو دی' تاکہ قبہ وغیرہ بنا سکیں' جس کی طرف شام کی جانب حجرے کا دروازہ تھا تو انہوں نے بابِ جبریل کے بالمقابل اور حجرہ مذکورہ کے دروازے کے سامنے بنیاد دیکھی جو شام کی جانب جا رہی تھی (یہ اس آگ کا موقع تھا جسے ہم نے بھی دیکھا) پھر مسجد کی حدود میں گذر چکا ہے' جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دیوار مشرق میں وہیں تھی تو میرا غالب خیال یہ ہے کہ وہ بنیاد بابِ جبریل کی ہو گی اور وہاں سے ہٹنے سے قبل وہیں ہو گی۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۱

مسجد میں کھلنے والے دروازوں کو بند کرنے کا حکم اور کونسا بند نہیں کیا گیا تھا

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ باب باندھا ہے: "باب" حضورﷺ کا یہ فرمان کہ ابوبکر کے علاوہ سب کے دروازے بند کر دو۔" امام بخاری نے اسے نماز کے بیان میں ان الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ "میری طرف سے سب جھونپڑے بند کر دو تو گویا آپ نے یہاں' صرف معنوی طور پر لکھا ہے پھر امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا' انہوں نے فرمایا: حضورﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا' فرمایا: اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دے دیا ہے کہ دنیا میں رہیں یا اللہ کے ہاں کے انعامات حاصل کریں تو اس بندے نے اللہ کے ہاں جانا پسند کر لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رو پڑے' ہم نے ان کے رونے پر تعجب کیا کہ آپ کو اس بندے کے بارے میں کیسے پتہ چل گیا حالانکہ یہ اختیار رسول اللہﷺ کو دیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر ہم سے زیادہ علم والے تھے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر مال خرچ کرنے اور ساتھی ہونے کے لحاظ سے حضرت ابوبکر کا بہت زیادہ احسان ہے اور اگر میں ربّ کریم کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو وہ ابوبکر ہوتے لیکن یہ اسلامی بھائی چارہ اور دوستی ہے' مسجد کا کوئی دروازہ بند کرنے سے نہ رہنے پائے' ابوبکر کا دروازہ رہنے دو۔"

امام مسلم نے مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے ایسی ہی روایت کی اور فرمایا: مسجد میں کسی کا جھونپڑا سوائے ابوبکر کے نہیں رہ جانا چاہئے۔

"خوخہ" دیوار میں چھوٹے دروازے کو کہتے ہیں جو روشنی کے لئے رکھا جاتا ہے جس کا بلند ہونا ضروری نہیں اور جہاں نیچے ہوتا ہے تو اسے کسی مکان تک جلد پہنچنے کے لئے بطور راستہ استعمال کیا جا سکتا ہے' یہاں یہی مقصد ہے چنانچہ اس لئے "باب" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وہ حدیث جس کی طرف "صلوٰۃ" میں اشارہ کیا گیا ہے' اس کا موقع وہ تھا جب مرض الموت کی حالت میں تھے۔ امام مسلم نے بھی حضرت جندب کی حدیث لکھی کہ آپ نے یہ بات وصال سے پانچ راتیں پہلے فرمائی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ابوبکر غار میں میرے ساتھی اور انس و محبت کا سامان تھے' مسجد میں کھلنے والا ہر دروازہ بند کر دو' صرف ابوبکر کا رہنے دو۔

طبرانی نے بذریعہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کی ہے اور اس میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب

آپ پر سات کنوؤں کے کئی مشکیزے پلٹ دیے گئے تھے' الفاظ یہ ہیں: مسجد میں کھلنے والے یہ دروازے دیکھو اور باب ابوبکر کو چھوڑ کر سب بند کر دو۔

طبقات ابن سعد کے مطابق حضرت یحییٰ بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سے مال خرچ کرنے اور ساتھی ہونے کے لحاظ سے مجھ پر ابوبکر کا بہت احسان ہے لہٰذا مسجد میں کھلنے والے سب دروازے' ماسوائے ابوبکر کے' بند کر دو۔

حضرت معاویہ بن صالح کہتے ہیں کہ اس پر لوگوں نے کہا: ہمارے دروازے تو آپ نے بند کر دئے اور اپنے خلیل کا رہنے دیا ہے۔ حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: مجھے ابوبکر کے بارے میں تمہاری شکایت مل گئی ہے' میں ابوبکر کے دروازے پر ایک عظیم نور دیکھ رہا ہوں جبکہ تمہارے دروازوں پر تاریکی ہے۔

اسی میں یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر کے علاوہ سب دروازے بند کرنے کا حکم فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! میری طرف بھی ایک روشن دان رہنے دیجئے کہ آپ مسجد میں نماز پڑھنے تشریف لائیں تو میں دیکھا کروں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔

خطابی اور ابن بطال کہتے ہیں کہ اس حدیث میں قوی اشارہ موجود ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کے حقدار تھے اور خاص طور پر یہ بھی دیکھئے کہ بیماری کی حالت میں زندگی کے آخری دنوں کے اندر آپ نے حضرت ابوبکر ہی کو حکم فرمایا تھا کہ صرف تم نماز پڑھایا کرو۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں' کچھ حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "باب" کا مطلب خلافت تھی' دروازے بند کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی خلافت کا مطالبہ نہ کرے گویا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی بھی خلافت کا مطالبہ نہ کرے' ہاں انہیں مطالبہ کرنے میں حرج نہیں۔

کچھ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مدینہ طیبہ کے بالائی حصے عوالی مدینہ "سُنح" میں تھا لہٰذا مسجد میں ان کا خوخہ (دروازہ) ناممکن ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ بات کمزور سی ہے کیونکہ "سنح" میں آپ کا مکان ہونا' آپ کے مسجد کے پڑوس میں آپ کے مکان ہونے سے رکاوٹ نہیں بنتا۔ سنح میں آپ کا مکان دامادوں کا تھا جو انصار سے تعلق رکھتے تھے' آپ کی وہاں ایک بیوی بھی تھیں جن کا نام بالاتفاق اسماء بنت عمیس تھا اور اگر ان دنوں اُم رومان موجود تھیں تو وہ ہوں گی۔

عمر بن شبہ نے "اخبار مدینہ" میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا وہ مکان' جس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اسے رہنے دیا جائے' وہ مسجد کی طرف تھا اور ساتھ ملا ہوا تھا' وہ آپ کے قبضہ ہی میں اس وقت تک رہا جب تک آپ کو کسی آنے والے گئے ضرورت نہیں پڑی چنانچہ آپ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے چار ہزار درہم میں خرید لیا۔

میں کہتا ہوں کہ واقعہ کا باقی حصہ آگے آ رہا ہے جس میں یہ ہے کہ حضرت عمر نے اضافہ کے دوران اسے مسجد میں داخل کر دیا تھا۔

ابن شبہ' بنو تیم کے گھروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بقیع کی گلیوں میں عثمان سے ذرا پہلے چھوٹا سا مکان بنایا تھا اور مسجد کے قریب بھی ایک گھر بنایا تھا اور یہی وہ مکان تھا جس کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ابوبکر کا دروازہ چھوڑ کر میری طرف کے سب دروازے بند کر دو اور حضرت ابوبکر نے "سنخ" میں ایک مکان بنایا تھا۔

جمال مطری کہتے ہیں کہ اس کے متعلق ابن نجار نے کہا: اہل سیرت لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کا دروازہ مسجد کے مغرب میں تھا' یہ بھی لکھا ہے کہ منبر کے قریب تھا اور جب اس کی مغربی حد تک مسجد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے یہ دروازہ تبدیل کر دیا اور آپ کے پہلے مکان کی طرح بنا دیا جیسے آج کل حضرت عثمان کا دروازہ وہیں کر دیا گیا ہے۔ جہاں پہلے تھا۔

مطری کہتے ہیں' آج کل حضرت ابوبکر کا دروازہ حرم کی کچھ چیزیں رکھنے کے سٹور کا دروازہ ہے' جب تم باب السلام سے مسجد میں جاؤ تو یہ دروازے کے قریب ہی بائیں طرف ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سٹور کے' مدرسہ اشرفیہ کی عمارت کے نزدیک' تین دروازے ہیں اور اس خوخہ کی جگہ اس تیسرے دروازے سے بائیں طرف یوں دکھائی دیتا ہے جب تم باب السلام کی طرف آؤ۔ یہ قدیم دور میں چونے کا سٹور رہا ہے جسے تعمیر کے لئے رکھا گیا تھا۔

مطری کا یہ کلام ابن زبالہ کے مطابق ہے کیونکہ انہوں نے بھی کہا تھا: اسحاق بن مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ وہ چھوٹا سا دروازہ جو مسجد کی غربی جانب باب زیاد کے پہلو میں ہے' وہاں دائیں طرف رحبۃ القضاء میں خوخہ ابوبکر ہے' جب مسجد میں توسیع ہوئی تو وہاں سے ایک طرف کر دیا گیا تو یہ دائیں طرف آ گیا یعنی داہنی طرف سے دیکھیں تو' اور "رحبۃ القضاء" اس خوخہ سے پہلے تھا اور حسن عتیق کی لائن میں تھا جسے سلطان اشرف نے ہمارے دور کی آتشزدگی کے بعد مدرسہ بنا لیا تھا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مسجد کے قریبی گھروں کے دروازے بند کرنے کے بارے میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جو بظاہر گذشتہ احادیث کے خلاف ہیں' ان میں سے ایک حضرت سعد بن ابو وقاص والی حدیث ہے' فرمایا تھا: حضور علیہ السلام نے مسجد میں کھلنے والے دروازوں کو بند کرنے کا حکم فرمایا تھا جبکہ حضرت علی کا دروازہ چھوڑ دیا تھا۔ (احمد نسائی)

طبرانی نے اوسط میں یہ روایت لی ہے: صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے دروازے بند کر دئے' آپ نے فرمایا تھا کہ یہ میں نے بند نہیں کئے بلکہ اللہ نے کر دئے ہیں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہمارے کچھ صحابہ کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا' یہ سب دروازے بند کر دو' صرف علی کا رہنے دو۔ لوگوں نے اس بارے میں تعجب کیا لیکن تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: بخدا میں نے نہ تو کسی چیز کو بند کیا ہے اور نہ ہی کھولا ہے' مجھے تو ایک حکم ملا تھا جسے میں نے پورا کر دیا۔ (احمد' نسائی' حاکم)

میں کہتا ہوں کہ امام احمد کے الفاظ یہ ہیں: زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ کے کچھ صحابہ کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے' ایک دن آپ نے فرمایا: حضرت علی کا دروازہ چھوڑ کر سب بند کر دو' اس سلسلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر حمد و ثناء الٰہی کی' فرمایا: اما بعد! مجھے تو حکم ہوا ہے کہ حضرت علی کا دروازہ چھوڑ کر یہ سب دروازے بند کرا دوں لیکن تم لوگ اعتراض کر رہے ہو' بخدا میں نے نہ تو کوئی دروازہ بند کیا ہے اور نہ کسی کو کھولنے کا حکم دیا ہے۔ الحدیث۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے مسجد کے دروازوں کے متعلق فرمایا تو حضرت علی کے دروازے کے علاوہ سب بند کر دیے گئے' وہ ناپاکی کی حالت میں یہیں سے گزرتے کیونکہ کوئی اور دروازہ تھا ہی نہیں۔ (احمد و نسائی)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی کے دروازے کے علاوہ سب دروازے بند کرنے کا حکم دیا' حضرت علی ناپاکی کی حالت میں وہاں سے کئی مرتبہ گزرے۔ (طبرانی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں کہا کرتے تھے کہ: رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے افضل ہیں' پھر حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تین خصلتیں عنایت فرمائی گئی تھیں کہ ان میں سے مجھے اگر ایک بھی حاصل ہو جائے تو میرے لئے قیمتی سرخ اونٹوں سے پیاری ہوتی: حضور ﷺ نے اپنی صاحبزادی ان سے بیاہی اور ان سے ان کی اولاد بھی ہوئی' ان کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کر دیے گئے اور جنگ خیبر میں انہی کو علم دیا گیا تھا۔ (احمد)

نسائی شریف کے مطابق علاء بن عرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ حضرت عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں مجھے کچھ بتائیے۔ الحدیث۔ اسی میں آتا ہے: رہے علی' تو ان کے بارے میں کسی سے مت پوچھو' دیکھو رسول اللہ ﷺ کے ہاں ان کا کیا مقام ہے' مسجد میں کھلنے والے ہم سب کے دروازے بند کر دیے گئے لیکن ان کا دروازہ رہنے دیا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ان احادیث میں سے کچھ' دوسری احادیث کو طاقت دیتی ہیں' ان میں سے ہر روایت قابل دلیل ہے' تمام کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں ذکر کیا ہے' اسے حضرت سعد بن ابو وقاص' زید بن ارقم اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لیا ہے اور اس کے راویوں پر طعن کرنے والوں کے لئے علت بنایا ہے اور اس میں حرج

نہیں کیونکہ میں نے بہت سے طریقوں کا ذکر کیا ہے پھر اسے حضرت ابوبکر کے بارے میں دی گئی احادیث کی مخالفت کے لئے علت بنایا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ یہ روایت رافضی شیعہ لوگوں کی طرف سے گھڑی گئی ہے جسے وہ حضرت ابوبکر کے بارے میں مذکور صحیح حدیث کے مقابلے میں لائے ہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہاں ابن جوزی نے سخت غلطی کھائی ہے کیونکہ اپنے وہم کی بناء پر وہ صحیح احادیث کا رد کرنے چلے ہیں حالانکہ ان دونوں واقعات کو جمع کیا جا سکتا ہے چنانچہ بزار نے اس طرف مسند میں اشارہ کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں: اہلِ کوفہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں حسن احادیث آتی ہیں اور اہلِ مدینہ کی طرف سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں احادیث وارد ہیں اگر اہلِ کوفہ کی روایات ثابت ہو جائیں تو ان دونوں طرح کی احادیث کو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت شدہ اس حدیث کی روشنی میں جمع کیا جا سکتا ہے انہوں نے فرمایا: میرے اور تیرے سوا بحالت پلیدی اس مسجد میں سے گذرنا جائز نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت علی کا دروازہ مسجد کی جانب تھا اس کے سوا ان کے لئے کوئی اور دروازہ تھا ہی نہیں لہٰذا اسے بند کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اس کی تائید حضرت مطلب بن عبداللہ بن حنطب کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت علی بن ابو طالب کے علاوہ کسی کو بھی حالتِ جنابت میں مسجد سے گذرنے کی اجازت نہ دی کیونکہ ان کا دروازہ مسجد میں تھا۔

ان دونوں احادیث کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ دروازے بند کرنے کا حکم دو مرتبہ ہوا تھا چنانچہ پہلے موقع پر تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس وجہ سے حکم نہیں فرمایا تھا کہ ان کا دروازہ مسجد کی طرف تھا اور تھا ہی نہیں لیکن دوسرے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو الگ رکھا۔ لیکن یہ بات اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک حضرت علی کے قصے میں دروازے کا حقیقی معنٰی مراد نہ لیا جائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے سے مراد مجازی نہ لیا جائے یعنی خوخہ (دریچہ چھوٹا دروازہ) اور گویا جب انہیں دروازے بند کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے دروازے بند کر کے چھوٹے دروازے رکھ لئے جن سے مسجد میں عبادت کے لئے جا سکیں اور پھر بعد میں انہیں بند کر دیا گیا چنانچہ یہ وہ طریقہ ہے جس سے دونوں مذکورہ حدیثیں جمع کی جا سکتی ہیں اور اسی طریقہ سے امام طحاوی نے بھی مشکل الآثار میں دونوں کو جمع کیا ہے جبکہ کلا بازی نے معانی الاخبار میں لکھ دیا ہے اور وضاحت سے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک دروازہ باہر کی طرف تھا جبکہ دوسرا مسجد میں تھا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے صرف مسجد ہی میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ اس عبارت کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کیونکہ اس میں احادیث کو جمع کا طریقہ گذشتہ طریقہ سے الگ ہے کیونکہ پہلے طریقے کا حاصل یہ تھا کہ دونوں دروازے باقی رہے اور جنہیں دروازے بند کرنے کا حکم تھا وہ ایسے لوگ تھے جن کے مسجد میں کھلنے والے دروازوں کے علاوہ اور دروازے بھی تھے رہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو

ان کے لئے مسجد والے دروازے کے علاوہ اور کوئی دروازہ تھا ہی نہیں چنانچہ شارع علیہ السلام نے اسے خصوصی فرمایا اور انہیں مسجد کی طرف راستہ دیا' اب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے کو الگ کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا اکثر علماء نے صرف اسی کو بیان کیا ہے اور پھر جس نے حضرت علی کے دروازے کا ذکر کیا ہے ان کا ارادہ یہ بتانا ہے کہ وہ بند نہیں کیا گیا تھا اور وضاحت سے اسے بھی باقی رکھنے کا ذکر کیا۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ واقعے دو تھے' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پہلے ہوا جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بعد میں اور اس کی دلیل یحییٰ کے مطابق یہ ہے کہ جب مسجد میں کھلنے والے ان کے دروازے بند کرنے کا حکم ہوا تو حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرخ رنگ کی چادر کھینچتے ہوئے آئے' آنکھیں ٹپک رہی تھیں اور وہ رو رہے تھے' عرض کی یا رسول اللہ! اپنے چچا کو تو آپ نے نکال دیا لیکن چچا کے بیٹے کو (اس حکم سے) نہیں نکالا۔آپ نے فرمایا: میں نے نہ تو آپ کو نکالا ہے اور نہ ہی انہیں جگہ دی ہے' انہیں جگہ دینا اللہ ہی کا کام ہے۔اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے کا ہے۔

بزار کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا' میرے ساتھ چلو اور انہیں کہہ دو کہ اپنے اپنے دروازے بند کر لیں' میں ساتھ گیا اور انہیں کہہ دیا' سیّدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ سب نے بند کر لئے۔میں نے عرض کی یا رسول اللہ! حضرت حمزہ کے علاوہ سب نے بند کر لئے ہیں' فرمایا حمزہ سے کہہ دو کہ اپنا دروازہ کسی اور جگہ رکھ لیں۔میں نے جا کر کہا' رسول اللہ علیہ السلام ارشاد فرما رہے ہیں کہ آپ اپنا دروازہ کسی اور طرف نکال لیں چنانچہ انہوں نے بدل لیا۔میں واپس آیا تو آپ نماز میں مصروف تھے پھر فرمایا کہ گھر واپس چلے جاؤ۔

بزار کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے میرا ہاتھ تھاما اور فرمایا: حضرت موسےٰ علیہ السلام نے اپنے ربّ سے سوال کیا تھا کہ ہارون کے ذریعے ان کی مسجد پاکیزہ بنا دے اور میں نے اللہ سے دُعا کی ہے کہ میری مسجد کو تیرے اور تیری اولاد کے ذریعے پاکیزہ بنا دے' پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغام بھیجا کہ اپنا دروازہ بند کر لو' انہوں نے پہلے تو انا للہ پڑھا اور پھر کہا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر چنانچہ اپنا دروازہ بند کر لیا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغام بھیجا پھر حضرت عباس کو بھی ایسا ہی پیغام بھیجا۔اس کے بعد رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ: تمہارے دروازے میں نے بند نہیں کرائے اور نہ ہی علی کا دروازہ کھلا رہنے دیا ہے' اللہ ہی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دروازہ کھلا رہنے دیا ہے اور تمہارے دروازے بند کرائے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں انہوں نے حضرت حمزہ کی جگہ حضرت عباس کا ذکر کیا ہے اور جو کچھ آگے آ رہا ہے وہ محلِ نظر ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بعد میں فرمایا تھا کیونکہ حضرت عباس تو فتح مکہ کے موقع پر مدینہ آئے تھے۔

ابن زبالہ و یحییٰ کے مطابق ایک صحابی نے روایت کی اور کہا: عین اسی موقع پر جب ہم رسول اللہ علیہ السلام کی مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک آواز دینے والا آیا' کہنے لگا: اپنے دروازے بند کر دو' لوگوں نے سنا تو شش و پنج میں پڑ گئے' کوئی بھی نہ اُٹھا' وہ پھر دکھائی دیا اور کہا کہ اپنے دروازے بند کر دو' پھر بھی کوئی نہ اُٹھا' لوگ کہنے لگے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟

وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ عذاب اُترنے سے پہلے اپنے دروازے بند کر دو' لوگ جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے' حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ "دروازے بند کر دو" کی آواز سنتے ہوئے چادر گھسیٹتے ہوئے نکلے۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہر ایک کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے سرہانے کھڑے ہو گئے' آپ نے فرمایا: کیوں کھڑے ہو؟ اپنے گھر جاؤ! انہیں دروازہ بند کرنے کو نہیں فرمایا۔ صحابہ نے کہا آپ نے ہمارے دروازے بند کرا دئے لیکن حضرت علی کا رہنے دیا حالانکہ وہ پہلے سے یہاں تھے' کسی نے کہا کہ رشتہ داری کی بناء پر چھوڑ دیا' پھر کہا کہ حضرت حمزہ اس لحاظ سے زیادہ قریب ہیں' وہ آپ کے رضاعی بھائی اور چچا ہیں' بعض نے کہا کہ اپنی بیٹی کی وجہ سے رہنے دیا ہے۔ یہ بات رسول اکرم ﷺ تک پہنچ گئی۔ آپ تیسرے دن ان کی طرف گئے' آپ نے حمد و ثناء بیان کی' چہرہ پر سرخی تھی' جب بھی آپ غصہ میں ہوتے تو آپ کے چہرے میں ایک رگ سرخ ہو جاتی' پھر فرمایا: اما بعد ذٰلکم! سنو! حضرت موسےٰ علیہ السلام کی طرف اللہ نے وحی فرمائی کہ ایک پاکیزہ مسجد بناؤ جس میں وہ' حضرت ہارون اور ان کے بیٹے شبر اور شبیر ہوا کریں اور اللہ نے میری طرف بھی وحی فرمائی ہے کہ ایک پاکیزہ مسجد بنا لو جس میں مَیں' علی اور ان کے دونوں بیٹے حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم رہیں چنانچہ میں مدینہ پہنچا اور اس میں میں نے مسجد بنا دی اور اس کی طرف اس وقت نہیں پھرا جب تک حکم نہیں ہوا' میں اتنا ہی علم رکھتا ہوں جتنا مجھے سکھایا گیا' وہی کرتا ہوں جس کا حکم دیا گیا۔ میں اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلا' انصار مجھے ملے' وہ کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ! ہمارے پاس اُتر آیئے' میں نے ان سے کہا' میری اونٹنی کو راستہ دیدو کیونکہ یہ حکم کی پابند ہے چنانچہ میں وہاں اُترا جہاں یہ بیٹھ گئی تھی' بخدا نہ تو میں نے دروازے بند کئے ہیں اور نہ ہی رہنے دئے ہیں' علی کو میں نے چھوڑا' انہیں اللہ نے رہنے دیا ہے۔

حضرت سعد بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دروازے بند کرنے کا حکم فرمایا کہ مسجد میں کھلنے والے سب بند کر دو' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دروازہ رہنے دیا۔ ابویعلیٰ' بزار اور طبرانی نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ: انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے حضرت علی کے دروازے کے علاوہ ہم سب کے دروازے بند کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: دروازے میں نے بند نہیں کرائے' یہ تو اللہ نے بند کرائے ہیں۔

یحیٰی کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دروازے بند کر دو چنانچہ حضرت علی کے دروازے کے علاوہ سب بند کر دئے گئے جس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی' یا رسول اللہ! حضرت علی کے علاوہ آپ نے ہم سب کے دروازے بند کرا دئے ہیں' آپ نے فرمایا کہ میں نے نہ تو بند کرائے ہیں اور نہ ہی کھلوائے ہیں۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت علی کا دروازہ چھوڑ کر مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کرا دو' یہ سن کر ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے اتنی جگہ رکھنے کی اجازت دیجئے جہاں سے میں آ جا سکوں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس کی اجازت نہیں۔ پھر عرض کی کہ یا رسول اللہ! اتنی جگہ کی

اجازت دیجئے جس سے اپنا سینہ نکال سکوں فرمایا اس کی بھی اجازت نہیں لہٰذا چلے جاؤ! اس نے پھر عرض کی کہ یا رسول اللہ! سر نکالنے کی جگہ دیدیں آپ نے فرمایا کہ اس کی بھی اجازت نہیں۔ وہ روتے ہوئے پیچھے مڑے تو آپ نے فرمایا: مجھے اجازت نہیں: بس علی کا دروازہ چھوڑ کر سارے دروازے بند کر دو۔

طبرانی کے الفاظ یہ ہیں: حضور ﷺ نے حضرت علی کے علاوہ سب کے دروازے بند کرنے کا حکم فرمایا تو حضرت عباس نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے لئے اس قدر اجازت دیجئے کہ میں اکیلا اس جگہ سے آ جا سکوں۔ آپ نے فرمایا: اس بارے میں مجھے کوئی اجازت نہیں چنانچہ دروازۂ علی کے علاوہ سب دروازے بند کر دئے گئے۔ راوی کہتے ہیں آپ نکلتے تو کئی مرتبہ جنابت کی حالت میں ہوتے۔

حضرت عمرو بن سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کر دینے کا حکم فرمایا ایک صحابی نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے ایک روشندان (یا چھوٹا دروازہ) کی اجازت دیجئے کہ صبح و شام آپ گذریں تو میں آپ کو دیکھ لیا کروں آپ نے فرمایا: ہرگز نہیں میں تو سوئی کے سوراخ جتنی جگہ بھی کھلا رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ دروازے بند کرنے کے حکم کے وقت آپ نے پہلے پہل خوخہ (چھوٹا دروازہ) تک بلکہ اس سے بھی کم بنانے کی اجازت نہیں دی اور اگر یہ بات صحیح ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعد میں خوخہ کی اجازت فرما دی تھی اور قصۂ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد میں ہوا۔

طبقات ابن سعد کے مطابق ابو البداح بن عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کیسی بات ہے کہ کچھ لوگوں کو تو آپ نے مسجد میں دروازے کھلے رکھنے کی اجازت دے رکھی ہے اور کچھ کو بند کرنے کا فرما دیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اے عباس! میں نے اپنے حکم سے نہ تو کھلوائے ہیں اور نہ ہی بند کرائے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۲

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے مسجد نبوی میں اضافہ

چودھویں فصل میں بخاری کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فرمان ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اکرم ﷺ والی مسجد میں کوئی اضافہ نہ کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ ابو داؤد کی روایت میں آ رہا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں مسجد کے ستون کمزور ہو گئے تھے آپ نے انہیں کھجور

کے تنوں سے بنا دیا اور یہ بات اس بات کے مخالف نہیں کہ آپ نے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔

اہلِ سیرت کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافہ نہ کرنے کی وجہ فتوحات میں مصروف رہنا تھا اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے کہا: میرا ارادہ ہے کہ مسجد میں کچھ اضافہ کروں؛ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سن نہ رکھا ہوتا کہ ''مسجد میں اضافہ کرنا ہوگا'' تو میں ذرہ بھر بھی اضافہ نہ کرتا۔

تاریخ یافعی میں ہے کہ آپ نے یہ اضافہ ۱۷ھ کو کیا تھا' دوسرے مؤرخ کہتے ہیں کہ اس سال آپ نے مسجد حرام میں اضافہ کیا تھا' مسجد مدینہ میں اضافہ نہیں کر سکے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا اور ابوبکر خلیفہ بنے تو انہوں نے مسجد میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے مسجد کے ستون کچی اینٹوں سے بنائے اور لکڑی سے بنے الگ کر دئے اور قبلہ کی طرف اضافہ کر دیا' قبلہ کی طرف حضرت عمر کی تیار کردہ مسجد کی دیوار کی حد وہی قبلہ والے ستون تھے جس طرف جالی لگی ہے جو ستونوں کے درمیان قبلہ کی طرف ہے اور اس پر چھت پڑی ہوئی تھی لیکن وہ جو بخاری و ابو داؤد میں عنقریب آ رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں اضافہ کیا اور حضور ﷺ کے عہد کی مسجد کی بنیادوں پر کچی اینٹ اور کھجور کی ٹہنیوں سے تعمیر کی اور لکڑی کے ستون لگا دئے تو یہ روایت ابن زبالہ کی اس روایت کے خلاف ہے جس میں ہے کہ حضرت عمر نے ستون کچی اینٹوں سے بنائے تھے' تاہم قابلِ بھروسہ روایت بخاری ہے۔

احمد کے مطابق حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ستون سے جالیوں تک اضافہ کیا اور فرمایا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ سے میں نے یہ سن نہ رکھا ہوتا کہ ''ہمیں مسجد میں اضافہ کرنا ہوگا۔'' تو کبھی بھی اضافہ نہ کرتا۔

یحییٰ کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا' اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا نہ ہوتا کہ ہمیں مسجد میں اضافہ کر دینا چاہئے تو میں کوئی اضافہ نہ کرتا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ عہد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں لوگ بڑھ گئے تو ان سے کسی نے عرض کی' اے امیر المؤمنین ! آپ نے مسجد میں اضافہ کر دیا ہوتا تو بہتر تھا' حضرت عمر نے فرمایا: اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن نہ رکھا ہوتا کہ: ''میں چاہتا ہوں کہ قبلہ کی طرف ہماری مسجد میں اضافہ کر دیا جائے۔'' تو میں کبھی بھی اضافہ نہ کرتا۔

مسلم بن حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ایک دن اپنے مصلے پر تھے کہ فرمایا: ''اگر ہم اضافہ کر دیتے'' اشارہ قبلہ کی طرف تھا چنانچہ ایک آدمی کو بلایا گیا اور اسے مصلائے نبی کریم ﷺ کی طرف بٹھایا گیا پھر اس کا ہاتھ اونچا نیچا کیا' انہوں نے اندازہ کر لیا کہ حضور ﷺ نے یہاں تک ہاتھ بلند کیا ہوگا پھر ایک رسی منگوائی اور اس کا ایک

پھر اس آدمی کے ہاتھ میں دیا اور پھر اسے کھینچا اور آگے پیچھے کرتے رہے اور یوں انہوں نے یقین کر لیا کہ حضور ﷺ نے یہاں تک اضافے کا اشارہ کیا تھا چنانچہ حضرت عمر قبلہ کی طرف بڑھے' یوں حضرت عمر کی دیوار جالیوں کی لکڑیوں کے مقام سے شروع ہوئی۔

حضرت عمر اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان گفتگو

ابن سعد کے مطابق حضرت سالم ابو النصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب دورِ عمر میں لوگوں کی تعداد بڑھ گئی اور مسجد تنگ ہوتی دکھائی دی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس بن عبد المطلب اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مکانوں کے علاوہ مسجد کے قریبی مکان خرید لئے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اے ابو الفضل! مسلمانوں کی یہ مسجد تنگ ہو رہی ہے لہٰذا میں آپ کا گھر اور اُمہات المؤمنین کے حجرے چھوڑ کر اردگرد کے مکان خرید رہا ہوں تاکہ مسلمانوں کی یہ مسجد وسیع کی جا سکے' اُمہات المؤمنین کے حجروں کی جرأت تو میں کر نہیں سکتا' رہا آپ مکان تو آپ اسے بیچ دیں' جتنی چاہیں قیمت لے لیں' میں بیت المال سے ادا کر دیتا ہوں تاکہ مسجد کو وسیع کر سکیں۔ حضرت عباس نے فرمایا' میں تو ایسا نہیں کروں گا۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ تین میں سے ایک بات مان لیں' ایک یہ کہ آپ بیت المال سے جتنی چاہیں رقم لے کر اسے بیچ دیں یا اس کے بدلے جہاں آپ چاہیں میں بیت المال سے جگہ لے کر آپ کو مکان تعمیر کر دیتا ہوں یا پھر مسلمانوں کو دیدیں' مسجد کی توسیع میں آپ کا حصہ ہو جائے گا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور کہا میں نہیں دونگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' کوئی ثالث بنا لیجئے' انہوں نے کہا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ثالث ہیں چنانچہ دونوں حضرت ابی بن کعب کے پاس پہنچے اور انہیں یہ قصہ سنایا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' چاہو تو میں ایک حدیث بیان کر دیتا ہوں جو میں نے حضور ﷺ سے سن رکھی ہے۔ انہوں نے کہا بتایئے' انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ نے سنا تھا' فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف پیغام بھیجا کہ میرے لئے ایک گھر بنا دو جس میں میری یاد ہوا کرے چنانچہ انہوں نے یہ خطۂ زمین بیت المقدس اس غرض سے تیار کرنے کا ارادہ کیا' دیکھا تو اس کی حد کے ایک کنارے میں بنو اسرائیل کے ایک شخص کا مکان تھا' حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے کہا کہ تم اسے بیچ دو۔ اس نے انکار کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دل میں سوچا کہ اس سے زبردستی لے لیں۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ اے داؤد! میں نے تو تمہیں یہ حکم دیا تھا کہ میرے لئے ایک ایسا گھر بنا دو جس میں میرا ذکر ہوا کرے لیکن تم نے چھینی ہوئی زمین پر بنانے کا ارادہ کر لیا ہے' یاد رکھو! ایسا گھر میری شان کے لائق نہیں' اب اس کی سزا یہ ہے کہ تم اسے نہیں بنا سکو گے۔ انہوں نے عرض کی' اے پروردگار! میری اولاد میں سے کوئی بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری اولاد میں سے کوئی بنائے گا۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابی کا دامن تھاما اور کہا کہ میں تو ایک معمولی فیصلہ کرانے آیا تھا

لیکن آپ نے اور مشکل میں پھنسا دیا ہے اور میرے ہاتھ سے یہ معاملہ نکال دیا ہے۔ پھر انہیں ساتھ لئے مسجد میں آئے اور لا کر صحابہ کرام کے مجمع میں بٹھا دیا جن میں حضرت ابو ذر بھی تھے۔ حضرت ابی نے کہا کہ میں اس شخص کی قسم دیتا ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس کے ذکر کے لئے گھر بنائے۔ اس پر حضرت ابو ذر نے کہا' یہ بات میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی' دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی سنی تھی۔ حضرت عمر نے حضرت ابی کو بلایا تو وہ حضرت عمر کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: اے عمر! کیا آپ نے میری بیان کردہ حدیث پر اعتماد نہیں کیا؟ حضرت عمر نے فرمایا: اے ابو المنذر! واللہ! میں تہمت نہیں لگاتا' میں نے خیال کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث واضح کر دی جائے۔

اب حضرت عمر نے حضرت عباس سے کہا: آپ جائیے' اس بارے میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ یہ سن کر حضرت عباس نے کہا: یہ بات ہے تو میں یہ مکان مسلمانوں کی مسجد کے لئے از خود پیش کرتا ہوں تاکہ مسجد وسیع ہو سکے' آپ کو اس سلسلے میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں چنانچہ حضرت عمر نے ان کا گھر مسجد میں شامل کر کے بیت المال سے انہیں مکان بنا دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ جب عمر نے مسجد نبوی میں اضافہ کا ارادہ فرمایا تو حضرت عباس کا مکان رکاوٹ بنا' حضرت عمر نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد میں شامل کر لیں اور انہیں معاوضہ دیدیں مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عطا کردہ ہے چنانچہ دونوں میں اختلاف ہو گیا' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ثالث مان لیا گیا اور دونوں ان کے گھر چلے گئے' انہیں لوگ سید المسلمین کہتے تھے' انہوں نے دونوں کے لئے تکیئے لگا دئے' وہ ان کے سامنے بیٹھ گئے' حضرت عمر نے اپنا ارادہ بتایا اور حضرت عباس نے عطیۂ رسول ہونے کا ذکر کیا۔ اس پر حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور نبی داؤد علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اس کے لئے گھر بنائے' انہوں نے عرض کی: الٰہی! یہ کہاں ہو گا؟ اللہ نے فرمایا: جہاں تم فرشتے کو تلوار ننگا کئے دیکھو گے' انہوں نے اسے ایک ٹھوس جگہ پر دیکھا' اچانک دیکھا تو وہ بنی اسرائیل کے لڑکے کی جگہ تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس کے پاس گئے اور فرمایا مجھے حکم ملا ہے کہ اس جگہ اللہ کے لئے ایک گھر بنا دوں' اس لڑکے نے کہا: یہ آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ میری مرضی کے بغیر بنا دو؟ آپ نے فرمایا: نہیں' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ میں نے زمین بھر کے خزانے تمہارے قبضے میں کر دئے ہیں لہٰذا اسے راضی کر دو۔ حضرت داؤد پھر اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے اللہ نے تمہیں راضی کرنے کا حکم فرمایا ہے لہٰذا اس کے بدلے میں میں تجھے قنطار بھر سونا دیتا ہوں۔ اس نے کہا میں قبول کرتا ہوں' اے داؤد! یہ بتاؤ کہ یہ بہتر ہے یا قنطار؟ انہوں نے کہا' یہ بہتر ہے' وہ کہنے لگا تو پھر مجھے راضی کیجئے' آپ نے فرمایا' تین قنطار لے لو' پھر خوب زور دیا اور آخر نو قنطار تک لے پہنچا۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا کہ میں اس کی قیمت نہیں لوں گا' میں یہ مسلمانوں کے

فائدے میں پیش کرتا ہوں' حضرت عمر نے اسے قبول کر لیا اور مسجد میں شامل کر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھر (بیت المقدس) حضرت داؤد علیہ السلام نے بنایا تھا اور سب سے پہلے آپ ہی نے اسے بنایا تھا اور پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا' روایت طبرانی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے لئے اس زمین میں ایک گھر بنا دو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک مسجد بنائی اور جب دیواریں مکمل ہو گئیں تو دو تہائی گر گئیں' انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں شکایت کی جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ وہ میرا گھر صحیح نہیں بنا سکیں گے اور پھر پہلے واقعہ کے خلاف بیان کیا۔ یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے پریشانی کا سبب بنی۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں نے تمہارے لڑکے سلیمان سے بنوانے کا فیصلہ کیا ہے۔

نسائی شریف کے مطابق جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس بنایا تو اللہ تعالیٰ سے تین خصلتیں مانگیں۔ الحدیث۔

تعمیر مسجد حضرت داؤد علیہ السلام نے کی ہو یا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بخاری و مسلم میں آنے والی یہ حدیث مشکل پیدا کرتی ہے' حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زمین پر بننے والی سب سے پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: مسجد حرام تھی۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ پھر کونسی بنی تھی؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے پوچھا کہ دونوں کے درمیان کتنا عرصہ تھا؟ آپ نے فرمایا کہ چالیس سال کا۔

یہ اشکال دور کرنے کے لئے ابن جوزی کی یہ روایت سامنے رکھیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف بنایا' ان کے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ تھا۔

ابن نجار نے حدیث کے ظاہری معنٰی مراد لئے ہیں لہٰذا کہا: اس میں اس شخص کا ردّ ہے جس نے یہ کہا ہے کہ داؤد علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار کا فاصلہ تھا اور اگر ویسے ہوتا جیسے عمرو نے کہا تو چالیس سال کا عرصہ بنتا ہے اور یہ تو محال ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک لمبا عرصہ ہے اور پھر قرآن کریم کی نص سے بھی ثابت ہے کہ قتلِ طالوت میں قصۂ داؤد علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے کچھ عرصہ بعد ہوا تھا۔

ابن جوزی نے یہ جواب دیا ہے کہ صحیحین کی حدیث میں پہلی تعمیر کی طرف اشارہ ہے اور مسجد کی بنیاد کا ذکر ہے' نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اوّلاً کعبہ بنایا اور نہ ہی سلیمان علیہ السلام نے اوّلاً بیت المقدس بنایا تھا' روایت یہ ملتی ہے کہ بیت اللہ (کعبہ) سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا پھر ان کی اولاد زمین میں بکھر گئی تو جائز ہے کہ ان میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس بنایا ہو اور پھر قرآن کے واضح بیان کے مطابق حضرت ابراہیم نے کعبہ بنا دیا۔

ابن ہشام کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کعبہ شریف بنایا تو انہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے بیت المقدس کی طرف جانے کی درخواست کی کہ اب اسے تعمیر کریں' آپ نے تعمیر فرمائی اور اس میں عبادت کرتے رہے۔

ابن جوزی کا بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ حضرت داؤد سلیمان علیہما السلام کا مسجد اقصیٰ میں حصہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے نئے سرے سے بنایا' بنیاد نہیں رکھی تھی' بنیاد تو حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام نے رکھی تھی اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کا واقعہ ہے۔

اس پر پہلا قصہ اعتراض بنتا ہے کیونکہ اس وقت انہیں زمین خریدنے کی ضرورت نہ تھی ہاں خطابی کہتے ہیں' ہو سکتا ہے کہ مسجد اقصیٰ حضرت داؤد سلیمان علیہما السلام سے پہلے بنائی گئی ہو' پھر انہوں نے اس میں اضافہ وتوسیع کر دی ہو چنانچہ تعمیر ان کے نام کی طرف منسوب کر دی گئی ہو چنانچہ احتمال یہ ہے کہ یہ پہلا قصہ زیادتی کے دور سے تعلق رکھتا ہو اور اس کی تائید حاکم کی روایت سے ہوتی ہے' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ "ہم مسجد میں اضافہ کریں گے" اور آپ کا گھر مسجد کے بالکل قریب ہے' آپ یہ گھر دیدیں تو ہم اسے مسجد میں شامل کر لیں' ہم آپ کو اس سے وسیع زمین دے دیں گے۔ انہوں نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر میں زبردستی کرونگا' انہوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکے گا' انہوں نے کہا کہ پھر کوئی ثالث مقرر کر لیں جو میرا اور آپ کا فیصلہ کر دے' حضرت عباس نے کہا' کون ہوں گے؟ حضرت عمر نے کہا' حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ' چنانچہ دونوں ان کے پاس آ گئے اور یہ واقعہ سنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس بارے میں میرے پاس ایک حدیث موجود ہے' انہوں نے کہا کونسی؟ حضرت حذیفہ نے کہا کہ حضرت داؤد نبی علیہ السلام نے جب بیت المقدس میں اضافہ کا ارادہ کیا تو اس مسجد کے قریب ہی ایک یتیم کا گھر تھا' اس سے گھر مانگا تو اس نے انکار کر دیا' آپ نے زبردستی لینے کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آ گئی کہ میرے گھر کے لئے لوگوں کے گھر بطور ظلم نہ لو چنانچہ آپ نے رہنے دیا۔

اس پر حضرت عباس نے حضرت حذیفہ سے پوچھا: کچھ اور کہنا باقی ہے؟ انہوں نے کہا' نہیں۔ کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمر مسجد میں چلے گئے' یکایک دیکھا تو حضرت عباس کے مکان کا پرنالہ مسجد میں اترا ہوا تھا' اس سے پانی مسجد میں بہتا تھا' حضرت عمر نے اسے اپنے ہاتھ سے اتار دیا اور کہا کہ یہ پرنالہ حضور ﷺ کی مسجد میں نہیں بہ سکے گا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے حضرت محمد ﷺ کو سچا نبی بنا کر بھیجا' یہ انہی کا کام تھا کہ اس مکان کا پرنالہ یہاں لگایا تھا' اور ایک تم ہو کہ اسے اُتار رہے ہو۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اپنے دونوں پاؤں میرے کندھوں پر رکھو اور اسے اکھاڑ کر پہلے والی جگہ پر لگا دو۔ حضرت عباس نے یونہی کیا پھر حضرت عباس نے کہا کہ میں یہ مکان آپ کو دے رہا ہوں تا کہ مسجد نبوی میں اسے شامل کر لیں چنانچہ حضرت عمر نے وہ مکان مسجد میں شامل کر کے

اسے وسیع کر دیا اور پھر حضرت عمر نے انہیں زوراء کے مقام پر اس سے بھی وسیع گھر لے دیا۔

حضرت عبد اللہ بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتے ہیں کہ حضرت عباس کا ایک مکان مسجد کے قبلہ والی جانب میں تھا۔ادھر لوگ کافی ہو چکے تھے اور مسجد تنگ ہوتے دکھائی دے رہی تھی چنانچہ حضرت عمر نے حضرت عباس سے کہا' آپ خوشحال ہیں' یہ گھر مجھے دیدیں تو مسجد کو وسیع کر دوں لیکن حضرت عباس نے انکار کر دیا' حضرت عمر نے کہا' میں آپ کو پیسے اور زمین دونوں دیتا ہوں۔انہوں نے پھر بھی انکار کیا اور بتایا حضور ﷺ میرے کندھوں پر چڑھے تھے اور یہ پرنالہ آپ نے خود لگایا لہٰذا میں ایسا نہیں کرونگا' حضرت عمر نے کہا کہ میں ضرور لوں گا' دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ایک ثالث مقرر کر لیں چنانچہ دونوں نے حضرت ابی بن کعب کو ثالث مقرر کر لیا پھر ان کے پاس گئے اور اجازت مانگی' انہوں نے کچھ دیر کے لئے انہیں دروازے پر کھڑا رہنے دیا پھر اجازت دیدی اور بتایا کہ ایک لونڈی میرا سر دھو رہی تھی۔بہرحال حضرت عمر نے یہ واقعہ سنایا' پھر حضرت عباس نے اپنی بات سنائی۔انہوں نے کہا تمہارے اختلاف پر مجھے ایک علم کی بات یاد آ گئی ہے' میں تمہارا فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے شنید کی بناء پر کرونگا' آپ نے فرمایا تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس بنانے کا ارادہ کیا تو یہ جگہ دو یتیموں کی تھی جن کا تعلق بنو اسرائیل سے تھا' جگہ مسجد کے قبلہ میں تھی' آپ نے ان سے خریدنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔آپ نے کہا میں ضرور لوں گا۔اسی دوران اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ میرے گھر کی وجہ سے کسی کے گھر پر ظلم نہ ہو' میں بیت المقدس کی تعمیر سے تمہیں محروم کر رہا ہوں۔حضرت داؤد نے اپنے بیٹے کے بارے میں اسے تعمیر کرنے کی درخواست کی جسے اللہ نے منظور فرما لیا۔

یہ سن کر حضرت عمر نے حضرت ابی سے کہا کہ میں اس کا گواہ چاہتا ہوں' کون گواہی دے گا؟ حضرت ابی کہنے لگے: کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھ رہا ہوں؟ میرے گھر سے چلے جاؤ۔حضرت عمر انصار کی طرف گئے اور پوچھا' تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کو یوں کہتے سنا ہے؟ ان میں سے ایک ادھر سے بولا کہ میں نے سنا ہے' دوسرا بولا میں نے سنا ہے اور پھر محبت سے لوگوں نے یہ بات کہہ دی۔جب حضرت عمر کو معلوم ہو گیا تو انہوں نے کہا: اگر یہ گواہی نہ ملتی تو میں تمہاری بات نہ مانتا لیکن میں ثبوت چاہتا تھا۔(تو مل گیا)۔

ابو الزناد کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسجد کو وسیع کرنے لگے تو مسجد کے اردگرد رہنے والوں کو بلا لیا اور کہا: تین شرائط میں سے جو چاہو مان لو' یا فروخت کر کے اپنی رقم لے لو یا ہبہ کر دو' یہ اچھا کام ہو گا۔اور میں شکر گزار بنوں گا یا پھر مسجد رسول اللہ ﷺ کی خاطر دیدو۔سب نے یہ بات مان لی' یہیں حضرت عباس کا بھی ایک مکان تھا جو مسجد کی دائیں طرف تھا' حضرت عمر نے انہیں بلا کر کہا' اے ابو الفضل تین میں سے جو بات چاہو' مان لو اور پہلے والی بات دہرا دی۔حضرت عباس نے کہا کہ مجھے منظور نہیں۔حضرت عمر نے گرا دینے کی دھمکی دی' حضرت عباس نے کہا' یہ آپ کے لائق نہیں۔آگے پورا واقعہ بتایا۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس کے مکان پر بات کی' یہ

مکان مروان بن حکم کے گھر سے متصل ستون مربعہ کے ایک قطعۂ زمین میں تھا جو انہیں حضورﷺ نے دیا ہوا تھا' حضرت عمر نے اسے مسجد میں شامل کر کے اس کے بدلے میں اچھی خاص رقم دینے کی بات کی اور کہا کہ اے ابوالفضل! لوگ مسجد کی جگہ تنگ ہونے کی بات کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ مسجد کو وسیع کر دیا جائے لیکن عباس نے یہ دینے سے انکار کیا' حضرت عمر نے کہا' اس کے بدلے مدینہ میں آپ جہاں چاہیں میں آپ کو اس سے بہتر جگہ سے دیتا ہوں۔ حضرت عباس نہیں مانے' حضرت عمر نے کہا کہ لوگوں کے فائدے میں دے دیجئے! انہوں نے پھر بھی انکار کیا جس پر حضرت عمر نے کہا کہ میں بہر صورت لوں گا' حضرت عباس نے کہا' آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ حضرت عمر نے کہا تو پھر ثالث مقرر کر لیجئے چنانچہ دونوں حضرت ابی کے پاس چلے گئے' انہوں نے تھوڑی دیر دروازے پر روکے رکھا' پھر اندر آنے کی اجازت دیدی' اور بتایا کہ ایک لڑکی میرا سر دھو رہی تھی۔ پھر کہا کون بات کرے گا' حضرت عمر نے کہا' میں' ہم نے آپ کو اپنے درمیان ثالث بنایا ہے' ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے' حضرت ابی نے کہا' ابوالفضل آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا ابھی بات کروں گا' ادھر حضرت عمر بات کئے جا رہے تھے جس پر حضرت ابی نے کہا' اے ابن خطاب! یہ نبی کریم ﷺ کے قریبی ہیں تو انہیں بات کرنے کا موقع دیجئے ہاں ابوالفضل کے لئے! چنانچہ حضرت عباس نے کہا زمین کا یہ ٹکڑا مجھے رسول اللہﷺ نے عنایت فرمایا' میں نے اس کی بنیاد رکھی تو حضورﷺ نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا اور بخدا آپ ہی نے یہ پرنالہ مسجد کی طرف لگایا تھا اور باقی واقعہ سنایا' اسی میں حضرت عباس کا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے کہا' اور اگر آپ نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے تو یہ میں مسلمانوں کو پیش کرتا ہوں' حضرت عمر نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے کندھوں پر چڑھ کر پرنالہ لگا دیں۔

اس کے بعد حضرت عمر نے دیوار گرا کر اسے مسجد میں شامل کر لیا اور پھر کھجور کے وہ ستون بھی تبدیل کر دئے جو رسول اللہﷺ کے دور سے چلے آ رہے تھے' انہیں دیمک کھا گئی تھی۔

علامہ رزین نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے' الفاظ یہ ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ حضرت عمر کے دور میں بہت سے لوگ مدینہ میں جمع ہو چکے تھے' انہوں نے حضرت عمر سے کہا' اے امیر المؤمنین! آپ اگر مسجد وسیع کر دیں تو کتنا اچھا ہو چنانچہ آپ نے اضافہ کا ارادہ کر لیا اور اس سلسلے میں حضرت عباس کے گھر کے بارے میں ان سے بات کی جو مسجد کے ساتھ ہی تھا' ان سے کہا میں آپ کو اس سے بہتر لے دوں گا' یہ آپ مسلمانوں کے لئے دیدیں' انہوں نے انکار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ یہ مجھے رسول اللہﷺ نے عطا فرمایا تھا اور اس کا پرنالہ ان کے ہاتھوں سے لگا ہے۔ حضرت عمر نے کہا' میں ضرور لوں گا' انہوں نے کہا کہ آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا' دونوں نے حضرت ابی کو ثالث مان لیا' وہ کچھ دیر ان کے دروازے پر کھڑے رہے پھر انہیں اندر آنے کی اجازت دی' دونوں نے اپنی اپنی بات سنائی۔ حضرت ابی نے کہا: میں نے رسول اللہﷺ کی زبانی سنا تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس بنانے کا ارادہ کیا' وہ زمین بنو اسرائیل کے دو لڑکوں کی تھی' یہ اسی مقام پر تھی جہاں آپ مسجد بنانے چلے تھے' حضرت داؤد نے انہیں بیچنے کو

کہا اور قیمت کا لالچ دیا' انہوں نے بیچ دی اور ان سے کہا: جو کچھ آپ نے ہم سے لیا ہے وہ بہتر ہے یا جو کچھ ہمیں دیا ہے' انہوں نے کہا' جو میں نے لیا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ ہم یہ بیع جائز نہیں سمجھتے' آپ سے زیادہ قیمت دینے کو کہا اور یوں سات بار ہوا' آپ نے فرمایا اگر تم مانگو گے نہیں تو میں اتنی رقم اور زیادہ دوں گا' انہوں نے کہا ہم یقیناً بیچتے ہیں اور آپ سے سوال نہیں کریں گے' آپ نے فرمایا' ایسا کر لو چنانچہ انہوں نے بہت سی رقم مانگ لی' حضرت داؤد علیہ السلام کو گراں گذری' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ اگر تم اپنے مال سے انہیں دے رہے ہو تم جانو اور اگر ہمارے رزق سے دے رہے ہو تو انہیں اتنا کچھ دے دو کہ یہ راضی ہو جائیں کیونکہ میرا گھر ظلم سے بچنا چاہیے اور میں تمہیں اس کی تعمیر سے محروم کر رہا ہوں۔ حضرت داؤد نے عرض کی' اے پروردگار! اس کی اجازت سلیمان کو دیدے اس کے بعد حضرت ابی نے حضرت عباس کو سچا قرار دیا۔ اس پر حضرت عباس نے کہا' اب اگر آپ نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے تو میں یہ مسلمانوں کو پیش کرتا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گئے اور پرنالہ اتار دیا' انہیں اس پر افسوس ہوا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے لگایا تھا۔ آپ نے بتایا' بخدا اسے لگاتے وقت حضور ﷺ کے قدم میرے کندھوں پر تھے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا' تو پھر میرے کندھوں پر پاؤں رکھ کر وہیں لگا دو' انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے ان سے کہا: اب اسے اپنے ہاتھ ہی سے گرا دیجئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ پرنالہ اس سے پہلے اُتار دیا گیا تھا کیونکہ مکان متصل تھا اور پانی مسجد میں گرتا تھا (رزین) اور یحییٰ کے مطابق حضرت موسےٰ بن عقبہ بتاتے ہیں کہ حضرت عباس کے گھر کا پرنالہ مسجد میں لگا ہوا تھا' حضرت عمر آئے اور اسے اکھاڑ دیا جس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے اسے اپنے مبارک ہاتھوں سے لگایا تھا' اس پر حضرت عمر نے حضرت عباس سے کہا' اسے وہیں لگانے کے لئے یہ میری پیٹھ حاضر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ حضرت عمر کے راستے میں حضرت عباس کے مکان کا پرنالہ ہوتا تھا' حضرت عمر جمعہ کے لئے کپڑے پہن کر نکلے' حضرت عباس نے دو جانور ذبح کر رکھے تھے' جب آپ پرنالے کے برابر آئے تو پرنالے سے خون ملا پانی آپ کے کپڑوں پر گرا' آپ نے اسے اکھاڑنے کا حکم دیا اور پھر واپس جا کر کپڑے اتار دیئے اور دوسرے پہن لئے' پھر واپس آ کر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ اتنے میں حضرت عباس آئے اور انہیں بتایا کہ یہاں اسے حضور ﷺ نے لگایا تھا۔ اس پر انہوں نے حضرت عباس سے کہا' میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ میری پیٹھ پر چڑھ کر اسے وہیں لگا دیں جہاں حضور ﷺ نے اسے لگایا تھا چنانچہ انہوں نے یونہی کیا۔

یحییٰ کے مطابق یوسف بن ماجشون کہتے ہیں کہ جب بارش ہوتی تو مروان کے گھر کے پرنالے سے ان کے گھروں سے نکلے پر پانی گرتا' مروان کا یہ گھر ان دنوں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا' حضرت عمر کے حکم پر وہ پرنالہ اُتار دیا گیا' حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اسے حضور ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے

لگایا تھا اس پر حضرت عمر نے اسے اسی جگہ لگا دیا' قبل ازیں انہوں نے کہہ دیا تھا آپ اسے میرے ہی کندھوں پر چڑھ کر لگائیں گے چنانچہ حضرت عباس نے یونہی کیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ گھر ان گھروں میں سے بچ گیا تھا جس کے بارے اختلاف ہوا تھا یہ مکان مروان کا کہنے کی وجہ آگے آ رہی ہے کہ یہ مروان کے گھر میں تھا' یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی تو گویا یہ پرنالہ اس بچے ہوئے مکان میں تھا۔

ان دونوں روایات کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس گھر کے دو پرنالے تھے' ایک پرنالہ تو مسجد کی طرف گرتا تھا اور دوسرا راستے میں تھا' ہر ایک کے بارے میں واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس کی تائید یحییٰ کے مطابق' حضرت عثمان کے اضافے کے بیان میں حضرت اعمش سے ملتی ہے' انہوں نے بتایا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب نے اپنا وہ گھر بنایا جو مسجد کے قریب تھا' اس وقت آپ نے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

''میں نے اسے پکی اینٹوں اور پتھر سے بنایا ہے' چھت لکڑیوں سے ڈالی ہے۔

اے پروردگار! یہاں رہنے والوں کے لئے برکت فرما۔''

یہ سن کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے دُعا دی کہ الٰہی اس گھر والوں کو برکت دے۔ راوی کے مطابق حضرت عباس نے اس کا پرنالہ مسجد کی طرف لگا دیا جو مسجد میں بہتا تھا' حضرت عمر نے اسے گرا دیا' اس پر حضرت عباس نے کہا: بخدا اسے تو حضور ﷺ نے میرے کندھوں پر کھڑا ہو کر لگایا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: کوئی بات نہیں' اب آپ اسے میرے کندھوں پر چڑھ کر لگائیں گے۔ پھر حضرت عباس نے اسے لگایا تھا۔ آخر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے خرید کر اسے مسجد میں شامل کیا تھا البتہ بارہ یا چودہ ہاتھ رہنے دیا تھا۔ حضرت اعمش کہتے ہیں' بعد میں مجھے معلوم نہیں کہ باقی حصہ آپ نے خریدا تھا یا نہیں۔

میں کہتا ہوں' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی ضرورت سے زائد حصہ اپنے پاس رکھ لیا تھا' اسی باقی حصے میں وہ پرنالہ تھا اور جب حضرت عمر نے مروان کے گھر کے پاس دروازہ لگایا تو وہ پرنالہ دروازے پر پڑتا تھا' یہ مسجد کا راستہ تھا اور بعد ازاں اس باقی حصے سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں اضافے کی ضرورت کے لئے خرید لیا تھا۔

ابن ابی الدنیا نے یہ طویل قصہ بیان کیا ہے' اس میں بتایا کہ حضرت عباس نے حضرت عمر سے کہا بخدا یہ پرنالہ حضور ﷺ نے لگایا تھا' میں بھی ساتھ تھا چنانچہ آپ نے مجھے اپنے کندھوں پر اُٹھایا تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو کندھوں پر اُٹھایا تھا۔

حضرت محمد بن عقبہ کہتے ہیں: یہ کیونکر ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے باپ یا چچا کے کندھوں پر قدم رکھتے' یہ حضرت عباس تھے جنہوں نے آپ کو کندھوں پر اُٹھایا تھا۔

یحییٰ کا حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی گذشتہ روایت میں یہ قول: ''حضرت عباس کا گھر اس ستونِ مربعہ کے اندر تھا جو مروان بن حکم کے گھر سے ملا ہوا تھا۔'' اس سے مراد وہ دروازہ ہے جہاں سے لوگ اس کے گھر کو جاتے تھے۔

علامہ زین مراغی لکھتے ہیں کہ مربعہ کا بیان آگے آ رہا ہے جہاں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے کا ذکر ہوگا۔ زین نے مطری کی پیروی میں وہاں لکھا ہے کہ یہ وہی ستون ہے جو قبلہ سے ملنے والے ستونوں کی لائن میں ہے' اس کا نچلا حصہ بیٹھنے کی جگہ کی مقدار میں اونچا کیا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ والا ستون بھی مربعہ تھا اور یہی بیت مروان سے ملا ہوا تھا' یہاں یہی مراد ہے جیسے ہم مسجد نبوی کی حد بندی میں بتا چکے ہیں' یہ منبر سے مغرب کی طرف پانچواں ستون تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے کی ابتداء اسی ستون سے ہوئی تھی لیکن مطری اور مراغی اسے نہیں مانتے کیونکہ انہوں نے اس سے قبل جس مربعہ کا ذکر کیا ہے' وہ حضرت عمر کے اضافے کی انتہاء تھی' یہ ان کے اضافے کی انتہاء کیسے ہو سکتی ہے جبکہ یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کی ابتداء تھی جہاں سے پہلا اضافہ شروع ہوا تھا پھر جو ستون ان دونوں نے ذکر کیا ہے' حجرہ مبارکہ شامل کر کے اس کی کل پیائش نوے ہاتھ بنتی ہے جبکہ یحییٰ کے مطابق حضرت ابن عمر کی روایت بھی یہ ہے: مسجد کا طول' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں' قبلہ سے شام کی طرف ایک سو چالیس ہاتھ تھا اور چوڑائی ایک سو بیس ہاتھ تھی جبکہ چھت کی اونچائی وہاں سے زمین تک گیارہ ہاتھ تھی۔ انتہٰی تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ اضافہ اس ستون تک تھا بلکہ ان کے اضافے کی ابتداء تو اس سے متصل ستون سے ہوئی تھی چنانچہ ان کا یہ اضافہ اس ستون سے مغرب کی طرف بیس ہاتھ تھا کیونکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ مسجد کا عرض سو ہاتھ تھا تو یہ اضافہ بیس ہاتھ ہوا اور یہ دو ستونوں کی طرف تھا چنانچہ ان کے دور میں اس طرف سے مسجد کی انتہاء منبر کی مغربی جانب سے ساتواں ستون تھی اور مشرق کی طرف سے حجرہ مقدسہ' کیونکہ اس طرف سے انہوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا اور قبلہ کی طرف سے ستونوں کی وہ لائن تھی جو قبلہ سے ملتے تھے' جالیاں بھی اسی طرف تھیں جو جل گئیں اور جو کچھ باقی بچا تھا وہ لکڑیاں اس ستون کے نیچے تھیں جو اس لائن میں محرابِ عثمانی کے سامنے بائیں طرف تھا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اضافہ قبلہ کی طرف سے' ریاض الجنہ کی درمیانی چھت اور قبلہ کی چھت کے درمیان تھا اور یہ اضافہ دس ہاتھ بنتا ہے' رہا شام کی طرف تو اس بارے میں آتا ہے کہ اس کا طول آپ کے دور میں ایک سو چالیس ہاتھ تھا جس میں سے قبلہ کی طرف دس ہاتھ کا اضافہ تھا اور آپ کے دور میں اصلی مسجد کے صحن کے اندر موجود دو پتھروں سے لے کر ساٹھ ہاتھ پیائش تھی کیونکہ ہم بیان کر چکے کہ مسجد اصلی کی اگلی طرف سے اس طرف صرف ستر ہاتھ بنتا تھا۔

ایک اور بات رہ گئی جس کے بارے میں کسی نے وضاحت نہیں کی اور وہ یہ کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے حجروں میں سے کچھ شام کی طرف تھے جیسے بتایا جا چکا اور جو کچھ ہم ابن سعد کے حوالے سے بتا چکے ہیں' وہ

بالکل ظاہر ہے کہ حضرت عمر نے ان میں سے کوئی بھی مسجد میں شامل نہیں کیا تھا البتہ انہیں ولید نے شامل کیا تھا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کی جانب والے حصے کو اپنے حال پر رہنے دیا تھا' مسجد اس کے اردگرد تھی۔

اسی روایت کے تحت سیّد قرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے اس جگہ کا بھی نصف حصہ خرید کر مسجد میں شامل کر دیا تھا جو حضور ﷺ نے حبشہ میں موجودگی کے وقت حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا تھا' آپ نے اسے ایک لاکھ درہم میں خرید کر مسجد میں شامل کر دیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ آئندہ یحیٰی کی روایت میں آ رہا ہے کہ یہ جگہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خریدی تھی' یونہی اس نسخے میں ہے جیسے ان کے پوتے حسن بن محمد نے ان سے روایت کیا پھر میں نے اس نسخے میں دیکھا جسے ان کے بیٹے ظاہر نے ان سے روایت کیا تو وہ وہی کچھ تھا جسے قرانی نے لکھا ہے۔

ابن زبالہ اور یحیٰی وغیرہ نے یہ نہیں لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مسجد میں داخل کیا تھا حالانکہ یہ بات طے ہے کہ اسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی نے داخل کیا تھا کیونکہ اس سے پہلی فصل میں گذر چکا ہے کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد کے مغرب میں تھا اور وہ خوخہ جو اس کے گھر شامل کرتے وقت اس کے برابر بنایا گیا تھا' وہ یہی ہے جو آج کل مسجد کے مغرب میں ہے اور اس میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں' اسی لئے اہل سیرت کے حوالے سے ابن نجار نے کہا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا چھوٹا سا دروازہ مسجد کے مغرب میں تھا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مغربی جانب تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں شامل کر لیا تھا لیکن حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابن شبہ نے ''اخبارِ مدینہ'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کا وہ گھر جس کے چھوٹے دروازے کے بارے میں حضور ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ اسے یونہی مسجد کی طرف رہنے دیا جائے' یہ مسجد سے متصل تھا' یہ آپ ہی کے قبضہ میں رہا پھر آپ کو ضرورت پڑی کہ کسی آنے والے کو کچھ دینا تھا تو اسے فروخت کر دیا' حضرت اُم المؤمنین سیّدہ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے چار ہزار درہم میں خرید لیا تھا' وہ انہی کے قبضہ میں رہا اور جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں مسجد کی توسیع کا ارادہ ہوا تو لوگوں نے اسے شامل کرنے کے لئے آپ سے مطالبہ کیا' آپ رُک گئیں اور فرمایا کہ میں مسجد میں کس راستے سے جایا کرونگی؟ آپ سے عرض کی گئی کہ ہم آپ کو اس سے کھلا مکان دیں گے جس میں ایسا ہی راستہ ہوگا چنانچہ انہوں نے خوش ہو کر وہ مکان دیدیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قصہ صرف ابن شبہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس گھر کے بارے میں بیان کیا ہے جو مسجد کے قبلہ کی طرف تھا' اسی کے ساتھ انہوں نے حضرت حفصہ کے بیت ابوبکر خریدنے کا ذکر کیا ہے جس کی کمزوری نظر آ رہی ہے' اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ حضرت ابوبکر کا گھر قبلہ کی طرف تھا اور آج کل آلِ عمر کا راستہ وہی ہے اور ابن حجر نے اسے یقینی قرار دیا ہے حالانکہ ایسا بالکل نہیں جیسے انشاء اللہ میں اسے آگے چودھویں فصل میں بیان کروں گا۔

یحییٰ نے اپنی گذشتہ روایت میں کہا ہے کہ ''حضرت عمر نے مسجد کے ستون کھجور کے تنوں اور چھت' کھجور کی ٹہنیوں سے دو ہاتھ بنائی تھی' مسجد کے اوپر دیوار کا پردہ تین ہاتھ۔'' ابن نجار نے اسے یوں بیان کیا ہے' چھت دو ہاتھ کھجور کی ٹہنیوں کی تھی اور اس کی اوپر کی طرف تین ہاتھ کی دیوار تھی۔ انتہی اور جہاں تک نظر آ رہا ہے' یحییٰ کی اس عبارت میں خلل معلوم ہوتا ہے' ابن نجار نے اسی کی پیروی کی ہے جبکہ مراد بعینہ وہ ہے جو رزین نے اس روایت میں بیان کیا ہے کیونکہ انہوں نے اس میں کہا ہے: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کا پردہ اوپر کی طرف دو تین ہاتھ کا بنایا تھا تو گویا یہاں ''او'' کا لفظ ''ثَلَاثَۃ اَذْرُع'' سے پہلے موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد یحییٰ اور رزین نے کہا: انہوں نے اس کی بنیاد پتھر سے رکھی اور وہ قد انسانی تک اونچی لے گئے' یحییٰ نے مزید لکھا کہ اس کی اینٹیں بقیع میں بنوائیں۔ مسجد کے چھ دروازے رکھے' دو قبلہ کی دائیں طرف' دو بائیں طرف اور دو قبلہ کے پیچھے تاہم بابِ عاتکہ (باب الرحمہ) کو تبدیل نہ کیا اور نہ وہ دروازہ تبدیل کیا جہاں سے حضور ﷺ داخل ہوتے تھے اور انہوں نے وہ دروازہ کھولا تھا جو قبرِ انور کے نزدیک تھا تو یہ دونوں دروازے بائیں طرف تھے یعنی مشرق کی طرف تھے پھر وہ دروازہ کھولا جو مروان بن حکم کے گھر کے نزدیک تھا اور دو دروازے مسجد کی آخری طرف کھولے۔ انتہی

ان کا یہ قول کہ ''حضرت عمر نے باب عاتکہ کو تبدیل نہ کیا اور نہ وہ دروازہ تبدیل کیا جہاں سے حضور ﷺ داخل ہوا کرتے تھے۔'' اس دروازے کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اس میں سے آپ مسجد میں داخل ہوتے تھے۔

علامہ مراغی نے مطری کی پیروی میں کہا کہ وہ ''باب جبریل'' ہے کیونکہ انہوں نے مشرق کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا تھا' رہا بابِ عاتکہ تو یہ محلِ نظر ہے کیونکہ مغرب کی طرف تو آپ نے اضافہ کیا تھا تو پھر تبدیل نہ کرنے کا مقصد یہاں یہ ہوگا کہ انہوں نے اسے پہلے دروازے کے سامنے تک مؤخر کر دیا تھا۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دروازہ جو آج کل باب النساء کے نام سے مشہور ہے' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں نہ تھا کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو دروازہ انہوں نے مشرق کی طرف زیادہ کیا تھا' اسے قبرِ انور کے قریب کیا تھا' شاید یہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ جب انہوں نے مشرق کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا تو قبرِ انور کے قریب دروازہ کیسے بن گیا اور کیسے انہوں نے وہ جانب دروازے کے بغیر چھوڑ دی جسے شام کی طرف بڑھایا تھا جبکہ جو نقل ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قبرِ انور کے نزدیک دروازہ بنانا ولید کا اضافہ تھا اور اسے باب النساء کہنے کی وجہ آگے آ رہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد بناتے وقت فرمایا تھا کہ یہ ''باب النساء'' ہے لہٰذا یہ بات پکی ہوگئی کہ باب النساء وہی دروازہ ہے جو مشرق میں دورِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چلا آ رہا ہے اور یہ آپ ہی نے بنایا تھا اور پھر عنقریب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے میں وہاں وہ عبارت آ رہی ہے جو اس معاملے میں بالکل واضح ہے' جہاں انہوں نے یہ بتایا کہ انہوں نے دروازے اتنے ہی رہنے دئے تھے جتنے حضرت عمر نے رکھے تھے۔ واللہ اعلم۔

بخاری شریف میں حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر نے مسجد بنانے کا حکم دیا اور کہا کہ میں لوگوں کو بارش سے بچانے کا انتظام کر رہا ہوں' سرخ اور زرد رنگ کرنے سے بچو کیونکہ لوگوں کو فتنہ میں ڈالو گے۔

ابن شبہ یحییٰ کے مطابق ابن ابوعمرہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے مسجد میں اضافہ شام کی طرف سے کیا اور پھر کہا: اگر ہم اس میں اضافہ کرتے چلے جائیں اور جبانہ تک بھی پہنچ جائیں' تب بھی یہ رسول اللہ ﷺ ہی کی مسجد کہلائے گی۔

یحییٰ کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا: اگر رسول اللہ ﷺ کی مسجد ذوالحلیفہ تک بھی پھیلا دی جائے تو وہ یہی مسجد کہلائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس مسجد کو ''صنعاء'' تک پھیلا دیا جائے تو میری ہی مسجد کہلائے گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مسجد میرے گھر تک وسیع کر دی جائے تو میں اسی میں نماز پڑھنے والا شمار ہوں گا۔

یحییٰ کے مطابق پختہ علماء نے کہا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' یہ ہے میری مسجد اور جو بھی اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے' اسی میں شمار ہوگا اور اگر میری یہ مسجد صنعاء تک بھی پہنچ جائے تو میری ہی مسجد کہلائے گی۔

میں کہتا ہوں کہ ان روایات کا جمع ہونا اس بات کو قوت دیتا ہے جو ہم نے دوسری فصل کے اخیر میں پہلے بیان کر دیا ہے چنانچہ حضرت مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مسجد نبوی میں کئی گنا ثواب' اضافے میں بھی ویسے ہی ملے گا۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۲

وہ بطیحاء (تھلہ) جسے حضرت عمر نے تعمیر کیا' مسجد کے ایک کنارے پر تھا

ابن شبہ و یحییٰ کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی ایک جانب ایک جگہ رکھی جسے بطیحاء کہتے تھے' انہوں نے حکم دے رکھا تھا کہ جس نے شور شرابا کرنا ہو' بلند آواز سے بات کرنا ہو یا بلند آواز سے شعر و شاعری کرنا ہو تو وہاں چلے جایا کرے۔

یحییٰ کے لفظ یہ ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی ایک جانب چٹیل جگہ چھوڑ رکھی تھی جسے بطیحا کہتے تھے اور پھر کہہ دیا تھا کہ جس نے شور شرابا کرنا ہو' اونچی آواز سے بولنا ہو یا شعر خوانی کرنا ہو تو اس جگہ چلے جایا کرے'

ابن شبہ کے مطابق محمد نے بتایا: میں اس بطیحاء میں سے مسجد کے اندر گیا جہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد اضافہ کیا گیا تھا۔

ابن شبہ نے ایک اور مقام پر یہ وضاحت کر دی ہے کہ یہ بطیحاء حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں مسجد کے مشرق میں تھا اور انتہائی آخر میں تھا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خالد بن ولید نے وہاں رہائش رکھی جو بطیحاء میں ان کا گھر تھا جسے آج کل رباط السبیل کہا جاتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب نماز سے فارغ ہوتے تو مسجد میں آواز دیتے۔ شور شرابے سے پرہیز کیا کرو نیز فرماتے کہ مسجد کی بالائی طرف شور ہونا چاہئے (اگر کرنا ہی ہو) یحییٰ کے الفاظ ہیں کہ مسجد میں جاتے وقت یوں فرماتے تھے۔

ابن شبہ کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ تاجروں کو سنا کہ وہ مسجد میں تجارتی اور دنیوی گفتگو کر رہے تھے تو سن کر فرمایا: مسجدیں ذکرِ الٰہی کے لئے ہوا کرتی ہیں' تمہیں اگر تجارت یا دنیاوی گفتگو کرنا ہو تو بقیع کی طرف جانا ہوگا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں ایک آدمی کی آواز سنی تو فرمایا: جانتے ہو کہاں کھڑے ہو؟ لگتا تھا کہ آپ کو اس کی اس انداز سے گفتگو پسند نہیں آئی۔

حضرت عبد الرحمٰن بن حاطب کہتے ہیں کہ حضرت عثمان اور طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان مسجد میں جھگڑا سا ہو گیا' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتہ چلا تو مسجد میں آئے' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو جا چکے تھے' طلحہ ابھی موجود تھے' ان سے کہا: تم لوگ مسجد میں بد زبانی اور بے معنٰی باتیں کرتے ہو؟ طلحہ زانو کے بل بیٹھ گئے اور کہنے لگے بخدا میں مظلوم ہوں اور برا بھلا مجھی کو کہا گیا۔ انہوں نے پھر کہا: تم لوگ مسجد میں بدگوئی اور بے مقصد باتیں کرتے ہو؟ تم مجھ سے بچ نہیں سکو گے۔ طلحہ نے کہا: اے امیر المؤمنین! معاف کیجئے' بخدا میں ہی مظلوم ہوں اور برا بھلا مجھی کو کہا گیا ہے' اتنے میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حجرے سے دیکھ کر فرمایا: بخدا واقعی یہ مظلوم ہیں' چنانچہ حضرت عمر خاموش ہو گئے۔

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ میں مسجد میں لیٹا ہوا تھا' مجھے کسی نے کنکر مارا' میں نے سر اُٹھایا' دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے' فرمایا: جاؤ اور ان دونوں کو لے کر آؤ' میں ان کی طرف گیا' آپ نے ان سے پوچھا' تم کون ہو یا کہا' کہاں سے آئے ہو' دونوں نے کہا' اہلِ طائف سے ہیں' فرمایا اگر تم اس شہر سے ہوتے تو میں شہر چھوڑنے سے قبل تمہیں کوڑے لگاتا' تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آوازیں بلند کر رہے ہو؟

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مسجد میں ایک شخص کو لایا گیا' کسی معاملے میں پکڑا گیا تھا' فرمایا: اسے مسجد سے باہر لے جا کر مارو۔

حضرت نافع کہتے ہیں کہ عشاء کے وقت حضرت عمر مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی کے ہنسنے کی آواز سنی' اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا: کون ہو؟ تو اس نے کہا کہ ثقیف قبیلہ سے تعلق ہے۔ پوچھا' کیا یہیں رہتے ہو؟ کہا' طائف کا رہنے والا ہوں' اس پر آپ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا: اگر تم ہمارے ہاں ہوتے تو میں تمہیں عبرتناک سزا دیتا پھر فرمایا: ہماری اس مسجد میں آوازیں بلند نہیں کی جاتیں۔

ابنِ سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابنِ مسعود نے کسی کو مسجد میں آواز بلند کرتے سنا تو اسے سخت لہجے سے ڈانٹا' آپ سے پوچھا گیا کہ آپ ایسی فحش گفتگو تو نہیں کیا کرتے؟ فرمایا: ہمیں یہی حکم ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنا کہ مسجد میں شعر خوانی کر رہے تھے' آپ ان کی طرف لپکے۔ اس پر حضرت حسان نے کہا: میں وہ شعر پڑھ رہا تھا جن میں آپ سے بہتر کا ذکر ہے' پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں' یہ بتایئے کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا تھا کہ: "(حسان!) میری طرف سے ان کفار کو جواب دو' اور اے اللہ اسے (حسان) کو جبریل امین کی تائید دے۔" انہوں نے کہا' ہاں سنا ہے۔

یحییٰ نے آپ کے اس قول:

"میں وہ اشعار پڑھ رہا تھا جن میں تم سے بہتر کا ذکر ہے۔"

کے بعد لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے ہٹ گئے' انہیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی بات کر رہے ہیں۔

ترمذی کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان کے لئے مسجد میں منبر لگا دیتے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر کفار کی برائیاں شمار کرتے۔

اس قسم کی بہت سی احادیث ملتی ہیں' انہیں جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شعر خوانی سے مراد جاہل اور باطل لوگوں کے اشعار ہیں اور حضرت عمر کے اس فرمان میں یہی مراد ہیں کہ: "جس نے شعر خوانی کرنا ہو' وہ بطیحاء کی طرف چلے جایا کرے اور ان اشعار کی اجازت ہے جو اس طرح کے نہ ہوں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ ان سے مراد مسجد میں بہت سی شعر خوانی ہے جس کی وجہ سے لوگ پریشان ہو جائیں۔ کسی نے اس وضاحت کو نہیں مانا بلکہ نہی پر عمل کرنے کو کہا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ اجازت منسوخ ہو گئی تھی اور ابن زبالہ کے مطابق حضرت کعب بن مالک نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں کچھ اشعار سنائے تھے جو یوں تھے:

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِی الْیَوْمَ مَتْبُوْلُ

"سعاد جدا ہو گئی اور آج میرا دل اسی کی طرف متوجہ ہے۔"

فصل نمبر ۱۷

مسجد نبوی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اضافہ

صحیح بخاری اور سنن ابو داؤد کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں مسجد کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی' چھت پر کھجور کی ٹہنیاں تھیں اور ستون کھجور کے تنے کے تھے' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا' حضرت عمر نے اضافہ کیا اور اسے انہی بنیادوں پر تعمیر کیا جو عہد نبوی میں تھیں' کچی اینٹیں اور کھجور کی شاخیں استعمال کیں اور ستون دوبارہ لکڑی کے لگائے پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس میں اضافہ کیا اور بہت سی تبدیلیاں کیں' دیواریں نقش و نگار والے پتھروں سے بنائیں جن میں چونا استعمال کیا نیز ستون بھی نقش و نگار والے پتھروں کے لگوائے اور چھت ساج کی لکڑی سے بنوائی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دور میں مسجد نبوی کے ستون کھجور کے تنے تھے' اوپر کھجور کی شاخوں سے انہیں سایہ دار بنایا گیا تھا پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں یہ بوسیدہ ہو گئے تو آپ نے کھجور کے تنے اور شاخیں استعمال کیں اور پھر یہ بھی دورِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بوسیدہ ہو گئے تو انہوں نے اینٹوں سے بنادیئے چنانچہ وہی اب تک چلے آ رہے ہیں' علامہ مجد نے حضرت ابوبکر کی بجائے لکھا ہے کہ حضرت عمر کے دور میں بوسیدہ ہو گئے تھے لیکن میں نے کسی اور نسخے میں یہ نہیں دیکھا۔

اس روایت میں یہ دکھائی دے رہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعمیر کا مقصد صرف یہ تھا کہ تنے بوسیدہ ہو گئے تھے اور حضرت عثمان نے انہیں اینٹوں سے بنایا تھا' پتھر سے نہیں لیکن صحیح بخاری کی روایت زیادہ صحیح ہے۔

مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ناپسند کیا' انہیں یہ پسند تھا کہ اسے اسی حال پر رہنا دیا جائے چنانچہ محمود کہتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے: جو اللہ کی خاطر مسجد بنا دے' اللہ جنت میں اسے ویسا ہی مکان دے گا۔

بخاری کے مطابق عبید اللہ خولانی کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت حضرت عثمان سے سنا جب وہ تعمیر کر رہے تھے' فرمایا: تم کافی انکار کر رہے ہو اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا ہے: جس نے اللہ کی خاطر مسجد بنائی' الحدیث۔

حضرت محمود بن لبید کے اس قول "لوگوں نے پسند یہ کیا کہ اسے پہلی حالت پر رہنے دیا جائے۔" کا مقصد یہ تھا کہ کھجور کے تنے اور کچی اینٹوں کو ویسے ہی رہنے دیا جائے جیسے حضرت عمر نے کیا تھا کہ حضور ﷺ سے موافقت ہو سکے' اسی وجہ سے علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا: "شائد صحابہ کرام حضرت عثمان کی نقش دار پتھروں سے تعمیر پر خوش نہ تھے' توسیع سے ناخوش نہ تھے اور اس کی تائید اس بات کی وجہ سے ہوتی ہے کہ لوگوں نے مسجد کی تنگی کی شکایت کی تھی۔

یحییٰ کے مطابق مطلب بن عبد اللہ بن حنطب بتاتے ہیں کہ جب حضرت عثمان ۲۴ھ کو خلیفہ بنے تو لوگوں نے

مسجد میں اضافے کی بات کی' انہیں بتایا کہ جمعہ کے دن مسجد تنگ دکھائی دیتی ہے اور انہیں کھلے میدان میں نماز پڑھنا پڑتی ہے چنانچہ حضرت عثمان نے اس سلسلے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا' انہوں نے بیک آواز کہا کہ اسے گرا کر اضافہ بھی کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھائی اور منبر پر چڑھ کر حمد و ثناء کی' پھر فرمایا: اے لوگو! میں مسجد نبوی کو گرانے اور اس میں اضافے کا ارادہ رکھتا ہوں' میں یہ بھی بتاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا تھا کہ جو اللہ کے ذکر کے لئے مسجد بنائے' اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا اور پھر اس سلسلے میں مجھ سے قبل عمر بن خطاب اس میں اضافہ اور تعمیر کر چکے ہیں چنانچہ میں نے بھی قابلِ رائے صحابہ سے مشورہ کیا ہے' انہوں نے اسے گرانے' تعمیر کرنے اور اضافہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

اس دن لوگوں نے آپ کی یہ رائے پسند کی اور ان کو دعائیں دیں چنانچہ صبح ہوئی تو انہوں نے کاریگر بلائے اور خود حصہ لیا۔ آپ ہمیشہ روزے سے رہتے اور راتوں کو نفل پڑھا کرتے تھے' مسجد سے نکلا نہیں کرتے تھے' آپ نے یہ کام ربیع الاوّل ۲۹ھ کو شروع کیا اور آئندہ سال ۳۰ھ کو محرم الحرام میں فارغ ہوئے' کوئی دس ماہ تک کام جاری رہا۔

میں بتاتا چلوں کہ مطلب کا پہلا قول: ''جب حضرت عثمان ۲۴ھ کو خلیفہ بنے۔ تا ''صبح ہوئی تو انہوں نے کاریگروں کو بلایا'' یہ بتاتا ہے کہ تعمیر اسی سال شروع ہوئی اور ان کا آخری قول کہ ''کام کی ابتداء'' اس تاریخ کے مخالف ہے اور جو آخر میں لکھا ہے وہی درست ہے کیونکہ یہ اور جگہ پر بھی مذکور ہے چنانچہ پہلے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ آپ نے یہ تعمیر کرتے وقت لوگوں سے مشورہ نہیں کیا اور نہ ہی عمارت بنائی بلکہ ان سالوں میں کام شروع رہا۔

علامہ رزین نے ان الفاظ سے روایت کی: جب حضرت عثمان خلیفہ بنائے گئے' آپ کی خلافت کا چوتھا سال تھا کہ لوگوں نے مسجد میں توسیع پر زور دیا اور مسجد کی تنگی کی شکایت کی چنانچہ حضرت عثمان نے اہلِ رائے سے مشورہ کیا اور انہوں نے مشورہ دیا۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے زور آپ کی خلافت کے چوتھے سال میں پڑا اور تعمیر ۲۹ھ تک مؤخر ہو گئی ورنہ یہ روایت پہلے کے مخالف ہے کیونکہ حضرت عثمان محرم کی ابتداء ۲۴ھ میں خلیفہ بنے اور خلافت کا چوتھا سال ۲۷ھ بنتا ہے اور پہلی تاریخ صحیح ہے کیونکہ یحییٰ و ابن زبالہ کے مطابق حضرت عثمان نے قتل سے چار سال پہلے مسجد میں اضافہ کیا' آپ ذی الحجہ ۳۵ھ کو قتل کئے گئے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں' مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمان کی طرف سے مسجد کی تعمیر ۳۰ھ کو ہوئی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری سال میں تعمیر ہوئی چنانچہ کتاب السیر میں وہب بن منبہ نے کہا مجھے مالک نے بتایا کہ حضرت کعب بن مالک نے اس وقت کہا تھا جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد تعمیر کر رہے تھے کہ یہ مسجد پوری نہ ہو پائے گی چنانچہ ابھی آپ تعمیر سے فارغ ہوئے تھے کہ انہیں قتل کر دیا گیا' چنانچہ یونہی ہوا۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں' ان دونوں روایتوں کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ پہلی تو ابتدائی تاریخ تھی اور دوسری

تاریخ آخری۔

میں کہتا ہوں' اس سے پہلے آ چکا ہے جس کی وجہ سے دونوں روایتیں جمع نہیں ہو سکتیں اور یہ بھی آ چکا کہ آپ ۳۰ھ کو فارغ ہوئے' ہاں یہ ممکن ہے کہ حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے آخری سال میں کوئی اور عمارت تعمیر کی ہو۔ابن شبہ اس روایت تک پہنچے ہیں جو مالک نے حضرت کعب سے روایت کی چنانچہ ابو صالح کہتے ہیں: حضرت کعب نے مسجد کی تعمیر کے دوران کہا تھا' بخدا مجھے تو یہ اچھا لگتا ہے کہ یہ برج بنانے سے فارغ ہوں تو اسے گر جانا چاہئے۔اس بارے میں پوچھا گیا: اے ابو اسحاق! کیا آپ ہمیں بتایا نہیں کرتے تھے کہ مسجد حرام کو چھوڑ کر اس میں نماز پڑھنا ایک ہزار نماز سے افضل ہے؟ آپ نے کہا ہاں میں اب بھی یہ کہتا ہوں لیکن آسمان سے فتنہ اترا چاہتا ہے' درمیان میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے اور جونہی یہ مسجد سے فارغ ہوں گے وہ نازل ہو جائیگا۔یہ بات اس وقت دکھائی دے گی جب یہ بوڑھے عثمان بن عفان قتل کر دیئے جائیں گے۔اس پر ایک شخص نے پوچھا: ان کا قتل بھی حضرت عمر کی طرح ہی ہوگا؟ انہوں نے کہا' نہیں' لاکھ یا اس سے بھی زیادہ گنا ہولناک ہوگا اور پھر یہ سلسلہ عدن سے روم کے تنگ راستوں تک پھیل جائے گا۔

یحییٰ کے مطابق حضرت حمید کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان نے ارادہ کیا لوگوں سے منبر پر کھڑے ہو کر بات کرتا ہوں تو مروان بن حکم نے عرض کی' میرے ماں باپ آپ پر قربان' اگر آپ یہ کام کر گذریں تو اچھا ہے' بہتر یہ ہے کہ اس کا ذکر نہ کریں۔انہوں نے کہا: افسوس! میں یہ بات ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ یہ خیال کریں کہ میں ان پر زبردستی کر رہا ہوں' مروان نے کہا جب حضرت عمر نے تعمیر کی تھی تو کیا ایسا ظاہر کر دیا تھا؟ انہوں نے فرمایا: چپ ہو جاؤ' عمر سخت قسم کے تھے تو لوگ ان سے ڈرتے تھے' وہ اگر انہیں گوہ کے سوراخ میں داخل ہونے کو کہتے تو انہیں ایسا کرنا ہوتا لیکن میں ان سے نرمی کا برتاؤ کرتا ہوں' مجھے ڈر رہتا ہے۔اس پر مروان نے کہا' میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ سے جو بھی یہ بات سنے گا' آپ کے خلاف ہوگا۔

عبدالرحمٰن بن سفینہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا تھا کہ حضرت عثمان رسول اللہ ﷺ کی مسجد بنا رہے تھے اور بطن نخل سے چونا آپ کے پاس لایا جا رہا تھا' آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے' کاریگر کام کرتے پھر نماز کا وقت آ جاتا تو آپ نماز پڑھاتے' کبھی سو کر واپس آتے اور کبھی مسجد ہی میں سو جاتے۔

خارجہ بن زید کہتے ہیں: حضرت عثمان نے مسجد گرا کر قبلہ کی طرف اضافہ فرمایا لیکن مشرق کی طرف اضافہ نہ کیا' مغرب کی طرف ایک ستون کی لائن بنائی' مسجد کو نقش دار پتھر اور چونے سے بنایا اور اسے سفید چونا سے پلستر کر دیا' زید بن ثابت نے ستونوں کی پیمائش کی تو وہ تنوں جتنے تھے پھر مشرق اور مغرب کی طرف طاق رکھے۔یہ کام اپنے قتل سے چار سال پہلے کر دیا' شام کی طرف پچاس ہاتھ کی زیادتی کی۔

حارث تیمی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے قتل سے چار سال پہلے قبلہ کی طرف اضافہ کیا تھا' انہوں نے آج

کے مقصورہ کی حد پر دیوار بنائی اور مغرب کی طرف مربعہ کے بعد ایک ستون زیادہ کیا' شام کی طرف پچاس ہاتھ اضافہ کیا لیکن مشرق کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا۔

مطری کا خیال ہے کہ اس مربعہ سے وہی مراد ہے جو پہلے گذرا اور جس کے بارے میں حضرت عمر کے اضافے کے دوران مسجد کی حد بتائی گئی تھی اور ستون مربعہ ان دو سے پہلے ہے تو مغرب کی طرف منبر سے چوتھے ستون کی لائن میں قبلہ سے ملتے ہیں پھر مطری اور مراغی نے کہا: حضرت عثمان کے اضافے کی انتہاء اس ستون تک تھی جو مغرب میں طراز کے سامنے تھا چنانچہ دونوں کہتے ہیں: مربعہ کہنے سے ان کا مقصد وہ ستون تھا جو اسے مغرب کی طرف سے ملتا تھا اور جو قبلہ میں تھا جس کی بنیاد بیٹھنے کی مقدار چوکور جگہ تھی اور یہ حضرت عثمان کی مغربی جانب اضافہ کی انتہاء تھی اور یہ اس ستون کے سامنے تھا جو حضرت عثمان نے قبلہ والی دیوار کی طرف زیادہ کیا تھا۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت عثمان کا اضافہ وہ چھتی جگہ تھی جو ان دو ستونوں کے درمیان تھی۔ اس سے قبل میں نے کسی کو یہ بتاتے نہیں دیکھا' ہم مسجد نبوی کی حد بندی میں بتا چکے ہیں کہ وہ طراز ترجیحی طور پر مسجد نبوی کی حد کے مقابل تھا' حضرت عمر اور حضرت عثمان کا اضافہ مغرب کی طرف اس کے بعد ہوا' حضرت عمر نے مشرق سے مغرب تک کی پیمائش ایک سو بیس ہاتھ کر دی (۱۸۰ فٹ) اور جس مربعہ کا ذکر ان دونوں نے کیا کہ وہ حجرہ شریفہ تک آپ کے اضافے کی انتہاء تھی' نو ہاتھ سے کم تھا اور طراز کے سامنے سو ہاتھ تھی چنانچہ حضرت عمر کے لئے مغرب کی طرف طراز کے بعد دو اور سائبان رہ گئے لہٰذا ان کے دور میں مسجد کی حد منبر سے ساتواں ستون تھا اور منبر سے ساتویں ستون کی صف میں ستون ہے جو نیچے سے چوکور لیکن زمین سے بقدر جلسہ (بیٹھنے کی جگہ) اونچا نہیں بلکہ وہ زمین ہی پر چوکور ہے اور یہ نئی عمارت میں دوسری آتشزدگی کے موقع پر ٹوٹ گیا تھا اور یہ ان ستونوں کی لائن میں نہیں جو قبلہ کی طرف ہیں بلکہ ان ستونوں کی صف میں ہے جو محراب حنفی کے پیچھے ہیں لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ مربعہ وہی ہے جو یہاں مراد ہے چنانچہ حضرت عثمان کے لئے مغرب میں وہ سائبان ہے جو بعد میں ہے لہٰذا آپ کے دور میں مسجد کی انتہاء منبر سے آٹھواں ستون تھی اور وہ بھی مغرب میں۔

اس کے صحیح ہونے کی دلیل وہ ہے کہ حضرت عثمان کے بعد ولید نے مغرب کی طرف دو ستون اضافہ کئے تھے اور پھر ولید کے بعد کسی نے بھی مغرب کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا اور منبر کی جانب سے آٹھویں ستون سے باقی رہ جانے والے صرف دو ستون مغرب میں ہیں جو ولید کا اضافہ ہیں' وہیں ایک چوکور ستون ہے جو آدمی کے بیٹھنے کی مقدار اونچا ہے اور اس کے سامنے ہے' باب السلام سے داخل ہوں تو سامنے آتا ہے' بظاہر یہ حضرت عثمان کے اضافے کی علامت اور ولید کے اضافے کی ابتداء تھی۔

اگر ہم کہیں کہ مسجد نبوی کی انتہاء وہ ستون مربعہ ہے جو قبلہ کی طرف ہے' جیسے اشارہ کیا جا چکا' تو پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اضافہ یہاں سے مغرب کی طرف دو ستون ہیں چنانچہ چھٹے ستون کی زیادتی منبر سے شمار ہو گی' اسی کی

لائن میں نیچے سے چوکور ستون' جلسہ کی مقدار میں ہے جو آج کل آٹھ پہلو ستون کے سامنے ہے اور حضرت عثمان کا اضافہ مغرب کی طرف اس سے بعد والے ستون تک تھا جو ساتواں ہے' ولید کے لئے مسجد کی دیوار تک تین ستون باقی رہ جاتے ہیں' اس کی تعبیر میں روایت آ رہی ہے جس کا مطلب یہی ہے' علاوہ ازیں جو کچھ انہوں نے پہلے مؤرخین سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی طرف جب بھی مربعہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ستون ہوتا ہے جو مغرب میں مربعۃ القبر کے مقابل ہے اور وہ آج کل آٹھ پہلو ہے اور پھر صحن کے دو شامی رکنوں میں اسی کی شکل کے دو ستون ہیں' انہیں بعد میں آٹھ پہلو بنایا گیا' اسے مربعۂ غربیہ کہتے ہیں اور یہ ستون منبر سے چھٹا ہے' اس سے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرت عمر کا اضافہ ہے اور حضرت عثمان کی ابتدائے تعمیر ہے اور اگر یوں ہو جیسے مطری اور اس کے پیروکاروں نے کہا تو حضرت عثمان کے اضافے کے بعد مغرب میں پانچ ستون ہوتے ہیں چنانچہ سب ولید کا اضافہ بنتے حالانکہ اسے کوئی بھی نہیں مانتا۔ہم نے مسجد کی حد بندی بتاتے ہوئے جو لکھ دیا ہے وہ اس کے رد کے لئے کافی ہے۔

عبد اللہ بن عطیہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نقش دار پتھروں اور چونے سے مسجد تعمیر کی اور اس کے ستون نقش دار پتھر سے بنوائے' اس میں لوہے کے ستون تھے جن میں سکہ بھرا ہوا تھا جبکہ چھت ساج کی لکڑی سے بنائی' لمبائی ایک سو ساٹھ ہاتھ رکھی اور چوڑائی ایک سو پچاس ہاتھ' چھ دروازے بنائے جیسے حضرت عمر کے دور میں تھے: باب عاتکہ جسے باب الرحمہ کہتے ہیں اور اس کے قریب مشرقی جانب سے اس کے مقابل دروازہ بنوایا' یہ باب النساء تھا' باب مروان جسے باب السلام کہتے تھے اور وہ دروازہ جسے باب النبی کہتے تھے یعنی باب جبریل اور دو دروازے مسجد کے آخر میں بنوائے۔

میں کہتا ہوں' ان کا یہ کہنا ''اس کی لمبائی ایک سو ساٹھ ہاتھ رکھی۔'' گزشتہ اس قول کے خلاف ہے کہ شام کی طرف سے انہوں نے پچاس ہاتھ کا اضافہ کیا کیونکہ حضرت عمر کے بارے میں آ چکا ہے کہ انہوں نے مسجد کا طول ایک سو چالیس ہاتھ کیا تھا اور اگر حضرت عثمان نے پچاس ہاتھ کا اضافہ کیا ہوتا تو آپ کے دور میں یہ طول ایک سو نوے ہاتھ ہوتا اور ذہن میں آتا ہے کہ حضرت عثمان کے دور میں اس کا طول ایک سو ساٹھ ہاتھ تھا جو ان کے اضافے میں مذکور ہو گا۔

ان کا یہ کہنا کہ ''اس کا عرض ایک سو پچاس ہاتھ تھا۔'' یہ بھی گزشتہ پیمائش کے مخالف ہے کیونکہ یہ گذر چکا کہ آپ نے مغرب کی طرف ایک ستون کے علاوہ اور کوئی اضافہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی مشرق میں کوئی اضافہ کیا۔تو یہ روایت غلط ہے کیونکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت عثمان نے مشرق کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا کہ ان کے دور میں انتہاء حجرہ شریفہ تھی جبکہ آج کی مسجد میں غربی دیوار سے حجرہ شریفہ کی دیوار تک ایک سو پچاس ہاتھ نہیں بنتا بلکہ اس میں سے سات ہاتھ سے کچھ زیادہ کم ہے اور پھر مغرب کی طرف سے ولید کا اضافہ باقی رہ جاتا ہے۔اس پر بھی سب کا اتفاق ہے تو درست بات یہ ہے کہ آپ نے مغرب کی طرف ایک ستون کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں کیا جبکہ آپ کے دور میں مسجد کا عرض ایک سو تیس ہاتھ تھا۔واللہ اعلم۔

پھر یحییٰ کے مطابق ابو الحسن مدائنی نے حدیث میں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جعفر کو ان کی حبشہ میں موجودگی کے موقع پر ایک مکان دیا تھا حضرت عثمان نے جس کا نصف حصہ ایک لاکھ میں خرید کر مسجد میں شامل کر دیا۔

میں کہتا ہوں' حضرت عمر کے اضافے کے موقع پر یہی واقعہ ان کے بارے میں بھی گذر چکا ہے' لگتا ہے دونوں حضرات نے دو مرتبہ میں نصف نصف خرید کر مسجد میں شامل کر دیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حضرت عبد اللہ بن عمر بن حفص کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے قبلہ کی دیوار ان ستونوں تک کھینچی جہاں آج کل مقصورہ موجود ہے پھر حضرت عثمان بن عفان نے اضافہ کیا اور آج کی دیوار تک پہنچ گئے۔ عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا' فرماتے تھے کہ جب اضافہ کے لئے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی ضرورت پڑی تو انہوں نے فرمایا: میں مسجد کی طرف کس راستے سے جاؤں گی؟ انہوں نے عرض کی تھی کہ ہم آپ کو اس سے بھی وسیع جگہ دیں گے اور ایسا ہی راستہ بھی دیں گے چنانچہ انہیں حضرت عبید اللہ بن عمر کا گھر دے دیا جو کھجوریں سکھانے کے لئے ہوتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس عبارت میں کئی احتمال ہیں کہ ''نعطیك الخ'' کہنے والے حضرت عمر ہوں گے یا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما' دوسرے کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ انہوں نے یہ عبارت حضرت عثمان کے اضافے میں ذکر کی ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبلہ کی دیوار کو مقصورہ تک آگے کیا پھر حضرت عثمان نے آج والی دیوار تک آگے کیا اور حضرت عباس کے گھر کا باقی حصہ مسجد میں شامل کیا جو قبلہ' شام اور مغرب کی طرف تھا نیز حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کا قبلہ کی جانب والا حصہ بھی داخل کر لیا چنانچہ مسجد اس حال پر رہی اور پھر ولید نے اضافہ کیا۔

میں کہتا ہوں' حضرت عمر کے اضافے کے بیان میں گذر چکا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت ابوبکر کا وہ گھر خریدا تھا جس کے خوخہ کے بارے میں آتا ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔ وہ گھر انہیں کے پاس رہا اور پھر حضرت عثمان کے دور میں توسیع مسجد کا ارادہ ہو گیا چنانچہ ان سے یہ گھر مانگا گیا تاکہ مسجد میں اضافہ کیا جا سکے' وہ رُک گئیں اور کہا کہ مسجد کی طرف میرا راستہ کونسا ہوگا' انہیں کہا گیا' ہم آپ کو اس سے بھی وسیع گھر دیں گے جس میں ایسا ہی دروازہ ہوگا چنانچہ انہوں نے خوش ہو کر مکان دے دیا اور وہ جو ابن شبہ نے کہا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا وہ گھر بنایا جو قبلۂ مسجد میں تھا اور اس کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا تو اس کے وارث حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہو گئے تھے پھر اس کی اصل کے بارے میں آ رہا ہے کہ وہ کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی' پھر حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک اور گھر کا ذکر کیا اور پھر کہا: مجھے کسی نے اطلاع دی اور کہا کہ حضرت ابوبکر کا وہ گھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قبضہ میں رہا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ اس کا خوخہ

رہنے دیا جائے' یہ گھر تمہارے داہنے ہاتھ پر ہو گا جب تم عبد اللہ کے گھر میں اس خوخہ سے داخل ہو گے' تمہارے سامنے وہ خوخہ آئے گا جو اس خوخہ کے اندر ہے جس کے راستے پر دروازہ ہے چنانچہ یہی خوفہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والا کہلاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ مکان حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خرید لیا تھا اور وہ گھر جس کے بارے میں میں نے کہا ہے کہ کھلے راستے پر ہے' عبد اللہ کے گھر کے دروازے پر ہے جو حضرت ہشام کے گھر کی جانب ہے' حضرت ابوبکر نے یہ گھر اور ساتھ ہی وہ گھر چار ہزار درہم میں حضرت حفصہ کو فروخت کر دیا جن سے حضرت عثمان نے خرید لیا تھا۔ حضرت ابوبکر نے وہ گھر بنو تیم کے آئے لوگوں کے سوال کرنے پر بیچا تھا۔

ابن شبہ مزید کہتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن عمر بن حفص کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا: وہ بتاتے تھے کہ جب حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی ضرورت پڑی تو انہوں نے فرمایا' مجھے مسجد کی طرف راستہ کہاں سے دو گے؟ آپ سے عرض کی گئی: ہم آپ کو اس سے کھلی جگہ دیں گے اور آپ کو ویسا ہی راستہ دیں گے چنانچہ انہیں عبد اللہ بن عمر کا مکان دے دیا گیا' پہلے وہ کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی۔ انتہٰی۔ ان کا یہ کہنا "مجھے کسی نے بتایا۔" بات کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

بنو تیم کے گھروں کے ذکر میں آ چکا ہے کہ حضرت ابوبکر کا گھر مسجد کے مغرب میں "دار القضاء" کی طرف تھا اور اوپر آیا ہے کہ حضرت حفصہ کا گھر پہلے مربد تھا اور یہیں انہوں نے بات ختم کی ہے۔ ان کا یہ کہنا "جب حضرت حفصہ کے گھر کی ضرورت پڑی۔" یعنی جس میں وہ ٹھہری ہوئی تھیں اور وہ حضور ﷺ کے دور میں مسجد کی طرف تھا۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافہ میں گذر چکا جو یحییٰ نے لکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس کا گھر خرید کر' تیرہ یا چودہ ہاتھ چھوڑتے ہوئے مسجد میں شامل کر دیا تھا۔ یہاں راوی کہتے ہیں' یہ پتہ نہ چل سکا کہ انہوں نے باقی حصہ خریدا تھا یا نہیں' ہم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضرت عباس کے گھر سے مراد حضرت عثمان کے مسجد میں شامل کرنے کے' بعد بچنے والا باقی حصہ تھا اور ظاہر تو یہ ہے کہ وہ باقی بچ جانے والا حصہ مروان کے گھر میں شامل ہو گیا تھا۔

ابن زبالہ' یحییٰ اور ابن نجار نے مروان کے گھر بنا لینے کو حضرت عثمان کے اضافے کے بعد ذکر کیا ہے چنانچہ احتمال ہے کہ انہوں نے اسے اضافہ عثمان کے دوران بنایا ہو یا اس کے بعد' اور یہ ظاہر ہے کیونکہ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے قبلہ کی طرف سے اس میں چھوٹا سا دروازہ رکھا تھا پھر کہا تھا مجھے ڈر ہے کہ اس سے روک دیا جاؤں گا پھر اس کے لئے دروازہ بنایا جو داخل ہوتے وقت تمہاری دائیں طرف ہو گا اور پھر تیسرا دروازہ بنایا جو مسجد کے دروازے پر تھا۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۵

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مقصورہ (چھوٹا کمرہ)

ابن زبالہ اور ابن شبہ کے مطابق آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچی اینٹوں سے مقصورہ (کمرہ نما) بنایا' اس میں ایک روشن دان تھا جہاں سے امام کو دیکھا جا سکے اور پھر حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسجد کی تعمیر کے موقع پر اسے ساج کی لکڑی سے بنایا تھا۔

ابن زبالہ اور دیگر کئی راویوں نے بتایا کہ سب سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچی اینٹوں سے مقصورہ تیار کرایا تھا جس کے نگران حضرت سائب بن خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے' انہیں ماہانہ دو دینار دئے جاتے تھے' وہ ان تین حضرات کے بعد فوت ہو گئے' مسلم' بکیر اور عبد الرحمٰن' سب دو دینار میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے چنانچہ دفتر سے اب تک ان تینوں کے لئے جاری ہیں۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کے بعد جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو انہوں نے کچی اینٹوں سے مقصورہ بنایا' اسے حضرت عمر کے واقعہ کی وجہ سے بنایا گیا تھا چنانچہ آپ اس میں نماز پڑھاتے' یہ چھوٹا سا تھا۔

یحییٰ نے یہ سارا واقعہ حضرت عثمان کے اضافے میں بیان کیا ہے اور پھر ولید کی زیادتی کے متعلق بتاتے ہوئے عبد الحکیم بن عبد اللہ کے حوالے سے بتایا کہ مسجد میں سب سے پہلے مقصورہ مروان بن حکم نے بنایا تھا' انہوں نے اسے نقش دار پتھروں سے بنایا جس میں ایک سوراخ بھی رکھا۔ انہوں نے صدقات وصول کرنے کے لئے تہامہ کی طرف ایک آدمی بھیجا' اس نے ایک آدمی پر ظلم کیا جس کا نام دَبّ تھا چنانچہ وہ مروان کے پاس آیا اور وہاں آ کر کھڑا ہو گیا جہاں مروان کھڑا ہونا چاہتے تھے اور جب انہوں نے تکبیر کہنے کا ارادہ کیا تو دبّ نے چھری سے وار کر دیا لیکن اس سے نقصان نہ ہوا' مروان نے اسے پکڑ لیا اور پوچھا کہ یہ جرأت تم نے کیوں کی ہے؟ اس نے کہا: تم نے اپنا کارندہ بھیجا تھا' اس نے ایک ہی مرتبہ میں سارا ٹیکس لے لیا' میرے اور اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں چھوڑا' میں نے دل میں سوچا کہ میں اس کے پاس جاتا ہوں جس نے اسے بھیجا ہے اور اسے قتل کر دوں گا۔ یہ اس واقعہ کی اصل بنیاد ہے چنانچہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ مروان نے اسے کچھ دیر قید میں رکھا اور پھر خفیہ طور پر اسے ہلاک کر دیا۔ لہٰذا مقصورہ بنایا گیا۔

ابن شبہ نے بھی یہی کچھ لکھا ہے لیکن کسی جگہ اس شخص کا نام ''دَب'' اور کہیں ''ذباب'' لکھا ہے' اس نے کہا تھا کہ تم نے اپنا کارندہ بھیجا جس نے مجھ سے گائے لے لی' مجھے اور میرے اہل وعیال کے پاس کچھ نہیں چھوڑا' میں بڑی گندی طبیعت کا ہوں لہٰذا میں نے سوچا کہ اس کے پاس جاتا ہوں جس نے اسے بھیجا ہے اور اسے قتل کروں گا۔ یہ اس واقعہ کی اصل ہے' اب آپ جو چاہیں کریں' مروان نے سے کچھ عرصہ تک قید میں رکھا پھر حکم دیا اور خفیہ طور پر قتل کرا دیا'

پھر مقصورہ بنایا۔

میں کہتا ہوں' عتبیہ کی کتاب الصلوہ میں لکھا ہے: مسئلہ: مالک نے کہا' مروان نے سب سے پہلے مقصورہ اس وقت بنوایا جب ایک یمانی نے ان پر وار کیا تھا۔ اس نے مٹی سے بنوایا اور اس میں سوراخ رکھا انتہی۔ اس کی شرح میں ابن رشد نے لکھا: ان کے اس قول کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مقصورہ حضورﷺ کے عہد میں نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی خلفاء کے دور میں بنا' اسے حکمرانوں نے اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے بنوایا تھا لہٰذا جامع مسجدوں میں اسے بنانا مکروہ ہے۔ انتہی۔

مسلم کی شرح نووی میں ہے کہ سب سے پہلے مقصورہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت بنوایا جب ایک خارجی نے آپ پر نیزے کا وار کیا تھا۔

ابن زبالہ کی کلام سے سمجھ آتا ہے کہ مقصورہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں مسجد کی زمین سے ذرا اونچا ہوتا تھا کیونکہ خلیفہ مہدی کے ذکر میں ملتا ہے کہ اس نے مقصورہ بنانے کا حکم دیا تھا' پھر اسے گرا کر زمین کے برابر کر دیا گیا' وہ زمین کی سطح سے دو ہاتھ اونچا تھا چنانچہ اسے لتاڑ کر برابر کر دیا گیا۔

مراغی نے یہ سمجھا کہ اس سے مراد مقصورہ کی چھت ہے' زمین نہیں کیونکہ اس نے خلیفہ مہدی کے اضافے میں لکھا ہے: اس نے مقصورہ کی چھت نیچے کر دی' وہ مسجد کی سطح سے دو ہاتھ اُونچی تھی چنانچہ اس نے مسجد کے برابر کر دی۔ انتہی۔

میں نے دیکھا کہ لفظ ''سقف'' ان کے ہاتھ سے بعد میں لکھا ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ یہی مراد ہے اور جو کچھ مطری نے لکھا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ مہدی نے اسے لکڑی سے قبلہ کی پوری چھت پر بنوایا تھا اور ابن جبیر کے اس قول سے بھی یہی مراد ہے' انہوں نے سفرنامے میں لکھا کہ مراد اروقہ (برآمدے) ہیں۔

یہ مقصورہ پہلی آتشزدگی میں جل گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۱۶

حضرت عمر بن عبد العزیز کی نگرانی میں ولید بن عبد الملک کا اضافہ

علامہ رزین نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے اضافہ کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ نے کوئی اضافہ نہیں کیا' نہ ہی یزید اور مروان نے کیا تھا' نہ ہی اس کے بیٹے عبد الملک نے کوئی اضافہ کیا' پھر ولید بن عبد الملک کا دور آیا (ان کی طرف سے حضرت عمر بن عبد العزیز مکہ و مدینہ کے گورنر تھے) ولید نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس بہت سال مال

بھیجا اور کہا' جو مکان بیچے' اسے قیمت ادا کر دو' جو انکار کرے اس کا مکان گرا دو اور رقم دیدو اور اگر وہ مال لینے سے انکار کر دے تو اسے فقیروں میں تقسیم کر دو۔انتہی۔

ابن زبالہ کے کسی اہل علم نے بتایا کہ ولید بن عبد الملک حج کرنے آئے تو عین اس وقت جب وہ منبر رسول پر خطبہ دے رہے تھے' اس کی نظر پڑی' یکا یک دیکھا تو حسن بن حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں شیشے کو پکڑ کر اس میں دیکھ رہے تھے' وہ منبر سے اترے تو حضرت عمر بن عبد العزیز کو پیغام بھیجا اور کہا کہ آج کے بعد یہ مکان نہیں رہنا چاہئے' یہ جگہ خرید لو اور حضورﷺ کا گھر مسجد میں شامل کر لو اور اسے بند کر دو۔

موسیٰ بن جعفر کہتے ہیں کہ ولید منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے باریک سوراخ دار پردہ ہٹ گیا' اچانک دیکھا تو حسن بن حسن اپنی ڈاڑھی کو کنگھی کر رہے تھے' ولید خطبہ دے رہے تھے' جب منبر سے اُترے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر گرا دینے کا حکم دیا۔

علامہ یحییٰ کے مطابق حضرت حسن بن حسن اور فاطمہ بنت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کہ ہم اس گھر سے نہیں نکلیں گے' ولید بن عبد الملک نے کہلا بھیجا کہ: اگر آپ یہاں سے نہیں نکلیں گے تو میں مکان تمہارے اوپر گرا دوں گا' انہوں نے پھر بھی انکار کیا چنانچہ یہ سب حضرات گھر ہی میں تھے کہ اس نے مکان گرانے کا حکم دے دیا' جب مکان کی بنیادیں کھودیں تو وہ وہیں تھے' مکان کی بنیادیں اکھاڑے وقت کہہ رہے تھے کہ اگر آپ باہر نہیں نکلے تو ہم مکان تمہارے اوپر گرا کر چھوڑیں گے۔آخر وہ وہاں سے نکل پڑے اور دن کے وقت حضرت علی کے گھر چلے گئے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام منصور کہتے ہیں کہ ولید بن عبد الملک ہر سال مدینہ میں ایک شخص بھیج دیتے تا کہ لوگوں کے حالات اور وہاں ہونے والے واقعات کا پتہ چل سکے چنانچہ ایک سال وہ شخص واپس آیا تو ولید نے اس سے پوچھا' اس نے کہا اس مرتبہ میں نے ایک ایسا معاملہ دیکھا ہے کہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ولید نے پوچھا' کیا دیکھ آئے ہو؟ اس نے کہا: میں نبی کریمﷺ کی مسجد میں تھا' دیکھا تو ایک مکان کے دروازے پر باریک پردہ پڑا تھا' نماز کھڑی ہوئی تو وہ پردہ اُٹھ گیا' گھر والے اور اس کے ساتھیوں نے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا شروع کر دی پھر وہ پردہ ڈال دیا گیا' اتنے میں کھانا آ گیا' سب نے مل کر کھایا اور جب پھر نماز کھڑی ہوئی تو انہوں نے ایسے ہی کیا' پھر میرے دیکھتے ہوئے اس نے شیشہ اور سرمہ پکڑا۔میں نے کسی سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ حسن بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔

ولید نے کہا' افسوس! میں کیا کر سکتا ہوں' وہ ان کا اور ان کی والدہ کا گھر ہے' اس کا کیا کیا جائے؟ اس نے کہا' آپ مسجد میں اضافہ کریں اور اس گھر کو اس میں شامل کر دیں چنانچہ ولید نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو خط لکھا کہ مسجد کی توسیع کرو اور یہ گھر خرید لو چنانچہ عمر نے انہیں مکان بیچنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور حسن نے کہا: بخدا ہم اس کی قیمت کبھی نہیں کھائیں گے۔کہتے ہیں کہ انہیں نے انہیں سات یا آٹھ ہزار دینار پیش کئے لیکن انہوں نے انکار کر دیا'

آپ نے ولید بن عبدالملک کو اس کی اطلاع کی' ولید نے مکان گرانے اور پھر اسے مسجد میں شامل کرنے کا حکم دیا اور کہہ بھیجا کہ یہ قیمت بیت المال میں سے دے دو چنانچہ عمر نے یونہی کیا۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حرہ میں جا کر اپنا مکان تیار کر لیا۔

میں کہتا ہوں کہ باقی واقعہ انشاء اللہ ان کے کنوئیں کے ذکر میں آئے گا۔

ابن زبالہ کے مطابق جب ولید کا خط حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس پہنچا جس میں مسجد گرانے اور اس میں اضافہ کا ذکر تھا تو انہوں نے آل عمر کو پیغام بھیجا کہ امیر المؤمنین نے مجھے لکھا ہے: میں سیدہ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان خریدوں' وہ مکان آل عمر کے خوخہ کی دائیں جانب تھا' اس کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس گھر کے درمیان راستہ تھا' جس میں حضورﷺ کی قبرِ انور ہے۔

وہ گھر میں لیک دوسرے سے کچھ کہہ رہے' حضرت عمر نے ان سے کہا: امیر المؤمنین نے مجھے حکم دے بھیجا ہے کہ میں یہ گھر خرید لوں اور اسے مسجد میں شامل کر دوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نہیں بیچیں گے' انہوں نے کہا تو پھر میں اسے مسجد میں داخل کر لوں گا۔ انہوں نے کہا: آپ جو چاہیں کریں لیکن ہم اپنا راستہ قطع نہیں کریں گے۔ حضرت عمر نے گھر گرایا اور انہیں راستہ دے دیا' مکان مسجد میں شامل کر لیا اور ستون تک لے گئے' راستہ پہلے اتنا تنگ تھا کہ آدمی ایک طرف کو ہو کر گزر سکتا تھا۔

عبدالعزیز بن محمد کہتے ہیں' میں نے عبید اللہ بن محمد سے سنا' وہ کہتے تھے: جب تک یہ راستہ بند ہوتے نہ دیکھ لوں' اللہ مجھے دنیا سے نہیں نکالے گا۔

یحییٰ کے مطابق حجاج نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر سے کہا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر ہمیں فروخت کر دو' انہوں نے کہا: بخدا میں رسول اللہﷺ کے اس گھر کی قیمت کبھی بھی وصول نہیں کروں گا۔ حجاج نے کہا' تو پھر میں اسے گرا رہا ہوں' انہوں نے کہا' بخدا اگر اسے گرانا ہے تو میری پیٹھ پیچھے ہی گرا سکیں گے۔ اتنے میں حجاج نے ایک شخص کو حکم دیا تو اس نے لوگوں سے ہتھوڑے وغیرہ لانے کو کہا۔ عبد اللہ کھڑے ہوئے' حضرت حفصہ کے گھر گئے' ادھر ہتھوڑوں وغیرہ کی آواز آئی' حجاج نے مکان گرانے کا حکم دیا' وہ لوگ گرانے کے لئے اوپر چڑھے' عبید اللہ انہی میں تھے' بنو عدی عبید اللہ کے پاس آئے اور کہنے لگے' تم کتنے ضعیف ہو؟ وہ تمہارے باپ کے قتل پر افسردہ ہے اور تمہارے قتل سے کنارہ کش ہے چنانچہ اسے وہاں سے نکال لیا اور حجاج نے مکان گرا دیا پھر ولید کو حالات لکھ بھیجے اور یہ بھی لکھا کہ عبید اللہ نے قیمت نہیں لی۔ اس پر ولید نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ انہیں دوبارہ قیمت پیش کرے اور اگر وہ انکار کر دیں تو اسے مسجد میں لگا دے اور ان کو اور جگہ دیدے۔ حضرت عمر نے حضرت عبد اللہ کے لئے وہ خوخہ تجویز کیا جو مسجد کے قبلہ میں تھا اور آج کل دارِ حفصہ کی طرف ہے۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر حجاج نے گرایا تھا۔

حضرت وردان کہتے ہیں کہ جب ولید نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو مدینہ کا گورنر بنا دیا تو انہیں حکم دیا کہ مسجد کو وسیع کریں' اسے تعمیر کریں اور پھر مشرق و مغرب و شام کی طرف کے قریبی مکان خرید لیں۔ جب وہ قبلہ کی طرف پہنچے تو عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر نے کہا' میں نہیں بیچوں گا' یہ حفصہ کا حق ہے' نبی کریم ﷺ یہاں رہائش رکھتے تھے۔ اس پر عمر نے کہا کہ جب تک میں اسے مسجد میں شامل نہیں کر لیتا' تم کو چھوڑوں گا نہیں۔

جب بات طول پکڑ گئی تو عمر نے ان سے کہا' میں مسجد میں تمہارے لئے دروازہ بنا دوں گا جس سے مسجد میں جا سکو گے اور اس مکان کے بدلے میں "دار الدقیق" دے دوں گا اور جو جگہ پھر بھی بچ جائے گی' وہ تمہاری ہو گی چنانچہ انہوں نے یہ بات مان لی' آپ نے ان کے لئے مسجد میں دروازہ نکال دیا اور یہ وہی خوخہ (چھوٹا سا دروازہ) ہے جو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی طرف ہے' انہیں دار الدقیق دے دیا اور اس مقام پر دیوار آگے کر دی جہاں اب ہے' مشرق کی طرف ستون مربعہ سے مسجد کی آج کی دیوار تک اضافہ کر دیا' اس کے ساتھ مربعۃ القبر سے شام کی جگہ تک چودہ ستون تھے اور مغرب میں دو ستون بڑھائے' پھر ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے گھر مسجد میں شامل کر لئے نیز اس میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے وہ تین مکان بھی شامل کر لئے جنہیں "قرائن" کہا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ مؤرخین کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھر ولید کے حکم پر مسجد میں شامل کئے گئے تھے چنانچہ نویں فصل میں ہم نے عطاء خراسانی کا یہ قول نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے ازواجِ مطہرات کے مکان دیکھے تو کھجور کی ٹہنیوں سے بنے تھے اور ان پر سیاہ بالوں کے کمبل پڑے تھے۔ ولید کا خط پڑھا جا رہا تھا تو میں بھی وہاں موجود تھا' اس نے حکم دیا کہ ان کے مکان مسجد میں داخل کر دئے جائیں' اس دن سے زیادہ لوگوں کو میں نے روتے نہیں دیکھا۔ عطاء کہتے ہیں' میں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے سنا' یہ ان کے مکان اسی حال میں رہنے دیتے تو اچھا تھا' لیکن زین مراغی نے سہیلی کے حوالے سے لکھا کہ عبد الملک بن مروان کے عہد میں ان کے حجرے اور مکان مسجد میں شامل کر لئے گئے تھے۔

میں کہتا ہوں: جو یہ بات عبد الملک کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے وہ مکان گرائے بغیر مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لئے رہنے دئے کیونکہ مسجد کی جگہ تنگ تھی' لوگ انہیں مسجد میں شامل کرنے سے پہلے نماز جمعہ کے دن استعمال کرتے اور ان میں نماز پڑھتے۔ چنانچہ مالک کہتے ہیں کہ لوگ ان گھروں میں داخل ہو جاتے اور وصال رسول ﷺ کے بعد ان میں جمعہ کی نماز پڑھتے رہے کیونکہ نمازیوں کے لئے مسجد میں جگہ تنگ تھی۔ کہتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے مکان مسجد کا حصہ نہ تھے لیکن ان کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ انتھٰی۔

ابن زبالہ کی گذشتہ بات کا باقی حصہ یہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنو عبد الرحمٰن بن عوف کو درہم دینے کی کوشش کی تو انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ آپ نے مکان گرا کر اسے مسجد میں شامل کر لیا۔

عبد الرحمٰن بن حمید کہتے ہیں کہ گرانے کے وقت ہمارا کچھ سامان ضائع ہوا اور انہوں نے مشرق اور شام کی

طرف سے ازواجِ مطہرات کے گھر شامل کیے' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا گھر شامل کیا' حضرت عبداللہ بن مسعود کا وہ گھر شامل کیا جسے ''دار القراء'' کہتے تھے' ہاشم بن عتبہ بن ابو وقاص کے مکان شامل کیے' مغرب کی طرف سے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کا گھر شامل کیا' مغربی جانب مربعہ والی' ابو سبرہ بن ابی رھم کی زمین شامل کی' اس کے ساتھ واقع حضرت عمار بن یاسر کا گھر بھی شامل کیا اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھر کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل کر لیا۔ میں اسے جانتا ہوں جو مسجد میں شامل کیا گیا تھا۔ آپ نے چھت سے ملے ستونوں کو مسجد کے دوسرے ستونوں سے اونچا کیا اور پھر حضرت عباس بن عبد المطلب کے غلام مخارق کا گھر بھی مسجد میں ملا لیا۔

میں کہتا ہوں' یہاں اگرچہ اُدْخِلَ الخ کا لفظ لایا گیا ہے جس کا فاعل اگرچہ معلوم نہیں (کس نے داخل کیے) لیکن اسے یہاں ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ ولید بن عبد الملک کا تھا۔ یہ محل نظر ہے' کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ستونِ مربعہ کے بعد ایک ستون کا اضافہ کیا۔ اب ولید کا اضافہ اس کے بعد مغرب میں رہ جاتا ہے لہٰذا اسے ابو سبرہ کے گھر تک شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ گھر مربعہ کے مقام پر تھا ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مربعہ سے مراد وہ ستون لیں جو دارِ مروان کے دروازے میں داخل ہوتے وقت تمہاری دائیں طرف تھا اسی کو باب السلام کہتے ہیں اور یہ مذکور دروازے سے دوسرا ہے کیونکہ ولید کے اضافے کی ابتداء ہے کیونکہ آپ اپنے گزشتہ قول میں بتا آئے ہیں کہ ''انہوں نے مغرب میں دو ستونوں تک اضافہ کیا۔'' لیکن یحییٰ سے نقل کرتے ہوئے ابن شبہ نے کہا کہ ''ابو سبرہ بن ابو رھم کا ایک گھر تھا جو اس ستونِ مربعہ کے پاس تھا جو مسجد میں دائیں اور مغربی جانب میں تھا' یہ نیا تھا پھر وہاں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان بھی تھا چنانچہ دونوں مسجد میں شامل کر دیے۔ انتہیٰ۔

یہ اس بات میں ظاہر ہے کہ مربعہ سے مراد وہ آٹھ پہلو ستون ہو جس کا ہم حضرت عثمان کے اضافے کے دوران ذکر کر چکے ہیں۔ پھر ان کا یہ کہنا ''حضرت عباس بن عبد المطلب کے گھر کا کچھ حصہ'' تو یہ بھی اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ ولید ہی نے آپ کا کچھ حصہ شامل کیا تھا اور شاید یہ بچ جانے والا حصہ ہی ہو گا جسے مروان نے اپنے گھر میں داخل کر لیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولید ہی نے مروان کے گھر والا کچھ حصہ شامل کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مروان کا گھر مغرب کی طرف سے مسجد کے ساتھ ملا ہوا تھا اور اس میں مسجد کی طرف چھوٹا سا دروازہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے ولید کے اضافے سے پہلے اسے بنایا تھا کیونکہ مروان کی وفات خلافت کے دس ماہ گذارنے کے بعد ۶۵ھ میں ہوئی تھی۔

اب آیئے ابن زبالہ کی گذشتہ بات پوری کریں۔ کہتے ہیں کہ ولید بن عبد الملک نے شاہِ روم کو لکھا ''ہم اپنے عظیم نبی کی مسجد بنانا چاہتے ہیں لہٰذا سامان اور کاریگر بھیج کر ہماری مدد کریں۔ کہتے ہیں کہ اس نے بیس سے زائد کاریگر اور بہت سا سامان بھیج دیا' کچھ نے دس کاریگر لکھے ہیں اور لکھ بھیجا کہ یہ دس کاریگر سو جتنا کام کریں گے نیز اسّی ہزار دینار مدد بھی کی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات یحییٰ نے بھی لکھی ہے نیز ایک اور روایت میں کہا کہ شاہ روم نے چالیس رومی ماہر اور چالیس قبطی کاریگر بھیجے اور چالیس ہزار مثقال سونا بھی بھیجا (ساڑھے اڑتیس ہزار تولہ یعنی بارہ من ایک سیر اور بیس تولہ) پھر رزین کی روایت ہے کہ اس نے تیس کاریگر اور روم سے چالیس بھیجے نیز اتنے ہی قبط (مصر) سے بھیجے۔اس کے ساتھ اسی ہزار مثقال سونا بھیجا (یعنی ۲۴ من دو سیر اور ۴۰ تولہ) پھر نقش و نگاری پتھر والے سامان کے اونٹ الگ تھے نیز قندیلوں کی زنجیریں بھی تھیں۔انتہٰی۔

ابن زبالہ کی بقیہ بات بھی سنئے' پھر اس نے یہ زنجیریں بھیجیں جن کے ساتھ ہی قندیلیں بھی تھیں۔کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مسجد کو ۹۱ھ میں گرایا اور پھر نقش و نگار والے پتھروں سے بنایا جس پر بطن نخل سے لایا چونا لگایا پھر جواہرات اور مرمر سے اسے چار چاند لگا دئے' یہاں سے اس نے مسجد کی کچی اینٹیں نیز حجروں کی اینٹیں لے کر حرۃ میں اپنا مکان بنایا' اسی مکان پر آج کل سفیدی کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ عین اس وقت جب یہ لوگ مسجد میں کام کر رہے تھے تو مسجد خالی نظر آئی چنانچہ ان میں سے ایک رومی کاریگر نے کہا کہ کیا میں ان کے نبی کی قبر پر پیشاب نہ کر دوں' پھر تیار ہوا لیکن اس کے ساتھیوں نے اسے منع کر دیا لیکن جب اس نے پختہ ارادہ کر لیا تو سر کے بل گرا' اس کا دماغ پھٹ گیا جسے دیکھ کر کئی نصرانی مسلمان ہو گئے پھر ان رومی کاریگروں میں سے ایک نے قبلہ کی دیوار کے پانچ روشن دانوں کے اُوپر خنزیر کی شکل بنا دی' حضرت عمر بن عبد العزیز کو پتہ چلا تو انہوں نے اس کی گردن اُڑانے کا حکم دے دیا اور وہ اُڑا دی گئی۔اُن کے کاریگروں نے کہا (جو پتھر کا کام کر رہے تھے) کہ ہم اسے یوں بنا رہے ہیں جیسے ہمارے معلومات کے مطابق جنت کے درختوں اور محلات کی صورت ہے۔انتہٰی۔

یحییٰ کی گذشتہ خبر کے مطابق حضرت عمر بن عبد العزیز نے سال بھر وہ چونا پکایا جس سے نقش و نگار کا سامان تیار کیا تھا' چونا وہ بطن نخل سے لے کر آئے' بنیاد پتھروں سے تیار کی اور دیواریں پتھروں سے بنائیں اور انہیں چونا لگایا' مسجد کے ستون اندر سے خالی پتھروں کے تیار کئے جن کے اندر لوہا اور سکہ پگھلا کر بھر دیا' مسجد لمبائی میں دو سو ہاتھ تھی اور چوڑائی اگلی طرف سے دو سو ہاتھ اور پچھلی طرف سے ایک سو اسی ہاتھ تھی' اس سے پہلے اس کا اگلا حصہ پہلی لمبائی کے مقابلے میں چوڑا تھا۔انتہٰی۔

یحییٰ نے چوڑائی غلط لکھی ہے کیونکہ آئندہ اکتیسویں فصل میں ابن زبالہ نے اپنی ایک تحریر میں آگے سے مسجد کی چوڑائی اپنے دور میں ایک سو پینسٹھ ہاتھ بیان کی ہے جبکہ پچھلی طرف سے چوڑائی ایک سو تیس ہاتھ بتائی ہے اور پھر آگے یہ بھی آ رہا ہے کہ ہماری تحریر کے مطابق آج کل قبلہ کی طرف اگلے حصے کی چوڑائی ایک سو ستاسٹھ ہاتھ ہے جبکہ پچھلی طرف شام کی جانب ایک سو پینتیس ہاتھ ہے اور اس میں شک نہیں کہ مسجد کی چوڑائی گھٹ نہیں سکی چنانچہ یہ مذکور پیائش صحیح نہیں۔اسے ابن نجار نے اہل سیرت سے نقل کیا اور مطری پیروی کر گئے۔

ابن زبالہ کے مطابق جب حضرت عمر بن عبد العزیز قبلہ والی دیوار کی طرف ہوئے تو اہلِ مدینہ قریش و انصار' عرب اور غلاموں میں سے عمر رسیدہ لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ آؤ اپنے قبیلہ کی بنیاد میں شامل ہو جاؤ' کل یہ نہ کہنا کہ عمر نے ہمارے قبلہ کا رُخ تبدیل کر دیا ہے پھر آپ ایک پتھر اُکھاڑتے اور اسی جگہ نیا پتھر رکھتے جاتے چنانچہ ولید بن عبد الملک نے مشرق سے مغرب تک چھ ستونوں کا اضافہ کیا اور شام کی طرف اس ستون مربعہ سے چودہ ستون بڑھائے' جو قبرِ انور کے اندر ہے جن میں سے دس تو کھلی جگہ میں اور چار پہلی ڈیوڑھیوں میں جو پہلے موجود تھیں' ستون مربعہ کے قریب والے ستون سے مشرق کی طرف چار ستون بڑھا دئے' یہ بھی ڈیوڑھیوں میں تھے' اس اضافے میں نبی کریم ﷺ کا گھر مبارک بھی شامل کر لیا گیا اور باقی تین ستون ڈیوڑھیوں میں رہ گئے۔

میں کہتا ہوں' اس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ وہ چھ ستون جنہیں مشرق و مغرب میں بڑھایا' ان میں سے مغرب کی طرف دو کے علاوہ اور کوئی نہیں جبکہ ان میں سے چار مشرقی جانب ہیں چنانچہ ولید کے اضافے کی مشرقی جانب میں ابتداء اس ستون سے ہوتی ہے جو آج کل ان جالیوں سے ملا ہوا ہے جو حجرہ شریف کے گرد ہیں' چنانچہ ان کے قول: ''اس ستون سے جو مربعہ کے نزدیک مشرق میں ہے۔'' میں یہی ستون مراد ہے اور ان کے قول ''تین ستون باقی رہ گئے'' سے مراد مذکورہ چار ستونوں میں سے ہیں اور ''ڈیوڑھیوں میں'' سے مراد مشرق والا موجودہ حصہ ہے لیکن یحییٰ کی پچھلی روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے مشرق میں ستونِ مربعہ (قبر شریف والا) مسجد کی مشرقی دیوار تک اضافہ کیا لہٰذا اس بناء پر ان کے صرف تین ستون ہوتے ہیں لیکن احتمال یہ ہے کہ مغرب میں بھی تین ہی ہوں پھر ان کے اس قول: ''قبرِ انور والے ستونِ مربعہ سے شام کی طرف الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے چھت والا مشرقی حصہ بنایا تو اس کی ابتداء اس کھلی جگہ سے کی اور اسی لائن میں شام کی طرف چودہ ستون بنائے جن میں سے دس تو کھلی جگہ پر اور چار چھتے ہوئے حصہ پر بنائے' یہ چھت پہلے موجود تھی یعنی شام کی طرف چھتے حصے پر بنائے' شامی کھلے حصہ پر چھت ڈالی اور یہ چھت چودہ ستونوں کے بعد ہے چنانچہ تعداد کے لحاظ سے یہ تھا ان کا اضافہ۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ شام کی طرف سے مسجد کی دیوار ولید کے دور میں مربعہ سے اٹھارہ ستونوں کے بعد تھی کیونکہ جب تم ڈیوڑھیوں والے نئے ستون ان سے ملاؤ گے جو چودہ مذکور ہیں تو اٹھارہ ہی بنیں گے چنانچہ گذشتہ دیوار کی جگہ وہ ہے جو اس ستون کے برابر ہے اور جو شامی چھتے حصے سے ایک ستون پہلے ہے جو رحبہ کی طرف ہے اور یہی وہ بات ہے جو انہوں نے پہلے بتا دی کہ انہوں نے اس کا طول (قبلہ سے شام کی طرف) دو سو ہاتھ کیا تھا تو یہ بات پکی ہو گئی کہ شام کی طرف سے ان کا اضافہ (جیسے بتایا جا چکا) دورِ عثمان میں چالیس ہاتھ ہوا تھا پھر یہ احتمال ہے کہ ان کے اس قول سے مراد ''شام کی طرف سے چودہ ستون ہے جو قبر انور والے ستون سے شروع ہوتے ہیں۔'' یہ ہے کہ ان کے دور میں شام کی جانب مسجد ان چودہ ستونوں سے شروع ہوئی جو مربعہ سے شام کی جانب تھا چنانچہ شام والی دیوار اس چبوترے کی طرف سے جو شام کی طرف چھتا ہوا ہے' پانچویں ستون کے برابر آتی ہے جو چبوترے کی طرف ہے اور پھر

وہاں ایک اور ستون ہے جو درمیانی صف اور مشرقی چھتے حصے میں ہے۔ جو بندے کے بیٹھنے کی جگہ جتنا مربع شکل کا ہے اور اس بناء پر وہ حد کی علامت ہوگا لیکن یہ گذشتہ اس بات کے خلاف ہے کہ انہوں نے اس کا طول دوسو ہاتھ کیا تھا بلکہ اس صورت میں اس کا طول ایک سو ساٹھ ہاتھ بنے گا اور یہ وہی طول ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں تھا لہٰذا یہ احتمال باطل ہوا لیکن آئندہ خلیفہ مہدی کے اضافہ میں اسے شمار کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

صالح بن کیسان کہتے ہیں کہ جب مسجد گرانے کے بارے میں دمشق سے ولید کا خط آیا تو وہ پندرہ لوگ چلے اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے جگہ کو صاف کر دیا' مجھے گرانے اور تعمیر کرنے کا نگران بنایا چنانچہ ہم نے مدینہ کے کاریگر لے کر اسے گرانا شروع کیا' سب سے پہلے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے گھر گرائے اور اسی دوران ہمارے پاس وہ کاریگر پہنچ گئے جو ولید نے بھیجے تھے۔

ابنِ زبالہ کے مطابق جنازگاہ (ولید کے دور میں مسجد کی مشرقی جانب) دو کھجوریں تھیں کہ جنازہ آتا تو ان دونوں کے پاس رکھ دیتے' پھر جنازہ پڑھاتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے انہیں کاٹنے کا ارادہ کیا' یہ ۸۸ھ کا واقعہ ہے' انصار میں سے بنونجار نے دونوں درختوں کے بارے میں جھگڑا کیا تو آپ نے خرید کر انہیں کاٹ دیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات گذشتہ اس بات کے خلاف نہیں کہ حضرت عمر نے ۹۱ھ میں مسجد کو گرایا تھا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان کی نگرانی ۸۸ھ سے ہوئی ہو' پھر سامان لینے' مکان خریدنے اور چونا پکانے کا کام ۹۱ھ تک رہا ہوا۔ چنانچہ یحییٰ کے مطابق حضرت عمر نے تعمیر کا سلسلہ تین سال تک جاری رکھا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح حضرت عمر بن عبد العزیز ۹۳ھ کے آخر میں فارغ ہوئے اور یہی وہ سال ہے جب حضرت عمر بن عبد العزیز مدینہ سے معزول کر دئے گئے۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ گرانے کا کام ۹۳ھ میں ہوا تاہم ابن زبالہ کی ایک روایت میں ملتا ہے کہ مسجد کو گرانے اور تعمیر کرنے کی ابتداء ۸۸ھ میں ہوئی تھی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مسجد کی تعمیر ۸۸ھ میں شروع کی تھی اور ۹۱ھ میں فارغ ہوئے' اسی سال ولید نے حج کیا تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ جب آپ فارغ ہو گئے تو حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو پیغام بھیجا چنانچہ انہیں ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر لایا گیا۔ آپ نے پوچھا' آپ کی اور اس تعمیر میں کیا فرق نظر آیا؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اسے مسجدوں کے طریقے پر بنایا تھا لیکن آپ نے گرجوں کی طرز بنا دی ہے۔

کہتے ہیں کہ ولید نے جب آلِ عمر کا خوخہ دیکھا تو کہا کہ اسے تمہارے ماموؤں نے بنایا تھا' یہ اس لئے کہا کہ عمر کی والدہ انہی میں سے تھیں۔

یحییٰ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابان بن عثمان نے یہ بات ولید سے کی تھی کیونکہ انہوں نے کہا تھا: جب ولید حج کرنے آئے تو پھر مسجد (مدینہ) میں گھومتے رہے' ہر چیز کو دیکھا' جگہ جگہ حضرت عمر بن عبد العزیز پر اعتراض بھی

اُٹھاتے رہے' حضرت ابان بن عثمان ساتھ ہی تھے۔ جب ولید نے ساری مسجد دیکھ لی تو ابان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہماری اور آپ کی تعمیر کیا فرق نظر آیا؟ انہوں نے کہا ہم نے تو اسے عام مسجدوں کے طریقے پر بنایا تھا لیکن آپ نے گرجوں کی طرح بنا دی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر نے مسجد کے حسن میں بڑی دلچسپی لی چنانچہ جب آپ کسی کاریگر کو دیکھتے کہ اس نے پتھر وغیرہ نہایت خوبصورتی سے لگائے ہیں تو اسے اصل مزدوری سے زیادہ تیس درہم بطور انعام دیتے۔

ابن زبالہ کے مطابق ابراہیم بن محمد زہری کہتے ہیں کہ ان کے دادا نے بتایا' جب ولید بن عبد الملک حج کر کے مدینہ پہنچے تو اس وقت حضرت عمر بن عبد العزیز تعمیر سے فارغ ہو چکے تھے' ولید نے مسجد میں گھومنا شروع کیا اور ساری مسجد دیکھی' جب مقصورہ کی چھت پر نظر پڑی تو کہا: آپ نے پوری چھت ایسی کیوں نہیں بنائی؟ انہوں نے جواب دیا۔اے امیر المؤمنین' یوں خرچہ بہت بڑھ جاتا۔ ولید نے کہا: کوئی بات نہ تھی۔ ابراہیم کے دادا کہتے ہیں کہ مقصورہ شریف (حجرہ کا حصہ) پر چالیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔

ابن نجار نے اہلِ سیرت سے یہ بات لکھی ان کے الفاظ یہ ہیں: اے امیر المؤمنین! یوں بنانے سے خرچہ بہت بڑھ جاتا' ولید نے کہا: پھر کیا ہوتا؟ حضرت عمر نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ میں نے قبلہ والی دیوار اور دو چھتوں کے درمیان کیا خرچہ کیا ہے؟ اس نے پوچھا بتایئے تو انہوں نے کہا کہ پینتالیس ہزار دینار خرچ ہوئے ہیں' کچھ کے مطابق کہا کہ چالیس ہزار خرچ ہوئے۔ ولید نے کہا تو گویا تم نے اپنی جیب سے خرچ کئے ہیں؟ کچھ کہتے ہیں کہ یہ خرچہ چالیس ہزار مثقال تھا۔ انتہٰی۔

یحیٰی نے ابن زبالہ کے اس قول ''اس میں خرچہ چالیس ہزار دینار تھا۔'' کے بعد لکھا ہے کہ ولید قبر شریف کے قریب پہنچے تو ابن ولید نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ یہ قبر میں کون ہیں؟ انہوں نے بتایا: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔ اس نے پوچھا: تو پھر حضرت امیر المؤمنین عثمان کہاں ہیں؟ حضرت عمر نے دلچسپی نہیں لی تو اس نے اصرار کیا' آپ نے کہا کہ وہ لوگوں کی مصروفیت کی بناء پر دفن کر دئے گئے تھے۔ پھر کہا کہ آپ نے بے ادبی کی ہے۔ ابن زبالہ نے مزید کہا کہ یہ سوال بکار بن عبد الملک نے کیا تھا۔ وہ کمزور تھے۔

ابن شبہ کے مطابق موسیٰ بن عبد العزیز نے بتایا کہ مجھے حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ ولید مدینہ پہنچنے پر میرے ہاتھوں کے سہارے ساری مسجد میں گھومے اور تعمیر دیکھی' پھر حضور ﷺ کے گھر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا: کیا آپ کے ساتھ ابوبکر و عمر بھی ہیں؟ میں نے کہا' ہاں۔ اس نے پوچھا تو پھر حضرت عثمان کہاں ہیں؟ آپ کتنے ہیں' آگے اللہ جانے لیکن میرا خیال یہ تھا کہ وہ ان دونوں حضرات کو نکال کر رہے گا چنانچہ میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قتل ہوئے تو لوگ فتنہ میں پڑ کر مصروف ہو گئے چنانچہ اسی وجہ سے وہ یہاں دفن نہیں کئے جا سکے' یہ سن کر ولید چپ ہو گیا۔

یحییٰ کے مطابق آپ نے مقصورہ شریف ساج کی لکڑی سے بنوایا جبکہ پہلے پتھر سے بنا تھا۔واقدی کہتے ہیں مجھے عبد اللہ بن یزید نے بتایا کہ قبطیوں نے مسجد کا اگلا حصہ بنایا اور رومیوں نے وہ حصہ بنایا جو چھت سے باہر تھا' یعنی اس کے اطراف اور آخری حصے کو بنایا۔میں نے حضرت سعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا' کہا: ان قبطیوں کا کام مضبوط ہے۔

فصل نمبر ۱۷

ولید کی توسیع میں محراب' برجیاں اور منار شامل تھے' محافظ کا کمرہ بنایا' مسجد میں نمازِ جنازہ روک دی

کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قتل ہوئے تو مسجد میں برجیاں (چھوٹے گنبد) نہ تھیں اور نہ ہی محراب تھا' یہ حضرت عمر بن عبد العزیز ہی تھے جنہوں نے دیواروں پر برجیاں اور محراب بنوائے۔حضرت قاسم اور سالم نے مسجد پر لگی برجیاں دیکھیں تو کہا کہ یہ مسجد کی خوبصورتی کا باعث ہیں۔ابن زبالہ کی تحریر میں ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز ہی نے مسجد چھتوں پر سکہ چڑھا اور پرنالے سکہ کے بنوائے اور کوئی پرنالہ اس کام سے خالی نہ چھوڑا' صرف دو پرنالے بچ گئے جن میں سے ایک جنازگاہ میں تھا اور دوسرا اس دروازے پر تھا جہاں بازار سے لوگ داخل ہوتے تھے' اسے بابِ عاتکہ کہتے تھے۔مسجد پر برجیاں نہ تھیں' یہ والئی مدینہ عبد الواحد بن عبد اللہ نصری نے ۱۰۴ھ میں بنوائیں۔انتہٰی۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ یہ برجیاں ولید کی توسیع میں نہیں بنی تھیں بلکہ اس کے دورِ خلافت میں بھی نہیں بنی تھیں کیونکہ اس کی وفات رجب ۱۰۱ھ میں ہوگئی تھی۔

سننِ بیہقی میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "مسجدیں تعمیر کرو اور جگہ ہموار ہو۔" حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ ہمیں بلند جگہ پر بنی مسجدوں میں نماز پڑھنے سے روکا گیا۔

علامہ زین مراغی لکھتے ہیں کہ جب سے آتش زدگی کا معاملہ بنا' مسجد کی برجیاں نہیں بنائی گئیں البتہ ۷۶۷ھ میں اس وقت نئے سرے سے بنائی گئیں جب مصر کے حکمران شعبان بن حسین بن محمد کا دور تھا۔انتہٰی۔

برجیوں سے مراد وہ چیز ہے جو صحن کی دیواروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوتی ہیں اور ان کے درمیان جالی کے سوراخوں جتنا فاصلہ ہوتا ہے اور جو بدر بن فرحون نے لکھا ہے ان سے بھی یہی مراد ہے کہ قاضی فخر الدین اپنے مصلّے پر بیٹھے رہتے' سورج نکل آتا تو نمازِ اشراق پڑھتے' انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ اپنی نماز کے لئے بدر کے لڑکے الشیخ ابو عبد اللہ کی انتظار کرتے۔کہتے ہیں کہ حضرت قاضی اس وقت اُٹھتے جب سورج مغربی دیوار میں چھوٹی جالیوں کے نیچے تک آ جاتا۔کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ تھا' مجھے ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا چنانچہ پوچھا' میں دیکھتا ہوں کہ آپ

اشراق کے لئے وقت سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اس سے اس وقت تک روک رکھا ہے جب تک سورج چڑھ نہ آئے اور خوب روشن نہ ہو جائے۔ حضرت قاضی میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا آج کے بعد ہم جیسے تم کہتے ہو' دیر کر لیا کریں گے اور پھر چپ ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے یہ بات اس لئے ذکر کر دی ہے کہ آج کل اکثر لوگ نوافل اس وقت شروع کر دیتے ہیں جب سورج برجیوں کے سروں پر آ جاتا ہے اور یہ سورج چڑھنے کے بعد سورج کے نیزے بھر اوپر آنے سے پہلے کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تیار کردہ منار

ابن زبالہ اور یحییٰ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب مسجد تعمیر کرائی تو چار منار رکھے' ہر کونے پر ایک منار تھا۔ چوتھا منار مروان کے گھر پر اونچا تھا۔ جب سلیمان بن عبدالملک حج سے واپس آیا' مسجد میں مؤذن نے اذان پڑھی تو اوپر سے جھانک کر دیکھا جس پر سلیمان نے اس منار کو گرانے کا حکم دیا چنانچہ مسجد کی چھت کے برابر اسے گرا دیا گیا' اس کا دروازہ مسجد کے دروازے پر تھا۔ یحییٰ کے نسخہ میں ہے کہ اس کا دروازہ مسجد کے اس حصے پر تھا جو مسجد کی طرف سے مروان کے گھر سے ملتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد مسجد کے صرف تین منار رہ گئے اور ابن زبالہ کے اس قول: مسجد نبوی کے تین منار ہیں جن میں سے ہر ایک ساٹھ ہاتھ بلند تھا' اور دوسری جگہ کہا کہ شمال مشرقی منار پچپن ہاتھ بلند تھا اور جنوب مشرقی بھی پچپن ہاتھ جبکہ شمال مغرب والا ترپن ہاتھ بلند تھا جبکہ ان کی ہر طرف سے چوڑائی آٹھ آٹھ ہاتھ تھی اھ۔

ابن جبیر نے جو کچھ اپنے سفرنامے میں لکھا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ شام کی طرف والے دونوں منار چھوٹے تھے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے: مسجد مبارک کے تین منار تھے جن میں سے ایک رُکن مشرق میں تھا جو قبلہ کے متصل ہے اور دو دوسری طرف چھوٹے تھے اور برجوں جیسے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید شام کی طرف والے دونوں منار تبدیل کر دئے گئے ہیں کیونکہ آج کل وہ جنوب مشرقی منار کی شکل کے ہیں جو آج کل منارۂ رئیسیہ کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اسے رئیس ہونے کی خصوصیت حاصل ہے اور ہمارے اس دور میں منارۂ رئیسیہ کا طول اولاً اس کے ہلال (چاند) کے سرے سے نیچے تک ستر ہاتھ ہے پھر اس میں سے ایک تہائی حصہ اس کڑک کی وجہ سے گر چکا ہے جس سے مسجد میں دوبارہ آگ لگی تھی چنانچہ اسے پورے کو گرا دینے کی صورت بن گئی پھر اسے دوبارہ بنایا گیا چنانچہ آج کل اس کا طول سو ہاتھ سے زیادہ ہے چنانچہ یہ سب مناروں سے طویل ہو گیا پھر اس کے بعد دوبارہ خرابی ہوئی چنانچہ سلطان اشرف شجاعی نے شاہین جمالی کو بھیجا اور اسے حکم دیا کہ اسے گرا دے چنانچہ اس نے گرا دیا' یہ مضبوط نہ تھا پھر نہایت گہرائی میں بنیاد کھودی اور دوبارہ اسے نہایت مضبوط بنایا جس کا عرض

مسجد کی مشرقی دیوار تک تھا جو مسجد کے مشرق میں جنازگاہ سے شروع ہوتی ہے پھر اس کی بلندی میں بھی اضافہ کیا جس کی بناء پر وہ ایک سو بیس ہاتھ کا ہو گیا اور شمال مشرقی منار کا طول اناسی ہاتھ ہے' اسے سنجاریہ کہتے ہیں جبکہ شمال مغربی منار کا طول بہتر ہاتھ ہے جسے خشبیہ کہتے ہیں' ہر ایک کی پیائش ہلال کے اوپر والے کنارے سے مسجد کی باہر والی زمین تک ہے اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ جو منار ابن زبالہ کے دور میں تھے' آج ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ شروع سے مسجد کے تین منار چلے آتے تھے حتیٰ کہ چوتھا جدید بنا دیا گیا' ایک اور جگہ پر انہوں نے اس کی نئی تعمیر کا ذکر کیا ہے چنانچہ مروان کے اس خوخہ کے ذکر میں کہا ہے جو مسجد غربی کے کونے میں موجود ہے: '' ولید نے خوخہ مذکورہ کا مشاہدہ اس وقت کیا جب وہ جدید بڑا منار ۷۰۶ھ میں بنا رہے تھے' اسے بنانے کا حکم سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون نے دیا تھا۔''

علامہ مطری نے کہا کہ خوخہ کا دروازہ اسی پر تھا اور وہ ساج کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جو آج تک کمزور نہیں ہوا' اسی سے مروان مسجد کے اندر داخل ہوا کرتا تھا' یہ خوخہ منارہ کی مغربی دیوار کی وجہ سے بند ہو گیا۔

(قلت) بدر بن فرحون رحمہ اللہ نے اس منار کی تعمیر کا ذکر کیا ہے کیونکہ انہوں نے اسے بنتے دیکھا تھا' انہوں نے کہا ہے کہ کھدائی کے وقت یہاں کسی منار کا کوئی اثر باقی نہیں تھا' ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے: جب سلار اور بھرس دونوں نے حج کیا تو ان سے خادموں کے سربراہ شبل الدولہ کافور مظفری (جسے حریری کہتے تھے) نے آج کل کے باب السلام والے منار کی تعمیر کے لئے گفتگو کی جس پر دونوں نے بہت سا انعام دینے پر رضا مندی ظاہر کی' پھر اسے ڈر ہوا کہ یہ دونوں بے پرواہی کریں گے اور خرچہ برداشت نہیں کر سکیں گے چنانچہ کہنے لگے کہ میں تم سے مال نہیں مانگتا' میرے پاس سونے اور چاندی کی قندیلیں ہیں جو اس کام سے بڑھ کر ہیں۔ اس پر انہوں نے کاریگر بھیجنے کا وعدہ کیا اور اسی مقام پر بنیاد کھودنے کا اظہار کیا جہاں یہ آج کل موجود ہے چنانچہ ابھی تھوڑا سا نیچے گئے تھے کہ انہوں نے مروان بن حکم کے دروازے کو دیکھا جو زمین سے قد انسانی جتنا نیچے تھا پھر انہوں نے مروان کے دور میں مسجد کے فرش پر سیاہ رنگ کے ڈالے گئے کنکر دیکھے جو دیکھنے میں جبل سلع کے معلوم ہوتے تھے پھر وہ بنیاد میں نیچے گئے اور پانی تک جا پہنچے پھر حریری نے اہل مدینہ کو تعمیر میں تعاون کے لئے کہا جیسے الشیخ ابراہیم بناء اور الشیخ علی الفراش الحجار وغیرہ' یہ زیادہ ماہر نہیں تھے چنانچہ انہوں نے بنیاد برابر کی اور موسم حج میں جب کاریگر آئے تو ان کے سربراہ نے شیخ سے کہا' اسے مت بناؤ کیونکہ یہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ ہم اس سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ شیخ اس تعمیر سے رُک گئے اور اسی وقت مصر کو گئے چنانچہ شیخ نے اپنے معلّموں سے کہا کہ تم بناؤ چنانچہ انہوں نے اسے موجودہ شکل میں بنا دیا اور یہ قابل دید اور مفید بن گیا کیونکہ یہ مدینہ کے درمیان میں ہے چنانچہ اذان دینے والوں کے سربراہ محمد بن ابراہیم نے مجھ سے کہا' اگر آپ اذان کی یہ جگہ میرے سپرد کر دیں تو پورے مدینہ میں آواز پہنچا لوں گا اور واقعی یہ سچ تھا کیونکہ مدینہ کا پھیلاؤ اور اس کی قوت مغرب کی طرف تھی یعنی اس منار کے عین برابر۔

بعض مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ وہاں اذان کے لئے مروان کے گھر سے اونچی جگہ تھی جسے اس نے مؤذنوں سے اپنے گھر کی غیرت بچانے کے لئے گرا دیا تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی علامت موجود ہے۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں' جو کچھ انہوں نے آخر میں ذکر کیا ہے کہ یہ "منار" احتمال ہے کہ مسجد کے دروازے پر ہو اور چھت سے مروان کے گھر سے ملا ہوا اور زمین میں اس کی بنیاد ہی نہ ہو۔" چنانچہ اس پر ان کا پہلی روایت میں یہ قول دلیل ہے: "اس کا دروازہ مسجد پر ہے یا اس طرف مسجد کے دروازے پر ہے۔" تو کھدائی کے وقت زمین میں اس کا اثر دکھائی نہ دینے سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ سرے سے اس طرف موجود ہی نہ ہو۔ علماء نے اس کی پیائش کا خیال نہیں رکھا حالانکہ یہ مسجد کے سارے مناروں سے طویل ہے' ہم نے ہاتھوں سے اس کی پیائش کی تھی تو اوپر ہلال کے سرے سے زمین تک پچانوے ہاتھ تھا لیکن رئیسیہ منار پہلی آتشزدگی کے بعد نیا بنا تو اس سے طویل ہو گیا۔ (واللہ اعلم)۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد میں سب سے پہلے منار بنانے کا سلسلہ ولید کے اضافے کے دوران ہوا اور پھر اس کی شہادت ابن اسحاق' ابو داؤد اور بیہقی کی یہ روایت ہے کہ بنی نجار کی ایک عورت نے کہا کہ میرا گھر مسجد کے گرد والے گھروں میں سے طویل ترین تھا' روزانہ صبح کو بلال اس پر اذانِ فجر دیتے' وہ سحری ہی وقت وہاں آ جایا کرتے' چھت پر بیٹھے فجر ہونے کی انتظار کرتے رہتے پھر دیکھ کر لیٹتے اور پھر کہتے "اے اللہ میں تیری تعریف کر رہا ہوں اور قریش کے بارے میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں کہ تیرے دین پر قائم ہو جائیں۔" وہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد وہ اذان پڑھتے۔

ابو برزہ اسلمی کہتے ہیں کہ منار پر اذان پڑھنا سنت ہے اور یونہی اقامت (تکبیر) بھی سنت ہے' ان کے علاوہ روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں اذان حضرت عبداللہ بن عمر کے گھر کی چھت پر ہوتی تھی جو مسجد سے قبلہ کی طرف تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق محمد بن اسماعیل وغیرہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر میں قبلہ کی طرف ایک منار تھا جس پر چڑھ کر بلال اذان دیتے تھے' چبوترے پر چڑھ کر اس پر جاتے چنانچہ وہ ستون اب تک قائم ہے' چار پہلو ہے جسے آج کل 'مسطمار' کہتے ہیں اور وہ عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر کے گھر میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ گذشتہ قصہ' خوخہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متبادل راستے کے بیان میں جس ستون کا ذکر ہے' وہ یہی ہے' بیان یہ ہے: "اسے ان کے لئے وسیع کر دیا اور یہ ستون تک وسیع ہو گیا۔"

میں نے اقشہری کے قلم سے لکھا نقل کیا ہے کہ عبدالعزیز بن عمران نے کہا: حضرت عبداللہ بن عمر کے گھر میں قبلہ کی طرف ایک ستون تھا جس پر حضرت بلال اذان پڑھا کرتے اور وہ چوکور شکل میں اب تک موجود ہے۔ اقشہری کہتے ہیں کہ وہ آج تک اسی صورت میں موجود ہے' عبدالعزیز کہتے ہیں کہ اسے 'مسطمار' کہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس منار پر اذان پڑھتے جو

حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر میں تھا۔ یہ گھر مسجد سے متصل تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اس میں سیڑھیوں پر چڑھ کر اذان پڑھتے۔ یہ ستون اس گھر میں تھا جو حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں تھا اور جسے عبد اللہ بن عمر کا گھر کہا جاتا تھا' یہ مسجد سے باہر تھا' مسجد میں داخل نہ تھا اور نہ ہی آج کل اس میں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے مسجد میں خوشبو کا استعمال کیا اور مؤذنوں کی تنخواہ مقرر کی

یحییٰ کے مطابق حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسجد میں خوشبو کا استعمال کیا' مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں اور حضورﷺ کے بعد منبر سے نچلے تیسرے درجے پر بیٹھے۔

مسجد کا محافظ مقرر کیا گیا

حضرت موسیٰ بن عبیدہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تنخواہ پر مسجد کا محافظ رکھا تا کہ کوئی شخص مسجد میں دخل نہ دے سکے۔

کثیر بن زید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کی محافظ دیکھے' وہ لوگوں کو مسجد میں جنازہ پڑھنے سے روکا کرتے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا: تم لوگوں کو مسجد میں جنازہ پڑھنے پر مارتے ہو؟ وہ کہتے ہیں' ہاں' انہوں نے کہا: دیکھو! حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ تو مسجد ہی میں پڑھا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں: یحییٰ کے مطابق یہ محافظ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے موجود تھے' وہ لوگوں کو مسجد میں جنازہ پڑھنے سے روکا کرتے تھے کیونکہ مقبری کہتے ہیں کہ انہوں نے مروان بن حکم کے مقرر کردہ محافظ دیکھے جو لوگوں کو مسجد سے نکال دیتے اور اس میں جنازہ پڑھنے سے روکا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: رہا یہ کہ حضورﷺ کے دور میں کیا ہوتا تھا تو اس سلسلے میں ایک حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریمﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو قریب المرگ شخص کی آپ کو اطلاع دی جاتی' آپ تشریف لے جاتے اور دعا فرماتے اور جب وہ فوت ہو جاتا تو آپ اور صحابہ کرام واپس آ جاتے' کبھی بیٹھ بھی جاتے اور اتنی دیر ہو جاتی تو آپ کو بوجھ محسوس ہوتا۔ کہتے ہیں کہ جب ہم نے یہ مشقت دیکھی تو لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا: مناسب یہ ہے کہ بندے کے فوت ہو جانے تک ہم آپ کو اطلاع نہ دیا کریں' روح قبض ہونے ہی پر اطلاع دیا کریں' اس میں آپ بوجھ محسوس نہیں کریں گے اور نہ ہی وقت ضائع ہو گا چنانچہ ہم نے یونہی کیا' ہم آپ کو میت کی اطلاع دیتے' آپ تشریف لا کر جنازہ پڑھاتے' پھر کبھی تو چلے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک ٹھہرے رہتے۔ کچھ عرصہ تک ہم یونہی

کرتے رہے پھر ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اطلاع دیئے بغیر جنازہ اُٹھا کر آپ کے پاس لے جایا کریں' آپ اپنے گھر کے قریب ہی جنازہ پڑھا دیا کریں؟ یہ آپ کے لئے آسان رہے گا' چنانچہ ہم نے یوں ہی کیا اور آج تک یونہی ہو رہا ہے۔

مسجدوں میں نماز جنازہ کا حکم

ابن شہاب رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو آپ اس کے مقامِ دفن پر جاتے اور جنازہ پڑھایا کرتے' جب یہ آپ کے لئے دشوار ہو گیا اور آپ عمر رسیدہ ہو گئے تو لوگ آپ کے پاس جنازہ اُٹھا کر لے جاتے چنانچہ آپ اپنے گھر کے پاس ہی جنازگاہ میں جنازہ پڑھا دیا کرتے۔اب تک یہی سلسلہ جاری ہے۔

ابن شبہ کے مطابق جنازگاہ میں کھجور کے دو درخت تھے' میت لائی جاتی تو ان کے پاس رکھ دی جاتی' اور جنازہ پڑھا جاتا۔حضرت عمر بن عبد العزیز نے مسجد تعمیر کرتے وقت انہیں کاٹنے کا ارادہ کیا تو انصار ان کے بارے میں لڑنے لگے' آپ نے خرید کر انہیں کاٹ دیا۔

صحیح بخاری میں قصۂ یہود کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ "دو یہودیوں کو مسجد کے قریب جنازگاہ میں سنگسار کر دیا گیا۔" اس سے پتہ چلا کہ یہ جگہ جنازہ کے لئے مشہور ہو چکی تھی۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے' انہوں نے حکم دیا کہ حضرت سعد بن ابو وقاص کا جنازہ مسجد میں لے جا کر پڑھایا جائے' لوگوں نے یہ بات ناپسند کی تو سیدہ نے فرمایا: لوگ کتنی جلدی بھول جاتے ہیں' حضور ﷺ نے حضرت سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد ہی میں تو پڑھی تھی۔اور روایت میں ہے بخدا رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں سہیل اور ان کے بھائی کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ایسا کم ہی ہوا ہے ورنہ آپ کا اکثر عمل ویسے ہی ہوتا تھا جیسے اشارہ کر دیا گیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا تھا۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا' پھر حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا۔ایک اور روایت میں ہے کہ منبر کے پاس پڑھا تھا۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس سے تو اجماع ثابت ہوتا ہے۔اس میں کئی مذہب ہیں۔

ابن نجار نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے گذشتہ قول کے بعد کہا: جنازوں کے بارے میں سنت اب تک باقی ہے لیکن علویوں اور سرکاری لوگوں کو چھوڑ کر' کیونکہ باقی لوگوں کا جنازہ مسجد کی مشرقی دیوار کے پیچھے پڑھایا جاتا تھا جب امام جنازہ کے لئے کھڑا ہوتا تو حضور ﷺ دائیں طرف ہوتے۔انتہٰی۔

نامور اشراف شیعہ لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کا جنازہ کیونکر؟

میں کہتا ہوں کہ ابن نجار کا ذکر کردہ طریقہ ختم کر دیا گیا اور پھر تمام جنازے مسجد ہی میں پڑھے جانے لگے البتہ خاص لوگوں کے جنازے ریاض الجنہ میں قبرِ انور اور منبر کے درمیان پڑھائے جاتے' ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے جنازے ریاض الجنہ کے سامنے پڑھائے جاتے' جنازہ آپ کے چہرۂ انور کے سامنے رکھ دیا جاتا' یہ سلسلہ ۸۴۲ھ تک جاری رہا' اس وقت سلطان ظاہر جقمق حکمران تھے پھر شیخ حرم نے شیعہ حضرات کے جنازے مسجد میں پڑھنے سے روک دیا۔ چنانچہ شیعہ کہلانے والے لوگوں کو اپنے جنازے مسجد میں لانے سے روک دیا گیا ہاں اشراف علوی لوگوں کے پڑھائے جاتے۔ چنانچہ یہی طریقہ آج تک جاری ہے کہ مسجد میں صرف اشراف شیعہ اور اہل سنت کے جنازے داخل ہوتے ہیں۔ کچھ اہلِ مدینہ نے غیر اشراف شیعہ کے جنازے مسجد میں لانے کا ارادہ کیا تو اس سلسلے میں امیرِ ترک نے مداخلت کر کے روک دیا تھا۔

ہمارے مالکی شیخ شہاب الدین احمد بن یونس قسطینی رحمہ اللہ تعالیٰ ریاض الجنہ اور مسجد کے اگلے حصے میں نماز جنازہ پڑھنا ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس طرح میت کے دونوں پاؤں حضور ﷺ کے سرِ انور کی طرف ہو جاتے تھے' پھر آپ نے وصیت کر رکھی تھی کہ خود ان کا جنازہ مسجد سے باہر قبرستان میں پڑھایا جائے نیز وصال سے قبل آپ اکثر یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آپ نے مجھے شام وغیرہ کے شافعی و غیر شافعی علماء کے خط بھی دکھائے تھے جن میں آپ ہی کی موافقت کی گئی تھی اور پھر ایک شافعی عالم نے کہا تھا: مناسب یہ ہے کہ مسجد نبوی میں نماز جنازہ حجرہ شریف کے پیچھے پڑھایا جائے یا پھر مشرق کی طرف' انہوں نے مجھ سے بھی کچھ لکھنے کو کہا تو میں نے جو کچھ لکھا' اس کا حاصل یہ تھا کہ: اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر نبی کریم ﷺ کی تعظیم لازم قرار دے رکھی ہے' ان کی عزت لازم ہے اور پورا ادب کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب میت کو ریاض الجنہ یا مسجد کے اگلی طرف رکھا جائے گا جیسے آج کل رکھا جاتا ہے تو اگرچہ اس کے دونوں پاؤں حقیقۃً سرِ انور کے مقابل نہیں ہوتے کیونکہ سرِ انور تو ستون توبہ اور مخلقہ کے مقابل ہے یعنی ان ستونوں کے مقابل ہے جو جنازہ پڑھانے والے کی پچھلی طرف ہیں' تاہم اس کے دونوں پاؤں ضرور اسی جہت میں ہوں گے اور دور ہونے کے باوجود جہت تو یہی رہے گی اور ہم کسی شخص کو ریاض الجنہ کے اسی مقام پر لیٹا ہوا دیکھیں جس نے اسی پاک جہت کی طرف پاؤں کر رکھے ہوں تو ہم اسے پسند نہیں کریں گے اور جسے ہم زندہ لوگوں کے لئے مناسب نہیں سمجھتے' اسے میت کے بارے میں کیسے پسند کریں گے؟

میں نے چاروں مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے' میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ کسی عالم نے پاؤں کی جہت کے رے میں سنت طریقے کا ذکر کیا ہو بلکہ شافعی حضرات نے کئی جنازے آنے پر اکٹھی نماز جنازہ کے بارے میں دو صورتیں لکھی ہیں جن میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ قبلہ کی طرف سب کو ایک صف میں امام کے سامنے رکھ دیا جائے' (پاؤں سب

کے ایک طرف ہوں) ابو زرعہ نے مزید کہا ہے' بہتر یہ ہے کہ اپنی دائیں طرف رکھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سب کو ایک لائن میں یوں رکھے کہ ایک میت کا سر دوسرے کے قدموں میں ہو اور پھر امام سب کو اپنی دائیں طرف رکھتے ہوئے آخری کے بالمقابل کھڑا ہو۔ یہ اس صورت میں ہے کہ ایک ہی طرح کے ہوں اور اگر مختلف ہو جائیں تو پہلی صورت پر عمل کرنا ہوگا۔

اس سے دوسری صورت میں میت کے دونوں پاؤں امام کی دائیں طرف ہونے کا مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے ورنہ اس کی دائیں طرف سب کی صف ایک نہیں بنتی' رہی پہلی صورت تو اس میں ابو زرعہ سے یہی کچھ ثابت ہے اور پھر جب کئی جنازوں کے بارے میں پاؤں داہنی طرف رکھنا مستحب ہوا تو ایک کا حکم بھی ویسا ہی ہوگا لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ میت کے پاؤں داہنی طرف ہوں لیکن لوگ بائیں طرف ہی کیا کرتے ہیں۔

اس میں راز کی بات مجھے یہ دکھائی دی ہے کہ لوگ نمازِ جنازہ مسجد سے باہر معروف جگہ پر پڑھتے تھے جو مشرق میں تھی اور قبرِ انور وہاں کھڑے ہونے والے کی دائیں طرف ہوتی تھی چنانچہ انہوں نے ادب اسی میں دیکھا کہ میت کے پاؤں امام کی بائیں طرف کئے جائیں تاکہ اس مبارک جہت سے ہٹ جائیں اور پھر انہوں نے یہ عادت ہی بنا لی اور یہی سلسلہ رائج ہو گیا اور جب اسے چھوڑ دیا گیا اور لوگوں نے مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا شروع کر دی تو پھر وہی پہلی عادت اپنا لی کہ میت کے پاؤں امام کی بائیں طرف کئے' یہ ان کی غفلت تھی اور جب بائیں طرف پاؤں کرنا سنت ثابت نہیں ہوتا تو اس مقام ادب کے پیش نظر دائیں طرف کرنا زیادہ بہتر ہے۔

میں نے ایک فاضل شافعی عالم شیخ فتح الدین بن تقی الدین کازرونی رحمہ اللہ تعالیٰ سے مذاکرہ کیا تو انہوں نے کہا: جب میں فوت ہو جاؤں تو میرے دونوں پاؤں امام کی دائیں طرف کئے جائیں چنانچہ ان سے یہی معاملہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ جگہ جو مسجد سے آپ کے پاؤں مبارک کی طرف ہے' وہ حضور ﷺ کے دور میں جنازہ کی جگہ تھی اور اس پر دلیل بنونجار کا وہ واقعہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے کھجور کے دونوں درخت کاٹنے کا ارادہ کیا تھا جب آپ مسجد کی تعمیر کر رہے تھے تو اگر آج وہاں اس شخص کا جنازہ پڑھا جائے جسے مسجد میں لایا گیا تو بہتر ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ بات حاصل ہو جاتی ہے کہ میت کے پاؤں امام کی بائیں طرف اور اس کا سر حضور ﷺ کے مبارک پاؤں کی طرف ہو جائے گا اور یہ افضل ہوگا۔ کیونکہ یہ عادت جاری ہے کہ میت کو باب جبریل سے باہر نکالا جاتا ہے اور یہ سلف صالحین کے طریقے کے موافق ہوگا کہ وہ بھی وہاں اپنے مردوں کے جنازے ایسے پڑھا کرتے تھے لیکن عادت والے لوگ مجھ سے اتفاق نہیں کرینگے۔

میں نے اسی سوال کے جواب میں اپنی کتاب ''دفع التعرض والانکار لبسط روضۃ المختار'' کے اندر بڑی تفصیل لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر۱۸

خلیفہ مہدی کا اضافہ

ابن زبالہ اور یحییٰ نے لکھا ہے کہ مسجد نبوی عرصہ تک اسی حالت میں رہی جیسے ولید نے اضافہ کیا تھا پھر ابو جعفر منصور نے اضافے کا ارادہ کیا لیکن فوت ہو گیا اور کوئی اضافہ نہ کر سکا اور خلیفہ مہدی نے اضافہ کیا تھا لیکن یحییٰ نے قبلہ کی دیوار میں لکھے ہوئے کو بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے الفاظ یہ ہیں: ''پھر اس تحریر کی ایک جانب (جو مہدی کے دور میں لکھی گئی) وہ تحریر ہے جو ابو العباس سفاح کے دور میں لکھی گئی کہ ''یہ تحریر مجھ تک پہنچی جس میں یہ لکھا ہوا ہے: ''اللہ کے بندے عبد اللہ امیر المؤمنین نے ۱۳۲ھ میں حکم دیا ہے کہ مسجد رسول اللہ ﷺ کو خوبصورت بنایا جائے اور اسے وسیع کیا جائے اس میں رضاء الٰہی کی خواہش ہے اور اللہ سے ثواب کی اُمید کیونکہ دنیا و آخرت کا ثواب اللہ ہی سے ملے گا اور اللہ بہت سننے دیکھنے والا ہے۔'' انتہیٰ۔

اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ابو العباس سفاح (پہلے خلیفہ بنو عباس) نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں مسجد وسیع کی تھی اس کی حکومت ۱۳۲ھ اور وفات ۱۳۶ھ کو ہوئی۔

ابن زبالہ کے الفاظ یہ ہیں: کہتے ہیں کہ ولید بن عبد الملک کے اضافے کے بعد عرصہ تک مسجد اسی صورت میں رہی پھر اسی دوران ابو جعفر عبد اللہ (منصور بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس) حاکم بن گئے چنانچہ اس نے اضافے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں مشورہ کیا ادھر حسن بن زید نے انہیں جنازگاہ کے بارے میں کچھ لکھ بھیجا اور کہا کہ اگر مشرقی جانب سے مسجد میں اضافہ کیا گیا تو حضور ﷺ کی قبر انور مسجد کے درمیان میں آ جائے گی۔ اس پر ابو جعفر نے لکھا کہ جو کچھ تم نے کہا اسے میں جان گیا ہوں لہٰذا حضرت عثمان بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے بارے میں بات نہ کرو۔ اسی دوران ابو جعفر فوت ہو گیا اور کوئی اضافہ نہ کر سکا۔

اس کے بعد مہدی (ابن ابو جعفر) نے ۱۶۰ھ میں حج کیا پھر واپسی پر مدینہ منورہ آیا اور ۱۶۱ھ میں یہاں کا گورنر جعفر بن سلیمان مقرر بنا اور ساتھ ہی مسجد میں اضافے کا حکم دیا نگرانی کے لئے عبد اللہ بن عاصم بن عمر بن عبد العزیز اور عبد الملک بن شبیب غسانی کو مقرر کیا ابن عاصم تو فوت ہو گیا چنانچہ اس کی جگہ عبد اللہ بن موسےٰ حمصی کو مقرر کر دیا اور مسجد میں شام کی طرف (شمال میں) ایک سو ہاتھ کا اضافہ کیا لیکن قبلہ مشرق اور مغرب میں کوئی اضافہ نہ کیا یہ اضافہ صحنِ مسجد سے عورتوں کے ڈیوڑھیوں تک دس ستون تھے اور پانچ ڈیوڑھیاں شام کی طرف بنائیں۔

یحییٰ نے ان کے قول: ''جعفر بن سلیمان بن علی بن عبد اللہ بن عباس'' کے بعد لکھا کہ اسے مسجد میں اضافے کا حکم دیا جبکہ نگرانی کے لئے عبد اللہ بن عاصم بن عمر بن عبد العزیز بن مروان اور عبد الملک بن شبیب غسانی شامی کا تقرر کیا چنانچہ مسجد میں اضافہ شام کی طرف وہاں تک کیا جہاں آج اس کی انتہاء ہے اس نے سو ہاتھ کا اضافہ کیا مشرق

مغرب اور قبلہ کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں حضرات نے یہ جو کہا ہے کہ خلیفہ نے مسجد کے آخر میں سو ہاتھ کا اضافہ کیا تو گزشتہ ولید کے اضافہ والی یہ روایت: ''اس نے اس کا طول دو سو ہاتھ رکھا'' اس کے خلاف ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ مہدی کے اضافہ کے بعد مسجد کا طول تین سو ہاتھ ہو جائے جبکہ ابن زبالہ کی وضاحت کے مطابق مسجد کا آج کل طول دو سو چالیس ہاتھ ہے اور جب میں نے خود پیائش کی تو تیرہ ہاتھ اس سے بھی زیادہ تھا جیسے آئندہ آئے گا اور بایں ہمہ یہ روایت اس فوری سمجھ آنے والے احتمال کی تائید کرتی ہے جو ولید کے اضافہ والی پہلی روایت میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان کے دور میں شام کی طرف مسجد کی انتہاء میں یہ اضافہ مربعۃ القبر والے ستون سے چودہ ستون تھے اور یہاں سے مسجد کے آخر تک چوبیس ستون تھے اور جب ہم اس میں سے ولید کے چودہ ستون نکال دیں تو دس باقی رہ جاتے ہیں اور انہوں نے تو اس کی پیائش سو ہاتھ رکھی تھی اور ان کی گزشتہ روایت میں اس قول ''اور یہ مسجد کے صحن میں عورتوں کی ڈیوڑھیوں تک (ان کے آخر تک) دس ستون ہیں'' کا مطلب بھی یہی ہے اور عورتوں کی ڈیوڑھیوں سے مراد شام کی طرف والا چھتا ہوا حصہ ہے پھر ان کے اس قول ''پانچ ستون ڈیوڑھیوں میں ہیں'' کا مطلب بھی یہی ہے اور یہ پانچ ستون انہی دس میں سے ہیں حالانکہ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مہدی نے چھتا ہوا حصہ پانچ ستون بنائے تھے اور یہ اسی دور کی بات ہے لیکن آج وہ صرف چار ہیں جبکہ پہلے ہم اس بات کو اولیت دے چکے ہیں کہ ولید کا مذکورہ اضافہ صرف چار ستون کا تھا اور پھر اس بات کو بھی اولیت دے چکے ہیں کہ ولید کی مذکورہ زیادتی رحبہ میں چودہ ستون تھے اور انہی میں وہ چار ستون بھی شامل تھے جو پہلے ہی ڈیوڑھیوں میں تھے اور یہ کہ انہوں نے اپنے دور میں چودہ مذکورہ ستونوں کے بعد شام کی طرف ڈیوڑھیاں بنائی تھیں اور اس ترجیح کا مقصد اس پیائش کی موافقت کرنا ہے جو ان کے زمانے میں ہاتھوں سے کی گئی تھی اور پھر اس لئے بھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے مسجد کی پیائش ایک سو ساٹھ ہاتھ کر دی تھی چنانچہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شام کی طرف مسجد کی انتہاء مربعۂ مذکورہ سے ان چودہ ستونوں سے قریب ہی ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے کے مطابق چالیس ہاتھ کا اضافہ تھا اور مہدی کا اضافہ صرف پچپن ہاتھ تھا' یوں مہدی کا اضافہ مسجد کے اخیر میں چھ ستون بنتے ہیں لیکن عنقریب مسجد کے دروازوں کی بحث میں آ رہا ہے کہ حضرت خالد بن ولید کے گھر کے سامنے والے دروازے پر لکھا ہوا تھا: ''زیادۃ المھدی'' اور یونہی اس کے بعد شام کی طرف والے دروازے کی صورت حال تھی اور پھر یہی حال ان دو دروازوں کا ہے جو مغرب میں ان دونوں کے بالکل سامنے آتے ہیں' وہ دروازے نہیں جو ان کے قریب ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ترجیح اس روایت کو حاصل ہے جس میں اس کے سو ہاتھ کے اضافے کا ذکر ہے۔

پھر میں نے مشرقی چھت والے حصے میں ایک ستون دیکھا ہے جو مسجد کے شام والے حصے میں نواں بنتا ہے' یہ نیچے سے چوکور ہے اور زمین سے تقریباً دو اڑھائی ہاتھ اونچا ہے اور یہ اس دروازے کے برابر ہے جو ان کے بیان کے

مطابق حضرت خالد بن ولید کے گھر کے سامنے تھا اور اگر یہ روایت سچی ہے تو پھر یہ مہدی کے اضافے کی ابتداء بنے گی۔ واللہ اعلم۔

ابن زبالہ و یحییٰ اپنی دو گذشتہ روایتوں میں بھی کہتے ہیں: اس کی تعمیر سے پہلے مہدی نے اس کا حکم دیا تھا چنانچہ انہوں نے اس کا اندازہ لگایا تو یہ خرید لیا گیا اور جو گھر مسجد میں داخل کر دیئے گئے تھے' ان میں حضرت ملیکہ کا گھر بھی تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق یہ گھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے قبضہ میں تھا لیکن اسے دار ملیکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عبدالرحمٰن نے ملیکہ بن خارجہ بن سنان کو یہاں ٹھہرایا ہوا تھا اور یہی وہ وجہ ہے جس کی بناء پر یہ ملیکہ کا گھر مشہور ہو گیا پھر عبدالرحمٰن بن عوف نے اسے حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابو طالب کے ہاتھ فروخت کر دیا اور پھر عبداللہ نے اسے مسجد کی تعمیر کے وقت فروخت کر دیا تھا چنانچہ اس کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کر دیا گیا' دوسرا حصہ چراگاہ میں اور کچھ راستے میں آ گیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت شرجیل بن حسنہ کا گھر بھی شامل کیا گیا جو عطیہ تھا کیونکہ انہوں نے کچھ گھر اور مکانات خرید کر صدقہ کر دیئے تھے جن میں سے کچھ بچ رہے تھے جو ان سے یحییٰ بن خالد بن برمک نے خرید لئے تھے اور وہ حضرت طلحہ کے باغ میں شامل کر دیئے گئے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن شبہ نے دار ملیکہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ: ''اسے حضرت عبداللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خرید لیا تھا جو شاملات میں شامل ہو گیا جسے مہدی نے مسجد میں شامل کر دیا۔ اس گھر کا ذکر انہوں مدینہ میں رزواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے حجروں کے علاوہ گھروں کی علامت میں کیا ہے چنانچہ ابو غسان نے کہا: حضرت اُم حبیبہ بنت ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آل شرجیل والا گھر لے رکھا تھا اور انہوں نے اسے شرجیل بن حسنہ کو بطور عطیہ دے دیا تھا' وہ ان کے بیٹوں کے پاس رہا اور پھر انہوں نے اس کا اگلا حصہ مہدی کو فروخت کر دیا جسے ۱۶۱ھ میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے اخیر میں شامل کیا۔ اس کے بعد ابن زبالہ لکھتے ہیں: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس گھر کا باقی حصہ بھی شامل کیا گیا جسے دار القراء کہتے ہیں' یونہی مسور بن مخرمہ بن نوفل بن اہیب بن عبد مناف بن زہرہ کا گھر بھی شامل کیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ ابن شبہ نے اس گھر کا ذکر بنو زہرہ کے گھروں میں کیا ہے اور کہا ہے کہ: مخرمہ بن اہیب بن نوفل نے گھر لیا جو مسجد کے ایک کنارے میں شرقی یمانی منار کے پاس تھا جس کا کچھ حصہ مہدی نے خرید لیا پھر دور والے مسجد کے صحن اور راستے میں شامل کر لیا' اس کا کچھ حصہ بچا گیا جو آل مطرف میں سے ایک شخص نے لیا پھر بنو برمک کے قبضے میں آیا اور پھر آج کل کھلا پڑا ہے۔ انتہی۔ اس منارہ کو شرقی یمانی (شمالی) کہنا غلطی ہے' اسے شامی کہنا چاہئے۔

اس کے بعد ابن زبالہ و یحییٰ لکھتے ہیں کہ مہدی اس تعمیر سے ۱۶۵ھ کو فارغ ہوا۔ اس نے آل عمر کے خوخہ

(چھوٹا دروازہ) کو بند کرنے کا ارادہ کیا تھا اور مقصورہ کا حکم دیا تھا چنانچہ اسے گرا کر مسجد کے برابر کر دیا گیا جبکہ وہ مسجد کے اگلے حصے سے دو ہاتھ بلند تھا' اس نے اسے توڑ کر مسجد کے برابر کر دیا۔آل عمر نے اپنے خوخہ کے بارے میں اس سے بات کی تو بات بگڑ گئی' آخر اس نے اجازت دی تو انہوں نے کھول کر اسے زمین کے برابر کر دیا اور یوں وہ مسجد میں آ گیا یعنی مقصورہ شریف کے باہر کی طرف تھا جس کے گرد لوہے کی جالی لگی ہوئی ہے۔اس نے اس خوخہ کے لئے تین درجے بنا دیئے چنانچہ آج کل وہ اسی طرح ہے۔

مہدی کے دور میں مسجد کے دروازوں پر لکھائی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس نے ولید کی طرح اسے پتھر کے خوبصورت ٹکڑوں سے بنایا تھا اور یہ بات بچے کھچے پتھر کے ان ٹکڑوں سے بھی معلوم ہوتی ہے جو شمال مغربی منارہ کے قریب مسجد کے آخر میں تھے اور مغربی دیوار کے قریب تھے۔

اس کے بعد' جہاں تک میں نے مدینہ کے بارے میں لکھنے والوں کو دیکھا ہے تو کسی نے بھی نہیں لکھا کہ مہدی کے بعد کسی نے مسجد نبوی میں اضافہ کیا ہو لیکن مراغی کے اس سلسلے میں الفاظ یہ ہیں: کہتے ہیں کہ مامون نے اس میں اضافہ کیا تھا اور ۲۰۲ھ میں اس کی بنیاد مضبوط کی تھی۔سہیلی کہتے ہیں کہ یہ اسی حال پر ہے لیکن رزین اس کا انکار کرتے ہیں مگر ان دونوں روایتوں کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ اس نے تجدید کی تھی' اضافہ نہیں کیا تھا۔انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ رزین کے کلام میں ایسی کوئی بات مجھے تو دکھائی نہیں دی کہ اس حکایت کی طرف توجہ دی ہو اور اس کا انکار کر دیا ہو کیونکہ جن مؤرخین نے مامون کا زمانہ پایا ہے' انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی' ہاں ابن قتیبہ کی المعارف میں مہدی کے اضافے کے ذکر میں یہ الفاظ ملتے ہیں: ''مامون نے مسجد میں کافی ساری توسیع کی تھی'' اور پھر مامون کے اس اضافے میں میں نے پڑھا ہے کہ: ''عبد اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد کی تعمیر کے لئے ۲۰۲ھ میں حکم دیا تھا'' پھر اس نے مامون کے عدل و انصاف اور پرہیزگاری کے حکم کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے مسجد میں اضافہ کیا ہو کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ اس نے اضافہ کئے بغیر تعمیر کرائی ہو۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر۱۹

ابتداء میں حجرہ مبارکہ کی کیفیت کیا تھی؟

پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے جب تعمیر فرمائی تو اپنی دو بیویوں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر بھی اسی طرح کچی اینٹوں اور کھجور کی ٹہنیوں سے بنائے تھے۔ابن نجار کہتے ہیں کہ ''سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کا ایک دروازہ تھا جو عرعر یا ساج کی لکڑی سے بنا تھا'' پھر نویں فصل میں بھی بتایا جا چکا ہے' جن حضرات نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے گھر مسجد میں شامل ہوتے دیکھے' انہوں نے بتایا کہ وہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ہوئے تھے جن پر بالوں سے بنے کمبل پڑے تھے اور عمران بن ابی انیس نے کہا تھا: ان گھروں میں

سے چار تو کچی اینٹوں سے بنے تھے جن کے آگے کھجور کی ٹہنیوں کا پردہ تھا۔

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے گرد سب سے پہلے کس نے دیوار بنائی؟

میں بتاتا ہوں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر ان چاروں میں سے ایک تھا لیکن ابن سعد کی روایت آگے آ رہی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں اس کے گرد دیوار نہ تھی اور سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنائی تھی۔ اسے یوں سمجھو کہ کھجور کے بنے گھر کی حضرت عمر کی طرف نسبت کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اسے دیوار کی شکل دیدی تھی۔ اس میں ساری روایتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ پھر عبد اللہ بن یزید ھذلی کا بھی یہ قول گذر چکا ہے کہ: ''جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنھن کے گھر گرائے تو دیکھا کہ وہ کچی اینٹوں سے بنے تھے اور ان کے حجرے کھجور کی لمبی ٹہنیوں سے بنے تھے' صرف سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کا حجرہ نہ تھا۔'' پھر حضرت حسن بن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بھی ہے: میں ابھی چھوٹا ہی تھا' رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں چلا جایا کرتا تھا' میں چھت کو ہاتھ سے چھو لیتا تھا' ہر گھر کا ایک حجرہ تھا اور یہ حجرے عرعر کی لکڑی پر بالوں سے بنے کمبل سے ڈھانپے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ بخاری شریف میں نبی کریم ﷺ کے جس پردہ کو کھولنے کا ذکر ہے' اس سے مراد یہی پردہ تھا۔

داؤد بن قیس کہتے ہیں، ''میرے خیال میں حجرے سے گھر کے دروازے کی چوڑائی چھ سات ہاتھ تھی جبکہ بلندی آٹھ اور نو ہاتھ کے قریب تھی۔ میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے قریب کھڑا ہوا تو دیکھا کہ اس کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔'' اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ دروازہ مغرب کی طرف تھا۔ آگے اس روایت کی تائید آ رہی ہے اور یونہی جو بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے اپنی مرض کے دوران دروازے کا پردہ ہٹایا تھا اور وہ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کی امامت کر رہے تھے' پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آپ کے بالوں میں کنگھی کا ذکر ہے جب آپ تو اپنی اعتکاف کی جگہ پر تھے اور وہ گھر میں بیٹھی تھیں جیسے گذشتہ حدیث میں آ چکا ہے کہ: حضور ﷺ اعتکاف فرماتے تو سرِ انور میرے آگے کر دیتے اور میں کنگھی کر دیا کرتی اور پھر نسائی کی روایت میں ہے: آپ میرے پاس بحالتِ اعتکاف تشریف لاتے اور میرے حجرے کی چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہو جاتے' میں سرِ انور دھو دیتی' میں تو اپنے حجرے ہی میں ہوتی لیکن آپ کا مکمل جسم مسجد میں ہوتا لیکن اس سے پہلے یہ بھی آ چکا ہے کہ آپ کا دروازہ شام کی طرف تھا لیکن یہ روایت ضعیف ہے یا اس میں تاویل ہوئی ہے۔ ضعیف ہونے کی وجہ تو یہ ہے جیسے گذرا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر شام کی طرف سے آپ کے گھر سے متصل تھا اور مربعہ کا ستون حضرت علی کا دروازہ تھا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اس ستون کا کچھ شامی حصہ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے متصل ہو لیکن دوسرا متصل نہ ہو چنانچہ یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی دلیل وہ گذشتہ روایت ہے جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کے گھر کے بیان میں گذری کہ وہ کھلی جگہ جو تعمیر عمر بن عبد العزیز میں موجود تھی' وہ حضورﷺ کے نکلنے کی جگہ تھی۔

رہی اس میں تاویل تو یہ دو میں سے ایک طریقے پر ہے جیسے زین مراغی نے اس کی طرف یوں اشارہ دیا: ایک تو یوں' اس کا مطلب یہ نکالا جائے گا کہ وہ دروازہ ہے' جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت عمر کے دفن کے بعد ایک دیوار بنا دی تھی جو اس کے اور دیگر پاکیزہ قبروں کے درمیان تھی نہ وہ دروازہ جو حضورﷺ کے زمانہ میں تھا اور یہ مشکل ہے کیونکہ آئندہ مضمون سے یہ بات نکلتی ہے کہ آپ کی بنائی دیوار مشرق میں تھی اور ان دونوں میں دوسری' تو یہ اس لئے کہ اس کے دو دروازے تھے کیونکہ اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں اور یہی مقصد ہے ابن عساکر کا جو محمد بن بلال نے بتایا کہ انہوں نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے دیکھے' کھجور سے بنے تھے اور ان پر اونی کمبل ڈالے گئے تھے چنانچہ میں نے ان سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: کہ اس کا دروازہ شام کی طرف تھا۔ میں نے پوچھا: اس کا ایک دروازہ تھا یا دو؟ انہوں نے کہا' ایک ہی تھا۔ میں نے پوچھا کس چیز کا بنا تھا؟ انہوں نے کہا کہ عرعر یا ساج کی لکڑی سے بنا تھا۔ ابن عساکر نے جو یہ کہا ہے کہ "گھر کا دروازہ شام کی طرف تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پوری زندگی میں اسے کسی شے سے بند نہیں کیا گیا۔" تو انہوں نے اسی سے دلیل لی ہے۔

پھر مجھے طبقات ابن سعد دیکھنے کا موقع ملا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ حجرہ شریف کے دو دروازے تھے کیونکہ انہوں نے وضاحت کے ساتھ کئی طریقوں سے لکھا کہ انہوں نے حضورﷺ کی نماز جنازہ ان کے حجرے ہی میں پڑھی اور پھر اسی کے دوران کہا: جب حضورﷺ کا وصال مبارک ہو گیا تو صحابہ نے کہا' آپ کی نماز جنازہ کیسے پڑھیں؟ تو انہوں نے کہا: اس دروازے سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں داخل کرتے جاؤ وہ آپ کے لئے دعا کر لیں تو انہیں دوسرے دروازے سے نکالتے جاؤ۔ واللہ اعلم حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا گھر قبلہ کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متصل تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق سیدہ حفصہ کے گھر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر (جس میں قبر انور موجود ہے) کے درمیان ایک راستہ تھا' گھر اتنے قریب تھے کہ وہ آپس میں بات چیت کر لیا کرتی تھیں' سیدہ حفصہ کا گھر خوخہ کی دائیں جانب تھا۔

میں کہتا ہوں کہ زائرین' مقصورہ کے اندر اور باہر آج کل یہیں کھڑے ہوتے ہیں جیسے مطری نے لکھا پھر مسجد نبوی کی حدود کے دوران آ چکا ہے کہ مسجد سے متصل حجرے کی دیوار ان قندیلوں کی حد میں تھی جو قبر انور سے متصل ستونوں اور ان کے مقابل ستونوں کے درمیان تھی اور یہ وہی ہے جو مغرب سے حجرے کو گھیرنے والی دیوار کی طرف ہے اور اسی طرف سے مسجد کے اضافے کے دوران حجرہ کا کچھ حصہ شامل کیا گیا تھا اور ظاہر یہ ہے کہ حجرہ کا جو حصہ مسجد میں شامل کیا گیا وہ یوں تھا جیسے دروازے کی دہلیز ہوتی ہے اور جو حصہ تعمیر ہو گیا' وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر سمجھا

جاتا ہے جس میں حضورﷺ دفن ہوئے۔

قدیم مؤرخین سے میں یہی کچھ حاصل کر چکا ہوں جبکہ یہ بات متاخرین کے خلاف ہے' متاخرین نے کہا ہے کہ حجرہ کی وہ دیوار جو حجرے کو گھیرے ہوئے ہے' وہ پہلی ہی دیوار ہے' مسجد کی حد یہیں تک ہے اور جو دیوار حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنائی تھی تو وہ حجرہ سے متصل تھی جبکہ ہم پہلے ابن زبالہ و محاسبی کے قول سے اس کا رد کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۰

حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور اس کے گرد دیوار پر کیا گزری؟

ابن زبالہ کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: جب سے عمر دفن ہو گئے' میں پردہ کر کے آتی اور معمولی لباس پہنا کرتی اور جب تک میں نے اپنے اور قبروں کے درمیان دیوار نہیں بنا دی' میں اپنے لباس کا دھیان کرتی رہی۔

حضرت مطلب کہتے ہیں' لوگ قبرِ انور سے مٹی لیتے تھے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حکم دیا تو سامنے دیوار بنا دی گئی پھر دیوار میں چھوٹا سا سوراخ تھا' وہ بھی آپ کے حکم پر بند کر دیا گیا کیونکہ اس سے مٹی لینے لگے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر دو حصوں میں

حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا' ایک میں تو قبرِ انور تھی اور ایک میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ٹھہری ہوئی تھیں' درمیان میں دیوار تھی اور جب آپ قبرِ انور کی طرف جاتیں تو معمول کے مطابق چلی جاتیں لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دفن ہو گئے تو آپ کپڑے پورے طریقے سے سنبھال کر (پردہ کر کے) جاتیں۔

ابن سعد کے مطابق حضرت حماد بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن دینار اور عبید اللہ بن ابو زید سے سنا' دونوں کہتے تھے کہ حضورﷺ کے دور میں آپ کے گھر کے گرد دیوار نہ تھی' سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دیوار بنائی تھی۔ حضرت عبید اللہ کہتے ہیں کہ یہ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی پھر اسے عبد اللہ بن جبیر نے بنایا تھا۔

علامہ اقشہری کے مطابق ابو زید بن شبہ نے بتایا کہ ابو غسان بن یحییٰ (انہیں مدینہ کے بارے میں معلومات تھیں اور لکھے پڑھے تھے) نے بتایا کہ جب تک حضورﷺ' حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما دفن نہیں ہوئے' آپ کا

گھر کھلا سا تھا اور پھر حضرت عمر بن عبد العزیز وہ شخص ہیں جنہوں نے گھر کے گرد پردہ کیا جو آج نظر آتا ہے' یہ کام انہوں نے اس وقت کیا جب ولید بن عبد الملک کے دور میں انہوں نے مسجد بنائی تھی' اسے کونہ دار بنایا کہ چوکور ہونے میں یہ کعبہ کی شکل اختیار نہ کر جائے اور لوگ اس کی طرف سجدہ کرنے لگیں۔

ابو زید کہتے ہیں: ابو غسان نے کہا: میں نے بہت سارے اہلِ علم سے سنا جن کے خیال میں حضرت عمر نے گھر بنایا تو اس کی وہ بنیاد تبدیل کر دی جو پہلے تھی' میں نے ایسے شخص سے بھی سنا جس نے کہا تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے گھر کے گرد تین دیواریں بنائی تھیں' قبرِ انور کو تین دیواروں نے گھیر رکھا تھا' ایک تو حضور ﷺ کے گھر کی دیوار تھی' ایک وہ دیوار جس کے متعلق خیال ہے کہ اسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنایا اور ایک دکھائی دینے والی دیوار۔ انتہی۔

میں بتاتا ہوں کہ جب حجرہ شریف تعمیر کے دوران کھل گیا تھا تو ہمیں صرف ایک ہی دیوار دکھائی دی جو باہر والی دیوار کے اندر تھی۔

ابن سعد کے مطابق حضرت نوفل بن سعید نے بتایا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں قبرِ انور کی وہ دیوار گر گئی جو اس کے گرد تھی تو انہوں نے اسے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ نوفل کہتے ہیں' حضرت عمر بیٹھے تھے کہ اس دوران انہوں نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا: اے علی! اُٹھو اور نبی کریم ﷺ کے گھر کی صفائی کر دو' حضرت قاسم بن محمد نے کہا' اللہ آپ کا بھلا کرے' میں بھی جاؤں؟ انہوں نے کہا ہاں آپ بھی صفائی کر سکتے ہیں پھر سالم بن عبد اللہ اُٹھے اور انہوں نے بھی کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے' میں بھی کروں؟ حضرت عمر نے کہا: سب بیٹھ جاؤ' اے مزاحم! تم اُٹھو اور صفائی کرو چنانچہ حضرت مزاحم اُٹھے اور انہوں نے صفائی کی۔

حضرت مسلم کہتے ہیں: مجھے مدینہ میں پتہ چل گیا کہ جس گھر میں حضور ﷺ کی قبر انور ہے' وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر تھا نیز گھر کا اور حجرے کا دروازہ شام کی طرف (شمال) تھا' آپ کا گھر چھت سمیت اصل حالت پر تھا' گھر میں ایک گھڑا اور پتھر کے کچھ ٹکڑے تھے۔ انتہی۔

ابن زبالہ اور یحییٰ کے مطابق حضور ﷺ کے گھر کی مشرقی جانب نامناسب خوشبو آئی تو حضرت عمر بن عبد العزیز آئے اور ان کے ساتھ عبد اللہ بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے' انہوں نے ابن وردان سے کہا کہ بنیاد کھود دیں۔ جب وہ کھود رہے تھے تو انہوں نے ہاتھ بلند کیا اور ڈر کے مارے الگ ہو گئے' حضرت عمر بن عبد العزیز گھبرا کر اُٹھے' حضرت عبد اللہ بن عبید اللہ کہنے لگے اے امیر المومنین! خطرے کی بات نہیں' یہ تمہارے دادا حضرت عمر بن خطاب کے قدم ہیں' گھر میں جگہ تنگ پڑ گئی تھی تو ان کے لئے بنیاد میں جگہ بنائی گئی تھی۔ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا: اے ابن وردان! جو کچھ تم نے دیکھ لیا ہے' اسے ڈھانپ دو چنانچہ انہوں نے یونہی کیا۔

حضرت مطلب کہتے ہیں کہ حجرہ انور کی دیوار گر گئی تو قبریں ظاہر ہو گئیں' حضرت عمر نے قباطی چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام ابو حفصہ کو حکم دیا' کچھ اور لوگ بھی ہمراہ تھے چنانچہ

انہوں نے دیوار بنا دی اور اس میں ایک روشندان رہنے دیا' وہ جب فارغ ہو گئے' دیوار بلند کر دی تو حضرت عمر کے غلام مزاحم داخل ہوئے' انہوں نے قبرِ انور سے مٹی وغیرہ صاف کر دی اور قباطی چادر کو نکالا' حضرت عمر بن عبد العزیز کہہ رہے تھے' جو کچھ مزاحم نے قبروں کی صفائی سے حاصل کیا ہے وہ مجھے دنیا کے مقابلے میں بہت بہتر دکھائی دے رہا ہے۔

یحییٰ کے مطابق حضرت عبد اللہ بن محمد بن عقیل کہتے ہیں: میں روزانہ رات کے آخری حصے میں گھر سے نکل کر مسجد کو آیا کرتا' نبی کریم ﷺ کو پہلے سلام پیش کرتا تھا اور پھر اپنی جائے نماز پر آ بیٹھتا اور صبح کی نماز پڑھتا۔ایک رات میں بارش والی رات میں نکلا اور جب حضرت مغیرہ بن شعبہ کے گھر کے قریب پہنچا تو ایسی خوشبو آئی جو پہلے محسوس نہیں کی تھی' میں مسجد میں آیا اور حسب معمول پہلے حضور ﷺ کے پاس حاضری دی' دیکھا تو دیوار گری ہوئی تھی' میں اندر داخل ہوا' نبی کریم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور نہایت آرام سے وہاں رُکا۔ پھر انہوں نے قبروں کی کیفیت بیان کی۔وہ کہتے ہیں کہ ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ میں نے قدموں کی آہٹ سنی' دیکھا تو حضرت عمر بن عبد العزیز تھے' انہیں پتہ چل گیا تھا تو وہ آئے تھے' انہوں نے حکم دیا تو چادر ڈال دی گئی۔صبح ہوئی تو مستری وردان کو بلا بھیجا' اسے اندر داخل ہونے کو کہا' وہ اندر گئے تو صورت حال دیکھی اور کہا: ایک آدمی کی ضرورت ہے جو مجھے سامان دیتا رہے۔اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے اندر داخل ہونے کے لئے پنڈلیوں سے کپڑا اُٹھایا' انہیں دیکھ کر حضرت قاسم بن محمد اور پھر سالم بن عبد اللہ نے بھی اندر جانے کی تیاری کر لی' اس پر حضرت عمر نے کہا' تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا: بخدا ہم بھی آپ کے ساتھ اندر جائیں گے۔اس پر حضرت عمر تھوڑی دیر رُکے اور پھر کہا: بخدا ہم بھیڑ کر کے ان حضرات کو تکلیف نہیں دیں گے لہٰذا اے مزاحم تم اندر جاؤ اور وردان کی مدد کرو۔

فارغ ہونے کے حضرت عمر بن عبد العزیز نے مزاحم سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور کی حالت کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ زمین کے برابر تھی۔پھر پوچھا دوسرے حضرات کی قبریں کیسے تھیں؟ تو انہوں نے کہا کہ اونچی تھیں۔حضرت عمر نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

عتبیہ میں ہے' حضرت مالک نے بتایا کہ حضور ﷺ کے گھر کی وہ دیوار گر گئی جس میں آپ کی قبر انور تھی' حضرت عمر بن عبد العزیز نکلے ان کے ہمراہ قریش کے کچھ لوگ تھے' حضرت عمر نے حکم دیا تو قبر انور کو ڈھانپ دیا گیا اور جب آپ نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی تو مزاحم سے کہا کہ اندر جاؤ اور جو کچھ ہوا اسے نکال دو۔وہ اندر گئے' کچی اینٹیں اور مٹی وغیرہ نکال دی اور پھر قبر انور کو پوری طرح درست کر دیا اور جو کچھ اوپر گر گیا تھا' اسے صاف کر دیا' پھر باہر نکلے' قبرِ انور کو ڈھانپا اور پھر دیوار بنائی۔انتہٰی۔

حضرت ہشام بن عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ جب ولید بن عبد الملک کے دور میں قبرِ انور کی دیوار گر گئی تو انہوں نے تعمیر کا ارادہ کیا' انہیں ایک قدم دکھائی دیا' وہ ڈر گئے اور خیال کیا کہ یہ قدم حضور ﷺ کا ہے' کوئی بتانے والا نظر نہیں آ رہا تھا' اتنے میں حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے' بخدا یہ حضور ﷺ کا قدم مبارک نہیں بلکہ حضرت عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

پچھلی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس تعمیر کا سبب خود وہ دیوار تھی جو گر گئی تھی اور یہ اس بارش کی وجہ سے گری تھی جس کا گذشتہ روایت میں ذکر ہے۔

علامہ آجری کی روایت اس کے خلاف ہے' حضرت ہشام کہتے ہیں' مجھے میرے والد نے بتایا کہ لوگ قبرِ انور تک پہنچ جایا کرتے تھے چنانچہ عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا تو دیواریں اونچی کر دی گئیں تا کہ کوئی پہنچ نہ پائے اور جب دیوار گری تو پنڈلی سمیت ایک پاؤں دکھائی دیا' حضرت عمر بن عبد العزیز ڈر گئے' اتنے میں حضرت عروہ آ گئے اور بتایا کہ یہ حضرت عمر کا پاؤں اور پنڈلی ہے۔یہ سن کر حضرت عمر خوش ہو گئے۔

حضرت رجاء بن حیوہ بتاتے ہیں کہ ولید بن عبد الملک نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو لکھا' وہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے حجرے خرید چکے تھے' انہیں حکم دیا کہ انہیں گرا دو اور مسجد میں شامل کر دو' یہ حکم ملنے پر آپ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے اور پھر گرا دینے کا حکم دیا۔میں نے لوگوں کو اتنا روتے کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس کے ارادے کے مطابق بنانا شروع کر دیا۔جب قبرِ انور پر گھر بنانے کے لئے دیواریں گرائیں تو تینوں قبریں نظر آنے لگیں' ان پر پڑی ریت وغیرہ اُتر چکی تھی جس سے حضرت عمر بن عبد العزیز ڈر گئے اور ارادہ کیا خود اُٹھ کر اسے برابر کر دوں۔میں نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے' اگر آپ اُٹھیں گے تو دوسرے لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔آپ کسی ایک شخص سے کہہ دیں' وہ درست کر دے گا' مجھے اُمید تھی کہ مجھے ہی کہہ دیں گے' انہوں نے کہا اے مزاحم! اُٹھو اور اسے درست کر دو۔(یہ ان کے غلام تھے)۔

حضرت رشید ابو المظفر گازرونی (شارح المصابیح) کہتے ہیں' میں نے کئی علماء سے مبارک قبروں کو چھپانے کے متعلق پوچھا یعنی اس دیوار کرنے کے بارے میں پوچھا جس میں دروازہ بھی نہیں تھا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا وصال ہونے کو تھا تو انہوں نے وصیت کی کہ ان کا جنازہ اُٹھا کر نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور کے سامنے لے جایا جائے اور پھر اُٹھا کر بقیع میں دفن کر دیا جائے اور جب حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی وصیت پوری کرنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے خیال کیا کہ آپ انہیں یہیں دفن کریں گے چنانچہ انہیں منع کیا اور ان سے جھگڑے جب عبد الملک یا کسی اور کا دور آیا تو انہوں نے قبریں بند کر کے ڈھانپ دیں۔

حضرت عثمان بن عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عروہ نے کہا: میں نے قبرِ انور کے بارے میں حضرت عمر بن عبد العزیز سے بحث کی کہ مسجد کی توسیع کے بارے میں کوئی جھگڑا کھڑا نہ کریں لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی اور کہنے لگے کہ امیر المؤمنین کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے۔میں نے کہا: اگر ضروری ہی ہے تو حجرے کے پیچھے جگہ بنا دو۔

ابن زبالہ کے مطابق حضور ﷺ کا گھر وہی تھا جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ٹھہری ہوئی تھیں۔اور اس میں سیاہ پتھر لگے تھے۔اس کی چار دیواریں تھیں' قبلہ والی دیوار لمبی تھی' شرقی اور غربی دیواریں برابر اور شامی جانب

(شمالی) والی دیوار کم لمبائی والی تھی' دروازہ شام کی طرف تھا جسے سیاہ پتھروں اور چونہ سے بند کر دیا گیا تھا پھر اس کے گرد حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ عمارت بنائی جو دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اس کا ایک کونہ بھی بنا دیا تاکہ لوگ اسے قبلہ نہ جان لیں اور مسجد رسول ﷺ میں سے اس جہت کی طرف نماز نہ پڑھ سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "اللہ یہودیوں کو تباہ فرمائے کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔" پھر یہ بھی فرمایا: "الٰہی! میری قبر کو بت کی حیثیت نہ دینا کہ پوجا کی جانے لگے الحدیث" کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے گرد والی دیوار اور نئی بنائی جانے والی مشرقی دیوار کے درمیان دو ہاتھ کا فاصلہ تھا' مغربی جانب ایک ہاتھ' قبلہ کی طرف ایک بالشت اور شام والی جانب (شمالی) کھلی جگہ ہے۔ اس کھلی جگہ میں کپڑے دھونے کا ٹوٹا ہوا برتن اور لکڑی کا پیمانہ موجود تھا۔ عبد العزیز بن محمد کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ بنانے والے ان چیزوں کو نکالنا بھول گئے تھے۔ انتہٰی۔

ابو غسان کہتے ہیں: میں نے اس کھلی جگہ کے بارے میں بات کرنے والے سے سنا' جو قبرِ انور کی جانب بنائی گئی ہے کہ وہاں کپڑے دھونے کا ایک برتن' ایک لکڑی اور سہارا لگانے کا لوہا ہے' محمد بن یحییٰ کہتے ہیں: عبد الرحمٰن بن ابو الزناد کہتے ہیں کہ یہ وہ برتن تھا جسے کاریگروں نے وہیں چھوڑ دیا۔ ابو غسان کہتے ہیں کہ میں نے خود اس تکون جگہ میں دیکھا کہ وہاں کوئی چیز نہ تھی' ایک شخص کا خیال تھا کہ اس نے یہ برتن دیکھا تھا اور اس کے ہاتھ بھی کوئی شے رکھی تھی لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کسی ایسے شخص کا علم ہے جس نے اس سامان کو اُٹھا لیا ہو' نہ ہی اس تکون میں میں نے کوئی دروازہ دیکھا اور نہ ہی دروازے کی جگہ دیکھی البتہ مجھے ابن ابی فدیک نے بتایا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے گھر کا وہ دروازہ دیکھا جو شام کی جانب تھا۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ جب تعمیر کے وقت ہم نے دیکھا تو کوئی دروازہ نہ تھا اور نہ ہی دروازے کی جگہ تھی اور نہ شام والی تکون کوئی کپڑے دھونے کا برتن تھا جس کا ذکر کیا گیا۔

عنقریب تیئیسویں فصل میں آ رہا ہے' ابن عاث نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے حجرہ مبارکہ کی گرنے والی دیوار تعمیر کرتے وقت' دیوار گرنے کی وجہ سے ایک ٹوٹا ہوا پیالہ دیکھا تھا' اسے بغداد پہنچا دیا گیا' اگر یہ بات صحیح ہے تو اُمید ہے کہ یہی برتن مراد ہے۔

پہلے ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ مبارک قبروں کی جگہ چھتی ہوئی تھی اور ان کی چھت مسجد کی چھت کے نیچے تھی جیسے وضاحت سے آ رہا ہے اور جب مسجد کی چھت کھلی تو انہوں نے اس تکون اور حجرہ مبارکہ کے درمیان نظر ڈالی تھی جبکہ حجرہ کے اندر نہیں دیکھا تھا' اس کی دلیل ابو الجزاء سے یہ آ رہی ہے کہ انہوں نے کہا: اہل مدینہ شدید قحط سے دو چار ہو گئے تو انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شکایت کی' انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور دیکھو اور اس جگہ میں سے آسمان کی طرف سوراخ کر دو' اس کے اور چھت کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہونا چاہئے' انہوں نے ایسے ہی کیا تو بارش ہو گئی لیکن جو بیسویں فصل میں ابن رشد سے ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں کہا:

ایک خوش شخص نے مجھے بتایا کہ ان کے دور میں مسجد کے نیچے چھت نہ تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ مسجد میں آتشزدگی کے بعد کی بات ہے کیونکہ آئندہ آنے والی مؤرخین کی کلام میں یہ بتایا گیا ہے کہ آتشزدگی کے بعد صرف مسجد کی چھت تھی، حجرہ کی نہ تھی پھر پتہ چلا کہ ابن رشد کا دور آتشزدگی سے بہت پہلے کا ہے کیونکہ ان کی وفات ۵۱۰ھ میں ہوئی تھی پھر جس عمارت کو ہم نے دیکھا اس میں آتشزدگی کے بعد چھت دیکھی تھی اور اس سے پہلے کی چھت کی آثار بھی تھے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۱

حجرہ مبارکہ میں مبارک قبروں کی ترتیب اور ایک قبر کی خالی جگہ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفن ہونگے قبر شریف کو گھیرنے والے فرشتوں کے بارے میں روایات، قبرِ انور کی تعظیم اور اس کے ذریعے بارش کی دُعاء

سنیئے: ابن عساکر نے مبارک قبروں کی کیفیت بتائی ہے اور اس میں اختلاف کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں سات روایتیں درج کی ہیں، اس سے پہلے ان کے شیخ ابن نجار نے ان کا ذکر کرتے ہوئے صرف چھ روایتیں ذکر کی ہیں۔

مبارک قبروں کی ترتیب میں حضرت نافع کی روایات

(۱) قبروں کی پہلی ترتیب

پہلی روایت نافع بن ابو نعیم رحمہ اللہ تعالیٰ یہ ہے کہ قبر رسول اللہ ﷺ، قبر ابوبکر صدیق اور قبر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور قبلہ کی طرف ہے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر رسول اللہ ﷺ کے دونوں کندھوں کے سامنے ہے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کندھوں کے سامنے ہے جس کی صورت یہ ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

میں کہتا ہوں کہ یہ وہ روایت ہے جس پر اکثر علماء کا اتفاق ہے' زین مراغی کہتے ہیں کہ حضرت رزین اور یحییٰ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور رزین کے کلام میں یونہی ہے' انہوں نے عبد اللہ بن محمد بن عقیل سے روایت کی اور اپنی پہلی روایت کے بعد حجرہ مبارکہ کی دیوار کے گرنے کا قصہ بیان کیا ہے' لکھا ہے: میں نے ان مبارک قبروں کو دیکھا' حضور ﷺ کی قبر شریف تو آگے تھی (قبلہ کی طرف) حضرت ابوبکر کی قبر ان کے پیچھے تھی اور حضرت عمر کی قبر حضرت ابوبکر کے پیچھے تھی' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضور ﷺ کے کندھوں کے پاس تھا اور حضرت عمر کا سر حضرت ابوبکر کے کندھوں کے پاس تھا۔ رہے یحییٰ تو ان کے کلام میں میں نے اس بارے یقین سے نہیں دیکھا بلکہ انہوں نے بھی دوسروں کی طرح روایات کا اختلاف بتایا ہے چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: ''مجھے ہارون بن موسیٰ نے بتایا کہ میں نے اپنے والد کو حضرت نافع بن ابونعیم وغیرہ مشائخ وغیرہ سے روایت کرتے سنا کہ نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور۔'' اور پھر پہلی ہی بات کہہ دی۔ پھر میں نے یحییٰ کی کتاب کے ایک نسخہ میں مبارک قبروں کا بنا ہوا یہی نقشہ دیکھا' انہوں نے کہا: مبارک قبروں کی یہ صورت ہے جیسے محدثین نے حضرت عروہ بن زبیر سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بتایا ہے اور پھر وہ کچھ لکھا جو چھٹی صفت میں آ رہا ہے۔

ابن سعد نے اپنی طبقات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے واقدی کے طریقہ پر حضرت ابوبکر بن عبد اللہ بن ابوسبرہ سے لکھا ہے جنہوں نے حضرت عمر بن عبد اللہ بن عروہ سے روایت کی کہ انہوں نے عروہ اور قاسم بن محمد سے سنا' دونوں کہتے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو وصیت کی کہ انہیں حضور ﷺ کے پہلو میں دفن کیا جائے چنانچہ ان کے لئے لحد کھودی گئی اور ان کا سر حضور ﷺ کے کندھوں کے پاس رکھا گیا اور پھر لحد کو قبرِ رسول ﷺ سے ملا دیا گیا چنانچہ ان کی قبر وہاں ہے پھر عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے روایت کی' انہوں نے کہا کہ حضرت ابوبکر کا سر حضور ﷺ کے کندھوں کے قریب ہے اور حضرت عمر کا سر حضرت ابوبکر کی کوکھ کے نزدیک ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر کے بارے گزشتہ روایت اور اس روایت میں قدرے فرق ہے۔

حضرت قاسم بن محمد کی روایت

(۲) قبروں کی دوسری ترتیب

ابو داؤد اور حاکم نے حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کی' کہتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر ہوا اور ان سے عرض کی: ماں جی! مجھے حضورﷺ اور آپ دو صحابیوں کی قبروں کے بارے میں وضاحت سے بتایئے چنانچہ انہوں نے تینوں قبروں کے بارے میں بتایا کہ نہ وہ زمین سے اُبھری تھیں اور نہ ہی زمین کے برابر' ان پر بطحاء کی سرخ مٹی ڈالی گئی تھی۔ حاکم نے اس روایت میں یہ زیادتی کی ہے کہ: میں نے رسول اللہﷺ کو آگے دیکھا' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضورﷺ کے کندھوں کے درمیان تھا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضورﷺ کے مبارک قدموں میں تھا' ابن عساکر یہ صورت بتاتے ہیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	

میں کہتا ہوں کہ حاکم نے اس سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عثمان بن نسطاس کی روایت

(۳) تیسری ترتیب

یہ ترتیب حضرت زبیر بن بکار نے ابن زبالہ سے نقل کی ہے' حضرت عثمان بن نسطاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے گھر کو گرا دیا تو میں نے حضورﷺ کی قبرِ انور دیکھی جو زمین نے چار انگلی اُٹھی ہوئی تھی اور اس پر سرخ رنگ کے کنکر پڑے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر حضورﷺ کے پیچھے تھی اور اس کے پیچھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر تھی' میں نے دیکھا کہ حضرت عمر کی قبر اس سے نیچی تھی' انہوں نے مجھے ویسے ہی صورت بنا کر دکھائی جیسے انہیں حضرت عثمان نے بنا کر دکھائی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ جس نسخہ کو میں نے دیکھا ہے' اس میں ابن زبالہ نے تصویر نہیں دی لیکن ابن عساکر نے یہ صورت بنائی ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

میں کہتا ہوں کہ ابن زبالہ ضعیف ہیں' اسحاق بن عیسیٰ' داؤد بن ابی ھند کی بیٹی کے بیٹے ہیں' سچے ہیں لیکن کبھی غلطی کرتے ہیں' عثمان بن نسطاس مدنی' عبید کے بھائی اور آل کثیر بن صلت کے غلام ہیں' ان کی پیروی کی جاتی ہے' مقبول ہیں ورنہ بات میں رنگ بدلتے ہیں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابوبکر آجری نے کتاب ''صفۃ قبر النبی ﷺ'' میں اسحاق بن عیسیٰ' سے' انہوں نے ابن نسطاس سے روایت کی ہے لیکن اس میں تصویر کا ذکر نہیں پھر ابن حجر نے آجری اور اسحاق کے درمیان واسطہ نہیں بتایا اور یہ روایت' ضعیف ہونے کے باوجود اس لائق ہے کہ اسے تاویل کر کے پہلی روایت کے ساتھ ملا دیا جائے کیونکہ انہیں قریب قریب ہونے کا مقام دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت منکدر بن محمد کی روایت

(۴) چوتھی ترتیب

ابن زبالہ کے مطابق حضرت منکدر اپنے والد محمد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور یوں ہے' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر ان کے پیچھے ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر ان کے پیچھے حضور ﷺ کے قدموں کے نزدیک ہے' ابن عساکر نے اس کی صورت یہ لکھی ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	

میں کہتا ہوں کہ اسے ضعف کے باوجود دوسری صورت سے ملایا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا قول: ''ابوبکر ان کے پیچھے ہیں۔'' اس لحاظ سے سچا ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کے کندھوں کے نزدیک ان کا سر ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذریعے حضرت عمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت

(۵) پانچویں ترتیب

حضرت عمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہمیں حضورﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قبروں کے متعلق بتایا، یہ قبریں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں ہیں، نبی کریمﷺ کا سرِ انور مغرب کی طرف ملا ہوا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضورﷺ کے مبارک قدموں کے قریب ہے اور حضرت عمر کی قبر حضورﷺ کے پیچھے ہے، ان کے علاوہ ایک قبر کی جگہ خالی ہے۔ یہ ہے ان کی قبروں کی صورت جیسے کہ ابن ابی اویس نے یحییٰ بن سعید اور عبد اللہ بن ابوبکر سے، انہوں نے عمرہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سن کر بتایا لیکن یحییٰ نے صورت نہیں بنائی۔

ابن زبالہ نے ایسی ہی روایت کی ہے، انہوں نے ابن عساکر سے لے کر بتائی اور پھر کہا کہ ان کی صورت یہ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

میں کہتا ہوں کہ یحییٰ کی روایت کا رد وہ روایت کرتی ہے جس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں کے لئے جگہ کم تھی لہٰذا بنیاد میں ان کے لئے لحد بڑھائی گئی۔ صحیح بخاری میں بھی قول عروہ ہے کہ ”یہ عمر ہی کا مرقدم ہے۔“

حضرت قاسم بن محمد سے ایک اور روایت

(۶) چھٹی صورت

ابن زبالہ کے مطابق حضرت قاسم بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ماں جی! مجھے حضورﷺ اور انؐ کے دونوں صحابہ کی قبریں دکھایئے چنانچہ انہوں نے پردہ اُٹھا دیا، دیکھا تو وہ نہ اونچی تھیں، نہ ہی زمین کے برابر، ان پر بطحاء کی سرخ مٹی ڈالی ہوئی تھی، دیکھا تو حضورﷺ کی قبر

شریف ان دونوں کے آگے تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دونوں پاؤں حضور ﷺ کے سر انور کے قریب تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر ان کے قدموں کے قریب تھا' ابن عساکر نے کہا کہ اس کی صورت یوں ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ | حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود قاسم بن محمد کی گذشتہ روایت سے ٹکر کھاتی ہے لیکن صحیح وہی ہے اور جو عنقریب حجرہ مبارکہ کے تعارف میں آ رہا ہے وہ اس کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ ہے' میں نے اسے کتاب یحیٰی کے ایک نسخے میں دیکھا ہے' جس میں بحوالہ طاہر یہ ترتیب لکھی ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ | حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر ابن یحیٰی طاہر نے کہا کہ انہوں نے قاسم بن محمد سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی۔ پھر ابن فراس (اس نسخہ کو نقل کرنے والوں میں سے ایک) نے کہا کہ میں نے طاہر بن یحیٰی سے کہا مجھے اپنے قلم سے حضور ﷺ' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مبارک قبروں کی صورت بنا دیں تو انہوں نے یہ صورت بنائی تھی' انتہٰی۔

حضرت عبد اللہ بن محمد بن عقیل سے روایت

(۷) ساتویں ترتیب

یہ اس روایت کی بناء پر ہے جو پہلی فصل میں بارش والی رات میں دیوار کے گرنے سے متعلق ہے جسے عبد اللہ بن محمد بن عقیل نے اپنے ایک قول میں بیان کیا تھا کہ: ''میں اندر داخل ہوا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور تھوڑی دیر ادب سے ٹھہرا' قبریں دیکھیں تو حضور ﷺ کی قبر تھی پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر آپ کے قدموں میں تھی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر ان کے قدموں میں' ان دونوں قبروں پر حصباء کی مٹی ڈالی گئی تھی' ابن عساکر کے مطابق اُس کی صورت یہ تھی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

میں کہتا ہوں کہ اسی روایت کو رزین نے عبد اللہ بن عقیل سے روایت کیا اور اسی طرح لیتے آئے لیکن انہوں نے کہا: میں نے قبریں دیکھیں تو حضورﷺ کی قبرِ انور آگے تھی' اور پھر پہلی روایت ذکر کی' وہ اس روایت کے خلاف ہے لیکن وہ قابلِ بھروسہ ہے کیونکہ یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود بعید بھی ہے جیسے حجرہ مبارکہ کے تعارف میں آ رہا ہے خصوصاً جیسے پہلے گذرا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے دو حصے کر دئے گئے تھے' اس پر دلیل تو ہے مگر کمزور اور وہ طبقات ابن سعد میں ہے' مالک بن اسمٰعیل (شاید آل زبیر کے غلام تھے) نے کہا: میں مصعب بن زبیر کے ہمراہ اس گھر میں داخل ہوا جس میں حضورﷺ' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مبارک قبریں تھیں' میں نے دیکھا تو مستطیل تھیں۔ انتہٰی۔

علامہ آجری کی روایت ایک آٹھویں ترتیب بتاتی نظر آتی ہے کیونکہ انہوں نے اس پہلی خبر کے بعد یہ الفاظ لکھے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر درمیان میں تھی لیکن انہوں نے حضرت عمر کی قبر کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وسطہ کی ضمیر اگر البیت کی طرف لوٹتی ہے تو پھر واضح ہے اور اگر یہ نبی کریمﷺ کی طرف لوٹتی ہے تو یہ آٹھویں ترتیب ہوگی لیکن ضرورت ہے کہ اس میں ذرا تاویل کرکے کسی اور روایت کے مطابق کر دیا جائے۔ اور جو ابو یعلیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ حضرت ابوبکر آپ کی دائیں طرف تھے اور عمر آپ کی بائیں طرف' تو اس میں تاویل کی جا سکتی ہے جیسے ابن حجر نے کہا۔

اب صرف دو پہلی روایتیں رہ جاتی ہیں اور ان میں صرف اولیت بتانا ہوگی لیکن پہلی روایت زیادہ مشہور ہے اور حاکم کے دوسری روایت کو صحیح کہنے کا مقصد' اسی کو اولیت دینا ہے' یہ سب سے صحیح روایت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قبریں زمین سے اونچی نہ تھیں جبکہ یحیٰی نے کہا' مجھے ہارون بن موسےٰ نے بتایا کہ انہیں بہت سے اہلِ مدینہ علماء نے جتلایا کہ یہ مبارک قبریں زمین کے برابر تھیں اور ان پر بطحاء کی سرخ مٹی ڈالی گئی تھی۔ ابن زبالہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت لکھی کہ رسول اللہﷺ کی قبرِ انور مربع شکل کی تھی اور آپ کا سرِ انور مغرب کی طرف رکھا گیا تھا۔

رہا وہ جو صحیح بخاری میں سفیان تمار نے کہا کہ انہوں نے نبی کریمﷺ کی قبرِ انور زمین سے اونچی دیکھی' اسی میں ابونعیم نے یہ زیادہ کیا کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قبریں بھی ایسی ہی تھیں اور پھر ابن سعد نے یہ الفاظ

لکھے: ''میں نے نبی کریم ﷺ' حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مبارک قبریں زمین سے اونچی دیکھیں (جیسے اونٹ کی کوہان ہوتی ہے) تو یہ روایتیں ہماری گذشتہ روایت سے نہیں ٹکراتیں کیونکہ یہ سفیان حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں پیدا ہوئے لہٰذا انہوں نے آخر میں قبر شریف دیکھی چنانچہ احتمال ہے (بیہقی کے مطابق) کہ اولاً قبر شریف اونچی نہ ہو اور پھر جب دیوار گری تو اسے اونچا کر دیا گیا' دیکھئے یحییٰ نے عبداللہ بن حسین سے روایت کی' انہوں نے کہا: میں نے ولید بن ہشام کے دور میں نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور دیکھی تو وہ اونچی تھی' ایک روایت میں لکھا کہ قبرِ انور پر مٹی اور کنکر ملے جلے رکھے تھے' بلند تو تھی لیکن بہت زیادہ نہیں' اس پر کنکر اور مٹی بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ابن سعد کے مطابق قبرِ انور پر مٹی بالشت بھر تھی۔

زمین کے برابر قبر ہونے کے متعلق مسلم کی فضالہ بن عبید سے حدیث ملتی ہے کہ انہوں نے ایک قبر کو برابر کرنے کو کہا تھا اور پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا' آپ انہیں برابر کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

ایک قبر کی جگہ باقی ہے

چوتھی روایت میں گذرا ہے کہ ان تین مبارک قبروں کے علاوہ ایک قبر کی جگہ خالی ہے' اسے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ روایت تائید دیتی ہے کہ آپ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کو اس وقت پیغام بھیجا جب وہ قریب المرگ تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور اپنے بھائیوں کے پاس دفن ہونا' انہوں نے کہا کہ میں آپ کے گھر میں تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا' یونہی آپ نے حضرت حسن کو اجازت دی تھی کہ ان کے پاس دفن ہوں لیکن بنو امیہ نے روک دیا تھا' یونہی بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت عبد اللہ بن زبیر کو وصیت فرمائی کہ مجھے ان کے پاس دفن نہ کرنا یعنی نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے پاس' ہاں میری ساتھی اُمہات المؤمنین کے پاس دفن کرنا۔اسماعیلی نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ: سیدہ کے گھر میں ایک قبر کی جگہ تھی لیکن صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دفن ہو سکتے ہیں؟ اس پر انہوں نے کہا تھا کہ میں یہاں دفن ہونا چاہتی تھی لیکن آج میں اپنے مقابلہ میں ترجیح دیتی ہوں۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ شاید آپ کے اجتہاد میں تبدیلی آ گئی تھی یا اس لئے کہ انہوں نے یہ بات حضرت عمر سے قصہ جمل سے پہلا کہی تھیںپھر اگر چہ آپ حضور ﷺ کی دنیا و آخرت میں زوجہ تھیں' تاہم حیاء روکاوٹ بن گئی۔

ابن التین کہتے ہیں: قصہ عمر میں آپ کا یہ فرمان بتاتا ہے کہ وہاں صرف ایک قبر کی گنجائش تھی لہٰذا یہ آپ کے اس قول کے مخالف ہے: ''مجھے ان کے پاس دفن نہ کرنا'' کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دفن کی جگہ تھی اور ان دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے: پہلے آپ کا خیال تھا کہ وہاں صرف ایک قبر کی گنجائش ہے اور جب حضرت عمر وہاں دفن ہو گئے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ایک اور قبر کی جگہ باقی ہے۔

حضرت یحییٰ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضورﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ دفن ہوں گے اور ان کی یہ چوتھی قبر ہو گی۔

سنن ترمذی میں ہے کہ: تورات میں حضرت محمدﷺ کی تعریف لکھی ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس دفن ہوں گے' وہ کہتے ہیں' ابومودود نے کہا کہ اس گھر میں ایک قبر کی جگہ موجود تھی۔

طبرانی میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام' رسول اللہﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ دفن ہوں گے تو یہ چوتھی قبر ہو گی۔

زین مراغی کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بتایا کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اُتریں گے' شادی کریں گے اور ان کے ہاں اولاد ہو گی پھر پینتالیس سال تک یہاں ٹھہریں گے' پھر وہ فوت ہوں گے تو میرے پاس دفن ہوں گے چنانچہ میں اور عیسیٰ بن مریم ایک ہی قبر سے ابوبکر اور عمر کے درمیان اٹھیں گے۔

ابن نجار کے مطابق اہل سیرت کا کہنا ہے کہ گھر میں شرقی طاقچہ میں ایک قبر کی جگہ ہے' حضرت سعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق حضرت عیسےٰ علیہ السلام وہیں دفن ہوں گے۔

فرشتے' حضورﷺ کی قبرِ انور کو گھیرے رہتے ہیں

عنقریب ہم حجرہ مبارکہ کی معین جگہ کے بیان میں لکھیں گے کہ اس کے مشرقی تیسرے حصہ پر ریت کا ڈھیر تھا جس کی بناء پر وہ جگہ باقی گھر سے نمایاں معلوم ہوتی تھی اور اس سے قبل عمارت میں شام سے قبلہ کی طرف اسی جہت میں ایک دیوار کی دلیل ملتی ہے اور شاید یہی وہ جگہ ہے (جسے طاقچہ کہا گیا)۔

حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب بھی فجر طلوع ہوتی ہے تو ستر ہزار فرشتے اُتر کر قبرِ انور کو گھیرے میں لے لیتے ہیں' اس پر پر بچھا دیتے ہیں' نبی کریمﷺ پر درود پڑھتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو اوپر چڑھ جاتے ہیں اور اسی دوران نئے فرشتے آ جاتے ہیں جو یہی کچھ کرتے ہیں اور پھر جب (قیامت کو) زمین پھٹے گی تو حضورﷺ ستر ہزار فرشتوں میں باہر نکلیں گے۔ دارمی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیان میں ہے: ستر ہزار رات اور ستر ہزار ہی دن کو ہوتے ہیں۔

مسجد نبوی میں آواز بلند کرنا جائز نہیں

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول پہلے گذر چکا کہ: "ہماری اس مسجد میں آوازیں بلند نہ کی جائیں۔" ادھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے: کسی بھی نبی کے پاس اس کی زندگی اور وصال کے بعد' آواز اونچا کرنا مناسب نہیں۔

ابن زبالہ و یحییٰ کے مطابق حضرت عبد العزیز بن ابو حازم اور حضرت نوفل بن عمارہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گاڑی جانے والی میخ اور اس دیوار میں ٹھونکے جانے والے کیل کی آواز سنتیں جو مسجد نبوی کے گرد تھی تو انہیں پیغام بھیج دیا کرتیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ کہتے ہیں کہ اسی بچاؤ کی وجہ سے اگر کہیں کوئی کام ہوا تو صرف کبھی طہارت خانہ پر ہوا' گھر پر نہیں (کہ اس کی آواز سے آپ کو تکلیف نہ ہو)۔

قحط سالی کے دنوں میں اہلِ مدینہ کا طریقہ

ابن زبالہ کے مطابق حضرت عبد العزیز نے کہا: اہلِ مدینہ سخت قحط سالی میں گرفتار ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں شکایت کی' انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور دیکھو اور آسمان کی جانب اس میں سوراخ کر دو' درمیان میں کوئی چھت وغیرہ نہیں ہونی چاہیے' انہوں نے یونہی کیا چنانچہ بارش ہو گئی' گھاس پھوس خوب اُگ آئی اور اونٹ موٹے ہو گئے اور گوشت سے بھر گئے چنانچہ اس سال کا نام ''عام الفتق'' پڑ گیا۔

علامہ زین مراغی کہتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کی آج تک عادت چلی آتی ہے کہ قحط سالی کے موقع پر وہ سوراخ کھول دیتے ہیں' وہ حجرہ کے قبہ مبارکہ کے نیچے سوراخ کھولتے ہیں' جو قبلہ کی طرف ہے اگرچہ قبر شریف اور آسمان کے درمیان مسجد کی چھت حائل ہوتی ہے۔

میں یہاں بتاتا ہوں کہ آج کل ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس دروازے کو کھولتے ہیں جو حجرہ کے گرد مقصورہ شریف میں سے چہرۂ انور کے سامنے ہے اور وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۲

حجرہ شریف کیسا؟ اس کے گرد پانچ کونی دیوار اور اپنا مشاہدہ

علامہ اقشہری کے مطابق حضرت ابو غسان کہتے ہیں کہ جب مسجد کی چھت کی لکڑیاں ٹوٹ گئیں اور اس طرف سے مسجد کی چھت اکھاڑی گئی تو میں نے باہر کی دیوار اور وہ گھر دیکھا جو اس کے اندر تھا' میں نے مسجد کی چھت کے درمیان سے دیکھا تو گھر کے گرد والی دیوار نظر آئی اور جو کچھ اس میں تھا' اس کا معاینہ کیا' ساری صورت حال کا مشاہدہ کیا اور اس میں رکھے پیمانے سے پیمائش کی۔ ان دنوں ابو البختری بن وھب بن رشد مدینہ کے حاکم تھے' یہ ۱۹۳ھ کا واقعہ ہے۔

ابو زید کہتے ہیں' اس کی صورت یوں تھی اور پھر اقشہری نے اپنی کتاب ''منسک القاصد الزائر'' میں اس کی یہ صورت بنائی:
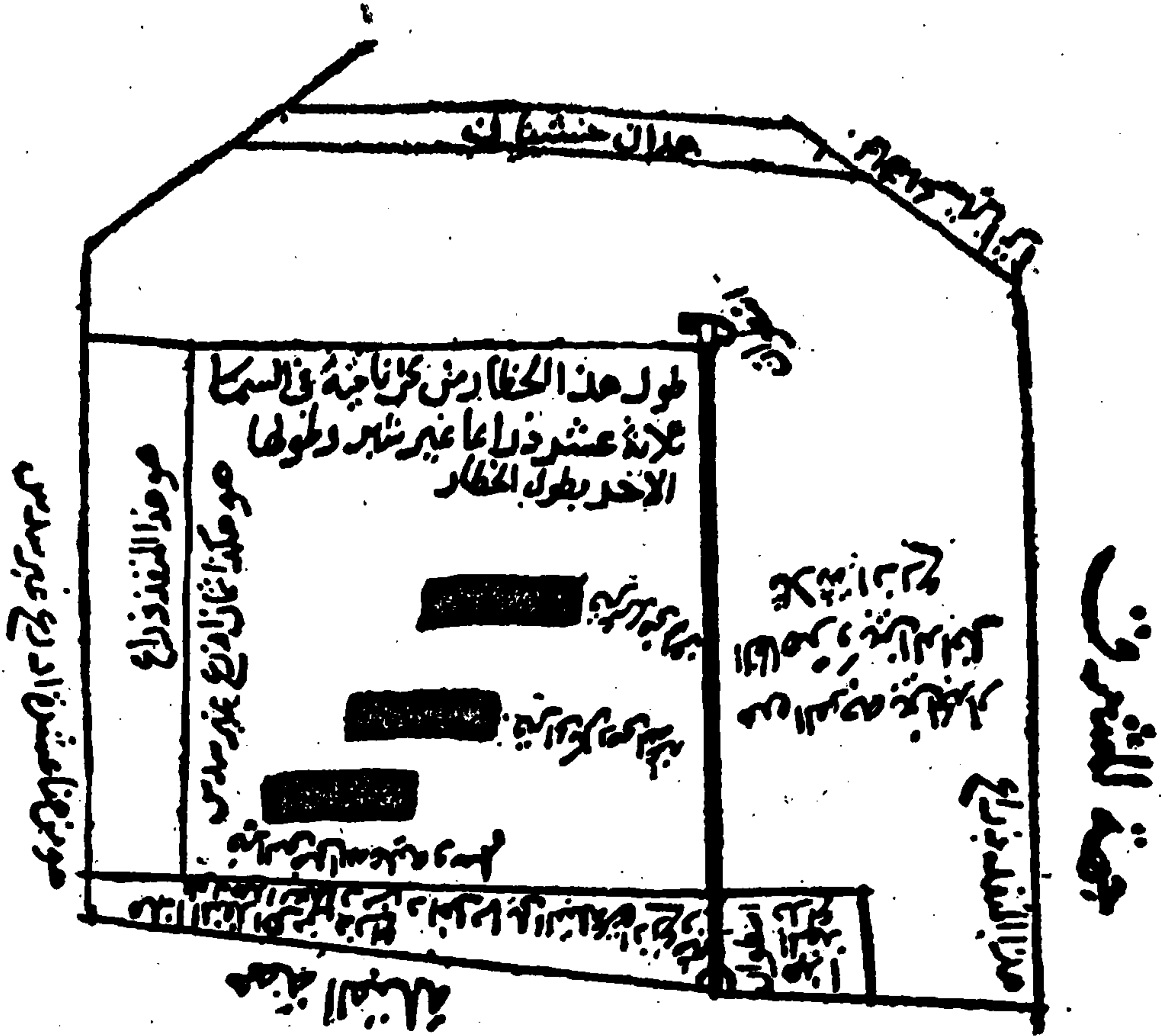
اس تصویر میں جو پیائش بتائی گئی ہے' اس کے اور ابن زبالہ کی گذشتہ پیائش کے درمیان مخالفت ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ جو دیوار گھر کے گرد ہے' اس کے اور مشرق کی طرف دکھائی دینے والی دیوار کے درمیان دو ہاتھ کا فاصلہ ہے اور اس تصویر میں یہ خلا تین ہاتھ لکھا گیا ہے اور پھر اس تصویر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ فاصلہ ان دونوں کے درمیان قبلہ کی طرف بھی مختلف ہے' ایک میں تو ہاتھ سے بھی کم ہے یعنی صرف ایک بالشت جیسے ابنِ زبالہ کے کلام میں ہے اور ایک میں ایک ہاتھ ہے۔

یہ ہم آگے بتا رہے ہیں کہ حجرہ شریف کی وہ صورت جسے ہم نے اس کے کھلنے کے وقت دیکھا تھا' پہلی تصویر کے قریب ہے جسے ابن زبالہ نے بیان کیا ہے اور پھر حال یہ ہے کہ اس کے اندر کی طرف تبدیلی ہو چکی ہے چنانچہ وہ اصل صورت میں نہیں ہے حالانکہ ابن زبالہ نے ابو البختری کی وہ تعمیر دیکھی تھی جس میں حجرہ شریف سے ملنے والی مسجد کی چھت کھولی گئی تھی چنانچہ اپنی کتاب میں لکھا: ''ابو البختری جب ہارون امیر المؤمنین کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے تو ۱۹۳ھ میں مسجد کی چھت کھولی گئی تھی جس میں سات ٹوٹی ہوئی لکڑیاں پائی گئیں چنانچہ ان کی جگہ صحیح لکڑیاں ڈال دی گئیں۔'' اھ

لگتا ہے کہ انہوں نے اسے دیکھا نہیں تھا جیسے ابوغسان نے دیکھ لیا تھا اس عمارت کے بارے میں ابوغسان کی عبارت یہ ہے: مسجد کی لکڑیوں میں سے' حجر شریف کے اوپر والی ابو البختری کے دور میں ٹوٹ گئی تھیں چنانچہ انہوں نے

چھت اکھاڑنے کو کہا۔ اس کے بعد ابن زبالہ کی گذشتہ بات دہرا دی' علاوہ ازیں ابنِ زبالہ اور یحییٰ نے اپنی اپنی کتابوں میں حجرہ اور اس کے گرد والی دیوار کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن جو نسخہ میں نے دیکھا' اس میں تصویر موجود نہیں تھی البتہ ابن النجار نے اپنی کتاب میں یہ تصویر دیدی ہے اور میرا خیال ہے کہ انہیں ایسا نسخہ مل گیا تھا جس میں وہ موجود تھی چنانچہ ابن عساکر نے اپنی کتاب ''تحفۃ الزائر'' اور ''المراغی'' نے اپنی تاریخ میں ان کی پیروی کی ہے لیکن جس صورت میں ہم نے حجرہ شریف دیکھا' یہ اس سے بہت مختلف ہے' پہلے ہم ان کی بتائی تصویر دکھاتے ہیں اور پھر وہ تصویر دکھائیں گے جسے ہم نے دیکھا ہے اور پھر وہ تصویر جس پر حجرہ مبارکہ آج بھی موجود ہے۔ میں نے تصویر دیتے وقت ابن نجار کی اس تصویر کو سامنے رکھا ہے جو علامہ مراغی نے بنائی ہے کیونکہ میں نے انہی کی بنائی کو نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں: ''حضرت عمر بن عبد العزیز نے حجرہ شریف کی بنیاد پانچ کونوں پر رکھی تا کہ نماز میں ان کی طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہو سکے کیونکہ حضور ﷺ نے اس سے ڈر دلایا ہے چنانچہ ابن نجار کے مطابق حجرہ اور اس کے گرد والی دیوار کی صورت یوں ہے' واللہ اعلم:
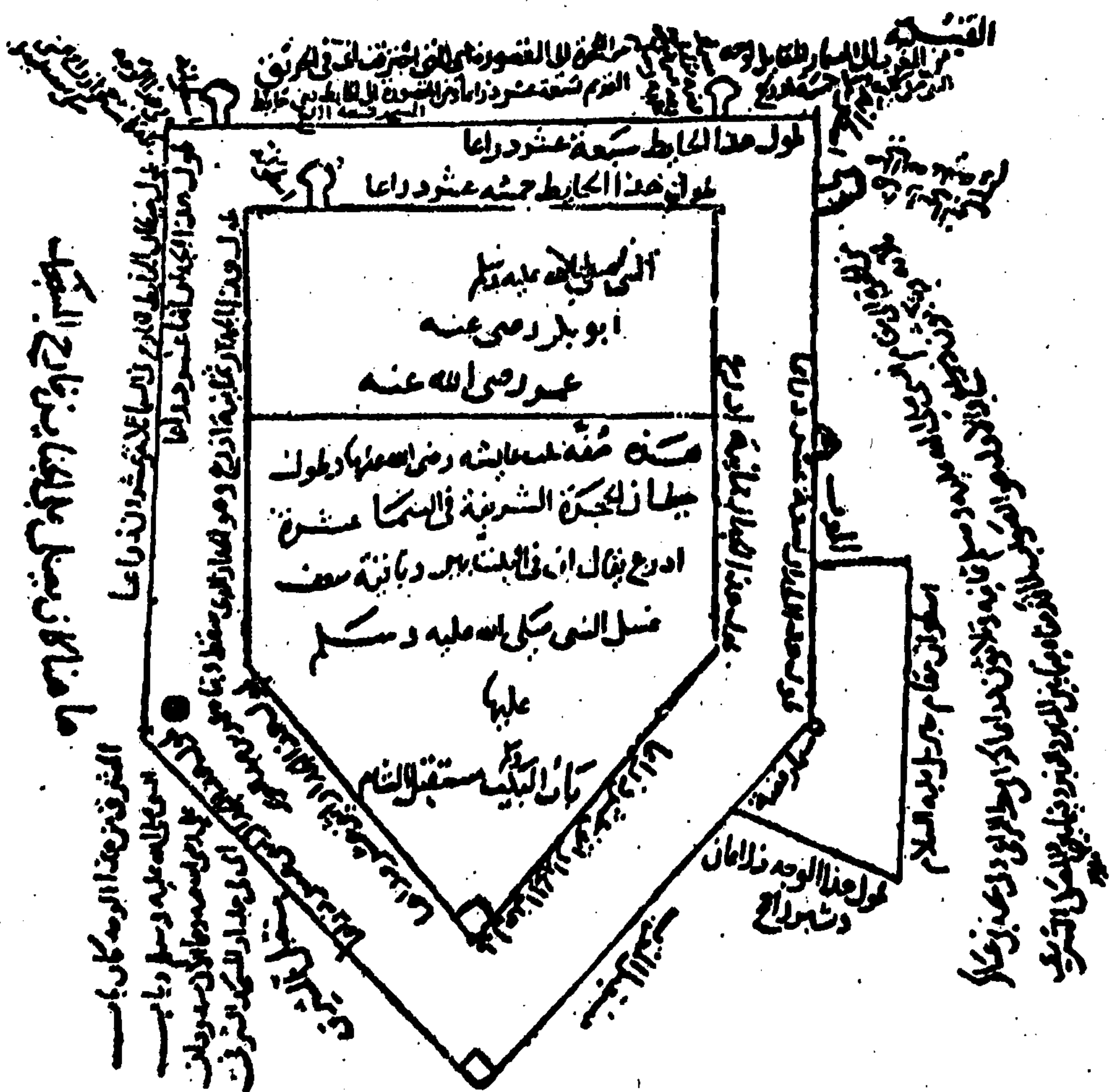
یہ تصویر ابن زبالہ کی گذشتہ تصویر کے مخالف ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کا گھر مربع شکل کا ہے جو

سیاہ پتھر اور چونے سے بنا تھا' پھر اسی شکل کو سامنے رکھ کر حضرت عمر بن عبد العزیز نے پانچ کونی عمارت بنائی تھی کیونکہ جیسے آپ دیکھ رہے ہیں' انہوں نے پانچ کونی تصویر بنائی تھی لیکن جو کچھ چھت کھلنے کے وقت ہم نے دیکھا ہے' یہ اس کے خلاف ہے۔ہم نے دیکھا تو گھر مبارک مربع شکل میں تھا' جسے صاف اور ملائم سیاہ پتھروں سے بنایا گیا تھا' ان کا رنگ خانہ کعبہ کے پتھروں جیسا تھا' وہاں ایسا رعب اور انس ہوتا ہے کہ اہلِ ذوق ہی کو پتہ چل سکتا ہے۔پھر باہر والی دیوار اور مغربی اندر والی دیوار میں ہم نے تو فاصلہ بالکل نہیں دیکھا بلکہ سوئی گاڑنے کی جگہ بھی نہیں دیکھی' نہ ہی اندر والے گھر کا کوئی دروازہ دیکھا اور نہ ہی دروازے کی کوئی جگہ نظر آئی' نہ ہی شامی جانب اور نہ کسی اور طرف اور گھر مبارک کے پیچھے شام کی طرف' گھر اور دکھائی دینے والی دیوار کے اندر خالی جگہ مثلث شکل کی دیکھی تھی اور اس کی پیائش دستی ایک ہاتھ تھی' یہ پیائش گھر کے شمالی حصے سے اس کے سامنے والے کونے تک تھی اور یہ وہی کونہ ہے جس سے شکل مثلث کے دو زاویے نکلتے ہیں۔وہاں ایک ستون بھی ہے جو ستون مربعۃ القبر اور ستونِ وفود کی لائن میں شامی دیوار سے ملا ہوا ہے' اس ستون کا کچھ حصہ اس شامی دیوار کے اندر داخل ہے' ان کے اوپر لوہے کے طاقچے لگے ہوئے ہیں' جن کے نیچے سہارے کے لئے کھجور کے تنے لگائے گئے ہیں جن کا ایک سرا تو اوپر کی طرف ہے اور دوسرا دکھائی دینے والی دیوار کے شمالی کونے پر ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ آتشزدگی کے موقع پر آگ کے اثر سے ستون پھٹ جانے پر لگائے گئے تھے۔یہی وہ ستون ہے جس کا پہلی تصویر میں ذکر ہو چکا ہے کہ یہ گھر کی شامی دیوار کے اخیر میں ہے جو مشرق میں ہے لیکن ہم نے اسے یوں نہیں دیکھا بلکہ یہ شامی دیوار کے تقریباً درمیان میں ہے البتہ تعمیر کے نگران اور اس کے ساتھیوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب گھر کی شامی دیوار گری تھی تو اندر کی طرف اس ستون کے مقابل دیوار کی بنیاد نظر آئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شام سے شروع ہو کر اپنے مقام قبلہ کی طرف جاتی تھی تو گویا یہ مشرق کی طرف گھر کی انتہاء تھی اور لگتا ہے کہ جب دیوار گری تھی تو اتنا حصہ اس میں اضافہ کیا گیا تھا۔

ناظرین سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مشرق سے دیوار کا باقی حصہ تعمیر نہیں گیا بلکہ یہ اسی مذکورہ دیوار کے سرے سے متصل ہے اور اس کی صورت یہ ہے دونوں دیواروں میں کسی کا پتھر دوسری دیوار میں نہیں گیا (داڑھا نہیں لگایا گیا) اور نہ اسے یوں ملایا گیا کہ ایک دیوار معلوم ہو سکے اور خود میں نے دیکھا تھا کہ مشرق سے ملنے والی دیوار نئی بنی تھی کیونکہ اس کے پتھروں کا رُخ مشرقی دیوار سے ہٹا ہوا تھا جبکہ حجرہ مبارکہ کی دوسری دیواریں ایسی نہ تھیں بلکہ ان کے اندر اور باہر صاف پتھر لگے ہوئے تھے تاہم میں نے شامی دیوار کو نہیں دیکھا تھا کیونکہ دیوار گراتے وقت میں اپنے بچاؤ کی وجہ وہاں نہیں جا سکا تھا۔اس سے ظاہر ہوا کہ مشرق کی طرف سے گھر مبارک ابن شبہ کے کہنے کے مطابق تھا' بعد میں اسے بنایا گیا' کسی تاریخ دان کو اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ دیوار وہی ہو جسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مبارک قبروں کے درمیان بنایا تھا چنانچہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر دو حصوں میں تقسیم تھا'

ایک میں تو قبرِ انور تھی اور دوسرے میں آپ خود رہتی تھیں۔ ان دونوں حصوں کے درمیان دیوار تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال میرے نزدیک اوّلیت رکھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر گھر کی مشرقی دیوار اور دکھائی دینے والی باہر کی دیوار میں خلاء مختلف ہے جیسے تنگ گلی ہوتی ہے چنانچہ شام کی طرف اس کی ابتداء میں ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے جس میں انسان پہلو کے بل گزر سکتا ہے اور جب قبلہ کی طرف قریب ہو جاتا ہے تو یہ تنگی اور بڑھ جاتی ہے چنانچہ وہاں سے ایک بچہ بھی گذرے تو پہلو کے بل گذر سکے گا کیونکہ وہاں یہ فاصلہ ہاتھ کا ایک تہائی (٦ انچ) رہ جاتا ہے جبکہ ابن شبہ کہتے ہیں کہ یہ فاصلہ تین ہاتھ تھا چنانچہ ان کی یہ بات اس کی تائید کرتی ہے کہ مشرقی داخلی دیوار میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ صرف اسی دیوار کو دیکھتے وقت یہ بات صاف نظر آتی ہے' دوسری دیواروں میں یوں نہیں۔

ہم نے بھی گھر کی قبلہ والی دیوار اور قبلہ والی باہر کی دیوار میں تنگ گلی سی دیکھی ہے جس کا فاصلہ مختلف ہے' مشرق کی طرف سے شروع کریں تو فاصلہ ایک ہاتھ ہے اور جب آپ کے چہرۂ انور کے قریب ہوں تو یہ فاصلہ بالشت بھر ہے اور جب مغربی جانب دو دیواروں کے ملنے کی جگہ پہنچیں تو اس سے بھی کم ہو جاتا ہے اور یہ راستہ اتنا رہ جاتا ہے کہ اس میں سے گذرنا ممکن نہیں کیونکہ وہ ستون جو باہر کی دیوار میں ہے اور حضرت عمر کے چہرے کے مقابل کھڑا ہونے والے زائر کو نظر آتا ہے' اس کا کچھ حصہ اندر کی طرف نظر آتا ہے اور اس کے سامنے اتنی ہی چوڑی دیوار ہے جس سے دونوں دیواروں کا درمیانی خلا بند ہو جاتا ہے' گویا کہ یہ حصہ دیوار گر جانے کی وجہ سے سہارے کے لئے تیار کیا گیا یا اس لئے کہ وہاں سے کوئی گذر نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ اسے بنانے والے کو بہترین جزا دے۔
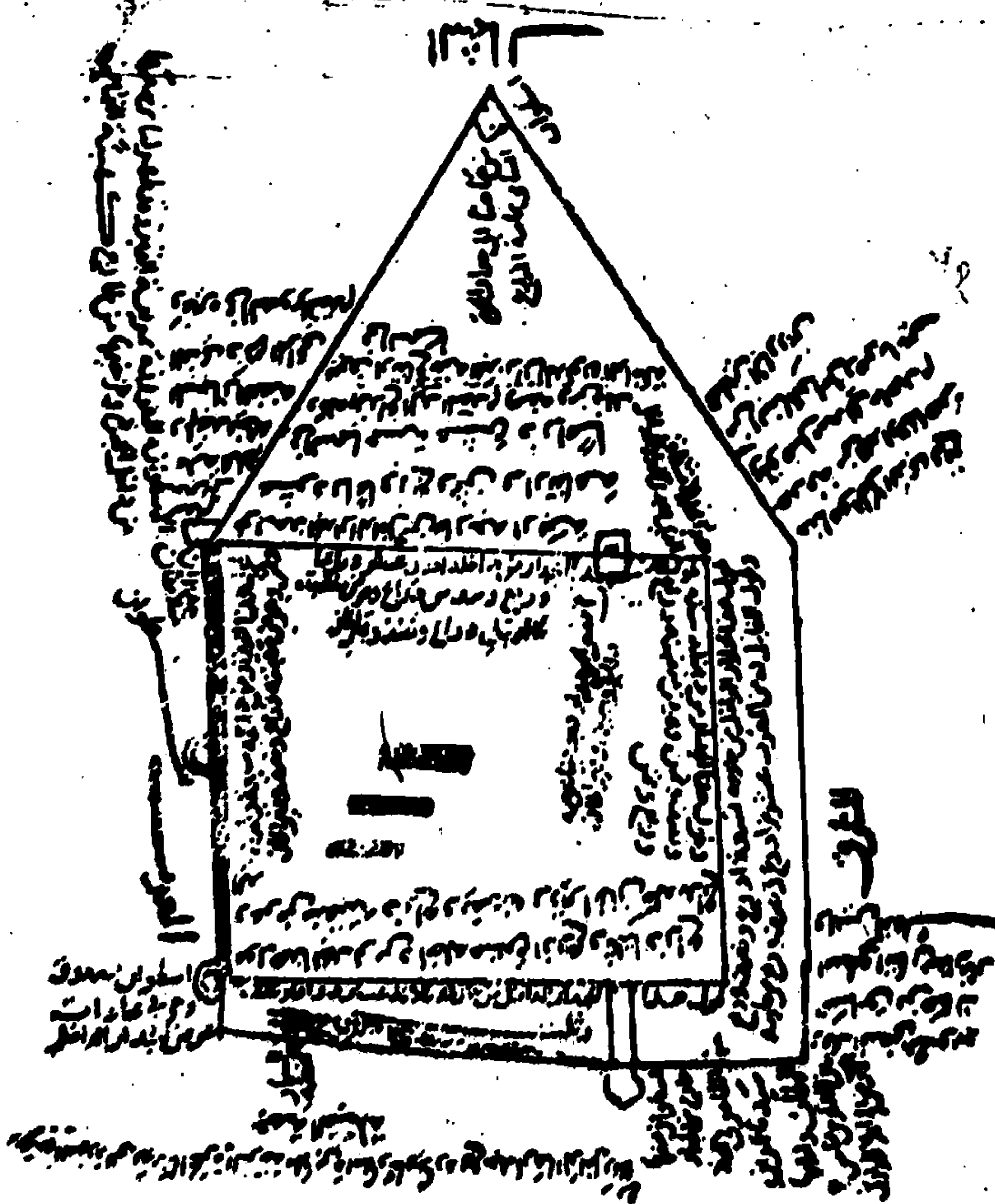
حجرہ مقدسہ کے باہر والی دیواروں کی پیمائش

رہا باہر والی دیوار کا ایک کونے سے دوسرے تک طول جو باہر سے دکھائی دیتی ہے تو قبلہ والی دیوار کے اس کونے سے جو مغرب کی طرف ہے' اس کونے تک جو مشرق کی طرف ہے' سترہ ہاتھ ہے صرف ذرا سا کم ہے اور یہ ابن نجار کی تصویر کے مطابق ہے۔ یونہی قبلہ کی طرف سے غربی دیوار کا طول مقامِ جبریل کی طرف تقریباً ساڑھے سولہ ہاتھ ہے' یہاں مقام جبریل سے شام کی طرف مقامِ جبریل کے قریب اڑھائی ہاتھ کا موڑ ہے اور یہ سارا فاصلہ انیس ہاتھ بنتا ہے اور ابن نجار کی تصویر میں یہی مراد ہے لیکن یہ فاصلہ وہم پیدا کرتا ہے کہ شاید مقام جبریل ان انیس ہاتھ میں داخل نہیں لیکن ایسا نہیں۔ پھر مقام جبریل سے گھوم جانے والی دیوار کا طول شمالی کونے تک ساڑھے بارہ ہاتھ سے قدرے زیادہ ہے' مشرقی دیوار کا طول جو قبلہ کی طرف سے شمالی کنارے کی طرف جاتی ہے' اس کا طول ساڑھے بارہ ہاتھ سے قدرے زیادہ ہے اور اس دیوار سے مڑنے والی دیوار کا طول اس کونے سے شمالی کونے تک تقریباً چودہ ہاتھ ہے اور تین آخری دیواروں کی پیائش ابن نجار کی پیائش سے مختلف ہے۔ رہا اونچائی کی طرف طول تو یہ تیرہ ہاتھ اور ہاتھ کا ایک تہائی ہے' کئی کونوں میں یہ قدرے زیادہ ہے اور پھر دیوار کی اپنی چوڑائی ایک ہاتھ سے قدرے زائد ہے۔

اقشہری نے لکھا ہے کہ ابو غسان کے مطابق دیوار کی اونچائی ہاتھ کا چھٹا حصہ کم تیرہ ہاتھ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے اوپر پکی اینٹ کا پردہ دیکھا ہے جو آدھا ہاتھ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نیا بنا ہے اور اس وقت بنا جب پہلی آتشزدگی ہوئی اور حجرے کی چھت ڈالی گئی لہٰذا ہمارے بتائے اور ابو غسان کے بتائے کے درمیان کوئی مخالفت نہیں۔

رہا اندر کی دیوار کی اونچائی تو شام کی طرف سے میں نے اس کا اندازہ باہر سے لگایا تھا' وہ گویا پندرہ ہاتھ تھا اور اس زمین کی اونچائی' جو شام کی طرف دو دیواروں کے درمیان ہے' حجرہ کی زمین پر ایک پورا ہاتھ اور تقریباً چوتھائی ہاتھ ہے اور اس کے باوجود باہر کی دیوار' اندر کی دیوار سے قدرے زیادہ یا برابر ہے اور اس کا سبب' باہر والی زمین کا اندر کی دو دیواروں کی درمیانی زمین سے ڈیڑھ ہاتھ سے قدرے زیادہ بلند ہونا ہے اور اس کے ساتھ شام کی طرف مثلث کے اندر پتھر اور چونا یوں اُٹے پڑے ہیں کہ اس میں ان کے لئے بنیاد نکالنا ممکن نہیں تھا۔

ابن نجار اور ابن عساکر کے کلام میں موجود مراغی کے خط سے پتہ چلا ہے کہ باہر کی دیواروں کی اونچائی تیئس ہاتھ تھی اور جو کچھ ہم دیکھ آئے ہیں' یہ اس کے خلاف ہے اور شائد ان کا اس سے مقصد حجرہ مقدسہ کے گرد والی زمین سے مسجد کی چھت کے درمیانی والی پیائش بتانا تھا حالانکہ حضرت عمر بن عبد العزیز بالاتفاق یہاں تک نہیں پہنچے تھے بلکہ اس کے اوپر لکڑی کی جالی تھی جو مسجد کی چھت سے ملی ہوئی تھی اور پردہ اُٹھانے سے نظر آتی تھی اور گویا ابن نجار کو وہم ہوا کہ وہ دیوار چھت کے ساتھ لگی ہوئی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں: حضرت عمر بن عبد العزیز نے نبی کریم ﷺ کے حجرے پر دیوار بنائی جو مسجد کی چھت سے زمین تک تھی جس کی وجہ سے حجرہ اس کے درمیان آ گیا۔

ان کے کلام کا یہ مطلب لینا زیادہ مناسب ہے کہ انہوں نے مسجد کی چھت سے زمین تک تعمیر کی تھی لیکن اس میں اوپر کی جالیاں بھی شامل تھیں اور یونہی جو انہوں نے پیائش کے بارے میں کہا ہے' اس کا مطلب بھی یہی لیا جائے گا کیونکہ اس جالی کا ان کے کلام میں ذکر موجود ہے کیونکہ انہوں نے بتایا ہے کہ جمال اصفہانی نے نئے سرے سے حجرہ کو مرمر سے مضبوط کیا اور پھر کہا: اس کے لئے صندل اور آبنوس کی لکڑی سے جالی بنائی اور اسے گردا گرد لا کر چھت سے ملا دیا یعنی اس مذکورہ دیوار کے سرے تک لے گئے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید وہ پہلے شخص ہیں جس نے یہ جالی تیار کی کیونکہ اس کا ذکر پہلے مؤرخین کی کلام میں موجود ہے۔واللہ اعلم۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے حجرہ مقدسہ کی چھت پر خیمہ کی طرح موم جامہ کیا ہوا کپڑا تھا اور اس پر چھت تھی اور اس کپڑے کے نیچے چھوٹا سا دروازہ تھا جس پر بند شیشہ تھا اور سطح کی چھت میں خوخہ کے اوپر ایک اور خوخہ (چھوٹا دروازہ) تھا جو اس خوخہ کے عین اوپر تھا اور اس کے اوپر بھی شیشہ لگا تھا جسے تالا لگا ہوا تھا پھر مسجد کی چھت اور سطح مسجد کی دوسری چھت کے درمیان دو ہاتھ کا خلاء تھا۔

میں کہتا ہوں کہ حجرہ سے ملنے والی مسجد کی جس چھت کا انہوں نے ذکر کیا ہے تو اسے ہم نے دیکھا کہ وہ موجود ہے جس پر لوہے کا تالا لگا ہے اور شمع جلانے کی جگہ کو مسجد کے متولی نے نئے سرے سے ہمارے دور میں بنایا ہے جبکہ مسجد جل چکی تھی اور وہ قبہ بھی بنایا گیا جو نیلے رنگ کے قبہ کی جگہ بنایا گیا۔

رہا وہ روشن دان جس کا ذکر انہوں نے حجرہ کی چھت میں کیا وہ اس موم جامہ کردہ کپڑے کے نیچے ہے جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اور یہ پہلی آتشزدگی سے پہلے کا واقعہ ہے اور جب اس کے بعد یہ چھت دوبارہ تعمیر ہوئی تو اس میں روشن دان نہ تھا۔

کلامِ مطری سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ایک روشن دان کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو چھت میں موجود ہو' کیونکہ انہوں نے کہا: دو چھتوں کے درمیان حجرے کی چھت پر تختیاں لگی ہیں جن میں سے بعض کو بعض کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا اور پھر ان پر موی کپڑا ڈال دیا گیا جن پھر تالا لگایا گیا کہ جب اسے کھولا جاتا تو نبی کریم ﷺ کے گھر کی دیوار اور اس دیوار کے اندر جانا ممکن ہو جاتا جسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنایا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس شیشے کے بارے میں جو کچھ انہوں نے کہا' وہ صحیح نہیں کیونکہ اس سے حجرے کے درمیان نیچے اُترنا برابر تھا حالانکہ مطری اور ان کے پیروکار اس بات پر متفق ہیں کہ آتشزدگی کے بعد حجرے کی چھت وہی مسجد کی چھت تھی اور یہ بھی اس کے خلاف ہے جو ہم نے دیکھا۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۳

حجرہ مقدسہ کی تعمیر اور اس میں داخلہ کی صورت اور مرمر کا استعمال

علامہ اقشہری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ابو عمرو احمد بن ابو محمد ہارون بن عاث نفری کہتے ہیں کہ مدینہ شریف (یا کہا' مدینہ اسلام) میں ایک حادثہ رونما ہوا تھا' انہوں نے سن رکھا تھا کہ چالیس سال ہوئے حجرہ مبارکہ میں ایک دھما کہ ہوا چنانچہ خلیفۂ وقت کو اس سلسلے میں لکھا گیا۔ انہوں نے فقہاء سے مشورہ کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ مسجد کے خادموں میں سے کوئی فاضل شخص اس میں داخل ہو چنانچہ انہوں نے بدر ضعیف کو منتخب کیا' وہ ایک فاضل شخص تھے' رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے اور بنو عباس سے تعلق تھا' انہیں اندر داخل کر دیا گیا' انہوں نے دیکھا کہ مغربی دیوار گر چکی تھی' یہ باہر والی دیوار کے اندر کی طرف نیچی تھی' اس کے لئے مسجد کی مٹی سے اینٹیں تیار کی گئیں چنانچہ خلیفہ نے پہلی صورت پر از سرِ نو اسے تعمیر کرا دیا۔ وہاں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو دیوار گرنے سے ٹوٹ گیا تھا جسے دیوار کی کچھ مٹی کے ساتھ بغداد پہنچا دیا گیا اور جس دن وہ بغداد پہنچا' لوگ استقبال کے لئے آئے اور اسے دیکھنے کے لئے بے شمار لوگ جمع ہو گئے' بھیڑ کی وجہ سے کاروبار بند ہو گیا اور خرید و فروخت تک رُک گئی۔ ابن عاث نے ۶۱۳ھ میں کوچ کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ "تقریباً چالیس سال ہوئے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ ۵۷۰ھ یا اس سے ذرا پہلے کا ہے۔ ابن عاث نے اسے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے جس سے میں نے نقل کیا ہے تو گویا یہ واقعہ "مستضی باللہ بن مستنجد باللہ" کے دور کا ہے۔ انتہی۔

یہ گرنے والی دیوار شاید مشرقی تھی جو عمارت کے اندر کی طرف تھی' اسے مغربی کہہ دیا گیا' اس لئے کہ یہ اس دیوار سے متصل تھی جو باہر کی طرف تھی تو یہ وہی واقعہ ہے جس میں یہ مذکورہ دیوار بنائی گئی اور اسے پہلی جگہ سے ذرا تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن اس کا سرا رہنے دیا گیا جیسے پہلے اس کی طرف اشارہ ہو چکا' اسے پتھر سے بنایا گیا تھا' وہاں کچی اینٹیں نہ لگی تھیں' صرف دیوار کے اوپر لگائی گئی تھیں اور شاید مسجد کی مٹی سے اینٹیں بنانے سے مراد یہی لیا لیکن کلامِ نجار میں یہ بھی ہے کہ حجرہ شریفہ میں اس کے دور ۵۵۴ھ تک کسی کا اندر داخل ہونا ثابت نہیں' ان کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب "الدرۃ الثمینہ" میں لکھا ہے: یقین کیجئے کہ ۵۴۸ھ میں انہوں نے حجرہ مبارکہ میں دھماکے کی آواز سنی تھی۔ اس وقت قاسم بن مہنی حسنی امیر مدینہ تھے۔ لوگوں نے اسے اس واقعہ کی اطلاع دی تو اس نے کہا: کسی شخص کو اس میں داخل ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ دیکھے' اندر کیا ہوا ہے' انہوں نے ایسے شخص کے بارے میں سوچا جو اس کام کو صحیح طریقے سے کر سکے چنانچہ عمر نسائی کا نام سامنے آیا' یہ موصل کے شیخ الشیوخ صوفی تھے۔ ان کے بارے

میں بتایا گیا کہ انہیں پیشاب وغیرہ کی شکایت ہے جس کی وجہ سے انہیں بار بار طہارت خانہ میں جانا پڑتا ہے لیکن انہوں نے انہیں تجویز کر لیا چنانچہ وہ کہنے لگے: مجھے مہلت دیجئے کہ میں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لوں۔

کہتے ہیں کہ آپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں موقع دیکھنے اور باہر آنے تک مرض سے رہائی ملی رہے۔ پھر انہوں نے انہیں خوخہ سے اس باڑ میں اُتارا جسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنایا تھا' وہاں سے آپ حجرہ مبارکہ میں شمع لئے داخل ہو گئے' دیکھا تو مبارک قبروں پر چھت کی مٹی گری ہوئی تھی چنانچہ داڑھی سے صفائی کر دی' کہتے ہیں کہ آپ کی داڑھی خوبصورت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اندر جانے آنے کے دوران انہیں بیماری سے بچائے رکھا۔ یہ بات میں نے بہت سے لوگوں سے سنی۔ واللہ اعلم۔

مطری کی پیروی میں علامہ مراغی نے لکھا: لوگوں نے انہیں رسی باندھ کر دو چھتوں کے درمیان سے نیچے اُتارا' وہ حضور ﷺ کے کمرے والی دیوار اور اس سے باہر والی دیوار کے درمیان اُترے اور شمع لئے دروازے کی طرف گئے جہاں سے اندر داخل ہو گئے اور مبارک قبروں کے پاس پہنچ گئے' وہاں دیکھا تو تھوڑا سا ملبہ پڑا تھا' یا تو چھت سے گرا تھا یا پھر دیواروں سے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ روایت ابن نجار کے مطابق نہیں چنانچہ علامہ مراغی نے اسی پر اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے جس کا ذکر آ رہا ہے۔

پھر ابن نجار نے کہا کہ ماہِ ربیع الآخر ۵۵۴ھ کو خلیفہ قاسم کے دور میں لوگوں نے حجرہ مقدسہ سے خوشبو آئی محسوس کی اور جب بڑھ گئی تو لوگوں نے امیرِ مدینہ سے شکایت کی۔ اس نے اندر اُترنے کا حکم دیا چنانچہ خواجہ سرا بیان اسود داخل ہوئے جو حجرہ کے خادم تھے' ان کے ساتھ مسجد کے متولی صفی موصلی بھی تھے اور امیر مدینہ سے اجازت لے کر ہارون شادی صوفی بھی اندر گئے۔ امیر نے انہیں بہت سا مال دیا اور جب وہ اندر گئے تو دیکھا کہ ایک بلی اوپر سے گر کر مر گئی تھی اور پھول چکی تھی' انہوں نے اسے نکال دیا۔ وہ حجرہ اور باہر والی دیوار کے اندر تھے۔

علامہ مراغی کہتے ہیں: انہوں نے دیکھا کہ اس جالی سے بلی گری ہے جو چھت کے اوپر تھی' وہ اس دیوار اور حضور ﷺ کے مبارک حجرے کی دیوار کے درمیان تھی۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ وہ گیارہ ربیع الآخر بروز ہفتہ اندر داخل ہوئے تھے اور اس تاریخ سے آج تک یہاں تک کوئی نہیں جا سکا۔ انتہی۔

یہ بات علامہ اقشہری کی ابن عاشت سے نقل کے خلاف ہے کیونکہ اس کے مطابق یہ واقعہ ۵۷۰ھ کے لگ بھگ ہوا تھا اور ظاہر یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے اور ان کے سوا کہیں اور نہیں ملا چنانچہ ہر ایک نے ویسے ہی نقل کر دیا جیسے ان تک پہنچا۔

زین مراغی' ابن نجار کا نقل کردہ واقعہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں: اس نقل میں غور کی ضرورت ہے کیونکہ مبارک

قبروں تک پہنچنا مشکل ہے خصوصاً اس صورت میں جب سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تعمیر کردہ دیوار باقی ہو اور اگر کہیں یہ مل جائے کہ وہ دیوار نکال دی گئی یا دروازے وغیرہ سے اندر جانے کا کوئی راستہ تھا تو یہ بات ٹھیک ہو گی ورنہ محلِ نظر ہے۔

میں کہتا ہوں' یہ محلِ نظر تو تب ہو سکتا ہے جب ابن نجار نے یہ کہا ہو کہ وہ دو دیواروں کے درمیان نازل ہوئے تھے اور وہاں سے حجرے کے دروازے تک گئے تھے لیکن ان کے کلام میں تو ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہم نے ان سے نقل کیا ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ حجرہ شریف میں روشن دان تھا (سوراخ تھا) اور اسی کے مقابل مسجد کی چھت میں بھی تھا' وہ تو اوپر سے حجرہ کی چھت تک اُترے تھے پھر وہاں سے حجرے تک لہٰذا اعتراض نہ رہا علاوہ ازیں جس دیوار کے متعلق انہوں نے اشارہ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بنائی تھی اور وہ کہتے ہیں کہ اس کا نشان نہیں ملتا' صرف اس کا سرا دکھائی دیتا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں شام کی طرف سے قبلہ تک دیوار تھی اور دروازے کا بھی ہمیں کوئی نام و نشان نہیں ملا جیسے ہم پہلے بتا چکے۔

باقی رہی یہ بات کہ حجرہ کو سنگِ مرمر لگا کر مضبوط کیا گیا تھا تو کلامِ ابن زبالہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا البتہ یحییٰ کے کلام میں اس کا ذکر موجود ہے کیونکہ ان کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے حضرت فاطمہ بنت حسین اور ان کے شوہر حضرت حسن بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نکال کر اس گھر کو گرایا جانے لگا تو حضرت حسن نے اپنی اولاد میں سب سے بڑے لڑکے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا اور تاکید کی کہ تعمیر کے قریب ٹھہرے رہنا اور دیکھتے رہنا فلاں قسم کا پتھر وہ بنیادوں میں لگاتے ہیں یا نہیں؟ وہ دیکھتے رہے' انہوں نے بنیادیں اونچی کر دیں لیکن وہ پتھر نہیں لگایا۔ حضرت جعفر نے اپنے والد کو بتایا کہ انہوں نے وہ پتھر نکال دیا ہے۔ یہ سن کر وہ سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے' یہ وہ پتھر تھا کہ نبی کریم ﷺ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں تشریف لاتے تو اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے' یا فرمایا کہ حضرت فاطمہ اس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھا کرتی تھیں۔ اس بات میں یحییٰ کو شک رہا اور حضرت علی بن موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو بتاتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی پتھر پر حضرت حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنم دیا تھا۔

علامہ یحییٰ کہتے ہیں' میں نے حسین بن عبد اللہ بن عبد اللہ بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھا تھا' ہم میں سے کوئی بھی ان سے افضل نہ تھا' انہیں جب بھی کوئی جسمانی تکلیف ہوتی تو اس پتھر کو تکلیف والے مقام پر لگاتے۔ ہم عرصہ تک اس پتھر کو دیکھتے رہے' اسی دوران مسجد بنانے والے کاریگر فوت ہو گئے اور جب قبرِ انور پر مرمر لگایا گیا تو ہمیں نظر نہیں آیا' وہ پتھر قبرِ انور کے متصل تھا اور چوکور حصے کے قریب۔ یحییٰ کی کتاب کے ایک راوی کہتے ہیں کہ یہ کاریگر حضرت اسحاق بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے' خلیفہ متوکل نے انہیں مکہ و مدینہ کی تعمیر کے لئے بھیجا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ خلیفہ متوکل کی خلافت ۲۳۲ھ سے شروع ہوئی اور وفات شوال ۲۴۷ھ کو ہوئی۔ یہ تھا ابن نجار کا

ماخذ جہاں سے انہوں نے یہ نقل کیا کہ متوکل نے اپنے دور میں حضرت اسحاق بن مسلمہ کو حکم دیا تھا (یہ مکہ و مدینہ میں اس کی طرف سے تعمیر پر مقرر تھے) کہ حجرہ مبارک کو مرمر لگا کر مضبوط کر دیں تو انہوں نے کر دیا پھر مقتفی کے دور خلافت ۵۴۸ھ میں ان کے دادا بنوزنگی کے وزیر جمال الدین نے بنائی تھی اور اس کے گرد کھڑے اور بیٹھے پتھر لگائے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد مرمر کو نئے سرے سے لگانے کا ذکر کسی بھی مؤرخ نے نہیں کیا البتہ ہمارے دور کے تعمیری نگران جناب شمس محسنی خواجگی بن زمن نے اسے سلطان قائتبائی کے حکم سے لگایا تھا اور قبلہ کی جانب مغرب کی طرف سے ابتداء ہی میں، سماقی رنگ کی تختی تھی جسے سفید واضح مرمر نے گھیر رکھا ہے' اس کے اندر دینار سے بڑا ٹکڑا اس تختی کے ظاہری حصے پر چونے سے چپکا ہوا تھا' اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ نفیس قسم کا چمکدار گوہر ہے پھر تعمیر کے نگران نے مجھے دکھایا کہ وہ شہد کے رنگ کا پتھر ہے جس کی سرخی' زردی مائل تھی' انہوں نے بتایا کہ میں تو اسے حجر الیرقان سمجھتا ہوں۔ نگران کو خدشہ تھا کہ اسے پہلے کی طرح کیسے چپکایا جائے گا چنانچہ پہلے مرمر کو کھرچنے کا حکم دیا اور اسے اس میں لگانے کو کہا' انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس پتھر کو اپنے مقام پر لگا دیا۔

میں نے کسی بھی مؤرخ کو نہیں دیکھا کہ اس نے اس مرمر کے بارے میں بتایا ہو جو حجرہ شریف کے گرد زمین میں لگایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس وقت دکھائی دیا جب زمین پر مرمر لگایا جا رہا تھا کیونکہ یحیٰی کے کلام میں اس پتھر کے بارے میں (جسے متبرک سمجھا جاتا تھا) بتایا جا چکا ہے کہ حضرت حسین بن عبد اللہ نے اس سے کنکریاں دور کیں' عمارت میں نہیں لگایا اور میں نے اسے اس وقت سے نہیں دیکھا جب سے حجرے کو مرمر سے پختہ کیا گیا تھا' اس سے پتہ چلا کہ انہوں نے زمین پر بھی مرمر لگایا گیا تھا ورنہ وہ پتھر چھپ نہ جاتا۔

رہا مصلّٰے مذکور پر سنگ مرمر لگانا تو میں نہیں جانتا کہ اسے کب لگایا گیا البتہ ابن زبیر کے سفرنامے میں اس کا ذکر موجود ہے' رہا وہ پتھر جو محرابِ عثمانی اور اس کے گرد لگا ہوا ہے تو اس کا قدیم حصہ (یعنی پہلی آتشزدگی کے بعد) وہ ہے جو محراب اور قدرے اس کے گرد ہے جسے مرمر لگایا گیا ہے اور سلطان ملک ظاہر جقمق نے ۸۶۰ھ کی پہلی دہائی میں قبلہ کی دیوار میں بیل بوٹے لگانے کا حکم دیا چنانچہ اسے محراب سے ملا دیا گیا اور جو عمارت ہم نے دیکھی ہے' اس میں اس کا اکثر حصہ نیا بنا دیا گیا ہے۔ وہ بیل بوٹے جو اوپر والے حصے میں تھے' اسے تبدیل کر دیا گیا اور اس کی جگہ سونے کے پانی سے نئے نقش و نگار کئے گئے جو آج تک موجود تھے لیکن دوسری آتشزدگی میں یہ سب کچھ بھی زائل ہو گیا پھر اسے منارۂ رئیسیہ بناتے ہوئے پہلے سے بھی خوبصورت کر دیا گیا' ساتھ ہی حجرہ مبارکہ کے اردگرد مرمر لگایا گیا' مصلّٰے شریف کے محراب پر بھی سنگ مرمر لگا دیا گیا پھر مواجہہ شریف کے بالمقابل ان ستونوں پر بھی مرمر لگایا گیا جب انہوں نے دوسرا قبہ بنایا تھا چنانچہ مقصورہ کے اندر اور باہر سے اسے پتھر لگا دیا گیا اور آج مسجد میں مرمر کا جتنا بھی کام نظر آ رہا ہے وہ ہمارے دور کے سلطان اشرف قائتبائی کا کرایا ہوا ہے (اللہ ان کے مددگاروں کو عزت دے اور ان کا اقتدار بڑھائے) واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۴

سرِ انور کی طرف صندوق‘ مواجہہ شریف کے سامنے ’’مقام فضہ‘‘ حجرہ مبارکہ میں مقامِ جبریل‘ حجرہ پر پردہ اور خوشبو لگانا

مجھے معلوم نہیں کہ سرِ انور کے سامنے صندوق کب رکھا گیا‘ کیسے اوپر والا چھوٹا ستون سجایا گیا تاہم اس نئی تعمیر میں پتہ چلا کہ پہلی آتشزدگی سے پہلے وہ موجود تھا کیونکہ تعمیر کے نگران نے اسے اکھاڑ دیا تھا تاکہ اسے مضبوط بنایا جاسکے چنانچہ اس نے صندوق کو خوب سجا دیا اور اسی سبب سے وہاں کے ستون کی بنیاد بھی درست کر دی اور جب انہوں نے صندوق اکھاڑا تو پہلے انہیں صندوق کے پائے نظر آئے جن میں آتشزدگی کا اثر دکھائی دے رہا تھا‘ لگتا تھا کہ انہوں نے اسی پر نیا صندوق رکھ دیا تھا اور وہ جلا ہوا اسی میں سمو دیا تھا اور دوبارہ اسی طرح بنا دیا تھا۔

مجد شیرازی نے اس صندوق اور پائے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: حجرہ شریف کے مغربی پہلو میں آبنوس سے بنا صندوق ہے جس میں صندل کا استعمال ہوا ہے اور اس پر چاندی کا خول ہے‘ وہ حضور ﷺ کے سرِ انور کے سامنے ہے‘ اس میں ایک ستون ہے‘ صندوق پر لکڑی کا پایہ ہے۔ یہ صندوق پانچ بالشت لمبا اور تین بالشت چوڑا ہے اور اوپر کو بلندی چار بالشت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سب معلومات میں نے ابن جبیر کے سفرنامے سے لئے ہیں سوائے اس کے جو اس پر ’’قائم‘‘ لگا ہے چنانچہ اسی سے مجد نے یہ بات نکالی کہ یہ نیا ہے۔ ابن جبیر کا یہ سفر ۵۸۰ھ کو ہوا تھا جس سے پتہ چلا کہ اس دور میں آتشزدگی سے پہلے وہ صندوق موجود تھا اور یہ جو انہوں نے لکھا ہے کہ یہ صندوق سرِ انور کے سامنے ہے‘ یہ غلط ہے کیونکہ ہمیں اس دور کی تعمیر میں پتہ چلا ہے کہ وہ قبلہ والی اندر کی دیوار کے سامنے ہے اور آگے آ رہا ہے کہ چہرۂ مبارک دیوار کی جانب ہے لہٰذا سرِ انور اس صندوق سے ذرا سا ہٹ کر ہے۔

علامہ مجد رحمہ اللہ کے پاس اس سلسلے میں حضرت جعفر بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت ہے‘ حضرت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ وہ جب حاضری دیتے اور حضور ﷺ پر سلام پیش کرتے تو روضۂ مبارکہ سے متصل ستون کے ساتھ کھڑے ہوتے اور پھر سلام عرض کرتے اور بتاتے کہ رسول اللہ ﷺ کا سرِ انور یہاں ہے اور اس کا مقصد ہم بتا چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

صندوق مذکور کی پونے دو ہاتھ اونچائی‘ دستی ہاتھ کی پیمائش کے مطابق تھی اور صندوق کے اوپر والا حصہ مرمر کے نفیس سرے کے برابر تھا‘ اس مذکور ’’قائم‘‘ (صندوق کے اوپر) کی بلندی تین ہاتھ تھی‘ یہ پانچ پہلو تھا جس کا ایک حصہ دوسرے سے پیوستہ اور جڑا ہوا تھا اور اس ستون کے ظاہری اس حصے کو گھیرے ہوئے تھا کہ اصل ستون جس پر موجود تھا

کیونکہ ستون کا کچھ حصہ اس عمارت میں شامل تھا جو باہر کی دیوار کے ساتھ متصل تھا اور اگر یہ اطراف تمام ستون کو گھیرتے تو پانچ سے بڑھ جاتے اور اس کی شکل آٹھ پہلو ہو جاتی۔ اس پر سیاہ ہندی لکڑیاں لگی تھیں اور اس کے طول وعرض میں ہر پہلو پر چاندی کی چادر تھی جو نہایت سلیقہ سے لگی تھی۔

رہا وہ صندوق تو اس میں تبدیلی نہ آئی تھی' سارے پر چاندی چڑھائی گئی تھی اور یہ دوسری آتشزدگی میں جل گیا تھا' انہوں نے چاندی سے سجا ہوا دیکھا چنانچہ اسی جگہ نیا صندوق رکھا اور جہاں اس پر ''قائم'' (ڈاٹ) تھا وہاں سنگ مرمر لگا جس پر بسم اللہ شریف' درود وسلام اور صحابہ وغیرہ کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہم لکھا تھا۔

رہا میخ کا معاملہ جو آپ کے چہرۂ انور کے سامنے تھی تو اس کے متعلق یہ گذر چکا کہ مغرب سے اس پہلو میں ابتداء سے پانچ ہاتھ کے فاصلے پر تھی' میں نے پیائش کی تو ہاتھ کا چھٹا حصہ پیائش کم نکلی' شاید یہ فرق ہاتھوں کے مختلف پیمانوں کی وجہ سے نکلا۔ اس ''مسمار'' (میخ) کی ابتداء بھی مجھے معلوم نہ ہو سکی' پہلے مؤرخین سے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ اس کے اوپر قندیل (روشنی کرنے کے لئے) رکھی جاتی تھی لیکن مطری نے لکھا: قندیل کے نیچے والی چیز جو حجرہ شریف کے سامنے سلام کرنے کی جگہ کے سامنے تھی' یہ مسجد شریف میں آتشزدگی سے پہلے تھی کیونکہ آپ کے چہرۂ انور کے سامنے صرف ایک قندیل ہوتی تھی اور جب تجدید ہوئی تو کئی قندیلیں وہاں رکھی گئیں' آج کل چہرۂ انور کے سامنے کھڑا ہونے کی جگہ کی علامت چاندی کی وہ میخ ہے جو سرخ پتھر میں لگی ہے۔ انتہیٰ یہی وہ جگہ ہے جس کے بارے میں آتشزدگی کے بعد علم حاصل ہوا نیز یہ وجہ بھی ہے کہ ابنِ جبیر نے اسے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے اور ابنِ جبیر' ابن نجار سے پہلے کے ہیں' انہوں نے حجرہ شریف کی تعریف کرتے ہوئے کہا: قبلہ کے پہلو میں حضور علیہ السلام کے چہرۂ انور کے سامنے چاندی کی میخ تھی لوگ اس کے سامنے کھڑے ہو کر سلام عرض کرتے۔ انتہیٰ۔

پھر ابن جوزی نے ''مثیر الغرام الساکن'' میں روایت کی کہ ابن ابو ملیکہ کہتے تھے جو حضور علیہ السلام کے چہرۂ انور کے سامنے کھڑا ہونا چاہتا ہے تو اسے قبرِ انور کے پاس قبلہ میں موجود قندیل کو اپنے سر پر رکھنا چاہئے اور پھر ابن جوزی نے کہا: اور وہاں قندیل کے بارے زیادہ معلوماتی چیز وہ میخ ہے جو حجرہ کی دیوار میں ہے کہ کھڑا ہونے والا جب اس کے مقابل ہوتا ہے تو قندیل اس کے سر پر ہوتی ہے۔ انتہیٰ۔

یحییٰ نے اپنی کتاب میں لکھا: ابن ابی ملیکہ کہتے تھے' جب تم قندیل کو اپنے سر پر رکھو گے اور دیوار میں موجود مرمر کو اپنے چہرہ کے سامنے لاؤ گے تو عین حضور علیہ السلام کے چہرۂ انور کے سامنے ہو گے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ میخ اسی مرمر میں تھی' اسی لئے ابن نجار نے کہا: آج کل وہاں ایک واضح علامت ہے جو چاندی کی ایک میخ ہے جو نبی کریم علیہ السلام کے حجرہ کی دیوار میں ہے' انسان جب اس کے سامنے آتا ہے تو قندیل اس کے سر پر آجاتی ہے اور انسان حضور علیہ السلام کے چہرۂ انور کے سامنے ہوتا ہے۔ انتہیٰ۔

ابنِ جماعہ سے پہلے میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ مناسک میں اس کا ذکر کیا ہو اور جو ابن صلاح کے مناسک

میں ہے' ذکر قندیل ہے جو احیاء سے لیا گیا ہے جسے زیارت کرنے والے کے سر کے برابر ہونا چاہئے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے نقل کیا' ان کی کلام سے یہ نکلتا ہے کہ وہاں کھڑے ہونے والے اور اس ستون کے درمیان (جو سر انور کے قریب غربی کنارے میں ہے اور جسے ستون صندوق کہتے ہیں) چار ہاتھ کا فاصلہ ہو تو یہ چیز میخ کے پتہ دینے میں زیادہ قریب آتی ہے اگرچہ انہوں نے واضح طور پر نہیں لکھا لیکن اقشہری کے لکھے سے میں نے لیا ہے کہ: مجھے امام عالم رضی الدین ابو احمد ابراہیم بن محمد بن ابوبکر (یہ مکہ میں مقامِ ابراہیم پر امام ہوتے تھے' ان کا وصال ۹ ربیع الاوّل ۷۲۲ھ میں ہوا) اور شیخ وزیر ابو عبداللہ محمد بن ابوبکر محمد بن عیسیٰ مومنانی' یہ دونوں کہتے تھے کہ ہمیں امام ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن بن صلاح سہروردی نے کہا: ''پھر مقدس ذات کی زیارت کرنے والا قبلہ کی طرف پیٹھ کرے اور اس میخ کے سامنے والی دیوار سے تین چار ہاتھ آگے آئے' جو حجرہ کی طرف سے قبلہ کی دیوار میں لگی ہوئی ہے۔''

یہ مضمون میں نے اقشہری کے ہاتھ کے لکھے سے نقل کیا ہے لیکن ابن اصلاح کے ہاں یہ نہیں ملا اور جو ابن عساکر نے اپنی ''تحفہ'' میں ابنِ صلاح کی طرف سے نقل کیا ہے (یہ ان کے شاگرد ہیں) وہ وہی ہے جو ہم پہلے بتا چکے۔ابن عساکر نے ابراہیم طبری کے ذریعہ ابن صلاح سے نقل کرتے ہوئے خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ ابن صلاح کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی تھی اور ابن صلاح کا دور پانے والے ابراہیم مذکور کے والد تھے جو رضی طبری کے نام سے مشہور تھے کیونکہ ان کے والد کی پیدائش ۶۳۳ھ میں ہوئی تو گویا ابن صلاح کے ساتھ دس سال کی سانجھ تھی تو پھر ابراہیم کا لڑکا ابن صلاح سے بلاواسطہ روایت کیسے کر سکتا ہے؟

علامہ اقشہری اپنی پہلی تحریر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ میخ ۷۲۰ھ میں گر گئی اور پھر رجب ۷۲۴ھ میں دوبارہ یہاں لگائی گئی۔

میں کہتا ہوں کہ میخ یہاں سے اس وقت اکھاڑی گئی جب حجرہ مبارکہ پر بوقتِ تعمیر مرمر لگایا گیا پھر بعینہٖ اپنی جگہ پر وہاں لگے ہوئے سرخ پتھر میں لگائی گئی' پھر دوسری آتشزدگی میں یہ اپنے مقام سے گر گئی تو اس کی جگہ ایک اور میخ لگا دی گئی اور اہلِ مدینہ میں سے کسی کو اس بارے میں اختلاف نہیں کہ یہ جگہ چہرۂ انور کے سامنے ہے اور جب حجرہ مبارکہ کے اندر سے مشاہدہ کیا جائے تو موقع پر یہی کچھ دکھائی دیتا ہے ہاں البتہ یحییٰ کے کلام میں میں نے دیکھا تو اس کے خلاف وہم پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ بتاتے ہیں کہ جو جگہ چہرۂ انور کے سامنے آتی ہے وہ تو نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور کی دیوار میں لگے درمیانی ستون کے درمیان ہے' اس جگہ اور ستون کے درمیان دو بالشت اور تین انگشت کا فاصلہ ہے اور حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے جس نے بھی اسے پایا ہے' وہ نبی کریم ﷺ پر سلام پیش کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اسی جگہ کے قریب کھڑے ہوتے' وہاں علامت تھی جس سے وہ قبرِ انور کا پتہ لگا لیتے اور جب سے میں جانتا ہوں وہ نشانی وہیں تھی اور جب مسجد تعمیر کرنے والے عمر نے خلیفہ متوکل کے دور میں قبرِ انور پر مرمر لگایا' تب یہ ختم ہوئی' اور کہا موسےٰ بن جعفر کہتے تھے کہ جو بھی اس مقام پر اپنا دایاں رخسار ایک طرف کو کر کے کھڑا ہو وہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کے سامنے

ہو گا اور حضرت علی بن حسین (زین العابدین) رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہیں کھڑے ہوا کرتے تھے۔انتٰی۔

میں کہتا ہوں کہ جس درمیانی ستون کی طرف انہوں نے اشارہ کیا وہ قبرِ انور کی دیوار سے قبلہ کے پہلو میں دکھائی دیتا ہے' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سلام پیش کرنے والا یہیں کھڑا ہوتا ہے' اس دیوار اور مذکور میخ کے درمیان تین ہاتھ یا اس سے زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر کہا ہے کہ جس جگہ کا انہوں نے ذکر کیا' اس کے اور مذکورہ ستون کے درمیان دو بالشت اور تین انگشت کا فاصلہ ہے لہٰذا یہ اس میخ سے دو ہاتھ دور ہو گا حالانکہ ہم نے حجرہ کے اندر سے اس ستون کا مشاہدہ کیا ہے' وہ اس کی انتہاء سے قریب ہے اور وہ یوں کہ جو وہاں دفن ہو اور اس کا چہرہ اس جگہ کے برابر ہو جس کا ذکر یحیٰی نے کیا ہے تو اس کے پاؤں حجرہ کی مشرقی دیوار میں ہوں گے جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفن کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے تو اس صورت میں یہ بہت بعید ہو گا کہ چہرۂ انور اس جگہ کے سامنے ہو' علاوہ ازیں جو انہوں نے موسیٰ بن جعفر سے نقل کیا ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس مذکورہ مقام پر کھڑے ہونے والے کا' چہرۂ انور کے سامنے آنا صرف اس صورت میں ہو گا جب وہ دایاں رخسار قبرِ انور کی دیوار کے ساتھ لگا کر ایک پہلو ادھر کر کے کھڑا ہو اور اس صورت میں ایک زیارت کرنے والا مغرب کی جانب متوجہ ہو تو اپنا مقصد پا سکتا ہے اور یہ اس لئے کہ قبلہ والی دیوار قدرے ٹیڑھی ہے جیسے گذشتہ تصویر میں ہم اس کا اشارہ کر چکے لہٰذا اس کا تقاضا یہ نہیں کہ بغیر چہرۂ پھیرے خود اس جگہ کی طرف متوجہ ہونے والا چہرۂ انور کے سامنے ہو جائے بلکہ چہرۂ انور کے سامنے کھڑا ہونے والا صرف اسی صورت میں چہرہ انور کی سمت میں ہو گا جب وہ مذکور میخ کے برابر ہو گا اور یحیٰی کے ذہن میں یہ ہے کہ زیارت کرنے والا مذکورہ شکل میں اپنا چہرہ قبرِ انور کے ساتھ لگائے تو میخ والی جگہ اس کے سامنے ہو گی چنانچہ اسی لئے انہوں نے اپنی گذشتہ تحریر کے بعد حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ذکر کیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مقصورہ شریف والی وہ جالی جو حجرہ کے گرد ہے کبھی اس میخ کو دیکھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے' ہاں دھیان ہو تو الگ بات ہے' اس سے زائر کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسرا اصرعہ (کواڑ) ہے جو مقصورہ کے قبلہ کی طرف والے دروازے سے شروع ہوتا ہے جو قبرِ انور کے سامنے دائیں طرف ہے چنانچہ جو اس نشان کے سامنے ہو گا وہ اس کے برابر ہو گا اور اس میخ پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے اور اس کا سرا گول ہے' تعمیر کے متولی نے ایک اور میخ بھی بنوائی جس کے سرے پر چاندی لگوائی تھی لیکن یہ قبلہ کی اس جانب تھی جو مغرب کی طرف صندوق کی جہت کے قریب تھی' اس میخ کا سرا قبہ کی طرح پہلو دار تھا لہٰذا یہ پہلی میخ سے نہیں ملتی پھر متولی نے دو اور میخیں بنوائیں جو پہلی میخ کے قریب ہی قبلہ کی جانب غربی پہلو کے ابتداء میں تھیں لیکن مجھے ان کے بنانے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی اور یہ تینوں میخیں دوسری آتشزدگی میں جل گئی تھیں۔

رہی وہ جگہ جو مقامِ جبریل کے نام سے معروف ہے اور ستونِ مربعۃ القبر کے قریب ہے تو پہلے آ چکا کہ وہاں میخ موجود تھی جو حجرہ سے مربعہ کی شمالی جانب مڑ کر تھی تو یہ مقام جبریل بتانے کے لئے علامت تھی تاہم اب ہم نے نہیں

دیکھی، میں نے مسجد کے خادموں اور پتھر لگانے والوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو یہاں کچھ دکھائی نہیں دیا اور اس جگہ کا نام مقامِ جبریل رکھنے وجہ مربعۃ القبر پر گفتگو کے موقع پر گذر چکی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نام اسے کیوں دیا گیا ہاں ابنِ جبیر نے حجرہ کی اس جگہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس پر پردہ لٹکایا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں جبریل علیہ السلام اُترا کرتے تھے لیکن ابن شبہ نے اپنی کتاب میں مقامِ جبریل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:
ابوغسان نے کہا کہ جس جگہ کو آج لوگ مقامِ جبریل کہتے ہیں، اس کی علامت یہ ہے کہ تم اس دروازے سے نکلو جو بابِ آلِ عثمان کہلاتا ہے تو نکلتے وقت تم اپنی داہنی طرف تین ہاتھ ایک بالشت کے فاصلے پر (جو زمین سے ایک ہاتھ ایک انگشت) ایک بڑا پتھر دیکھو گے جو مسجد کی دیوار میں لگے پتھر سے بڑا ہے، یہ اس جگہ کی علامت ہوگا۔

وہ کہتے ہیں، حضرت مالک بن انس کہتے تھے کہ اس مضمون کے بعد ابن شبہ کی کتاب میں اگلا مضمون موجود نہیں لہٰذا نہیں جانتا کہ وہ کیا تھا لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس مقامِ جبریل میں اختلاف ہوگا کہ کیا وہ ستون مربعہ کے نزدیک مسجد میں داخل ہوگا یا بابِ آلِ عثمان کے نزدیک خارج ہوگا، آج کل اسی کو بابِ جبریل کہتے ہیں اور شاید اسے باب جبریل کہنے کی وجہ یہی ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ سلطان محمد بن عبد اللہ بن سلیمان ربعی (ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کی اولاد میں سے تھے) کے عہد میں مجھے جنازہ کی جگہ سے خدشہ تھا چنانچہ سلطان کے حکم سے اسے بنا دیا گیا اور مقامِ جبریل کی علامت کے لئے اس میں پتھر لگایا گیا، اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش بنایا اور نشان قائم کیا تا کہ مقامِ جبریل کی پہچان ہو سکے جبکہ مقامِ جبریل، مسجد میں دائیں طرف ہے۔

جب یہ بات حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچی تو انہوں نے اس بارے میں روشنی ڈالی اور اسے انوکھا کام جانتے ہوئے ناپسندیدہ قرار دیا، پھر اس کی جگہ ایک لمبا سخت پتھر لگا دیا گیا جس میں کوئی علامت نہ تھی، یہ پتھر مسجد کے پتھروں کی مخالف جانب میں تھا۔انتہٰی۔

احتمال یہ ہے کہ ابن زبالہ نے اپنے اس قول: ''مقامِ جبریل مسجد کے اندر اس کی دائیں جانب'' سے گذشتہ پہلی جگہ مراد لی ہو جو حجرہ شریف کے اندر ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کے نزدیک دروازہ کو اپنی پہلی جگہ سے اسی کے سامنے آگے کر دیا گیا ہو جس کی وجہ سے مقامِ جبریل مسجد کے اندر ہو گیا ہو اور اس مقام کے سامنے ہو، پھر اس کی ترجیح کے لئے ظاہر ہے کہ مقامِ جبریل کے بارے میں اصل بات وہی ہے جو ہم بنو قریظہ سے غزوہ میں صاحب ''الاکتفاء'' سے بتا آئے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام اسی دن زرہ پہنے آئے اور جنازگاہ میں آ کر کھڑے ہو گئے، حضرت جبریل علیہ السلام کے چہرہ پر گرد و غبار کا اثر دکھائی دے رہا تھا۔اھ چنانچہ یہی وہ وجہ ہے جس کی بناء پر اسے مقامِ جبریل کہا گیا کیونکہ اس وقت جنازگاہ کے لئے دروازہ نہ تھا۔

بیہقی کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تھے ہم گھر

میں تھے کہ ایک شخص نے آ کر سلام کہا' حضور ﷺ صورت گھبراہٹ میں اُٹھ کھڑے ہوئے' میں بھی آپ کے پیچھے ہو لی' یکا یک حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سامنے آ گئے آپ نے فرمایا: یہ جبریل ہیں جو مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں بنو قریظہ کی طرف جاؤں۔ واللہ اعلم۔

حجرہ نبوی پر پردہ

رہا حجرہ مبارکہ پر پردہ تو اس کے بارے میں ابن نجار کہہ چکے ہیں: حجرہ مبارکہ اسی صورت میں رہا' آخر حسین بن ابو الھیجاء نے (جو مصری حکمرانوں کے وزیر تھے) سفید کپڑے کا پردہ بنایا' اس پر نقش و نگار بنوائے جس پر سفید اور زرد ریشم سے لکھائی کرائی اور اس پر سرخ ریشم کا پردہ چڑھایا گیا' اس پر مکمل سورۂ یٰسین لکھوائی۔

کہتے ہیں کہ اس پر اس نے قرضہ کی بہت سی رقم خرچ کر دی پھر اسے حجرہ مبارکہ پر لٹکانے کا ارادہ کیا تو امیر مدینہ قاسم بن مھنی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ خلیفہ مستضیء بامر اللہ کے اجازت کے بغیر نہ لگاؤ چنانچہ انہوں نے اسے لٹکانے کے لئے بغداد کو ایک شخص بھیجا' اجازت مل گئی چنانچہ دو سال تک اسے لٹکائے رکھا پھر خلیفہ کی طرف سے بنفشہ رنگ کا ریشم سے بنا پردہ آ گیا جس پر بیل بوٹے بنے تھے اور چوفیرے لکھائی کی ہوئی تھی: ابوبکر' عمر' عثمان اور علی پھر ایک کنارے پر امام مستضیء بامر اللہ کا نام لکھا تھا اور پھر اسے حضرت علی کی کوفہ میں شہادت گاہ پر اٹکا رہنے دیا گیا اور پھر اس کے بعد یہ پردہ لٹکایا گیا۔

جب امام ناصر الدین خلیفہ بنے تو انہوں نے سیاہ ریشم کا پردہ بنوایا' اس پر سفید ریشم سے بیل بوٹے بنوائے چنانچہ اسے اس پر لگا دیا گیا اور جب ان کی والدہ الجھۃ نے حج کیا اور واپس عراق آئیں تو انہوں نے بھی سیاہ ریشم کا پردہ تیار کیا جو پہلے پردے کی شکل کا تھا اور جب مکمل ہو گیا تو اسے اسی پردے کے اوپر لٹکا دیا گیا چنانچہ ہمارے اس دور میں حجرہ مبارکہ پر یکے بعد دیگرے تین پردے موجود ہیں۔ انتہٰی۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ابی الھیجاء وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خلیفہ المستضیء بامر اللہ کے دور میں حجرہ مقدسہ پر پردہ ڈالا تھا' ان کی خلافت کا دور ۵۶۶ھ ہے اور انتقال ۵۷۵ھ ہے جبکہ علامہ رزین کے کلام میں اس روایت کی مخالفت موجود ہے کیونکہ انہوں نے محمد بن اسماعیل سے نقل کرتے ہوئے اپنی کلام میں کہا تھا: جب امیر المؤمنین ہارون کا دور تھا تو میں بھی ان کے ساتھ خیزران کو گیا' انہوں نے مجھے مسجد نبوی اور قبرِ انور کو خوشبو لگانے کا حکم دیا اور ان پر پردہ ڈالنے کو کہا۔ انتہٰی۔

''عتبیہ'' میں میں نے دیکھا جو پردہ ڈالنے کی اصل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے' انہوں نے اول کتاب میں لکھا: مالک سے کہا گیا' تم نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ کی قبرِ انور کو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی چھت پر پردہ کیسے ڈالا جاتا ہے تو کہا گیا کہ اس پر کھردرا اونی کپڑا ڈالا جاتا ہے۔ اس نے کہا: مجھے اس اونی کپڑے سے تعجب نہیں' اسے دیکھنے کی

ضرورت ہے۔ انتہیٰ۔

ابن رشد نے اپنے بیان میں کہا کہ مالک نے رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور کی چھت کھولنے کو ناپسند کیا اور خیال کیا کہ اسے محفوظ کرنے کے لئے ڈھانپ دینا چاہئے اور یہ خیال نہ کیا کہ اسے کھردرے اونی کپڑے سے ڈھانپ دینا ہی کافی ہے، گویا انہوں نے سوچا کہ اسے گھروں کی طرح پردہ سے ڈھانپ دیا جائے۔ مجھے ایک بھروسہ والے شخص نے بتایا کہ آج کل مسجد کی چھت کے نیچے کوئی چھت نہیں ہے۔ انتہیٰ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ملائی جا سکتی ہے کہ کعبہ پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں کعبہ کی تعظیم پائی جاتی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کا تو ہمیں حکم ملا ہوا ہے اور آپ کی قبر کی تعظیم بھی تو آپ ہی کی تعظیم ہے۔ یہ دلیل جوازِ تعظیم کے لئے اس سے زیادہ اہم ہے جو علامہ سبکی نے سونے کی قندیلیں بنانے کے بیان میں دی ہے کیونکہ وہاں ان کی دلیل بھی یہی ہے جبکہ یحییٰ اور ابن زبالہ حجرہ مبارکہ پر پردہ ڈالنے کی بحث میں نہیں پڑے اور شاید اس لئے کہ یہ معاملہ ان دونوں کے بعد شروع ہوا باوجودیکہ ابن زبالہ نے منبر شریف پر پردہ ڈالنے کا ذکر تو کیا ہے اور دروازوں پر پردہ ڈالنے کی بات بھی کی ہے اور یہ نقل کیا ہے کہ خانہ کعبہ کا غلاف اور پردہ مکہ لے جانے سے پہلے مدینہ میں لایا جاتا تھا اور مسجد کے اخیر میں اسے پھیلا دیا جاتا تھا اور پھر اسے مکہ کو لے جایا جاتا لیکن حجرہ انور کے غلاف کی بات نہیں کی۔

اس کے بعد انہوں نے حجرہ مبارکہ اور مسجد کو خوشبو لگانے کا ذکر کیا چنانچہ کہا: "امیر المؤمنین مدینہ موسیٰ کی والدہ ۱۷۰ھ میں خیزران آئیں تو انہوں نے حکم دیا چنانچہ مسجد کو خوشبو لگائی گئی۔ خوشبو لگانے کا کام اس کی لونڈی مونسہ کی نگرانی میں ہوا، اس پر ابراہیم بن فضل بن عبید اللہ بن سلیمان (ہشام بن اسماعیل کا غلام) نے اسے کہا: کیا تم لوگ بعد والوں سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہو اور ایسا کام کرتے ہو جو پہلے لوگوں نے نہیں کیا؟ مونسہ نے پوچھا، وہ کونسا کام ہے؟ اس نے کہا: تمہیں ساری قبر پر خوشبو لگانی چاہیے چنانچہ انہوں نے یونہی کیا جبکہ اس سے پہلے اس کے دو تہائی یا اس سے بھی کم پر لگائی جاتی تھی پھر اس نے اشارہ کیا تو انہوں نے ستونِ توبہ اور اس ستون پر بھی لگائی جو مصلّائے نبی ﷺ کے نزدیک بطور علامت موجود ہے چنانچہ انہوں نے دونوں کو خوشبو لگا دی اور نیچے تک لے گئے۔ انتہیٰ اور اگر اس دور میں حجرہ پر خوشبو لگانے کا وجود ہوتا تو اس کا بیان بھی کرتے۔

یہ بھی یاد رہے کہ سلطان صالح اسماعیل بن ملک ناصر محمد بن قلاون نے ۷۶۰ھ کی دھائی میں مسلمانوں کے بیت المال کی رقم سے مصر میں ایک گاؤں خریدا اور اسے سالانہ خانہ کعبہ کے غلاف تیار کرنے کے لئے مقرر کیا، علاوہ ازیں حجرہ مبارکہ اور منبر شریف پر ہر پانچ سال بعد ایک مرتبہ غلاف ڈالنے کو کہا تھا۔ اسے علامہ زین مراغی نے بھی ذکر کیا ہے البتہ حجرہ مقدسہ کے غلاف کے بارے میں اس نے ہر چھ سال بعد ایک مرتبہ ڈالنے کا ذکر کیا ہے، اسے سیاہ ریشم سے تیار کیا جاتا اور سفید ریشم سے اس پر لکھائی کی جاتی، اس پر سونے چاندی سے بیل بوٹے بنائے جاتے جو گردا گرد ہوتے لیکن منبر کے غلاف پر سفید ٹکڑے لگائے جاتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مدت جو انہوں نے حجرہ کے متعلق بتاتی ہے' لگتا ہے کہ اس پر عمل ان دونوں کے دور میں ہوتا رہا ہوگا لیکن ہمارے اس دور میں تو دس سال کے لگ بھگ کا عرصہ گذرنے کے باوجود بھی اس پر عمل نہیں ہو سکا ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جب بھی کوئی مصر کا والی بنا ہے' وہ غلاف بھیجنے کا اہتمام ضرور کرتا ہے۔

حافظ ابن حجر غلاف کعبہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہی سلطان صالح وہ شخص ہے جس نے ایک شہر سندبیس کا ایک حصہ خریدا تھا' اس کا دو تہائی بیت المال کے وکیل کے ذریعہ خریدا اور اسی مقصد کے لئے وقف کر دیا لیکن حجرہ مقدسہ کا غلاف تیار نہیں کرتا تھا اور شاید دو تہائی کے علاوہ ایک تہائی (جس کا ذکر نہیں کیا) حجرہ مبارکہ کے غلاف سے متعلق رکھتا ہو جیسے ہم پہلے ذکر کر چکے اور یہ احتمال بھی ہے کہ غلاف بادشاہوں کی طرف سے آتے ہوں' وقف والے مال سے نہ آتے ہوں پھر ان کی عادت یہ تھی کہ جب بھی نیا غلاف آ جاتا تو خادموں کے نگران' اُترا ہوا غلاف ان خادموں میں تقسیم کر دیتے اور کچھ دوسرے لوگوں کو دیتے' اس کی ایک جانب سلطانِ مصر کے ہاں بھیج دی جاتی اور حجرہ مبارکہ کے غلاف کو بیچنے کا مسئلہ اسی طرح ہے جیسے غلاف کعبہ کا اور قدیم سے اس میں علماء کا اختلاف چلا آیا ہے۔اس مسئلہ میں ہمارے سامنے دونوں طرف کے دلائل موجود ہیں۔

حافظ صلاح الدین خلیل علائی کہتے ہیں کہ اب اسے فروخت کرنے میں کوئی شعبہ نہیں رہا کیونکہ غلاف سے بھی مقدم سامان کو امام کا وقف کر دینا اس عبارت کے بعد اور علم ہونے پر ثابت ہو چکا ہے لہٰذا اسے واقف (وقف کرنے والا) قرار دیا جائے گا۔انتھی۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۵

حجرہ مبارکہ وغیرہ کے اردگرد سونے اور چاندی کی قندیلیں لٹکانا

آپ کے علم میں ہونا چاہئے کہ میں نے کسی کے کلام میں نہیں دیکھا کہ اس کام کی ابتداء کب ہوئی تھی البتہ ابن نجار نے لکھا ہے: قبلہ اور حجرہ کے درمیان زائرین کے سروں پر مسجد کی چھت میں' جہاں وہ ٹھہرتے ہیں' چالیس سے زیادہ بڑی چھوٹی قندیلیں لٹکی ہوتی ہیں جن میں چاندی کی کچھ تو نقش و نگار والی ہیں اور کچھ سادہ' دو ان میں سے شیشے کی ہیں' ایک سونے کی ہے اور ان میں ایک چاندی کا چاند بھی ہے' جس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے۔یہ بادشاہوں اور رعب والے امیر لوگوں کی طرف سے بھیجی گئی ہوتی ہیں۔انتھی۔

میں کہتا ہوں کہ سونے اور چاندی کی قندیلیں بھیجنے کا یہ سلسلہ بادشاہوں اور رعب والے صاحب حیثیت لوگوں کی طرف ہمارے اس دور میں بھی یونہی جاری ہے۔

میں نے شیخ علامہ ناصر الدین العثمانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کچھ چیزیں دیکھی ہیں جنہیں انہوں نے قاضی طیبۃ الزین عبد الرحمٰن بن صالح کے لکھے سے نقل کیا جس میں ان کا چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر سال آتی تھیں چنانچہ ایک سال میں پندرہ قندیلوں کا ذکر کیا' ایک میں تیرہ کا اور ایک میں اکیس قندیلیں لائے جانے کا ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے اس دور میں آنے والی قندیلیں سالانہ اکثر بیس سے زیادہ آیا کرتی ہیں اور کوئی پکی تعداد نہیں بتائی جا سکتی کیونکہ یہ مختلف لوگوں کی طرف سے بطور نذرانہ پیش کی جاتی ہیں اور گویا یہاں جب زیادہ لگ جاتی ہیں تو ان میں سے کچھ مسجد کے اندر دوسرے حصوں میں لگا دی جاتی ہیں چنانچہ وہاں بہت سی جمع ہو جاتی ہیں۔حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ ۸۱۱ھ میں سلطان ناصر نے حسن بن عجلان کو سلطنت حجاز کے لئے روانہ کیا کہ اس دوران ثابت بن نفیر کی موت واقع ہوگئی' جس نے اس کی جگہ اپنے بھائی عجلان بن نفیر منصوری کو مقرر کر دیا۔ان پر جماز بن ھبہ بن جماز جمازی نے حملہ کر دیا' یہ امیر مدینہ تھا' اس نے خدام کو بلا بھیجا لیکن انہوں نے اس کے پاس آنے سے انکار کر دیا' وہ مسجد شریف میں داخل ہوا اور حجرہ مبارکہ کے غلاف کو پکڑ لیا اور خدامِ مسجد سے نو ہزار درہم اس شرط پر مانگا کہ وہ حرم کا مال نہیں لے گا لیکن وہ رُک گئے۔اس نے ان کے نگران کو مارا اور مسجد کا سامان رکھنے کی جگہ کا تالا توڑ ڈالا۔

جو کچھ میں نے دیکھا ہے ایک دستاویز تھی جس پر مدینہ شریف کے چیدہ چیدہ لوگوں کے دستخط تھے جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ جماز بن ھبہ امیر مدینہ تھا چنانچہ ثابت بن نفیر کو مدینہ کے امیر بنانے کی دستاویز دکھائی دی اور ان کی نظر تمام حجاز کے لئے حسن بن عجلان پر تھی (کہ اسے حاکم بنایا جائے) اس پر جماز بن ھبہ مخالفت اور سرکشی کا اظہار کر دیا اور فسادیوں کا ایک گروہ اکٹھا کر کے اہل مدینہ کے کچھ گھر برباد کر دیئے پھر کافی لوگوں کو لے کر مسجد میں آیا اور وہاں موجود قاضیوں' مشائخ اور خادموں کے نگران کی ہاتھوں اور زبان سے توہین کی' ان پر تلوار چلائی اور سامان والے مکان کا دروازہ توڑ دیا' وہاں سے سونے چاندی کی وہ قندیلیں لوٹ لیں جو دنیا بھر سے صرف رضاء خدا و رسول کے لئے لوگوں نے کئی سال سے بھیج رکھی تھیں' بہت سی نفیس اشیاء' انگوٹھیاں' چراغوں میں ڈالا جانے والا تیل' تراویح میں استعمال ہونے والی شمعیں' کفن اور بے شمار درہم لوٹ لئے جن سے ایک وادی کو بھرا جا سکتا تھا پھر حجرہ مبارکہ کی طرف بڑھا' قبر انور کا غلاف اور اس کے گرد لگی قندیلیں اُتارنے کے لئے سیڑھی منگوائی لیکن اسے توفیق نہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا پھر خادموں کے کمروں سے حجرہ مبارکہ کے دروازوں کے پردے لے لئے' اسی دوران ایک دن اور رات کے لئے مسجد نبوی میں نہ تو اذان ہوئی' نہ اقامت کہی گئی اور نہ ہی جماعت ہو سکی۔اس نے اپنے ساتھیوں اور قریبی لوگوں کو حکم دیا کہ لوگوں کے گھر لوٹ لیں' خوبصورت اونٹنیاں پکڑ لیں اور پھر اس کے بعد وہاں سے بھاگ گیا۔

جب حسن بن عجلان کو حجاز پر حکومت کا حکم موصول ہوا تو اس نفیر کے بیٹے عجلان کو بلایا اور اسے مدینہ کا امیر مقرر کر دیا اور سب سے پہلے اسے ان کے بھائی کی دستاویزات دکھائیں اور ان سے تعارف کرایا۔انتہیٰ۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس نے سامان والے کمرے (اسٹور) سے گیارہ خوشخان (برتن) مال

سے بھرے دو بڑے صندوق اور ایک چھوٹا صندوق' پانچ ہزار کپڑے کے ٹکڑے ٹوٹے' ایک اور خادم پر سختی کی اور اسے دور کر دیا گیا اتنے میں عجلان بن نغیر آئے' ان کے ہمراہ آل منصور بھی تھے چنانچہ امن کا اعلان کر دیا گیا پھر ان کے بعد احمد بن حسن بن عجلان آئے اور ان کے ساتھ ایک لشکر آیا' یہ لوگ مکہ سے آئے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے اپنے شیخ علامہ ناصر الدین مراغی کے قلم سے لکھی تحریر دیکھی جسے انہوں نے قاضی طیبۃ الزین عبدالرحمٰن بن صالح سے نقل کیا تھا' لکھا ہے کہ جو کچھ قبہ میں تھا اور جماز بن ھبہ نے اسے پکڑ لیا تھا' وہ چاندی کی قندیلیں تھیں جن کا وزن ۲۳ قنطار اور ایک تہائی قنطار تھا' یہ اس کے علاوہ تھا جو رفوف برتن میں تھا' دو سونے بھرے صندوق تھے پھر باقی چیزوں کی تفصیل لکھی جو یوں تھی۔خوشخانہ پر مہر تھی جسے کھولا نہیں گیا تھا' ظاہر ہے کہ اس میں سونا تھا' ان قندیلوں کا وزن جو رفوف (کپڑا) میں تھیں ایک تہائی قنطار کم چار قنطار تھا' صندوق میں نو قندیلیں تھیں جو سونے کی تھیں' علاوہ ازیں ایک بند صندوق تھا۔انتہٰی۔

ہمیں یہ اطلاع ملی کہ اس نے اس کا بہت سا حصہ دفن کر دیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے پکڑ لیا چنانچہ وہ قتل ہوا اور دیگر لوگ بھی قتل ہوئے جو مال دفن کرتے وقت اس کے ساتھ تھے اور آج تک اس جگہ کا پتہ نہ چل سکا۔

حافظ ابن حجر نے ۸۱۲ھ میں اس کے قتل کے بارے میں لکھا: کہ اسی سال جماز بن ھبہ بن جماز بن منصور حسینی بھی قتل ہوا تھا جو امیر مدینہ تھا' اس نے مدینہ کا جمع شدہ مال پکڑا اور وہاں سے دور لے گیا۔ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ وہ دشمنوں سے جنگ میں قتل ہو گیا۔انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ اسے ایک عرب نے رات کو ہلاک کر دیا تھا۔

میں نے ''قائمہ'' میں دیکھا جس کا ذکر گذرا جس میں یوں لکھا ہے: حجرے میں رکھی سونے کی قندیلوں کا وزن نو قنطار تھا پھر اس کے بعد سلطان کی والدہ کی طرف سے ایک قندیل آئی جس کا وزن ایک ہزار مثقال تھا پھر سلطان کی ہمشیرہ کی طرف سے بھی ایک قندیل آئی جس کا وزن پندرہ سو مثقال تھا علاوہ ازیں چار بڑی قندیلیں تھیں جن میں سے ایک میں چار چھوٹی تھیں' دوسری میں دو چھوٹی قندیلیں' تیسری میں کئی قندیلیں بند کی ہوئی تھیں اور چوتھی میں ایک قندیل تھی' ان سب کا وزن تین ہزار سات سو بیس مثقال تھا۔

ظاہر یہ ہے کہ ان کے قول: ''من قنادیل الذھب'' کے بعد ''و الفضّة'' کا لفظ رہ گیا ہے اور اس ''قائمہ'' میں بھی چاندی کی قندیلیں ایک سو سترہ رطل تھیں جسے بیق نے اپنے ہاتھ سے رکھا تھا۔انتہٰی۔

پھر امیر غریر بن ھیازع بن ھبہ حسینی جمازی نے اس سٹور سے ۸۲۴ھ میں کچھ حصہ اس گمان پر لیا کہ قرضہ لے رہا ہے جس کی وجہ سے مدینہ کے ایک قاضی آزمائش میں پھنس گئے پھر اس عزیز کو حفاظت سے قاہرہ میں لے جایا گیا اور وہ قیدی میں مر گیا۔

یہ قندیلیں بڑھتی چلی گئیں اور ۲۷ ذی الحجہ ۸۶۰ھ رات کو برغوث بن بتیر بن جریس حسینی نے ان پر ڈاکہ ڈالا

اور مشہور مقام ''دار الشباک'' میں رات کو داخل ہو گیا' یہ باب الرحمہ کی ایک جانب تھا' وہاں رہائشی کوئی نہ تھا' وہ مسجد کی دیوار پر چڑھ گیا اور مسجد شریف میں موجود باری میں سے مسجد کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے چل کر اس جگہ پہنچا جو حجرہ مبارکہ کی چھت کے برابر تھا اور بہت سی قندیلیں اتار لیں' شائد اس نے کئی مرتبہ میں یہ اکٹھی کی تھیں' مسجد میں موجود کسی شخص کو پتہ چل سکا اور نہ ہی نگران معلوم کر سکے البتہ قریبی گھر کی ایک لڑکی نے گھر کی چھت سے دو شخص دیکھے جو ''دار الشباک'' کے اوپر کی طرف کوئی بڑی وزنی چیز اُٹھائے جا رہے تھے اور اس کی آواز آ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو اس نے مسجد کے دربان کو اطلاع دی لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی کیونکہ وہاں کوئی تھا ہی نہیں اور پھر یہ کسی کی عقل وفکر میں بھی نہیں آیا لیکن اللہ کے ارادے میں اسے ذلیل کرنا لکھا جا چکا تھا اور اللہ اس پر ناراض ہو چکا تھا چنانچہ کسی شخص نے امیر مدینہ کو اطلاع کر دی کہ اس شخص کے پاس بہت سا مال ہے اور اسے کوئی نہیں جانتا چنانچہ پکڑ کر امیر نے اسے اپنے پاس روک لیا اور پھر قید کر دیا چنانچہ رات ہوئی تو وہ نکل گیا پھر مدینہ میں سونے چاندی کی کھڑکیوں کی فروخت کا چرچا ہو گیا جس پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

پھر ربیع الاوّل ۷۶۱ھ کو پتہ چلا کہ برغوث ینبع میں ہے اور اس کے پاس سونے کی قندیلوں کے بہت سے ٹکڑے ہیں۔ نگرانوں نے حجرہ کی تلاشی لی' انہیں معلوم ہوا کہ بہت سی قندیلیں چوری ہو چکی ہیں' اب انہیں صورتِ حال کا علم ہوا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ سراج نفطی کی بیٹی پر الزام لگا کہ اس نے برغوث کی مدد کی ہے اور وہ اس کے باپ کے گھر سے وہاں داخل ہوا کیونکہ وہ قبلہ کی طرف مسجد کے قریب تھا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو اس جرم سے بری کر دیا۔ اس وقت مدینہ میں زین الدین موجود تھا' اس نے وہاں ایک مجلس لگائی' مدینہ کے نامور لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے ینبع کے امیر کو لکھا کہ برغوث کو پکڑ لے اور ہمارے پاس بھیج دے چنانچہ اس نے اسے قبضہ میں لے لیا جس پر اس نے یہ بات مان لی کہ یہ چوری اسی نے کی ہے اور دبوس بن سعد حسینی اس کے ہمراہ تھا اور یہ بھی بتایا کہ وہ مذکورہ عورت کے گھر سے داخل ہوا تھا اور ایک خادم نے اس کی مدد کی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حق ظاہر فرمایا کہ وہ ''دار الشباک'' سے داخل ہوا تھا اور دبوس نامی شخص اس کا مددگار اور اس کام میں شریک تھا۔

امیر ینبع نے اسے مدینہ بھیجنا ضروری نہ سمجھا بلکہ شاہی حکم کی انتظار میں اسے اپنے پاس چھوڑے رکھا۔ اس کے بعد امیر مدینہ نے دبوس اور اس کے قریبی کچھ لوگوں کو روک لیا۔ اس نے اس بات کو پسند نہ کیا لیکن اس کے کچھ ساتھیوں نے چوری مان لی اور کچھ سونا چاندی سامنے لا رکھا۔ اس کے بعد برغوث ینبع کی قید سے بھاگ گیا لیکن اللہ نے اس کا رُخ مدینہ کی طرف کر دیا چنانچہ وہ وہاں پہنچا تو امیر کو اطلاع دی گئی' اس نے اسے روک لیا پھر دبوس اور ساتھیوں سمیت اسے قید کر دیا لیکن وہ بھاگ گئے پھر اللہ تعالیٰ نے دبوس کے علاوہ دوسروں کو گرفتار کرا دیا چنانچہ ایسی جرأت کرنے والے کے قتل کا موقع آ پہنچا اور امیرِ مدینہ نے برغوث اور اس کے ساتھی رکاب کو قتل کر دیا پھر دبوس کو گرفتار کر لیا اور اسے بھی قتل کر دیا۔

مجھے برغوث کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے کہا تھا: میں بھاگا تو جب بھی میں مدینہ کے علاوہ کسی اور جانب کا رُخ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی مجھے روک رہا ہے اور جب مدینہ کی طرف رُخ کرتا تو کوئی رکاوٹ نہ ہوتی اور یوں لگتا جیسے کوئی مجھے پیچھے سے ہانکے جا رہا ہے اور آخر میں یہاں آ پہنچا۔

رہا ہمارے اس دور میں حجرہ مبارکہ کے اردگرد قندیلوں کی تعداد تو ۸۸۱ھ کی ابتداء میں سلطان اشرف کے شیخ الحرم الامیر اینال اور قاضیوں کو حکم دینے پر حساب و کتاب لگایا گیا تو پتہ چلا کہ سونے کی جتنی چیزیں لٹک رہی تھیں' ان میں اٹھارہ قندیلیں تھیں' قندیل کا کچھ حصہ تھا' چار مشکیزرے' دو پیالے اور دو کنگن تھے' ان سب کا وزن سات ہزار چھ سو پینتیس قفلہ تھا' ان میں ایک بڑی قندیل تھی جو چہرۂ انور کی جہت میں تھی جس کا وزن چار ہزار چھ سو قفلہ تھا' یہ سلطان کلرجہ شہاب الدین احمد نے بطور ہدیہ دی تھی' علاوہ ازیں کئی چاندی کی چیزیں لٹک رہی تھیں' ان میں تین سو چوالیس قندیلیں تھیں' بہت سا اور بھی سامان تھا جس کا وزن چھیالیس ہزار چار سو پینتیس قفلہ تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے ۸۶۲ھ میں بھی امیر بردبک تاجی کے ہاتھوں اندازہ لگایا گیا تھا' ان دونوں مقداروں کو سامنے رکھنے پر پتہ چلا کہ جو حساب پہلی تاریخ میں لگایا گیا تھا' اس میں سونا ایک ہزار ایک سو پچاس قفلہ زیادہ تھا اور چاندی تیرہ ہزار سات سو پچاسی قفلہ زیادہ تھی' یہ زیادتی سال ۶۳ھ سے ۷۹ھ کے آخر تک میں تھی۔

وہاں اور بھی لٹکنے والی چیزیں تھیں جو ان گذشتہ چیزوں کے علاوہ تھیں' چاندی کے تابوت میں شیشے کی قندیل تھی' چار تانبے کی قندیلیں تھیں' ایک فولاد کی تھی جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا کہ الناصر محمد بن قلاوون نے اسے اس سال اپنے ہاتھ سے لگایا جب حج کیا تھا پھر ۸۰ھ کو شیخ انیال کے دور میں کچھ سامان آیا جو پہلے سامان میں شامل نہیں تھا یہ سونے کی قندیلیں تھیں جن کا وزن ایک سو پچیس قفلہ تھا اور چاندی کی بتیس قندیلیں تھیں جن کا وزن بارہ سو پچھتر قفلہ تھا' پھر ۸۱ھ میں سونے کی قندیل آئی جس کا وزن ایک سو بیالیس قفلہ تھا' علاوہ ازیں چوبیس چاندی کی قندیلیں تھیں جن کا وزن نو سو پچاس قفلہ تھا۔ پھر سال ۸۲ھ میں اکتیس قندیلیں آئیں جن کا وزن ایک ہزار پچپن قفلہ تھا لیکن سونے کی کوئی چیز نہ آئی۔ سال ۸۳ھ میں سونے کی صرف ایک قندیل آئی جس کا وزن بیس قفلہ تھا' چاندی کی پچیس قندیلیں تھیں جن کا وزن گیارہ سو پینتیس قفلہ تھا' سال ۸۴ھ میں چاندی کی انیس قندیلیں تھیں جن کا وزن سات سو پینتالیس قفلہ تھا' اس سال سونے کی کوئی چیز نہیں آئی چنانچہ امیر انیال کے دور میں جو کل سامان آیا وہ سونے کی کل چار قندیلیں تھیں جن کا وزن دو سو ستاسی قفلہ تھا اور چاندی کی ایک سو انتیس قندیلیں تھیں جن کا وزن پانچ ہزار چھ سو پچپن قفلہ تھا اور جب انہوں نے ۸۸۱ھ میں حجرہ شریفہ کی تعمیر شروع کی تو تمام وہ لٹکی ہوئی چیزیں اُتار لیں جو اس کے گردا گرد لٹک رہی تھیں اور اس قبہ میں رکھ دی گئیں جو مسجد کے صحن میں تھا کیونکہ تعمیر کے متولی جناب شمسی کا حکم تھا اور پھر اپنی مقرر تاریخ تک وہیں رہیں اور آج حجرہ مبارکہ کے گرد ۸۱ھ سے ۸۴ھ کے آخر تک نئی چیز آنے کے علاوہ کوئی بھی چیز لٹک نہیں رہی پھر تعمیر کے متولی نے سلطان کے لئے مسجد اور مدینہ شریف کی اصلاح کی چنانچہ کچھ سامان دوسری آتشزدگی

سے پہلے مصر پہنچا دیا پھر آتشزدگی کی وجہ سے جلی ہوئی قندیلیں دیکھیں جو گر گئی تھیں پھر متولی نے ان میں سے کچھ چھت کو سنہرا کرنے کے لئے خرچ کیں جو نئے سرے سے بنائی گئی تھی۔ پھر اسی قبہ کے پاس اخراجات کے لئے انتظام کیا گیا تو تیرہ ہزار دینار جمع ہو گئے۔

اتفاقاً امیر مدینہ حسن بن زبیری منصوری اسلحہ اور ننگی تلواریں لئے بہت سے لوگ لے کر آیا اور اسی حالت میں مسجد کے اندر چلا گیا' یہ واقعہ ۶ ربیع الاوّل ۹۰۱ھ کو بوقتِ ظہر رونما ہوا اور حرم شریف کے خزانہ دار کو سٹور کی چابیاں لانے کے لئے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اس نے اسے خوب مارا پھر خود سٹور کے دروازے پر پہنچا' ہتھوڑا منگوایا اور تالا توڑ کر اس میں سے نقدی' قندیلیں اور چاندی کا سارا سامان باہر نکال لیا پھر اس کی تین گانٹھیں باندھیں پھر دو گھوڑوں اور ایک خچر لادا نیز سامان سے بھرے تھیلے بوجھ اُٹھانے والوں کی پیٹھیوں پر لاد دئے اور اپنے قلعہ کی طرف چلا گیا اور ڈھلائی کرنے والے کو بلایا اور ان قندیلوں کو ڈھال دینے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ کام اس نے مدینہ کی امارت سے توجہ ہٹا کر کیا تھا کیونکہ وہ سید شریف محمد بن برکات کا نائب تھا جسے سلطان اشرف نے حجاز کے معاملات پر مقرر کر رکھا تھا' وہ اپنا حصہ اس سے لیتا تھا جو اس کے پاس ٹیکس اور صدقات وغیرہ آتے تھے' اہلِ مصر نے کچھ ٹیکس اسے دینے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے حملہ کر دیا تھا۔

مسجد نبوی میں لٹکنے والی چیزوں کا حکم

رہا مسجد نبوی میں لٹکی ہوئی چیزوں وغیرہ کا حکم جیسے صندوق وغیرہ تو وہ یونہی ہے جیسے خانہ کعبہ میں لٹکی چیزوں اور ان کے زیور بنانے کا حکم ہے۔ علامہ سبکی نے کعبہ کی قندیلوں اور ان کے زیور بنانے پھر ان قندیلوں کے بارے میں جو حجرہ شریفہ کے گرد ہیں' گفتگو کی ہے اور اس بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''تنزیل السکینہ علی قنادیل المدینہ'' ہے۔ انہوں نے بخاری کی حدیث ذکر کی ہے جس کے اندر کعبہ میں لگے سونا چاندی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے اسے اپنے مقام پر برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے' پھر حضرت ابوبکر نے بھی یہی حکم دیا اور پھر حضرت عمر نے اسی کی طرف رجوع کیا تھا جیسے ابن شبہ نے لکھا ہے' حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ یہ دو وہ شخص ہیں جن کی میں پیروی کروں گا۔ کہتے ہیں کہ یہ حدیث کعبہ کے مال' یہاں بھیجے والے تحفے تحائف' جو نذریں بھیجی جاتی ہیں اور مال جیسا بھی ہوتا ہے' کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔

ابن بطال کہتے ہیں' حضرت عمر کا ارادہ یہ تھا کہ اس مال کو مسلمانوں کے نفع کے لئے استعمال کر لیا جائے اور پھر جب انہیں پتہ چلا کہ حضور ﷺ نے اس سے پہلو تہی فرمائی ہے تو آپ رُک گئے اور واللہ اعلم شاید آپ نے اسے خرچ کرنا اس لئے چھوڑا تھا کہ جو کچھ کعبہ میں لگایا گیا یا فی سبیل اللہ یہاں بھیجا گیا' یہ وقف مال ہوتا ہے لہٰذا اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی' اسے باقی رکھنے میں اسلام کی تعظیم ہے اور دشمن کے لئے خوف کا عنصر ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں، اس کے پیچھے ابن حجر نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ترک کا مقصد قریش کو تسلی دینا تھا جیسے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر کعبہ کی بنیاد ترک کی تھی۔ اس کی تائید مسلم شریف کی سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت شدہ اس حدیث قدسی سے ہوتی ہے کہ: اگر آپ کی قوم کفر سے ابھی ابھی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں کعبہ کے خزانے راہِ خدا میں خرچ کرتا اور اس کا دروازہ سونے کا بنا دیتا۔ الحدیث۔ چنانچہ یہ دلیل قابلِ بھروسہ ہے۔

میں کہتا ہوں، کہا یہ جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس سبب کی بناء پر یہ مال خرچ کرنا ترک کر دیا، اسی سبب کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے بھی ترک کیا پھر حضرت عمر نے پہلے تو ارادہ کیا کہ اسے خرچ کر دوں لیکن پھر رُک گئے پھر اس کے بعد بھی اسے ترک کیا جاتا رہا تو یہ اس کے ترک پر گویا اجماع ہو گیا لہٰذا ہمیں اس پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ واللہ اعلم۔

علامہ سبکی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، اس بات میں غلطی کھانا نہیں چاہئے کہ اسے حرم کے فقراء میں خرچ کیا جائے کیونکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب حرم یا مکہ کو ہدیہ دیا جائے اور جب خود کعبہ کے لئے ہدیہ آئے تو اسے اسی پر خرچ کیا جائے جیسے اس کی تعمیر میں خرچ کرے اور پھر ایسے وقت میں دیکھا جائے گا کہ اگر ایسے مال اسی مقصد کے لئے رکھے گئے ہیں تو اسی میں خرچ ہوں گے اور اگر ایسا نہیں تو پھر جس مقصد کے لئے آئے ہیں جس کے لئے رکھے گئے تھے مثلاً بخور جلانے کے لئے آئی چیز، پردے میں خرچ نہ ہو سکے گی۔

رہی اس میں لگی قندیلیں اور پتھر تو اس میں سے ان پر خرچ نہ ہو سکے گا بلکہ یہ اپنے حال پر رہیں گی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول: ''میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اس میں سونا اور چاندی کی چیزیں نہیں رہنے دوں گا۔'' اس میں دو صورتیں ہیں تو اس سلسلے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس وقت اس کی صورت کیا تھی اور جو یہ کہتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے بیت پر سونے کا کام ولید نے کیا تھا تو یہ اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ دور جاہلیت میں سونا استعمال کیا گیا ہو جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور تک رہا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ تقی فاسی نے لکھا ہے: ''اسی سال (۶۵ھ کو) ابن زبیر نے کعبہ کی تعمیر کرنے کو کہا۔'' اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے سکہ پگھلا کر بنایا جس میں ورس کا استعمال کیا جبکہ کعبہ پر اور اس کے ستونوں پر سونے کا استعمال کیا اور چابیاں بھی ایسی ہی بنائیں اھ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ سب سے بہتر دلیل ہے۔

پھر علامہ سبکی نے رافعی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: کعبہ پر سونے چاندی کا استعمال جائز نہیں اور نہ ہی اس کی قندیلیں لٹکانا جائز ہے۔

پھر آپ نقل کرتے ہیں کہ کعبہ اور مسجد پر سونے چاندی کا استعمال اور اس کی قندیلیں لٹکانا، تو اس میں دو صورتیں ہیں جو ''الحاوی'' وغیرہ میں لکھی ہیں، ایک یہ کہ یہ جائز ہے کیونکہ اس میں ان کی تعظیم پائی جاتی ہے جیسے قرآن

کریم اور جیسے کعبے پر ریشم کا غلاف چڑھایا جاتا ہے لیکن ان میں سے زیادہ واضح بات اس سے رُک جانا ہے کیونکہ پہلے بزرگوں سے اس سلسلے میں کوئی چیز ثابت نہیں۔

پھر علامہ رافعی کے کلام پر اعتراض کیا اور کہا: کعبہ اور مسجد کو ایک جیسا کہنا مناسب نہیں کیونکہ جو تعظیم کعبہ کی کی جاتی ہے، وہ دوسری مسجدوں کی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس پر ریشم کا غلاف چڑھانا بالاتفاق جائز ہے لیکن مسجدوں کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اس میں اختلاف کا بیان مشکل ہے اور منع کرنے کو ترجیح دینا اس سے بھی مشکل ہے اور ایسا کیوں ممکن ہے جبکہ اس اُمت کے ابتدائی دور میں یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ دیکھئے ولید کے دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ تعمیر مسجد کے نگران بنے اور بغیر رجوع کے مسجد کی چھت پر سونے کا کام کیا بلکہ بعد میں آپ خلیفہ بن گئے اور انہوں نے جامع مسجد بنو امیہ میں سے سونا اتارنے کا ارادہ کیا تو آپ سے کہا گیا تھا کہ اس سے تو کھر چنے کی قیمت بھی وصول نہ ہو سکے گی چنانچہ آپ نے اسی طرح رہنے دیا جبکہ کعبہ پر لگی چیزوں سے تو بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اگر یہ فعل حرام ہوتا تو آپ اسے اپنی خلافت ہی کے دور میں اُتار دیتے اور جب آپ نے اسے جوں کا توں رہنے دیا حالانکہ ہر سال حج کرنے والے لوگ آپ کے ساتھ بھی تھے تو یہ بات یقینی ہو گئی کہ ان کا استعمال جائز ہے۔ یہ بات کعبہ کے غلاف وغیرہ پر سونے کا کام کرنے کے بارے میں ہے اور سونے کا پانی چڑھانے کے بارے میں اختلاف ہونا منع نہیں کیونکہ اس میں مال ضائع ہو جاتا ہے اور باقی مسجدوں میں بھی سونے کا پانی چڑھانے اور سونے کے استعمال میں اختلاف کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں قاضی حسین رحمہ اللہ نے مسجد میں سونے وغیرہ کی قندیلیں لگا کر زیب و زینت دینا حلال قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس (سونے لگانے) کا حکم اس زیور جیسا ہے جس کا استعمال جائز اور مباح ہے اور یہ بات رافعی کے قول سے زیادہ واضح ہے کیونکہ ان دونوں کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں، اس کا استعمال تو صرف مردوں کے لئے حرام ہے یونہی اس کا کھانا پینا وغیرہ حرام ہے جبکہ مسجدوں میں قندیلیں وغیرہ لگانے میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ ہر مسجد میں یہ بات قربِ الٰہی (عبادت) کی نیت سے کی جاتی ہو گی۔

باقی رہی علامہ رافعی کی یہ بات کہ سلف صالحین سے اس سجاوٹ کا ثبوت نہیں ملتا، عجیب و غریب ہے کیونکہ اتنا کہہ دینے سے یہ حرام نہیں ہو جاتی اور جس نے سونے چاندی کے برتن بنانے کو حرام لکھا ہے (اور ہے بھی صحیح) تو وہ اس لئے کہ نفس انسانی حرام چیزوں کے استعمال کی خواہش رکھا کرتا ہے اور اس کا یہی حکم ہے اور جب یہ چیزیں مسجد کے لئے بنائی جائیں تو نفس اس کی خواہش نہیں رکھتا، یہ تو برتن کہلاتی ہی نہیں پھر حرام کیسے ہوئیں؟

وہ کہتے ہیں، حنبلی حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ اسے مسجد کے لئے حرام قرار دیتے ہیں، انہیں برتنوں میں شامل کرتے ہیں یا پھر برتنوں پر قیاس کرتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں اور پھر جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ تمام مسجدوں میں قندیلیں اور سونے کا استعمال حلال ہے تو اس میں شک ہی نہیں کہ وہ تین مسجدوں (مکہ، مدینہ، بیت المقدس) کے لئے تو

حلال ضرور ہی قرار دیں گے اور جو حضرات روکتے ہیں' وہ ان تین مسجدوں کا نام ہی نہیں لیتے لیکن ان کی عمومی بات ان کو بھی شامل ہوتی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس اختلاف کو ترتیب دی جائے چنانچہ ان تین مسجدوں کے علاوہ میں دو صورتیں ہیں' صحیح یہ ہے ان میں سونے وغیرہ کا استعمال جائز ہے' مسجد بیت المقدس میں ان سے بہتر ہے اور مکہ و مدینہ کی مسجدوں میں ان سے بھی بہتر ہے پھر ان مسجدوں میں اس بارے میں کس کو فضیلت حاصل ہے؟ اس میں بھی اختلاف ہے' بعض حضرات کہتے ہیں کہ مسجد مدینہ کو افضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے پڑوس میں ہے اور جو کچھ اس میں لگا ہے' اس سے تعظیم کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ ساری باتیں صرف بحث مباحثہ ہیں لیکن صحیح وہی ہے جو ہم نے نقل کر دیا۔

پھر یہ ساری بحث اس صورت سے متعلق ہے جب یہ چیزیں وقف نہ ہوں اور اگر سونے چاندی سے بنی چیزیں یہاں وقف کر دی جائیں تو پھر قاضی حسین اور علامہ رافعی کہتے ہیں کہ ان میں زکوٰۃ لازم نہیں لیکن رافعی حرام کہنے کو ترجیح دیتے ہیں تو پھر ان کی طرف سے یہ ترجیح کیسی؟ کیونکہ اس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ان کا وقف صحیح قرار پائے' ہاں ممکن ہے کہ رافعی کی مراد یہ ہو' جب تم صحیح ارادہ کی بناء پر وقف کرو تو اس وقت ہم صحیح وقف پر اس کی بنیاد رکھیں گے۔ پھر کہا کہ یہ حکم اس سلسلے میں مسجدوں سے تعلق رکھتا ہے' رہا حجرہ مبارکہ تو قندیلوں کا اس میں معلق کرنا ایک عرصہ سے عادت بن چکا ہے اور اس میں شک نہیں کہ حجرہ مبارکہ اس سلسلے میں دوسروں سے بہتر ہے اور جنہوں نے مسجدوں میں اختلاف کا ذکر کیا ہے انہوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا' یہاں تو بے شمار عالم اور صالح لوگ حاضری دیتے رہتے ہیں لیکن کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا تو پہلے دلائل کے ساتھ یہی ایک دلیل ان کے جائز ہونے کے لئے کافی ہے' پھر دلائل تلاش کئے جائیں تو کسی میں اس سے منع ثابت نہیں ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ہم تو جواز کا یقین رکھتے ہیں اور حجرہ مبارکہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر ہے اور اس کا اردگرد' پھر اشارہ کیا ہے کہ اس کا اردگرد یا تو اسی گھر میں شمار ہوتا ہے یا دوسرے حجروں میں جو مسجد میں داخل ہیں۔

فرماتے ہیں کہ آپ کے حجرہ میں آپ کے ''جائے دفن'' کو تمام مسجدوں سے فضیلت حاصل ہے بلکہ کعبہ پر بھی لہٰذا اگر ان کا استعمال مسجدوں اور کعبہ میں منع بھی ہو تو یہاں منع نہیں ہوگا۔

فرماتے ہیں کہ یہاں ہم نے کسی کو انکار کرتے نہیں دیکھا لہٰذا جو شے اس جگہ اس کی عزت کی خاطر وقف ہوگی تو اس کا وقف صحیح ہوگا اور اگر صرف اسے ہدیہ قرار دیا جائے تو بھی صحیح ہوگا جیسے کعبہ کے لئے ہدیہ کا معاملہ ہے یونہی یہاں کے لئے بھیجی نذر کا حکم ہے' یہ نبی کریم ﷺ کا حق ہے اور آپ تو بلاشبہ زندہ ہیں' حکم تو صرف یہ ہے کہ آپ کے وصال سے وہ چیزیں ملکیت میں شمار نہیں ہوتیں جو پہلے ملکیت میں تھیں' وہ تو آپ کے بعد صدقہ بن گئیں' رہی یہ قسم تو اس کا آپ کی ملکیت میں ہونا منع نہیں اور یہی وہ بات ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں ہے کیونکہ سب یہی کہتے ہیں کہ ''یہ چیز نبی کریم ﷺ کے لئے ہے''۔

اس کے بعد علامہ رافعی کے حوالے سے علامہ سبکی نے یحیٰی کی ذکر کردہ وہ روایت ذکر کی ہے جو مسجد میں خوشبو سلگانے سے تعلق رکھتی ہے' بتایا: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس خوشبو سلگانے کے لئے چاندی کا برتن لایا گیا جس میں تصویریں تھیں' انہوں نے ایک مؤذن حضرت سعد کو دیا اور فرمایا اسے جمعہ کے دن اور ماہ رمضان میں سلگائیں چنانچہ وہ حضرت عمر بن خطاب کے ہوتے ہوئے سلگایا کرتے تھے۔الحدیث۔

پھر فرمایا: یہ جو فقہاء نے خوشبو سلگانے کے برتن کے بارے اجماع شرط کیا ہے اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ کام حرام نہیں لیکن عرف یہ بتاتا ہے کہ اسے بھی ''استعمال'' ہی شمار کرتے ہیں تو اَب یا تو یہ حدیث ضعیف ہو گی یا پھر انہوں نے اسے مسجد کی تعظیم قرار دیا ہے لہٰذا قندیلیں تو اولاً تعظیم بنتی ہیں کیونکہ ان میں ''استعمال'' نہیں ہوا کرتا۔

پھر فرمایا: حجرہ مبارکہ کی کسی شے کو اس کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں اور نہ مسجد میں جائز ہے کیونکہ انہیں باقی رہنے کے لئے تیار کرایا جاتا ہے اور ان کا مقصد بھی باقی رکھنا ہی ہوتا ہے خواہ انہیں کوئی وقف کرے یا صرف بطور ہدیہ دے۔

فرماتے ہیں' مجھ سے سوال ہوا تھا کہ انہیں مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو میں نے انکار کر دیا تھا اور اسے برا جانا تھا' یہ بات ہم دنیا کے شہنشاہوں کو کیسے بتائیں گے نبی کریم ﷺ کے حرم کی تعمیر کے لئے ہم نے ان کی قندیلیں بیچ ڈالی ہیں حالانکہ ہمارے مال کی ان کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ ہم تو ان پر اپنا آپ قربان کرنے کو تیار ہیں' وہ لوگ تو فخر سے تعمیر میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں بہت سے علماء نے بات کی ہے' اس میں بحث کی گنجائش ہے لیکن ہمیں اس سے غرض نہیں' ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ کعبہ پر ریشم کا غلاف چڑھانے کے بارے میں اجماع موجود ہے' رہا مذکورہ چیزوں کے ذریعے آرائش وخوبصورتی کرنا تو یہ اس شخص سے ثابت نہیں جو اس فعل کو دلیل بناتا ہے نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ان اشیاء کو چھوڑ دینا تو اس میں کئی عذر بیان کئے جاسکتے ہیں جنہیں یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔

ادھر شیخ موفق نے سونے کے برتن استعمال کرنے کے حرام ہونے پر اجماع نقل کیا ہے حالانکہ قندیلیں بھی تو برتن ہیں اور اس میں شک بھی نہیں اور ہر شے کا استعمال اس کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتا ہے لہٰذا مذکورہ چیزوں کو لٹکا کر ان کا استعمال ایک خوبصورتی ہے حالانکہ ان سے تعمیر کا حرام ہونا تسلیم شدہ ہے۔

۱۔ جمال گازرونی مدنی نے کچھ ایسی اشیاء کا ذکر کیا ہے کہ ان سے سبکی کی تائید ہوتی ہے۔

ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ ۝ (سورۂ نور: ۲۶)

''ان گھروں میں جنہیں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔''

انہوں نے کہا کہ یہ گھر حضور نبی کریم ﷺ کے ہیں۔ تُرۡفَعَ کا معنیٰ ہے' ان کی تعظیم کی جائے' ان کی شان بلند

کی جائے اور انہیں مزین کیا جائے اور ان کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں سونے کی قندیلیں لٹکائی جائیں انہیں ہر قسم کی پلید چیزوں سے بچایا جائے اور ستھرا کیا جائے۔

میں کہتا ہوں' ان کا یہ قول "ان کی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں سونے کی قندیلیں لٹکائی جائیں۔" تو اس میں بحث کی گنجائش ہے کیونکہ جو انہیں حرام سمجھتا ہے' وہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔

۲۔ ایک یہ ہے' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسجد نبوی میں سونے کی قندیلیں لٹکانے کی روایت ملتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید یہ ان کے دشمنوں کی مخالفت کا نتیجہ ہے ورنہ میں نے تو کسی تالیف میں نہیں دیکھا' اگر اس کی کوئی بنیاد ہوتی تو تاریخ مدینہ لکھنے والے حضرات اسے ضرور ذکر کرتے۔

۳۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ولید کے حکم پر تعمیر کرتے ہوئے سب کچھ لگایا تھا لیکن کسی نے اسے برا نہیں کہا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔

۴۔ ان میں سے ایک یہ ہے' انہوں نے یہ روایت بتائی کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے مسجد بیت المقدس بنائی تو اسے بہت خوبصورت بنایا اور اس میں قندیلیں لگائیں اور یہ قاعدہ ہے کہ پہلے لوگوں کو شرعی چیزیں اس وقت تک ہماری بھی شریعت ہوں گی جب تک انہیں منسوخ نہ کیا جائے۔

میں کہتا ہوں' حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف سے اس میں سونے کی قندیلیں لٹکانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور اگر ثابت ہو بھی جائے تو برتنوں کے حرام قرار دئے جانے کی بناء پر یہ روایت منسوخ ہو گی کیونکہ یہ بھی تو برتن ہیں اور جو کسی نے انہیں برتن قرار نہیں دیا تو یہ قابلِ تسلیم نہیں۔

۵۔ ان میں سے ایک ثعلبی کی روایت ہے: **اتیان المساجد یوم القیٰمۃ** اور اس میں ہے کہ "ان کے امام انہیں دھکیل لے جائیں گے' انہیں تعمیر کرنے والے' خوبصورت کرنے والے اور سونے کا استعمال کرنے والے' ان سے لٹکے ہوں گے۔" الحدیث۔

میں کہتا ہوں' انہوں نے یہ روایت قرطبی سے لی ہے جیسے ایک نسخے میں میں نے دیکھا ہے' میں نے قرطبی کی طرف بھی رجوع کیا لیکن انہوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ "اسے تعمیر کرنے والے اس سے لٹکے ہوں گے۔"

۶۔ ایک روایت سعید بن ربان سے ہے کہ ابو ہند نے کہا: تمیم داری شام سے مدینہ کو قندیلیں' زیتون' کپڑوں کے تھان' ایک یا دو سونے کی قندیلیں لے کر آئے' مدینہ پہنچے تو جمعہ کی رات تھی' ایک غلام کو حکم دیا جس کا نام براد تھا' وہ اُٹھا' گانٹھ کھولی اور قندیلیں لٹکا دیں' ان میں پانی اور زیتون بھرا پھر فتیلے رکھے' جب سورج غروب ہو گیا تو براد کو جلانے کا حکم دیا' اس نے جلا دیں' رسول اللہ ﷺ مسجد کی طرف تشریف لائے' دیکھا تو وہ جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ پوچھا یہ کام کس نے کیا؟ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے عرض کی یا رسول اللہ!

تمیم داری نے! فرمایا تم نے اسلام روشن کیا اور مسجد کو زیور پہنایا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے دنیا و آخرت روشن کر دیگا۔

میں کہتا ہوں' یہ روایت بھی انہوں نے قرطبی سے لی ہے لیکن میں نے اس میں انکے یہ الفاظ نہیں دیکھے: "ایک یا دو سونے کی قندیلیں" اور نہ ہی یہ قول دیکھا: "تم نے مسجد کو زیور پہنایا ہے۔"

ے۔ ان میں سے ایک یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب شام میں داخل ہو رہے تھے تو انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے' بڑا لشکر اور گھوڑے ہمراہ لائے' سونے چاندی کا اسلحہ تھا' ریشمی لباس پہنے تھے اور شاہان روم و فارس جیسی ٹھاٹھ باٹھ سے استقبال کیا۔ حضرت عمر نے پوچھا: معاویہ! یہ کیا کیا ہے؟ یہ زیب و زینت اور تکبرانہ سلسلہ کیا ہے؟ آج تو میں بڑا عجیب کام دیکھ رہا ہوں' آپ نے تو سخت راہ اپنائی ہے۔ انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اس سے کفار کے دل جلیں گے' ان پر قہر برسے گا' رَن کانپے گا ان کے قدم لڑکھڑائیں گے' ہمارا یہ کام ان پر غلبہ ہے' اس میں ان کی ذلت ہے اور اسے دیکھ کر وہ اپنے آپ کو ہلکا جانیں گے اور جب وہ ہماری مسجدیں دیکھیں گے کہ سونے سے سجی ہیں تو ان کے دلوں پر رعب چھا جائے گا کہ ان کی چھتیں سونے چاندی کی قندیلوں سے بھرپور ہیں' الحدیث۔

ن کے آخر میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر خاموش ہو گئے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ خبر تاریخ دانوں نے لکھی ہے اور ایسی خبریں دلیل نہیں بنا کرتیں' پھر مسجدوں کے بارے میں اتنی بڑی بات میں نے کہیں نہیں دیکھی اور پھر میں نے بعض نسخوں میں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس روایت کو علامہ ذہبی سے منسوب کیا گیا ہے' ایسا تاریخ الاسلام میں ہوا ہے' ایک اور نسخے میں یہ نسبت ذکر نہیں کی گئی' اسے دیکھنے کے لئے تاریخ الاسلام کی طرف رجوع کیجئے' اگر اس میں یہ زیادتی موجود نہیں ہے تو جہاں تک میرا خیال ہے کہ کسی متعصب شخص نے یہ چیزیں اپنی طرف سے اس میں شامل کر دی ہیں کہ اس کی دلیل مکمل ہو سکے کیونکہ اس مسئلہ میں کئی طرح کے تعصب موجود ہیں جبکہ علامہ گازرونی کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف قندیلیں لگانے کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہی چیزیں بیان کر رہے ہیں جن سے یہ ثبوت مل سکے اور جب اس متعصب نے دیکھا کہ ان کے سوا اس کی دلیل پوری نہیں ہوتی تو اس نے یہ سب کچھ ملا دیا اور اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ اگر یہ موجود بھی ہوں اس کی دلیل پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ صحیح سند متصل نہیں ہے اور جو شخص نبی کریم ﷺ کی سیرت اور آپ کے حالات میں غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انہیں یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۶

پہلی آتشزدگی جس میں یہ سارا سامان جل گیا' مسجد اور اس کی چھت کا بیان' قبلہ والے حصہ کی چھت' آتشزدگی کا سبب اور تاریخ

تاریخ دان کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں آتشزدگی یکم رمضان ۶۵۴ھ جمعہ کی رات' رات کے ابتدائی حصے میں واقع ہوئی تھی۔ ابوشامہ کے مطابق آگ کی ابتداء شمال مغربی کونے سے ہوئی اور اکثر مؤرخین کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ مسجد نبوی کے ایک خادم ابوبکر بن اوحد فراش (جھاڑو دینے والے) وہاں موجود سٹور میں داخل ہوئے' آگ ہمراہ تھی ان سے غفلت ہوگئی اور وہ سٹور میں پڑی کسی چیز کو لگ گئی' جسے وہ بجھا نہ سکے چنانچہ ابوبکر فراش' سٹور اور اس میں موجود سارا سامان جل گیا۔

علامہ قطب قسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اور دوسرے باب کی تیسری فصل میں مذکورہ آگ کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ''عروۃ التوثیق فی النار والحریق'' یہ وہی آگ تھی جو اسی سال مدینہ پاک میں دکھائی دی تھی۔ اس کتاب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب حکمتیں بیان کی ہیں کیونکہ آپ اس وقت مکہ میں موجود تھے' اس میں آپ نے وہی کچھ بتایا ہے جو مؤرخوں کے حوالے سے ہم پہلے بتا چکے۔ چنانچہ لکھا ہے: ایک سچے شخص نے مجھے لکھا پھر موقع پر موجود سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے آتشزدگی کا سبب یہ بتایا کہ مسجد کے ایک خادم مسجد کے آخری دروازے کے اندر مغربی جانب موجود اسٹور میں مسجد کے مناروں کی قندیلیں نکالنے گئے ضرورت کی چیزیں تو لے لیں لیکن وہ قندیلوں کے ایک پنجرے پر لگی جلتی آگ چھوڑ آئے' اس میں کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا' اسے آگ لگ گئی' انہوں نے جلد بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بچھونوں' پنجروں اور چھڑیوں کو لگ گئی پھر شعلے تیز ہوئے اور اتنے بڑھے کہ مسجد کی چھت تک جا پہنچے۔ انتھی علامہ ذہبی کی ''العبر'' میں لکھا ہے کہ یہ آگ خادم کے چراغ سے لگی تھی۔

تاریخ دان کہتے ہیں کہ آگ چھت میں تیزی سے بھڑک اٹھی' امیر مدینہ آئے تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے جنہوں نے اسے بجھانے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ اسے روک نہیں سکے' بہت کم حصے سے بجھا سکے' اتنے میں اس نے ساری چھت کو گھیر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ جل گیا' ایک لکڑی تک بھی نہ بچ سکی۔

میں کہتا ہوں' شاید ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مکمل لکڑی نہ بچی ورنہ جب حجرہ مبارکہ سے دیوار گرنے

کے بعد چیزیں نکالی گئیں تو بہت سی لکڑیاں نکلی تھیں۔

قطب قسطلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسجد کا سارا سامان جل گیا تھا' منبر شریف' دروازے' محفوظ شدہ سامان' جالیاں' چھوٹے مقصورے' صندوق اور ان میں کی کتابیں' حجرے کا غلاف' یہ کوئی ستر پردے تھے۔

آتشزدگی میں حکمت الٰہیہ

اس کے بعد حضرت قطب قسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس آتشزدگی کی حکمتیں اور راز بتائے ہیں کہ یہ زیب و زینت حضورﷺ کو پسند نہ تھی' ایک یہ حکمت بھی تھی کہ جب تینوں مسجدیں ان آنکھوں سے دیکھی جائیں تو کوئی انہیں روضۂ انور پر بڑھا نہ سکے بلکہ یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قہاری اور عظمت کی صفت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے اور آخر وہی واحد اور قہار ہے' کعبہ شریف اور بیت المقدس میں بھی تو اس سے پہلے آگ لگ چکی تھی اور پھر اس دور میں حجازِ مقدس کی بڑی آگ کے معجزے کے بعد (جو حضورﷺ نے بتا دی تھی) مسجد نبوی میں یہ واقعہ گذر گیا' لوگوں نے گریہ زاری کی تو آپ کے پڑوسی اس سے بچ گئے اور وہ حرم شریف کے پاس پہنچنے سے پہلے بجھ گئی تھی جیسے گذرا۔اہل مدینہ کے خیال میں اس آگ کے رُک جانے سے پتہ چلتا ہے کہ حضورﷺ کی برکت سے آخرت میں بھی ان سے آگ دور رہے گی چنانچہ یہ بات بھی ظاہر کرنے کے لائق تھی (اس لئے آگ لگی)۔

علامہ اقشہری نے ایسے اشعار لکھے ہیں جن میں بتایا ہے کہ آگ صرف ان زیب و زینت کی چیزوں کو لگی جن سے روکا گیا ہے اور جو حق تھیں' وہ بچ گئیں' جھوٹی چیزوں کو جلنا ہی تھا' فرماتے ہیں: مجھے حافظ صالح شیخ ابراہیم بن محمد کنانی نے کچھ اشعار سنائے' یہ خود اور ان کے والد بھی مؤذن تھے' وہ کہتے ہیں کہ آتشزدگی کے بعد ایک دیوار میں یہ اشعار لکھے تھے:

> ''حرم نبوی کسی شک والی چیز کی بناء پر نہیں جلا تھا اور یہ آتش زدگی کوئی بڑی بات بھی نہیں' اصل بات یہ تھی کہ شیعوں کے ہاتھوں مسجد میں بہت کچھ ہو چکا تھا جسے آگ لگا کر راکھ کر دیا گیا۔''

میں کہتا ہوں کہ علامہ مجد نے اسے یوں لکھا ہے:

> ''نبی کریمﷺ کا حرم کسی ایسے واقعہ کی بناء پر نہیں جلا جس میں کوئی خدشہ ہوا ورنہ ہی اس میں شرم کی کوئی بات ہے' یہ شیعہ تھے جنہوں نے مسجد میں ایسے کام کر رکھے تھے' اللہ تعالیٰ نے آگ کے ذریعے سب کچھ صاف کر دیا۔''

پھر ان دونوں شعروں کے بعد دو اور اشعار لکھے:

> ''رافضیوں سے کہہ دو کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ہر بیوقوف بھی تم سے برائی کا کام لے لیتا ہے' حرم شریف کو آگ صرف اس وجہ سے لگی ہے کہ تم صحابہ کو گالیاں دیتے ہو۔''

میں کہتا ہوں' اس کی وجہ یہ تھی کہ مسجد اور مدینہ پر شیعہ لوگوں کا غلبہ تھا' قاضی اور خطیب انہی کے تھے اور پھر ابن فرحون نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے دیکھتے کوئی شخص اہلِ سنت کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔

تاریخ دان بتاتے ہیں کہ اس آگ میں صرف وہ قبہ بچا تھا جسے سلطان الناصر دین اللہ نے مصحف عثمانی اور متعدد بڑے صندوقوں کی حفاظت کے لئے بنایا تھا' یہ ۳۰۰ھ کے بعد بنائے گئے تھے جو اب تک (یعنی ان کے زمانے میں) اسی طرح موجود ہیں' اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ قبہ مسجد کے درمیان تھا اور دوسری وجہ مصحف عثمانی کا اس میں ہونا تھا۔اس مذکورہ قبہ کی تعمیر ۵۷۶ھ میں ہوئی تھی۔

کہتے ہیں کہ مسجد کے باقی ستون بچ گئے' یہ گویا کھجور کے تنے تھے' جب ہوا چلتی تو یہ پھر جایا کرتے' کچھ ستونوں سے سکہ پگھل گیا تو وہ گر پڑے' حجرہ مبارکہ سے اوپر والی چھت حجرہ مبارکہ پر گر گئی چنانچہ یہ دونوں مل کر حجرہ شریف کے اندر اور مبارک قبروں پر گر گئے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں: حجرہ کی چھت کا کچھ حصہ گر پڑا اور یہ سب کچھ لوگوں کے سونے سے پہلے ہوا چنانچہ لوگ صبح کو اُٹھے اور نماز پڑھنے کے لئے جگہ صاف کر دی پھر رمضان المبارک میں خلیفہ معتصم باللہ ابو احمد عبد اللہ بن مستنصر باللہ کو اطلاع دی گئی چنانچہ موسم حج ہی میں وہ کاریگر اور سامان لے کر پہنچے' عراقی سوار لائے تھے اور یوں ۶۵۵ھ میں تعمیر شروع کر دی گئی۔

آتشزدگی کے بعد تعمیر کا آغاز

علامہ مطری کہتے ہیں کہ کاریگروں نے جب تعمیر شروع کی تو ارادہ کیا کہ مبارک قبروں پر گری دیواروں کو ہٹانے کا کام پہلے کر لیا جائے لیکن انہیں جرأت نہ ہوئی چنانچہ امیر مدینہ منیف بن شیحہ' مسجد کے مجاوروں اور خادموں کی رائے یہ ہوئی کہ امام مستعصم خود آ کر جائزہ لیں اور جو ضرورت ہو' اسے پورا کریں چنانچہ انہوں نے اسے خط لکھا اور جواب کی انتظار کرنے لگے لیکن چونکہ تار تاریوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا' اس لئے ان کا جواب نہ آیا' تار تاریوں نے وہاں کے عاملوں کو بھگا دیا گیا تھا چنانچہ انہوں نے کام وہیں روک دیا' وہاں کوئی نہ گیا اور نہ ہی اس کی فکر کی اور نہ ہی اسے شروع کر سکے۔

علامہ مجد شیرازی کہتے ہیں کہ کام وہیں چھوڑ دیا گیا اور کوئی شخص یہ عظیم کام نہیں کر سکا جس کے ارادے ہی پر قدم لڑکھڑانے لگ جائیں اور پھر یہ کام کسی سے بھی نہ ہو سکا۔

میں کہتا ہوں' اس زمانے میں یہ کام ترک کرنے پر مجھے سخت تعجب ہے چنانچہ میں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''الوفاء بما یجب لحضرۃ المصطفٰی'' رکھا جس میں میں نے بیان کیا کہ طریقۂ ادب میں واجب یہ ہے کہ اس عظیم نبی سے اظہارِ محبت کے لئے (جن کی تعظیم اور قبر انور کی تعظیم ہر اُمتی پر لازم ہے) لازم یہ تھا حجرہ مبارکہ سے وہ سب کچھ دور کر

دیا جاتا جو حجرہ مبارکہ کے اندر تھا۔میری اس کتاب کے بعد وہ تعمیر ہوئی جو آگے بیان ہو رہی ہے' میری پہلی تالیف اس معاملہ کا سبب نہیں تھی جیسے آگے آئے گا حتیٰ کہ متولی تعمیر سے مجھے اس وقت پتہ چلا جب حجرہ کی دیوار کا کچھ حصہ گر گیا اور جب انہوں نے باہر والی دیوار میں سوراخ ڈالا تو دونوں دیواروں کے درمیان کھلی جگہ میں میں نے دیکھا' جو حجرہ کے پچھلی طرف تھی' میں نے دیوار گرنے کا یہاں ایک ہولناک منظر دیکھا جو قد انسانی جتنے ڈھیر کی صورت میں تھا' اس سے مجھے معلوم ہوا کہ پہلے لوگوں نے اُسے صرف اس بناء پر چھوڑا تھا کہ اس کو زائل کرنے سے ہتک عزت ہو گی چنانچہ وہ رُک گئے۔اللہ انہیں جزائے خیر دے۔میں تو اسے ہلکا سا کام جانتا تھا کہ ادب کے ساتھ یہاں سے سامان نکالا جا سکتا ہے' دیکھا تو یہ ایک ہولناک کام تھا اور سب سے بڑا کام مسجد کی اوپر والی چھت اور دو چھتوں کے درمیان والی عمارت کا تھا جو ستونوں پر کھڑی تھی چنانچہ میں نے دعا کی تھی اسے نکالتے وقت میں نہ دیکھ پاؤں چنانچہ میں نبی کریم ﷺ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے صرف اسی شے کی توفیق دے جس پر وہ راضی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہاں جانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

علامہ مطری ان کے قول ''نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نہ ہی اسے شروع کیا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:
انہوں نے اس کے اوپر دوبارہ چھت ڈال دی جو ان ستونوں کے اوپر تھی جو حجرہ شریفہ کے اردگرد تھے کیونکہ وہ دیوار حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضور ﷺ کے گھر کے گرد اور ان ستونوں کے درمیان بنائی تھی' چھت کے اوپر تک نہیں پہنچی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ مطری ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلے جو ان کے بعد ہوئے چنانچہ انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ آتشزدگی کے بعد حجرہ مبارکہ کی چھت نہیں ڈالی گئی کیونکہ جو چھت ستونوں کے اوپر تھی وہ مسجد کی چھت تھی جس کا تقاضا یہ تھا کہ انہوں نے مسجد کی چھت کو حجرہ مبارکہ کی چھت بنا دیا اور انہوں نے ذکر کیا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز والی دیوار پر انہوں نے جالیاں لگا کر مسجد کی چھت سے ملا دیا اور سب سے پہلی جگہ جہاں سے انہوں نے تعمیر شروع کی وہ مسجد کی چھت کا وہ حصہ تھا جو حجرہ مقدسہ کے برابر آتا تھا۔اس میں اس کے بارے میں مخالفت پائی جاتی ہے جس کا ہم نے آنے والی تعمیر میں مشاہدہ کیا کیونکہ انہوں نے اس کے اندر والی دیوار پر مربع شکل کی چھت دیکھی اور وہ باہر سے مشرق و مغرب میں ملی ہوئی تھی' یہ باہر والی دیوار کے سرے سے بالشت بھر قریب تھی اور جب اسے کھولا گیا تو گری دیوار کے آثار دکھائی دیئے اور پتہ چلا کہ اس کی لکڑیاں اندر والی دیوار میں تھیں' اب اس نئی چھت کو انہوں نے پہلی پر نہیں بنایا کیونکہ یہ کام سُترہ گرانے کے بغیر ہونے کا نہیں تھا اور نہ ہی لکڑیوں کے سروں کی جگہ کے اصلاح کے بغیر ممکن تھا لہٰذا ادب و احترام کی وجہ سے انہوں نے اسے ویسے ہی رہنے دیا اور دیوار کے سترہ کے اوپر ہی وہ چھت ڈال دی اور اس پر ہلکا پھلکا سترہ ڈال دیا اور پھر اس چھت پر انہوں نے پردہ لگایا جو باہر والی دیوار کے اوپر جالیوں میں دھاگے سے بندھا تھا' اس چھت پر مٹی نہیں لگائی گئی تھی' اس پر ایک ایسی چھت تھی جسے

ساج ہندی کی بڑی موٹی تختیوں کے ذریعے مضبوط بنایا گیا تھا اور ایک دوسرے کو لکڑی کے پائے لگا کر مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا' اس کے چار حصے کئے تھے جن میں سے ہر حصہ ایک بڑا دروازہ معلوم ہوتا تھا پھر ان تین سے ہر دو ٹکڑوں کے سروں پر لوہے کی سلاخیں لگا کر جوڑ دیا گیا تھا اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا گیا تھا اور اس ساج کی لکڑی کو اُٹھانے کے لئے اس کے تین تین ٹکڑوں کو گانٹھ دیا گیا تھا پھر ان تختوں کے کناروں کو باہر سے نظر آنے والی دیوار تک پہنچا دیا گیا تھا' ان تختیوں میں نہ تو انہوں نے تیل لگایا' نہ نقش و نگار بنایا اور نہ ہی اس پر کچھ لکھا البتہ بڑھئی نے اس کے ایک کونے پر اپنا نام کھود دیا تھا اور یونہی مسجد کی وہ چھت جو حجرہ مبارکہ کے برابر تھی اور جو اس چھت سے ملی ہوئی تھی' یہ بھی ساری کی ساری ساج کی لکڑی سے بنی تھی جس پر نہ تیل تھا اور نہ ہی نقش و نگار' اس کے درمیان میں ایک طباق تھا جس پر تالا لگا تھا' او پر شمع تھی' یہ اس وقت تک رہا جب تک دوسری آتشزدگی کے بعد دوسرا قبہ نہیں بنا دیا گیا اور پھر حجرے کی اندر کی دیوار پر شام کی جانب تختیاں تھیں جو دیوار کے سرے سے مسجد کی چھت تک تھیں۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ انہوں نے اس چھت کو اُٹھاتے وقت اس کے نیچے کی طرف لکڑیوں کے دو حصے دیکھے جو دونوں ہی کھائے جا چکے تھے' صرف ایک بچا تھا اور اس کے باوجود اس نے اسے اُٹھا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے لوگوں کو بہتر جزاء دے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ کام اس وقت کیا گیا تھا جب مسجد کی چھت دوبارہ بنائی گئی تھی۔

اب ہم پھر اسی کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے پہلے مضمون کے بعد لکھا ہے: انہوں نے کہا اس سال میں (۶۵۵ھ) انہوں نے حجرہ مبارکہ اور اس کے اردگرد قبلہ والی اور مشرقی دیوار سے باب جبریل تک چھت ڈالی جسے پہلے باب عثمان کہا جاتا تھا' یونہی مغربی جانب میں تمام ریاض الجنہ اور منبر پر چھت ڈال دی۔ اس کے بعد سال ۶۵۶ھ شروع ہوا جس کے ماہِ محرم میں واقعۂ بغداد ہوا' تاتاری اس پر غالب آ گئے اور انہوں نے خلیفہ کو اس کے اہلِ خانہ سمیت قتل کر دیا۔

میں بتاتا چلوں کہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا' میں نے اسے اپنی کتاب ''الوفاء'' میں ذکر کیا اور پھر دوسرے باب کی دوسری فصل میں وہاں لکھا جہاں حجاز کی آگ کا ذکر کیا تھا پھر علامہ ذہبی کا ذکر کیا ہوا وہ واقعہ بھی لکھا جس میں اس آگ کا ذکر ہے جس نے بغداد کو گھیر لیا تھا اور خلفاء کی قبروں تک کو جلا دیا تھا' اس سے ایک سال پہلے وہ لوگ غرق بھی ہو گئے تھے۔ یہ اللہ عظیم و مالک کے کام ہیں۔

گذشتہ مضمون کے بعد علامہ مطری لکھتے ہیں: مصر سے ہر قسم کے آلات آ گئے' اس وقت والئ مصر الملک المنصور نور الدین علی بن الملک المعز عز الدین ایبک صالحی تھا پھر والئ یمن الملک المظفر شمس الدین یوسف بن منصور عمر بن علی بن رسول کی طرف سے آلات اور لکڑی پہنچ گئی۔ انہوں نے ابھی باب السلام (جسے پہلے باب مروان کہتے تھے) تک کام کیا تھا کہ اس دوران شاہ مذکور معزول ہو گیا (یعنی ذی القعدہ ۶۵۷ھ کے آخر میں) اور ان کی جگہ ان کے والد کا غلام

الملک المظفر سیف الدین قطز المعزی والی بنا جس کا اصل نام محمود بن ممدود تھا' اس کی والدہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی ہمشیرہ تھی اور اس کا باپ اس کا چچا زاد تاتاریوں کے غلبہ پر قید ہو گیا تھا جسے دمشق میں بیچ دیا گیا اور اس بیچ کے نتیجے میں مصر منتقل ہو گیا اور پھر ۶۵۸ھ میں بادشاہ بنا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ۱۸ ذی القعدہ ۶۵۷ھ بروز ہفتہ' والی بنایا گیا اور ماہِ رمضان ۶۵۸ھ میں جالوت کے چشمہ کا واقعہ ہوا جہاں اللہ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو غلبہ دیا لیکن وہ اپنی حکومت کا ایک سال بھی پورا نہ کر پایا بلکہ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد مصر میں داخل ہوتے ہی قتل کر دیا گیا چنانچہ اس سال مسجد شریف میں تعمیر کا کام باب السلام سے باب الرحمہ تک ہوا جسے پہلے باب عاتکہ کہتے تھے اور ادھر باب جبریل سے باب النساء تک ہوا جو پہلے دور میں باب ریطہ بنت ابو العباس سفاح کے نام سے مشہور تھا' اسی سال کے آخر میں الملک الظاہر رکن الدین بیبرس صالحی شاہِ مصر بنا جسے بند قداری کہتے تھے۔اس نے اپنے دور میں مسجد کی چھت کا باقی حصہ مکمل کیا جو باب الرحمہ سے مسجد کے شمال تک تھا اور دوسری طرف باب النساء تک مکمل کیا' یوں یہ چھت پہلے کی طرح چھت بنا دی گئی جیسے آتشزدگی سے پہلے تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ الظاہر رُکن الدین خلیفہ بنا تو اس نے پورا اہتمام کیا' لکڑی' لوہا اور سکّہ وغیرہ منگوا لیا' تریپن کاریگر بھیجے جن کے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور سفر پر جانے سے پہلے انہیں نان و نفقہ دیا پھر ان کے ہمراہ الامیر جمال الدین محسن صالحی وغیرہ کو بھیجا اور ضرورت کے مطابق آلات وخرچہ کی امداد مسلسل جاری رکھی' مسجد میں کام جاری رہا اور انہوں نے مشرقی وغربی دونوں چھتیں (یعنی جو مسجد کے صحن کے دائیں اور بائیں جانب تھیں) نئے سرے سے بنا دیں۔یہ کام ۷۰۵ھ یا ۷۰۶ھ میں ہوتا رہا' یہ سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون صالحی کی خلافت کا ابتدائی دور تھا چنانچہ دونوں چھتوں کو ایک کر دیا گیا جیسے شمالی چھت تھی اسی کے مطابق بنایا گیا کیونکہ یہ الملک الظاہر نے یونہی تعمیر کی تھی۔

پھر ۷۲۹ھ میں سلطان مذکور نے قبلہ والی چھت کے ساتھ آخر میں دو برآمدے بنانے کا حکم دیا جن سے چھت وسیع ہو گئی اور فائدہ مند رہی۔

میں کہتا ہوں کہ پھر اس میں خلل پیدا ہو گیا تو الملک الاشرف برسبائی نے ذوالقعدہ ۸۳۱ھ میں مقبل قدیدی کے ہاتھوں قرض کے خرچہ پر تعمیر کروائی جیسے مجھے حرم کے ایک شیخ نے بتایا تھا۔میں نے یونہی اس کا نام اس تختی پر دیکھا جو قبلہ والی چھت میں (جو مسجد کی کھلی جگہ سے ملتی تھی) سامنے لکھا دیکھا اور وہ ایک ہی چھت تھی جو مسجد کی چھت کے نیچے والے حصے کے برابر تھی۔یہی وجہ ہے کہ قدیم مسجد کے اگلے حصے کی چھت ان دو برآمدوں سے اونچی تھی' اس کا ایک دروازہ تھا جس میں داخلہ کے لئے دونوں چھتوں کے درمیانی مشرق کی طرف ملنے والے دونوں برآمدوں کے شروع میں ایک راستہ تھا۔

اسی سلطان اشرف نے شام والی جانب کی چھت کا کچھ حصہ بنوایا جو منارہ سنجاریہ سے ملتی تھی اس کے بعد

سلطان جقمق کے دور کے اندر ریاض الجنہ کی چھت اور مسجد کی دوسری چھت میں خرابی ہوئی تو اس نے ۸۵۳ھ میں امیر بردبک الناصر و معمار وغیرہ کے ہاتھوں اسے نئے سرے سے بنوا دیا۔

پھر سلطان الملک الاشرف قایتبائی کے عہد میں مسجد کی چھتیں درست کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس بارے میں ان کا حکم آیا جیسے آگے ان کی طرف اشارہ آ رہا ہے کہ وہ جناب خواجگی شمسی شمس الدین بن زمن تھے چنانچہ اس سلسلہ میں وہ ۸۷۹ھ میں امیر جدہ کے ساتھ حاضر ہوئے' تعمیر کے کام کو ترتیب دیا اور ان کے ساتھ چل پڑے چنانچہ انہوں نے مشرق کی طرف کے ستون گرا دیئے اور برآمدوں کی چھت بھی گرا دی کیونکہ انہوں نے اسے گرانا مناسب سمجھا تھا' کچھ ستون توڑ کر دیکھا تو کسی میں سکہ بالکل نہیں تھا اور کسی میں کچھ موجود تھا چنانچہ اسی سال اسے تیار کر دیا نیز مسجد کی وہ دیوار گرائی جو مشرق کی طرف منارۂ سجاریہ سے ملتی تھی' اسے دروازہ کی سیڑھی سے گرایا اور یہ دوسرا دروازہ ہے جو ظاہر دکھائی دینے والے دروازے کے اندر ہے اسے قبلہ کی طرف سے چبوترہ کے کنارے تک گرایا' یہ شامی چھت کا آخری حصہ تھا۔ اس کی مقدار دستی ستائیس ہاتھ تھی' اسے اوپر سے نیچے تک گرا دیا اور پہلی بنیاد تک لے گئے۔ اس قدیم منارہ کی بنیاد میں ایسا پھٹا ہوا حصہ نظر آیا کہ جس کی وجہ سے گراتے وقت وہ ایسے' ملتی تھی جیسے ابھی گر جائے گی چنانچہ اس شگاف میں انہوں نے بہت سا ڈھلا ہوا سکہ بھر دیا اور مسجد کی جو دیوار اور ستون انہوں نے گرائے تھے' ان میں بھی سکہ بھرا تھا جو ڈھالا گیا تھا۔ تعمیر کے ماہر نے بتایا کہ دیوار میں خرابی کی وجہ یہ تھی کہ شور کی وجہ سے سکہ ڈھل جاتا ہے چنانچہ ان کا ارادہ بنا کہ اسے مٹی اور چونا ملا کر ملائم پتھروں سے بنا دیں چنانچہ انہوں نے یہ کام اس پوری دیوار میں کیا اور یونہی وہ ستون بھی بنائے پھر مسجد کے اندر اور باہر سے پتھر کو چونا سے جوڑ دیا گیا اور اس چھت کو اوپر اُٹھا دیا جو منارہ کے سامنے گری دیوار کی ایک جانب تھی اور اسے بھی پہلے کی طرح تعمیر کر دیا پھر کچھ ایسے معاملات سامنے آئے جن کی وجہ سے تعمیر میں تاخیر ہو گئی چنانچہ ۸۸۰ھ میں کام رُک گیا پھر خواجہ شمسی بن زمن امیر جدہ کے ہمراہ جمادی الاولیٰ ۸۸۱ھ کو مدینہ میں آئے اور خود تعمیر کی نگرانی کی چنانچہ ریاض الجنہ کی اوپر والی چھت کو بلند کیا اور قبہ شریف سے متصل حصے کو بھی بلند کر دیا' پھر منبر کی غربی جانب والے اس حصے کو بھی اوپر کیا جو اس کے برابر تھا کیونکہ اس کی بہت سی لکڑیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ چھت (مسجد کے اگلے حصے کی چھت) لکڑی کے شہتیروں پر تھی جو ستونوں کے سروں پر چوڑائی میں پڑے ہوئے تھے جیسے مسجد سے ملنے والی نچلی سمت چھت بھی ایسے شہتیروں (یا بڑے تختوں) پر پڑی ہوئی تھی۔ اب متولی کی رائے یہ ہوئی کہ انہیں لکڑی کی بجائے اینٹوں کے ستونوں سے تبدیل کر دیں جیسے مسجد کی کھلی جگہ کے گرد گویا پل بنا ہوا تھا (ڈاٹ) ان کی رائے میں یہ لکڑیوں سے بہت مضبوط ہو گی اور دیر پا ہو گی اور ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ نچلی چھت کے تختے ستونوں کے سروں پر رکھے تھے لیکن انہوں نے اس میں مضبوطی دیکھی چنانچہ اسے چھت کے اس حصے میں لگایا جسے بلند کیا تھا اور اس چھت کی لکڑیاں اس ڈاٹ پر رکھ دیں چنانچہ وہ مقام اوپر والی چھت کے قریب والے حصے سے بلند ہو گیا چنانچہ اب اس طرف دونوں چھتوں کے درمیان

چلنے والا بالکل سیدھا یا تھوڑا سا جھک کر چل سکتا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہاں زیادہ جھک کر چلنا بھی مشکل تھا اور وہ ڈاٹیں اس جگہ رکھی تھیں جو ان ستونوں کی لائن کے برابر تھی جو ریاض الجنہ کے قبلہ میں تھی اور جس کے اول میں مصلّٰی شریف تھا اور مشرق کی طرف سے دیکھیں تو اس ستون تک تھیں جو مغرب سے منبر کے ساتھ ملتا تھا اور اس پر بھی جو دوسری صف کے برابر تھا اور یہ اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صف تھی جو اس صف کے برابر تھی جو مشرق سے مغرب تک تھی نیز اس کے اوپر تھی جو تیسری صف کے برابر تھے اور یہ بھی مشرق سے مغرب تک ستون محرس کی صف تھی۔رہی وہ جو ستون وفود کی صف کے برابر تھی تو اس پر وہ دیوار تھی جو نچلی اور اوپر والی چھت کے درمیان پردہ کی حیثیت میں تھی' اس میں ایک دروازہ تھا جس سے دونوں چھتوں کے درمیان جا سکتے تھے چنانچہ یہ دیوار انہوں نے گرا دی اور اس کی بنیاد مضبوط کر دی اور اس پر بھی لکڑیوں کے کنارے رکھ دیئے چنانچہ یہ تین برآمدے وہی تھے جن کی اونچی چھت اور اردگرد کے ان ستونوں کی چھت سے بلند تھی جو مقصورہ شریف سے متصل تھے اور ان ستونوں تک جاتے تھے جو منبر سے ملے ہوئے تھے اور ان دو برآمدوں کی چھت جو ریاض الجنہ اور قبلہ والی دیوار کے درمیان بشمول اس چھت کے جو حجرہ شریف سے لے کر مشرقی دیوار تک ہے' نیز مسجد کی اگلی طرف سے منبر کے مغربی جانب والی چھت تک' ساری کی ساری اس سے نیچی ہو گئی۔

پھر انہوں نے بہت سی بکھری لکڑیاں دیکھیں جو چالیس کے قریب تھیں اور اوپر والی چھت میں لگی تھیں' وہ ٹوٹ چکی تھیں' انہیں تبدیل کر دیا اور ان میں سے کچھ کے ساتھ نیلے رنگ کی لکڑیاں لگا دیں اور چھت کھولے بغیر انہیں مضبوطی سے لگا دیا' اور اس نیچی چھت کو اکھاڑ دیا جو مشرقی برآمدے میں پاؤں مبارک کی طرف ملتی تھی اور باب جبریل سے باب النساء تک کے برآمدے کی چھت کے ایک جانب تھی اور درمیانے برآمدے میں اس چھت سے ملتی تھی جو اس برآمدے سے ملتا تھا جسے انہوں نے پچھلے سال بنایا تھا اور اسے دوبارہ بنا دیا اور وہ نیچی چھت اُکھاڑ دی جو اس جگہ کے برابر تھی جہاں چہرۂ مبارکہ کے سامنے زائرین کھڑا ہوتے تھے' یہ سب سے قدیم چھت تھی لیکن اس کے باوجود وہ اسے اُکھاڑتے وقت کسی اور مقام کو اُکھاڑنے سے زیادہ تھک گئے تھے کیونکہ یہ بہت مضبوط اور پختہ تھی کہ پہلے لوگوں کے ہاتھوں سے بنی تھی اور میرے خیال میں انہوں نے اس پر سلطان بیبرس کا لکھا ہوا نام پڑھا تھا' انہوں نے اسے دوبارہ بنایا اور شام والے چھتے جسے کی مرمت کی پھر انہوں نے چھت کے کچھ حصے کو روغن کیا جو حجرہ کے گرد اس مقصورہ کے اندر کی طرف تھی جسے آج کل حجرہ کہتے ہیں اور اس دوران انہوں نے چھت کو اُکھاڑا نہ تھا پھر یہ سب کچھ دوسری آتشزدگی میں جل گیا تھا جس کا ذکر انیسویں فصل میں آ رہا ہے اور جب دوبارہ چھت ڈالی تو مسجد کی ساری چھت ایک ہی بنا دی جیسے آگے آ رہا ہے۔

فصل نمبر ۲۷

حجرہ شریف کے عین اوپر نیلا گنبد' سبز گنبد اور مقصورہ کا ذکر

نیلے رنگ کا قبہ:

مسجد نبوی میں پہلی آتشزدگی سے پہلے اور بعد حجرہ مبارکہ پر گنبد نہ تھا بلکہ نبی کریم ﷺ کے حجرہ مبارکہ کے چوفیرے' مسجد کی چھت میں تقریباً اڑھائی فٹ اونچا چبوترہ بنایا گیا تھا جو اینٹوں سے بنا تھا تاکہ مسجد کی دوسری چھت سے' حجرہ مبارکہ کی چھت نمایاں ہو سکے جیسے ابن نجار وغیرہ نے لکھا ہے۔ پھر ۶۷۸ھ کو الملک المنصور قلاوون صالحی کے دور میں قبہ (گنبد) تعمیر کیا گیا' یہ لکڑی سے بنا تھا' نیچے سے مربع اور اوپر سے ہشت پہلو تھا' اسے ستونوں کے اوپر کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس پر لکڑی کی تختیاں لگائی گئی تھیں اور ان کے اوپر سکے کی پلیٹیں لگائی گئیں' اس میں ایک طاق رکھا کہ جب اس میں سے انسان دیکھے تو مسجد کی نچلی چھت نظر آئے اور اس پر موم میں بھیگا کپڑا لگایا گیا پھر چھت پر اس قبے کے گرد قریب ہی سکے کی پلیٹیں بچھائی گئیں' اسے اور قبہ کو لکڑی کی جالی نے گھیر رکھا تھا جو پختہ اینٹوں کی جگہ بنی تھی اور اس کے نیچے دو چھتوں کے درمیان لکڑی کی جالی تھی جس نے اس چھت کو گھیر رکھا تھا جس میں چھوٹا دروازہ تھا جس پر موم میں بھیگا کپڑا لگا تھا۔ تاریخ مدینہ لکھنے والے کسی مؤرخ نے اسے بنانے والے پر زیادہ بحث نہیں کی البتہ "الطالع السعید الجامع اسماء الفضلاء و الرواۃ باعلی الصعید" (جو کمال احمد بن برھان عبد القوی ربعی کے حالات میں لکھی گئی ہے جو قوس کے وزیر تھے) میں میں نے دیکھا کہ انہوں نے سرور عالم ﷺ کی قبر انور پر یہ قبہ بنایا تھا اور مقصد صرف بھلائی اور ثواب تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس نے بڑھئی لوگوں کو روضۂ انور سے اونچا کر کے اور لکڑے کے کام میں آواز پیدا کر کے بے ادبی کی تھی۔ کہتے ہیں کہ اسی سال اس کے اور کچھ دوسرے والیوں میں بحث مباحثہ ہو گیا جس میں کمال کو مارنے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ پیٹا گیا۔ اس موقع پر اسے بے ادب کہنے والے نے کہا کہ یہ اسی بے ادبی کی سزا ہے' امیر علم الدین شجاعی نے اس کا پیچھا کیا اور اس کا گھر برباد کر دیا' وہاں سے سنگ مرمر اور مال و دولت اٹھا لے گیا۔ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت مدرسہ منصوریہ میں تھے۔

اس کی تائید' حضرت انس بن مالک کی ابو داؤد میں ذکر شدہ روایت سے ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی طرف تشریف لے گئے اور گنبد دیکھا جو بلند تھا' فرمایا: یہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ یہ فلاں شخص کا ہے جس کا تعلق انصار سے ہے' آپ خاموش ہو گئے اور یہ بات دل میں رکھی اور جب اس کا مالک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور لوگ بھی تھے) تو آپ نے چہرۂ انور پھیر لیا' ایسا کئی مرتبہ ہوا تو اس شخص کو ناراضگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا کہ آپ ناراض محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آپ باہر نکلے تو تمہارا یہ گنبد دیکھا ہے چنانچہ وہ

گھس گیا اور گنبد گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔

گنبد بنانے کی اصل

ایک دن رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے تو وہ گنبد نہ دیکھا۔ پوچھا: گنبد کہاں گیا؟ صحابہ نے عرض کی کہ گنبد والے نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ نے اس سے منہ پھیر لیا ہے تو ہم نے اسے وجہ بتائی جس کی بناء پر اس نے گرا دیا ہے۔ اس پر فرمایا: ''ہر مال ایک وبال ہے' ہاں جہاں خرچ کرنا ضروری ہو' وہاں خرچ کرنا چاہئے۔''

الملک الناصر حسن بن محمد بن قلاوون کے دور میں یہ گنبد نئے سرے سے بنایا گیا لیکن سکہ کی پلیٹیں اپنی جگہ سے اکھڑ گئیں چنانچہ بارشوں کے نقصان کا اندیشہ ہوا چنانچہ الملک الاشرف شعبان بن حسین بن محمد کے دور میں اسے مضبوطی سے بنا دیا گیا۔ یہ ۷۶۵ھ کی بات ہے۔

پھر ۸۸۱ھ میں کچھ لکڑیوں کو نقصان پہنچا چنانچہ متولی شمس بن زمن نے اسے لکڑیاں لگا کر مضبوط کر دیا' اردگرد والی سکے کی وہ پلیٹیں اکھڑوا دیں جو چھت اور جالی کے درمیان تھیں' دیکھا تو عرصہ گذر جانے کی وجہ سے اور بارشوں کے پانی کی نمی پہنچنے کے باعث' ان لکڑیوں میں سے کچھ کھائی جا چکی تھیں چنانچہ انہیں درست کیا اور دوبارہ بناتے وقت اس میں بہت سا سکہ استعمال کیا' کچھ تو مسجد کے سٹور سے لیا تھا اور کچھ مصر سے آیا تھا نیز روضۂ انور کے گرد والے جنگلے کو بھی از سرِ نو بنایا۔ بارشوں کے پانی کی نمی حجرہ مبارکہ کی چھت تک پہنچ چکی تھی کیونکہ نمی کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے اور اس کا اثر حضرت عمر بن عبد العزیز کی تیار کردہ دیوار کے اوپر لگی ہوئی جالیوں پر نظر آ رہا تھا کہ انہیں گھن لگ چکا تھا چنانچہ متولی نے انہیں درست کر دیا اور بارشوں نے حجرہ شریف کے پردے کو بھی نقصان پہنچایا حتیٰ کہ اس کا کچھ حصہ گل گیا اور پھر دوسری آتشزدگی میں یہ سب کچھ جل گیا چنانچہ اب ان کی رائے یہ ہوئی کہ ان دنوں موجود سفید گنبد کی بنیاد ان ستونوں پر رکھیں جو زمین پر اینٹوں سے مضبوط بنائے تھے' یہ ستون انہوں نے ان ستونوں کے برابر بنائے جن کے درمیان مقصورہ شریف کی جالی تھی اور پھر شام والی جانب کچھ ستون نئے بنائے جو اس تکونی حصے کے قریب تھے جو حجرہ مبارکہ کے پاس تھے' اسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنایا تھا' یہاں ایک اور ستون بنایا اور جب اس کی بنیاد کھودی گئی تو تکون کی مشرقی جانب ایک قبر دکھائی دی جس کی لحد میں کچھ ہڈیاں تھیں اور اگر یہ روایت صحیح ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے گھر میں دفن ہوئیں تو یہ قبر انہی کی ہو گی۔

کچھ ستون بدل دئے گئے اور ان کی جگہ ستون بنائے گئے جن میں سے ایک کے قریب ایک اور ستون کھڑا کیا گیا اور ان دونوں کو آپس میں ملا دیا گیا تاکہ اوپر سے انہیں ایک کیا جا سکے' پھر مسجد کی مشرقی دیوار اور ان ستونوں کے درمیان تنگی دکھائی دی کیونکہ وہاں ستون اکٹھے ہو گئے تھے چنانچہ ان کے درمیان ڈیڑھ ہاتھ کا فاصلہ ڈالا گیا کیونکہ انہوں نے اس دیوار کو گرا دیا اور اسے باب جبریل تک از سرِ نو تعمیر کیا لیکن باب جبریل کو اس کی جگہ سے تبدیل نہیں کیا۔

پھر گنبد مبارک میں اوپر شگاف پڑ گیا جس میں ترمیم کا کچھ فائدہ نہ تھا چنانچہ سلطان نے شجاعی شاہین جمالی کو اس بارے میں سوچنے کو کہا اور منارۂ رئیسیہ کو بھی بنانے کا حکم دیا جس کی نگرانی شیخ حرم کے ذمہ لگائی۔ مشورہ کے بعد اس بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ منارہ کے اوپر کے حصے کو گرا دیا جائے اور اسے قدرے گھٹا دیا جائے چنانچہ اس کے نیچے تختیاں لگا دیں تاکہ کوئی چیز روضہ مبارکہ پر نہ گر سکے پھر اس کا اوپر والا حصہ گرایا گیا اور اسے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بنا دیا گیا' اس سلسلے میں مصر سے چپس منگوائی گئی اور اسے شامل کر لیا گیا چنانچہ یہ بہت خوبصورت اور مضبوط بن گیا اور جب مکمل ہو گیا تو وہ چھت زائل کر دی گئی۔ یہ واقعہ ۸۹۲ھ کا ہے۔

حجرہ مبارکہ کو گھیرنے والا مقصورہ (جالی)

رہا وہ مقصورہ شریف جو حجرہ شریفہ پر ستونوں کے درمیان حجرہ کی دیوار اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے گرد تھا اسے سلطان بیبرس رکن الدین نے بنایا تھا اور وہ یوں کہ جب ۶۶۷ھ میں اس نے حج کیا تو ارادہ کیا کہ حجرہ شریف پر لکڑی کا جنگلہ بنا دے (وہ یہی مقصورہ تھا) چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ سے رسّی کے ذریعے حجرہ شریفہ کا چوفیرا ماپ لیا' یہ پیائش اپنے ساتھ لے گیا اور جنگلہ بنوا دیا جسے ۶۶۸ھ کو بھیجا اور اس کے گرد لگوا دیا' اس میں قبلہ' مشرق اور مغرب کی طرف تین دروازے رکھے' اسے ان ستونوں کے درمیان کھڑا کیا جو حجرہ سے ملتے تھے لیکن شام کی طرف نہیں تھے کیونکہ اس طرف سے انہوں نے حضور ﷺ کے مقام تہجد تک اضافہ کیا تھا۔ پھر ۶۷۹ھ میں اس مقصورہ کے اندر ایک اور دروازہ نکالا گیا جو دو برآمدوں کے پاس شمال میں کھلی جگہ پر تھا' پہلی آتشزدگی سے پہلے اس پر اونچی چھت تھی جسے لکڑی کے کواڑ نے گھیرا ہوا تھا' پھر یہ دروازہ نکالا گیا اور مسجد کی کھلی جگہ کی طرف سے اس کے سامنے ہلکی سی چھت بھی تھی جو پہلی چھت سے بالکل قریب چھ ہاتھ کے فاصلے پر تھی' اس میں بھی دھوپ سے بچاؤ کے لئے لکڑی کا پردہ تھا۔ اس کے نیچے ملائم مرمر تھا جو اس مرمر جیسا تھا جس کا پہلے ذکر آ چکا' اسے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دیوار کے گرد زمین پر مقصورہ کے اندر زمین پر بچھایا گیا تھا۔ یہ کام سلطان الظاہر جقمق کے دور میں ۸۵۳ھ کو ہوا۔

زین مراغی کہتے ہیں کہ جو جنگلے رُکن الدین بیبرس نے بنوائے تھے اور جو دوہرے قد انسانی جتنے تھے' جب سال ۶۹۴ھ آیا تو سلطان زین الدین کتبغا نے اس کے گرد جالی لگا دی جسے مسجد کی چھت سے ملا دیا۔ انتہٰی۔

پھر متولی نے بھی اس مقصورہ کا کچھ حصہ بنوایا جو پہلی عمارت میں روضہ مبارکہ سے ملا ہوا تھا اور پھر دوسری آتشزدگی میں جل گیا تھا چنانچہ اس کے بدلے انہوں نے قبلہ کی طرف تانبے کی جالیاں لگا دیں اور اس کے اوپر تانبے کی زرد جالی لگوائی' یہ حجرہ مبارکہ کو گھیرنے والی لکڑیوں کے درمیان تھی پھر حجرے کے باقی حصوں پر' جو شام کی طرف ہے اور مشرق و مغرب میں متصل ہے' لوہے کی بنی جالیاں لگائیں اور ان کے اوپر تانبے ہی کا پردہ لگایا' اس سے پہلے لوہے کی یہ جالی کسی نے نہیں لگائی تھی' تکون کے پیچھے فاصلہ چھوڑ کر لگائی' اس میں دو دروازے تھے' ایک تو تکون کی دائیں طرف اور

ایک بائیں طرف ہے، یہ جالی اس حجرہ کے درمیان آ گئی جو شام اور اس کے مقابل کے درمیان واقع ہے، اب اسے ہی حجرہ شریف کہا جاتا ہے اور اسی کے دروازوں کو حجرہ کے دروازے کہا جاتا ہے اور اس پر لٹکی قندیلوں کو حجرہ کی قندیلیں کہہ دیتے ہیں۔

بدر بن فرحون کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مغرب کی طرف اس مقصورہ سے متصل ایک مقصورہ تھا اسے ہٹا دیا گیا: وہ کہتے ہیں: پہلے لوگوں سے غفلت ہو گئی چنانچہ انہوں نے حجرہ مبارکہ پر ایک بڑا مقصورہ بنایا جس کا مقصد غروبِ آفتاب کی دھوپ سے بچانا تھا' یہ ایک بدعت و گمراہی تھی' اس میں شیعہ لوگ نماز پڑھتے کیونکہ انہوں نے صفیں کاٹ دیں اور کئی برے کام کئے جس پر اسے بنانے والا شرمسار ہوا' میں نے بھی ان میں سے ایک کو سنا جو اس کے دروازے پر کھڑا ہو کر بلند آواز سے یوں اذان دے رہا تھا: حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ ۔ یہاں وہ تدریس کرتے' ان کے علماء بیٹھتے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک شخص مسلط کیا' چنانچہ ایک رات اس کے دروازے اکھڑ گئے' لکڑیاں قوس بن گئیں اور صفیں آپس میں مل گئیں اور ان میں سے کچھ حجرہ میں چلی گئی (یعنی جو کچھ جنگلے میں تھا)' اس میں انہوں نے شام کی طرف دروازہ رکھا اور یہ دو برآمدوں ہی کے ساتھ رکھا جسے ملک ناصر نے اضافہ کیا تھا۔ انتہٰی۔

مجھے ایک شیخ مدینہ نے بتایا کہ یہ مقصورہ ستونِ وفود کی شامی جانب تھا جو حجرے کی شامی جانب میں حجرے کے دروازے کی جانب تھا' آج کل شیعہ لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں' ابن نجار نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے بارے میں جو فرمایا ہے کہ: ''ان کے گھر کے گرد آج مقصورہ ہے جس میں محراب ہے اور وہ نبی کریم ﷺ کے حجرہ کے پیچھے ہے۔'' تو اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ آتشزدگی سے پہلے یہاں مقصورہ موجود تھا اور شاید مقصورہ بنانے کی یہی دلیل سلطان رُکن الدین کے سامنے تھی۔

علامہ مطری نے اس مقصورہ سے سلطان کی غرض بتاتے ہوئے لکھا ہے: ''الملک الظاہر کا خیال تھا کہ اس نے جو کیا' وہ حجرہ مبارکہ کی تعظیم کے لئے کیا تھا چنانچہ اس نے ریاض الجنہ کا وہ حصہ جو حضور ﷺ کے گھر سے متصل ہے' تھوڑا سا چھوڑ دیا اور اس میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا حالانکہ اس کی فضیلت اور اس میں نماز کی فضیلت تسلیم شدہ ہے اور اگر وہ اس کا عکس کرتے اور نبی کریم ﷺ کے گھر کی پچھلی طرف جو مشرقی جانب ہے اور جنگلہ کو آپ کے گھر سے ملا دیتے جو ریاض الجنہ سے ملا تھا تو یہ ہلکا کام ہوتا کیونکہ یہ مشرقی جانب نہ تو ریاض الجنہ میں شمار ہوتی ہے اور نہ ہی مسجد میں گنی جاتی ہے بلکہ یہ تو ولید کے زمانے میں اضافہ ہوا تھا۔

کہتے ہیں: آج تک میرے پاس یہ بات نہیں پہنچی کہ کسی اہل علم اور اہلِ صلاح نے' جو وہاں موجود تھا اور نہ ہی ایسے شخص نے اس جگہ کو چھوڑنے کے بعد' اس بات کو ناپسند کیا ہو یا اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہو اور اس کے دل میں کھٹکی ہو۔ یہ ایسی بات ہے جس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

علامہ زین مراغی اس کے بعد لکھتے ہیں: یہ بات جاننے کے لائق ہے کہ سلطان ظاہر کے لئے اس کام کرنے کا

ثبوت موجود ہے (اس سے پہلے بھی یوں ہو چکا ہے) کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی اس ریاض الجنہ کا کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا' اگر چہ وہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ انتھی۔

میں کہتا ہوں' جگہ چھوڑنے کی بنیاد اسے اچھی طرح یہ معلوم ہونا تھا کہ حجرہ مبارکہ کی وہ دیوار جو باہر کی دیوار کے اندر تھی' اس سے قبل وہ حضورﷺ کے دور میں مسجد کی انتہاء تھی حالانکہ ہم حدود مسجد کے بیان میں جو کچھ پہلے بتا چکے ہیں وہ اس بات کا رد کرتی ہے اور اگر تسلیم بھی کر لیں کہ یہ مسجد کی انتہاء تھی اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے جو یہ دیوار بنائی تھی تو اس کا مقصد قبر شریف کی حفاظت تھا اور اس لئے بنائی تھی کہ قبر شریف کی طرف منہ کرنا شمار نہ ہو سکے جیسے ہم پہلے بتا چکے جبکہ یہ مقصورہ اس کی ضد تھا۔ واللہ اعلم۔

علامہ بدر بن فرحون شیخ علی واسطی کے حالات میں لکھتے ہیں: ''مجھے جمال الدین (مطری) نے بتایا کہ شیخ علی نے الملک الناصر کو پیغام بھیجا: اگر تم میری ایک حاجت پوری کر دو تو میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تین حاجتیں پوری فرما دے گا' میری حاجت یہ ہے کہ تم حجرہ مبارکہ سے یہ جالی ہٹا دو یعنی یہ مقصورہ ختم کر دو۔ اسے یہ بات پہنچ گئی' وہ رُک گیا اور یہ جالی نہ ہٹائی۔

بدر بن فرحون کہتے ہیں: کاش اس نے یہ جالی ہٹا دی ہوتی کیونکہ جو جالی حجرہ مبارکہ کے گرد ہے' یہ مسجد کے ایک کٹے ہوئے حصے میں تھی اور اس نے ریاض الجنہ کا کافی حصہ چھوڑا تھا' پھر ہر دور میں یہ بنتی رہی اور تعمیر ہوتی رہی جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے اور اس میں ان کا کافی حصہ داخل کر دیا گیا یعنی جب بھی مقصورہ زائل کیا گیا۔

علامہ مجد شیرازی' مطری کے اس بیان کے بعد لکھتے ہیں: مطری کے بیان کی توجیہ بیان کی جائے گی ہاں ایک دروازہ ان لوگوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہا جو یہاں داخل ہونا چاہیں یا زیارت کے لئے آئیں تو نماز کا ارادہ رکھنے والے کے لئے یہاں داخل ہونا اور ریاض الجنہ کے اندر پہلی صف میں کھڑا ہونا ممکن ہو۔ یہ بات پوشیدہ نہیں جنگلہ کو حجرہ کے قریب بنانے سے حجرہ کی بنیاد اصل ٹھکانہ سے خارج ہو جاتی ہے اور اس میں زائرین کے لئے نہایت تنگی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے بالخصوص اس وقت جب خاص موسم میں لوگوں کی بھیڑ ہوتی ہے کیونکہ ایسے وقت میں تو اس وقت یہاں لوگوں کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اگر یہ جنگلہ حجرہ مبارکہ سے ملا ہوتا تو پھر کیا حال ہوتا؟

یہ نہ کہا جائے کہ یہ حصہ زائرین کے لئے مشرق کی طرف سے وسیع تھا کیونکہ لوگ تو اسی طرف سے آیا کرتے ہیں' اس لئے کہ آپ کا سرِ انور اسی طرف سامنے ہے اور اس طرف سے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حضورﷺ پر سلام پہلے پڑا جا سکے' یہ نہ ہو کہ شیخین سے گزر کر آگے آنا پڑے' یہ بات بہت قابلِ غور اور صحیح ہے۔ پھر کہتے ہیں: اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں اور نہ ہی اس طرح ریاض الجنہ کی کوئی جگہ معطل ہوتی ہے بلکہ نمازیوں کی سستی بھی ہو تو معطل نہیں ہو سکتی اور پھر میں نے بہت سے نمازیوں کو دیکھا ہے کہ جمعہ کے دن جنگلے کے اندر نماز پڑھتے ہیں۔ انتھی۔

میں کہتا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے' وہ ان کے دور کے لحاظ سے صحیح ہے کیونکہ یہ دروازہ ان دنوں ہر وقت

کھلا رہتا تھا' یہی بات ابنِ جماعہ نے بھی اپنی منسک میں لکھی ہے اور انہوں نے حوالہ دیا ہے کہ یہ صرف موسم میں بند ہوا کرتا تھا چنانچہ لکھتے ہیں کہ: ''یہ جنگلہ ریاض الجنۃ کی حجرہ شریف کے متصل جگہ چھوڑ کر بنایا گیا ہے چنانچہ حجرہ مبارکہ اور جنگلہ کی درمیانی جگہ موسم حج میں عورتوں کے اپنے بچوں کے ہمراہ ٹھہرنے کی جگہ ہوتی ہے کیونکہ بسا اوقات یہاں چھوٹے بچے پیشاب پاخانہ بھی تو کر سکتے ہیں اور ۷۳۲ھ میں جنگلہ بند رکھنے کے بارے میں میری الملک الناصر سے اس وقت بات ہوئی تھی جب وہ حج و زیارت کرنے آئے تھے چنانچہ وہ چپ ہو گئے تھے اور کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یہ بات غور کرنے کی ہے انتہی۔''

چنانچہ اس کے بعد دروازہ ہمیشہ کے لئے بند رہا' اسے صرف اس وقت کھولا جاتا جب قندیلیں وغیرہ جلانا ہوتیں پھر یہاں اسی وجہ سے کوئی داخل بھی نہ ہوتا' صرف خادم' صفائی کرنے والے اور باوقار شخص داخل ہوا کرتا اور وہ بھی خدام کے شیخ کی اجازت سے' وہ رات ہی کو داخل ہوتے' اس سے یہ بات پکی ہوگئی کہ زمین کا یہ ٹکڑا فارغ ہے پھر لوگ ستونِ سریر کے تبرک سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ اس کی جگہ اس کے ستون کی شرقی جانب ہے یونہی اس جگہ ٹھہرنے سے بھی محروم ہو گئے جہاں پہلے بزرگ ٹھہرتے تھے' جو اس کے اور حجرہ شریف کے درمیان تھی یا قبرِ انور سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھی؛ یونہی قبر انور کے مربع حصے اور مقامِ جبریل سے بھی محروم ہو گئے جیسے ہم بتا چکے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے تبرک حاصل کرنا بھی رہ گیا کیونکہ یہ ساری چیزیں اسی مقصورہ مبارکہ کے اندر ہیں بلکہ یہی مقصورہ ان سے بھی بڑے کام کا سبب بن گیا اور وہ اس زمین پر ستون کھڑا کرنا ہے کیونکہ یہ عوام اور مسجد کے معاملات سے ناواقف کے نزدیک مسجد میں داخل نہیں بلکہ حجرہ میں شامل ہے چنانچہ وہ اس سے وہی معاملہ کرتے ہیں جو غیر مسجد کی جگہ سے کیا جاتا ہے اور جب لوگ اس میں شریک ہونے لگے تو میں نے واضح طور پر اسے حرام قرار دے دیا چنانچہ کسی نے اشارہ دیا کہ ان ستونوں پر گنبد بنا دیا جائے' بنیاد کی ضرورت نہیں اور پھر اس سے ہٹ بھی گئے حالانکہ میں اس وقت مصر میں تھا۔

دروازے بند رکھنے کا سبب یہ ہوا کہ شام کے قاضی نجم بن حجی نے جب حج کا ارادہ کیا تو یہاں لوگوں کی بھیڑ دیکھی جیسے ابن جماعہ اشارہ کر چکے' اس پر انہوں نے اسے بند کرنے کا فتویٰ دیا' حضرت ولی عراقی نے اس وقت اس کے خلاف فتویٰ دیا کہ اسے کھول دیں' جب وہ الحاج المصری کے ہمراہ آئے تھے۔ مجھے مشائخ حرم میں سے ایک نے بتایا تھا کہ یہ واقعہ ۸۲۲ھ کا ہے اور اب تک یونہی ہو رہا ہے جیسے ولی عراقی نے فتویٰ دیا تھا اور جب ولی نجم بن حجی دیوانِ انشاء کے والی بنے تو انہوں نے سلطانی رسموں کے پیش نظر ۸۲۸ھ میں اسے بند کرنے کا حکم دیا چنانچہ آج تک یونہی چلا آ رہا ہے۔

پھر میں نے علامہ مجد کے کلام پر حافظ جمال الدین بن خیاط یمنی کے قلم سے حاشیہ لکھا دیکھا' الفاظ یہ ہیں:

''شاہِ مصر و شام الملک الاشرف برسبائی کے دور میں ۸۳۰ھ کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ مذکورہ جنگلے کے دروازے بند کر دیئے گئے چنانچہ جنگلوں کے باہر ہی سے لوگ زیارت کرتے ہیں' حجرہ پر اور کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا' ان کا ارادہ یہ ہوتا

ہے کہ اس طرح احترام زیادہ ہے اور روضۂ مبارکہ اس طرح بہت ہاتھ وغیرہ لگانے والوں سے بچا رہتا ہے کیونکہ اکثر جاہل عرب وغیرہ قبر انور کے صندوق اور دیوار سے پیٹھ لگا دیتے ہیں اور اسی کو تبرک سمجھ لیتے ہیں حالانکہ بھلائی تو صرف ادب ہی میں ہوتی ہے انتہی۔"

میں کہتا ہوں' درست طریقہ یہ ہے کہ ان دروازوں میں سے کچھ کھول دیئے جایا کریں اور خاص طور پر اس وقت جب خاص موسم نہ ہو' یہ طریقہ مناسب نہیں کہ ایسی خرابی دور کرنے کے لئے وہ دروازے بند رکھے جائیں اور اس زمینی ٹکڑے کو بیکار کر دیا جائے' ضرورت یہ ہے کہ وہاں خادم کھڑے ہوں اور ادب نہ کرنے والوں کو روکا کریں۔علاوہ ازیں اس طرح فساد کی جڑ تو کٹ نہیں سکتی کیوں یہ کام (جاہلوں کا ہاتھ لگانا اور پیٹھ لگانا) آج بھی تو ان جنگلوں سے کئے جا رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جس دیوار سے یہ معاملہ کیا جاتا ہے' یہ قبر تو ہے نہیں بلکہ قبر کی دیوار بھی نہیں بلکہ ایک اور دیوار ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے جیسے اس مقصورہ نے اسے گھیرا ہوا ہے تو اگر اس طرح کرنے سے وہ جگہ معطل اور بیکار ہو جاتی ہے تو پھر اس سے ساری کی ساری مسجد کو بیکار کر دینا چاہئے جبکہ مسجد کو بیکار جاننا یا اس کے کسی حصے کو بیکار سمجھنا حرام ہے لہٰذا ایسا کام ممکن حد تک کرنا ہی نہیں چاہئے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ موسم میں کئی بار وہاں پلیدی دیکھی گئی تو اس کے جواب میں ہمارے شیخ شیخ الاسلام فقیہ العصر شرف الدین مناوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ یہ جگہ مسجد کا حصہ ہے تو اگر وہاں پلیدی کا ہونا' مسجد کو بیکار کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور بند کرنے سے مسجد کی حفاظت ہوتی ہے تو ساری مسجد کو بند کر دینا چاہئے کیونکہ مسجد کو بچانے اور قبر انور کو تعظیم دینے کا معاملہ ایک ہی حکم رکھتا ہے اور یہ اس دیوار کے متعلق بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس پر موجود ہے اور تعظیم کا طریقہ تو اس سے رُکنا ہے علاوہ ازیں دیوار کو ہاتھ لگانا اور چومنا ان امور سے نہیں جن میں کراہت پر اجماع ہو۔

جب ہمارے آقا السلطان الملک الاشرف قایتبائی ۸۸۴ھ کو زیارت کے لئے مدینہ منورہ آئے تو روضہ شریفہ میں میں ان کے ہمراہ تھا' میں نے ارادہ کیا کہ موسمِ حج کے علاوہ ان دو دروازوں میں سے کچھ کو کھول دینے کی بات کرتا ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں آ کر وہ اس مقصورہ میں داخل ہونے کو برا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں: مجھے زیارت کے لئے اس سے بھی دور کھڑا ہونا پڑے تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں اور وہ اسے تعظیم سمجھ رہے ہیں تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ میرے ارادے کے موافق نہیں ہیں۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۲۸

ہمارے دور میں حجرہ مبارکہ کی ایسی تعمیر جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھی' یوں پہلی آتشزدگی کے نقصان کی صفائی ہوئی' جسم انور کس طرح رکھا ہے اور یہ بیان کہ اس عمارت میں حجرہ شریف کس حیثیت میں ہے

غور سے سنئے کہ حکومت اشرفیہ میں مسجد کی ایک چھت جسے نیا بنایا گیا تھا' اس کی کسی لکڑی میں ٹوٹنے کے آثار دکھائی دیئے چنانچہ اشرف کے مقرر کردہ شاہین جمالی جدہ سے واپسی پر مدینہ میں آئے تو انہوں نے انہیں مسجد کی چھت دکھائی اور وہ پانچ کونی دیوار بھی دکھائی جو حجرہ مبارکہ کے گرد تھی کہ اس میں قدیم شگاف تھا جو غلاف اُٹھانے پر انتہائی مشرقی جانب شمالی پہلو میں دکھائی دیتا تھا چنانچہ انہوں نے غلاف اُٹھایا اور اس معاملہ میں کچھ سمجھداروں کو بلایا گیا' کچھ نے ٹھیک کرنا ضروری جانا اور کچھ نے کہا کہ یہ ضروری نہیں' میں بھی شاہین کے پاس بیٹھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ضروری نہیں کیونکہ یہ شگاف دیوار کی لمبائی میں ہے' چوڑائی میں نہیں' یہ عرصے کا ہے اور اس میں چونا بھرا ہے اور اس پر چھت بھی نہیں جو بوجھ بنے جس سے ہمیں کوئی خدشہ ہو۔ میں ان کی اس بات سے تعجب میں پڑ گیا۔

پھر ۸۷۰ھ میں ہمارے آقا سلطان الاشرف نے مسجد کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی اور مسجد قباء کا منارہ گرنے کا پتہ چلا' ایسے کاموں پر جناب خواجگی شمسی بن زمن مقرر ہوتے تھے پھر مدینہ کے اندر ان کے مدرسہ زمنیہ کی عمارت بھی ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں انجام پائی تھی چنانچہ سلطان نے مسجد نبوی کی تعمیر کا انتظام ان کے سپرد کیا' وہ ۸۷۹ھ کو مدینہ طیبہ آئے اور تعمیر کا کام ان کے ذمہ لگا کر مصر واپس چلے گئے۔

پھر عمارت کی تعمیر کے لئے سلطان کے مقرر کردہ شرقی شرف الدین انصاری کو متوجہ کیا گیا' الحاج کے ساتھی مکہ مکرمہ پہنچے' وہ یہاں ایک مدت تک ٹھہرے اور تعمیر کا سامان اکٹھا کیا لیکن ۱۷ صفر کی شب ۸۸۱ھ میں فوت ہو گئے۔ کوئی معمولی تکلیف ہوئی تھی۔

پھر تعمیری کام کے لئے جناب شمسی بن زمن کو خط لکھے گئے' وہ جدہ میں تھے چنانچہ جمادی الاولیٰ ۸۸۱ھ کو وہ

مدینہ منورہ آئے اور بہت سے کاریگر ساتھ لائے اور خود ملاحظہ کرنے کے لئے یہاں ٹھہرے چنانچہ انہوں نے اوپر والی چھت درست کی نیز ایک اور چھت بنائی' نیلے رنگ کے گنبد کو مضبوط کیا جو حجرہ مبارکہ کے عین اوپر تھا' اسے چھت کے برابر بنایا' اس صندوق کی اصلاح کی جو سرانور کی طرف موجود ستون کے بالکل ساتھ تھا اور نیا قبہ بنایا۔

جب انہوں نے قدیم پایہ اور اس کے ماتحت صندوق اُتارا تو اس کے نیچے مذکور ستون کے پتھر نکلے جو ٹوٹے ہوئے تھے' وہ نگینوں کی طرح اندر سے خالی تھے اور مسجد کے قدیم تمام ستون ایسے ہی تھے' ان میں سکہ اور لوہے کی سلاخیں تھیں' اہلِ مدینہ ان میں سے ہر ایک قطعہ کو "خرزہ" کہتے ہیں اور فلکہ بھی کہہ لیتے ہیں۔اب ان کی رائے یہ ہوئی کہ چھت کی لکڑیوں کو مذکور ستون کے سرے سے گہرا کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے مذکور ستون کے گرد لکڑیوں کی مرمت کی تاکہ اس ستون کے پھٹے ہوئے خرز کو توڑ دیں' یہ چھ تھے پھر جو صحیح ستون تھے انہیں معلق کیا تاکہ اس کے بدلے میں اسے اس کی جگہ داخل کر دیں اور پھر ان خرزوں کو توڑ کر نکالنا شروع کیا لیکن یہ کام انہیں مشکل لگا اور انہیں سخت تکلیف اُٹھانا پڑی حتیٰ کہ حجرہ کی دیواریں کانپتی تھیں کیونکہ حجرہ اس ستون سے ملا ہوا تھا۔اس پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں لیکن اس وقت کیں جب خرزہ کا کچھ حصہ وہ توڑ کر نکال چکے تھے۔وہ سکّے کو نکالتے وقت پتھر سے بھی زیادہ محنت کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک میٹنگ بلائی جس میں مجھے بھی بلا بھیجا' میں پریشان ہو گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک شخص کا دل میری وجہ سے بھڑک اُٹھتا تھا اور اس کے دل میں یہ بات سما گئی تھی کہ میں اس کے ہاتھوں یہ کام ہوتے نہیں دیکھ سکتا حالانکہ پہلے وہ مجھ سے محبت رکھتا تھا پھر قدرے مجھ سے دور ہو گیا۔مجھے معلوم ہو گیا کہ اس ستون کی اصلاح سے ہٹ جانا ناممکن ہے کیوں کہ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا تھا اور اسے نکالا جا چکا تھا چنانچہ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں غور وفکر کا وقت ختم ہو گیا' میں نے ایلچی کو جواب دیدیا اور ان کے پاس نہ گیا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ بعض لوگ اس کے مخالف ہیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا حالانکہ یہ معاملہ واضح تھا پھر فیصلہ کے قریب پہنچ کر وہ بکھر گئے' کچھ دن تک وہ اس معاملہ پر سوچ بچار کرتے رہے حتیٰ کہ اسے پورا کر لیا اور ان چھ خرزات کی جگہ انہوں نے مسجد قباء کے ستونوں سے توڑے ہوئے ٹکڑے لگا دیئے چنانچہ یہ ان خرزات کے اندازے کے مطابق برابر ہو گیا' انہوں نے دوبارہ بناتے وقت اسے سکّے اور لوہے کی سلاخوں سے خوب مضبوط کر دیا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ ان کی طاقت سے باہر تھا اور میں تعجب کرتا تھا کہ باقی ستون اوپر سے قائم ہیں حالانکہ نیچے سے بھی انہیں اُٹھا دیا گیا تھا اور وہ پتھر اور سکّے کی وجہ سے پہاڑ جیسے ہو گئے تھے لیکن محمدی مدد نے اس میں ان کا ساتھ دیا۔

پھر تاریخی صندوق اور اس کے اوپر قائم کو اپنے اپنے مقام پر رکھ دیا گیا اور وہ مرمر توڑا جس کی وجہ سے حجرہ مبارکہ کی ظاہری دیوار نئی اور مضبوط بنائی گئی تھی اور جب شمالی کونے سے مشرقی کونے تک کا مرمر اُتار رہے تھے تو ایک شگاف دکھائی دیا' یہ قدیم شگاف تھا جسے پہلے لوگوں نے اینٹیں توڑ کر اور اس میں چونہ بھر کر بند کیا تھا اور پھر اس پر سفید

چونے کا پلستر کر دیا تھا۔ یہ سفید حصہ اس مرمر اور مذکورہ دیوار کے سروں سے پھٹ گیا' انہوں نے ارادہ کیا کہ سفیدی کے نیچے کا حال معلوم کریں چنانچہ سفیدی کھرچ ڈالی اور اس میں اینٹ کے روڑے اور چونہ نکال دیا۔ اس کے نکالنے پر حجرہ مبارکہ چوکور شکل دکھائی دیا جو پانچ کونی دیوار کے اندر کی طرف تھا' اس سے ان دیواروں کا جوڑ نظر آیا جو شام والی جانب اور مشرقی دیوار سے بنا تھا اور وہاں بھی شگاف دکھائی دیا' یہ شگاف حجرہ کی اندر والی دیوار میں اس جگہ تھا جہاں دونوں دیواریں ملتی تھیں' اس میں پورا ہاتھ داخل ہو جاتا یہ شگاف بھی قدیم تھا' اسے بھی پہلے لوگوں نے بند کیا تھا پھر دیر تک یونہی رہنے سے کھل چکا تھا۔

تیرہ شعبان ہفتے کی رات تھی کہ انہوں نے مقصورہ کے اندر مذکورہ دیوار کے پاس میٹنگ کی' وہاں قاضی اور مشائخ حضرات اکٹھے ہوئے' مسجد کے خادم اور ان کے شیخ الامیر اینال بھی آئے' مجھے بھی بلا بھیجا میں پہلے کی طرح شش و پنج میں پڑ گیا پھر وضو کیا' نماز استخارہ پڑھی اور اللہ سے دُعا کی کہ مجھے اس سلسلے میں راہِ راست پر چلنے کی توفیق دے' پھر وہاں گیا اور دیکھا کہ وہ اتفاق کر چکے تھے چنانچہ میں نے وہ کچھ دیکھا جس کا ذکر پہلے کر چکا' میں نے اندر کی طرف دیکھا تو وہ ہیبت اور انس محسوس ہوا جسے نہ تو بیان کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی سمجھ میں آنے والا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ باہر کی دیوار کا شگاف اندر والی دیوار کے شگاف کی وجہ سے تھا جب وہ باہر والی دیوار کی طرف جھکی تھی اور گویا جب پہلے لوگوں نے اندر والی دیوار کا شگاف دیکھا (واللہ اعلم شاید انہوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب آتشزدگی کے بعد انہوں نے حجرہ مبارکہ کی دیوار بنائی تھی) تو اندر کی دیوار کو ان لکڑیوں سے سہارا دیا جنہیں انہوں نے حجرہ کی مشرقی جانب دیوار کے اندر اور باہر کے سروں کے ساتھ رکھا تھا' باہر کی دیوار اوپر سے ایک طرف یوں جھک گئی تھی اس کا اوپر کا حصہ نیچے والے حصے کے برابر نہ رہ گیا تھا' یوں وہ دیوار بالکل سیدھی نہ رہ گئی تھی چنانچہ اسی وجہ سے شگاف پڑ گیا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ کچھ لوگ تو چپ ہیں اور کچھ مشورہ دے رہے ہیں چنانچہ مجھے کعبہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے زیادہ بہتر معلوم ہوئی جس میں انہوں نے کعبہ کی صرف مرمت کا مشورہ دیا تھا' میرے ذہن میں یہ بھی تھا جتنا ادب یہاں ضروری ہے' وہاں نہیں چنانچہ میں نے تو کعبہ کی بناء کا حوالہ دیا لیکن کسی نے مجھ سے اتفاق نہ کیا پھر میں نے تعمیر کے ماہر انجینئر سے پوچھا (وہ اس معاملے میں ان سب سے زیادہ واقف کار تھا) کیا آپ کے اندازے کے مطابق دیوار کو گرنے سے بچانے کے لئے کچھ تاخیر ممکن ہے یا اگر پہلے کی طرح اسے مرمت کر دیا جائے تو کچھ وقت نکل سکتا ہے اگر ایسا ممکن ہے تو کچھ تاخیر کر لی جائے؟ کیونکہ اب تو اتنا کام ہی کیا جا سکتا ہے جتنی سر دست ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ مرمت اور شے ہے اور تسلی بخش کام اور ہے۔ پھر تعمیر کے متولی نے پوچھا کہ لکھا کیونکر جائے؟ اس پر قاضی زکوی شافعی ناظر نے کہا: کل گرانے والے گرانا شروع کر دیں اور سب کے دستخط لے لیں۔ متولی نے چپکے سے میرے سامنے اس کا انکار کیا اور اسے اُبھارا کر میری بات پر توجہ نہ دے۔

متولی نے اس کے بعد مجھے بتایا کہ قاضی نے خواب دیکھا ہے جس سے انہوں نے سمجھا کہ دیوار گرا دی جائے

اور پھر پکا ارادہ کر لیا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اس کے پاس بہادر جن اور دل کی ایسی مضبوطی موجود ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کسی نے اسے بتایا ہے کہ میں یہ کام اس کے ہاتھوں انجام پانا اچھا نہیں سمجھتا اور نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم کام کرنے میں وہ کامیاب ہو جائے لیکن میں اللہ اور رسول ﷺ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں' میں نے صرف یہ ارادہ کیا تھا کہ حضور ﷺ کا وہ ادب پورا کروں جو اللہ نے ان کے بارے میں ہم پر لازم کیا ہوا ہے۔

پھر اسی شعبان کی چودہ تاریخ کو انہوں نے باہر کی دیوار گرانا شروع کر دی چنانچہ انہوں نے مشرقی حصہ شمالی کونے تک گرا دیا اور یہ کونہ پانچ ہاتھ وسیع تھا نیز زمین سے اوپر کے کنارے تک چار ہاتھ تھا چنانچہ اس وقت معلوم ہوا کہ حجرہ مبارکہ والی دیوار کے اندر کی طرف جلا ہوا حصہ گرا تھا' وہاں ہم نے دیکھا کہ جلی ہوئی لکڑیوں میں سے تقریباً ہاتھ بھر کے ٹکڑے جلنے سے بچ گئے تھے۔

پھر ماہِ شعبان کی پندرہ تاریخ کو وہ اس کی صفائی کرنے آئے' ادھر متولی' ہمارے شیخ عارف باللہ سیدی شہاب الدین الاشیطی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس گئے اور ان سے عرض کی کہ برکت کی دُعاء کرنے کے لئے تشریف لائیں چنانچہ وہ مسجد کے باہر کی طرف سے آئے' اندر داخل نہ ہوئے اور وہیں فاتحہ پڑھی پھر کہا: اللہ کی برکت سے صفائی شروع کرو اور یہ کہہ کر چلے گئے۔ پھر بعد میں مجھے بتایا کہ مجھے انہوں نے کہا تھا کہ اسے گرانا ضروری ہے' میں نے ان سے کہا کہ پھر ضروری پر عمل کرو۔

جب وہ صفائی کے لئے اندر داخل ہوئے تو میں نے جلا ہوا اتنا ملبہ دیکھا کہ جسے کدال اور کسّی وغیرہ کے علاوہ صاف نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس وقت مجھے پتہ چلا کہ آتشزدگی کے وقت موجود لوگ اسے کیوں نہ اُٹھا سکے' وہ ملبہ قد آدم جتنا بلند تھا اور یہ ملبہ اوپر والی چھت' چونا اور اینٹوں کا تھا اور اس دیوار سے گرا تھا جو حجرہ مبارکہ کو نمایاں کرنے کے لئے دیوار کے اوپر بنائی گئی تھی نیز وہ ملبہ تھا جو ستونوں پر رکھی لکڑیوں کے جل جانے سے بنا تھا۔

انہوں نے صفائی شروع کی' بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے' صفائی کرتے کرتے وہ زمین تک جا پہنچے اور وہاں انہیں مسجد میں پڑی کنکریوں جیسی کنکریاں نظر آئیں' فرق صرف یہ تھا کہ یہ کنکریاں زمینی تری کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ میں نے دیوار کے باہر مرمر والی اور اندر والی زمین میں فرق دیکھا تو اندر والی زمین باہر والی سے ایک ہاتھ اور تہائی ہاتھ نیچی تھی اور اندر والی تعمیر سے پتہ چلا کہ وہ بائیسویں فصل میں مذکور صورت پر تھی کہ وہ پتھروں سے چوکور بنی تھی اور اوپر والی جگہ اُبھری ہوئی تھی اور اس کا مغربی کنارہ باہر والی دیوار کے اندر کی طرف کنارے سے بالکل ملا ہوا تھا اور دونوں کے درمیان سوئی گاڑنے کی جگہ بھی نہ تھی' نہ ہی کوئی دروازہ تھا اور نہ دروازے کا نشان' پھر شمالی کنارے سے ستون ملا ہوا تھا جس کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے' اس کا کچھ حصہ اس کنارے میں داخل تھا۔ اس میں آگ کا اثر تھا' وہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا خصوصاً اوپر سے' یہ ستون مربعۃ القبر والے ستون کی قطار میں تھا' مشرقی جانب سے اس کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

یہاں اندر کی دیوار میں وہ شگاف بھی دکھائی دیا جس کا پہلے ذکر آ چکا چنانچہ انہوں نے اس شگاف میں شمع داخل کی تو دیکھا کہ اس کے قبلہ والی دیوار میں' جو مشرق والی جانب میں تھی' ویسا ہی شگاف موجود تھا اور یہ بھی واضح ہوا کہ قبلہ کی جانب والی دونوں دیواروں کے درمیان والی عمارت قبلہ والی دیوار میں موجود ستون کے برابر تھی جہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سلام پڑھنے والا کھڑا ہوتا ہے' اسے اس مذکورہ دیوار کے لئے سہارا بنایا گیا تھا اور وہ اس وقت جب اس میں شگاف پڑا تھا اور وہ لکڑیاں بھی دیکھیں جو سہارے کے لئے مشرق میں دیوار کے اندر اور باہر لگائی گئی تھیں۔متولی نے شامی اور اس کے سامنے والی دیوار کے شگاف بھرنے میں تردد کیا۔ پھر اس دیوار (شام کی طرف والی اندر کی دیوار) کو گرانے کا عہد کیا چنانچہ اس چھت کو اونچا کرنا شروع کیا جو خود حجرہ مقدسہ کے اوپر تھی' اس وقت انہیں حجرہ مبارکہ کی پیائش کا پتہ چلا' اللہ تعالیٰ نے اس ملبے کی وجہ سے مبارک قبروں کو ڈھانپ دیا تھا پھر مجھے معلوم ہوا کہ جتنی ثابت قدمی اور ادب دکھانے کی یہاں ضرورت ہے' کہیں اور نہیں ہے چنانچہ میں یہ عہد کر کے واپس چلا آیا کہ جب تک یہ گرانے کا کام کر رہے ہیں' میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا ہاں تعمیر کے وقت ضرور شامل ہونگا پھر وہ حجرہ کی داخلی دیوار میں موجود گنبد کو مضبوط کرنے کے لئے تیار ہوئے تو میں نے ناپسند کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس سے حجرے کے بڑے حصے کے گرنے کا اندیشہ ہے اور پھر پہلے جیسی مصیبت کی بھی فکر تھی۔

پھر گیارہ شعبان کو انہوں نے اس کا پختہ ارادہ کر لیا چنانچہ شامی اور مشرقی دیوار کو اندر کی طرف سے گرانا شروع کیا تو دیکھا کہ شامی دیوار کے مغرب کی طرف نیز قبلہ کی طرف اور یونہی غربی دیوار میں کچی اینٹیں لگی تھیں جن کی لمبائی ہاتھ سے زیادہ اور چوڑائی آدھا ہاتھ تھی جبکہ موٹائی چوتھائی ہاتھ تھی اور کچھ وہ تھیں جن کا طول' عرض اور موٹائی آدھا ہاتھ تھی لیکن مشرقی دیوار میں ایسی نہیں دیکھیں اور نہ ہی شامی اور قبلہ والی میں' کچھ لوگوں نے پہلے لوگوں کے ان اینٹیں لگانے پر اعتراض بھی کیا اور اسے کم عقلی جانا' کہنے لگے کہ دورِ ولید میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی نگرانی میں کام کرنے والے کاریگر کافر تھے چنانچہ وہ یہ دھوکا کر گئے حالانکہ یہ ان کہنے والوں کی جہالت تھی جبکہ پہلے ہم حجرہ مبارکہ کی تعمیر کے بارے میں کافی کچھ بتا چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے کہ حضرت عمر بن خطاب یا ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ حجرہ مبارکہ بنایا تھا جیسے ابن سعد نے لکھا اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ عمارت عمر بن عبد العزیز کے دور میں بنی تھی تو دیکھنا ہوگا کہ وہ لوگ بڑے پرہیزگار تھے' یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے نبی کی قبر انور کی تعمیر کافروں پر چھوڑ دیتے کہ وہ ایسی عمارت دھوکے سے بنا سکتے۔

پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے بزرگوں نے جب حجرہ مبارکہ پتھروں سے بنایا کہ مضبوطی رہے اور دیرپا بن جائے جبکہ اس کے علاوہ باقی عمارت حضور ﷺ کے دور میں اینٹوں سے بنی تھی' چنانچہ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ یہاں یہ اینٹیں لگانا نہ رہ جائیں لہٰذا انہوں نے پتھروں میں وہ اینٹیں لگائیں جو کافی مضبوط تھیں یہ پتھر چونے سے لگائے گئے تھے اور واقعی اگر وہ اس مضبوطی سے نہ بناتے تو اتنی لمبی مدت تک یہ عمارت کبھی نہ ٹھہری رہتی پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ

شگاف تو اس طرف پڑا تھا جدھر یہ اینٹیں لگی بھی نہ تھیں حالانکہ ہم پہلے بتا چکے کہ وہ جانب گر گئی تھی' دوبارہ تعمیر کی گئی اور کاریگروں کا مختلف ہونا اس بات کی شہادت دے رہا ہے حتیٰ کہ مشرقی دیوار اندر ہی سے پتھروں کے ساتھ بنی تھی اور اس شگاف کا عرض دیوار کے عرض سے کم تھا۔

جب شامی دیوار کو گراتے ہوئے وہ حجرہ مبارکہ کی زمین کی تہ تک پہنچے تو اس ملبے کو ہٹانا شروع کیا جس نے مبارک قبروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ کام انہوں نے شعبان کی تئیس تاریخ کو شروع کیا تھا' وہ یہ کام غروبِ آفتاب تک کرتے رہے حالانکہ بہت سے لوگ لگے ہوئے تھے' مجھے معلوم ہوا کہ حجرہ میں لوگ بھر گئے تھے' انہوں نے کوئی جگہ صاف کرنے سے نہیں چھوڑی' ان کا خیال تھا کہ قبرِ انور حجرہ شریف کے تقریباً درمیان میں ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا جیسے ہم آگے بیان کر دیں گے۔ یہ ملبہ انہوں نے مغربی چھتے ہوئے حصے کے پاس رکھا جو اسی جانب میں چبوترے سے ملا ہوا تھا' متولی نے وہاں وہ چبوترہ بنا دیا جو وہاں دکھائی دیتا ہے۔

پھر قاضی زکوی نے متولی سے کیا ہوا تحریری معاہدہ پورا کر دیا جس پر اہل مدینہ نے تو دستخط کیے تھے لیکن میں نے نہیں کیے تھے' میرا عذر یہ تھا کہ اس سے قبل میں نے کبھی دستخط نہیں کیے۔ یہ معاہدہ انہوں نے مصر بھیج دیا اور پھر جب ماہ شعبان کی پچیس تاریخ تھی تو متولی نے مجھے پیغام بھیجا کہ صفائی کے بعد حجرہ مبارکہ کا مشاہدہ کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اس دوران میں نے سنا' کوئی تو یہ کہتا پھرتا تھا کہ قبر شریف ظاہر ہو گئی اور کوئی کہتا تھا کہ انہوں نے تمام قبروں کا نشان نہیں پایا' شوق اور غلبۂ عشق نے مجھے وہاں جانے پر مجبور کر دیا پھر یہ بھی یاد آیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی کسی سے مبارک قبریں دکھانے کو کہا تھا' پھر اگلے لوگوں نے مبارک قبروں کی تعریف کی ہوئی تھی اور اس حجرہ کی پیائش بھی لکھی تھی' یہ وہ باتیں تھیں جنہوں نے مجھے جانے پر مجبور کیا' میری حالت یہ تھی:

"اگر مجنون سے کوئی یہ کہہ دے فلاں زمین پر قبر لیلیٰ کی مٹی جا پڑی ہے تو وہ جتن لگا کر جلدی پہنچنے کی کوشش کرے گا کہ ایسی کوئی شے دیکھ سکے جسے لیلیٰ سے نسبت ہو' یوں وہ پھٹ جانے والے دل کو تسلی دے سکے گا۔"

میں نہا دھو کر تیار ہو گیا اور دل میں عظیم شخصیت سے ملنے کا خیال تھا' یہ سوچ رہا تھا' اس گھر کو چلا ہوں جہاں کرم ہی کرم اور بخشش کا سامان ہے' یہی تو ایک سہارا ہے' پھر یہ بھی خیال میں تھا:

"میں تو بڑا گنہگار ہوں' میرے چہرے پر تو گناہوں کا پردا پڑا ہوا ہے' مجھے بتاؤ کہ میں محمد ﷺ سے کیسے ملاقات کروں؟"

پھر مجھے یہ شعر یاد آیا:

"حبیب ﷺ اور ان کے قربِ الٰہی کی وجہ سے جلد اللہ تعالیٰ مجھے دامنِ عفو میں لے لے گا کیونکہ ان کا عفو بہت وسیع ہے۔"

میں نے اللہ سے دُعا کی کہ اس عظیم مقام پر جا کر مجھے ادب کرنا نصیب ہو اور ان کی تعظیم کا مجھے صحیح طریقہ بتا دے اور میری یہ حاضری قبول فرماتے ہوئے مجھ سے راضی ہو جا' میرے گذشتہ سب گناہ بخش دے چنانچہ میں نے اجازت مانگی اور حجرہ مبارکہ کی پچھلی طرف سے اندر چلا گیا اور پھر وہاں سے ہلا نہیں' مجھے وہ خوشبو آئی جو زندگی بھر سونگھ نہیں سکا تھا' پھر ڈرتے اور حیاء کرتے ہوئے سب انبیاء سے اعلیٰ نبی پر سلام پیش کیا اور اس کے بعد آپ کے ساتھ لیٹے ان صحابہ کی خدمت میں سلام عرض کیا جن جیسا دنیا بھر میں کوئی صوفی نہیں' پھر ممکن حد تک دُعائیں کیں' زمین و آسمان کے رہنے والوں کے سردار ﷺ سے شفاعت فرمانے کی عاجزانہ درخواست کی اور ان لمحات کو زندگی بھر کے لئے غنیمت جانا' اللہ اسے جزائے خیر دے جس نے کہا:

"اگر تمہیں قرب کا موقع مل جائے تو غنیمت جانو اور جو کچھ حاصل کر سکتے ہو' کر لو کیونکہ میں نے قریب آنے کے کئی دروازے کھول رکھے ہیں اور زیارت کرنے والوں کے لئے میرا دروازہ بالکل قریب ہے۔

بلند مقام کے لئے صبح کی ہوائیں چل رہی ہیں لہٰذا خوشی سے بڑے پیالے پیتے جاؤ۔

جو وقت چلا جاتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آیا کرتا' نہ ہی عزیزوں کے گھروں میں رہا جا سکتا ہے۔

دور ہونے سے پہلے بلند زمین کو غنیمت جانو کیونکہ چلے جانے والے کے لئے یہ بلند جگہ گھر نہیں بن سکتی۔

میں اس شخص سے کہہ رہا ہوں جو نجد سے گذرنے چلا ہے اور دوسرے گھروں کے مقابلے میں کامیاب ہوا ہے۔

نجد کے نرگسی پھولوں کی خوشبو سنبھال رکھو کیوں رات ہو گئی تو پھر یہ خوشبو نہیں مل سکے گی۔

جب شعبان کی بیس تاریخ لوٹ آئے تو رات دن پیتے چلے جاؤ۔

پھر چھوٹے برتنوں میں پینے کی ضرورت نہیں کیونکہ چھوٹے برتنوں میں وقت تھوڑا لگتا ہے۔"

جب میں نے جی بھر لیا تو میری آنکھوں نے اس گوشے سے فائدے حاصل کئے کہ میں مشتاق لوگوں کو اس کا تحفہ پیش کر سکوں اور اس کی پاکیزہ خبریں پیارے لوگوں تک پہنچا سکوں۔ میں نے حجرہ مبارکہ کو خوب غور سے دیکھا' زمین برابر تھی' میں نے مٹی ہاتھ میں لی تو وہ تر تھی اور اس میں ایسے کنکر تھے جو دو دیواروں کے درمیان موجود تھے جن کا ذکر پہلے آ چکا' انگلیوں سے ٹٹولنے پر دکھائی دیتے تھے لیکن ایک بھی قبر دکھائی نہیں دے رہی تھی' البتہ حجرہ مبارکہ کے درمیان میں قدرے اونچی جگہ تھی جس کے متعلق لوگوں کے ذہن میں تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر و انور ہے چنانچہ لوگ بطور تبرک اسی سے قدرے مٹی لیا کرتے تھے اور یہ بات وہم کی حد تک اس لئے جا پہنچی کہ وہاں کے لوگ حجرہ مبارکہ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے حالانکہ وہ جگہ قبر ہرگز نہیں تھی' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

قبر ہو کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ قبر انور قبلہ کی دیوار میں تھی کیونکہ انہوں نے اس شخص کا رد کرتے ہوئے فرمایا تھا جس نے یہ کہا کہ حضور ﷺ چوڑائی کے رُخ قبرِ انور میں داخل کئے گئے چنانچہ فرمایا:
''یہ بات خبروں میں سے فحش سی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر انور تو دیوار کے قریب تھی اور لحد شریف دیوار کے نیچے تھی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جنازہ قبر کی چوڑائی میں رکھا جاتا اور پھر چوڑائی میں اُتارا جاتا۔ اس سے پتہ چلا اقشمری کی یہ نقل صحیح نہیں تھی۔ انتہٰی۔

قبرِ انور پر پانی چھڑکا گیا

پھر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور پر پانی چھڑکا گیا' یہ چھڑکنے والے حضرت بلال بن رباح تھے جنہوں نے مشکیزے سے چھڑکا' سر انور سے شروع کیا اور مبارک پاؤں تک چھڑکتے گئے اور دیوار تک تر بتر کر دیا' آپ گھوم نہیں سکتے تھے کیونکہ انہوں نے قبرِ انور اور قبلہ کی دیوار کے درمیان صرف کوڑے جتنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

طبقات ابن سعد میں حضرت عبد الرحمٰن کی روایت ہے: کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں حضور ﷺ کی قبرِ انور کی دیوار گر گئی (آپ ان دنوں ولید کی طرف سے مدینہ کے امیر تھے) تو سب سے میں پہلے اُٹھا' قبرِ انور کو دیکھا تو آپ کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دیوار کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا جس سے مجھے پتہ چل گیا کہ انہوں نے آپ کو قبلہ کی طرف سے لحد میں نہیں ڈالا تھا اور اگر وہاں قبرِ انور اور قبلہ کی دیوار کے درمیان جگہ ہوتی بھی' جہاں سے آپ کو داخل کیا جا سکتا تو پھر بھی وہ قبرِ انور کی جگہ نہ ہوتی کیونکہ وہ قبلہ کی دیوار سے بہت دور تھی۔

ابن زبالہ اور یحییٰ کے مطابق دیوار حجرہ شریفہ کے گرنے کے قصہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضرت مزاحم کے حاضری دے کر باہر نکلنے پر پوچھا تھا: قبرِ انور کس صورت میں دیکھ آئے ہو؟ انہوں نے بتایا تھا کہ زمین کے برابر ہے۔ پھر پوچھا کہ ان دو حضرات کی قبریں کس شکل میں ہیں؟ تو انہوں نے بتایا تھا کہ بلند ہیں۔ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا تھا: میں اس بات کا گواہ ہوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔

قبل ازیں ہم حجرہ مبارکہ کے اندر کی بابت جو کچھ بتا چکے ہیں اور جو اس کی پیائش بتائی ہے' وہ کافی ہے پھر میں نے حجرہ مبارکہ کی زمین اور دیوارِ شامی کے اندر کی زمین اور باہر کی دیوار کے کونے کا حساب لگایا تو حجرہ مبارکہ کی زمین ڈیڑھ ہاتھ باہر والی زمین سے نیچی تھی اور یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ اندر کی کھلی زمین باہر والی مسجد کی زمین سے ایک ہاتھ اور تہائی ہاتھ نیچی تھی چنانچہ حجرہ مبارکہ کی داخلی جگہ مسجد والی جگہ سے تقریباً تین ہاتھ پست ہے۔ پھر میں نے دیواروں پر آتشزدگی کے اثرات دیکھے تو بعض دیواروں میں تین ہاتھ تک اور کسی میں دو ہاتھ تک اُونچے ملبے کے نشان نظر آئے اور یہی بات ملبہ نکالنے والوں نے مجھے بتائی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے قبلہ والی دیوار سے مشرقی جانب ملنے والے حصے کو گرایا جو چار ہاتھ سے قدرے زیادہ تھا' یہ بھی حجرہ مبارکہ کی زمین تک جا پہنچے پھر انہوں نے کچھ غربی دیوار بھی گرائی جو شام کی طرف ملتی تھی تو وہ بھی حجرہ مبارکہ کی زمین تک جا پہنچے اور یہ پانچ ہاتھ تھی' یہاں تک کھودنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ گنبد کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر سکیں جس کا وہ فیصلہ کر چکے تھے' اب حجرہ کی دیواروں میں سے صرف وہ رہ گئی تھیں جو قبلہ اور مغرب کی طرف تھیں۔اس کے بعد انہوں نے باقی رہ جانے والی دو دیواروں کو بھی پانچ پانچ ہاتھ تک گرا دیا' اب حجرہ کی بنیاد صرف اتنا حصہ رہ گیا تھا جو گرانے سے بچ گیا تھا۔پھر گراتے وقت انہوں نے قبلہ والی دیوار کے شروع میں اُوپر کی طرف پرنالہ دیکھا جو دیوار کی بناء میں تھوڑا سا جل گیا تھا اور تقریباً ایک ہاتھ بچا تھا' یہ عرعر کی لکڑی سے بنا تھا' خوشبو بہت پیاری تھی' پرنالے میں پانی بہنے والی جگہ کی گنجائش چار یا پانچ انگشت بھر تھی گویا کہ وہ پہلے صرف حجرہ مبارکہ ہی کا پرنالہ تھا پھر پہلے لوگوں نے اسے اکھاڑ کر چھت کے لئے بنائے پردے اور دیوار کے سرے کے درمیان لگا دیا اور جب حجرہ مبارکہ کو دوبارہ بنایا گیا تو میری خواہش یہ تھی کہ اسے وہیں لگا دیا جائے' متولی نے مجھ سے وعدہ بھی کیا اور جب تعمیر مکمل ہونے کو تھی تو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اسے شامی دیوار کے اوپر والے حصے میں لگا دیا ہے' وہاں' جہاں حجرہ مبارکہ کی اینٹیں باقی تھیں اور پھر اس پر انہی اینٹوں کی مٹی لگا دی گئی ہے۔

جب حجرہ مبارکہ کی تعمیر شروع ہوئی تو ان کا ارادہ یہ بنا کہ حجرہ شامی کی دیوار کے پیچھے والے ستون کو مسجد میں شامل کر دیں کیونکہ وہ پھٹ گیا تھا چنانچہ انہوں نے تکونی کھلی جگہ سے دیوار کی چوڑائی میں اسے شامل کر دیا جو مثلث شکل کا تھا۔

حجرہ مبارکہ کی دوبارہ تعمیر کا کام سترہ شعبان کو شروع ہوا تھا' اسی مذکورہ دیوار سے انہوں نے عمارت شروع کی اور غربی دیوار تک لے گئے' بنیاد میں انہوں نے حجرہ مبارکہ والے پتھر لگائے' پھر انہوں نے سوچا کہ جس گنبد کو پختہ بنانے کا انہوں نے سوچا ہے' اس کے لئے مربع بنیاد ہونی چاہیئے کہ اس کا طول' عرض سے زیادہ نہ ہونے پائے جبکہ حجرہ کی پیمائش میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا' چنانچہ انہوں نے حجرہ شریف کے تیسرے حصے پر جو مشرق اور مبارک قدموں کی طرف ملتا تھا' گول بنیاد بنائی' اور جو مشرقی دیوار کا حصہ رہ گیا تھا' اسے حجرہ کی اندر والی دیوار سے ملا دیا چنانچہ وہ حصہ اندر لے آئے جو ان دونوں کے درمیان اوپر والی دیوار پر تھا' یونہی انہوں نے قبلہ والی دیوار سے کیا جو اندر اور باہر کی طرف تھی' اسے انہوں نے پورے طور پر بند کر دیا تھا حتیٰ کہ اندر کی عمارت کے گرد کوئی خلاء نہیں تھا البتہ شام کی طرف مثلث عمارت اور حجرہ کے درمیان خلاء تھا اور گنبد کی بلندی' گنبد اور مشرقی دیوار کے درمیان بھی فضاء بن گئی اور پھر حجرہ کے بقیہ حصہ پر انہوں نے گنبد رکھ دیا اور یہ وہ حصہ ہے جو مبارک سروں کی طرف مغرب سے ملتا ہے۔

کچھ حضرات نے ارادہ کیا کہ گنبد کو اینٹوں سے بنایا جائے جسے میں نے ناپسند کیا چنانچہ متولی نے بھی اس رائے پر عمل نہیں کیا اور اسے حجر اسود کی قسم کے پتھروں سے تیار کیا اور پھر اسے سفیدی کر دی۔مجھے لوگوں نے بتایا اس گنبد کی'

حجرہ مبارکہ کی اندرونی زمین سے گنبد کے اوپر والے سرے تک' اونچائی (جہاں چاند گاڑا گیا تھا) معمول کے بارہ ہاتھ (۱۸ فٹ) تھی' یہ دستی ہاتھ کے مطابق اٹھارہ ہاتھ اور چوتھائی ہاتھ بنتی تھی اور پھر حجرہ مبارکہ کی زمین سے بھی اس حصے تک جس پر مذکورہ گنبد کی ایک دیوار بنائی گئی آٹھ ہاتھ معمولی سے قدرے زائد فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ پہلے ہاتھ کے لحاظ سے گیارہ ہاتھ بنتا ہے اور گنبد کی مشرقی دیوار کی بلندی قبروں کی اس طرف سے جس پر وہ دیوار بنائی گئی معمول کا ایک ہاتھ اور دو تہائی ہاتھ تھی' یہ بلندی اڑھائی ہاتھ سے کچھ زیادہ بنتی ہے اور یوں گنبد کی دیوار اور حجرہ کی مشرقی دیوار کے درمیان وہی فاصلہ ہو گیا جو دو دیواروں کے درمیان تھا پھر دیوار کی چوڑائی میں ایک خلاء شامل کیا گیا جسے مغرب سے تو گنبد کی دیوار گھیرتی تھی اور مشرق سے حجرہ مبارکہ کی دکھائی دینے والی دیوار اور قبلہ کی طرف سے بھی اسے حجرہ مبارکہ ہی کی دیوار گھیرتی تھی اور شام کی طرف ایک پردہ تھا جسے گنبد کی دیوار اور مشرق سے حجرہ مبارکہ کی دیوار گھیرتی تھی۔ اس خلاء کی پیائش جو گنبد کی نچلی گولائی کی سطح سے طول میں قبلہ سے شام کی طرف معمولی سات ہاتھ اور ہاتھ کا چھٹا حصہ تھی جو گیارہ ہاتھ بنتی تھی تاہم عرض میں اس کی پیائش مختلف تھی چنانچہ قبلہ کی طرف معمولی اڑھائی ہاتھ تھی اور شام کی طرف تقریباً تین ہاتھ' رہی گنبد سے شام کی طرف والی دیوار تو پہلے گذر چکا کہ انہوں نے اس کے عرض میں اضافہ کیا تھا' خلاء سے اس کے پیچھے تک اور اسے بھی مختلف چوڑائی سے بنایا چنانچہ مشرق کی طرف والی دیوار مغرب والی سے آدھا ہاتھ زیادہ ہے یونہ۔ انہوں نے گنبد کے جوڑ کے نیچے سے اس طرف دیوار کی چوڑائی دستی طور پر تین ہاتھ رکھی تھی اور دوسری طرف اس کی چوڑائی اس سے تقریباً آدھا ہاتھ کم رکھی تھی بایں طور کہ ستونِ مذکور والی جہت مذکورہ کھلی جگہ میں اس دیوار کے باقی حصے سے نمایاں ہو گئی اور پھر اس دیوار کے اوپر انہوں نے حجرہ مبارکہ کی ایک دیوار سے بچی ہوئی اینٹوں سے تھوڑی سی دیوار بنائی' یہ اینٹیں بکھر گئی تھیں تاہم ان میں سے بہت سے اکٹھی کر لی گئی تھیں۔ پھر انہوں نے اس دیوار کے تقریباً درمیان میں ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا اور جب صرف یہی دیوار رہ گئی تو اس دروازے سے انہوں نے بہت سے کنکر اندر رکھ دئے جنہیں عقیق سے لے کر آئے تھے اور یہ مسجد ہی کے کنکروں کی جنس تھے' وہ اس لئے لائے کہ انہیں دھو کر مبارک قبروں کے اوپر ڈال دیں۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بتایا دیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور قبلہ والی دیوار سے ملی ہوئی ہے اور جو کچھ ہم چہرۂ انور کے سامنے موجود چاندی کے کیل کے بارے میں بتا چکے ہیں' اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قبرِ انور کا اوّل حصہ مغربی دیوار سے دستی پیائش کے حساب سے تقریباً دو ہاتھ کے فاصلہ پر ہے کیونکہ جب ہم دونوں غربی دیواروں کی چوڑائی نکال دیں (اندر اور باہر والی دیوار) جو کیل اور مغربی ظاہری دیوار کے ابتدائی حصے کے درمیان تین ہاتھ کے قریب ہے یہ دیوار پانچ ہاتھ ہے) تو باقی سر انور تک دو ہاتھ کے قریب فاصلہ رہ جاتا ہے چنانچہ اس شخص نے میری اس بات کو بہتر کہا اور جب وہ مبارک قبروں پر کنکر ڈالنے کے لئے اس دروازے میں داخل ہونے لگے تو وہ بھی ان کے ساتھ تھا' انہوں نے کنکریاں وہیں ڈالیں جہاں میں نے کہا تھا اور شروع کرتے وقت انہوں نے وہی صورت سامنے رکھی جو مبارک قبروں کی ہے یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضور ﷺ کے کندھوں کی پچھلی طرف اور

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کندھوں کی پچھلی طرف ہے چنانچہ دونوں قبروں پر انہوں نے یونہی کنکر ڈالے' ان میں کنکر ڈالنے والا ایک شخص حنفی تھا (متولی کا داماد) لہٰذا اس نے کوہان بنا دی اور یہ کام انہوں نے مذکورہ جگہ میں بہت سارا عود اور عنبر وغیرہ کئی قسم کی خوشبوئیں سلگانے کے بعد کیا' اس مقام پاک میں خوشبو سلگانے کا یہ کام عام طور کیا جاتا ہے' کسی نے کہا تھا:

''رسول اکرم ﷺ کی خوشبو سے نسیم کو خوشبو ملتی ہے ورنہ کستوری' کافور اور تروتازہ عود کی حیثیت ہی کیا ہے؟''

پھر بہت سے لوگوں نے اس چھوٹے دروازے سے کئی کاغذ لکھ کر اندر ڈالے تا کہ نبی کریم ﷺ کی شفاعت حاصل ہو اور حجرہ مبارکہ کی برکت سے حاجتیں پوری ہوسکیں اور اس کے بعد انہوں نے وہ دروازہ بند کر دیا اور باقی دیوار کی طرح اسے مضبوط کر دیا اور پھر گنبد شریف اور اس کی تمام دیواروں پر باہر کی طرف سے چونا لگا دیا چنانچہ وہ نہایت خوبصورت ہوگیا اور اس پر پاکیزہ جگہ کا انس و محبت نظر آنے لگا پھر انہوں نے اس کے اوپر کی طرف تانبے کا چاند لگا دیا جو دیکھنے والے کو سونا معلوم ہوتا تھا اور وہ پہلی مسجد کی چھت کے قریب تھا کیونکہ یہ گنبد اس کے نیچے تھا اور اس کے بعد انہوں نے باہر کی دیوار کا باقی رہ جانے والا شگاف بند کر دیا۔

اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا اور حجرہ مبارکہ کے کچھ حصے کی تعمیر کے وقت بھی وہیں تھا' میں نے بھی برکت حاصل کرنے کے لئے کام میں ہاتھ بٹایا تھا' اس کے علاوہ میں نے' امن و سلامتی کی وجہ سے کہیں اور حصہ نہیں لیا پھر میں نے اس بابرکت جگہ کے بارے میں کچھ بچگانہ اشعار لکھے جو وسیع کرم فرمانے والے' بلند مرتبہ حبیب' شفاعت فرمانے والے اور اس مضبوط ٹھکانے والے کی خدمت میں پیش کئے' جن میں سے پہلا یہ ہے:

''ذرا ان گھروں میں تو ٹھہرو' یہ حرم کے بلند مرتبہ لوگوں کے ہیں' اس ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت کو سلام پیش کرو جن کا تعلق اصنم والوں سے ہے۔''

اس کام سے فارغ ہونے اور ظاہری دیوار کے ختم کرنے کی تاریخ اسی سال (۸۸۱ھ) ۷ شوال جمعرات تھی انہوں نے اس گنبد کی دیواروں' مسجد کی عمارتوں' مسجد کے منارہ' مسجد کی کچھ نئی چھتیں بنانے' اس پانی کا بندوبست کرنے (جو بارشوں کی وجہ سے مسجد کے گرد جمع ہو جاتا تھا) کے لئے بہت سا مال خرچ کیا اور لوگوں کے لئے سب سے زیادہ فائدہ مند کام مذکورہ پانی کو سنبھالنا تھا چنانچہ اس کا بہت زیادہ فائدہ پہنچا اور یہ سب کچھ سلطانی اشرفی دفتروں میں لکھا ہوا ہے۔ یہ سارا کام متولی جناب شمس کی زیر نگرانی انجام پایا اور یہ ہے وہ تصویر جس کے مطابق یہ عمارت بنی' حجرہ مبارکہ اور مبارک قبروں کی صورت کچھ یوں ہے۔

جهة القبلة

جهة الشرق

جهة الغرب

الشمال

پھر دوسری آتشزدگی کے بعد اس دوسرے گنبد کی تعمیر کے موقع پر جو نیلگوں گنبد کی جگہ بنایا گیا' مغرب کی طرف مقام جبریل کے پاس حجرہ مبارکہ کی ظاہری دیوار کے متصل ایک ستون اور محراب بنائے گئے اور یونہی اس کے مقابل مشرق میں بھی ستون اور محراب بنائے گئے۔

فصل نمبر ۲۹

اس عمارت کے بعد ہمارے دور میں آتشزدگی اور اس کے اثرات

اس مضمون کا میں یہاں الحاق کر رہا ہوں اور ساتھ وہ کچھ بھی لکھوں گا جس کا پہلی فصلوں میں اشارہ کر چکا ہوں کیونکہ اس وقت میں اپنی اس کتاب کا مسودہ تیار کر چکا تھا' میں عمرہ کے لئے ماہِ رمضان ۸۸۶ھ کی پہلی تاریخ کو مکہ مکرمہ چلا گیا تھا کہ اسی دوران' بیچ دوستوں کی طرف اس آگ کے بارے میں کئی خط آئے اور پھر جس نے یہ موقع آنکھوں سے دیکھا تھا' اس نے بھی' سامنے بیٹھ کر بتایا کہ یہ عظیم اور پریشان کن واقعہ گذر گیا ہے کہ رمضان شریف کی تیرہ تاریخ کو

رات کے اوّل تہائی حصہ کے آخر میں مسجد نبوی شریف آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

ہوا یوں کہ اذان پڑھنے والوں کے رئیس اور صدر المدرسین شمسی شمس الدین محمد بن خطیب اس وقت منارۂ رئیس (مشرق میں) میں کلمہ شریف کا ذکر کر رہے تھے' دوسرے مؤذن اپنے اپنے مناروں پر چڑھ چکے تھے کہ اچانک گھٹائیں چھا گئیں اور آسمانی بجلی اس دھماکے سے کڑکی جس سے سوئے ہوئے بیدار ہو گئے' ایک انگارا سا گرا جس سے منارۂ کا چاند اُڑ گیا اور مسجد میں جا گرا' اس سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے پھر منارۂ کا سرا پھٹ گیا' وہ رئیس بے ہوش کر فوراً وصال کر گئے' دوسرے مناروں والوں نے انہیں آواز دی تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا ان میں سے ایک نے پتہ چلایا تو فوت ہو چکے تھے' آسمانی بجلی کڑک کے بعد مسجد کی اوپر والی چھت' منارۂ رئیسیہ اور حجرہ مقدسہ والے گنبد کے درمیان گری اور ڈھال جتنا شگاف ڈال دیا' آگ اس پر اور نچلی چھت پر لگ گئی' خادموں نے روزانہ کے وقت سے پہلے ہی دروازے کھول دئے' ابھی روشنی بھی نہ کی تھی اور آواز دی کہ مسجد میں آگ لگ چکی ہے۔

یہ سن کر امیر مدینہ اور اس کے گھر والے مسجد میں آ گئے' کچھ لوگ آگ بجھانے کے لئے پانی لے کر اوپر چڑھ گئے۔آگ کے شعلے تیزی سے دونوں چھتوں پر بھڑک رہے تھے' انہوں نے شمال اور مغربی حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' لوگ آگ بجھانے سے عاجز آ گئے' جب بھی ارادہ کرتے' شعلے اور تیز ہو جاتے چنانچہ سوچا کہ اسے کاٹنے کے لئے سامنے والے چھت کے حصے کو گرا دیا جائے لیکن آگ فوراً وہاں پہنچ گئی اور پوری مسجد میں زبردست اندھیرا چھا گیا' بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے اور مسجد سے نکل بھاگے اور یوں وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔کچھ اور لوگ مسجد کی چھت سے شمال کی طرف بھاگے' پانی والے ڈولوں کی رسیوں کے ذریعے مسجد کے باہر پانی پلانے کی جگہوں اور گھروں میں اُتر گئے اور کچھ گر کر ہلاک ہو گئے۔کچھ لوگ مسجد کے سوراخوں سے اُترنے کے لئے دوڑے جن میں کچھ ہلاک ہو گئے' کچھ نے مسجد کے صحن میں پناہ لی اور ساتھ وہ لوگ بھی تھے جن کے اور مسجد کے دروازوں کے درمیان آگ گئی۔ ان لوگوں میں ہمارے شیخ اور عالم صدر المدرسین شمسی شمس الدین محمد بن مسکین عوفی بھی تھے۔وہ چند دن کے بعد فوت ہو گئے کیونکہ دھوئیں کی وجہ سے انہیں سانس مشکل سے آتا تھا اور بخار کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی۔

خادموں میں سے زینی شند نائب خازن دار الحرم بھی فوت ہو گئے' کچھ لوگ جلے ہوئے ملبے کے نیچے دب کر فوت ہو گئے' یہ فقیر اور سوڈان کے رہنے والے تھے۔آگ کی وجہ سے فوت ہونے والے کل افراد دس سے کچھ زیادہ تھے اور جو بچ رہے' ان کا بچ جانا حیران کن تھا کیونکہ آگ اتنی عظیم تھی کہ آگ کا گہرا دریا معلوم ہوتی تھی' ہر طرف چیخ و پکار تھی اور زبانیں منہ کو آ رہی تھیں۔اس کے شعلے دور ہی سے اثر کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد میں موجود کھجور کے درختوں پر بھی اثر کیا پھر ان میں سے کچھ حصہ منارۂ رئیسیہ پر جا لٹکا تو وہ بھی جل گیا' آگ نے رئیس شمس الدین محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے کپڑوں کو جا لیا تو وہ فوت ہونے کے بعد جل گئے۔

آگ بڑے بڑے شعلے برسا رہی تھی اور وہ شعلے مسجد کے قریبی گھروں پر بھی گر رہے تھے لیکن نقصان نہیں

کرتے تھے' ایک شعلہ سامان پر بھی گرا لیکن وہ سامان جل نہ سکا پھر مسجد کی چھت کے نیچے سے کتابوں کے بعض ذخیرے لا کر مسجد کے صحن میں رکھے گئے' آگ کے شعلے وہاں بھی پہنچے اور انہیں جلا دیا۔ بہت سارے لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے مرغابی جیسے سفید رنگ کے پرندے دیکھے جو آگ کے گرد گھوم رہے تھے جیسے وہ لوگوں کے گھروں سے شعلوں کو روک رہے ہوں۔

پھر امیر مدینہ شریف السید الشریف زین الدین فیصل جمازی نے بتایا کہ ایک بچ گو عربی شخص نے ۱۲ رمضان کی رات کو خواب دیکھی کہ آسمان میں ٹڈیاں بکھری ہوئی ہیں' ان کے پیچھے آگ لگی ہوئی ہے کہ اتنے میں نبی کریم ﷺ آگ کو پکڑ لیتے ہیں' فرماتے ہیں کہ میں اسے اپنی اُمت سے روک رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اُمت کی طرف سے بہترین جزاء عطا فرمائے۔

یہ تھی اہلِ مدینہ کو ملنے والی عظیم دہشت اور حیرت جس میں انہوں نے اس آگ کو ہولناکی دیکھی اور بھیانک منظر دیکھا' لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ آج ہلاک ہو جائیں گے۔ کچھ لوگ شعلے پہنچنے پر گھروں سے نکل گئے' کچھ بقیع کی طرف والے باب مدینہ سے نکل گئے اور کچھ اس دروازے سے نکل گئے جو مصلّٰی کی طرف تھا' وہ خیال کر رہے تھے کہ آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

حضرت شمس عثمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پورے مدینہ میں ہر طرف رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور لوگ گڑگڑا کر دُعائیں کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آگ کا معاملہ عجیب تھا' سنی چیز دیکھی ہوئی کے برابر نہیں ہوتی' پوری مسجد تنور بن گئی تھی آن کی آن میں آگ نے مسجد کی چھت کو گھیر لیا' دروازے' کتابوں کے صندوق' وغیرہ سب جل کر راکھ ہو گئے صرف وہ بچ گیا جو جلد نکال لیا تھا لیکن وہ بہت تھوڑا تھا' مسجد کے صحن والا گنبد بھی جلنے سے بچ گیا۔ پہلی آتشزدگی میں بھی بچ گیا تھا۔ میں نے اپنی کتابیں الگ تھلگ ایک کمرے میں رکھی تھیں جہاں میں رہتا تھا' یہ کمرہ مسجد کے آخر میں تھا' مجھے اس کے جلنے کی اطلاع دی گئی' اسی میں یہ اصل کتاب بھی تھی' علاوہ ازیں اور نفیس قسم کی کتابیں بھی تھیں' یہ کوئی تین سو جلدیں تھیں' اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا اور میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اسے محسوس بھی نہ کیا' ان کتابوں سے زیادہ مجھے مدینہ سے تعلق اچھا لگتا ہے اور پھر یہ بھی اس کا احسان ہے کہ میں اس وقت اس ہولناک موقع پر موجود نہ تھا کیونکہ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب میں حرمِ مکہ میں پہنچ چکا تھا حالانکہ رمضان میں میں کبھی مدینہ منورہ سے نہ نکلا تھا بلکہ شب و روز مسجد نبوی میں اوّل سے آخر تک رہتا تھا اور یہ تھا وہ سبب جس کی وجہ سے مجھے اس پریشانی سے نجات مل گئی۔

جب حجرہ مبارکہ کے برابر والی اوپر کی چھت پر شعلے بھڑکے تو گنبد سے سکہ پگھل گیا' اس کی لکڑیاں جل گئیں' اور چھت کے برابر والا نچلا حصہ بھی جل گیا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کی لگوائی وہ جالی بھی جل گئی جس کے اوپر غلاف تھا اور نہ معلوم کتنا کچھ نچلے گنبد پر آ گرا جس کی نئی تعمیر کا بیان گذر چکا ہے۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے گنبد پر گرے ملبے سے

آگ بجھانا شروع کی اور دن بھر بجھاتے رہے چنانچہ گنبد شریف صحیح سلامت رہا حالانکہ اس میں کچھ وہ سفید پتھر بھی لگا ہوا تھا جو آگ کو بہت جلد پکڑ لیتا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ تھا کیونکہ مسجد کے بہت سے ستون سکہ پگھل جانے سے گر کر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے' یہ سیاہ سکے سے تیار کئے ہوئے تھے' اس کے باوجود یوں ٹوٹے جیسے چونے کے پتھر ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سو بیس سے کچھ زیادہ تھی اور جو بچ گئے تھے' ان پر آگ کا اثر واضح دکھائی دیتا تھا نیز وہ ستون بھی سلامت رہے جو حجرہ مبارکہ کے ساتھ متصل تھے۔ اللہ ہی نے حجرہ مبارکہ محفوظ رکھا جس پر وہ لائق حمد و ثناء ہے اور پھر وہ مقصورہ جل گیا جو حجرہ مبارکہ کے گرد تھا نیز منبر بھی جل گیا اور ریاض الجنہ میں رکھا صندوق بھی جل گیا جو مصلّٰی کے سامنے تھا' ساتھ ہی اس کے اوپر والا محراب بھی جل گیا' مسجد کے اکثر ستون گر گئے' جو بچ رہے وہ بھی گرنے کے قریب تھے' منارۂ ریئسیہ کا اوپر والا حصہ بھی جل گیا' پھر انہیں خطرہ تھا کہ کچھ اور بھی گر جائے گا لہٰذا انہوں نے باقی میں سے تہائی حصہ گرا دیا۔

اس کے بعد انہوں نے سلطان مصر ہمارے آقا الاشرف' شاہ حرمین قایتبائی کو ۱۶ رمضان کے دن اطلاع بھیجی اور نائب نگران کی رائے یہ تھی کہ مسجد کے سٹوروں کے دروازے بند کر دیے جائیں اور وہ سٹور بھی بند کر دیا جائے جس میں چراغ جلانے کا تیل رکھا تھا۔ ان کی رائے یہ تھی سلطان کے احکام پہنچنے تک ملبہ اسی طرح رہنے دیا جائے کیونکہ اسے ہٹانے میں لوگوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ سب کی رائے یہ تھی کہ مسجد کا اگلا حصہ صاف کر دیا جائے اور حجرہ مبارکہ کے اردگرد کا حصہ چھوڑ دیا جائے کیونکہ قندیلوں کے گرنے کا اندیشہ تھا حالانکہ وہ ملبہ تھوڑا سا تھا' انہوں نے اس کے گرد اینٹوں کا پردہ لگا دیا۔ مسجد کے اگلے حصے کا ملبہ انہوں نے باب الرحمہ کے آخر میں لا رکھا۔ اس کام میں امیر شہر' قاضیوں' اشراف لوگوں' عورتوں اور بچوں سمیت بے شمار لوگوں نے رضا کارانہ طور پر حصہ لیا' صرف وہ خواتین اس میں حصہ لینے سے رہ گئیں جو سخت پردہ دار تھیں۔

پھر پہلے منبر کی جگہ پر انہوں نے اینٹوں سے منبر بنا دیا اور اسی وقت سے مصلائے نبوی کے سامنے نمازیں پڑھنا شروع کر دیں' باب جبریل کے علاوہ مسجد میں داخل ہونے کے لئے چھوٹے دروازے لگا دئے کہ لوگ مسجد میں داخل ہوسکیں' ان کے علاوہ باقی سب دروازے بند کر دئے' خادموں نے مسجد میں خیمے گاڑ دئے کیونکہ مسجد میں سائے کا انتظام نہ تھا' کچھ اہلِ خیر نے اپنی طرف سے کئی قندیلیں جلانے کا انتظام کر دیا حالانکہ سٹور میں کافی تیل موجود تھا البتہ اسے نکالنا مشکل تھا کیونکہ اسے بند کر دیا گیا تھا' حجرہ مبارکہ کے گرد اور چہرۂ انور کے سامنے جہاں زائرین کھڑے ہوتے تھے' وہاں پڑے ملبے میں آگ جلتی رہی' ایک دھواں دیکھنے والے شخص نے بتایا کہ اس مقام شریف سے وقفے وقفے کے بعد دھواں دکھائی دیتا تھا۔

پھر شوال کے دوران قاضی مالکیہ حضرت شمس الدین سخاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خواب دیکھی کہ انہیں کوئی کہہ رہا ہے: حجرہ مبارکہ سے آگ بجھا دو یعنی اس مقام سے جہاں سے اس کے اردگرد انہوں نے صفائی کرنا چھوڑ دی تھی'

انہوں نے تلاش کی تو آٹھ جگہوں پر آگ موجود تھی لہٰذا اسے بجھا دیا پھر انہوں نے سوچا کہ جب تک ملبہ صاف نہیں کیا جائے گا' آگ کی بنیاد یونہی موجود رہے گی چنانچہ انہوں نے اسے صاف کرنے کا تہیہ کر لیا حالانکہ نائب ناظر مکمل طور پر خاموش تھے۔

اس کام کے لئے انہوں نے قابلِ بھروسہ خادموں' فقہاء اور فقراء کو مقرر کر دیا' بہتر تھا کہ اس کام کو اولیت دیتے لیکن کیا کیا جائے کہ ہر کام کے لئے رکاوٹ ہوتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں کیا کرنے والا ہے اور جب انہوں نے صفائی کی تو سرانور کی طرف رکھے جانے والے صندوق' غلاف کا ایک پہلو اور کچھ بچھو نے صحیح سلامت تھے کیونکہ ان پر ملبہ گر گیا تھا اور وہ قندیلیں بھی مل گئیں جن کی وجہ سے اس مقام کی صفائی سے ڈر لگتا تھا پھر حجرہ مقدسہ کے گردا گرد مقصورہ شریف کی جگہ اینٹوں سے دیوار کر دی' اس میں جالیاں لگا دیں' سوراخ رکھ دیئے اور دروازے لگا دیئے۔ یہ خرچہ ایک خاتون وغیرہ نے برداشت کیا' معماروں نے آدمی اجرت لی حالانکہ خزانے میں کافی رقم موجود تھی پھر اس عورت وغیرہ نے حجرہ مبارکہ کے لئے سفید کپڑے کا غلاف بھی پیش کیا جو اس پر ڈال دیا گیا۔

اس واقعہ میں اہلِ بصیرت کے لئے ایک سبق موجود تھا کہ وہ ایک عظیم کام کے ذریعے لوگوں کو ڈراتا ہے چنانچہ اس نے اس کے لئے حضور ﷺ کا گھر منتخب کیا جو "نذیر" کے نام سے مشہور ہیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اُمت کے سارے اعمال آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور جب ہمارے برے اعمال پیش ہوتے ہیں تو اس آگ کے ذریعے ڈرایا جاتا ہے جو پیش ہوتی ہے تو اسے اس کا حکم ملتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں ہمیشہ خوفزدہ رہا کیونکہ پوری نصیحت حاصل نہیں کر سکا' اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا۝ (سورۃ الاسراء:۵۹)

"اور ہم ایسی نشانیاں نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کو۔"

نیز فرمایا:

ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۝ (سورۃ زمر:۱۶)

"اس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو' اے میرے بندو! تم مجھ سے ڈرو۔"

گویا زبان خداوندی آواز دیتی ہے کہ دیکھ کر اور سن کر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ کیا رکتے اور باز نہیں آتے ہو؟ اس عظیم مقام کو نہیں دیکھتے ہو' اسے عظیم تعلق حاصل ہے' بڑا مرتبہ و مقام رکھتا ہے' جب تم گناہگار لوگوں کے گناہ یہاں پہنچتے اور تم جیسے غافل لوگوں کی پلیدی پہنچتی ہے تو میں نے آسمان سے آگ کا دریا اتار دینا ہوتا ہے کہ اسے یہاں سے صاف کر دے اور تمہیں گناہوں پر برقرار رہنے سے ڈرائے' تم جانوں پر بوجھ والے کام نہ کرو' تمہاری نظریں' اللہ کی عام قدرت کا ملاحظہ کریں' تمہیں پہلے سے عبرت کا سبق دیا جائے اور اس سے قبل ہی تم اپنے کئے پر افسوس کرو اور جو اس ڈرانے کے باوجود نہیں رُکتا اور اس عظیم آگ کی روشنی سے ہدایت حاصل نہیں کرتا' تو اسے دیکھنا

چاہئے کہ قدیم آگ کے بعد میں نے کیا کیا پھر اسے غور کرنا چاہیے کہ اس دردناک عذاب کے مقابلے میں تمہاری کمزوری کس قدر ہے؟

مکہ میں سیلاب

یہ عجیب بات تھی کہ ابھی یہ ملبہ اُٹھا کر مسجد کی پچھلی طرف ڈالا بھی نہیں گیا تھا کہ ہر طرف سے حاجی لوگ زیارت کے لئے آ گئے اور انہوں نے بھی یہ بڑا سبق آموز موقع دیکھ لیا' انہوں نے اپنی آنکھوں سے ملبے کے بنے ٹیلے دیکھ لئے اور پھر اس سے اگلے سال ذوالقعدہ ہیں کہ ابھی حاجی مکہ میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں عظیم سیلاب بھیجا جس نے دو پہاڑوں کا درمیانی حصہ بھر دیا' ابوابِ کعبہ سے اوپر ہو گیا اور کعبہ کے اندر داخل ہو گیا اور قد انسانی سے بھی اوپر آ گیا' بہت سے گھر گرا دئے' کہتے ہیں کہ یہ ایک ہزار سے بھی زیادہ تھے اور اس کی وجہ سے اس قدر مالی و جانی نقصان ہوا جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔انہوں نے مسجد کی صفائی کے بعد دیکھا کہ صرف اس مسجد کے ملبہ کے نیچے اسی کے قریب لوگ ہلاک ہو چکے تھے' کچھ سو سے زیادہ تھے۔اس سے قبل میں نے دور جاہلیت و اسلام میں اتنا زبردست سیلاب لکھا نہیں دیکھا۔

انہوں نے ملبہ اُٹھانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ یہ حاجیوں کے آنے سے پہلے اُٹھایا نہیں جا سکے گا' مسجد حرام میں ٹیلے بن چکے تھے' اتنے میں حاجی آنا شروع ہو گئے اور ان سب نے آنکھوں سے یہ سماں دیکھا۔وہ ذات کتنی پاکیزہ ہے' ہر کام اسی کے قبضہ میں ہے' کسی کام کے بارے میں اس سے سوال کرنا ممکن نہیں' البتہ باقی ساری مخلوق سے وہ خود سوال کر سکتا ہے۔

سیلاب مکہ پر اہلِ رودس نصرانیوں کی خوشی

جب اس سیلاب کی اطلاع نصاریٰ کے شہر رودس میں پہنچی تو وہ بہت خوش ہوئے انہوں نے خوبصورت کپڑے وغیرہ پہنے اور ناقوس بجائے۔ابھی یہ دن گذرا بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عظیم زلزلے بھیج دئے جس سے ان کے شہر کی فصیل گر گئی' گرجا تباہ ہوا اور بہت سارے مکان برباد ہو گئے' اس کے علاوہ بے شمار لوگ ہلاک ہو گئے' زلزلے کئی دن تک چلتے رہے۔مجھے ان کے بارے میں اسکندریہ سے آنے والے سچے لوگوں کے خطوں سے پتہ چلا' انہوں نے بتایا کہ انہیں یہ اطلاع ان لوگوں نے دی جو سوار ہو کر رودس سے آئے تھے' وہ اس وقت وہاں سے نکلے کہ زلزلے مسلسل جاری تھے۔وہ لوگ زندہ بچ جانے والوں کو شہر سے باہر پہنچا کر لوگوں کو ملبے کے نیچے سے نکال رہے تھے۔آپ لوگ ان معجزاتِ نبویہ کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں' یہ الٰہی نشانیاں تھیں۔

سلطانِ مصر کو آتشزدگی کی اطلاع پہنچی

جب پیغام لے جانے والا شخص مصر پہنچا اور شاہِ مصر کو اطلاع ہوئی تو اسے یہ خبر ناگوار گذری چنانچہ فوری طور پر

اس نے صفائی کرنے کے احکام جاری کئے۔اس نے دیکھا کہ اگر اللہ اس کی تعمیر کا اسے اہل بنا دے تو یہ بڑا عظیم کام ہو گا اور ناموری کا باعث ہوگا' یہ اللہ کی طرف سے اس کے لئے ایک عزت ہوگی' یہ اس کے اعمالنامے میں درج ہو جائے گی جس سے اسے فائدہ پہنچے گا چنانچہ اس نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے ایک افسر سیفی امیر سنقر جمالی کو سو سے زیادہ لوگ دے کر بھیجا جن میں معمار' بڑھئی' آری چلانے والے' تیل کا استعمال کرنے والے' پتھر گھڑنے والے' کھدائی کرنے والے' لوہے کا کام کرنے والے اور مرمر لگانے والے لوگ شامل تھے' بہتر سے زیادہ گدھے اور اونٹ بھیجے۔ان کے ساتھ اپنے بھائی اشرفی شجاعی شاہین اور امیر قاسم' فقیہ' شیخ حرم بیس ہزار دینار لے کر پہنچے' سلطان نے طوز ینبع اور مدینہ میں اوزار وغیرہ بھیجنے کے لئے تیار رکھے۔پھر مدینہ شریف میں کام کرنے والے پہلے متولی الجناب العالی الخواجگی شمسی شمس الدین بن زمن کو ربیع الاوّل کے دوران بھیجا۔ان کے ہمراہ دوسو اونٹ' ایک سو گدھے اور تین سو سے زائد پہلے والے کاریگر بھیجے جن میں بوجھ اُٹھانے والے' سفیدی کرنے والے' جالیاں لگانے والے اور دیگر کاریگر بھیجے اور سفر پر روانہ ہونے سے پہلے انہیں کچھ سفر خرچ دیا' اس نے خشکی اور بحری راستوں کے ذریعے سامان بھیجنا جاری رکھا' شاید ہی کوئی سستی ہوئی ہو چنانچہ انہوں نے پوری کوشش سے کام شروع کر دیا۔

سب سے پہلے انہوں نے منارۂ رئیسیہ گرایا جسے آگ سے نقصان پہنچا تھا اور بنیادوں تک کھو دیا پھر مسجد کی دیوار کو باب السلام کے نزدیک ستون سے قبلہ کی دیوار کے آخر تک گرا دیا اور ساتھ ہی اس سے متصل مشرقی دیوار باب جبریل تک گرا دی اور وہ دیوار بھی گرا دی جو مغرب میں منارہ سے شروع ہو کر باب الرحمہ تک جاتی تھی۔منارۂ رئیسیہ نئے سرے سے بنایا اور مسجد کی مذکورہ دیوار بنا دی' مسجد کے عرض میں تھوڑا سا اضافہ کیا اور محراب عثمانی کو وسیع کر دیا' مسجد کے اگلے حصہ کی چھت ایک کر دی اور اس سے قبل منارے چھوٹے کر کے ان پر اینٹوں سے ستون بنا کر اوپر لکڑیوں کی چھت ڈال دی تھی اس سے پہلے مذکورہ ستون مسجد کی چھت سے یوں ملے ہوئے تھے جیسے مشرق و مغرب اور شام کے بقیہ حصہ والے ملے تھے پھر ستون کے دوسرے ملا کر محراب عثمانی کے اوپر ستونوں کے سروں پر گنبد بنایا تاکہ اس گنبد کو مضبوط کیا جا سکے اور پھر اس ستون کو وہاں سے نکال دیا جو اس ستون کی سیدھ میں تھا جو مصلاّئے نبوی کے سامنے موجود تھا' یہ اس کے اور محراب عثمانی کے درمیان واقع تھا پھر حجرہ مبارکہ کے عین اوپر اس کے گرداگرد عظیم گنبد بنایا جو مسجد کی زمین پر بنے ستونوں اور اینٹوں سے بنی برجیوں پر رکھا گیا' یہ اس نیلگوں گنبد کی جگہ تھا جو آتشزدگی میں جل گیا تھا' وہ نیلگوں گنبد ستونوں کے سروں پر تھا جیسے ستائیسویں فصل میں آچکا اور وہاں ہم نے بیان کر دیا تھا کہ کچھ ستون بنانے کی وجہ سے مسجد میں تنگی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ انہوں نے مسجد کی مشرقی دیوار کی چوڑائی جتنا باہر نکال دیا لیکن باب جبریل کو وہیں باقی رہنے دیا۔

پھر حجرہ مبارکہ کی مثلث کی جانب میں ایک اور ستون بنایا تاکہ وہ بنیاد مضبوط ہو سکے جس پر اس طرف گنبد رکھا تھا۔اس گنبد کے لئے انہوں نے گہری بنیاد کھودی جس کی وجہ سے وہ قبر نظر آنے لگی جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے پھر دو ستون اور برجیاں ان دو ستونوں کی جانب زیادہ کر دیں جو چہرۂ انور کے سامنے موجود ہیں' اس سلسلے میں انہوں نے چہرۂ انور کے سامنے والی جگہ کی تنگی کی پرواہ نہیں کی جو مقصورہ وغیرہ میں ہوئی تھی کیونکہ انہیں گنبد گر جانے کی فکر دامنگیر تھی اور جب انہوں نے منارۂ رئیسیہ گرایا تو اس میں ایک سٹور سا بنا دیکھا جس میں پہلے لوگوں نے پہلی آتشزدگی کے بعد قرآنِ کریم کے جلے ہوئے کاغذ رکھ دیئے تھے اور اوپر سے اسے بند کر دیا تھا چنانچہ یہ کاغذ وغیرہ لے کر انہوں نے اس گنبد کے اوپر وہاں رکھ دیئے جہاں گنبد ختم ہوا تھا' اسی وجہ سے وہاں شگاف بننا شروع ہو گیا تھا لہٰذا ان سے کہا گیا کہ یہ شگاف ان کاغذوں ہی کی وجہ سے پڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (سورۂ حشر:۲۱)

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اُتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا' پاش پاش ہوتا' اللہ کے خوف سے۔"

یہ سن کر انہوں نے وہ اوراق وہاں سے نکال لئے۔اس فیصلہ سے میں بہت حیران ہوا۔

ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے تعمیر شروع ہونے سے قبل اپنی والدہ اور اہل وعیال کے پاس مصر جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لہٰذا میں ان موقعوں پر موجود نہ تھا' اللہ نے میری قسمت میں والدہ اور اہل سے ملنا لکھا تھا' میرے آنے کے دس راتوں بعد والدہ فوت ہو گئیں' میں سولہ سال سے اپنی بیوی سے نہ مل سکا پھر اللہ نے احسان فرمایا اور میں مدینہ میں واپس آیا' مجھے جلی کتابوں کی جگہ ضروری کتابوں کی ضرورت تھی۔آ کر میں نے دیکھا تو وہ گنبد اور مسجد کا اگلا حصہ تعمیر کر چکے تھے اور مشرق سے شام کی جانب تک انہوں نے گنبد کی لکڑیاں لگا دی تھیں' چھت کی جگہ انہوں نے چبوترہ سا بنا دیا تھا نیز حجرہ مبارکہ اور قبلہ والی دیوار کے درمیان ہلکا سا گنبد بنا دیا تھا اور اس کے گرد تین اور بنائے تھے جنہیں "مجارید" کہتے تھے' ان گنبدوں کی محرابوں اور نئے منارہ رئیسیہ کے درمیان انہوں نے ہوا اور روشنی کے لئے روشن دان بنا لئے تھے' اس منارہ کا دروازہ مغرب کی طرف تھا جسے انہوں نے شام کی طرف منتقل کر دیا اور پھر اس کے سامنے زمین پر چار سیڑھیاں بنا دیں نیز اس کی ایک جانب سامان رکھنے کی جگہ (خزانہ) بنا دیا پھر پہلے دروازے والی جگہ میں ایک ایسی جگہ بنا دی جہاں خطیب خطبۂ جمعہ دینے سے پہلے بیٹھ سکے۔وہ وہاں خالی وقت میں بیٹھتے پھر باب السلام کی طرف اندر کی جانب انہوں نے دو قبے بنائے۔یہ دروازہ انہوں نے سفید و سیاہ مرمر سے بنایا تھا اور بہت سجایا ہوا تھا' دوسرے قبے بھی ایسے ہی تھے' مسجد کے اگلے حصے کی زمین نیچی کر دی اور وہ مصلّٰی شریف کی جگہ کے برابر ہو گئی' اس کے لئے انہوں نے وہاں رکھے صندوق کی جگہ محراب بنا دیا اور اسے مرمر سے خوبصورت بنایا' اسی طرح محرابِ عثمانی کو بھی خوبصورت کر دیا' حجرہ مبارکہ اور اس کے اردگرد پر مرمر لگا دیا اور قبلہ والی دیوار پر بھی مرمر لگایا' وہ عمارت دور کر دی جسے اہل مدینہ نے مقصورہ کی جگہ پر بنایا تھا جس نے حجرہ مبارکہ کو گھیرا ہوا تھا اور قبلہ کی طرف تبدیلی کرتے ہوئے تانبے کی بالیاں لگا دیں اور اس کی اوپر والی جگہ پر تانبے کی بنی ہوئی جالی لگا دی پھر حجرہ کے باقی حصے پر شام کی طرف لوہے کی

جالی لگائی جو حجرہ کی مثلث کی داہنی طرف ذرا فاصلے پر تھی' اس کی بائیں جانب دو دروازے تھے۔ پھر منبر اور مؤذنوں کے لئے مرمر کا چبوترہ بنایا نیز باب الرحمہ اور باب النساء کی طرف آخر میں بھی دو چبوترے بنائے جن میں سے ایک چھتے ہوئے غربی حصے میں اور دوسرا مشرقی جانب تھا' انہیں شامی چبوترہ سے نیچا رکھا مسجد کا سہارا دیا اور مشرقی دیوار کو بناتے وقت کتابوں کے لئے الماریاں' اوپر کی طرف بڑے بڑے روشن دان اور گول کھلے سوراخ رکھے جن سے کھلی روشنی داخل ہو سکے حالانکہ اس سے قبل دیواروں کی اوپر والی جانب صرف ایک جالی تھی پھر اسی طرح کے روشن دان قبلہ والی دیوار میں بھی رکھے' ان طاقوں کی ابتداء میں اینٹیں لگائیں۔ اس کی ضرورت اس لئے پڑی کہ مسجد کے اگلے حصے کے ستون چھت سے ملے ہوئے تھے اور وہاں ڈاٹ نہیں تھے' صرف دو برآمدوں کے درمیان کھلی جگہ تھی جسے الناصر نے بنایا تھا اور مسجد کے اگلے حصے میں گرنے والے ستون بہت سے تھے کیونکہ گرانے کے وقت دو چھتوں کے درمیان والی محرابیں گر گئی تھیں لہٰذا انہوں نے مشورہ کیا یہ ستون چھوٹے بنا کر انہیں محرابوں کے ذریعے چھت سے ملا دیا جائے' اس طرح یہ ڈاٹیں روشنی پہنچائیں گی چنانچہ طاقوں کی جگہ انہوں نے یہ بنا دیں۔ پھر مسجد کے متولی نے ان گھروں کی تعمیر شروع کی جو مسجد کے قبلہ کی جانب تھے اور جنہیں ''دور العشرہ'' کہا جاتا تھا تاکہ سلطان کے نام سے مدرسہ بنا دیں۔ ان میں بھی اس نے متعدد جالیاں لگانے کا پروگرام بنایا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا ارادہ تبدیل کر دیا' اس نے پتھر لگا کر سب جالیاں بند کر دیں اور دیوار جیسا بنا دیا پھر وہ روشن دان بھی بند کر دئے جو قبلہ کی دیوار میں رکھے تھے' صرف ایک رہنے دیا جو اس قبہ کے عین اوپر تھا جو محراب عثمانی پر بنایا گیا تھا پھر اس میں اور باقی روشن دانوں میں شیشہ اور تانبے کی جالیاں لگا دیں۔

پھر متولی نے سرائے بنائی جسے ''حصن عتیق'' کہتے تھے اور اس کی شامی جانب مدرسہ جو بانیہ اور مکان بنایا جسے ''دار الشباک'' کہتے تھے (یہ سب کچھ باب الرحمہ اور باب السلام کے درمیانی حصے میں بنایا گیا) یہ اس دیوار کے گرانے کے وقت بنایا گیا۔ اس دیوار میں تین حصوں کے اندر جالیاں لگانے کے لئے کشادہ جگہ چھوڑی' یہ کشادگی تین مقامات پر چھوڑی گئی کیونکہ تیسری کشادگی باب السلام میں داخل ہونے والے کی دائیں طرف تھی اور اس جگہ تھی جہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کا چھوٹا دروازہ تھا' اسے انہوں نے مسجد کی طرف بطور دروازہ بنایا اور یونہی دو ان کشادگیوں کی جگہ باب السلام کے درمیان انہوں نے مسجد کی طرف دو دروازے نکالے' یہ تین دروازے صرف مسجد کی طرف تھے نہ کہ مدرسہ کی طرف جو مسجد کے سٹور سے شروع ہوتا تھا اور پانچویں کشادگی (جو حضرت ابوبکر کے خوخہ سے تیسری تھی) کے لئے بھی انہوں نے مسجد کی طرف دروازہ رکھا اور ان کشادگیوں کے اوپر والے طبقہ میں تانبے کی جالی لگا دی جو صرف روشنی کے لئے تھی۔

جب متولی نے مسجد کے قبلہ والی دیوار میں جالیاں لگانے کا ارادہ کیا تھا تو اس طرف انہیں منتقل کرنے سے پہلے لوگوں نے ان پر اعتراض کر دیا تھا اور بات بڑھ گئی تھی چنانچہ متولی نے سلطان کو لکھا اور علماءِ مصر سے اس بارے میں فتویٰ مانگا تھا چنانچہ بہت سے علماء نے انہیں اس طرف منتقل کرنے کا فتویٰ دیا تھا تو اس نے اسے مان لیا تھا اور جو قرآن

وغیرہ ضائع ہو گئے تھے ان کی جگہ اور دیدئے اور ان میں سے کچھ میرے ہاتھ بھیجے تھے چنانچہ میں نے بہت سے قرآن درست کر لئے پھر اس نے ضرورت کا سامان بھیجنے کا وعدہ کیا اور توفیق ہونے پر امیر کبیر فخری کے پاس بھیجا جو مسجد کے نگران اور خدامِ مسجد کے شیخ تھے۔ وہ علم اور اہلِ علم حضرات سے محبت رکھتے تھے' قرآن کی تلاوت سے عشق تھا' اس سلسلے میں ان جیسا کوئی شخص نہ دیکھا گیا' وہ قرآنوں کی حفاظت خود کرتے یا خادموں سے کراتے' پھر چھوٹی کرسیاں بنوائیں جن پر ریاض الجنہ میں قرآن رکھے جاتے اور دن کی نمازوں میں وہ خود پڑھتے اور دوسرے لوگ بھی پڑھا کرتے۔ اس طرح وہ بہت مفید رہیں۔

جب مسجد تعمیر کے آخری مرحلے میں پہنچی تو انہوں نے سرائے اور مدرسہ بنانے کی طرف توجہ دی اور ان دونوں کی ایک جانب ایک منارہ کی بنیاد رکھی جو باب الرحمہ کے ساتھ ملتا تھا پھر اس ''حصنِ عتیق'' نامی سرائے کے علاوہ ایک اور سرائے تعمیر کرنا شروع کی نیز اس سرائے کے سامنے ایک حمام بنایا جس کی زمین انہوں نے باب السلام پر موجود وضو خانے کے نگران سے اجرت پر لی پھر مسافر خانہ' تنور' چکی اور کھانا پکانے کی جگہ (مطبخ) تعمیر کرنا شروع کی۔ سلطان نے حج سے واپس آ کر مکان خریدنے شروع کئے اور انہیں وقف کر دیا تا کہ اس کی آمدن مدینہ شریف پر خرچ ہو اور اہلِ مدینہ میں بانٹی جائے اور پھر اس سے دستر خوان کا انتظام کیا جائے جیسے حضرت خلیل علیہ السلام نے کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ساٹھ ہزار دینار دئے جیسے ہم نے تینتیسویں فصل میں ذکر کیا چنانچہ یہ مکان انہوں نے اسی لئے خریدے' یہ ایسا کام تھا جسے اس سے قبل کوئی نہ کر سکا۔ اس سے پہلے عرصہ سے مدینہ منورہ میں کوئی حمام بھی نہ تھا' نہ ہی چکی موجود تھی' یہ لوگ ہاتھ والی چکی سے کام لیتے تھے۔

پھر شاہ نے اپنے بااعتماد لوگوں کو لکھا کہ ان مکانوں کے لئے مکمل طور پر محصول کا بندوبست کریں اور ان کے لئے محصول کی حد ساڑھے سات ہزار ''اردب'' سالانہ ہونی چاہیے (اردب چوبیس صاع کا اور ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کلثوم شاہ نے اس وقف کے بعد مصر میں مکان بنائے تا کہ ان سے اس وقف کو طاقت دے سکیں پھر اس نے مدینہ کے ٹیکس بند کر دئے اور وہاں کے امیر کو معاوضہ دینا شروع کر دیا۔

مسجد نبوی کی تمام چھتیں رمضان المبارک کے آخری دنوں میں ۸۸۸ھ کو مکمل ہو گئیں جبکہ مسجد کی تعمیر بعد میں ہوئی' صرف چند عمارتیں رہ گئیں جن کا ذکر ہو چکا اور مدرسہ اشرفیہ مکمل نہ ہوا۔

سال ۸۸۹ھ میں پینٹ کرنے والوں کی ایک جماعت آئی' انہیں' سلطان اشرف نے مصر سے بھیجا تھا۔ انہیں اس لئے بھیجا گیا کہ مسجد کی ایک چھت کو لاجوردی رنگ کر دیں' اس کام کے لئے انہیں سیڑھیاں دیں چنانچہ انہوں نے یہ کام احسن طریقے سے کیا۔ پھر اس نے ایک بزرگ بہاؤ الدین کو بھیجا' اس کے ساتھ سواروں کی ایک جماعت تھی جو اُس کے خاص تھے' وہ اسی سال ۷ ذی القعدہ کو پہنچے' ان کے ہمراہ مدرسہ اشرفیہ کے لئے وقف شدہ شرعی کتابوں کے لدے ہوئے اونٹ تھے' بہت سے اونٹوں پر دانے' آٹا اور دیگیں لدی تھیں جو لنگر تیار کرنے کے لئے بھیجی گئیں اور کچھ آلات بھی

تھے جو ینبع میں رکھے ہوئے تھے چنانچہ دستر خوان لگا دیا گیا اور اہلِ مدینہ میں سے ایک کو اس کے اہل خانہ کی گنتی کے لحاظ سے کافی کچھ دیا گیا' ہر شخص کو سات مصری اردب دیئے گئے' اس میں چھوٹے بڑے' آزاد اور غلام کا فرق نہیں رکھا گیا اور باہر سے آنے والوں کے لئے روٹی اور ہر دن کے کھانے کا بندوبست کیا گیا' پھر مدرسہ کا انتظام کیا اور مرمر لگانے والوں کو ان کی بقایا مزدوری دی گئی' انہیں ان کی مزدوری سے بھی زیادہ رقم دی گئی اور ان پر خاص مہربانی کی گئی چنانچہ لوگوں نے ان کے لئے دعائیں کیں۔

اس عمارت میں کام کرنے والے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ جو کچھ وہاں خرچ ہوا اور مدرسہ کی تعمیر کے شروع کرنے پر نقد رقم' آلات خریدنے کی رقم اور چوپائے وغیرہ خریدنے کے لئے ایک لاکھ بیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے لیکن کام پھر بھی مکمل نہ ہوا تھا اور پھر جب کام مکمل ہو گیا تو سلطان کو اطلاع ملی کہ متولی نے یہ رقم صحیح طور پر خرچ نہیں کی بلکہ غفلت سے کام لیا ہے اور وہ گنبد جسے انہوں نے حجرہ مبارکہ کے عین اوپر بنایا تھا' وہ پھٹ گیا تو اس کی مرمت کی لیکن وہ پھر پھٹ گیا' مرمت فائدہ مند نہ ہو سکی' ایک یہ شکایت تھی کہ منارۂ رئیسیہ ایک طرف کو جھک گیا ہے' ایسی ہی اور شکایات بھی تھیں اس پر شاہ کی طبیعت بدل گئی اور وہ متولی پر ناراض ہو گئے۔ پھر اس کام پر شجاعی شاہین جمالی کو مقرر کیا کیونکہ وہ با عزت اور بہترین رائے دیتے تھے پھر انہیں خدام کا شیخ بنایا' نگران بنایا اور لنگر کی نگرانی پر مقرر کر دیا چنانچہ وہ ۸۹۱ھ کو مدینہ شریفہ پہنچے اور لوگوں کو غور و فکر کے لئے جمع کر لیا پھر سمجھداروں سے مشورہ لیا' آخر طے یہ ہوا کہ منارۂ رئیسیہ کو گرا دیا جائے اور گنبد کا اوپر والا حصہ بھی گرا دیا جائے۔

جب منار گرایا گیا تو پتہ چلا کہ اصل خرابی بنیاد گہری نہ کھودنے کی وجہ سے پیدا ہوئی چنانچہ انہوں نے پانی تک بنیاد کھودی اور بنیاد میں بھرنے کے لئے سیاہ رنگ کے سخت پتھر منگوائے پھر بنیاد اس شاندار طریقے سے بھری کہ اس سے پہلے ایسی کوئی بنیاد نہ بھر سکی تھی' اس میں دروازہ پہلی جگہ ہی رکھا' زمین میں موجود درجیں بند کر دیں' رہا گنبد تو اس کے نیچے ایسی چھت ڈال دی کہ گنبد گراتے وقت حجرہ مقدسہ پر کوئی سامان نہ گر سکے اور پھر اسے گرانے اور تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا' حجرہ مبارکہ کا غلاف نہ اُٹھایا اور نہ ہی مسجد میں کام کرنے والوں کے لئے اس طرف راستہ رکھا البتہ مشرقی جانب سطح مسجد پر جانے کے لئے راستہ بنایا پھر منارہ کی جگہ کے درمیان پردہ کر دیا جو مسجد اور منار کے درمیان حائل تھا' ایسے لگتا تھا کہ یہاں کوئی عمارت نہیں' پھر منار کو کاریگروں کے لئے مشق کرنے کی جگہ نہیں بننے دیا۔

اب گنبد نہایت خوبصورت اور مضبوط بن چکا تھا' اس کی تعمیر میں انہوں نے مصر سے چپس منگوا کر لگوائی اور اسے تعمیر میں استعمال کیا' انہوں نے اینٹیں پختہ کرنے کا بھی انتظام کیا اور عادت کے مطابق انہوں نے کافی کاریگر لگائے' اس سے پہلے اتنا کام کرنے کی کسی کو توفیق نہ ہو سکی اور ہر ایک کو وہی توفیق ملتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہوتا ہے۔

ابن نجار نے مسلمان خلفاء کی مسجد نبوی میں خدمات کا بیان کرتے ہوئے لکھا: بنو عباس کے خلفاء مدینہ منورہ پر امراء مقرر کرتے رہے اور مسجد نبوی میں سے کوئی چیز گر جاتی تو اسے درست کرنے کے لئے امداد کرتے رہے' یہ سلسلہ

سلطان الناصر دین اللہ تک بدستور جاری رہا جو اپنے دور کے خلیفہ تھے' وہ ہر سال تعمیر مسجد کے لئے ایک ہزار دینار دیتے رہے پھر کاریگر' بڑھئی اور نقش و نگار کرنے والے لوگ بھیجتے رہے' علاوہ ازیں بغداد سے بھی امداد بھیجتے رہے پھر لوہا' سکہ اور دیگر آلات بھی بڑی مقدار میں بھیجتے رہے' مسجد کی تعمیر مسلسل جاری رہتی حتیٰ کہ ایک انگلی کی جگہ بھی ایسی نہیں جس پر انہوں نے کام نہ کیا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ ابن نجار کی وفات سے ذرا بعد مدینہ منورہ کا کنٹرول شاہان مصر کے ہاتھ چلا گیا وہ ہمیشہ اس مسجد شریف کی تعمیر کا اہتمام کرتے رہے' سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اس کام کے لئے کمر بستہ رہے اور تعمیراتی سلسلے میں سب سے بہترین شخص سلطان قایتبائی ثابت ہوئے جو ہمارے اس دور کے حکمران ہیں' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام انہی سے لیا اور یہ مرتبہ انہی کو ملا اور جو کچھ ہم چھبیسویں فصل میں لکھ چکے ہیں' اس میں غور کرنے والے کو پتہ چلے گا کہ پہلی آتشزدگی کے بارے میں جو کچھ ہم نے مؤرخین سے لے کر پہلے شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے مسجد کیسے تعمیر کرائی' اس نے کتنی مدت پائی اور کس حیثیت کے تھے اور پھر ہمارے دور کے شاہ سے اس کا مقابلہ کریں تو اسے کہنا پڑے گا کہ ہمارے سلطان بڑے بلند ہمت ہیں اور قابلِ فخر ہیں اور انہیں وہ کام کرنے کا فخر حاصل ہے جو پہلے کوئی اور نہیں کر سکا' گویا یہ پہلے وقت کے سلطان ہیں' اگرچہ یہ پچھلے شمار ہوتے ہیں۔ہم نے حجاز میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے جو نہایت اچھی ہیں' ان کے صرف چند خصوصیات بتائی ہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے تینتیسویں فصل میں بیان کیا ہے۔

خاتمہ

حضرت نور الدین شہید کی طرف سے حجرہ مبارکہ کے گرد خندق کھود کر اس میں سکہ وغیرہ بھرنے کا ذکر اور اس کی وجہ؟

دیکھئے' مجھے علامہ جمال الدین اسنوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تصنیف کردہ ایک رسالہ کو دیکھنے کا موقع ملا' جس میں انہوں نے نصاریٰ کو حکومت دینے سے منع کیا ہے' کچھ لوگوں نے اس رسالے کا نام ''الانتصارات الاسلامیہ'' رکھا ہے' میں نے اس پر ان کے شاگرد علامہ زین مراغی کے ہاتھ کا لکھا تقریباً یوں دیکھا ہے: ''نصیحۃ اولی الالباب فی منع استخدام النصاری کتاب یہ ہمارے شیخ علامہ جمال الدین اسنوی کتاب ہے'' لیکن انہوں نے اس کا نام نہیں لکھا چنانچہ میں نے ان کی موجودگی میں یہ نام لکھا تو انہوں نے اسے پسند کیا۔ انتہیٰ۔

میں نے اس میں دیکھا تو لکھا تھا: نصاریٰ کو یہ بات سوجھی کہ عادل بادشاہ نور الدین شہید کے دور میں ہم کوئی عظیم کام کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنا نور اسلام پورا کرے گا خواہ کافر برا جانیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان نور الدین رات تہجد میں گزارتے اور اپنے وظائف میں لگے رہتے' ایک دن تہجد کے بعد

وہ سو گئے' خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ دو نیلگوں آنکھوں والوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں کہ مجھے ان دونوں سے بچاؤ' آپ گھبرا کر اُٹھے پھر وضو کیا' نفل پڑھے اور سو گئے' پھر وہی خواب آئی' بیدار ہوئے' نوافل پڑھے اور پھر سو گئے' تیسری مرتبہ پھر زیارت ہوئی چنانچہ بیدار ہوئے اور کہا' اب نیند باقی نہیں رہی۔

ان کا ایک وزیر تھا' بڑا نیک' نام جمال الدین موصلی تھا' آپ نے رات ہی میں ان کے پاس پیغام بھیجا اور پھر سارا واقعہ بتایا۔ اُنہوں نے کہا: اب بیٹھنا کیسا؟ آج ہی نبی کریم ﷺ کے شہر مدینہ چلئے اور اس خواب کو چھپائے رکھئے چنانچہ رات کے باقی وقت میں انہوں نے تیاری کی اور ہلکی پھلکی سواریاں لے کر بیس افراد کے ہمراہ روانہ ہوئے' وہ وزیر بھی ہمراہ تھے' بہت سا مال ساتھ لیا اور سولہ دن بعد مدینہ منورہ پہنچے۔ شہر کے باہر ہی غسل کیا اور مدینہ پاک میں داخل ہوئے' ریاض الجنہ میں نفل پڑھے اور زیارت کی' پھر بیٹھ گئے' کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وزیر نے اس وقت کہا' جب لوگ مسجد میں آ چکے تھے کہ سلطان زیارت کے ارادے سے آئے ہیں اور بہت سا مالِ صدقہ لے کر آئے ہیں لہٰذا ہر ایک کو خط لکھ دو چنانچہ اہلِ مدینہ کو دعوتی خط لکھ دیئے گئے اور سلطان نے انہیں اپنے پاس بلا لیا' جو بھی آتا جاتا آپ اس میں وہ نشانی دیکھتے جاتے جو حضور ﷺ نے بتائی تھی لیکن ایسا کوئی نہ تھا جس میں وہ نشانی دکھائی دیتی' آپ ہر ایک کو مال دیتے جاتے اور واپس جانے کی ہدایت کرتے۔ آپ نے کہا کوئی صدقہ لینے سے رہ تو نہیں گیا؟ انہوں نے کہا، نہیں، آپ نے کہا: پھر بھی سوچ لو' انہوں نے کہا' دو مغربی لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں رہا اور وہ تو کسی سے کچھ لیتے ہی نہیں' وہ بہت نیک ہیں' غنی ہیں اور محتاجوں کو بہت سا صدقہ دیتے رہتے ہیں۔

سلطان کی سمجھ میں بات آ گئی' کہنے لگے: انہیں میرے پاس لے آؤ' انہیں لایا گیا تو دیکھتے ہی دل میں کہا کہ یہ تو وہ ہیں جن کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے اور حکم فرمایا ہے کہ میری مدد کرو اور مجھے ان سے بچاؤ۔ سلطان نے ان سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اہلِ مغرب ہیں' ہم حج کرنے آئے تھے اور اس سال ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں رہیں گے۔ آپ نے کہا: سچ سچ بتا دو! انہوں نے اسی بات پر اصرار کیا۔ آپ نے پوچھا کہ ان کا گھر کہاں ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ حجرہ مبارکہ کے قریب ہی سرائے میں رہتے ہیں۔ آپ نے ان دونوں کو وہیں روکا اور خود ان کے گھر پہنچے' دیکھا تو اس میں بہت سا مال پڑا تھا' دو انگوٹھیاں تھیں اور ایک تھیلے میں کتابیں تھیں' اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اہلِ مدینہ نے ان کی بہت تعریف کی اور بتایا کہ یہ ہمیشہ روزے سے رہتے ہیں' ریاض الجنہ میں پابندی سے نماز پڑھتے ہیں' روزانہ زیارت نبی کریم ﷺ کرتے اور روزانہ بقیع کی حاضری دیتے ہیں اور ہفتہ میں ایک بار قباء کو جاتے ہیں' کسی سائل کا سوال رد نہیں کرتے' صبح کو اس قحط کے سال میں انہوں نے اہل مدینہ سے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔

یہ سن کر سلطان نے صرف سبحان اللہ! کہا اور اپنی خواب کا اظہار نہیں کیا اور خود ان کے گھر میں چکر لگایا' ایک جگہ سے انہوں نے گھاس وغیرہ اُٹھا کر دیکھا تو ایک سرنگ نظر پڑی جو گہری کھودی گئی تھی اور جو حجرہ مبارکہ کی طرف

سیدھی جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے' سلطان نے آ کر ان سے کہا سچ سچ بتا دو اور پھر انہیں شدید مارا پیٹا۔ انہوں نے مانا کہ وہ نصرانی ہیں اور نصاریٰ نے انہیں مغربی حاجیوں کے روپ میں بھیجا ہے' بہت سارا مال بھی دیا ہے اور انہیں ایک عظیم کام کا حیلہ کرنے کو کہا ہے اور اسے خود گھڑا ہے' ان کا خیال ہے کہ اللہ انہیں اس کام میں کامیاب کرے گا' وہ کام آپ کی ذات تک پہنچنا ہے اور وہ یہ کام ابلیس کے یہ سجا کر دکھانے پر کر رہے ہیں کہ آپ کا جسم منتقل کر سکیں گے چنانچہ وہ حجرہ مبارکہ کے قریب مسافر خانہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جس کا ذکر ہوا۔

یہ دونوں رات کو مٹی کھودتے' دونوں کے پاس مغربی طرز کے تھیلے تھے' جو مٹی جمع ہو جاتی اسے ہر ایک اپنے اپنے تھیلے میں ڈال کر بقیع کی زیارت کے بہانے ادھر نکل جاتے اور قبروں کے درمیان ڈال دیتے اور یہ کام مدت سے کر رہے تھے اور جب حجرہ مبارکہ کے قریب پہنچے تو آسمان کانپ گیا اور خوب چمکا' زمین میں ایسا زلزلہ آیا' لگتا تھا کہ پہاڑ اکھڑ جائیں گے۔

سلطان اگلی صبح کو آئے' وہ دونوں وہیں تھے اور اعتراف کر چکے تھے اور جب انہوں نے اعتراف کر لیا اور ان کو پورا پتہ چل گیا اور یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں اس کام کا اہل بنایا ہے' کسی اور کو نہیں تو بہت زور سے روئے اور ان کی گردنیں اڑا دینے کا حکم دیا چنانچہ اس جالی کے نیچے قتل کر دئے جو حجرہ مبارکہ کے ساتھ تھی یہ بقیع کی طرف تھی۔

پھر سلطان نے بہت سا سکہ لانے کا حکم دیا اور پورے حجرہ مبارکہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا اور ڈھال کر اس میں سکہ بھر دیا چنانچہ حجرہ مبارکہ کے گرد پانی تک سکہ کی دیوار بنا دی اور یہ کام کر کے وہ اپنے ملک میں چلے گئے اور نصاریٰ کو کمزور کرنے کا حکم دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ کسی کافر کو کسی بھی کام میں استعمال نہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی حکم دیا کہ ان کے اوزار توڑ دئے جائیں۔ انتہٰی۔

علامہ جمال مطری نے بھی اس طرف مختصر سا اشارہ کیا ہے لیکن حجرہ مبارکہ کے گرد خندق اور اس میں سکہ بھرنے کا ذکر نہیں کیا لیکن اس سال کا ذکر کیا ہے جس میں یہ واقعہ ہوا تھا حالانکہ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی' چنانچہ انہوں نے شہر کے گرد حفاظتی دیوار کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: سلطان نور الدین محمود بن زنگی بن اقسنقر ۵۵۷ھ کو مدینہ منورہ میں ایک خواب دیکھنے کی وجہ سے آئے' جس کا ذکر ایک شخص نے کیا اور خود میں نے اسے فقیہ علم الدین یعقوب بن ابوبکر سے سنا جن کے والد مسجد میں آتشزدگی کے رات جل گئے تھے' انہوں نے ایک بڑے شخص سے سن کر بتایا کہ سلطان مذکور نے ایک ہی رات میں رسول اللہ ﷺ کی تین مرتبہ زیارت کی' ہر بار انہوں نے فرمایا کہ اے محمود! مجھے ان دو نیلگوں آنکھوں والوں سے بچاؤ جو تمہارے سامنے ہیں۔ انہوں نے اپنے وزیر کو صبح ہونے سے پہلے بلایا اور اسے یہ خواب سنائی تو اس نے کہا: یہ ایسا کام ہے جو مدینۃ النبی ﷺ میں ہوا' آپ کے سوا اسے کوئی سنبھال نہیں سکتا لہٰذا انہوں نے تیاری کر لی اور جلدی سے ایک ہزار اونٹ سوار اور گھوڑ سوار لے چلے' مدینہ میں داخل ہوئے تو کسی کو پتہ نہ چل سکا' وزیر ساتھ ہی تھا۔ آپ نے زیارت کی اور مسجد میں بیٹھ گئے' کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وزیر نے آپ سے پوچھا: اگر وہ

دو شخص آپ کے پاس آئیں تو آپ انہیں پہچان لیں گے؟ سلطان نے کہا: ہاں چنانچہ انہوں نے صدقہ لینے کے لئے لوگوں کو بلایا' ان میں بہت سا سونا اور چاندی تقسیم کر دی اور کہا کہ مدینہ میں کوئی شخص باقی نہیں رہنا چاہیے' چنانچہ صرف دو آدمی رہ گئے جو مجاور تھے اور اندلس سے آئے تھے' وہ مسجد سے باہر حجرہ مبارکہ کے قبلہ کی طرف آلِ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے جسے آج کل ''دار العشرہ'' کہتے ہیں' انہیں صدقہ لینے کے لئے بلایا لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: ہمارے پاس کافی کچھ ہے' ہم کسی سے کچھ نہیں لیتے۔آپ نے انہیں بلانے پر اصرار کیا لہٰذا انہیں لایا گیا۔انہیں دیکھ کر وزیر سے کہا: یہ وہی ہیں' اس پر ان سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو اور ارادہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پڑوس میں رہنا چاہتے ہیں۔آپ نے کہا: سچ سچ بتا دو' بار بار سوال کیا اور آخر سزا دینے کا ارادہ کیا' انہوں نے اقرار کیا کہ وہ نصاریٰ ہیں' انہیں ان کے بادشاہ نے بھیجا ہے کہ اس حجرہ میں موجود شخص کو نکال لے جائیں۔پھر سلطان نے دیکھا کہ انہوں نے سرنگ نکالی ہے جو مسجد کے قبلہ والی دیوار کے نیچے زمین میں ہے اور دونوں حجرہ تک پہنچنا چاہتے ہیں' وہ مٹی نکال کر اپنے گھر کے قریب ایک کنوئیں میں ڈالتے ہیں جس میں رہتے ہیں چنانچہ سلطان نے مسجد کے باہر نبی کریم ﷺ کے حجرہ کی مشرقی جانب موجود جالی کے پاس ان کی گردنیں اُڑا دیں اور پھر دن ڈھلے انہیں جلا دیا گیا اور سلطان شام کی طرف روانہ ہو گئے۔انتھیٰ۔

علامہ مجد نے بھی یہ واقعہ مطری کی طرح لکھا ہے' وہ لکھتے ہیں: مسجد نبوی کے حوادث میں سے ایک وہ ہے جسے مشائخ و علماءِ مدینہ کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور پھر واقعہ لکھا' یونہی زین مراغی نے مطری سے نقل کیا ہے اور یہ زیادہ بتایا کہ سلطان نور الدین کے وزیر موفق خالد بن محمد بن احمد قیسرانی شاعر تھے۔انتھیٰ۔

زین مراغی نے اسے ذہبی سے لیا ہے' وہ اس موفق کے بارے میں لکھتے ہیں: موفق الدین ابو البقاء' یہ صدر تھے' بہت عقلمند اور نیک تھے' بڑے رعب دار تھے' سلطان نور الدین کے وزیر تھے' ان کا وصال حلب میں ہوا' سال ۵۸۸ھ تھا۔انتھیٰ۔

علامہ زین نے اپنے شیخ اسنوی کی مخالفت کی ہے اور وزیر کا نام جمال الدین اسنوی بتایا ہے اور موفق کے سلطان نور الدین کے وزیر ہونے سے یہ لازمی نہیں کہ اس خواب کے وقت بھی وہی وزیر ہو کیونکہ احتمال یہ ہے کہ اس خواب سے قبل یا بعد میں ہوا ہو۔یہ جمال الدین موصلی وہی ہیں جنہیں جواد اصفہانی کہتے ہیں' ان کا ذکر وہاں آ چکا ہے جہاں حجرہ پر مرمر لگانے کا ذکر ہوا تھا' وہاں ان کے بارے میں آ چکا ہے کہ وہ بنو زنگی کے وزیر تھے کیونکہ آپ نور الدین شہید کے والد کے وزیر تھے جو زنگی کہلاتے ہیں' پھر ان کے لڑکے غازی کے وزیر بنے' نور الدین شہید کا دور بھی پایا اور اس واقعہ کا زمانہ پایا تو ظاہر یہی ہے کہ وہ ان کے وزیر ہوں گے اور وہی اس واقعہ میں مراد ہیں۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ میں اس شخص کے کلام پر جس نے نور الدین شہید کا ذکر کیا ہے' واقف نہیں ہو سکا حالانکہ یہ واقعہ عظیم ہے اور یہ امام یافعی کے ذکر کردہ حالات نور الدین شہید کی یاد دلاتا ہے کہ شیوخ (اکابر) میں سے

ایک عارف کے بارے میں آتا ہے: وہ اولیاء کے چالیس کے طبقہ میں شمار ہوتے تھے اور صلاح الدین تین سو اولیاء کے طبقہ میں ان کے نائب تھے۔ انتہیٰ۔

ابن الاثیر کہتے ہیں کہ میں نے دور اسلام سے قبل اور آج تک کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے لیکن خلفاءِ راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد کوئی حکمران سیرت کے لحاظ سے حضرت نور الدین جیسا عادل حکمران نہیں دیکھا۔ انتہیٰ۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۵۵۷ھ کے بعد بھی حضرت نور الدین شہید کی خواب جیسا ایک واقعہ ہوا ہے جسے ابن نجار کی تاریخ بغداد سے زین مراغی نقل کیا ہے' انہوں نے بتایا کہ ابو القاسم عبد الحلیم بن محمد مغربی کے مطابق ایک بے دین نے عبیدی حاکم مصر کو اشارہ کیا کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے دونوں ساتھیوں کو مدینہ سے نکال کر مصر لے آئے اور یہ بات بنا سنوار کر کہی اور یوں کہا اگر تم ایسا کرلو گے تو جہان بھر سے لوگ مصر کی طرف کھنچے چلے آئیں گے اور یہ بات اہلِ مصر کے لئے بڑی عزت کا باعث ہوگی چنانچہ اس حاکم نے کوشش کر کے تھوڑی ہی مدت میں مصر کے اندر ایک جگہ بنائی اور اس پر بہت بڑی رقم خرچ کی۔ کہتے ہیں کہ پھر اس نے ابو الفتوح کو وہ پاکیزہ جگہ کھودنے کے لئے بھیجا۔ وہ جب مدینہ منورہ میں پہنچا اور بیٹھ گیا تو اہلِ مدینہ میں سے کئی لوگ اس کے پاس آئے جو اس کے مقصد سے واقف ہو گئے' ایک قاری بھی وہاں موجود تھا جسے زلبانی کہتے تھے' اس نے مجلس میں یہ آیت پڑھی:

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ (تا) اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ (سورۂ توبہ' ۱۲ تا ۱۳)

"اور اگر عہد کر کے اپنی قسمیں توڑیں اور تمہارے دین پر منہ آئیں تو کفر کے سرغنوں سے لڑو بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں' اس اُمید پر کہ شاید وہ باز آئیں۔ کیا اس قوم سے لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑیں اور رسول کے نکالنے کا ارادہ کیا حالانکہ انہی کی طرف سے پہل ہوئی ہے' کیا ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ سن کر لوگ بھڑک اُٹھے' لگتا تھا کہ ابو الفتوح اور اس لشکر کے ساتھیوں کو مار ڈالیں گے' اس جلد بازی سے انہیں صرف اس بات نے روکا کہ وہ بھی انہی شہروں کے تھے۔

جب ابو الفتوح نے یہ دیکھا تو کہنے لگا کہ: اللہ زیادہ اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے' بخدا اگر میرے حاکم سے مجھے جانی خطرہ نہ ہوتا تو میں اس جگہ (روضۂ منورہ) کا ارادہ نہ کرتا اور پھر کھانسی سے اسے ایسی بے چینی ہوئی کہ وہ کسی طرح اس ذلت سے جان چھڑائے۔ ابھی وہ دن پورا بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ اتنی شدید آندھی آئی جس کی قوت سے لگتا تھا کہ زمین میں زلزلہ آ جائے گا' چنانچہ اونٹ پالانوں اور گھوڑے زینوں سمیت لڑکھڑا گئے جیسے گیند زمین پر بے قرار ہوتا ہے اور بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ اس پر ابو الفتوح کے سامنے یہ بات کھل گئی اور حاکم کا خوف جاتا رہا کیونکہ اب اس کام سے رُکنے کے لئے اس کو بہانہ مل گیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ ابن عذرہ نے ابن سعدون قیروانی کی کتاب: ''تاسی اھل الایمان فیما جری علیٰ مدینۃ القیروان'' میں نقل کیا ہے کہ: پھر حاکم بامر اللہ نے مدینۃ الرسول ﷺ کی طرف اس شخص کو بھیجا جو نبی کریم ﷺ کی قبرِ انور کو کھود ڈالے چنانچہ وہ مسجد کے قریبی گھر میں داخل ہوا اور زمین میں قبرِ انور تک پہنچنے کے لئے سرنگ کھودی اور بیل دیکھے' ایک شخص چلا رہا تھا کہ تمہارے نبی کی قبر کھودی جا رہی ہے' لوگوں نے تلاش کی' انہیں ڈھونڈ ڈالا اور اسی وقت قتل کر دیا۔انتہیٰ۔

اسی موقع کی مناسبت سے یہ روایت بھی سنیئے جسے محب طبری نے ''الریاض النضرہ فی فضائل العشرہ'' میں لکھا: مجھے ہارون بن شیخ عمر بن زعب (ایک ٹھوس شخصیت' بھلائی' نماز اور عبادت میں مشہور) نے اپنے والد شیخ عمر بن زعب (ایک بڑی شخصیت) سے روایت کی کہ انہوں نے بتایا کہ میں مدینہ منورہ میں ٹھہرا ہوا تھا اور خدام النبی ﷺ کا شیخ تھا کہ دیکھا تو وہاں حضرت شمس الدین صواب لمطی ملے (وہ ایک نیک شخص تھے' فقیروں کے ساتھ بھلائی کرتے اور شفقت سے پیش آتے) میرے اور ان کے درمیان انس و محبت تھی' ایک دن مجھ سے کہا کہ میں تجھے ایک عجیب بات بتاتا ہوں' میرا ایک ساتھی تھا جو امیر مدینہ کے پاس بیٹھا کرتا تھا' مجھے اس جس بات کی ضرورت پڑتی' وہ مجھے اس کے بارے میں بتایا کرتا' ایک دن ایسا ہوا کہ وہ آیا اور کہنے لگا کہ آج ایک عظیم واقعہ گذرا ہے۔میں نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ حلب سے کچھ لوگ آئے ہیں' انہوں نے امیر کو اس شرط پر بہت سی رقم دی ہے کہ انہیں حجرہ مبارکہ کھولنے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو وہاں سے نکالنے دیا جائے' اس نے یہ شرط منظور کر لی ہے۔

صواب کہتے ہیں کہ مجھے اس بات کا شدید غم ہوا۔اسی دوران امیر کی طرف سے مجھے بلاوا آ گیا' میں نے کہا' آ رہا ہوں' امیر نے کہا: اے صواب! آج رات تمہارے پاس آئیں گے اور مسجد کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے' تم دروازہ کھول دینا اور جو کچھ وہ چاہیں کرنے دینا' روکاوٹ نہ ڈالنا۔صواب کہتے ہیں کہ میں نے حکم بجا لانے کا یقین دلایا اور وہاں سے نکل آیا' آج سارا دن میں حجرہ مبارکہ کے پیچھے مسلسل روتا رہا' آنسو رک نہیں رہے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔

رات بیت رہی تھی' ہم نے عشاء کی نماز پڑھ لی' لوگ مسجد سے چلے گئے تو ہم نے دروازے بند کر دیئے' تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ امیر کے سامنے والا دروازہ کھٹکھٹایا گیا یعنی باب السلام اور امیر اس وقت ''حصنِ عتیق'' (باب السلام کے قریب) ٹھہرا ہوا تھا۔صواب کہتے ہیں کہ میں نے دروازہ کھول دیا' میں ایک ایک کر کے شمار کرتا گیا' وہ چالیس آدمی تھے۔جن کے پاس گرانے اور کھودنے کے اوزار تھے اور شمع بھی تھی' بخدا' ابھی منبر شریف تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ زمین نے انہیں ساز و سامان سمیت نگل لیا اور ان کا نام و نشان تک نہ رہا۔

صواب کہتے ہیں' امیر کو خبر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔اس نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اے صواب! وہ لوگ نہیں پہنچے؟ میں نے کہا ہاں آئے ہیں لیکن ان کے ساتھ یہ واقعہ گذر گیا ہے' کہنے لگا: دیکھو' کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا' درست کہہ

رہا ہوں، یقین نہیں آتا تو اُٹھ کر دیکھو کوئی باقی بچا ہے یا ان کا کوئی نشان رہ گیا ہے؟ اس نے کہا کہ بات یہیں رہنی چاہیے اور اگر تم نے کسی کو بتا دیا تو میں تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ میں وہاں سے نکل آیا۔

محب طبری کہتے ہیں، میں نے ہارون سے یہ حکایت سن کر محفوظ رکھی اور پھر کچھ لوگوں کو بتائی، ان میں ایک ایسا شخص تھا جس کی بات پر میں یقین کرتا تھا۔ وہ بولا کہ ایک دن میں شیخ ابوعبداللہ قرطبی کے پاس مدینہ میں تھا اور شیخ شمس الدین صواب انہیں یہ واقعہ سنا رہے تھے، میں نے ان کی زبانی اپنے کانوں سے خود سنا تھا۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں: ابو محمد عبداللہ بن ابوعبداللہ بن ابو محمد مرجانی نے بھی مختصر طور پر یہ واقعہ اپنی ''تاریخ المدینہ'' میں لکھا ہے، انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنے والد سے سنا یعنی جلیل القدر امام ابو محمد عبداللہ مرجانی سے سنا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد ابو محمد مرجانی سے سنا، انہوں نے حجرہ کے خادم سے سنا۔ ابوعبداللہ مرجانی کہتے ہیں: پھر میں نے بھی خادمِ حجرہ سے سنا لیکن انہوں نے واقعہ بتا کر کہا تھا کہ پندرہ آدمی داخل ہوئے تھے (یا بیس کہا) جو اوزار لے کر آئے تھے، ابھی وہ ایک یا دو قدم ہی چلے تھے کہ زمین انہیں نگل گئی۔ انہوں نے خادم کا نام نہیں بتایا۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۳۰

مسجد میں کنکر بچھانا، تھوکنا، خوشبو لگانا، دھونی سلگانا اور دیگر احکامِ مسجد

مسجد نبوی میں کنکر بچھانے کے بارے میں

ابو داؤد، ابو الولید سے بیان کرتے ہیں، فرمایا کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسجد میں روڑے بچھانے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایک دن ہمارے ہاں بارش ہوئی، زمین تر بتر ہو گئی، لوگ اپنے کپڑوں میں روڑے لے کر آتے اور اپنے پاؤں میں بچھا لیتے، حضور ﷺ نے نماز پڑھ لی تو فرمایا: یہ کتنی اچھی بات ہے؟ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں مسجد کے اندر روڑے بچھائے جایا کرتے تھے؟ اس کی تائید اصحابِ سنن سے ہوتی ہے چنانچہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو اللہ کی رحمت اس کا رُخ کرتی ہے لہٰذا کنکروں پر ہاتھ نہ پھیرے۔''

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ہر مسئلہ پوچھا اور کنکر کو ہاتھ لگانے کے بارے میں بھی پوچھا: آپ نے فرمایا: صرف ایک مرتبہ یا فرمایا کہ ایسا نہ کرو!

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ کنکر اس شخص کو برا جانتا ہے جو اسے مسجد سے اُٹھا کر لے جاتا

ہے۔

یحییٰ کے مطابق سلف صالحین میں سے ایک بزرگ کہتے تھے کہ وہ جب اپنے کپڑے یا جوتے میں لگا کنکر لے کر مسجد سے نکل آتے تو انہیں حکم ہوتا کہ اسے مسجد میں چھوڑ آؤ۔

سلیمان بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب کنکر مسجد سے نکالے جاتے ہیں تو اسی جگہ واپس کرنے تک وہ چلاتے رہتے ہیں۔

برھان بن فرحون کہتے ہیں' حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا کہ ایک شخص مسجد سے نکلتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کنکر اس کے ماتھے پر لگا رہ گیا ہے: کیا لازم ہے کہ وہ اسے مسجد میں چھوڑ کر آئے؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ لازم نہیں' میں اسے وہیں پھینک دینے کی اجازت دیتا ہوں۔ اس پر سوال کرنے والے نے کہا: اے ابوعبداللہ! لوگ کہتے ہیں کہ جب کنکر مسجد سے نکال لئے جائیں تو واپس لے جانے تک وہ چلاتے رہتے ہیں۔ اس پر امام مالک نے فرمایا: اسے چیخنے دو اور گلہ پھاڑنے دو! سائل نے کہا: کیا اس کا بھی گلہ ہوتا ہے؟ فرمایا: تو پھر چیخنا کیسے ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کنکروں کے بارے میں حضرت نفیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: ''اسے مسجد میں چھوڑ آؤ ورنہ قیامت کے دن میں تم سے جھگڑا کروں گا۔''

شیخ الخدام حضرت ظہیر الدین بن عبد اللہ اشرفی کہتے ہیں کہ ۷۱۵ھ کو حج کے دنوں میں شام سے میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا' میں نے پچھلے سال حج کیا' تھوڑی سی مٹی اور کنکر اُٹھا لایا' مسلسل مجھے وہ خواب میں ملتی رہی اور کہتی رہی: مجھے میرے مقام پر چھوڑ آؤ' تو نے مجھے عذاب میں ڈالا ہے' اللہ تمہیں عذاب میں ڈالے' یہ دیکھو میں اسے لے چلا ہوں چنانچہ انہوں نے ایک تھیلی میں سے نکال کر دکھائی اور پھر ہم نے اسے مسجد میں جا رکھا۔ انتھٰی۔

مورخین کے کلام سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مسجد میں کنکر ڈالنے کا سلسلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں شروع ہوا چنانچہ یحییٰ کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد تعمیر کرتے وقت فرمایا: سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم مسجد میں کیا بچھائیں؟ انہیں بتایا گیا کہ کنکر یا ٹاٹ بچھا لیتے۔ انہوں نے کہا' تو پھر یہ وادی بڑی مبارک ہے' میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' فرمایا: عقیق برکت والی وادی ہے' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے کنکر بچھا دیئے۔

حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی حضرت عمر بن خطاب کے پاس آئے' مسجد میں کنکر نہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس کوئی وادی نہیں؟ حضرت عمر نے کہا' کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا' تو پھر وہاں سے کنکر لا ڈالو۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اس وادی مبارک (عقیق) سے کنکر لا کر بچھا دو۔ انتھٰی۔

ابن زبالہ کے مطابق حضور ﷺ کے عہد میں مسجد نبوی کے اندر چھڑکاؤ کیا جاتا تھا پھر ابوبکر اور پھر حضرت عمر

کے دور خلافت کے اکثر حصے میں بھی کیا جاتا رہا' لوگ مسجد میں کھنگار ڈال دیتے اور تھوکتے' جس سے پھسلن ہو جاتی' اسی دوران ابن مسعود ثقفی آئے اور حضرت عمر سے کہا' تمہارے قریب کوئی وادی نہیں ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں موجود ہے۔انہوں نے کہا: تو پھر کسی کو حکم دیجئے کہ کنکر لے آئے تا کہ مسجد میں بچھا دئے جائیں' تھوک وغیرہ سے بچاؤ رہے گا۔حضرت عمر نے حکم فرما دیا۔

یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام مسجد میں تھوک دیا کرتے تھے۔

مسجد میں تھوکنے کا حکم

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ فرمایا: ''مسجد میں تھوکنا بڑی غلطی ہے اور تلافی کے لئے اسے دفن کر دینا ضروری ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے کہ آپ نے مسجد میں کھنگار دیکھا تو فرمایا: ''جس نے یہ تھوکا ہے' قیامت میں سامنے آئے گا تو اس کے منہ پر دکھائی دے گا۔''

حضرت عبد اللہ بن قسیط رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرفوع حدیث لکھتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں تھوکا نہ کرو۔''

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسجد میں تھوکنا بڑی برائی ہے اور اسے دفن کرنا نیکی کا کام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کہ مسجد کو کھنگار سے اسی طرح صاف رکھنے کی ضرورت ہے جیسے جلد کو آگ سے بچانے کی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ امام نووی نے ''تحقیق'' اور ''شرح المہذب'' میں مسجد میں تھوکنے کو حرام قرار دیا ہے' ہمارے کچھ اصحاب نے اس سے کراہت کا مفہوم نکالا ہے اور کچھ نے کراہت تحریم بتائی ہے' ایک عالم کا کہنا ہے کہ مسجد میں تھوکنا اس وقت برائی بنتا ہے جب اسے دفن نہ کرے کیونکہ یوں وہ مسجد میں ایک طرح کی پلیدی ڈال رہا ہوتا ہے جس سے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔علامہ قرطبی کہتے ہیں: یہ مطلب نکالنے کی تائید حدیث ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ: میں نے اُمت کے برے کاموں میں کھنگارنے کو شامل کیا ہوا ہے بشرطیکہ کھنگار کو دفن نہ کر دیا جائے اور اسے برائی صرف اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے جب یہ مسجد میں پھینکا جائے اور پھر اسے دفن بھی نہ کیا جائے۔

میں کہتا ہوں' پہلی روایت یہ بتا رہی ہے کہ یہ کام ایک خطا اور کوتاہی ہے اور اسے دفن کر دیں تو کوتاہی کی تلافی ہو جاتی ہے جیسے زنا کی پلیدی کو جلد دور کر دیتی ہے تو اس دوسری روایت کا مطلب بھی یہی نکالنا چاہئے کیونکہ اس بارے میں اطلاع اس بات کی ہے جو ثابت ہو چکا ہے لیکن ابن شبہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی'

فرماتے ہیں: میں نے حضرت واثلہ بن اسقع کو دیکھا' وہ مسجد دمشق میں گئے' اس میں نماز پڑھی پھر بائیں پاؤں کے نیچے تھوکا اور پھر بعد میں کھرچ دیا۔ میں نے واپسی پر ان سے کہا: آپ صحابی رسول ﷺ ہو کر مسجد میں تھوکتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی میں نے یونہی کرتے دیکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ حدیث وارد ہے' فرمایا: جو شخص میری اس مسجد میں داخل ہو پھر تھوکے یا کھنگارے تو گہرا گڑھا کھودے اور دفن کر دے' اگر ایسا موقع نہیں تو پھر کپڑے سے پونچھ کر اسے باہر لے جائے۔ یہ حدیث اگر صحیح ثابت جاتی ہے تو اس مذہب شافعی کے لئے دلیل بن جائے گی۔

اگر یہ کہا جائے کہ حدیث بخاری اسے قوت دیتی ہے' حضرت انس کے مطابق نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی طرف پڑا کھنگار دیکھا تو آپ کو بہت برا لگا اور چہرے پر ناراضگی کے آثار دکھائی دیئے' آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے کھرچ دیا پھر فرمایا: کوئی تم میں سے جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اللہ سے راز و نیاز کی بات کر رہا ہوتا ہے (یا فرمایا) اس کا ربّ اس کے اور قبلہ کے درمیان جلوہ فرماتا ہے لہٰذا تمہارا یہ کام نہیں کہ قبلہ کی طرف تھوک دو' یا تو بائیں طرف تھوکو یا پھر اپنے قدم کے نیچے تھوک دو' پھر اپنی چادر لے کر اس میں تھوکو اور کپڑے میں مل کرو اور پھر فرمایا: کیا یوں کیا نہیں جا سکتا؟

یونہی حضرت ابونضرہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی طرف کھنگار دیکھا' سخت ناراض ہوئے لگتا تھا کہ صحابی کے خلاف دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیں گے لیکن فرمایا: قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکا نہ کرو کیونکہ ادھر اللہ تعالیٰ توجہ فرما رہا ہوتا ہے' نہ ہی دائیں طرف تھوکو کیونکہ دائیں طرف فرشتہ ہوتا ہے تھوک آئے تو بائیں طرف تھوک دے یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے اور اگر بائیں طرف کوئی موجود ہو تو پھر اپنے کپڑے میں تھوکے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے کپڑے میں تھوکا اور پھر کھرچ دیا تھا۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد میں تھوک لینا جائز ہے' صرف نماز میں قبلہ اور داہنی جہت میں تھوکنے سے پرہیز رکھے' اسے لازم ہے کہ دفن ضرور کر دے۔

ہم کہتے ہیں۔ حدیث کا انداز یہ بتاتا ہے کہ نمازی کو تھوکنے کا طریقہ آنا چاہیے' مسجد میں تھوکنے سے غرض نہیں جبکہ مسجد میں تھوکنے کا مسئلہ پہلی حدیث کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے لہٰذا اسے چھوڑنا مناسب نہیں۔

حضرت قفال رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ میں (جہاں مسجد میں کھنگارنے کی حدیث لکھی ہے) ایک فائدہ مند بات لکھی ہے' وہ فرماتے ہیں' اس حدیث پاک مطلب یہ ہے کہ دماغ سے کھنگار آئے تو یوں کرے اور جب سینے (پھیپھڑے) سے آئے تو یہ پلید ہوتا ہے لہٰذا اسے مسجد میں دفن نہیں کرنا چاہیے۔

ابوداؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے' بتاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ ایک دن خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اسی دوران مسجد کے قبلہ رُخ کھنگار دیکھا' لوگوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور پھر اسے' میرا خیال ہے کہ ابن عمر نے کہا: آپ نے زعفران منگوایا اور اس جگہ مل دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے چہرہ کے سامنے جلوہ فرماتا ہے لہٰذا اپنے

سامنے تھوکا نہ کرو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک دن نماز پڑھی اور مسجد کے قبلہ میں کھنگار دیکھا' نماز پڑھ کر ایک چھڑی پکڑی اور اسے دور کر دیا پھر خوشبو منگوائی اور اس جگہ لگا دی اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے' فرمایا: اے لوگو! جب کوئی نماز پڑھے تو اپنے سامنے تھوکا نہ کرے' نہ ہی دائیں طرف کیونکہ وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

مسجد میں خوشبو لگانے کی ابتداء

حضرت ابوالولید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ مسجد میں زعفران کا استعمال کیونکر ہوا؟ انہوں نے کہا' نبی کریم ﷺ نے مسجد میں کھنگار دیکھا تو فرمایا کہ یہ کتنا برا کام ہے' یہ کس نے تھوکا ہے؟ چنانچہ کھنگارنے والا آیا اور اسے کھرچ دیا اور پھر اوپر زعفران مل دیا۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' یہ اس سے بھی اچھا کام کر دیا۔

یحییٰ یہی روایت ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں: میں نے ابن عمر سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ یہ زردی (زعفران) مسجد کے قبلہ میں کب سے برتی گئی؟ انہوں نے کہا ہاں حضور ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی' نماز سے فارغ ہو کر قبلہ کی طرف کھنگار دیکھا اور پھر اگلی روایت بتاتے ہوئے کہا: تب سے لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا۔یوں اس کی ابتداء ہوئی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے قبلہ کی طرف کھنگار دیکھا' ناراض ہوئے اور چہرۂ انور سرخ ہو گیا۔یہ دیکھ کر ایک انصاری عورت نے اُٹھ کر اسے کھرچ دیا اور اس جگہ خوشبو لگا دی' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' یہ کتنا اچھا کیا ہے!

حضرت ابونضرہ کہتے ہیں کہ جس نے کھنگار تھوکا تھا' وہ تھوڑا سا زعفران لائے اور اس جگہ پر مل دیا' حضور ﷺ یہ دیکھ کر خوش ہوئے' ایک اور سند سے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی دیوار پر کھنگار دیکھا' اسے کپڑے پر لگا دیا اور مسجد سے باہر لے آئے پھر وہاں خوشبو لگا دی یا فرمایا زعفران لگا دیا یا فرمایا کہ خوشبو دار گھاس ورس لگا دی۔

حضرت قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبلہ کی طرف تھوکا اور اس پر غمگین ہو گئے' ان کی بیوی نے پوچھا: کیا بات ہے' غمگین کیوں ہو؟ کیا کوئی بات نہیں' میں نماز پڑھ رہا تھا کہ قبلہ کی طرف تھوک دیا ہے۔وہ مسجد کو گئیں' اسے دھویا پھر خوشبو تیار کر کے وہاں لگا دی چنانچہ یہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے قبلہ کی طرف خوشبو لگائی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس مسجد میں تشریف لائے' ہاتھ میں کھجور کے گچھے کی پچھلی لکڑی تھی' ہماری اس مسجد میں قبلہ کی طرف کھنگار دیکھا تو اس لکڑی سے اسے کھرچ دیا' پھر

ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم میں کون چاہتا ہے کہ اللہ اس سے توجہ ہٹا لے؟ انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ! یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا۔ فرمایا جب بھی تم میں سے کوئی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اللہ اس کے سامنے جلوہ فرمائی کرتا ہے لہٰذا نہ تو اپنے آگے تھوکا کرو اور نہ ہی داہنی طرف البتہ بائیں طرف بائیں پاؤں کے نیچے تھوکا کرو' پھر جلدی کی صورت میں فرمایا کہ یوں کپڑے سے صاف کرو اور پھر کپڑے کو لپیٹ کر دکھایا' پھر فرمایا کہ عنبر لاؤ! ایک نوجوان کھڑا ہوا جس نے گھر جا کر اصرار کیا اور ہتھیلی پر خوشبو لے آیا۔ حضور ﷺ نے اسے اس لکڑی کے نوک پر لگایا اور اس سے کھنگار کا نشان صاف کر دیا۔ اس پر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ اس وقت سے تم نے مسجدوں میں خوشبو لگانا شروع کی۔

یہ لیجئے' حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہموار زمین پر موجود مسجد بنو حرام میں نماز پڑھی تو قبلہ کی طرف کھنگار دیکھا' کھجور کی لکڑی آپ ساتھ رکھتے' جدا نہ کرتے' پھر آگے حدیث بتائی' اس حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ: ''یہ پہلی مسجد تھی جس میں خوشبو لگائی گئی۔''

ایک صحابی حضرت سائب بن خلاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ایک شخص نے کچھ لوگوں کو نماز پڑھائی اور قبلہ کی طرف تھوک دیا' حضور ﷺ دیکھ رہے تھے' وہ فارغ ہو گئے تو فرمایا یہ تمہیں نماز نہ پڑھایا کریں۔ پھر ان کا ارادہ ہوا کہ انہیں نماز پڑھائیں' لوگوں نے روک دیا اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان بتایا' پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ہاں میں نے کہا ہے۔ راوی کہتے ہیں' میرا خیال ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: تم نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دی ہے۔

علامہ مجد کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محراب میں جب کھنگار دیکھا تو پوچھا کہ اس مسجد کا امام کون ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ فلاں ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اسے معزول کرتا ہوں۔ اس شخص کی بیوی نے پوچھا کہ تمہیں حضور ﷺ نے کس وجہ سے معزول فرمایا ہے؟ کہنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ نے محراب میں کھنگار دیکھا تھا۔ اس پر وہ خاتون خوشبو لے گئی اور محراب میں جا کر لگا دی۔ بعد ازیں رسول اللہ ﷺ وہاں سے گذرے' پوچھا خوشبو کس نے لگائی ہے؟ صحابہ نے عرض کہ امام مسجد کی بیوی نے' فرمایا: میں اس کی بیوی کی وجہ سے اس کی غلطی معاف کرتا ہوں اور اسے امامت پر بحال کرتا ہوں۔

میں کہتا ہوں ان روایتوں میں اختلاف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعات کئی تھے لہٰذا یہاں روایات میں کوئی ٹکراؤ نہیں' ہاں ان میں ابن شبہ کی طرف سے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا ردّ ضرور ہے جنہوں نے کہا تھا: سب سے پہلے مسجد کو خوشبو لگانے اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کرنے کا کام حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ چوتھی فصل میں اس کے بارے میں آ چکا ہے' اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بیت المال سے پہلی مرتبہ انتظام کیا تھا۔

ابن عجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے امیر مدینہ کو لکھا تھا کہ قبلہ والی

جانب کے علاوہ خوشبو کا استعمال نہ کریں اور ستون دھویا کریں۔ کہتے ہیں کہ ان کی حکومت میں ستونوں پر خوشبو نہیں لگائی جاتی تھی۔

قبر پر خوشبو کا استعمال

۱۷۰ھ میں اُم موسیٰ خیزران مسجد میں آئیں اور اپنی کنیز مونسہ سے کہا کہ مسجد میں خوشبو لگاؤ چنانچہ لگا دی گئی۔ اس پر ابراہیم بن فضل اس کے پاس گئے اور کہا: تمہیں کیسے پہنچا کہ تم اپنے پچھلوں کے لئے ایک نیا کام کرتے دکھا رہی ہو اور وہ کر رہی ہو جو پہلوں نے نہیں کیا؟ مونسہ نے پوچھا' کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم پوری قبر کو خوشبو لگاتی ہو' یہ کام پہلوں نے بھی کیا لیکن وہ دو تہائی یا اس سے بھی تھوڑے حصے پر لگاتے تھے۔ پھر انہوں نے اشارہ کیا تو انہوں نے ستونِ توبہ اور اس ستون پر بھی لگائی جو نبی اکرم ﷺ کے مصلّے کے قریب تھا چنانچہ دونوں کے نیچے تک لگائی اور اوپر لگانے کا بھی اضافہ کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کی تفسیر فرمائی:

وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ ۝

''اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم و اسمٰعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو۔''

فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کو خوب صاف ستھرا رکھو' اس میں دھونی سلگاؤ اور خوشبو لگاؤ۔

مسجد میں خوشبو دار دھونی سلگانا

حضرت علی بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں خوشبو سلگانے کا حکم فرمایا۔ پھر بتایا کہ جمعہ کے دن کے بارے میں فرمایا تھا۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچوں' دیوانوں سے بچائے رکھو' ان میں خرید و فروخت سے پرہیز کرو' یہاں نہ تو جھگڑے کرو' نہ آوازیں بلند کرو' سزائیں نہ لگاؤ اور نہ ہی یہاں تلواریں لہراؤ' ان کے دروازوں پر صفائی کرنے والے مقرر کرو اور جمعہ کے دن ان میں خوشبو سلگاؤ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: حضور ﷺ نے محلّوں میں نماز پڑھنے کی جگہیں بنانے کا حکم فرمایا اور انہیں صاف کرنے اور خوشبو لگانے کا حکم دیا۔

حضرت اسماعیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس عود والی ٹوکری لے کر آئے لیکن لوگوں نے جگہ نہ دی لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اسے مسجدوں میں استعمال کیا کرو تاکہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے چنانچہ خلفاء میں یہ طریقہ رائج ہو گیا اور آج تک جاری ہے۔ ہر سال عود کی ٹوکری لائی جاتی ہے پھر وہ جمعہ کی رات اور دن' منبر کے پاس اس کے پیچھے' امام کے خطبے کے دوران سلگائی جاتی۔

حضرت سعد قرظ کہتے ہیں کہ حضرت عمر میرے پاس عُود لے کر آئے اور مہاجرین میں تقسیم کر دی اور پھر مسجد کے لئے بھی حصہ رکھا چنانچہ جمعہ کے دن سلگائی جاتی اور یہ عادت آج تک چلی آتی ہے۔اس کام کے لئے سعد مقرر ہوئے اور وہی سلگایا کرتے۔

حجرہ مبارکہ کی قندیلوں کے حکم میں گذر چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چاندی سے بنا خوشبو سلگانے کا برتن لائے اور مؤذنین کے دادا سعد کو دیا اور فرمایا کہ اسے جمعہ اور رمضان میں سلگایا کرو چنانچہ حضرت سعد جمعہ کو سلگاتے اور حضرت عمر کے سامنے رکھ دیا جاتا۔

خوشبو سلگانے والے نعیم کے والد کے بارے میں آتا ہے کہ بتایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا' ایک بہتر کام کیا کرو گے' خوشبو سلگانے والا برتن لے کر لوگوں میں گھوم سکتے ہو؟ انہوں نے عرض کی' ہاں' چنانچہ حضرت عمر اسے جمعہ کے دن سلگانے کا حکم دیتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر جمعہ کو رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں خوشبو سلگایا کرتے۔

مسجدوں کے فرش کا حکم

ہمارے حضرات (شافعی) کہتے ہیں کہ مسجد کا فرش بنانا مستحب ہوتا ہے۔امام بخاری نے چٹائی پر نماز کے بارے میں بیان کیا ہے۔حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ چٹائی پر نماز پڑھا کرتیں' ابن زید کہتے ہیں خمرہ چٹائی کو کہتے ہیں۔حدیث کے لفظ خمرہ کے بارے میں قرطبی کہتے ہیں کہ یہ چھوٹا جائے نماز ہوتا ہے' کھجور کی ٹہنیوں سے بنایا جاتا ہے اور اس کے دھاگے چھوڑے جاتے ہیں۔امام بخاری کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرش پر نماز پڑھی اور کہا: ہم حضور ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تو اپنے اپنے کپڑے پر سجدہ کرتے۔یحییٰ کے مطابق حضرت عقیل بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے جمعہ کے دن مسجد کی غربی دیوار کی طرف چٹائی بچھا دی جاتی اور جب دیوار کا سایہ پوری چٹائی پر پڑتا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ باہر نکلتے' کہتے ہیں کہ پھر جمعہ کی نماز کے بعد واپس آتے اور دوپہر کا قیلولہ کرنے والوں کی طرح قیلولہ کرتے۔حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے جوتوں کی تلاش مسجد کے دروازوں پر کرو۔حضرت موسیٰ بن یعقوب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مسجد کا غبار کھجور کی لکڑی سے صاف کرتے۔

ہم نے مسجد کی فضیلت بیان کرتے وقت اس کے بارے میں کچھ لکھا تھا کہ تھوم اور پیاز کھانے والے کو مسجد کے قریب آنے سے روکا گیا ہے۔حضرت عمر کے مسجد میں اضافہ کے بیان میں بطیحاء کی بات کرتے ہوئے ہم نے بتایا تھا کہ مسجد میں آواز بلند کرنا منع ہے اور شعر پڑھنا بھی منع ہے۔ولید کے اضافے میں ہم نے مسجد کے اندر جنازہ کے

بارے میں لکھا۔ ابن شبہ کے مطابق حضرت شیبہ بن قصاح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کپڑے میں جوئیں دیکھے اور وہ مسجد میں ہو تو ان کے لئے گڑھا کھودے اور انہیں دفن کر دے اور ان پر تھوک بھی دے کیونکہ یہ ان کے قتل کا کفارہ ہو گا۔ حضرت محمد بن منکدر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ کو جوئیں مسجد میں دفن کرتے دیکھ کر مجھے ایک شخص نے بتایا۔ یوسف بن ماھک کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبید بن عمیر کو دیکھا کہ انہوں نے حضرت ابن عمر کے کپڑے سے جوں پکڑی اور اسے مسجد میں دفن کر دیا۔ حضرت ابوبکر بن منکدر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے چچا محمد بن منکدر کو دیکھا کہ مسجد میں ہوتے ہوئے جوں پکڑتے' وہیں اسے مار کر اوپر تھوک دیتے۔ حضرت جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ جوں کو مسجد میں دفن کرنے میں حرج نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں قابلِ دلیل نہیں ہیں۔

جوں کے بارے میں حکم

حضرت احمد نے اپنی مسند میں حضرت ایوب سے روایت لکھی کہا: ایک شخص نے اپنے کپڑے میں جوں دیکھی' اسے مسجد میں پھینکنے کے لئے پکڑا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کرو' اسے دوبارہ اپنے کپڑے میں اتنی دیر تک ڈالے رہو' جب تک مسجد سے نکل نہیں جاتے ہو۔

حضرت حضرمی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مسجد میں نماز پڑھتے اگر تم میں سے کوئی جوں دیکھ لے تو اسے کپڑے ہی میں رہنے دے' مسجد میں اسے نہ مارے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: جب مسجد میں ہوتے ہوئے کوئی اپنے کپڑے میں جوں دیکھے تو مسجد سے باہر آنے تک اسے کپڑے میں رہنے دے۔ امام نووی کہتے ہیں کہ اگر اس نے اسے مار ڈالا تو اسے مسجد میں نہ پھینکے کیونکہ وہ بھی تو ایک مردار ہے۔ امام مالک نے اسے مسجد میں مار ڈالنے کو ناپسند کیا ہے۔ ابن العماد نے مالکی حضرات کی کتابوں سے یہ مسئلہ لیا ہے کہ زندہ جوں کو مسجد میں پھینکنا حرام ہے البتہ بھڑ کو نہیں کیونکہ یہ مٹی کھا کر جیتا ہے جبکہ جوں مٹی نہیں کھاتی لہٰذا اسے مسجد میں پھینکنے سے یوں ہو گا کہ اس نے اسے بھوکا رہنے کے عذاب میں ڈالا ہے۔ انتھیٰ۔

مسجد میں خرید و فروخت

ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں مسجد کے اندر خرید و فروخت اور گمشدہ چیز کا اعلان کرنے سے روکا گیا ہے۔ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے: میں نے امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ نمازِ عصر پڑھی' آپ نے مسجد میں ایک درزی دیکھا تو اسے نکالنے کا حکم دیا۔ آپ سے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! یہ شخص مسجد کی صفائی کرتا' دروازے بند کیا کرتا اور کبھی کبھی مسجد میں پانی بھی چھڑکا کرتا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا ہے' فرمایا تھا کہ کاریگروں کو اپنی مسجدوں سے الگ رکھو۔

میں کہتا ہوں' ہمارے دور میں یہ چیز بھی ناپسندیدہ کاموں میں داخل ہے جس میں تعمیر کے بارے میں گفتگو کرنے والے حضرات' لکڑی چیرنے والوں' بڑھئیوں اور مسجد نبوی میں پتھر کا کام کرنے والوں کے بارے میں سست روی سے کام لیتے ہیں جو اپنے آلات کے استعمال کرتے اور ان سے کام لیتے ہیں' اس سے مسجد میں برادہ وغیرہ اُڑ کر پڑ جاتا ہے حالانکہ یہ کام مسجد سے باہر کرنا ممکن ہوتا ہے' ہم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں لکھ چکے ہیں کہ آپ مسجد کے گرداگرد مکانوں میں کیل ٹھونکنے یا میخ ٹھونکنے کی آواز سنتیں تو انہیں پیغام بھیج دیتیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف نہ دو۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے طہارت خانہ کے علاوہ اپنے گھر کے دروازے اسی شور کے خوف سے نہیں بنائے تھے۔

حضرت مقدسی نے ''مثیر الغرام'' میں حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس جن سے فرمایا تھا' جسے مسجد بیت المقدس کی تعمیر کے لئے پتھر کاٹنے کو بلایا تھا' کہ تمہارے پاس کوئی ایسا حیلہ ہے جس سے میں پتھر کاٹا کروں؟ کیونکہ میں اپنی اس مسجد میں لوہے کی آواز پیدا ہونے کو پسند نہیں کرتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وقار اور سکون کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے عقاب کا گھونسلہ تلاش کر دو کیونکہ آسمانوں پر اُڑنے والا ایسا کوئی جانور نہیں جو اس سے زیادہ حیلہ کرنا جانتا ہو۔ انہوں نے عقاب کا گھونسلا تلاش کر لیا اور پھر اس پر لوہے کا خول چڑھا دیا' عقاب اپنے گھونسلے پر پہنچا لیکن اسے کھولنے کی ہمت نہ ہوئی چنانچہ وہ دن اور رات بھر آسمان پر گھومتا رہا پھر واپس آیا تو اس کے پاس ہیرے کا ایک ٹکڑا تھا' شیطان بکھر گئے اور اس سے وہ ٹکڑا لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ اس سے پتھر کاٹا کرتے۔ انتہٰی یونہی آلات لانے والے خچروں اور گدھوں کو بھی داخل کرنا منع ہے کیونکہ یہ کام انسان کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتا دکھائی دے تو اسے یہ کہہ دینا چاہئے کہ: ''اَیُّهَا النَّاشِدُ غَیْرُكَ الْوَاجِدُ'' (یعنی تمہیں یہ چیز نہ ملے) ہاں اپنے پاس بیٹھنے والوں سے اگر پوچھ لے تو اس میں حرج نہیں لیکن آواز نہ لگائے۔ اور جو مسجد میں خرید و فروخت کرے' اسے کہہ دے کہ: تجھے اس میں نفع نہ ہو جیسے مرفوع حدیث سے ثابت ہے۔

علامہ زین مراغی لکھتے ہیں: قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے کو یوں کہنا چاہئے: اللہ تمہیں کچھ نہ دے۔

''عتبیہ'' میں ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسجد میں پنکھے کو مکروہ جانا۔ ہمارے نزدیک مسجد میں سونا مکروہ نہیں اور کچھ علماء نے لکھا ہے کہ ایسا پردیسی جس کی مسجد کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں' اس کے علاوہ کسی شخص کا سونا مکروہ ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں احادیث لکھی ہیں۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشاء کے بعد مسجد میں نگرانی رکھتے اور مسجد میں کھڑے نمازی کے علاوہ ہر ایک کو باہر نکال دیتے۔ ایک مرتبہ کچھ صحابہ کرام کو دیکھا جن میں حضرت ابی بن

کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے تو پوچھا: یہ کون ہیں؟ حضرت ابی نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کے اہل ہیں۔آپ نے ان سے پوچھا: نماز کے بعد یہاں کیوں رُکے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ذکر الٰہی کے لئے بیٹھے ہیں' آپ ان کے پاس بیٹھ گئے' پھر ایک قریب والے سے کہا کہ دُعا کرو' انہوں نے دُعا کی تو آپ نے ایک ایک کو پڑھنے کے لئے کہا اور آخر میرے پاس تشریف لائے' میں ان کے پہلو میں تھا' مجھے فرمایا: تم بھی سناؤ' میں شرمسار ہو گیا' فرمایا سناؤ' کاش تم نے یوں کہا ہوتا: الٰہی ہمیں بخش دے' الٰہی ہم پر رحم فرما اور پھر خود دُعا کرنا شروع کی' اب آپ سے زیادہ نہ تو کوئی آنسو بہا رہا تھا اور نہ ہی رو رہا تھا پھر فرمایا: اب تم اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔

مسجد میں گوز مارنا

مسجد میں گوز مارنا (ہوا خارج کرنا) حرام نہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سے بچے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: فرشتے اس تھوڑی سی چیز سے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں جس سے تم تکلیف محسوس کرتے ہو۔

علامہ زرکشی رحمہ اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں: حدیث پر گفتگو کرنے والے قدیم حضرات میں سے کچھ کہتے ہیں کہ مسجد میں بے وضو ہو جانے سے (گوز مارنا) بے وضو ہونے والا فرشتوں کے استغفار والی دُعا سے محروم ہو جاتا ہے اور اس دُعا سے بھی محروم ہو جاتا ہے جس کی قبولیت کی اُمید ہوتی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا: حضور ﷺ نے مسجد میں گوشت لانا منع فرمایا ہے۔

مسجد میں رکھے قرآن کی تلاوت

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قدیم لوگوں کا یہ طریقہ تھا کہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پڑھتے تھے' سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے اسے رواج دیا۔امام مالک مزید فرماتے ہیں: میں مسجد میں قرآن پڑھنا پسند نہیں کرتا' میرے خیال میں لوگ مسجد میں تلاوت کے لئے جمع ہوں تو انہیں اُٹھا دینا چاہیے۔(یہ پابندیاں اس وقت ہوتی ہیں جب ایسی عبادتوں کے لئے بے احتیاطی سے کام لیں' ورنہ ممانعت نہیں۔۱۲ چشتی)

میں کہتا ہوں کہ پہلے اور بعد والے بزرگ اسے مستحب جانتے ہیں اور صحیح بخاری میں حدیث ہے ''مسجدیں ذکرِ الٰہی' نماز اور تلاوتِ قرآن کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں۔'' اس سے پتہ چلا کہ قرآن دیکھ کر تلاوت کرنا یا زبانی تلاوت کا حکم ایک جیسا ہے۔

ابن شبہ کے مطابق حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: مصحف میں قرآن کو جمع کرنے والے اور لکھنے والے سب سے پہلے شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں' پھر انہوں نے اسے مسجد میں رکھوا دیا تھا اور حکم دیا کہ اسے روزانہ صبح کے وقت پڑھا کرو۔

حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ میں حجاج بن یوسف کی نگرانی میں تھا' حجاج نے قرآن لکھوائے

اور شہروں کو بھیج دیئے' ایک قرآن مدینہ منورہ میں بھی بھیجا' اسے آلِ عثمان نے پسند نہیں کیا۔ انہیں کہا گیا کہ حضرت عثمان کا لکھوایا ہوا قرآن یہاں سے نکال دو۔ انہوں نے کہا کہ قتل عثمان کے دن ان کا لکھا قرآن ضائع کر دیا گیا تھا۔

حضرت محرز لکھتے ہیں' مجھے معلوم ہوا کہ مصحفِ عثمان' خالد بن عمرو بن عثمان کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب مہدی خلیفہ بنا تو ایک قرآن اس نے مدینہ بھیجا تھا اور وہی آج تک پڑھا جا رہا ہے جبکہ حجاج والا مصحف مسجد سے اُٹھا لیا گیا اور وہ منبر کے نزدیک صندوق میں رکھا ہے۔ انتہٰی۔

لکھے ہوئے قرآن مسجدوں میں بھیجنے کا حکم

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ حجاج بن یوسف نے مرکزی شہروں کی طرف لکھے ہوئے قرآن بھیجے تو ان میں سے ایک بڑا قرآن مدینہ منورہ میں بھی بھیجا۔ حجاج پہلا حکمران تھا جس نے دیہاتوں میں قرآن بھیجے تھے۔ یہ بڑا قرآن اس ستون کے پاس رکھے ہوئے صندوق میں بند کر کے داہنی طرف رکھا تھا جو مقامِ نبی ﷺ کی علامت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا' صرف جمعرات اور جمعہ کے دن اسے کھولا جاتا تھا اور صبح کی نماز پڑھ لی جاتی تو اسے کھول کر پڑھا جاتا' اس کے بعد مہدی نے کئی قیمت والے قرآن بھیجے جنہیں (حفاظت کے لئے) صندوقوں میں رکھا گیا اور مصحف حجاج وہاں سے ہٹا لیا گیا' اسے ستون کی بائیں طرف رکھ دیا گیا پھر ان کے لئے چھوٹے منبر بنائے گئے جن پر انہیں رکھ کر پڑھا جاتا اور حجاج والا مصحف اس کے صندوق میں محفوظ کر کے منبر کی دائیں طرف والے ستون کے پاس رکھ دیا گیا۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ پہلے مؤرخین کے ہاں اس مصحف کا ذکر کہیں نہیں ملتا جو آج کل اس قبہ میں ہے جو مسجد کے درمیان میں بنا ہوا ہے اور جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے منسوب ہے بلکہ ہم پہلے جو کچھ بیان کر چکے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت یہ مصحف وہاں موجود نہ تھا بلکہ کلام نجار میں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا حالانکہ وہ متاخرین میں سب سے پہلے تاریخ دان تھے اور مسجد نبوی میں موجود قرآنوں کا انہوں نے باقاعدہ ذکر بھی کیا ہے' اس کا اکثر حصہ مٹ چکا ہے اور کاغذ بکھر چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے جمع کر کے باب مروان کی جانب جلے ہوئے مقصورہ میں جھول کے اندر رکھا گیا ہے۔

ابن زبالہ نے مزید لکھا کہ مسجد میں ملاح کے لکھے ہوئے کئی قرآن ہیں جنہیں ساج سے بنے ڈبے میں محفوظ کیا گیا ہے جو مقامِ نبی ﷺ کے پیچھے مقصورہ کے سامنے رکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہاں ایک بڑی کرسی ہے جس میں قرآن رکھ کر اسے تالا لگا دیا گیا ہے' یہ مصر سے لایا گیا تھا اور یہ اس ستون کے پاس ہے جو مقامِ نبی ﷺ کی لائن میں بنایا گیا ہے' اس کے پہلو میں کرسیوں پر دو قرآن رکھے ہیں جنہیں دیکھ کر لوگ تلاوت کرتے ہیں' ان کے علاوہ وہاں کوئی مصحف نہیں ہے۔ انتہٰی۔

میں نے اس قرآن کے بارے میں نہیں دیکھا کہ اسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب کیا گیا ہو' ہاں مطری وغیرہ کے کلام میں اس جگہ اس کا ذکر ہے جہاں آگ سے بچ جانے والے مسجد کے درمیان قبے کا ذکر ہے ہاں ابن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ مقامِ نبی ﷺ کے سامنے (جسے وہ ''روضۂ صغیرہ'' کہتے ہیں) ایک صندوق ہے پھر مقام اور حجرہ مبارکہ کے درمیان (مشرق سے مقام کی طرف) ایک بڑا ہودج ہے جس پر ایک بڑا قرآن رکھا ہے جس پر پردہ ہے اور اسے تالا لگایا گیا ہے۔ یہ ان چار مصاحف میں سے ایک ہے جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہروں کی طرف بھیجا تھا۔انتہٰی۔

یہ قرآن جس کے بارے میں ابن جبیر نشانیاں بتا رہے ہیں' یہ نشانیاں اس مصحف پر سچی آتی ہیں جس کے بارے میں ابن نجار نے بتایا ہے کہ مصر سے منگوایا گیا تھا لیکن اسے حضرت عثمان کی طرف منسوب نہیں کیا حالانکہ ابن جبیر نے وضاحت کی ہے کہ یہ ان مصاحف میں سے ہے جنہیں حضرت عثمان نے شہروں کی طرف بھیجا تھا' وہ نہیں جو آپ کے قتل کے وقت گود میں تھا جبکہ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ قتل کے وقت آپ کی گود والا قرآن آپ کے بیٹے خالد کے پاس تھا پھر ان کی اولاد کے پاس رہا' انہوں نے اسے لپیٹ کر رکھ لیا تھا۔ پھر کہتے ہیں: مجھے ایک شامی شیخ نے بتایا کہ یہ مصحف سرزمین طوس میں ہے۔انتہٰی۔

علامہ شاطبی کے کلام کا حاصل یہ ہے' حضرت مالک نے کہا: لکھنے والے کو چاہئے کہ وہ پہلے لکھے ہوئے کے مطابق لکھے' انہیں سامنے نہ رکھا جائے جو لوگوں نے اب لکھے ہیں۔امام مالک کہتے ہیں: کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ والا مصحف غائب ہو گیا تھا اور مشائخ کے ہاں اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔

ابوعبید قاسم بن سلام' کتاب ''القراءات'' میں لکھتے ہیں: میں نے وہ قرآن دیکھا تھا جسے مصحف عثمان بن عفان کہتے ہیں' مجھے امراء کے خزانے سے نکال کر دکھایا گیا' یہ وہی تھا جو حضرت عثمان کی شہادت کے وقت ان کی گود میں تھا' میں نے کئی مقامات پر خون کے نشان دیکھے تھے لیکن ابوجعفر نحاس نے کلامِ مالک کی بناء پر یہ بات ردّ کر دی ہے۔شاطبی کہتے ہیں کہ انصاف پسند لوگوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کیونکہ مالک کے قول'' تَغَيَّبَ '' سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مکمل طور پر گم ہو گیا ہو کہ مل ہی نہ سکے کیونکہ غائب ہونے والے چیز کے مل جانے کی اُمید ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں' یہ بھی احتمال ہے کہ پتہ چلنے پر وہی مدینہ منورہ کی طرف منتقل ہوا ہو اور پھر اسے مسجد نبوی میں رکھ دیا گیا ہو لیکن اس احتمال کو یہ بات کمزور کر دیتی ہے کہ قاہرہ میں ایک قرآن ہے جس میں قرآن کی اس آیت پر خون کے نشان ہیں: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ جیسے اس وقت مدینہ منورہ میں موجود قرآن پر موجود ہیں جبکہ صحیح بخاری میں' حضرت عثمان کی کتابت قرآن کے مقام پر لکھا ہے کہ: حضرت عثمان نے حضرت زید بن ثابت' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت سعید بن عاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حکم دیا تو انہوں نے مصحف لکھے اور پھر وہ ہر طرف بھیج دیئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لکھے وہ قرآن جو ہر علاقے میں بھیجے گئے

قرآنوں کی اس گنتی میں اختلاف پایا جاتا ہے جو حضرت عثمان نے مختلف علاقوں کی طرف بھیجے تھے کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ ابن حجر کے مطابق ان کی تعداد پانچ تھی۔ابو داؤد نے کہا کہ چار تھے' ان میں سے ایک کوفہ کی طرف بھیجا جو مراد میں سے ایک شخص کے پاس تھا' میں نے اسی سے لکھ لیا۔ابن ابو داؤد لکھتے ہیں: میں نے ابو حاتم بجستانی سے سنا' فرماتے تھے کہ آپ نے سات قرآن لکھوائے پھر مکہ' شام' یمن' بحرین' بصرہ' کوفہ اور ایک ان میں سے مدینہ میں رکھ لیا گیا۔انتہٰی۔

اس وقت موجود مصحف کے بارے میں ہمارے پاس صرف ایک احتمال ہی موجود ہے۔واللہ اعلم۔

مسجد میں چراغ (قندیل) لٹکانا

مسجد میں چراغ (یا روشن کرنے والی چیز) کا استعمال مستحب ہے۔ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے دور میں چراغ کا انتظام کیا۔کچھ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جلائے تھے اور یہ اس وقت جب لوگ ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کے لئے لوگوں کو جمع کیا گیا تھا۔

یوسف بن مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ مسجد کی قندیلوں کے لئے شام سے تیل منگوایا جاتا تھا' یہ اس وقت بند ہوا جب مدینہ کے امیر جعفر بن سلیمان تھے۔انہوں نے بازار سے لینا شروع کیا اور جب داؤد بن عیسےٰ امیر مدینہ تھے اور لوگوں کو انگور سے بننے والی شراب سے روک کر اسے گرا دیا گیا تو یہ بیت المال سے نکالا جانے لگا۔یہ ۱۹۸ھ کی بات ہے۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ بیت المال میں تیل کے ناظم کی تنخواہ تین دینار ماہانہ تھی اور ٹوٹنے والی قندیلیں بھی بیت المال کے ذمہ تھیں۔انتہٰی۔

ابن نجار کہتے ہیں کہ ہمارے اس دور میں مصر کے اوقاف سے یہ تیل منگوایا جاتا ہے۔اس کی مقدار ستائیس مصری قنطار ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی چھوٹی بڑی ایک سو ساٹھ شمعیں بھی آتی ہیں' پھر خوشبو سلگانے کا سامان بھی آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل یہ تیل مصر اور شام سے منگوایا جاتا ہے جو سو قنطار سے زیادہ ہوتا ہے' جس میں سے کچھ تو مصر میں قاضی شافعیہ کی نگرانی میں اوقاف سے آتا ہے اور کچھ امام کے ہاں سے۔واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۳۱

مسجد نبوی کے برآمدے' ستون' موریاں' مشکیزے اور زرہیں وغیرہ

ابن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ مسجد نبوی مستطیل شکل میں ہے جسے چاروں طرف سے برآمدوں نے گھیرا ہوا ہے اور اُن سب کے درمیان صحن ہے۔قبلہ کی طرف (قبلہ کے چھتے حصے کی طرف) پانچ برآمدے ہیں اور پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ ان میں اضافہ کیا گیا تو یہ سات ہو گئے' یہ مشرق سے شروع ہو کر مغرب میں ختم ہوتے ہیں۔ابن جبیر کہتے ہیں کہ شامی جانب بھی پانچ برآمدے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات ہمارے مہدی کے اضافے میں بیان کردہ کے موافق ہے کہ انہوں نے شام کی طرف والی ڈیوڑھیوں میں پانچ ستونوں کا اضافہ کیا تھا اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ان سب میں سے چار باقی ہیں اور یہ چاروں برآمدے ہیں۔لگتا ہے کہ جب پہلی آتشزدگی کا موقع تھا اور دو برآمدے بڑھائے گئے تھے تو ایک انہوں نے مسجد میں اضافہ کی خاطر گھٹا دیا تھا' یہ شامی جانب تھا۔میں نے یہ بات کسی تاریخ دان سے لکھی نہیں دیکھی اور یہی چھتا ہوا حصہ آج کل ''دکّاک'' کہلاتا ہے کیونکہ یہ باقی زمین سے اونچا ہے' یہ علم نہیں کہ یہ کب بنا تھا' ابن جبیر نے اس کی بلندی کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس سے کم بلند چیزوں کا ذکر کر گئے ہیں۔ان کا وصال مسجد میں پہلی آتشزدگی سے پہلے ہو گیا تھا تو شاید یہ ان کے بعد بنا ہو جیسے دوسری آتشزدگی پر مسجد کے دونوں طرف دو نئے چبوترے بنے تھے۔

مسجد نبوی کی دیواریں

ہمارے اس دور میں قبلہ والے چبوترے کے نزدیک جو حصہ مغربی جانب ہے' وہاں ایک اور چبوترہ دکھائی دیتا ہے اور یہ وہی ہے جسے دیوار حجرہ گرنے پر حجرہ والے حصے میں' تعمیر مسجد کے وقت بنایا گیا تھا۔ابن زبالہ کے کلام میں ہے کہ شام کی طرف چھتے حصے کو ''سقائف نساء'' کہتے ہیں۔

ابن جبیر کہتے ہیں کہ مشرقی جانب میں قبلہ سے شام تک تین برآمدے اور غربی جانب میں بھی یونہی چار ہی تھے۔یہ ابو جبیر نے ذکر کیا ہے البتہ انہوں نے برآمدے کہنے کی بجائے اسے بلاط (ہموار زمین) کہا ہے اور یونہی ابن عبدربہ نے ''عقد'' میں بیان کیا ہے اور یہ مسجد نبوی کی موجودہ صورت کے مطابق ہے البتہ قبلہ اور شام والے چھتے حصے میں یوں نہیں ہے۔

ابن جبیر کہتے ہیں کہ قبلہ والی دیوار کے نچلے حصے میں مرمر لگا ہے جو مختلف رنگوں میں کئی ڈیزائنوں سے لگایا گیا

ہے' خوب چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر لگائے گئے ہیں اور دیوار کے انتہائی اوپر والے حصہ میں کئی قسم کے پتھر کے ٹکڑے سجائے گئے ہیں' کاریگروں نے اس میں اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا ہے اور عجیب وغریب شکلیں بنائی ہیں' درختوں کی ایسی صورتیں بنائی ہیں کہ پھل سے لدی ٹہنیاں جھکی دکھائی دیتی ہیں اور ساری مسجد اسی کاریگری سے بنائی گئی ہے لیکن قبلہ والی دیوار میں کام بہت زیادہ کیا ہوا ہے اور قبلہ کے سامنے دکھائی دینے والی دیوار نیز شامی جہت والی دیوار بھی ایسی ہی ہے اور پھر مشرقی وغربی صحن کے سامنے دونئی دیواریں بھی ایسی ہی ہیں' ان پر پر کئی رنگوں میں کام کیا گیا ہے۔ابن جبیر نے یونہی نقشہ کھینچا ہے۔انتہی۔

پھر ''عقد'' میں ابن عبدربہ نے قبلہ والی دیوار میں بہترین مرمر اور نقش و نگار کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسجد کی تمام دیواریں اندر کی طرف سے اوّل سے آخر تک مرمر' سونا اور مختلف پتھروں سے سجائی گئی ہیں نیز یہ بتایا ہے کہ ستونوں کے سرے سنہری نقش و نگار سے سجائے گئے ہیں اور پھر دروازوں کی چوکھٹیں بھی خوبصورت بنا دی گئی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ پہلی آتشزدگی میں جل گیا تھا' اس میں سے کچھ کے آثار' مسجد کی دیوار کے مغربی چھتے ہوئے حصے میں دکھائی دیتے ہیں اور یونہی شمال مغربی حصے میں اذان کے مقام پر بھی کچھ نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں' رہی قبلہ کی دیوار تو اس میں صرف ایک تختی بچی ہوئی ہے جس میں محراب کے سامنے دائیں طرف درختوں کی شکلیں نظر آتی ہیں اور یہ آثار قدیم ہیں اور ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ محراب کی بائیں طرف بھی ایسی ہی تختی موجود تھی جو اب گر گئی ہے اور پھر یہ سب کچھ دوسری آتشزدگی میں جل گیا تھا۔اس مذکور دیوار میں پتھر کا کام' پہلی آتشزدگی کے بعد سلطان قمق نے کرایا تھا جیسے ہم بتا چکے ہیں کہ محراب عثمانی اور اس کے اردگرد کا حصہ پہلے سے مرمر کے ساتھ سجا ہوا تھا اور باقی مسجد نہایت سفید معلوم ہوتی ہے اور پھر قبلہ کی دیوار میں بھی نقش و نگار والی دو پٹیاں تھیں جن کا ذکر ہو چکا جن کے اوپر کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا تھا چنانچہ متولی نے وہ اور اس کے گرد والا حصہ اکھاڑ دیا تھا اور نئے سرے سے اسے سلطان اشرف قایتبائی کا نام لکھ کر سجا دیا تھا اور پھر باقی پٹی سے ملا دیا تھا۔

مسجد کے ستون

رہی ستونوں کی تعداد تو ابن زبالہ نے بتایا کہ یہ ایک سو چھیانوے تھے جن میں سے چھ تو قبرِ انور کی دیوار میں تھے۔

ابن جبیر کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دوسو نوے تھی۔ان دونوں روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ابن جبیر نے ان ستونوں کا شمار نہیں کیا جو قبر شریف کی دیوار میں ہیں البتہ ایک ستون کا مغالطہ رہ جاتا ہے کیونکہ ہماری تحریر سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ قبرِ انور والے ستونوں سمیت اس زمانے میں دوسو پچانوے تھے کیونکہ غربی چھتے ہوئے حصے میں چار صفیں (لائنیں) تھیں اور جب تم قبلہ والی دیوار سے شامی دیوار تک شمار کرو تو یہ لائن اٹھائیس ستونوں کی تھی چنانچہ اس حصہ میں

ایک سو بارہ ستون آتے تھے پھر مشرقی چھتے حصے میں تین لائنیں تھیں جن میں سے ہر لائن اٹھائیس اٹھائیس ستونوں کی تھی البتہ درمیانی دیوار میں سے ایک کم تھا اور اس کا ہمیں اس وقت پتہ چلا جب حجرہ مبارکہ کو دیکھنے کا موقع بنا تھا کیونکہ حجرہ مبارکہ کی شامی دیوار سے متصل ستون' جو باہر والی دیوار کے اندر تھا اور جس کے بارے میں بتایا جا چکا کہ متولی نے اسے اس دیوار کی چوڑائی میں داخل کر دیا تھا جس کے مقابلے میں وہ ستون آتا ہے جس کا آدھا حصہ قبلہ والی دیوار کے ظاہری حصے میں داخل تھا اور جب دونوں طرف کے آمنے سامنے والے ستونوں کو دیکھا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کے درمیان میں بھی ایک ستون ہوگا جو مربعۃ القبر اور باہر والی دیوار میں داخل صندوق کے ستون کے درمیان تھا لیکن اب موجود نہیں کیونکہ اس وقت وہ حجرہ مبارکہ کے درمیان میں آ گیا تھا لہٰذا اس لائن میں اسی سبب سے ایک ستون ختم ہو گیا اور یہ ستون انہیں دکھائی نہیں دے سکا جس نے کھلا ہوا حجرہ مبارکہ نہیں دیکھا لہٰذا اس صورت میں مشرقی چھتے حصے کے کل ستون' دیوارِ قبلہ سے شامی دیوار تک تراسی ہوئے اور اس کے بعد باقی ستون' قبلہ والی چھتے حصے میں وہ رہ جاتے ہیں جو صرف مسجد کے صحن کے مقابلے میں آتے تھے اور وہ پانچ لائنیں تھیں جن میں سے ہر ایک دس ستونوں کی تھی لہٰذا یہ کل پچاس ستون ہوئے اور پھر شامی چھتے ہوئے حصے میں بھی پانچ لائنیں تھیں جو ان کے مقابلہ میں تھیں چنانچہ قبر انور میں داخل ستون سمیت کل تعداد دو سو پچانوے ہوئی اور چھتے ہوئے غربی حصے کے آخر میں غربی دیوار سے متصل دو ستون تھے جو اس گنتی میں شامل نہیں۔ رہی آج کی مسجد میں ستونوں کی تعداد تو پہلے بتایا جا چکا کہ قبلہ والے چھتے حصے میں مسجد کے صحن کی جانب دو برآمدے تھے جبکہ شامی چھتے حصے میں سے ایک کم ہو گیا تو پہلوں میں دس کا اضافہ ہو گیا اور یہ ان ستونوں میں سے خارج ہیں جو اس چھت کی وجہ سے نئے بنے تھے جو شامی دروازے کے سامنے تھی پھر اس آتش زدگی کے بعد نئی تعمیر میں وہ ستون نہ بنا جو مصلّائے نبوی اور محراب عثمانی کے درمیان تھا بلکہ وہاں موجود ستونوں کے ساتھ اور ستون بنا دیئے گئے اور کچھ کو یوں تبدیل کیا گیا جیسے انیسویں فصل میں گذر چکا ہے اور قبلہ کے چھتے حصے کے ستونوں کو تبدیل کر دیا گیا اور یوں مسجد کے کل ستون (جیسے ابن جبیر نے بتایا) وہ تھے جو چھت کی موٹائی کے ساتھ متصل تھے اور مسجد کے گرد جنگلے کے قریب تھے۔ یہ پتھر کے سوراخ دار پتھروں سے بنے تھے جو نر مادہ تھے اور جن میں سریا لگایا گیا تھا پھر ان میں پگھلا ہوا سکہ ڈالا گیا جس سے وہ یکجان ہو گئے۔ میں کہتا ہوں اس جالی سے مراد وہ جالی ہے جسے لوہے سے آج کل باندھا جا رہا ہے' رہے وہ ستون جو برآمدوں میں داخل ہیں تو ان سے مراد وہ ہیں جو چھت سے متصل تھے' سوا ان دو برآمدوں کے جو قبلہ کے چھتے حصے سے مسجد کی کھلی جگہ سے ملتے تھے۔

ابن نجار نے پہلے مؤرخین کی پیروی میں ان محرابوں کو طاق کہا ہے چنانچہ کہتے ہیں: رہے ان کے طاق (محراب) جو صحن کے گرد ہیں' تو قبلہ کی طرف ان میں سے گیارہ ہیں اور اتنے ہی شامی جانب میں ہیں جبکہ مشرق و مغرب کی ہر جانب انیس انیس ہیں اور ہر دو ستونوں کے درمیان ایک محراب موجود ہے جن کے سروں پر لکڑی کی جالیاں لگا دی گئی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات مشرق و مغرب سے متصل جہت میں ابن زبالہ کی بات کے مطابق تھی جبکہ اس کے خلاف ہے جو جہت قبلہ اور شام کی جہت میں ملتی تھی کیونکہ انہوں نے کہہ دیا ہے: اس کے قبلہ والے طاقوں کی تعداد بارہ تھی' شام کی طرف بھی بارہ' مشرق کی طرف انیس اور مغرب کی طرف بھی انیس تھی چنانچہ یہ باسٹھ محرابیں ہوئیں۔ انتہٰی اور پھر یہ بات اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک غربی چھتے حصے کو صرف تین برآمدے شمار نہ کیا جائے جیسے مشرقی حصہ تھا چنانچہ وہ ڈاٹیں جو قبلہ اور شام کی طرف تھیں' بارہ ہوتیں اور ستونوں کی جو تعداد پہلے بتائی گئی' یہ اس کے خلاف ہے لہٰذا ابن نجار کا بتایا صحیح ہوا۔

پھر وہ ڈاٹیں جو آج کل شام اور قبلہ کی طرف سے کھلی جگہ کو گھیرے ہوئے ہیں' ان کے موافق ہیں جن کا ابن نجار نے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ہر طرف سے گیارہ گیارہ ہیں' ہاں مقصورہ کا شامی دروازہ اور اس کی چھت' اس قبلہ والی ڈاٹ سے بند کر دی گئی ہے' رہا مشرق و مغرب والی ڈاٹیں تو وہ ہر طرف سے ایک کم ہو گئی کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ قبلہ والے چھتے حصے میں دو برآمدے اضافہ کئے گئے اور شام والے چھتے حصے سے ایک برآمدہ گھٹ گیا تھا چنانچہ ہر جانب سے ڈاٹوں کی تعداد' اٹھارہ ہوئی۔ آج کل جالیوں سے بند کئے ہوئے وہ ڈاٹ ہیں جو قبلہ والے پورے اور کچھ مشرق والے تھے اور یہ دوسری آتشزدگی میں جل گئے تھے۔

ابن زبالہ کے مطابق محمد بن اسماعیل نے کہا: میں نے دیکھا کہ جمعہ کے دن لوگ مسجد میں سماتے نہیں تھے لہٰذا کچھ لوگوں کو دار القضاء میں نماز پڑھنا پڑتی تھی جو ان دنوں تعمیر ہو چکا تھا' کچھ لوگ ابن مکمل کے گھر' کچھ دار الخادمین میں اور کچھ عاتکہ کے گھر میں جمعہ پڑھتے اور ۱۴۰ھ میں جب ابوجعفر المنصور مدینہ میں آئے تو انہوں نے پردے لانے کو کہا اور پھر انہیں مسجد کے صحن میں خیموں کی چھڑیوں پر ڈال دیا گیا جنہیں ڈاٹوں پر لگا دیا گیا' ان میں ہوا داخل ہو سکتی تھی' یہ ستون نما چھڑیاں پھٹے ہوئے حصوں پر گر جاتیں لہٰذا اس نے انہیں تبدیل کر دیا اور موٹے پردے منگوا کر رسیوں سے باندھ دیئے' یہ رسیاں کشتیوں کی تھیں جو جدہ سے منگوائی گئی تھیں جنہیں پرانی رسیوں کی جگہ ڈالا گیا' وہ جمعہ کے دن لوگوں پر تان دی جاتیں' یونہی کام چلتا رہا' آخر ۱۴۵ھ میں جمادی الاولیٰ کی دو راتیں رہتیں تھیں' رات بدھ کی تھی کہ محمد بن عبد اللہ بن حسن آئے چنانچہ پرانے نیزے کاٹ دیئے گئے جن سے جنگ کی جاتی تھی اور ہارون کے زمانے تک انہیں یونہی چھوڑ دیا گیا' یہ امیر المؤمنین تھے چنانچہ انہوں نے یہ پردے لگا دیئے حالانکہ بنوامیہ کے دور میں یہ پردے نہیں لگے تھے۔

میں کہتا ہوں' ہوا یہ کہ انہیں اُتار دیا گیا کیونکہ ان کی ضرورت نہ رہی تھی کہ مدینہ میں لوگ کم ہو گئے تھے بلکہ بہت سے برآمدے خالی رہ جایا کرتے تھے۔ آج کل حجرہ کے شامی جانب ایک پردہ موجود ہے جسے مشرقی ستون پر خادموں کو دھوپ سے بچانے کے لئے لگا دیا جاتا ہے۔

ابن زبالہ و یحییٰ کہتے ہیں کہ جب مسجد کے صحن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا تو قبلہ کی جانب والی ڈیوڑھیاں بھر

دیتا اور اس طرف کی کنکریاں بہہ کر مسجد کے صحن میں آ جاتیں لہٰذا قبلہ اور صحن کے درمیان قبر کے سامنے ستونوں سے متصل انہوں نے ایک پتھر کا پردہ لگا دیا' یہ پتھر مغربی جانب تھے' یوں صحن کا پانی قبلہ کی طرف جانے سے رُک گیا اور وہ کنکریاں بھی مسجد کے صحن میں آنا بند ہو گئیں۔

یحییٰ کی عبارت یوں ہے: ابو البختری نے پتھر لانے کو کہا چنانچہ اس پانی کے سامنے انہوں نے پتھر لگا کر روک کر دی جس کی وجہ سے وہ کنکریاں بہہ کر آتی تھیں' یہ پتھر قبر انور کے قریب چوکھٹے اور اس چوکھٹے کے درمیان لگائے جو مسجد کے مغربی جانب تھا نیز یہ دیوار ستون کے متصل کی تھی۔

میں کہتا ہوں' پتھر سے یہ پردہ انہوں نے مشرق سے مغرب تک کے درمیانی خلا میں کیا تھا' جبکہ قبر انور کو چوکھٹا مشرق کی جانب سے ستونوں کی ابتداء میں تھا کیونکہ یہ ستونِ وفود والی لائن میں تھا' یہ لائن قبلہ کے چھتے حصے کے آخر میں تھی جبکہ غربی چوکھٹا مغربی جانب ستونوں کے آخر میں تھا' یہ ستون ان دنوں آٹھ پہلو والا ہے' جس کے اور مسجد کے غربی صحن کے رُکن کے درمیان آج کل دو ستون ہیں جن کا سبب وہ دو برآمدے ہیں جو مذکورہ چھتے حصے کے آخر میں تھے اور یہ پردہ آج کل دفن ہو چکا' اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا اور ظاہر یہ ہے کہ ان ستونوں کے درمیان جو مشرق سے مغرب میں صحن مسجد کے اندر تھے' ایسا ہی پردہ موجود تھا اور وہاں پہلے سے موجود چبوترے سے پہلے دو چبوتروں کی جگہ دو چبوتروں کے درمیان تھی' ابھی اس کا کچھ نشان باقی ہے پھر آج کل کے قبلہ کی طرف چھتے حصے کی زمین قریبی صحن سے قدرے اونچی ہے لہٰذا اسے پانی کا اثر نہیں پہنچ سکتا تاہم متولی نے دوسری آتشزدگی کے بعد اسے مصلّٰی شریف کی زمین کے برابر کر دیا تھا لہٰذا قبلہ کی طرف مسجد کی کھلی جگہ سے ملنے والے ستونوں کے درمیان اس کی ضرورت پڑی۔

پانی کے خارج کرنے کے لئے نالیوں کی تعداد

مسجد نبوی میں چونسٹھ بالوعہ جات (پانی کے برتن جن میں پانی سٹور کر کے بعد میں گرا دیا جاتا) تھے جن میں بارش کا پانی جمع ہوتا' ان پر پتھر رکھے ہوتے۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل صرف ایک بالوعہ موجود ہے جس کے دو دہانے ہیں اور یہ ان دو پتھروں کے پاس ہیں جن کا ذکر آ چکا' ان میں سے ایک تو قبلہ کی جانب دو پتھروں کی طرف ہے اور دوسرا ان دونوں کے شامی جانب ہے اور یہ دونوں وہاں موجود ایک کنوئیں میں جمع ہو جاتے ہیں' ان دونوں پر چکی جیسے گول پتھر ہیں اور پھر ان دونوں کے دہانوں پر نچلی طرف جالی ہے جس میں سے پانی داخل ہو جاتا ہے اور کنکر گرنے نہیں پاتے حالانکہ پہلی تعمیر میں یہاں سے کافی کنکر نکلے تھے۔

مسجد میں پانی پینے کی جگہیں

رہے پانی کے مقامات تو ابن زبالہ کے دور کے اندر مسجد کے صحن میں یہ انیس مقامات تھے' ان کا دور ۱۹۹ھ تھا'

ان میں سے تیرہ کو ایک عورت خالصہ نے بنایا' یہ سب سے پہلے بنانے والوں میں تھی' تین' زید بربری نے بنائے تھے جو امیر المؤمنین کا غلام تھا' ایک ابو البختری وھب بن وہب نے بنایا تھا' ایک شجن نے بنا رکھا تھا جو امیر المؤمنین ہارون کی اُم ولد تھیں' ایک سقایہ سلسبیل کا تھا جو جعفر بن ابو جعفر کی اُم ولد تھیں۔ یہ سب کچھ ابن نجار نے لکھتے ہوئے ان کی وضاحت بھی کی ہے اور پھر کہا ہے: اب ان میں سے صرف ایک سقایہ مسجد کے درمیان میں موجود ہے' یہ ایک بڑا حوض سا ہے جسے اینٹوں' چونے اور لکڑی سے بنایا گیا ہے' اس کی چاروں طرف سے چار نالیوں کے ذریعے چشمے سے پانی جمع ہوتا ہے اور فوارے سے اوپر اُٹھتا ہے اور پانی صرف ان دنوں میں جمع ہوتا ہے جب حج کا موسم ہوتا ہے' باقی دنوں میں یہ خالی رہتا ہے۔ اسے شام کے ایک امیر شامہ نے بنایا تھا' ابن زبالہ کہتے ہیں کہ خلیفہ الناصر لدین اللہ کی والدہ ''جہت'' نے ایک بڑا حوض بنایا تھا جس میں کئی گھر تھے اور اس نے اس کے لئے کنواں کھودا تھا اور اس کے لئے شامی دیوار میں سے مسجد کی طرف ایک دروازہ رکھا تھا۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں' ابن زبالہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ سقایہ سے ان کی مراد وہ حوض وغیرہ ہے جو پانی پینے کے لئے ہوتا ہے لیکن ابن نجار کی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ برتن ہے جو وضو کرنے کے لئے ہوتا ہے اور پھر خلیفہ کی والدہ کی طرف سے اس کا بنایا جانا بھی ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسا حوض مراد لے رہے ہیں جس کا دروازہ شامی دیوار میں تھا' اس کا قدیم زمانے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو بند کر دیا گیا اور مغرب میں مسجد سے ملا ظاہر ہوتا ہے۔

ابن زبالہ کے قول ''اس حوض میں کئی گھر تھے'' سے مراد اس میں خلاء تھے اور اس سے پہلے قول: ''اب ان میں سے صرف ایک سقایہ موجود ہے جو مسجد کے درمیان میں ہے۔'' سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے مراد مسجد کے درمیان پانی پینے کا حوض لے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں بدر بن فرحون کہتے ہیں: مسجد کے درمیان میں ایک سقایہ (حوض) تھا جس میں چشمے کا پانی ڈالا جاتا تھا' اس دوران اسے خادموں کے شیخ نے بنایا تھا' اس پر خرچہ کرنے کے لئے اس نے اپنے مال میں سے کچھ حصہ وقف کر رکھا تھا' اس کی پیائش ہر طرف سے پندرہ ہاتھ تھی' اس کے درمیان میں مرمر سے پانی نکلنے کی جگہ بنائی (فوارہ) پھر وہاں کوزے اور بند لوٹے رکھے' اس میں لکڑیاں اور کھجور کی ٹہنیاں لگائیں اور لوہے سے قبہ بنایا پھر کئی سال گذرنے کے بعد وہاں جھگڑے کی صورت بنی' وضو کرنے والے اس کے اندر داخل ہو جاتے اور یوں وہاں فتنے کی صورت بن گئی۔ ابن زبالہ کہتے ہیں کہ جب فائدے کی بجائے اس کا نقصان زیادہ معلوم ہونے لگا تو قاضی شرف الدین امیوطی اور شیخ ظہیر الدین کے باہمی مشورے سے اسے اُکھاڑ دیا گیا۔

رہا وہ حوض جس کا ابن نجار نے ذکر کیا ہے' اس کا ذکر مطری کی کلام میں ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن ابی الھیجاء نے بنایا تھا کیونکہ چشمے کے بارے میں آئندہ وہ بتا رہے ہیں کہ ابن ابی الھیجاء نے ۵۶۰ھ میں اس سے ایک شاخ نکال کر باب السلام کی طرف مسجد کے قریب کھلی جگہ میں ڈال دی تھی۔ پھر مزید بتایا کہ اس میں سے ایک چھوٹی سی

شاخ (نالی) بنائی جو مسجد کے صحن میں داخل ہوتی تھی' پھر اس کے لئے ایک گھاٹ بنایا جس میں سے فوارے کے ذریعے پانی نکلتا اور ضرورت مند اس سے وضو کرتے' اس میں سے وضو کرتے وقت بے پردگی ہو جاتی تھی اور لوگ استنجاء کرتے تھے لہٰذا مسجد کے احترام کی خاطر اسے بند کر دیا گیا۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے مسجد میں موجود کھجور کے قریب اس کے نشان دیکھے ہوئے ہیں لیکن اس وقت وہاں کوئی نشان موجود نہیں' صرف بند لوٹے وہاں لٹکے ہیں جن سے خاص وقتوں میں لوگ پانی پیتے ہیں البتہ خادموں کے لئے بنے ہوئے حوض میں ہر وقت پانی ہوتا ہے اور جب ہمارے سلطان اشرف نے باب الرحمہ اور باب السلام کے درمیان مدرسہ بنایا تو اس میں سے باب الرحمہ کی طرف راستہ بنایا جو مسجد کی طرف جاتا تھا۔

مسجد سے متعلق ساز و سامان

مسجد سے متعلق ساز و سامان میں سے ایک گنبد ہے جو مسجد کے صحن میں تھا۔ اس کا ذکر گذر چکا' آج کل اکثر اس میں مسجد میں شمعیں وغیرہ جلانے کا تیل ہوتا ہے اور پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب قرآن اسی میں ہے پھر مسجد ہی میں چاروں مناروں کے سامنے ایک ستور ہے جن میں سے قبلہ والے مناروں کے سامنے کے ستور پہلے والے ہیں جبکہ شامی مناروں والے ستور نئے بنے ہوئے ہیں اسی لئے بدر بن فرحون نے کہا ہے: حق یہ ہے کہ شامی مناروں والے ستور زائل کر دئے جائیں کیونکہ ان کے دروازے اصلی دروازوں پر بنے ہیں اور پھر شمال مغربی منارۂ یعنی منارۂ خشبیہ کے دروازے کی جانب بھی ایک چھوٹا سا ستور ہے جس میں مسجد کے خادم اپنے بستر وغیرہ رکھتے ہیں اور کبھی اس میں وہ لوگ بھی ٹھہر جاتے ہیں جنہوں نے اعتکاف کرنا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مغربی جانب بھی دو بڑے ستور ہیں جن میں شیشے کی قندیلیں اور مسجد کے کچھ اوزار وغیرہ رکھے جاتے ہیں' انہی دونوں میں سے پہلے میں نے اپنی کتابیں رکھی ہوئی ہیں' میں اس میں مطالعہ کے لئے بیٹھتا ہوں اور اعتکاف بھی یہیں کرتا ہوں کیونکہ یہ مسجد کا حصہ ہے۔ یہاں ٹھہرنے کی وجہ سے مجھے ایسا معاملہ پیش آیا تھا جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں' پھر اس کے مقابلے میں مشرق کی طرف منارۂ سنجاریہ کے ساتھ تنہائی کی کھلی جگہ ہے' یہاں بھی خادموں کے بستر وغیرہ ہوتے ہیں' اسی کی جانب دو ستور ہیں جن میں سے ایک تو اسی شخص کے قبضہ میں ہوتا ہے جس کی صفائی کی باری ہوتی ہے' وہ اس میں فانوس وغیرہ رکھتا ہے اور دوسرا بھی خادموں ہی کے قبضے میں ہوتا ہے پھر مشرقی جانب باب جبریل کے قریب' اس کے اور باب النساء کے درمیان ایک ستور ہے جہاں خدام نے پینے کا پانی رکھا ہوتا ہے نیز کچھ بستر اور دوسرا سامان ہوتا ہے' کلام ابن زبیر میں اسی کا ذکر ملتا ہے چنانچہ کہتے ہیں: مشرقی جانب ایک لکڑی سے بنا ہوا مکان ہے جہاں مسجد کے پہرے دار خادم رات کو ٹھہرتے ہیں۔ پھر بتاتے ہیں: مسجد کے خادم مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے اور صاف ستھرے لباس والے ہوتے ہیں۔ انتہٰی۔ اسی ستور کی طرف ایک صندوق ہے جس میں وہ تیل رکھا ہوتا ہے جو روزانہ جلانے کے لئے قبہ سے نکالتے

ہیں۔ مسجد کی غربی جانب باب الرحمہ اور باب السلام کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں قلعی چونا رکھا جاتا ہے جس کے دروازے کا نام خوخۂ ابوبکر ہے کیونکہ وہ اس کے مقابلے میں تھا اور جب مسجد میں اضافہ کیا گیا تو یہاں ایک خوخہ بنایا گیا جو پہلے والے خوخہ کے مقابل تھا پھر مدرسہ اشرفیہ کی عمارت بناتے وقت اس جگہ میں تین دروازے رکھے گئے۔ اس کی بائیں طرف تیسرے دروازے میں داخل ہوتے وقت' ان کی جگہ بائیں طرف ہے۔

مسجد کی قندیلیں

رہی قندیلوں کی تعداد تو ابن زبالہ کے مطابق ان کے زمانے میں دوسونوے تھی جبکہ ہمارے اس دور میں کل قندیلیں دوسوچھپن ہیں جو ہمیشہ چلتی رہتی ہیں اور تقریباً سو قندیل کبھی کبھار جلاتے ہیں پھر ان ڈاٹوں میں سے ہر ڈاٹ میں تین قندیلیں ہیں جو مسجد کے صحن میں اس کے آگے اور دونوں طرف پر ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر ڈاٹ میں صرف ایک ہی قندیل سے کام لے لیتے ہیں جیسے مسجد کے آخر میں ڈاٹیں ہیں اور خصوصاً اس وقت جب تیل ہی کم ہو۔

دوسری آتشزدگی کے بعد بہت سی نئی زنجیریں تیار کی گئی ہیں جن کے ساتھ قندیلیں لٹکاتے ہیں نیز مسجد کے صحن میں چار مشعلیں ہیں جن میں سے دو تو قبلہ کی طرف ہیں اور دو شام کی طرف' ان مشعلوں میں سے ہر ایک ستون کی طرح ہے' ان کے اوپر عظیم شمعدان ہیں جو زیارت کی مشہور راتوں میں جلائی جاتی ہیں' مجھے ان کی ابتداء کا علم نہیں پھر ریاض الجنہ کے آگے اور اردگرد تنور زیادہ کرتے ہیں' وہاں محفلیں بھی لگاتے ہیں خصوصاً رمضان المبارک کی ستائیسویں کو محفلیں بہت سجاتے ہیں' ان دنوں تقریباً ہر رات چالیس شمعیں جلاتے ہیں جنہیں ریاض الجنہ اور حجرہ انور کے مقابل بڑے بڑے شمعدانوں پر لگاتے ہیں' یونہی مغربی جانب اور کچھ ان میں سے محراب حنفیہ میں لگاتے ہیں۔ پھر مسجد میں چھ فانوس ہیں جن کے اردگرد پھر کر خادم عشاء کے بعد لوگوں کو مسجد سے نکالتے ہیں کیونکہ انہوں نے دروازے بند کرنا ہوتے ہیں' وہ مسجد میں صرف خادموں کو رہنے دیتے ہیں یا پھر انہیں' جن کی کسی کام پر ڈیوٹی ہوتی ہے۔

بدر بن فرحون' خدام کے شیخ حریری کی اچھی عادتیں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے کھجور کی لکڑی پر شمعیں لے کر گھومنا بند کر کے ان کی جگہ فانوس (لالٹین) کا رواج ڈالا جنہیں آج کل رات کو لے کر گھومتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حریری سے قبل اور ان کے ابتدائی دور میں خادموں کے غلام اور کچھ جھاڑ والے کھجور والی شمعیں لے کر چلتے اور آج کل کے فانوس کی بجائے انہیں جلاتے اور جب وہ باب النساء کے پاس پہنچتے تو انہیں باہر نکال دیتے اور باقی کو روند ڈالتے جن سے مسجد اور دروازے بھی سیاہ ہو جاتے تھے چنانچہ حریری نے ان کی جگہ فانوس جلانے کا رواج ڈال دیا۔

مسجد کے صحن میں کھجوریں

مسجد کے صحن میں کھجوریں ہیں جن کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ یہ کب سے لگی ہیں البتہ ابن جبیر نے اپنے سفر نامے میں مسجد کے اندر موجود قبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: صحن میں قبہ کے سامنے کھجور کے پندرہ درخت

ہیں۔انتہی۔

بدر بن فرحون کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے یہ کھجوریں دیکھیں وہ شیخ عزیز الدولہ تھے جو خدام کے مشائخ میں سے تھے' کہتے ہیں کہ ان کے دور میں بہت سی کھجوریں بوئی گئیں جو مسجد کے اندر موجود ہیں۔

علامہ مجد نے عزیز الدولہ کے بارے میں کہا: اکثر کھجوریں انہی کے دور میں بوئی گئیں۔پھر کہا: ان کی عظمت شان یا ان کی زبان درازی کے خوف سے ان کی اس بدعت کا کسی نے پیچھا نہیں کیا یا پھر اس بناء پر انہیں کچھ نہیں کہا گیا کہ ان سے پہلے بھی یہ کھجوریں لگائی گئی تھیں جس کی انہوں نے اقتداء کی تھی۔یہ کھجوریں شیخ یاقوت رسولی کے شیخ ہونے کے آخری دور میں سخت آندھی کی بناء پر جڑ سے اکھڑ گئی تھیں' پھر دوبارہ بو دی گئیں جن پر کئی لوگوں نے اعتراض کیا۔

میں کہتا ہوں' طوغان شیخ نے ۸۷۳ھ کو ان میں اضافہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن میں نے انکار کر دیا پھر کچھ اور اچھے لوگ بھی منع کرنے لگے تو یہ ارادہ باطل ہو گیا۔الحمد للہ۔

مسجد نبوی کے امام

مسجد نبوی میں شروع ہی سے مقامِ نبی ﷺ پر صرف ایک امام نماز پڑھاتے چلے آئے ہیں' وہ امام موسم حج وغیرہ میں محرابِ عثمانی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے رہے ہیں پھر وہ وقت آیا کہ سلطان اشرف اینال کے دور میں شیخ طوغان مذکور نے محرابِ حنفی تیار کرانے کی کوشش کی' اہلِ مدینہ نے انہیں منع کیا' حکومت مصر کے ایک اہم رُکن اور ناظر' نیک بخت جناب جمال الدین یوسف نے اہلِ مدینہ کی مدد کی جس کی وجہ سے طوغان کامیاب نہ ہو سکا اور جب اینال فوت ہو گئے تو طوغان نے دوبارہ کوشش کی جس کے باعث ۸۶۰ھ کے بعد وہ کامیاب ہوئے چنانچہ محرابِ نبوی کے امام تبدیل ہو جانے پر حنفی امام پانچوں نمازیں پڑھانے لگے' محراب نبوی کے امام شافعی تھے ہاں تراویح میں دونوں امام اکٹھے ہو جاتے' یوں آہستہ آہستہ مکہ کے اثرات مدینہ شریف میں پہنچ گئے۔

علامہ زرکشی کہتے ہیں' اس کا سبب یہ ہوا کہ طوغان کے دور میں بدعتی امام تھا اور جب لوگ اپنے اس امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے کترانے لگے تو انہوں نے اپنے لئے امام مقرر کرنے کا ارادہ کر لیا لہٰذا یہ سلسلہ چل پڑا اور یونہی بیت المقدس اور جامع مصر میں یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔انتہی اور نماز کا یہ حکم ہم نے اپنی کتاب ''دفع التعرض والانکار لبسط روضۃ المختار'' میں بیان کر دیا ہے۔

مسجد کی دیوار کی چوڑائی

ابن زبالہ و یحییٰ کے مطابق مغرب کی طرف سے مسجد کی دیوار کی چوڑائی دو ہاتھ سے ذرا کم تھی جبکہ مشرق کی طرف سے دو ہاتھ چار انگل تھی۔اس طرف اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ ادھر سیلاب کا پانی آ جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں اس اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ سیلاب اس طرف سے مسجد کو گھیر لیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حجرہ مبارکہ کی

مشرقی دیوار بھی گر گئی تھی اور پھر اسی جانب سے مسجد کی دیوار بھی گری تھی جیسے ابن زبالہ کے قول میں یہ گذرا کہ: محمد بن عبد اللہ کی حکومت میں مجھے جنازگاہ کی جانب سے مسجد کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ انہوں نے حکم دیا اور انہوں نے دیوار بنا دی۔انتہی۔

ہم اس سے قبل ولید کے اضافے میں یحییٰ کے مطابق مسجد کے عرض کی بات کر چکے ہیں اور اس کی خرابی بھی بتا چکے ہیں لیکن ابن زبالہ نے مسجد کے بارے میں اپنے آخری قول میں جو کچھ کہا ہے' صحیح وہی ہے کیونکہ انہوں نے پہلی مسجد کی لمبائی اور چوڑائی بیان کرتے ہوئے کہا تھا: آج کل رسول اللہ ﷺ کی مسجد کی چوڑائی ایک سو پینسٹھ ہاتھ ہے' یہ چوڑائی قبلہ کی اگلی طرف مشرق و مغرب کے درمیان ہے لیکن اس کا پچھلا حصہ' اگلے حصے سے پینتیس ہاتھ کم ہے جبکہ یمنی جانب سے شامی جانب دو سو چالیس ہاتھ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میں اس کی پیائش لکھ چکا ہوں چنانچہ مسجد کے قبلہ کی اگلی طرف سے یہ پیائش ایک سو ساڑھے ستاسٹھ ہاتھ تھی' یہ پیائش ابن زبالہ کی پیائش سے اڑھائی ہاتھ زیادہ بنتی ہے' یا تو ہاتھ میں فرق ہے یا رسّی میں ڈھیل کی وجہ سے فرق آ گیا ہے اور شام کی طرف سے یہ چوڑائی ایک سو پینتیس ہاتھ تھی چنانچہ میری پیائش میں ابن زبالہ سے یہ چوڑائی پانچ ہاتھ زیادہ ہوئی اور میری پیائش کے مطابق قبلہ سے شام کی طرف لمبائی دو سو ترپن ہاتھ تھی' اس صورت میں یہ ان سے تیرہ ہاتھ زیادہ بنتی ہے اور ابن نجار نے جو پیائش درج کی ہے وہ میری پیائش کے مطابق ہے' صرف تھوڑا سا فرق ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: آج مسجد نبوی کا قبلہ سے شام کی طرف طول دو سو چون ہاتھ چار انگلی ہے جبکہ مشرق سے مغرب کی طرف (قبلہ والی جانب) پورے ایک سو ستر ہاتھ بنتی ہے۔انتہی۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یمن سے شام کی طرف مسجد کا طول (صحن) ایک سو پینسٹھ ہاتھ تھا اور مشرق و مغرب میں عرض نواسی (۸۹) ہاتھ تھا۔انتہی جبکہ ابن النجار نے لکھا کہ یہ صحن ایک سو انچاس ہاتھ اور تین انگل تھا جبکہ عرض ستانوے ہاتھ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں کہتا ہوں: ان دنوں قبلہ سے شام کی طرف صحن کا طول ایک سو ساڑھے باون ہاتھ ہے اور جب اس میں اس برآمدہ کی چوڑائی شامل کر دیں تو چونکہ برآمدہ نو ہاتھ کا ہوتا ہے لہٰذا یہ کل پیائش صرف ایک سو اور ساڑھے ساٹھ ہاتھ بنے گی اور یہ تقریباً وہی ہے جو ابن نجار نے لکھی ہے۔

رہا مسجد کی اگلی طرف سے صحن کی چوڑائی تو وہ پچانوے ہاتھ ہے۔واللہ اعلم۔

ابن نجار نے مسجد کے اونچائی پچیس ہاتھ لکھی ہے' اس سے ان کا مقصد زمین سے دیوار کے اوپر والی برجیوں کی پیائش بتانا ہے کیونکہ ایک اور مقام پر جو انہوں نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کی بلندی زمین سے چھت تک اکیس ہاتھ ہے اور پھر چھت کی موٹائی اور وہ دیوار جس پر برجیاں ہیں اور جو صحن کے گرد ہے' ملا کر چار ہاتھ اونچی بنتی ہے جبکہ دوسری آتشزدگی کے بعد مسجد کے اگلے حصے کی دھرتی نیچے ہو جانے پر چھت تک اونچائی بائیس ہاتھ تھی اور حضرت عمر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے اضافے کے بیان میں گذر چکا ہے کہ ان کے دور میں ان کے درمیان کا فاصلہ گیارہ ہاتھ تھا تاہم مجھے اس اضافے کا کوئی علم نہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا جبکہ باہر کی طرف سے مسجد کو گھیرنے والی زمین اور دیوار کے اوپر والے مغربی پردے کے درمیان کا فاصلہ اٹھارہ ہاتھ تھا چنانچہ باہر کی طرف سے مسجد کی موٹائی (اونچائی) یہ تھی۔ واللہ اعلم۔

یاد رہے کہ مسجد کے منبروں اور ان کی اونچائی کا ذکر ولید کے اضافے میں گذر چکا ہے۔

فصل نمبر ۳۲

مسجد کے بند شدہ اور موجود دروازے ان کے سامنے نئی اور پرانی عمارتیں

مسجد کے دروازے

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد کے تین دروازے بنوائے تھے' ایک تو مسجد کے اخیر میں تھا' ایک وہ دروازہ جسے باب عاتکہ کہتے تھے اور جس کا نام باب الرحمہ تھا اور تیسرا دروازہ وہ تھا جس میں سے رسول اکرم ﷺ مسجد میں داخل ہوتے اور یہ وہی دروازہ تھا جسے آلِ عثمان کا دروازہ کہا جاتا تھا۔

تاریخ دانوں کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں دروازے اپنے مقام ہی پر رہے بلکہ جب مسجد میں ان کی طرف سے اضافہ کیا گیا تو پھر بھی یہ اپنے پہلے مقام ہی پر بنا دئے گئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافے میں ہم بتا چکے ہیں کہ انہوں نے چھ دروازے بنائے تھے' دو دروازے تو قبلہ کی دائیں طرف' دو بائیں طرف اور دو قبلہ کی پچھلی طرف لیکن باب عاتکہ اور باب عثمان میں تبدیلی نہیں کی بلکہ باب عاتکہ والی جانب اس دروازے کا اضافہ کیا جو دارِ مروان کے نزدیک تھا اور اسے باب السلام کہا گیا اور بابِ عثمان کے بعد انہوں نے باب النساء کا اضافہ کیا تھا چنانچہ یہ وہ دو دروازے ہیں جو مغرب اور مشرق میں بڑھائے گئے اور پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں برقرار رکھا تھا اور ان میں اضافہ نہیں کیا تھا تاہم ابن زبالہ' یحییٰ اور زرین نے ان دروازوں کا ذکر نہیں کیا جو ولید نے بڑھائے تھے البتہ ابن نجار نے کہا: رہے مسجد کے دروازے تو یہ مہدی کے اضافے کے بعد خوخۂ ابوبکر کے علاوہ انیس تھے اور پھر ان کے مقامات کا ذکر کیا کہ کہاں کہاں تھے۔

علامہ مطری اور ان کی اتباع میں مراغی ومجد نے کہا: جب ولید نے مسجد کی تعمیر کی اور اس میں اضافہ کیا تو اس میں بیس دروازے رکھے اور پھر خوخۂ ابوبکر سے بعینہٖ انہی دروازوں کا ذکر کیا لیکن یہ صرف وہم ہی ہے کیونکہ ان

دروازوں کے بارے میں آتا ہے کہ یہ مہدی کے اضافے میں تھے اور اب بھی مسجد اسی حال پر برقرار ہے اور پھر شام اور اس کے متصل مشرق و مغرب والے دروازوں کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دورِ ولید میں بننا سوچا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ پہلے ذکر آ چکا کہ ان کا اضافہ مہدی نے کیا تھا پھر مطری نے ان سے موافقت کی ہے تو پھر انہیں ولید کی طرف منسوب کیسے کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ بھی آ رہا ہے کہ ان میں سے ایک دروازہ (بابِ زیاد) ابو العباس منصور کے دور میں زیاد نے نکالا تھا۔

علامہ مطری سے پہلے کے مؤرخین کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کی جو شکل اضافوں کے بعد بن چکی ہے' اس کے مطابق دروازے دار القضاء کے صحن میں کھلتے تھے اور یہ بات ابن زبالہ کے اس قول کے مخالف نہیں کہ: ''مسجد میں (دورِ ابن زبالہ میں) چوبیس دروازے تھے'' کیونکہ انہوں نے ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ: ان میں سے آٹھ تو مشرق کی طرف ہیں اور قبلہ کی جانب بھی ایک دروازہ ہے جس میں باب مروان کی طرف سے امراء مقصورہ کی طرف جاتے تھے اور قبلہ کی بائیں جانب وہ دروازہ ہے جس میں تم جنازگاہ کی طرف سے مقصورہ کی طرف داخل ہوتے ہو اور پھر اس کے مقابلے میں قبلہ کی دائیں جانب ایک دروازہ ہے جسے باب زیت القنادیل کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسے مروان نے بنایا تھا اور مقصورہ کے نیچے خوخۂ آل عمر بھی انہوں نے بنایا تھا' پھر مغربی جانب آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک وہ چھوٹا دروازہ ہے جو خوخۂ ابوبکر کی دائیں جانب کے مقابلے میں ہے' نیز شام کی طرف چار دروازے ہیں۔ انتہٰی چنانچہ دوسرے مؤرخین نے اس دروازے کو شمار نہیں کیا جو قبلہ میں دار مروان کی طرف کھلتا ہے کیونکہ یہ گھر کا دروازہ تھا یونہی خوخۂ آل عمر بھی کیونکہ یہ گھر کا تھا' مسجد کا نہیں اور یونہی باب زیت القنادیل بھی ہے کیونکہ یہ مسجد کے سٹور کا ہے' اس میں عام لوگ داخل نہیں ہو سکتے اور اس کا ٹھکانہ غربی دیوار کے کنارے کے پاس ہے جو قبلہ کی طرف ہے' اسے انہوں نے اس منارۂ بابِ السلام کی عمارت کے نزدیک دیکھا جس کے آگے دیوار کا پردہ بن جاتا ہے۔

رہا وہ دروازہ جس کا ذکر انہوں نے قبلہ کی بائیں طرف کیا ہے تو ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مشرق میں باب زیت القنادیل کے مشرق میں تھا اور یہ مقصورہ کے لئے مخصوص تھا اور اگر یہ دروازہ عام دروازوں کی طرح ہوتا تو وہ اسے ان دروازوں میں شمار کرتے جو مشرق میں ہیں۔ یہ دروازہ اس وقت دکھائی دیا جب ہمارے سامنے لگنے والی آگ کے بعد مشرقی منار گرایا گیا تھا' یہ چھوٹا سا دروازہ تھا جو مسجد کی مشرقی دیوار کے کونے کے نزدیک بند تھا اور گویا اس سے اس سٹور کی طرف جاتے تھے جو مشرقی یمنی منارے کے نیچے تھا اور پھر وہاں سے مقصورہ کو چلے جاتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ایک اور مقام پر جہاں ابن زبالہ نے تفصیلی طور پر دروازے بتائے ہیں' انہوں نے ان چار کا ذکر نہیں کیا بلکہ کل بیس ہی لکھے ہیں۔ اب ہم ان کی طرف سے اور دوسرے مؤرخین کی طرف سے بیان کردہ ان دروازوں کا ذکر کرتے ہیں پھر ان کا بھی ذکر کریں گے جنہیں مطری نے بیان کیا اور ان کے محل بھی بتائیں گے پھر اس کے بعد خوخۂ آل عمر کا علیحدہ ذکر کریں گے تو سنئے:

باب النبی ﷺ

یہ پہلا دروازہ ہے جو مشرق سے قبلہ والے دروازوں کی ابتداء میں ہے۔اسے باب النبی ﷺ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ مبارکہ کے سامنے ہے جہاں حضور ﷺ کی قبرِ انور موجود ہے' یہ نام اس بناء پر نہیں رکھا گیا کہ آپ اس میں سے داخل ہوتے تھے کیونکہ آپ کے دور میں تو یہ موجود ہی نہ تھا اور جب مشرقی دیوار نئے سرے سے بنی تھی تو اس وقت بھی بند کر دیا گیا تھا اور پھر اس کی جگہ وہ جالی لگا دی گئی جس کے نزدیک باہر سے آنے والے کھڑے ہوتے ہیں اور حجرہ مقدسہ ومطہرہ کی زیارت کرتے ہیں۔

بابِ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ

دوسرا دروازہ ''بابِ علی'' کہلاتا تھا' یہ اس دروازہ کے مقابلے میں تھا جو نبی کریم ﷺ کے گھر کے سامنے تھا اور جب دیوار از سرِ نو تعمیر کی گئی تو اسے بند کر دیا گیا اور وہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا دروازہ اس دروازے سامنے ہے تو یہ بات علامہ مطری اور ان کے پیروکاروں نے کہی ہے' دروازہ کا نام باب علی رکھنے کی مناسبت یہی نظر آتی ہے لیکن ابن نجار کی وضاحت یوں نہیں چنانچہ مشرقی دروازوں کا شمار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: باب علی پھر باب النبی ﷺ پھر باب عثمان اور پھر وہ دروازہ جو دارِ ریطہ کے بالمقابل تھا اور پھر آخر تک دروازے ترتیب وار ذکر کر دئے۔انہوں نے یہ بات ابن زبالہ و یحییٰ کی اس تحریر سے لی ہے جو ان دونوں نے ذکر کیا کہ انہوں نے مسجد کی دیواروں پر لکھا دیکھا تو کہا تھا: ''مشرقی جانب' مسجد کے عین اندر' بابِ علی اور باب النبی ﷺ کے درمیان لکھا تھا۔'' اور پھر جو کچھ لکھا تھا' اسے بیان کیا پھر دونوں نے کہا کہ ''باب النبی ﷺ اور باب عثمان کے درمیان لکھا تھا'' اور جو کچھ تھا' ذکر کر دیا اور پھر مسجد کے باہر سے جو کچھ دروازوں پر لکھا تھا' وہ بتاتے ہوئے کہا: قبلہ کی جانب' مسجد کے باہر جنازگاہ کی جگہ' جہاں حضرت علی بن ابو طالب کے دروازے کے قریب فوت شدہ لوگوں کی نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی تھی' بسم اللہ شریف کے بعد لکھا ہوا تھا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ' اس سے معلوم ہوا کہ اس جانب والے دروازوں میں سے بابِ علی سب سے پہلا دروازہ تھا اور باب النبی ﷺ دوسرا تھا اور پھر علامہ مطری کو جس چیز نے مذکورہ قول پر آمادہ کیا (کہ بابِ علی' بیت النبی کے پیچھے تھا) اور انہوں نے یہ تعلق بیان کیا' وہ ان کا گذشتہ یہ بیان ہے: احتمال یہ ہے کہ باب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مشرق میں پہلے دروازے تک پھیلا ہوا تھا لہٰذا اس کا نام باب علی رکھ دیا گیا اور پھر ابن شبہ نے بیتِ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں جو یہ لکھا ہے' وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ: آپ کا گھر مشرق میں دارِ عثمان اور اس دروازے کے درمیان تھا جو دارِ اسماء کے مقابل تھا اور دوسرے کو باب النبی کہنا اسی دروازے کے قریب ہونے کی وجہ سے تھا۔واللہ اعلم۔

بابِ عثمان (بابِ جبریل)

تیسرا دروازہ بابِ عثمان تھا اور یہ وہ دروازہ تھا جو اس دروازے کے سامنے تھا' جس میں سے نبی کریم ﷺ گذرا کرتے تھے اور ہم ابن زبالہ و یحییٰ سے لکھ آئے ہیں کہ جس دروازے سے نبی کریم ﷺ گذرا کرتے تھے وہ بابِ آل عثمان تھا چنانچہ اضافۂ عثمانی میں یحییٰ کی روایت سے اسے باب النبی ﷺ کہا گیا اور حجرہ کی شامی جانب والی جالی کے دروازے کے نزدیک اسی دروازے کے مقابل (اسی جگہ) وہاں ستون کی بنیاد کھودتے وقت بنیاد کے آثار تھے اور ظاہر یہ ہے کہ وہ آثار اسی دروازہ کو وہاں سے تبدیل کرنے کے تھے کیونکہ وہ مسجد کی پہلی دیوار کے سامنے تھا اور اسے بابِ عثمان کہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دارِ عثمان بن عفان کے مقابل تھا اور عنقریب آ رہا ہے کہ یہ گھر بقیع کو جاتے وقت اس راستے میں تھا جو اس باب سے نکلنے والے کی بائیں طرف آتا تھا جب وہ اس راستے کی طرف جاتا جو مدرسہ شہابیہ سے شام کی طرف جاتا تھا اور آج کل ان دروازے کے مقابلے میں سرائے ہے جسے جمال الدین محمد بن ابو المنصور اصفہانی نے بنایا تھا' یہ جواد کے نام سے مشہور تھے جو بنو زنگی کے وزیر تھے۔

ایک عجیب واقعہ

علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ سرائے انہوں نے عجمی فقراء کے لئے وقف کر دی تھی اور اس میں اس نے ایک تربت بنا دی تھی جس کے گرد قبرِ انور کے مقابل جالی بنائی تھی۔ جب یہ وزیر قید خانے میں بیمار ہو گئے تو شیخ ابو القاسم صوفی سے کہا: مجھے ڈر لگتا ہے کہ فریب سے مجھے قبر میں لے جائیں گے یعنی وہ اس بات پر خوش تھے کہ وہ اسی حالت قید میں فوت ہو جائیں تو اچھا ہے (نہ کہ زندہ دفن کر دیا جاؤں) پھر انہیں یہ بھی بتایا کہ میرے اور اسد الدین شیرکوہ کے درمیان (صلاح الدین بن ایوب کے چچا) یہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم میں سے جو پہلے فوت ہو جائے گا تو زندہ بچ جانے والا اسے مدینہ شریف لے جا کر اسی قبر میں دفن کر دے گا جو انہوں نے بنا رکھی ہے لہٰذا اگر میں فوت ہو جاؤں تو مجھے وہاں لے جانا چنانچہ جب جمال الدین فوت ہو گئے تو ابو القاسم' اسد الدین کے پاس انہیں اطلاع دینے گئے چنانچہ مکہ اور مدینہ میں لے جانے کے لئے انہیں بہت سا مال دیا اور حکم دیا کہ ان کو لے کر صوفیہ کی ایک جماعت حج کرے اور ان کے تابوت کے ساتھ ایسے لوگ ہوں جو جنازہ رکھتے اور چلتے وقت ان کے آگے آگے تلاوت کرتے جائیں اور مدینہ کے راستے میں بھی یونہی تلاوت کرتے جائیں نیز شہروں میں ان کے جنازے کا اعلان کر دیا جائے چنانچہ جب وہ "حلّہ" پہنچے تو لوگ نمازِ جنازہ کے لئے جمع ہو گئے' یکایک دیکھا تو ایک نوجوان اونچی جگہ کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا:

> "ان کی لاش گردنوں پر رہی ہے کیونکہ ایک عرصہ سے ان کی سخاوت لینے والوں کی گردنوں پر سوار رہی ہے (ہر ایک تک پہنچی) آج جس وادی سے وہ گذر رہے ہیں تو وہاں کی ریت کے ذرّے بھی

ان کی تعریف کر رہے ہیں اور جن محتاجوں کے پاس ہوتے تھے وہ بھی مدح وثناء کر رہے ہیں۔"
چنانچہ لوگ اس قدر روئے کہ اتنا کبھی نہیں روئے ہوں گے۔ پھر انہیں لے کر مکہ پہنچے اور کعبہ کا طواف کرایا نیز حرم شریف میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی پھر مدینہ منورہ کی طرف لے گئے' وہاں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر اسی قبر میں دفن کر دیا گیا (جو پہلے سے بنا رکھی تھی)۔

آپ کا وصال ۵۵۹ھ میں ہوا۔ آپ نے کئی یادگار کام کئے خصوصاً حرمین شریفین میں کئی کام کئے تھے پھر انہوں نے مدینہ منورہ کے گرد حفاظتی دیوار بھی بنائی تھی جس کا ذکر آ رہا ہے' ہم وہاں ان کے کچھ حالات بھی لکھیں گے۔

پھر دارِ عثمان کی سرائے کے قبلہ میں سرائے کے اندر ہی تربت بنائی گئی جس کے لئے اسد الدین شیرکوہ بن شاذی (سلطان صلاح الدین یوسف بن ایوب بن شاذی کے چچا) نے زمین خرید لی تھی چنانچہ انہیں اور ان کے بھائی نجم الدین ایوب (صلاح الدین کے والد) کو بھی ان کی وفات کے بعد یہیں دفن کیا گیا۔ یہ واقعہ ۵۷۶ھ کا ہے لیکن علامہ ذہبی کا وہم یہ ہے کہ یہ دونوں بقیع میں دفن کئے گئے چنانچہ انہوں نے "العبر" میں اسے لکھا ہے۔

اس دارِ عثمان کے بقیہ حصہ میں بھی اس قبر والی جانب ایک حویلی ہے جو حرم شریف کے خادموں کے لئے وقف ہے جس میں خدام کے شیخ رہتے ہیں۔ اس دروازے کے سامنے تو دارِ عثمان کبریٰ ہے لیکن عنقریب ان کے دارِ صغریٰ کا بیان آ رہا ہے جہاں مغربی لوگوں کی سرائے ہے اور اسے بھی باب جبریل کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے یہ نام رکھنے کی وجہ بیان نہیں کی اور شاید اس کا سبب وہ ہے جو چوبیسویں فصل میں ابوغسان کے حوالے سے یوں بیان ہوا: مقامِ جبریل کی وہ علامت جس کی وجہ سے اسے مقام جبریل کہا جاتا ہے کہ تم اس دروازے سے نکلو جسے باب آلِ عثمان کہا جاتا ہے تو تم اس دروازے سے نکلتے وقت تین ہاتھ اور ایک بالشت کے فاصلے پر ایک ایسا پتھر دیکھو گے جو اس سے بڑا ہے جس کے ساتھ دیوار موجود ہے (یہ مقامِ جبریل کی علامت ہے) اور پھر مزید ہم یہ بتا چکے ہیں کہ باب جبریل کہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام غزوۂ بنو قریظہ کے موقع پر گرد آلودہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے اور جنازہ والی جگہ کے نزدیک مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے اور اس وقت اس دروازے کے بغیر اور یہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔

پھر ابن زبالہ کے مطابق حارثہ بن نعمان گذرے تو نبی کریم ﷺ حضرت جبریل کے پاس جنازہ والی جگہ میں موجود تھے' انہوں نے تو سلام نہیں کہا۔ اس پر جبریل علیہ السلام نے عرض کی: کیا یہ شخص بدر میں شریک تھا؟ فرمایا' ہاں۔ جبریل نے پوچھا: تو آپ کی اُمت میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ کیا لوگ انہیں کوئی حیثیت دیتے ہیں؟ فرمایا' ہاں' بدر میں شریک تمہارے سب ساتھی اسے اچھا جانتے ہیں۔ ابن زبالہ بتاتے ہیں کہ پھر حضرت حارثہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے' فرمایا آپ نے وہ آدمی دیکھا تھا جو میرے ساتھ تھا؟ عرض کی' ہاں وہ دحیہ کلبی معلوم ہوتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ جبریل تھے' کہتے تھے کہ اگر تم سلام کہہ دیتے تو وہ جواب بھی دیتے۔ عرض کی میں اس وجہ سے رُک گیا تھا

کہ آپ ان سے گفتگو فرما رہے تھے لہٰذا یہ مناسب نہیں تھا کہ میں آپ کی بات کاٹ دیتا۔

بیہقی نے ''دلائل'' میں حارثہ بن نعمان کی روایت سے لکھا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں سے گذرا تو جبریل آپ کے پاس بیٹھے تھے' میں نے سلام عرض کیا اور آگے گذر گیا۔ جب ہم واپس لوٹے اور نبی کریم ﷺ واپس تشریف لائے' مجھ سے فرمایا: کیا تم نے انہیں دیکھا تھا جو میرے ساتھ تھے؟ میں نے عرض کی' ہاں دیکھا تھا۔ فرمایا: وہ جبریل تھے' انہوں نے تمہارے سلام کا جواب دیا تھا۔ اس دروازے پر باہر کی طرف بسم اللہ شریف کے بعد یہ آیات لکھی ہوئی تھیں:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ○ (سورۂ توبہ ۱۲۸' دو آیتیں)

باب ریطہ (باب النساء)

چوتھا دروازہ باب ریطہ تھا' یہ ابو العباس سفاح کی بیٹی کا نام تھا' یہ دروازہ ان کے گھر کے سامنے تھا' یہ باب النساء کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ نام رکھنے کی وجہ ابو داؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیں یہ دروازہ عورتوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ ابن عمر نے عرض کی' ہاں ٹھیک ہے چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے وصال تک اس میں سے نہیں گذرے۔ (یاد رکھئے کہ دروازوں سے مراد صرف کھلے راستے ہیں کیونکہ اس وقت دروازے نہیں لگائے گئے تھے۔ ۱۲ چشتی)۔

اس کے بعد ابو داؤد لکھتے ہیں: عبد الوارث کے علاوہ اور نے جو روایت کی' وہ زیادہ صحیح ہے پھر ابو داؤد نے ایک اور روایت کی جس میں یہ قول حضرت ابن عمر کا بتایا۔ پھر ایک اور روایت کی جو حضرت نافع سے ہے' وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب النساء میں داخل ہونے سے منع فرماتے تھے' یہ روایت قابلِ اعتماد ہے کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں مسجد کی مشرقی جانب باب آل عثمان کے علاوہ کوئی دروازہ نہ تھا۔

ابن زبالہ و یحییٰ کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد کی تعمیر فرما رہے تھے تو میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا' فرمایا: یہ باب النساء ہے' چنانچہ حضرت ابن عمر اپنے وصال تک اس میں سے نہیں گذرے اور جب وہ نماز پڑھ رہی ہوتیں تو بھی آپ ان کے سامنے سے نہ گذرتے اور اس دروازہ کے سامنے دار ریطہ کے بارے میں مطری لکھتے ہیں کہ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا اور یہ بھی لکھا کہ آپ کا وصال یہیں ہوا تھا۔ آج کل یہاں حنفی مدرسہ قائم ہے جسے شام کے ایک امیر یازکوح نے بنایا تھا اور وہیں اپنی قبر بھی بنوائی جہاں شام سے انہیں منتقل کیا گیا' دار عثمان اور اس مدرسہ کے درمیان سے بقیع کو راستہ جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ ابن زبالہ نے اس کی نسبت حضرت ابوبکر کی طرف کی ہے تو اس کے بارے میں مستند بات

آگے آ رہی ہے جس میں اس کے بارے میں اور کچھ بھی بتایا جائے گا۔
باہر سے دیکھیں تو اس دروازے کی اوپر والی جانب پتھر کی بہترین سلیٹ لگی ہوئی ہے جس پر آیۃ الکرسی لکھی ہوئی تھی جو دوسری آتشزدگی میں اُتر گئی تھی۔

پانچواں دروازہ

یہ دروازہ سیّدہ اسماء بنت حسین بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھر کے سامنے تھا' یہ حضرت جبلہ بن عمرو ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھروں میں سے ایک تھا' پھر یہ گھر حضرت سعد بن خالد بن عمر بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں آئے اور اس کے بعد حضرت اسماء کے ہو گئے اور آج کل یہ عورتوں کی سرائے ہے۔ یہ دروازہ بھی اس وقت بند کر دیا گیا جب یہ دیوار شمال مشرقی منار سے اس دروازے تک بنائی گئی تھی' یہ سال ۵۸۹ھ تھا اور الناصر لدین اللہ کا دور تھا۔ علامہ مطری اور ان کے پیروکاروں نے یونہی لکھا ہے۔
ابن جبیر کی کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور دوسرے دروازے ۵۸۰ھ سے پہلے ہی بند کئے گئے تھے کیونکہ ابن جبیر نے اس سے پہلے سفر کیا تھا' اپنے سفر نامے میں انہوں نے لکھا: مبارک مسجد میں حضرت ابوبکر کے خوخہ کے علاوہ انیس دروازے تھے جن میں سے چار کے علاوہ کوئی دروازہ کھلا نہیں رہ گیا تھا' ان میں سے دو تو مغرب میں تھے اور دو ہی مشرق میں تھے۔ انتہٰی لیکن اس کے بعد انہوں نے کہا کہ: قبلہ کی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جسے تالا لگا ہوا تھا یعنی باب ''دار الامارۃ'' پھر کہا کہ پانچ دروازے مغرب میں تھے جن کو تالے لگے تھے یونہی مشرق میں بھی پانچ بند تھے جبکہ شام کی طرف چار دروازوں کو تالے لگے تھے۔ انتہٰی۔
اس سے ظاہر ہوا کہ ان کے زمانے میں دروازے بند نہیں کئے گئے تھے بلکہ انہیں تالے لگے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مطری کی دی ہوئی تاریخ کے مطابق بند کیا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

چھٹا دروازہ

چھٹا دروازہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے سامنے تھا اور نئی دیوار بننے پر اسے مسجد میں شامل کر لیا گیا' آج کل یہ دروازہ لوگوں کی سرائے بن چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی شمالی جانب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا' آج کل اسے ''رباط السبیل'' (مسافر خانہ) کہا جاتا ہے اور یونہی رباط النساء کو یہی نام دیا جاتا ہے' یہ دونوں سرائیں قاضی کمال الدین ابو الفضل محمد بن عبد اللہ بن قاسم شہرزوری نے بنوائی تھیں۔ ابن زبالہ و یحیٰی نے ذکر کیا ہے کہ اس دروازے کے چھجے پر اندر کی طرف لکھا ہوا تھا:

> ''اسے مہدی محمد امیر المؤمنین نے بصریوں کے ہاتھوں ۱۶۲ھ میں بنوایا ہے' یہ مسجد میں مہدی کے اضافے کی ابتداء ہے۔''

ساتواں دروازہ

یہ ساتواں دروازہ تھا جو طہارت خانوں کے راستے کے سامنے تھا' اسے بھی نئی تعمیر کے وقت دیوار میں شامل کر لیا گیا تھا' یہ مقام حضرت عمرو بن عاص اور صوافی کے گھروں کے درمیان تھا: ان گھروں کو مطری نے دار موسےٰ بن ابراہیم کا نام ایک وہم کی بناء پر دیا ہے جو انہیں ابن زبالہ کے کلام سے ہوا جیسے انشاء اللہ ہم اس کی وضاحت کریں گے۔آج کل یہ راستے دار حسن بن علی عسکری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف جاتے ہیں' آج کل انہیں ''حوش الحسن'' کہتے ہیں' یہ راستے (گلیاں) مدینہ کے باہر طہارت خانوں کی طرف جاتی تھیں' وہاں حضور علیہ السلام کے مبارک دور میں عورتیں رات کو قضاءِ حاجت کے لئے جایا کرتی تھیں۔

ابیات صوافی وہ تھے جنہیں مطری نے دار موسےٰ بن ابراہیم کا نام دیا ہے' آگے آ رہا ہے کہ ان میں سے کچھ تو آج کل لوگوں کے لئے سرائے کا کام دیتے ہیں جنہیں قاضی محی الدین ابوعلی عبد الرحیم بن علی بن حسن لخمی بیسانی نے بنایا تھا اور نئی دیوار بناتے وقت یہ دروازہ بھی اسی میں داخل ہو گیا۔

آٹھواں دروازہ

یہ آٹھواں دروازہ تھا جو صوافی کے گھروں کے سامنے تھا اور یہ بھی نئی تعمیر میں شامل کر لیا گیا تھا۔ان کے بارے میں آ چکا ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ تو حضرت عمرو بن عاص کے گھر سے ملا ہوا تھا اور اسے ''رباط الفاضل'' کہتے تھے اور باقی دوسرا حصہ اس دروازے کے سامنے تھا جسے آج کل دار الرسام کہتے ہیں جسے شیخ صفی الدین سلامی نے اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے وقف کیا اور پھر فقراء کے نام وقف کر دیا تھا' اس کی شامی جانب وہ دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر سلامی کی دونوں سراؤں کو جاتے تھے۔انہیں مطری نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے: ''اور یہ یعنی ابیاتِ صوافی' ان گھروں میں تھے جو موسیٰ بن ابراہیم مخزومی اور عبید اللہ بن حسین اصغر بن علی زین العابدین بن امام حسین بن علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے گھروں کے درمیان تھے۔'' پھر کہا: اِن گھروں (یا حویلی) کی جگہ پر آج کل ایک گھر ہے جسے شیخ صفی الدین ابوبکر بن احمد سلامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خرید کر اپنے قریبی سلامیوں کے نام وقف کر دیا تھا۔انتہٰی۔

آگے آ رہا ہے کہ ابیاتِ صوافی وہی گھر تھے جن میں قہطم رہتے تھے اور یہ عمرو بن عاص اور دارِ موسےٰ بن ابراہیم مخزومی کے درمیان اس کے اور عبید اللہ بن حسین میں مشترک تھے اور یہ مشترک گھر شامی جانب مشرق کی جہت میں ان مشترک گھروں میں سے پہلے گھر تھے چنانچہ ابیاتِ صوافی اسی دارِ قہطم کو کہتے تھے اور اس جگہ پر رباط الفاضل اور دار السلامی بن چکے ہیں' رہے مشترک گھر تو ان کی جگہ آج کل خالی ہے جہاں وضو کرنے کی جگہ ہوتی تھی اور پھر رئیس ابراہیم کا گھر تھا جو وضو کرنے کی جگہ اور اس گلی کے درمیان تھا جو دار المضیف (مہمانخانہ) سے ملتی تھی' یہ مہمان خانہ شامی جانب آخری گھر تھا اور وہ مشترک گھر اس سے متصل تھا۔یہ دروازہ وہ آخری دروازہ تھا جو مشرق کی طرف تھے۔

مسجد کے شامی جانب والے دروازے

علامہ مطری نے شامی دروازوں کا ذکر چھوڑ ہی دیا ہے' چنانچہ کہتے ہیں: مسجد کے شمال میں بھی چار دروازے شمالی دیوار کی تعمیر کے وقت بند کر دیئے گئے تھے' آج کل مسجد کے شمال میں باب سقایہ (ماشکی) کے علاوہ کوئی دروازہ نہیں ہے' اسے امام الناصر کی والدہ نے بنایا تھا۔

شامی دروازوں پر مطری کے کلام نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ابن زبالہ نے اس کے سامنے والے گھروں کا ذکر نہیں کیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کے کلام اور ابن شبہؒ کے ان گھروں کے بارے میں کلام سے جو مسجد کے گرد تھے' ان دروازوں کا پتہ چلتا ہے۔

اب ہم ان دروازوں کا ذکر کر رہے ہیں جو ان دونوں حضرات نے بیان نہیں کئے لہٰذا سنئے۔

نواں دروازہ

نواں دروازہ مسجد کی پچھلی طرف تھا اور شمال مشرق میں پہلا دروازہ تھا جو دارِ حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بالمقابل تھا' یہ ان کے دادا عبد الرحمٰن کا گھر تھا جہاں وہ رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کو ٹھہرایا کرتے تھے اور دار ابن مسعود کا باقی حصہ تھا' اب ان دونوں کی جگہ مہمانخانہ ہے جس کے مغرب میں رباط الظاہر یہ موجود ہے۔

دسواں دروازہ

دسواں دروازہ حضرت ابو الغیث بن مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے سامنے تھا' آج کل اس کی جگہ مشہور سرائے رباط الظاہر یہ والشر شورہ موجود ہے۔

گیارہواں دروازہ

گیارہواں دروازہ دارِ ابو الغیث کے ساتھ تھا جو امیر المؤمنین کی لونڈی خالصہ کے گھروں میں سے تھا' یہاں وہ شفاخانہ ہے جسے ابو جعفر المنتصر باللہ نے ۶۲۷ھ میں تعمیر کرایا تھا۔

بارہواں دروازہ

یہ دروازہ خالصہ کے دوسرے گھروں کے سامنے تھا' آج کل یہاں ایک گھر اور گلی ہے جس میں سے نکل کر اس سرائے کی طرف جاتے ہیں جسے شیخ شمس الدین ششتری نے بنوایا تھا اور یہ دروازہ شامی جانب والے دروازوں میں سے آخری تھا' یہ سب دروازے آج کل بند کر دیئے گئے ہیں' اس وقت مسجد کی دیوار کے ساتھ جتنے بھی گھر موجود ہیں' وہ سب نئے بنے جیسے پہلے تاریخ دانوں کے کلام سے پتہ چلتا ہے' یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کب بنائے گئے تھے۔

تیرھواں دروازہ

تیرہواں دروازہ مغربی جانب والے دروازوں میں سے شامی جانب پہلا تھا' یہ وہ دروازہ تھا جو منیرہ کے گھر کے سامنے تھا اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھروں میں شمار ہوتا تھا' پھر یہ گھر حضرت عبد اللہ بن جعفر بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قبضہ میں آ گئے' پھر اُم موسےٰ کی لونڈی منیرہ کے قبضے میں آ گئے' آج کل ان کی جگہ وہ گھر ہے جو ہمارے شیخ عارف باللہ سیدی عبد المعطی مغربی کے قبضہ میں ہے جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں پھر یہی گھر سیّد شریف علامہ محی الدین کے قبضے آئے جو حرمین شریفین میں حنبلی حضرات کے قاضی ہیں' اس گھر کے قبلہ کی جانب وہ دروازہ ہے جو خواجا قاوان کا کہلاتا ہے جس میں سے قیاش لوگوں کے گھروں کی طرف جاتے تھے۔ یہ دروازہ بند ہے جیسے باہر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے۔

چودھواں دروازہ

یہ دروازہ بھی منیرہ کے گھر کے سامنے تھا جیسے ابن زبالہ و یحییٰ نے وضاحت کی ہے لیکن مجد کو وہم ہوا' انہوں نے اگلا دروازہ کہہ دیا' آج کل اس کے مقابلہ میں وہ گھر ہے جو ان خادموں کے لئے وقف ہے جو اس گلی کے قبلہ میں واقع ہے جس سے گذر کر قیاشین کے گھروں کی طرف جاتے ہیں' یہ دروازہ بھی آج کل بند ہے چنانچہ باہر سے دیکھنے پر معلوم ہو جاتا ہے' اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوار سے ان دونوں کی جگہ نئی نہیں بنائی گئی۔ (شاید قیاس کا لفظ ہے جس کا معنی کمان درست کرنے والا ہے۔۱۲ چشتی)

پندرھواں دروازہ

پندرھواں دروازہ نصیر صاحب المصلّٰے کے گھر کے سامنے تھا' یہ مہدی کے غلام تھے' یہ گھر حضرت سیّدہ سکینہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا رہائشی مکان رہا تھا' اس کی جگہ وہ گھر ہے جو قیاشین کی گلی اور اس گھر کی طرف جانے والے کی بائیں طرف ہے جسے آج کل دار تمیم الداری کہا جاتا ہے' یہ میرے حصے میں آیا' میں نے اسے وقف کر دیا اور رہائش یہیں رکھی ہوئی ہے' یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا' یہ گھر اس گھر کے سامنے ہے جو دار تمیم کے نام سے مشہور ہے' آج کل یہ بند ہے' اس کا کچھ حصہ مسجد کی باہر والی جانب سے دکھائی دیتا ہے اور باقی حصہ باب عاتکہ کی طرف سے نئی دیوار بننے پر اس میں شامل کر دیا گیا تھا۔

سولھواں دروازہ

یہ دروازہ حضرت جعفر بن یحییٰ بن خالد بن برمک کے گھر کے سامنے تھا پھر اسی میں شامل کر لیا گیا' یہ گھر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلعے کا بچا ہوا حصہ تھا۔ آج کل اس جگہ "مدرسۂ کلبرجہ" ہے جسے ۸۳۸ھ

میں ہند کے سلطانِ کلبرجہ شہاب الدین احمد نے بنایا تھا' یہ دروازہ بھی نئی دیوار میں داخل کر دیا گیا تھا۔کلام ابن زبالہ و یحییٰ میں ہونے کے باوجود مطری نے اسے چھوڑ دیا ہے' اسے چھوڑتے وقت انہوں نے ایسے دروازے کا ذکر کیا جس کا اس سے پہلے کہیں ذکر نہیں ملتا۔

بابِ عاتکہ (باب السویق و باب الرحمہ)

باب عاتکہ بنت عبد اللہ بن یزید بن معاویہ' عاتکہ کے گھر کے سامنے تھا پھر یہ جعفر کے والد یحییٰ بن خالد برمکی کے قبضے میں آیا اور دار جعفر میں شامل ہو گیا۔اسے جعفر بن یحییٰ کا قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ حضرت حسان کے قلعہ کی جگہ تھی' علامہ مراغی کا وہم ہے' یوں نہیں ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے' آج کل یہاں خادموں کے لئے وقف جگہ موجود ہے جو مدرسہ کلبرجہ سے قبلہ میں مسجد سے نکلنے والے کی دائیں طرف موجود ہے' شیخ زینی بن ھرمز نے اسے دیوان الانشاءات اور مغربی گھروں کی جگہ بنایا اور پھر اسے مدرسہ' سرائے اور برآمدے کی شکل دی' یہ سارا کام نور الدین محلّی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں انجام پایا۔قدیم دور میں اسے باب السویق بھی کہتے تھے کیونکہ مدینہ کا بازار مغرب میں اسی طرف تھا پھر اسے باب الرحمہ بھی کہا جاتا تھا کیونکہ یحییٰ نے حضور ﷺ کے تعمیر مسجد کے بیان میں لکھا ہے کہ آپ نے مسجد کے تین دروازے رکھے تھے' ایک آخر میں' ایک باب عاتکہ جسے باب الرحمہ کہتے تھے' ان کے الفاظ یہ ہیں: بعد کے مؤرخین نے اس کی اس پہچان پر اتفاق کیا ہے اور ہمارے دور میں بھی اسی پر اتفاق ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ نام رکھنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی' میں نے کئی مشائخ سے اس بارے میں پوچھا لیکن کسی کو علم نہ تھا' اس کے بعد اللہ کی مہربانی سے مجھے اس بارے میں معلوم ہو گیا اور وہ یوں کہ امام بخاری نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمعہ کے دن ایک شخص دار القضاء (کچہری) کی جانب والے دروازے سے مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے' وہ آپ کے سامنے کھڑا ہوا اور عرض کی' یا رسول اللہ! مال مویشی ہلاک ہو گئے اور راستے بند ہو گئے ہیں (آمدورفت بند ہے) آپ بارش کی دُعا فرما دیں۔یہ سن کر رسول اکرم ﷺ نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دئے اور عرض کی: الٰہی بارش نازل فرما (تین مرتبہ فرمایا) حضرت انس کہتے ہیں: بخدا آسمان پر نہ تو بادل تھا' نہ بادل کا نام ونشان' اور نہ ہی ہمارے اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی گھر یا حویلی تھی جو دیکھنے میں رکاوٹ بن سکے۔اتنے میں سلع کی طرف سے ایک چھوٹی سی بدلی اُبھری اور آسمان کے درمیان آ کر پھیل گئی اور بارش شروع ہو گئی اور پھر سات دن گذر گئے' ہم سورج ہی نہ دیکھ سکے۔

پھر اگلے جمعہ ایک آدمی اسی دروازے سے اندر آیا' رسول اللہ ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے۔آگے باقی حدیث بیان کر دی۔

ہم آگے بابِ زیاد کے ذکر میں (جو اس سے اگلا ہے) بتائیں گے کہ دار القضاء' باب الرحمۃ اور باب السلام

کے درمیان تھا پھر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں اس طرف مسجد کا صرف ایک دروازہ تھا جسے باب الرحمہ کہتے تھے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش مانگنے والا یہ شخص ''رحمت'' تھا جو اندر داخل ہوا تھا چنانچہ اس کی دُعا کے نتیجے میں رحمت حاصل ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بناء پر بادل بھیج دیا۔ یہ سلع پہاڑ مسجد کی مغربی جانب ہی میں تھا چنانچہ شاید اسی وجہ سے اس کا نام باب الرحمہ رکھا گیا لیکن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک اور روایت میں ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے دن اس دروازے سے اندر آیا جو منبر کے سامنے تھا' جس کا مقصد یہ بنتا ہے کہ وہ اس دروازے سے داخل ہوا جو مسجد کی شامی جانب تھا کیونکہ منبر کے سامنے کہنے کا مطلب یہی بنتا ہے لیکن یہ دروازہ دار القضاء کی طرف نہ تھا لہٰذا ضرورت ہے کہ ان دونوں روایتوں کو جمع کیا جائے اور وہ یوں کہ یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں یا پھر یہ کہ منبر کے سامنے کہنے میں مجازی معنٰی لئے گئے ہیں یا پھر یہ دروازہ شامی جانب تھا جیسے ہم نے لکھا کہ یہ شمال مغربی کونے میں تھا چنانچہ وہ شخص اس طرف سے آ کر داخل ہوا' پھر دیکھا کہ حضور ﷺ کے خطبہ کے دوران سامنے نہیں آ سکے گا' اس کے لئے صفیں پھلانگنا پڑیں گی تو وہ منبر کے سامنے والے دروازے سے نمودار ہوا جو منبر کے سامنے تھا کیونکہ جس طرف سے وہ آیا تھا' اکثر اسے باب الرحمہ کہتے ہیں اسے یہ چیز بھی قوت دیتی ہے کہ بادل اسی طرف سے آیا تھا۔ واللہ اعلم۔

بابِ زیاد (باب القضاء)

اٹھارھواں دروازہ وہ تھا جسے باب زیاد کہتے تھے' یہ بھی اس وقت بند کر دیا گیا تھا جب وہ دیوار نئی بنائی گئی جس میں یہ موجود تھا' یہ خوخۂ ابوبکر اور اس سے پہلے والے دروازے کے درمیان تھا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسماعیل نے اپنے چچا سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''رحبۃ القضاء'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں تھا (آپ کا گھر تھا) انہوں نے قرض ادا کرنے کے لئے اپنے وصال کے موقع پر اپنے بچوں حضرت حفصہ اور عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کہ اسے بیچ دو' اس سے قرض ادا ہو جائے تو بہتر ورنہ بنو عدی بن کعب سے لے کر ادا کر دیں چنانچہ انہوں نے حضرت معاویہ بن ابوسفیان کے ہاتھ فروخت کر دیا' اسے دار القضاء کہتے تھے۔ حضرت معاویہ نے اسے اپنے دورِ خلافت میں خریدا اور انہی کے قبضے میں رہا تا آنکہ ۱۳۸ھ میں زیاد بن عبد اللہ مدینہ میں آئے اور اسے گرا کر مسجد کے صحن میں شامل کر دیا اور اس جگہ ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا جو چھوٹے خوخہ کی طرف کھلتا تھا' انہوں نے اسے گرانے کی مزدوری بازار والوں کے ذمے لگا دی۔

محمد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ مجھ سے انہوں نے اس سلسلے میں چار دانق وصول کئے۔ سہلہ بنت عاصم سے روایت ہے کہ اسے دار القضاء کہنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عبد الرحمٰن فیصلہ کے لئے یہاں راتوں میں ٹھہرتے اور فیصلہ کیا کرتے' اس کے بعد بنو عبد الرحمٰن نے اسے حضرت معاویہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس میں سرکاری ریکارڈ ہوتا اور بیت المال بھی یہیں تھا پھر امیر المؤمنین ابو العباس نے اسے گرا دیا اور مسجد کا صحن بنا دیا چنانچہ آج بھی صحن ہی ہے۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عمر کا وصال ہونے لگا تو اٹھائیس ہزار قرض چھوڑے جا رہے تھے چنانچہ حضرت عبد اللہ اور حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بلا کر فرمایا کہ میں نے اللہ کے مال سے کچھ لیا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاتے وقت مجھ پر کوئی قرض نہ ہو لہٰذا اسے بیچ کر قرض اُتار دینا' اگر قرض ادا نہ ہو سکے تو بنو عدی سے بات کرنا' یوں ادا ہو سکے تو بہتر ورنہ کئی قریشیوں سے لے کر ادا کر دینا چنانچہ حضرت عبد اللہ حضرت معاویہ کے پاس گئے اور یہ دار القضاء ان کے ہاتھ فروخت کر دیا پھر غابہ میں اپنا مال بھی فروخت کر کے قرض اتار دیا۔ اسے ''دار قضاء دین عمر'' کہا جانے لگا اور یہی ''رحبۃ القضاء'' کہلایا۔

محمد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ زیاد بن عبید اللہ نے دار القضاء کو اس وقت گرایا جب ابو العباس کی طرف سے ۱۳۸ھ میں امیر مدینہ تھے۔ آپ اہلِ مدینہ تاجروں سے کرایہ لیتے پھر اسے گرا کر مسجد کے صحن میں شامل کر دیا اور وہ دروازہ رکھا جو خوخہ کی ایک جانب تھا۔

میں کہتا ہوں' اس واقعہ میں دیوار گرانے اور دروازہ بنانے کی جو تاریخ دی گئی ہے' وہ ابنِ زبالہ و یحییٰ کی تاریخ سے مختلف ہے جو انہوں نے مسجد کے دروازوں کے بارے میں لکھی ہے: وہ کہتے ہیں: بابِ زیاد پر کیلوں سے جڑی ساج لکڑی کے اوپر باہر کی طرف لکھا ہے: ''امیر المؤمنین عبد اللہ نے مسجد رسول اللہ ﷺ میں اضافہ کرتے وقت یہاں کام کرنے کا حکم دیا اور اس صحن کی تعمیر کی' یہ کام ۱۵۱ھ کو مسلمانوں کی موجودگی میں کرایا جس کا مقصد رضائے الٰہی اور آخرت کی بھلائی ہے الخ۔''

میں کہتا ہوں کہ یہ زیاد وہی زیاد بن عبید اللہ بن عبد المدان الحارثی' سفاح کے خالو تھے' ۱۳۸ھ میں ابو العباس منصور کی طرف سے مکہ و مدینہ کے امیر تھے لہٰذا ابن ابی فدیک کا یہ قول ''وقت گذرتا گیا اور پھر زیاد بن عبید اللہ ۱۳۸ھ میں آئے'' ان کی صرف آمد کی تاریخ بتاتا ہے' پھر ان کا یہ قول '' اسے گرا دیا'' اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے دور میں گرایا تھا' اس میں تاریخ معین نہیں کی گئی لہٰذا یہ دروازے پر لکھے ہوئے کے خلاف نہیں ہے پھر ابن زبالہ کے اس قول ''زیاد بن عبد اللہ نے اس وقت دار القضاء گرایا جب ۱۳۸ھ میں امیر تھے'' سے مراد یہ لینا ہوگا کہ ان کے دور کی ابتداء تھی' گرانے کی تاریخ نہ تھی تا کہ دونوں باتیں جمع ہو سکیں لیکن اس سے پہلی روایت کی تاویل اس سے اچھی کی جا سکتی ہے۔

ابن زبالہ نے اپنی پہلی روایت میں محمد بن اسماعیل سے روایت کرتے ہوئے کہا: زیاد بن عبید اللہ نے چاروں دروازوں پر پردے ڈالے: بابِ دارِ مروان جسے باب السلام کہتے تھے' اس خوخے پر جو خوخۂ ابوبکر کے سامنے بنا تھا' اسی بابِ زیاد پر اور باب السوق پر یعنی باب الرحمہ پر جیسے کلامِ یحییٰ سے سمجھ آتا ہے۔

علامہ مجد نے ''دار القضاء'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ یہ دارِ مروان بن حکم تھا' یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں تھا جسے ان کا قرض ادا کرنے کے لئے بیچا گیا تھا۔ کسی کا گمان یہ بھی ہے کہ یہ دار الامارۃ تھا اور یہ گمان

بھی صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ یہ امیر مدینہ کا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ دار مروان مسجد کے قبلہ کی جانب تھا' یہ ہرگز نہ تھا' شاید مقصد یہ ہے کہ مروان دار القضاء کے مالک تھے' اسی لئے ان سے منسوب ہو گیا' یہ نام مشہور نہیں البتہ حافظ ابن حجر نے ابن شبہ سے نقل کیا کہ وہ امیر مدینہ تھے تو ان کا ہو گیا' فرماتے ہیں: یہ شائد اس شخص کا شبہ ہے کہ "یہ دار الامارۃ تھا" لہٰذا غلط نہ ہو گا لیکن "مشارق" میں کہا: کچھ نے غلطی سے اسے دار الامارۃ کہہ دیا۔

میں کہتا ہوں کہ ابن شبہ کے ہاں میں نے اسے حضرت معاویہ کی ملکیت دیکھا حالانکہ قدیم دور میں اسے دار الامارۃ کہتے تھے' یہ وہی دار مروان تھا جو مسجد کے قبلہ میں تھا اور پہلے گذر چکا ہے کہ امراء اس کے دروازے سے گذر کر مقصورہ کی طرف جاتے تھے۔ برھان بن فرحون کا وہم یہ ہے کہ یہ دار القضاء کا صحن تھا چنانچہ لکھا: ابن حبیب کہتے ہیں کہ پہلے قاضی حضرات مسجد کے صحن میں بیٹھا کرتے تھے بلکہ جنازگاہ کے پاس بیٹھتے یعنی بابِ جبریل کے باہر یا پھر دار مروان کے اس صحن میں جسے "رحبۃ القضاء" کہتے تھے لیکن اب اسے وضو کرنے کی جگہ بنا لیا گیا ہے لیکن یہ وہم ہے کیونکہ جسے وضو کی جگہ بنا لیا گیا ہے وہ عین دارِ مروان ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دارِ القضاء کے اس رحبۃ القضاء ہونے میں اختلاف نہیں جو مسجد کے مغرب میں بابِ مروان کی طرف ہے۔

پچھلے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صحن باب زیاد سے باب السلام تک کے سامنے تھا اور پھر آگے مسجد کے گرد مکانوں کے بیان میں آ رہا ہے کہ یہ باب الرحمہ تک بھی پھیلا ہوا تھا اور ایک شیخ مدینہ کے اس قول کا بھی یہی مقصد ہے جس میں انہوں نے کہا تھا: وہ شروع سے سنتے آئے ہیں لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ بابِ الرحمہ اور باب السلام کے درمیان ایسا کوئی گھر نہ تھا جو مسجد سے ملا ہوا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ اس صحن کا مقام آج کل "دار الشباک" ہے جو باب الرحمہ سے متصل ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی مدرسہ جو بانیہ اور حصنِ عتیق بھی ہے۔ یہ دار الشباک شیخ الخدام کافور مظفری نے بنوایا تھا جو حریری کے نام سے پہچانے جاتے تھے' یہ ۷۰۰ھ کے بعد بنایا گیا اور اس میں سے مسجد کی طرف جالی رکھی گئی' مسجد کی دیوار میں صرف اسی کی جالی لگائی گئی کسی اور گھر کی نہیں لگائی گئی اور ظاہر یہ ہے کہ بابِ زیادؔ جالی ہی کی جگہ تھا یا اس سے قبلہ کی جانب۔

رہا مدرسۂ جو بانیہ تو اسے مغلوں کے سپہ سالار جوبان نے ۷۲۴ھ میں بنوایا تھا' اس میں ایک تربت بھی بنائی تھی جو مسجد کی دیوار کے ساتھ دار الشباک اور حصنِ عتیق کے درمیان تھی اور یہ رحبۃ القضاء ہی میں موجود تھی اور مسجد کی دیوار میں اس کے سامنے جالی لگائی گئی تھی جو آج کل بند ہے لیکن اس تربت میں انہیں دفن ہونے نہیں دیا گیا' ۷۲۸ھ میں انہیں سلطان ابو سعید کے حکم پر تابوت میں ڈال کر بغداد سے مکہ لایا گیا' انہیں کعبہ کے گرد گھمایا گیا جیسے جواد اصفہانی کو گھمایا گیا تھا' الحاج عراقی نگرانی تھے اور جب لوگ انہیں مدینہ میں لے پہنچے تو امیر مدینہ نے اس کام سے روک دیا اور کہا کہ سلطان کے مشورہ کے بغیر دفن نہیں ہونے دوں گا۔

صلاح صفدی کہتے ہیں کہ جب سلطان ناصر کو پتہ چلا کہ انہیں تیار کر کے مدینہ میں دفن کرنا چاہتے ہیں تو اس نے مدینہ میں پیغام بھیجا کہ انہیں اس تربت میں دفن نہ کیا جائے چنانچہ بقیع میں دفن کر دیے گئے۔

ایک شخص نے مجھے وہاں دفن سے روکنے کی وجہ بتائی کہ جب انہیں اس تربت میں لٹایا جائے گا تو ان کے پاؤں حجرہ مقدسہ کی طرف ہوں گے کیونکہ یہ تربت مسجد کے مغرب میں تھی جبکہ جواد وغیرہ کو مسجد کی مشرقی جانب دفن کیا گیا تھا کیونکہ ان کے سر حضور ﷺ کے پاؤں میں آئے تھے۔ واللہ اعلم۔

رہا حصنِ عتیق تو یہ امراءِ مدینہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی پھر یہ سلطان غیاث الدین سلطانِ بنگال ابو المظفر اعظم بن سلطان اسکندر کے ہاتھ آئی' انہوں نے ۸۱۴ھ میں اسے مدرسہ بنا دیا اور پھر اسی سال فوت ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس سے قبل ایک سلطان نے اسے سرائے بنائے رکھا تھا۔

پھر متولی مسجد کی رائے ہوئی تو انہوں نے ہمارے دور کی آتشزدگی کے بعد اس سے ملحقہ غربی دیوار گرنے پر دار الشباک' جو بانیہ اور پورے حصنِ عتیق کو تبدیل کرنے کا ارادہ کیا' اسے مدرسہ بنایا اور سلطان اشرف کے لئے سرائے بنائی جو باب السلام اور باب الرحمہ کے درمیان تھی جیسے انیسویں فصل میں گذر چکا۔

یاد رہے کہ علامہ مطری نے یہاں اس دروازے کے بدلے میں جس کا ذکر بابِ عاتکہ سے پہلے چھوڑے دیا' ایک اور دروازہ ظاہر کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں: بابِ عاتکہ اور خوخۂ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان دو دروازے تھے جو نئی دیوار بنانے پر بند کر دیے گئے' مطری کے بعد والوں نے بھی یہی کہا لیکن ابن زبالہ یحییٰ اور ابنِ نجار کی کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ باب عاتکہ اور خوخہ کے درمیان بابِ زیاد کے علاوہ کوئی دروازہ نہ تھا لہٰذا ابن نجار نے ابواب میں خوخہ کا ذکر ترک کر دیا اور اس طرف کے سات دروازے لکھے۔ چنانچہ کہا: پانچواں باب عاتکہ تھا' چھٹا بابِ زیاد اور ساتواں بابِ مروان۔ انتہٰی اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ درست وہی ہے جو ہم بتا چکے۔ واللہ اعلم۔

خوخۂ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک خوخہ

انیسواں دروازہ وہ خوخہ تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خوخہ کے سامنے تھا' اسے مسجد میں اضافے کے موقع پر بنایا گیا اور ابن زبالہ کے گذشتہ اس قول کا مطلب یہی ہے جس میں انہوں نے دروازوں کی گنتی بتاتے ہوئے لکھا: مغربی جانب آٹھ دروازے تھے جن میں سے ایک' خوخۂ ابوبکر کی داہنی جانب کے مقابلہ میں خوخہ تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ خوخہ دار القضاء کے صحن میں کھلتا تھا جیسے ہم ابن زبالہ کی کلام سے بتا چکے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافہ میں بتا چکے کہ حضرت ابو غسان نے کہا تھا: مجھے محمد بن اسماعیل بن ابو فدیک نے بتایا کہ انہیں ان کے چچا نے بتایا تھا: وہ خوخہ جو مسجد کی مغربی جانب دار القضاء میں کھلتا تھا' وہ خوخہ ابوبکر تھا یعنی ان کے خوخہ کے مقابلے میں بنایا گیا تھا۔

ابن زبالہ مسجد کے دروازوں پر لکھائی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ: خوخہ کی اندر کی طرف اور باہر کی طرف کچھ بھی لکھا نہیں گیا تھا اور پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ آج کل اس خوخہ کا ایک دروازہ ہے جو مسجد کی طرف ہے جسے ''حاصل النورۃ'' کہتے ہیں' اسے خوخۂ ابوبکر کہا جاتا ہے اور پہلے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حاصل' دار القضاء سے ہے اور آج کل اس کا دروازہ وہ کشادگی ہے جو ان تین کشادگیوں میں سے ہے جو باب السلام میں داخل ہونے والے کی دائیں طرف ہیں اس خوخہ کی جگہ دروازہ بنا دیا گیا جس میں سے مسجد میں داخل ہوتے تھے' اس کے بعد جالی تھی اور پھر دروازہ تھا جس میں سے گذر کر مدرسہ اشرفیہ کو جاتے تھے۔

بیسواں دروازہ

بیسواں دروازہ بابِ مروان تھا' اس کا یہ نام رکھنے کی وجہ تھی کہ ان کا یہ گھر' جو قبلہ میں تھا' اس دروازے کے سامنے تھا اور اس کا کچھ حصہ مغرب کی طرف سے مسجد میں آ جاتا تھا۔ آج کل یہاں وضو کرنے کی جگہ موجود ہے جسے ۶۸۶ھ میں سلطان قلاوون صالحی نے بنایا تھا' اسے دار السلام بھی کہا جاتا ہے اور باب الخشوع بھی' یہ مطری نے لکھا ہے اور ابن جبیر کے سفرنامے میں اسے باب الخشیہ کہا گیا ہے' عام طور پر زائرین اسی سے اندر داخل ہوتے ہیں کیونکہ باب مدینہ کا یہ درمیانہ راستہ ہے لہٰذا یہ نام رکھنے کا لحاظ ڈھکا چھپا نہیں۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ آج تک قبلہ کی طرف آل عمر کے خوخہ یا خوخہ مروان کے علاوہ کوئی دروازہ موجود نہیں' ہم نے بڑے منار کی تعمیر کے وقت مشاہدہ کیا تھا کہ مروان ہی کے گھر کے دروازے سے مسجد میں داخل ہوتے تھے چنانچہ منارہ کی غربی دیوار بناتے وقت یہ خوخہ بند کر دیا گیا۔

علامہ زین مراغی کہتے ہیں: اس شخص پر اعتراض کیا جا سکتا ہے جس نے کہا کہ مروان اس میں سے مسجد میں داخل ہوتے تھے کیونکہ انہیں ان کی بیوی اُم خالد بن یزید' آمنہ بنت علقمہ نے قتل کر دیا تھا' اس کا نام فاختہ بنت ہاشم بھی بتایا جاتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ طاعون سے فوت ہوئے تھے' یہ واقعہ نصف رمضان ۶۵ھ کا ہے' ان کا دورِ خلافت نو ماہ تھا اور یہ واقعہ ان کے لڑکے کے لڑکے ولید بن عبد الملک بن مروان کے مسجد میں اضافے سے پہلے کا ہے یعنی تین سال قبل کا اور اس میں شک نہیں کہ یہ آلِ مروان کا خوخہ تھا لہٰذا درست یہ ہے کہ وہ اس جیسے دروازے سے داخل ہوتے تھے' اس سے نہیں اور گویا یہی وہ دروازہ ہے جس کا ذکر ابن زبالہ نے یوں کیا ہے: مسجد میں قبلہ کی طرف ایک دروازہ ہے جس میں سے گذر کر سلطان مقصورہ شریف کی طرف جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: رہا یہ کہ مطری نے کہا ہے' مسجد کے قبلہ میں (ان کے دور تک) آل عمر کے خوخہ کے علاوہ کوئی دروازہ نہ تھا تو ان کا یہ قول ہمارے گذشتہ بیانِ ابن زبالہ کے سامنے مردود ہے کیونکہ انہوں نے بیس سے زیادہ دروازوں کی تفصیل لکھی ہے جن میں اس دروازے کو بھی شمار کیا ہے جو قبلہ میں تھا اور دارِ مروان کی طرف تھا' اس میں سے امراء

داخل ہوا کرتے تھے پھر انہوں نے ان دروازوں کا ذکر کیا ہے جو قبلہ کی دائیں اور بائیں طرف تھے اور جن میں سے گذر کر مقصورہ کی طرف جاتے تھے اور وہ دروازہ جو قبلہ کی دائیں طرف تھا' وہ یہی ہے جسے مطری نے دیکھا تھا لہٰذا جو زین مراغی نے ذکر کیا ہے' وہ صحیح نہیں کیونکہ ان کے مطابق ابن زبالہ نے قبلہ میں جس دروازے کا ذکر کیا ہے' وہ یہی ہے کیونکہ انہوں نے ان دونوں کو الگ الگ بنا دیا ہے اور رہا مراغی کا اس قول سے پتہ لگا لینا: ''مروان اس دروازے سے داخل ہوتے تھے جس کا ذکر مطری نے کیا'' تو یہ صحیح ہے اور ابن زبالہ سے گذر چکا ہے کہ انہوں نے قندیلوں کے تیل رکھنے کی جگہ کو دروازہ کہا ہے اور قولِ مراغی میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس کے مطابق وہاں مروان نے بھی ایک دروازہ بنوایا تھا کیونکہ ابن زبالہ لکھتے ہیں کہ جب مروان نے اپنا گھر بنوایا تو اس میں سے قبلہ کی طرف ایک دروازہ رکھا پھر کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے روک نہ دیا جاؤں کیونکہ یہ قبلہ میں ہے لہٰذا اس گھر کا دروازہ اس طرف بنایا گیا جو اس میں داخل ہوتے وقت تمہاری دائیں طرف کو تھا یعنی وہی دروازہ جس کا ذکر گذر چکا۔ پھر کہا مجھے خدشہ ہے کہ مسجد سے روک نہ دیا جاؤں چنانچہ تیسرا دروازہ بنوایا جو مسجد کے ساتھ تھا یعنی باہر کی طرف سے باب السلام کے ساتھ ملحق تھا' آج کل اس کی جگہ پانی پینے کا حوض ہے جو مدرسہ حصن عتیق کے دروازے کے سامنے تھا اور اسی جہ سے رحبۃ القضاء کا نام رحبۂ دارِ مروان رکھا گیا کیونکہ یہ اس کے گھر کے سامنے تھا۔

ابن زبالہ کے مطابق جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے مسجد تعمیر کی تو ارادہ کیا کہ گلی کے دروازوں میں حلقے لگا دیں تاکہ مویشی اندر داخل نہ ہوسکیں چنانچہ وہ حلقہ بنایا جو دارِ مروان سے ملنے والے مسجد کے دروازے میں تھا پھر انہیں ظاہر ہوا کہ یہ تو باب مسجد جیسا ہے تو اسے چھوڑ دیا۔

میں کہتا ہوں' اس سے مراد لوہے کی زنجیر تھی جو باب السلام کے دونوں طرف باندھی جاتی تھی تاکہ چوپائے اس میں داخل نہ ہوسکیں' باب الرحمہ میں اس زنجیر کے نشان اب تک باقی ہیں' باب السلام کی یہ زنجیر موسم میں کھول دی جاتی تھی کیونکہ ۸۵۰ھ میں ایسا واقعہ پیش آیا تھا' لوگوں کا اس مقام پر جمگھٹا ہو گیا تھا جس سے کافی لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ باب السلام کے سامنے اندر کی طرف جنگلہ تھا جو اس جنگلے جیسا تھا جو باب جبریل کے اندر کی طرف تھا' لوگ اپنے جوتے یہیں اُتارتے تھے اور باب الرحمہ کے سامنے بھی اندر کی طرف یونہی ہوتا تھا چنانچہ امیر نے یہاں پتھر لگوا دئے' یہ باب السلام کی محراب کی جانب میں قریب تھا جو حصن عتیق کے دروازے سے متصل تھا اور پھر اس دروازے کے سامنے محراب کے برابر مسجد کا صحن بنایا اور لوگ وہاں جوتے اُتارنے لگے اور پھر باب الرحمہ کی محراب کے پاس بھی یونہی کیا اور وہ جنگلہ اُتار دیا اور یہ جگہ جنگلے اور باب الرحمہ کے درمیان مسجد کی زمین سے نیچے تھی چنانچہ اسے اس کے برابر کر دیا جیسے آج دکھائی دیتی ہے' اب اس کی سیڑھی اونچا کرنے کی ضرورت پڑی چنانچہ اصلی سیڑھی پر ایک اور سیڑھی بڑھا دی اور دروازے کا نچلا حصہ کچھ کم کر دیا اور یہ آج کل دکھائی دے رہا ہے جس سے مسجد کی حفاظت ہو گئی اور پھر باب النساء کے سامنے بھی صحن بنایا اور وہ جنگلہ اوپر اُٹھایا جو اندر کی طرف تھا' پھر باب جبریل کے سامنے صحن بنایا لیکن جنگلہ اوپر نہ اُٹھایا

کیونکہ اس طرف لوگ جوتے لے کر نہیں چلتے تھے اور پھر دوسری آنتشز دگی کے بعد مسجد کی تعمیر کے وقت وہ جنگلے اُتار دیئے گئے۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۳۲

خوخۂ آل عمر اور اس کی حد بندی

یاد رہے کہ آج کل یہ خوخہ ہی وہ مقام ہے کہ قبلہ والے برآمدوں میں سے دوسرے برآمدے سے لوگ یہاں پہنچتے ہیں اور یہی وہ برآمدہ ہے جس میں سے لوگ زیارت کے لئے چہرۂ انور کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان' ولید اور مہدی کے مسجد میں اضافوں سے یہ بات واضح ہے کہ اصل یوں ہے کہ جب سیّدہ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی ضرورت پڑی (آپ کے حجرہ کی) تو انہوں نے فرمایا تھا: میں مسجد کی طرف کیسے جاؤں گی؟ تو آپ سے عرض کی گئی: ہم آپ کو آپ کے گھر سے زیادہ وسیع جگہ دیں گے اور بالکل ایسا ہی راستہ دیں گے جیسا اب آپ کو حاصل ہے چنانچہ آپ کو حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مکان دیدیا گیا یعنی جہاں بعد میں سیّدہ حفصہ آئی تھیں' پہلے یہ کھجوریں خشک کرنے کی جگہ تھی۔

پہلے ہم ولید کے اضافے کے بیان میں بتا چکے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے آلِ عمر کے لوگوں کو پیغام بھیجا کہ امیر المؤمنین نے انہیں حضرت حفصہ کا مکان خریدنے کو کہا ہے' یہ مکان مسجد کے اندر کی طرف سے خوخہ کی دائیں طرف تھا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم کسی بھی قیمت پر اسے فروخت نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا: تو پھر میں خود اسے مسجد میں شامل کرلوں گا۔ انہوں نے کہا: یہ پھر آپ کی مرضی لیکن ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اسے ٹکڑے نہیں کریں گے۔ گھر گرا دیا گیا' آپ نے انہیں بہت سا مال دے دیا۔

ہم پہلے یہ بھی بتا چکے ہیں کہ حجاج ثقفی وہ شخص ہیں جنہوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس گھر کی قیمت لگائی اور اسے گرانے کی بات کی۔

یحیٰی کی ایک روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز تعمیر کرتے ہوئے جب حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان تک جا پہنچے تو عبید اللہ نے ان سے کہا' میں اسے نہیں بیچوں گا کیونکہ یہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حق ہے' نبی کریم ﷺ اس میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمر نے کہا: میں تمہارے بغیر اسے مسجد میں داخل نہیں کروں گا اور جب بہت کچھ کہا جا چکا تو حضرت عمر نے ان سے کہا: میں تمہارے لئے مسجد میں دروازہ رکھ دوں گا جس سے تم داخل ہو سکو گے اور تمہیں دارِ رقیق بھی دیدوں گا اور گھر کا جو حصہ بچے گا' وہ بھی تمہارا ہوگا' انہوں نے یہ بات منظور کر لی۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ ولید نے جب حج کیا اور مسجد نبوی میں گھوما اور اس دروازے کو قبلہ میں دیکھا تو حضرت عمر بن عبد العزیز سے پوچھا: یہ کونسا دروازہ ہے؟ انہوں نے بیت حفصہ کے بارے میں اسے آل عمر سے کی گئی گفتگو بتائی

کیونکہ اس بارے میں ان سے بہت گفتگو ہو چکی تھی اور پھر صلح بھی ہو گئی تھی۔ ولید نے ان سے کہا کہ آپ نے اپنے نھیال سے نرمی برتی ہے۔

ہم نے پہلے ابن زبالہ کی روایت سے اس طرف اشارہ کر دیا تھا اور پھر عبد العزیز بن محمد کی روایت سے بتایا ہے کہ وہ حضرت عبید اللہ بن عمر کو کہتے سنتے تھے کہ: اسے بند ہوتا دکھا کر اللہ مجھے موت نہ دے پھر یہ بھی آ چکا ہے کہ یہ خوخہ آل عمر کے گھروں کی طرف جانے کے لئے راستہ کا کام دیتا رہا اور پھر وہ وقت آیا کہ مہدی نے قبلہ کی طرف والے برآمدے میں مقصورہ بنا دیا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ انہوں نے انہیں ان کے دروازے سے نکلنے سے بند کر دیا' اس لئے اس بارے میں بہت کچھ ہوا اور پھر انہوں نے اوپر سے مسجد کی دیوار تک خوخہ بند کرنے پر صلح کر لی اور یہ طے کیا کہ وہ اسے زمین تک لے جائیں گے اور پہلے دروازے کی جگہ قبلہ میں اوپر کی طرف جالی لگا دیں گے اور تہ خانے جیسا بنا دیں گے جس سے مقصورہ کے باہر سے برآمدے کی طرف نکلا جا سکے گا اور اس کے تین درجے ہوں گے جو اس کے دروازے کے قریب مسجد کے تہ خانے میں ہوں گے چنانچہ وہی چبوترہ آج کل موجود ہے اور اس پر لوہے کا تالا لگا ہے اور حاجیوں کے زیارت کے لئے آنے کے وقت کے بغیر اسے کھولا نہیں جاتا۔

علامہ مطری کہتے ہیں کہ یہ ان آل عمر کا راستہ ہے جو ان کے گھروں کی طرف جاتا ہے جنہیں آج کل ''دار العشرہ'' کہتے ہیں حالانکہ یہ آل عبد اللہ بن عمر ہے۔ انتہٰی۔

میں کہتا ہوں کہ دارِ مسجد کے باہر کی طرف سے اس تہ خانہ پر دروازہ ہے' یہ بھی مسجد کی دیوار میں ہے' اس کے سامنے دہلیز ہے جس سے کھلے راستے کو پہنچا جاتا ہے' جہاں بہت سے گھر آباد ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر ہم وہاں کریں گے جہاں مسجد کے گرد گھروں کا ذکر ہو گا۔

فریب دینے کے لئے لوگوں کا دروازہ بنانا

لوگوں نے ان دروازوں کے نام گھڑ لئے ہیں' کسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کا گھر ہے' کسی نے اسے سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام سے منسوب کیا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ان گھروں والوں میں سے کسی نے دیوار کے گڑھے میں سرمہ رکھا ہوا ہے چنانچہ وہ حاجیوں سے کہتے ہیں کہ یہ سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سرمہ دانی ہے' پھر اپنے پاس ایک چکی کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چکی ہے۔

مجھے یہ باتیں شش و پنج میں پڑے شخص نے بتائیں' ایسے لوگوں نے انہیں یہ جھوٹی باتیں بتائی تھیں چنانچہ اس نے انہیں کچھ مال بھی دیا تھا۔ مسجد میں تہ خانے کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوتا ہے' وہ آج کل آل عمر میں سے نہیں ہے

کیونکہ جن کے پاس چابی ہوا کرتی تھی' آل عمر کا ایسا کوئی شخص نہیں بچ سکا' ان میں سے صرف اس شخص کی بیوی بچی تھی' وہ فوت ہو گئی تو اس نے اس شخص سے اولاد چھوڑی جن کے ہاتھ میں یہ چابی چلی آتی تھی چنانچہ یہ تہ خانے کے پاس بیٹھے والا ان کا نائب ہے' وہ اس کو موسم حج میں کھولتا ہے' اس کے پاس لوگوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو حاجیوں کو زیارت کراتے ہیں اور آنے والوں سے رقم لیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس بیٹھنے والا کچھ لئے بغیر اندر داخل نہیں ہونے دیتا' اندریں حالات اس پردیسی حاجی کا کیا حال ہوتا ہو گا جو اس طرح کا دروازہ دیکھے جو مسجد میں زیر زمین ہو اور اسے کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کی صاحبزادی سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تک پہنچ رہا ہے؟

اہلِ مدینہ کی دیکھا دیکھی یہ بات اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اسے ناپسند نہیں کرتا تھا تو ایسی صورت میں پردیسی اور مسکین ان مقامات تک پہنچنے کے لئے جان تک کی بازی لگا دینے کے لئے تیار ہو جاتا تھا حالانکہ بسا اوقات اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا' وہ اس کے لئے انتہائی مشقت اُٹھاتا تھا۔ میرے ایک دوست شیخ مبارک ابو الجود برکات الجیعانی نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں قیام سے پہلے کسی وقت مدینہ میں آئے' انہوں نے کہا کہ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور اس تہ خانے میں چلا گیا جس پر وہ بیٹھا شخص میری پیٹھ پر اس لئے سوار ہو گیا کہ میں نے اسے کچھ دیا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے اور ایک بااعتماد آدمی نے مجھے بتایا کہ اس تہ خانے میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے' مرد اور عورتیں' جگہ کی تنگی کے باوجود آپس میں ٹکراتے ہیں اور چلنے والے کو بھی ایک طرف ہونا پڑتا ہے۔

ایک شخص نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بہت بُرا منظر دیکھا کہ ایک نوجوان بھیڑ کے باوجود عورتوں کے پیچھے پیچھے تھا' عجیب طرح سے چل رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ایسا کام کر رہا تھا جس سے اللہ و رسول ناراض ہوں اور میں حیران تھا کہ لوگوں کو اس کام کے لئے کیسے کھینچ رہا ہے؟ اور یہ کام صرف اسی وجہ سے ہو رہا تھا جو میں نے ذکر کر دی ہے کیونکہ یہ گھر کا ایک دروازہ تھا اور جس کے ہاتھ میں چابی تھی وہ ان گھروں میں سے کسی ایک کا بھی مالک نہ تھا اور اگر ہوتا تو اس میں سے صرف اسی گھر کے لوگ داخل ہوتے کیونکہ انہوں نے صرف آل عمر کے داخلے کے لئے بنایا ہوتا نہ یہ کہ وہ ہر گذرنے والے سے پیسوں کا لالچ کرتے' وہ لوگ تو اس برائی سے بچنے والے تھے۔

پھر اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ گھر قابلِ زیارت ہیں تو باہر سے بھی تو ان کی زیارت کی جا سکتی تھی مسجد کو راستہ بنانے کی کیا ضرورت تھی اور حضور ﷺ کے ہوتے بدترین مال دنیا کے لئے یہ حالت بنانے کی کیا ضرورت تھی حالانکہ مال تو کجا' ہم آپ پر اپنی جانیں فدا کرنے کو تیار ہیں' انہوں نے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خوخہ کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے بند کرنے کا حکم فرما دیا تھا خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا دروازہ کیوں نہ ہو حالانکہ ان لوگوں کا دروازوں سے صرف یہ مقصد تھا کہ مسجد تک پہنچ سکیں تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس حقیر مال کے لئے حضور ﷺ کے سامنے کوئی دروازہ باقی رہے۔ یہ ایسا کام ہے کہ جو مومن بھی تعظیم رسول اللہ ﷺ کرنے والا ہے' وہ اسے پسند نہیں کرے گا' لہٰذا آپ کے حکم سے منہ پھیرنے والوں کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں کسی آزمائش میں نہ پڑ جائیں یا

انہیں نوچ کر دینے والا عذاب نہ گھیر لے۔

پھر اس تہ خانے کو تالا لگا ہے اور اس کے گردا گرد لکڑی لگی ہے' میں نے بے شمار خلقت دیکھی ہے جو پھسل جاتے ہیں اور کئی ان میں سے منہ کے بل گرتے ہیں۔ پھر جب نصف شعبان وغیرہ جیسی راتوں کو ہجوم ہوتا ہے تو پاؤں تلے سے زمین زلزلے کی طرح کانپتی ہوتی ہے اور یہ چیز حضور علیہ السلام کو تکلیف دیتی ہے۔ دیکھئے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب بھی کبھی مسجد کے گرد کے مکانوں میں میخ یا کیل ٹھونکنے کی آواز سنتیں تو ان کو پیغام بھیج دیتیں کہ رسول اللہ علیہ السلام کو تکلیف نہ دو اور یہی وجہ تھی کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے طہارت خانوں کے علاوہ اپنے گھر کے دروازے کے دروازے نہیں لگائے تھے حالانکہ وہ طہارت خانے رات کے وقت عورتوں کے استعمال کے لئے بنوائے گئے تھے جو مدینہ سے باہر تھے' پھر یحیٰی کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بتایا کہ ایک اُم المؤمنین نے دروازے پر دستہ لگانے کے لئے بڑھئی کو بلایا تو اس نے دستہ لگانے کے لئے کیل کو زور سے ضرب لگائی جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس بڑھئی سے تلخ کلامی فرمائی اور فرمایا: تم جانتے نہیں کہ حضور علیہ السلام کا احترام وصال کے بعد بھی ویسے ہی کرنا لازم ہے جیسے آپ کی زندگی میں کیا جاتا تھا؟ اس پر ایک اور اُم المؤمنین نے کہا: کیا یہ آواز آپ تک پہنچ رہی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس آواز سے حضور علیہ السلام کو ویسے ہی تکلیف ہوگی جیسے آپ کی زندگی میں ہوتی۔

سلطان قایتبائی کا سفر حج

میں جب سے مدینہ منورہ میں حاضر ہوا ہوں' اس برے کام کو دل' زبان اور تحریری طور پر برا جانتا آیا ہوں لیکن اس سلسلے میں کسی نے بھی میری مدد نہیں کی کیونکہ عام لوگوں کے دلوں میں بن دیکھے پرانی رسمیں نبھانا گھر چکا تھا پھر میں نے اپنی کتاب ''الوفاء بما یجب لحضرۃ المصطفیٰ علیہ السلام'' میں اس کا خوب رد کیا ہے۔ اس کے بعد مجھے سلطان الاسلام والمسلمین سلطان اشرف قایتبائی کے سامنے ہونے کا بھی موقع ملا جب انہوں نے ۸۸۴ھ میں حج کا ارادہ کیا تو زیارتِ روضۂ انور کے لئے پہلے مدینہ منورہ پہنچے اور پھر ذوالقعدہ کی بائیس تاریخ کو جمعہ کے دن بوقت طلوعِ فجر یہاں حاضری کے لئے آئے' یہاں پہنچ کر عاجزی و انکساری والا لباس پہنا' دبدبے اور رعب کے خوف سے صرف وہ لباس پہنا جو حاضری کے لئے مناسب تھا اور پھر شاہی گھوڑے سے اس وقت اُتر آئے جب شہر پناہ کے دروازے پر پہنچے' یہاں سے پیدل چلے اور بلند مرتبہ جناب میں حاضر ہوئے جو اللہ کے محبوب و شفیع ہیں (علیہ السلام)' تحیۃ المسجد کے دو نفل پڑھے سلام عرض کیا اور خاص رحمتوں سے حصہ لیا' پھر آپ کے ساتھ لیٹنے والے دو پیاروں کی خدمت میں سلام پیش کیا اور ایک گوشے سے گرد اُٹھا کر چہرہ پر ملی۔ پھر انہیں مقصورہ شریف میں داخلے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اسے عظیم انعام قرار دیا' آج کل اسے حجرہ منیفہ کہا جاتا ہے۔ سلطان نے کہا کہ اگر مجھے کہیں دور کھڑے ہونے کی جگہ مل

جاتی تو میں وہاں بھی کھڑا ہونے کو تیار تھا کیونکہ یہ بڑی عظیم بارگاہ ہے' تعظیم کا خیال رکھتے ہوئے یہاں کون کھڑا ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔

پھر صبح کی نماز پہلی صف میں روضۂ پاک کے فقیروں میں' میرے مصلاً کے قریب اسطوانۂ مہاجرین کے نزدیک کھڑے ہو کر ادا کی' میرے اور شاہ کے درمیان ان کے امام شیخ الشیوخ برھان الدین کرکی موجود تھے' اس سے قبل ان سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا اور میں نے انہیں سلام کہنے میں ابتداء بھی نہیں کی' نہ ہی سلطان نے سلام کہا ایسا اتفاق میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

اس کے بعد انہوں نے حضور ﷺ کے چچا جان اور شہداءِ اُحد کی زیارت کا ارادہ کیا چنانچہ حسب عادت پیدل چل پڑے اور اسی طرح مدینہ کے دروازے سے باہر نکلے۔ ہر مقام پر یہی عادت رہی اور جب تک واپسی نہیں ہوئی' مدینہ میں قیام کے دوران پیدل ہی چلتے رہے اور جب جمعہ کی نماز کا وقت ہوا' تو اسی مصلّے پر آ بیٹھے' اب بھی میرے اور ان کے درمیان وہی امام حائل تھے پھر ایک شخص نے شیخ المحدثین علامہ شمس الدین بن ابو الفرج عثمانی سے ایک حدیث بخاری پڑھی۔ وہ امام چونکہ طلب علم کے بڑے دلدادہ تھے لہٰذا مجھ سے انہوں نے اس بارے میں علمی سوال و جواب شروع کر دیئے' وہ بڑے باکمال شخص دکھائی دیئے اور بحث کرتے وقت بڑے انصاف سے بات کرتے تھے۔ اب میری اور ان کی محبت ہو گئی۔

پھر امام تو اُٹھ گئے لیکن سلطان وہیں بیٹھے رہے' انہوں نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے بات کرنے کا موقع عطا کیا اور گہرے مسائل پر گفتگو کی' میں نے دیکھا کہ وہ حد درجہ مہربان تھے' بہت عاجزی اور بردباری کرنے والے اور نہایت سمجھ دار تھے' میں نے ان کے سامنے یہ اشعار پڑھے:

"میں ہر سوار سے احمد بن سعید کے بارے میں کوئی اچھی پوچھتا جاتا تھا اور پھر جب ہماری ملاقات ہو گئی تو بخدا میری آنکھوں نے وہ کچھ دیکھا جو کان نہیں سن سکے تھے۔"

میں نے تہ خانے کے بارے میں ان سے بات کی اور دل میں سوچا' شاید اللہ تعالیٰ نے سلطان کو یہاں بھیج کر میری ان سے ملاقات اس لئے کرائی ہے کہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس اس برائی سے پاک کر دی جائے اور یہ چیز سلطان کے نامۂ اعمال میں لکھی جا سکے اور پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ گذشتہ حکمرانوں نے اس برائی کو بند کرنے کا کبھی خیال نہیں کیا تھا حالانکہ جو خدشات ہم بیان کر چکے ہیں' وہ ان کے دور میں نہ تھے' انہوں نے صرف ایک رکاوٹ کی بناء پر اسے چھوڑے رکھا تھا اور اس وقت کوئی بھی رکاوٹ موجود نہ تھی۔ سلطان نے وعدہ کیا کہ کوشش کروں گا۔

پھر اس امام کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا موقع ملا تو میں نے اس بارے میں ان سے بھی بات کی اور بتایا: مجھے یہ معلوم ہوا ہے چابیاں رکھنے والے کو ہر سال اس کام سے دس دینار آمدن ہوتی ہے اور ہر سال اس کی عزت بڑھتی جا رہی ہے' میں نے کہا کہ اسے لالچ دے کر اس کام سے ہٹا دینا چاہیے۔

امام نے یہ بات سلطان سے کی تو انہوں نے کہا کہ ہم اسے اپنی طرف سے راضی کر دیں گے پھر سلطان مغرب کی نماز کے لئے آئے تو براہ مہربانی مجھ سے خود بات شروع کر دی' اس وقت وہ امام موجود نہیں تھے لیکن ان تک پوری بات پہنچ چکی تھی چنانچہ انہوں نے مجھ سے مصلاً شریف میں لکھی اس آیت کے بارے میں پوچھا: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ کہ کیا یہ آیت واقعۂ معراج اور نمازیں فرض ہونے سے پہلے اُتری تھی یا بعد میں؟ اور آیت کے اُترنے سے پہلے خطاب کیونکر ہوا؟ چنانچہ میں نے جواب دینا شروع کیا تو اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا' انہوں نے نماز پڑھی اور پھر چھ رکعت نفل پڑھے اور پھر جواب سننے کے لئے میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے انہیں مدینہ میں اس آیت کے نازل ہونے کی تاریخ بتائی اور اس سلسلے میں اختلاف کا ذکر کیا اور بتایا کہ نماز کی وصیت معراج کے موقع پر مکہ میں ہوئی تھی اور وہ کچھ بھی بیان کیا جو علماء نے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے متعلق لکھا ہے اور یہ بتایا کہ قبلہ کئی مرتبہ منسوخ ہوا اور حضور ﷺ نے مکہ میں دو یمانی رکنوں کے درمیان کھڑے ہو کر کعبہ کو اپنے اور بیت المقدس کے درمیان رکھ کر نماز پڑھی تھی اور پھر کئی اور فائدہ مند باتیں بھی کیں جن کا ہم اپنے مقام پر ذکر کر چکے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا اور ہم نے عشاء کی نماز بھی اکٹھے پڑھی۔ اس مجلس میں مجھے وہ عزت حاصل ہوئی جسے میں نے محبوب اور شفیع رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس نیکی کا بدلہ اور جزاء سمجھا۔

پھر انہوں نے اہلِ مدینہ میں بہت سا مال تقسیم کیا جو چھ ہزار دینار سے بھی زیادہ تھا اور پھر اپنے اسی امام کے ہاتھ مجھے بھی کافی مال بھیجا' میں نے مدینہ سے ٹیکس اُٹھانے اور اس کے بدلے میں امیر مدینہ سے تعاون کرنے کی بات کی جس سے مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے اس بارے میں بھی وعدہ کر لیا' پھر مجھ سے اس دارِ عباس کے بارے میں پوچھا جو ان کے لئے خریدا گیا تھا اور یہی گھر قاضی زکوئی کے قتل کا سبب بنا تھا کیونکہ اسے لیتے وقت انہوں نے سیاست سے کام نہیں لیا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ آپ نے مجھے اس سلسلے میں لکھ کیوں نہیں دیا تھا؟ میں نے ایسا عذر پیش کیا جو انہوں نے قبول کر لیا اور جو کچھ اس معاملے میں ہوا تھا' اس سے پہلو تہی کی اور اس معاملے کو سلجھانے کا وعدہ کیا اور جب واپس آئے تو یہ وعدہ پورا بھی کر دیا' انہوں نے انہیں بہت سی رقم دے دی جس سے وہ راضی ہو گئے۔ پھر یہ مہربانی کی کہ مجھے وہ خط و کتابت کرتے رہنے کی اجازت دے دی جس میں اہلِ مدینہ کی بھلائی ہو اور محتاجوں کے بارے میں اطلاع ہو۔

پھر اسی ماہ کی چوبیس تاریخ کو سلامتی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف توجہ کی' مدینہ کے فقیروں اور فقہاء کو ساتھ لیا اور بابِ مدینہ سے پیدل باہر نکل آئے۔ وہاں کچھ دیر ٹھہرے اور ہم نے حضور ﷺ کے لئے مل کر فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

پھر میں الحاج شامی کے ساتھ مکہ پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بھی وہ اسی عاجزی میں تھے اور وہاں مدینہ منورہ کے مقابلے میں بھی زیادہ مال تقسیم کیا اور جب میں مکہ مکرمہ میں ان کے امام کے ساتھ مل بیٹھا تو ہم نے مدینہ شریف میں صدقہ کی بات کی نیز یہ بھی سوچا کہ اس قدر مال خرچ کرنے سے کیا نفع ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مغرب سے آئے چار

فقیروں میں سے کسی نے بھی یہ مال نہیں لیا کیونکہ وہ اپنی سرائے میں ٹھہرے رہے تھے اور تقسیم کرنے والے تک نہیں پہنچ سکے نیز ایک اور شخص تھا جس کے بارے میں میں چاہتا تھا کہ اسے جو کچھ ملا تھا' اس سے زیادہ ملنا چاہئے۔

یہ بات سلطان تک پہنچ گئی چنانچہ جب منٰی میں ٹھہرے ہوئے تھے تو میں نے اس امام کو الوداع کہنے کا سوچا' انہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ سلطان کو الوداع کہو۔ میں نے کہا: خدشہ یہ ہے کہ میرے جانے کا مفہوم کوئی اور نہ سمجھ لیں۔ امام نے کہا: انہیں الوداع کہنا ضروری ہے چنانچہ ہم دونوں چل پڑے' وہاں مجھے وہ اعزاز ملا جس پر میں اکرم الاکر مین سے اس کے لئے دعا گو ہوں۔

سلطان نے پھر کہا: آپ نے امام سے یہ بات کی ہے؟ سلطان فقیروں کے بارے میں کی ہوئی بات نہیں بھولے تھے۔ میں نے کہا ہاں کی ہے چنانچہ انہوں نے مجھے سو دینار دئے اور کہا کہ ان میں بیس بیس دینار بانٹ دینا۔ پھر کہا: کیا اب تو کوئی باقی نہیں رہ گیا؟ میں نے کہا کہ ذہن میں تو کوئی نہیں آ رہا۔

میں نے دیکھا کہ وہ حضور ﷺ کے پڑوسیوں کے بارے میں بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے کھڑے کھڑے مجھے الوداع کہا اور اس تہ خانے کے بارے میں حکم دیا کہ اسے نہ کھولا جائے بلکہ بند ہی رکھا جائے چنانچہ جب خدام کے شیخ کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں الحاج مصری کے اس سال آنے پر اسے کھولنے سے منع کر دیا اور بند ہی رکھا کیونکہ کسی برائی کو دور کرنے کے لئے اس کی جڑیں کاٹنا ضروری ہوتی ہیں اور پھر انہوں نے اسے بند کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اہلِ مدینہ کے لئے قایتبائی کی طرف سے وقف مال

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد سے سلطان مصر پہنچے تو بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے مصر میں پہنچ کر ساٹھ ہزار دینار نکالے کہ ان سے مکان خرید کر وقف کر دیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدن بارگاہِ اقدس میں بھیج دیں اور اس سے ایسا لنگر جاری کر دیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا ہوا تھا' یہ ایسا کام تھا کہ اس سے پہلے کسی اور سلطانِ اسلام نے نہیں کیا تھا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ان کے لئے یہ کام آسان فرما دے۔

ہم نے انتیسویں فصل میں یہ بات بتا دی تھی کہ سلطان کی طرف سے ٹیکس ختم کرنے اور امیر مدینہ کو اس کے عوض رقم فراہم کرنے کے بارے میں چٹھیاں آ گئی تھیں اور پھر انہوں نے بہت سے مکان وقف کر دئے تھے جن سے اہلِ مدینہ کے لئے ساڑھے سات ہزار اِردب گندم سالانہ (ایک اردب پچیس صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے یعنی تقریباً چھ سو پچپن من) حاصل ہوتی تھی اور وہ یہاں لنگر کے کام آتی تھی جو ہر گھر کی ضرورت کے لئے کافی ہوتی تھی' انہوں نے ابو البقاء بن الجیعان بہائی کو اس کا نگران بنایا جو اسے خرچ کرتے اور لنگر جاری رکھتے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمید ہے کہ یہ سلسلے جاری رکھے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں ایسے کام جاری

کرار کھے ہیں جو ان سے پہلے کسی سلطان سے نہیں ہو سکے جن میں سے ایک یہ بتایا جا چکا کہ انہوں نے مسجد شریف اور حجرہ مبارکہ کی تعمیر کی تھی اور پھر تہ خانے کی یہ رسم بند کر دی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں تہ خانے کی چابیاں تھیں' وہ مصر پہنچا اور اسے دوبارہ کھولنے کی اجازت مانگی لیکن انہوں نے یہ بات نہیں مانی اور خزانے سے دس سے کچھ زیادہ دینار سالانہ اس کے لئے مقرر کر دیئے جو اسے اس بڑے کام سے حاصل ہوتے تھے۔ پھر اس بارے میں اطلاع کے لئے چٹھیاں آ گئیں اور اس تہ خانے کو بند کرنے کا بھی حکم تھا لیکن کچھ نفسانی خواہشات والوں کے لئے ان پر عمل مشکل تھا جس کا سبب میں ہی تھا چنانچہ اس میں تاخیر ہو گئی' اسی دوران شیخ الخدام فوت ہو گئے لیکن یہ سلسلہ بند نہ کیا اور جب ۸۸۷ھ کو میں مصر پہنچا تو مجھے ڈر لگا کہ اس وجہ سے سلطان کچھ لوگوں پر ناراض ہوں گے لہٰذا میں نے تاخیر کا عذر یہ پیش کیا کہ شیخ حرم فوت ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے شیخ حرم اور متولی تعمیر شمس بن زمن کو خط لکھا کہ اسے مکمل طور پر بند کر دیا جائے اور پھر دوبارہ نہ کھولا جائے۔ اس کے برعکس متولی اس کی طرف مائل تھے اور جیسے کہ فصل اٹھائیس میں آ چکا کہ ان کو مجھ پر رنج تھا۔ پھر اس کے بعد ۸۸۶ھ میں یہ سب کچھ جل گیا اور ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ یہ سب کچھ سلطان کی طرف سے اسے بند کرنے کے بعد ہوا' آگ نے اسے سخت نقصان پہنچایا۔ اب متولی نے اسے دوبارہ مضبوط بنایا اور اس کا ایک دروازہ رکھا اور جب اس سلسلے میں اس کے پاس چٹھی آئی جس میں میرے دخل کا ذکر تھا تو اس نے کہا کہ میں اس سلسلے میں سلطان سے بات کروں گا کیونکہ یہ گھر ان کے ہیں۔

پھر شیخ حرم نے یہ بات سلطان تک پہنچائی تو ان کی طرف سے چٹھی آئی کہ اسے بند کر دو اور انہوں نے بند کرنے میں تاخیر اور دوبارہ بنانے پر ملامت کی لیکن متولی نے تعمیل حکم میں تاخیر کی تاکہ سلطان سے بات کر سکے اور کہا وہ انہیں قابلِ زیارت مقام قرار دیدیں' مقصد یہ تھا کہ کسی طرح انہیں برقرار رکھا جا سکے لیکن لوگوں نے اس کی جرأت پر تعجب کیا۔ پھر سلطان تک یہ خبر پہنچ گئی اور ساتھ ایسی باتیں بھی پہنچیں جن کی وضاحت سے بات لمبی ہو جائے گی۔ اس پر سلطان شدید ناراض ہوئے اور اسے بند کرنے کے لئے حکم بھیجا اور تاخیر کرنے پر سخت ڈانٹا چنانچہ شیخ حرم نے مسجد کی باہر کی جانب سے اسے مضبوط تعمیر کے ذریعے بند کر دیا اور اس کا دروازہ بھی اُتار لیا اور مٹی سے اسے بند کر دیا اور مسجد کی زمین کے برابر کر دیا چنانچہ اس کا نام و نشان نہ رہا۔ یہ واقعہ چار ذوالقعدہ ۸۸۸ھ کو ہوا جس سے ہر بھلا آدمی خوش ہوا اور سلطان کو ڈھیروں دُعائیں دیں۔ یہ ان کا بہت اچھا کام تھا۔

حرمین شریفین میں سلطان قایتبائی کے کارنامے

☆ سلطان کے عظیم کارناموں میں سے ایک خلیص چشمے کو بار بار بندش کے بعد بحال کرنا تھا' یہ حج کے لئے بہت مفید ثابت ہوا اور یونہی ''برکۃ الروحاء'' کو بحال کیا گیا۔

☆ ایک اور کارنامہ مسجد خیف کی نئے سرے سے تعمیر تھی جبکہ وہ مکمل طور پر گر چکی تھی پھر اس کا قریبی منار اور سبیل بھی بنوائی جو اس کے دروازے کے قریب تھے پھر اس منار پر اذان پڑھنے اور مسجد میں امامت کرانے والے کے لئے تنخواہ مقرر کی۔

☆ انہی کارناموں میں سے ایک یہ تھا کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی طرف منسوب مسجد نمرہ کے اگلے حصے میں سایہ کا انتظام کیا کیونکہ اس دن شدید دھوپ کی وجہ سے حاجیوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔اللہ تعالیٰ شاہ کو قیامت کے دن سایہ نصیب فرمائے جب سایہ اسی کے ہاتھ ہوگا۔

☆ انہی کارناموں میں ایک' عرفہ کے چشمے کی بحالی تھی جو بطنِ نعمان سے آتا تھا۔وہ مکمل طور پر بند تھا' نشانات مٹ چکے تھے نالیاں وغیرہ بند ہو چکی تھیں اور دور و نزدیک کی نہریں بند ہوگئی تھیں' سلطان نے اسے مسجد نمرہ تک پہنچا دیا اور وہاں پانی جمع رکھنے کے لئے بڑا حوض (ڈیم) بنا دیا' اس کے ذریعے حج جیسے عظیم فریضے میں پیاس کی شکایت ختم ہوگئی۔میں ہر سال دیکھا کرتا تھا کہ فقیر لوگ اس دن پانی ہی مانگتے رہتے تھے اور یہ تحفے سے کم نہ تھا۔اب کوئی مانگنے والا نہ رہا۔اللہ تعالیٰ سلطان کو اس خدمت پر حوضِ کوثر سے پلائے۔

☆ انہی میں سے مدرسہ اور سرائے تھی جنہیں مکہ مکرمہ میں بنایا جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

☆ ان میں ایک یہ کہ انہوں نے اس سال حج بھی کیا جبکہ اس سے قبل ڈیڑھ سو سال سے کسی سلطانِ مصر نے حج نہیں کیا تھا' شاہانِ مصر میں سے حج کرنے والے آخری سلطان ملک ناصر محمد بن قلاوون تھے جنہوں نے تین حج کئے تھے' پہلا ۷۱۰ھ میں' دوسرا ۷۲۰ھ میں اور تیسرا ۷۳۲ھ میں' ان کے بعد کسی شاہِ مصر نے حج نہ کیا' میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سلطان کی عمر دراز فرمائے اور حج ان کے نصیب میں ہو اور بارگاہِ رسالت میں انہیں بھلائی کا مزید موقع عطا فرمائے۔

☆ پھر اسکندریہ کی چھاؤنی میں ایک عظیم برج بنوایا' ان سے پہلے کسی نے نہیں بنوایا تھا پھر وہاں اسلحہ اور فوج کا انتظام کیا۔

جب میں بیت المقدس میں اضافہ دیکھنے گیا تو انہوں نے یہاں بھی کام کیا تھا' پھر مصر وغیرہ میں ایسے کام کرائے جو کوئی اور نہ کرا سکا' مدرسے بنوائے' مسجد اور پل تعمیر کرائے۔یہاں تفصیل بتانے کا موقع نہیں' ہم نے تو صرف وہ کارنامے ذکر کئے ہیں جو حجاز سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ہماری ضرورت اتنی ہی ہے۔

وہ ایسے بادشاہ تھے جن کی رعایا اطاعت گذار' وہ ہر طرف سے محفوظ' صبر کرنے والے' جلد باز نہ تھے' بہت حیاء دار' صاحبِ عزت اور دبدبہ والے تھے۔جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تو جلد بازی سے کام نہ لیتے بلکہ سکون سے کرتے۔اہل علم کی قدر دانی کرتے اور انہیں عزت دیتے۔

ہم نے ان کا یہاں ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ ایک واقف کار اس سلطان کے لئے دُعائیں کرے کیونکہ

انہوں نے ایسے مقاصد پورے کئے ہیں اور یہ مقصد بھی تھا کہ آئندہ سلاطین ان کے نقشِ قدم چل کر ان جیسے کام انجام دے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ان کی عمر دراز فرمائے۔اب شائد ہی ان کے بعد کوئی ایسے کام کرا سکے۔

فصل نمبر ۳۴

مسجد نبوی کے گرد مکانات اور مہاجرین کے گھروں کی نشاندہی

''طبقات'' میں ابن سعد کے مطابق حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں گھروں کی نشاندہی فرمائی تھی چنانچہ بنو زھرہ کے لئے مسجد کے آخر میں ایک طرف نشان لگایا' حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے حصے میں ''حش'' والی جگہ آئی۔حش ان کھجور کے درختوں کو کہتے ہیں جنہیں پانی نہ دیا جائے۔

انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں کی نشاندہی فرمائی چنانچہ بنو زھرہ کے لئے مسجد کے آخر میں ایک جگہ پر نشان لگایا' حضرت مسعود کے دونوں بیٹوں عبد اللہ اور عتبہ کے لئے مسجد کے قریب یہ خطّہ (زمین کا ٹکڑا) مقرر فرمایا۔

علامہ یاقوت کہتے ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ پہنچے تو لوگوں کو گھر اور ٹھکانے الاٹ کئے' بنو زھرہ کے لئے مسجد کے آخر میں ایک جگہ الاٹ کی' حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کو حش والی مشہور جگہ دی' قبیلہ ھذیل میں سے حضرت مسعود کے دونوں بیٹوں عبد اللہ اور عتبہ کے لئے مسجد کے نزدیک' ان کے نام سے مشہور ٹکڑا مقرر فرمایا' حضرت زبیر بن عوام کو بقیع کا وسیع حصہ دیا' حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو ان کے گھر والی جگہ دی' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد کے نزدیک ان کا مکان دیا اور یونہی حضرت عثمان بن عفان' حضرت خالد بن ولید اور حضرت مقداد وغیرہ کو ان کے مکان الاٹ کر دیئے۔حضور ﷺ نے اپنے صحابیوں کو زمین کے یہ ٹکڑے خود عطا فرمائے۔کنتر جگہ خود لی اور جو آباد اور رہائشی جگہ تھی وہ انصار نے آپ کو پیش کی جس میں سے آپ نے مرضی کا حصہ لے لیا' سب سے پہلے جس صحابی کو اپنا حصہ دیا وہ حارثہ بن نعمان تھے۔

دارِ آلِ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مسجد کے گرد قبلہ کی طرف سے اوّل گھر حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تھا جس میں وہ خوخہ تھا جس کا ذکر گذر چکا اور آج کل یہ گھر کسی آلِ عمر کے فرد کے پاس نہیں ہے۔پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ اس گھر کی جگہ

کھجوریں سکھانے کے کام آتی تھی' یہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ملی اس حجرہ کے بدلے میں جب وہ مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آلِ عمر کو اس کے بدلے میں دارِ دقیق اور اس کا بقیہ حصہ دیدیا گیا تھا۔

ابن غسان کہتے ہیں کہ مجھے کسی نے بتایا کہ یہ دارِ آلِ عمر کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی اور جہاں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات وضو فرمایا کرتی تھیں اور جب آپ کا وصال ہو گیا تو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے تیس ہزار درہم دے کر اپنے نام کر لیا چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کے بعد اس کے وارث بنے۔ یہ وہی تھا جس کے بارے میں حضرت عبد اللہ نے تحریر کیا تھا کہ: ''عبد اللہ نے اپنا مسجد کے قریب والا گھر صدقہ کر دیا جو انہیں حضرت حفصہ کی وراثت سے ملا تھا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ گھر جو آلِ عمر کے ملکیت میں آ گیا

ابن غسان کہتے ہیں' مجھے اطلاع دینے والے نے بتایا: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ گھر جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''میرے سامنے والے یہ دروازے بند کر دو الحدیث۔'' حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قبضے میں آ گیا تھا' یہ وہ گھر ہے کہ جب تم مسجد میں موجود خوخہ سے دارِ عبد اللہ میں داخل ہو تو تمہاری دائیں جانب ہے' وہاں تمہیں وہ خوخہ نظر آئے گا جو اس خوخہ کے اندر ہے جو راستہ ہے اور جس پر دروازہ ہے' یہ خوخۂ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔

ابن غسان مزید کہتے ہیں: حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ گھر خرید لیا تھا اور قبلہ کی جانب والا مکان بھی خریدا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ گھر حضرت عمر کے لڑکے کو دیدیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آخری روایت کمزور ہے لہٰذا اس کے قائل کا ذکر نہیں کیا گیا' پھر اس لئے بھی کہ یہ گھر بنو تیم کے گھروں میں تھا' جب حضرتِ ابوبکر کے اس گھر کا ذکر کیا جس کے بارے میں مذکورہ روایت آئی ہے تو انہوں نے یہ روایت ذکر نہیں کی بلکہ مشہور روایت ہی پیش نظر رکھی کہ وہ مسجد کے مغرب میں ہے کیونکہ جس خوخہ کے بارے میں حدیث آئی ہے وہی دار القضاء کے صحن میں کھلتا ہے' اسی لئے جب انہوں نے مسجد میں اضافہ کیا تو اس جیسا بنانے کا ارادہ کیا چنانچہ اسے خوخہ بنایا جو اس صحن میں کھلتا تھا' دوسرے دروازوں جیسا نہیں بنایا اور پھر اس لئے بھی کہ انہوں نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے گھروں کے بارے میں رائے پختہ کر لی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہ گھر اپنا لیا جسے دارِ عائشہ کہا جاتا تھا جو دار الرقیق اور دارِ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان تھا اور جسے آپ نے آگے دے دیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر دار الرقیق سیّدہ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر اس کے پہلو میں ہو گا حالانکہ لوگوں کے ہاں مشہور یہ ہے کہ وہ گھر جو خوخۂ آلِ عمر سے نکلنے والے کی داہنی طرف تھا' وہ

حضرت عائشہ ہی کا گھر تھا تو شاید شبہ اس بناء پر پڑا کہ یہ حضرت ابوبکر کی طرف منسوب تھا حالانکہ مؤرخین کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گھر جو خوخہ کی دائیں طرف تھا' وہ آلِ عمر کا تھا' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر یہاں نہ تھا اور اس مذکورہ گھر کو (جو خوخہ سے داخل ہونے والے کی دائیں طرف تھا) شیخ الخدام نے وقف کیا تھا اور مجھے پتہ چلا تھا: اسے وقف کرنے والے نے یہ شرط لگا دی تھی کہ اس میں شادی شدہ رہائش نہ رکھے۔ آج کل اس کا دروازہ قبلہ کی طرف کھلتا ہے اور خوخہ کی دائیں جانب جالی لگی ہوئی ہے اور شائد وہ اس کے پہلے دروازے کی جگہ پر تھی کیونکہ خوخہ اسی گھر میں کھلتا تھا اور رہا وہ گھر جو اس خوخہ (چھوٹا دروازہ) کی بائیں جانب تھا تو اسے بھی اس کے نگران شیخ الخدام نے وقف کیا تھا۔ اس کا دروازہ خوخہ کے پاس نہیں کھلتا تھا بلکہ مغرب کی طرف ذرا دور موجود تھا اور یہ ان گھروں میں سے آخری تھا جن کا ذکر آ رہا ہے اور ابن شبہ و ابن زبالہ کا بیان آگے آ رہا ہے کہ وہ گھر جو آج کل دارِ عائشہ کے نام سے مشہور ہے اور وہ دو گھر جو اس کے مغرب میں قبلہ کی طرف ہیں' یہ سب دارِ آلِ عمر میں شامل ہیں کیونکہ دونوں کہتے ہیں: ان گھروں میں جو قبلہ کی طرف سے کھلتے ہیں' دارِ عبد اللہ بن عمر ہے اور پھر دارِ مروان جس کا ذکر آگے آ رہا ہے اور دوسرا گھر جس کے بارے میں ابوغسان کا اشارہ گذر چکا کہ یہ دارِ حفصہ ہے تو اس کا ذکر انہوں نے اپنے اس قول میں کیا ہے: حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر وہ تھا جو عبد العزیز بن مروان کی اس گلی میں تھا جو دارِ مروان میں داخل کر دیا گیا تھا جو دار الامارۃ بنا تھا اور عاصم بن عمر کی گلی کے درمیان تھا' جس کا دروازہ بنونجار کے قلعہ کے عبادت خانہ کے سامنے کھلتا تھا جسے خویرع کہتے تھے' انہوں نے حضرت عمر کے بیٹے کو دے دیا تھا چنانچہ یہ بطور صدقہ اُن کے قبضے میں تھا۔

میں کہتا ہوں کہ گھر کی یہ پہچان آج کل شافعی حضرات کے قاضی ابو الفتح بن صالح کے مکان اور شام کی طرف سے ان سے متصل مکان میں پائی جاتی ہے کیونکہ عاصم کی گلی وہ کھلی گلی تھی جو اس دروازے میں کھلتی تھی جو یہاں سے شروع ہو کر قبلہ اور وضو کرنے کی جگہ تک جاتی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ عبادت خانہ خویرع اس کے اور مدرسہ شہابیہ کے درمیان تھا۔ اس بناء پر عاصم والی گلی وہی تھی جو اس کی شامی جانب تھی' اس کا کچھ حصہ اس جگہ میں داخل کیا گیا جو دارِ مروان کے سامنے تھا اور باقی حصہ وہ تھا جو اس دارِ آلِ عمر اور اس گھر کے درمیان تھا جس کا چھوٹا سا دروازہ (خوخہ) تھا۔ واللہ اعلم۔

دارِ مروان بن حکم

پھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قبلہ میں خوخہ والے غربی گھر کے ساتھ ہی دارِ مروان بن حکم واقع تھا۔ ابن زبالہ کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ بنو عدی کے نعیم بن عبد اللہ کا تھا اور کچھ حصہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر سے تھا' اسے مروان نے خرید کر تعمیر کیا اور اس میں اپنے بیٹے عبد العزیز کا گھر بھی بنایا۔

ابن زبالہ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اضافہ مسجد میں لکھا ہے کہ اس میں کھجور کے درخت

تھے' مروان نے آل نحام سے ہر درخت اور اس کی جگہ ایک ایک ہزار درہم میں خریدی' یہ درخت اٹھارہ یا بارہ تھے' لوگوں نے دیکھا کہ مروان نے مہنگا خریدا ہے اور جب بیع کا سلسلہ چل نکلا تو انہیں کاٹ کر ایسا گھر بنا دیا جس پر لوگ رشک کرنے لگے۔

ابن شبہ نے نقل کیا ہے کہ دار مروان وہ تھا جہاں ملک کے والی رہتے تھے' یہ مسجد کی ایک جانب تھا' یہ اس دارِ عباس کے لئے کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی جسے مسجد میں داخل کر لیا گیا تھا چنانچہ اسے مروان نے خرید لیا تو میں نے کسی کہنے والے سے سنا: وہ گنبد جو دارِ مروان اور اس کے اس حجرے میں تھا جو گھر میں داخل ہونے والے کی دائیں طرف تھا جو نحام کا تھا جو بنو عدی بن کعب کے بھائی تھے' اس میں کھجور کے تین درخت تھے' مروان نے نحام سے یہ تین لاکھ درہم میں خرید لئے اور انہیں اپنے گھر میں داخل کر لیا چنانچہ یہ جگہ اس باڑے میں سے نہیں تھی جسے عباس نے خریدا تھا۔ ابن شبہ نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ دارِ مروان صوافی میں شامل ہو گیا تھا یعنی بیت المال کے لئے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں آج کل وضو کرنے کی جگہ بنی ہوئی ہے جو باب السلام کے نزدیک مسجد کے قبلہ میں ہے اور یہ جگہ مشرق میں آل عمر کے گھروں تک جاتی ہے۔

ابنِ زبالہ اور ابنِ شبہ کہتے ہیں: دارِ مروان کے ایک جانب مغرب میں یزید بن عبد الملک کا وہ گھر تھا جو زبیدہ نے لے لیا تھا' وہاں آلِ ابوسفیان بن حرب کا گھر تھا' یہ گھر پورے مدینہ میں تعمیر کے لحاظ سے اعلیٰ اور آسمان کی طرف سب سے بلند تھا' ایک اور گھر تھا جو آل ابو امیہ بن مغیرہ کا تھا جسے یزید نے خریدا تھا جسے اس نے گرا کر اپنے گھر میں شامل کر لیا تھا۔ ایک شخص یزید بن عبد الملک کے پاس آیا اور کہا: میں مدینہ میں تمہارے لئے ایسا گھر نہیں جانتا اور پھر جب اس کے چہرے کے آثار دیکھے تو کہا اے امیر المؤمنین! یہ گھر نہیں بلکہ یہ تو ایک شہر ہے چنانچہ اس بات سے وہ خوش ہو گیا۔

دارِ حضرت رباح و حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہما

میں بتاتا ہوں کہ آج کل اس گھر کی جگہ مغربی جانب وضو خانہ کے سامنے سلطان کا خریدا ہوا گھر' دار العباس او ر وہ گھر ہے جو مغرب میں اس سے متصل ہے' ان دونوں سے انہوں نے قبلہ والے گھر ملا لئے ہیں۔

ابن شبہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے غلام حضرت رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید بن عبد الملک کے گھر کے غربی یمانی کونے پر مکان لیا تھا اور حضرت مقداد بن اسود (بنو زہرہ کے حلیف) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت رباح کے گھر اور حضرت عاصم کی گلی کے درمیان مکان لیا ہوا تھا لہٰذا یہ گھر دارِ یزید کے جنوب مشرق میں آتا ہے تو یہ دونوں ہی آج کل سلطان کے خریدے ہوئے ہیں پھر وضو خانہ اور ان گھروں کے درمیان گلی ہے جو شاید حضرت عاصم بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی گلی سے متصل ہے لیکن ابن زبالہ اور ابن شبہ نے ان دونوں کا ذکر نہیں کیا' وہ کہتے ہیں: پھر دارِ

یزید کے سامنے اویس بن سعد بن ابو سرح عامری کا گھر ہے۔ ابن شبہ نے اس گھر کے بارے میں لکھا ہے: مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہ گھر حضرت مطیع بن اسود کا تھا جس کے ساتھ حضرت عباس نے دار مطیع کا تبادلہ کر لیا تھا اور دس ہزار درہم گرہ سے بھی دیئے تھے پھر حضرت عباس نے حضرت عبداللہ بن سعد بن ابو سرح کے ہاتھوں تیس ہزار درہم میں فروخت کر دیا تھا جس میں ان کے بھتیجوں نے رہائش کی تھی تو یہ وہی گھر ہے جسے دارِ اویس کہتے تھے اور یہ ہموار زمین میں دارِ یزید بن عبدالملک کے پاس تھا اور پھر ہم نے ایک شخص سے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت مطیع کو ان کا یہ گھر دے دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت اویس کے اس گھر کی جگہ آج کل مدرسۂ باسطیہ موجود ہے جسے قاضی عبدالباسط نے چند سال زائد ۸۴۰ھ میں بنایا تھا اور اس کے مشرق میں مدرسہ ہے جو حصنِ عتیق کے نام سے مشہور ہے اسے بھی اسی نے بنایا تھا اور یہ سب دارِ یزید کے سامنے ہیں' ان دونوں کے درمیان باب السلام کی ہموار زمین فاصلہ ڈالتی ہے۔

دار حضرت مطیع اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابن زبالہ اور ابن شبہ کہتے ہیں: پھر دارِ اویس کے پہلو میں (مغرب میں) حضرت مطیع بن اسود عدوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر ہے جس کا قصہ بیان ہو چکا اور یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضہ میں تھا۔ ابن شبہ کہتے ہیں کہ اسے دارِ ابو مطیع کہتے ہیں اور اس کے نزدیک اصحاب فاکہہ (پھل بیچنے والے) موجود ہیں پھر ان کے قصہ میں یہ اضافہ کیا: انہیں یہ اطلاع ملی کہ حکیم بن حزام نے یہ گھر اور اس سے پچھلا گھر ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا اور ابن مطیع کو شریک کر لیا تھا جس کی قیمت حکیم نے دی تھی چنانچہ ابن مطیع نے اپنا گھر پوری قیمت میں لے لیا جبکہ دارِ حکیم بطور نفع ان کے ہاتھ آ گیا۔ اس پر حکیم سے کہا گیا کہ انہوں نے آپ سے دھوکا کیا ہے تو انہوں نے کہا گھر کے بدلے گھر مل گیا اور ایک لاکھ درہم بھی مل گیا' دارِ ابو مطیع کو "عنقاء" کہتے تھے۔

دار ابو مطیع کے سامنے یزید بن عبدالملک کے گھر تھے جن میں دھوبی رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یزید نے آل مطیع کو اپنا گھر بیچنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا' اس پر اس نے ان کے گھر کے سامنے یہ گھر تعمیر کر دیئے اور ان کے گھروں کا راستہ بند کر دیا چنانچہ انہیں "ابیات الضرار" کہا جانے لگا پھر یہ خیزران کے ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل دار ابو مطیع کی جگہ وہ گھر ہے جو مدرسۂ باسطیہ کے مغرب میں ہے جسے خواجا ابن الزمن کے وکیل نے خریدا تھا اور اس کے مغرب میں آج کل بازارِ مدینہ موجود ہے' یہ چٹیل میدان میں ہے اور اس کے پاس اس کی جگہ وہی ہے جو اس قولِ ابن شبہ سے مراد ہے: اس کے پاس اصحاب فاکہہ ہیں تو گویا تب اس میں پھل بیچے جاتے تھے۔

دارِ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

رہا دارِ حکیم جس کے بارے میں آتا ہے کہ دارِ مطیع کے پیچھے تھا تو اس کی جگہ آج کل وہ گھر ہے جو ان گھروں کی شامی جانب ہے۔ ابن شبہ بنو اسد کے گھروں کے بارے میں کہتے ہیں: حضرت حکیم بن حزام نے اپنا وہ گھر جو ہموار زمین پر کھلتا تھا اور دارِ مطیع بن اسود کے پہلو میں تھا' بنایا' اس کے اور دارِ معاویہ بن ابوسفیان کے درمیان ایک راستہ کا فاصلہ تھا۔ ہموار زمین سے ان کی مراد وہ جگہ ہے جہاں آج کل بازارِ مدینہ ہے اور جو مدرسۂ زمنیہ کے سامنے ہے جو یہاں سے شامی جانب تک پھیلا ہوا ہے۔

ابن شبہ کا یہ کہنا کہ اس کے (دارِ حکیم اور دارِ مطیع) اور دارِ مطیع کے درمیان راستہ کا فاصلہ ہے' اس سے مراد وہی ہموار زمین ہے تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ دارِ معاویہ وہی ہے جو مغرب میں دو گھروں کے درمیان سامنے موجود ہے اور پھر ان کے سامنے آج کل وہاں نئی سرائے ہے جسے مصری لشکروں کے سپہ سالار فخر نے ۸۱۹ھ میں بنایا تھا جس دروازہ آج کل بازار مدینہ اور دار خربہ میں کھلتا ہے۔

ابن شبہ نے بنو عدی بن کعب کے گھروں کے بیان میں بھی لکھا ہے: نعمان بن عدی نے اپنا وہ گھر بنایا جو محمد بن خالد بن برمک سے لے کر بنا لیا تھا۔ اسے انہوں نے آلِ نحام اور آلِ ابوجہم سے خریدا تھا' یہ ان کی وراثت تھی۔ انتہی۔

دارِ حضرت عبد اللہ بن مکمل رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس گھر کی جگہ یا تو وہ دارِ خربہ تھا جو سرائے کی جانب بازار میں کھلتا تھا یا پھر مدرسہ زمنیہ تھا۔ واللہ اعلم۔

دوبارہ ان گھروں کا بیان جو مسجد کے اردگرد تھے

ابن شبہ لکھتے ہیں کہ مسجد کی غربی جانب حضرت عبد اللہ بن مکمل کا گھر تھا جو ''رحبۃ القضاء'' میں کھلتا تھا' اس سے بدشگونی لی جاتی تھی کیونکہ اس کی تعمیر میں ایسا واقعہ ہوا تھا۔

پھر بنی زھرہ کے مکانوں کے بارے میں کہا کہ: حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے انہیں ابن مکمل کو ہبہ کر دیا تھا جنہیں ان کی آل و اولاد نے مہدی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا چنانچہ وہ آج تک ان کے لڑکے کے پاس ہے' یہ مسجد کے پہلو میں ہے۔ یعنی رحبۃ القضاء بنانے سے قبل انہوں نے مہدی کو بیچا تھا۔

ابن شبہ نے کہا: یہ وہی مکان ہیں جن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان میں رہنے والوں نے عرض کی تھی' یا رسول اللہ! ہم اکٹھے تھے تو یہ گھر خریدے' پھر بکھر گئے' تو غنی ہوتے ہوئے محتاج ہو گئے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: انہیں چھوڑ دو کیونکہ یہ برے ہیں۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ یہ وہی گھر تھے جن کے پاس شرطیں لگانے والا بیٹھتا تھا اور پھل والے بیٹھتے تھے' وہ لوگ اسے بنانے سے ڈرتے تھے اور انہیں شامت سمجھتے تھے تو یہ جیسے خریدے گئے' آج تک اسی حال میں ہیں۔

مؤطا میں بدشگونی والی چیزوں سے بچنے کا حکم ہے۔ حضرت یحییٰ بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی' عرض کی' یا رسول اللہ! میرا ایک گھر ہے جس میں رہنے والے بہت تھے' مال و دولت عام تھی لیکن رہنے والے گھٹ چکے اور مال و دولت نہ رہی۔ اس پر آپ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ برا ہے۔ بزاز کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی جگہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے' پھر اتنا اور زیادہ کر کے فرمایا کہ: انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم کیسے انہیں چھوڑ دیں؟ آپ نے فرمایا: یا تو انہیں بیچ ڈالو یا پھر کسی کو ھبہ کر دو۔

بزاز کہتے ہیں کہ اس میں صالح بن ابو الاخضر نے غلطی کھائی ہے' درست یہ ہے کہ یہ عبد اللہ بن شداد کے چھوڑے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ دارِ ابن مکمل کی جگہ آج کل جو بانیہ مدرسہ موجود ہے جو اس گھر کے دروازے سے مغربی سرائے تک پھیلا ہوا ہے' بلکہ ابن زبالہ کے گذشتہ قول ''پھلوں والے اس کے پاس بیٹھتے تھے'' سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ یہ رنگ کرنے والون کے بازار تک پھیلے تھے۔

دارِ نحام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مغرب میں دارِ نحام عدوی تھا۔ ابن زبالہ و ابن شبہ کی عبارت اس سلسلے میں یہ ہے: مسجد کے مغرب میں دارِ ابن مکمل اور دار النحام تھے' ان دونوں کے درمیان چھ ہاتھ کا فاصلہ تھا جو راستہ تھا۔

بنو عدی کے گھروں کے بارے میں ابن شبہ لکھتے ہیں کہ: نعیم بن عبد اللہ نے نحام اپنا وہ گھر بنایا جس کا دروازہ دار القضاء کے صحن کے کنارے پر تھا اور اس کے مشرق میں وہ گھر تھا جو جعفر بن یحییٰ بن خالد بن برمک سے قبضے میں آ گیا تھا اور یہ عاتکہ بنت یزید بن معاویہ کا گھر تھا تو یہ بطور صدقہ جعفر کے لڑکے کے پاس تھا۔

ابن شبہ کہتے ہیں کہ مجھے کسی نے بتایا' نبی کریم ﷺ نے ان گھروں میں سے اپنے لئے بھی کچھ حصہ لیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ جعفر کا یہ گھر باب الرحمہ کے سامنے تھا جس سے پتہ چلا کہ نحام کا یہ گھر مدرسۂ جومانیہ کے دروازے کے سامنے تھا پھر دار النحام اور دارِ ابنِ مکمل کے درمیان راستہ یہی ہموار زمین تھی جو باب الرحمہ سے بازار تک پھیلی ہوئی تھی اور اسی سے معلوم ہوا کہ یہ رحبۃ القضاء' باب الرحمہ اور باب الجوبانیہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔

دارِ حضرت جعفر بن یحییٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر دار النحام کے پہلو میں دارِ جعفر بن یحییٰ تھا جس میں عاتکہ بنت یزید بن معاویہ کا گھر اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قلعہ شامل تھے جسے ''فارع'' کہتے تھے۔

میں کہتا ہوں' پہلے بتایا جا چکا کہ اس کی جگہ باب الرحمۃ میں تھی اور آج کل وہ گھر ہے جو باب الرحمہ کے سامنے

ہے' یہی عاتکہ کے گھر کی جگہ تھی اور پھر اس کی شامی جانب مدرسہ کبرجیہ بھی اسی میں شامل تھا' یہ قلعہ والی جگہ تھی۔

دارِ نصیر

پھر دارِ جعفر بن یحییٰ کی طرف صاحب مصلّٰی نصیر کا گھر تھا' یہ گھر سیّدہ سکینہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تھا اور پھر اس کے پہلو میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کی طرف چھ ہاتھ کا راستہ تھا۔

میں کہتا ہوں' پہلے مغربی جانب والے دروازوں کے بیان میں گذر چکا ہے کہ دارِ نصیر والی جگہ پر آج کل وہ گھر موجود ہے جو دارِ تمیم داری کے نام سے مشہور ہے نیز وہ گھر ہیں جن کی شامی جانب اس راستے کی طرف جس سے قیاشین کے گھروں کی طرف داخل ہوتے ہیں اور جو خواجا قاوان کے ہو گئے تھے' یہاں یہی راستہ مراد ہے اور وہ گھر حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے تھے اور ان کے مشرق میں دارِ منیر تھا جس کا ذکر آ رہا ہے۔

بنو تیم کے گھروں کے بارے میں ابن شبہ کہتے ہیں: حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے اپنا گھر دارِ عبد اللہ بن جعفر (جو منیر کا ہو گیا تھا) اور دارِ عمر بن زبیر بن عوام کے درمیان بنایا جسے ان کے بعد ان کے بیٹے نے تین گھروں میں تبدیل کر دیا' چنانچہ دارِ منیرہ سے متصل مشرقی گھر حضرت یحییٰ بن طلحہ نے لیا' اس کے ساتھ والا حضرت عیسیٰ بن طلحہ نے لیا اور تیسرا ابراہیم بن محمد بن طلحہ نے لیا۔

میں بتاتا ہوں کہ دارِ عمر بن زبیر جو دارِ طلحہ کے مغرب میں ہے' عروہ بن زبیر کے گھر سے متصل ہے۔ابن شبہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں گھر حضرت زبیر نے لے لئے تھے جنہیں ان دونوں اور ان کی اولادوں کے لئے وقف کر دیا تھا اور یہ دونوں خوخۂ قواریر کے بالکل متصل ہیں۔انتہٰی۔

پھر راستے کے آخر میں قیاشین کے گھروں تک ایک خوخہ ہے جو مغرب میں عطاروں کے بازار کے نزدیک کھلتا تھا اور ظاہر یہ ہے کہ خوخۂ قواریر سے یہی مراد ہے۔

اُمِ موسیٰ کی لونڈی منیرہ کا گھر

پھر طلحہ کے گھروں کو جاتے ہوئے راستے کی ایک جانب دارِ منیرہ تھا جو اُمِ موسیٰ کی لونڈی تھیں' یہ عبد اللہ بن جعفر بن ابو طالب کی بیوی تھیں۔

میں بتاتا ہوں: اس گھر کا مقام ہم نے مغرب میں واقع مسجد کے دروازوں کے بیان میں بتا دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گھر قیاشین کے گھروں سے مسجد کی انتہاء کے درمیان سامنے موجود تھا اور پھر اس کے پہلو میں آلِ یحییٰ بن طلحہ کا خوخہ تھا۔

میں بتاتا ہوں کہ آج کل وہاں اس تنور کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہے جو مسجد کے آخر کے قریب مغربی جانب سے سامنے تھی جو ''زقاق عانقینی'' کے نام سے مشہور تھی' اس سے یہی مراد ہے کیونکہ ان گھروں میں' جن میں سے قیاشین

کے گھروں کی طرف جاتے تھے' وہ گھر تھے جو طلحہ کے کہلاتے تھے۔

حَشّ طلحہ (کھجوروں کا باغ)

پھر آلِ یحییٰ بن طلحہ کے خوخہ کی ایک جانب' حضرت طلحہ بن ابوطلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھجوروں کا باغ (حَش) تھا اور وہی آج کل آلِ ابن برمک کی طرف سے صوافی کا ویران حصہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل اس جگہ پر تنور موجود ہے۔

پھر ہم مہدی کے اضافے میں بتا چکے ہیں کہ انہوں نے آلِ شرحبیل بن حسنہ کے گھر کا اگلا حصہ مسجد میں داخل کر لیا تھا' یہ اُم حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا جو مسجد کے آخر میں تھا۔اس کے بعد ابن شبہ نے لکھا: پھر انہوں نے اس کا باقی حصہ یحییٰ بن خالد بن برمک کے ہاتھ بیچ دیا' انہوں نے اس وقت اسے گرا دیا جب حضرت طلحہ کا باغ ختم کیا گیا' یہ صوافی میں میدان سا رہ گیا پھر اس کی جگہ لوگوں نے اصحابِ صوافی سے زیادہ گھر بنا لئے تھے۔اس سے پتہ چلا کہ حضرت طلحہ کا باغ شام کی طرف سے مسجد کے موڑ پر تھا اور ظاہر یہ ہے کہ اس باغ سے شرحبیل کے گھر کا باقی حصہ وہ تھا جو مغرب میں مسجد کی شامی جانب وضو خانہ کے برابر تھا۔دلیل آگے آ رہی ہے۔واللہ اعلم اور پھر طلحہ کے باغ کے ایک پہلو میں پانچ ہاتھ چوڑا راستہ تھا۔

میں بتاتا ہوں کہ یہی وہ راستہ تھا جو وضو خانے کی شامی جانب تھا جس سے نکل کر شیخ شمس الدین ششتری کی سرائے تک پہنچتے تھے۔

ابیاتِ خالصہ

پھر اس راستہ کی ایک طرف امیر المؤمنین کی لونڈی خالصہ کے گھر تھے' یہ حباب کا گھر تھا جو عتبہ بن غزوان کے غلام تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی جگہ آج کل مسجد کے موذنوں کے رئیسوں میں سے ایک کا گھر ہے' اسی کے نزدیک مستنصر باللہ کا بنایا ہوا شفاء خانہ ہے اور اسی کے قریب ظاہر یہ کی سرائے ہے۔

دار حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر خالصہ کے گھروں کے پہلو میں ابو الغیث بن مغیرہ بن حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف کا گھر تھا جو صدقہ میں ملا ہوا تھا۔

ابن شبہ نے بنو زہرہ کے گھروں کے بیان میں لکھا کہ عبد الرحمٰن بن عوف کے ان گھروں میں سے حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف کا گھر تھا جو طلحہ کے باغ میں تھا۔اسے دار الکبریٰ کہتے تھے۔

ابن شبہ کہتے ہیں' اسے دارِ کبریٰ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ وہ پہلا گھر تھا جسے مدینہ میں سب سے پہلے کسی مہاجر

نے بنایا تھا' حضرت عبد الرحمٰن اس میں حضور ﷺ کے مہمانوں کو ٹھہرایا کرتے تھے لہٰذا اسے دار الضیفان بھی کہتے تھے' کسی مہمان نے یہاں چوری کر لی' حضرت عبد الرحمٰن نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تھی۔ حضور ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر اس فرمائی تھی' یہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے کسی لڑکے کے قبضہ میں تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ گھر عبد الرحمٰن بن عوف کے اس گھر کے علاوہ تھا جسے دارِ ملیکہ کہتے تھے اور جس کے بارے میں گذر چکا کہ وہ مسجد میں داخل کر دیا گیا۔

پھر مسجد کی شامی جانب مشرق کی طرف ایک گھر تھا جو ''دار المضیف'' کہلاتا تھا اور اسے یہ نام دینے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دار الضیفان کی جگہ پر تھا لیکن اس کے بعد مشرق کی طرف جس گھر کا ذکر آ رہا ہے' اس سے یہ غلط ہو جاتا ہے تو گویا دار المضیف سے غربی جانب اور اس کے اردگرد پر چھت پڑی ہے اور پھر ظاہر یہ کی سرائے کا کچھ حصہ اسی گھر کی جگہ پر ہے۔ پھر دارِ ابو الغیث کی ایک جانب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر کا باقی حصہ تھا جو یحییٰ بن جعفر کے پاس تھا جو ان سے قبضے میں لے لیا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں' پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ اسے دار القراء کہتے تھے اور اس کا کچھ حصہ ولید کے اضافے کے وقت شامل مسجد کر لیا گیا تھا اور بقایا حصہ مہدی کے اضافے کے وقت شامل کر لیا گیا تو گویا بقایا میں سے کچھ حصہ مراد ہے جیسے یہاں دلیل موجود ہے حالانکہ میں اس بات کو بعید جانتا ہوں کہ شامی جانب کچھ بچا ہو اور خصوصاً جب مہدی نے سو ہاتھ کا اضافہ کیا ہو۔ پھر اسی طرف وہ اضافہ منسوب ہو گا جو ولید نے کیا تھا اور میدان والا عرض بھی جو مسجد کی شامی جانب تھا تو آپ بتائیں کہ کونسا گھر ہو گا جس کی لمبائی سو ہاتھ سے زیادہ ہو اور مسجد میں شامل کرنے کے بعد اس کا اتنا بقایا ہو؟ اور آج جو اس کی جگہ بیان کی جاتی ہے مشرقی جانب دار المضیف سے ملتی ہے۔ واللہ اعلم۔

دارِ موسیٰ المخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابن زبالہ و ابن شبہ کہتے ہیں: پھر مشرقی جانب حضرت موسیٰ بن ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن ابو ربیعہ بن مغیرہ مخزومی کا گھر تھا جسے انہوں نے اور عبید اللہ بن حسین بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خریدا تھا' دونوں نے اس کی قیمت لگائی تو عبید اللہ کے ذہن میں آیا کہ موسیٰ نفع چاہتے ہیں لہٰذا عبید اللہ نے یہ گھر انہیں سونپ دیا اور وہ موسیٰ کا ہو گیا۔

میں کہتا ہوں' ظاہر تو یہ ہے کہ یہ گھر شامی جانب مشرقی جہت میں پہلا تھا' آج کل اس کی جگہ رئیس مؤذنین میں سے ایک کا مکان ہے اور وضو خانہ کی ترک کی ہوئی جگہ ہے' اس کے اور دار المضیف کے درمیان گلی تھی جو ''مخرق الجمل'' کے نام سے جانی جاتی تھی جو ان گھروں تک چلی جاتی تھی جو مدینہ کی شہر پناہ کے ساتھ ملے ہوئے گھر ہیں اور شائد یہ پہلے سے زقاقِ جمل مشہور تھی کیونکہ ابن شبہ نے کہا ہے کہ ''حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دارِ

انس بن مالک اور زقاق جمل کے درمیان گھر لیا تھا۔'' اور دار انس کے متعلق آتا ہے کہ وہ بنو جدیلہ میں تھا اور بنو جدیلہ شہر پناہ کی دیوار کے شامی جانب تھے اور پھر دار موسےٰ کی جانب میں قہطم کے گھر دار موسےٰ و دار عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں' دار عمروؓ یہ ان کی طرف سے انہیں صدقہ میں ملا تھا اور آج کل یہ صوانی یعنی قہطم کے گھر ہیں اور ابن زبالہ نے یوں کہا ہے: ''اس کے پہلو میں گھر ہیں جن میں قہطم ہیں'' اور انہی کو صوانی کہتے ہیں پھر دار موسےٰ بن ابراہیم اور دار عمرو بن عاص سہمی کے درمیان راستہ ہے اور یہ ان کے لئے آج کل صدقہ ہے۔

ابیات الصوافی

میں کہتا ہوں کہ قہطم کے گھر وہی تھے جنہیں ابن زبالہ نے مسجد کے دروازوں پر لکھائی کے بیان میں ''ابیات الصوافی'' کہا تھا اور جس راستے کا انہوں نے یہاں ذکر کیا ہے' اسے ''زقاق المناصع'' کہتے تھے لیکن کلام ابن شبہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابیاتِ قہطم' دار موسےٰ اور دار عمرو بن عاص کے درمیان تھے لہٰذا یہ مذکورہ راستہ قہطم کے گھروں اور دار عمرو بن عاص کے درمیان بنتا ہے لہٰذا ہمیں ابن زبالہ کے کلام کا بھی یہی مطلب لینا ہوگا اور ''دار موسےٰ کے درمیان راستے'' سے مراد لینا ہوگا ''ابیاتِ قہطم اور دار عمرو بن عاص۔''

دارِ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ابیاتِ صوافی کی جگہ رباط الفاضل اور دار الرسام تھا جو سلامی کا وقف کیا ہوا تھا اور وہ دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر سلامی کی سرائے کی طرف جاتے تھے اور دار عمرو بن عاص کی جگہ آج کل رباط السبیل کے آخر میں ہے جس میں مرد رہتے ہیں اور وہ اس سے شامی جانب ہے اور وہ راستہ جو اس کے اور رباط الفاضل کے درمیان ہے' وہ ''زقاق المناصع'' کا ہے اور آج کل یہ کھلا نہیں اور پھر مہدی کے اضافے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے نزدیک چٹیل میدان ہے جسے ''رحبۃ المشارب'' کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر دار عمرو کے پہلو میں دار حضرت خالد بن ولید تھا۔ ابن شبہ و ابن زبالہ کہتے ہیں: یہ بنو ایوب بن سلمہ (ابن عبد اللہ بن ولید بن مغیرہ) کے قبضہ میں تھا۔ ابن زبالہ مزید لکھتے ہیں کہ ایوب بن سلمہ اور اسماعیل بن ولید بن ہشام بن اسماعیل بن ہشام بن ولید بن مغیرہ کا اس بارے میں جھگڑا ہو گیا' ایوب کہتے تھے کہ یہ وراثت ہے اور میں قعد کی طرف سے تم سے پہلے اس کا وارث ہوں کیونکہ وہ قریبی عصبہ ہیں لیکن اسماعیل کہتے تھے' یہ صدقہ ہے یعنی اس میں قریب کا دخل ہو سکتا ہے خواہ وہ دور ہو چنانچہ قعد کی وراثت بناتے ہوئے یہ ایوب کو دے دیا گیا۔ انتہٰی اور یہ اس لئے کہ ایوب مذکور (ابن حزم کے مطابق) حضرت خالد بن ولید کی اولاد میں سے ایک اور وارث ہیں۔ ابن حزم کہتے ہیں: کیونکہ ان کے چچا حضرت خالد بن ولید کی تمام اولاد ختم ہو گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں: حالانکہ حضرت خالد بن ولید کی اولاد بہت تھی' تقریباً چالیس مرد تھے اور سب کے سب شام میں تھے پھر یہ سب طاعون کی وجہ سے ہلاک ہو گئے اور کوئی بھی ان

کا وارث نہ رہا۔ انتہی۔

حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے گھر کی تنگی کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: اللہ سے فراخی کی دُعا کرتے ہوئے بنیادیں اونچی کر لو۔ ابن شبہ نے کہا: نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا: آسمان کی طرف فراخی سے کام لو۔ پھر واقدی کی روایت سے یہ بھی لکھا کہ حضرت خالد بن ولید نے مدینہ میں اپنا گھر بند کر رکھا تھا' نہ اسے بیچا' نہ ہی ھبہ کیا۔

میں کہتا ہوں کہ آج کل اس کی جگہ رباط السبیل کا اگلا حصہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھر چھوٹا تھا جبکہ دوسرے گھر چھوٹے نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس کے تنگ ہونے کی شکایت کی تھی۔ واللہ اعلم۔

دارِ اسماء بنت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اسی کے پہلو میں دارِ اسماء بنت حسین بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھا اور یہ دار جبلہ بن عمر ساعدی کے گھر کا حصہ تھا۔

میں کہتا ہوں کہ ہم اس کے بارے میں پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ کس جگہ تھا اور مسجد کے پانچویں دروازے میں اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

دارِ ریطہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

پھر اس کے پہلو میں دارِ ریطہ بن ابو العباس تھا' یہ دارِ جبلہ اور دارِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حصہ تھا۔ ابن زبالہ نے لکھا۔

میں کہتا ہوں' ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مشرقی جانب سے دار ریطہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس سے متصل حصہ شامل کیا گیا' یہ مطلب نہیں کہ دارِ ابوبکر مسجد کی سیدھ میں اس کے سامنے تھا جیسے مطری کا وہم ہے کیونکہ انہوں دارِ ریطہ کو دارِ ابوبکر ہی بنا دیا ہے جبکہ یہ مدرسہ تھا جو باب النساء کے سامنے تھا' درست یہ ہے کہ دارِ ابوبکر مشرقی جانب اس مدرسہ کے پیچھے تھا کیونکہ بنوتمیم کے گھروں کا ذکر کرتے ہوئے ابن شبہ نے کہا: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دارِ صغریٰ کے سامنے بقیع والی گلی میں ایک گھر لیا تھا۔ پھر ابن زبالہ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کا یہ دارِ صغریٰ وہی ہے جو بقیع والی گلی سے دارِ آل حزم (جو انصاری تھے) کے پہلو میں تھا اور حضرت عثمان کے بیانِ قتل میں جو کچھ لکھا' اس کا مطلب یہ ہے کہ دارِ صغریٰ دارِ کبریٰ سے متصل تھا اور آپ کے قاتل دیوار پر چڑھ کر آپ کے پاس پہنچے تھے۔ آج کل اس کی جگہ وہ سرائے ہے جو رباط المغاربہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور اسے رباط سیّدنا عثمان بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دارِ ابوبکر شام کی طرف سے اس کے سامنے تھا لہٰذا ان گھروں کی جگہ ہوا جو مدرسہ کے مشرقی جانب تھے اور اس سرائے کے سامنے تھا اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ اس کا کچھ حصہ مدرسہ میں داخل ہو

اور جو ابن سعد نے اپنی طبقات میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے' اس سے بھی یہی مراد ہے' فرماتی ہیں: حضرت ابوبکر مرضِ وصال میں تھے اور اس روز آپ اس مکان میں تھے جو حضور ﷺ نے انہیں الاٹ فرمایا تھا' یہ دارِ عثمان بن عفان کے سامنے تھا یعنی دارِ صغریٰ۔ واللہ اعلم۔

دارِ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر دارِ ریطہ اور دارِ عثمان کبریٰ کے درمیان راستہ پانچ ہاتھ کا تھا۔ یہ قول ابن زبالہ و ابن شبہ کا ہے۔ علامہ مطری نے ابن زبالہ سے نقل کیا ہے کہ ان کے درمیان سات ہاتھ کا راستہ تھا' ابن زبالہ نے وہی کچھ لکھا ہے جو ہم نے ذکر کیا اور آج بھی اتنا ہی ہے' اسے ''طریق البقیع'' کہتے ہیں۔

ابن سعد کے مطابق حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ میں نشاندہی فرمائی تو حضرت عثمان کے لئے وہ مکان رکھا جو آج بھی موجود ہے اور کہتے ہیں کہ آج کل دارِ عثمان والا خوخہ حضور ﷺ کے اس دروازے کے سامنے ہے جس میں سے آپ داخل ہو کر حضرت عثمان کے گھر تشریف لے جاتے۔

میں کہتا ہوں' یہ وہی گھر ہے جس کے بارے میں ابن شبہ نے لکھا ہے ''حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا دارِ کبریٰ بنایا جو جنازگاہ کے قریب تھا پھر اپنے لڑکے کو عطا فرمایا چنانچہ انہی کے پاس رہا اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس کی جگہ پر آج کل اصفہانی کی سرائے' اسد الدین شیر کوہ کی قبر ہے (جو سلطان صلاح الدین بن ایوب کے چچا تھے) اور ان کے ساتھ ان کے والد بھی دفن ہوئے اور وہ گھر بھی وہیں ہے جہاں خادموں کے مشائخ رہتے تھے۔

دارِ ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر حضرت عثمان کے گھر کے بعد تقریباً پانچ ہاتھ کا راستہ تھا' پھر حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ گھر تھا جس میں حضور ﷺ نے رہائش رکھی تھی' اسے مغیرہ بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام نے خریدا تھا اور اس میں پانی کا انتظام کیا تھا جو مسجد میں پیا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں' ہم تیسرے باب کی چودھویں فصل میں پہلے بتا آئے ہیں کہ یہ گھر کس حال میں تھا اور بتایا کہ ملک مظفر شہاب الدین غازی نے یہ زمین خریدی اور چاروں مذہبوں کا مدرسہ بنا کر اسے وقف کر دیا تھا۔

دارِ حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پھر حضرت ابو ایوب کے گھر کے پہلو میں دارِ جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا گھر تھا جس میں پانی پینے کا انتظام تھا' جسے حضرت جعفر نے عطیہ کے طور پر دیدیا تھا' یہ حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں آج کل بہت کھلا میدان ہے جو مدرسہ شہابیہ سے قبلہ رُخ ہے' یہاں حضرت جعفر صادق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مسجد کے قبلے کا محراب ہے اور اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔آج کل یہ چند اشراف کی ملکیت ہے اور پھر ان سے یہ شجاعی شاہین جمالی شیخ الحرم کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے اسے اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔

دارِ حضرت حسن بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اسی مکان کی مغربی جانب دارِ حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود ہے' یہ قلعہ تھا جسے حضرت حسن نے خریدا تھا' اس میں ابو عوف نجاری نے جھگڑا کیا تو حضرت حسن نے اسے گرا دیا اور گھر بنا دیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ وہ قلعہ تھا جسے ''فویرع'' کہتے تھے' آج کل اس جگہ میں چند اشراف کے گھر ہیں جن پر چھت پڑی ہے اور وہ مدرسۂ شہابیہ کے متصل ہے اور یہیں وہ قبلہ رُخ گھر ہے۔

دار فرج الخصی

دارِ حسن اور اس دار خرج الخصی کے درمیان پانچ ہاتھ کا راستہ تھا' یہ امیر المؤمنین کے ابو مسلم نامی غلام تھے' یہ گھر ابراہیم بن ہشام کے گھروں میں سے تھا اور جنازگاہ کے قبلہ میں تھا۔یہاں زمین میں سرنگ تھی جس میں سے ابراہیم اپنے گھر دار التماثیل کی طرف جاتے تھے جس میں یحییٰ بن حسین بن زید بن علی کی رہائش تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مذکورہ راستہ مدرسۂ شہابیہ کے دروازے سے شروع ہو کر بنو صالح کے گھر تک جاتا تھا اور دارِ فرج یہی سرائے تھی جو رباطِ مراغہ کے نام سے پہچانی جاتی تھی اور یہ راستہ اس کے اور دارِ اشراف کے درمیان تھا۔رہا دار التماثیل جس کی سرنگ میں سے ابن ہشام نکل کر گھر جاتے تھے تو اس کے بارے میں نہ تو ابن زبالہ نے لکھا اور نہ ہی ابن شبہ نے کچھ لکھا ہے البتہ یہ وہ شخص تھا جس نے باب السلام والا وضو خانہ بنانا شروع کیا تو زمین میں اس نے سرنگ دیکھی جو گنبد دار تھی جو قبلہ والے کونے سے مغرب کو جاتی تھی' اس کے نزدیک باب الخربہ تھا جو دار الخرازین کے نام سے مشہور تھا۔انہوں نے تعمیر شروع کی (دار الخرازین کی)' پہلے یہاں حصن عتیق کی سرائے تھی۔میں اسے گرائے جانے سے پہلے اس میں داخل ہوا تو اس میں کاریگری کے نمونے دیکھے جس سے پہلے لوگوں کے عجیب فن کا پتہ چلتا تھا لہٰذا سرنگ کی موجودگی میں یہ بات کھل کر میرے سامنے آگئی کہ دار التماثیل سے یہی مراد ہے۔واللہ اعلم۔

دار عامر بن زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہم

پھر دار فرج الخصی کے پہلو میں دارِ عامر بن عبد اللہ بن زبیر بن عوام تھا۔ابن ہشام نے اپنا گھر بنانے وقت حضرت عامر کا کچھ حق دبا لیا تھا لہٰذا انہوں نے ابن ہشام سے کہا: میرا راستہ کہاں گیا؟ انہوں نے کہا' جہنم کو۔اس پر عامر نے کہا تھا کہ وہ تو ظالموں کا راستہ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ اس وقت خدام کے ہاتھوں میں ہے اور وہ خوخۂ آلِ عمر سے نکلنے والے کی دائیں طرف ہے' اسی کو آج کل بیت النبی ﷺ کہہ دیا کرتے ہیں اور پھر تم لوٹ کر دارِ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف آ جاؤ

گے، جہاں سے ابتداء کی تھی۔

میں کہتا ہوں، بنو ہاشم کے گھروں کے ذکر میں ابن شبہ نے لکھا کہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وہ گھر بنایا جو آلِ فرافصہ اور آلِ وردان کا ہو گیا تھا۔ یہ عاصم بن عمر والی گلی کی پچھلی طرف تھا۔

قبل ازیں چند دروازے چھوڑ کر باقی دروازے بند کرنے کا بیان گذر چکا جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی طرف راستہ بنایا ہوا تھا اور حضرت عاصم کی گلی کا ذکر ہو چکا، اس سے پتہ چلا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مسجد کے قبلہ میں تھا لیکن اس کی جگہ معلوم نہ ہو سکی۔ واللہ اعلم۔

فصل نمبر ۳۵

بلاط (وہ جگہ جس میں پتھر لگائے گئے ہوں، یہ ایک خاص جگہ تھی) اور اس کے گرد مہاجرین کے مکان، اس میدان کی حد بندی

امام بخاری نے صحیح بخاری میں باب لکھا ہے: **من عقل بعيره على البلاط اوباب المسجد** اور اس میں حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذکر کی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو میں بھی داخل ہو گیا اور اپنا گھوڑا میدان میں باندھ دیا۔ پھر ایک اور باب کا ذکر کیا: **الرجم بالبلاط** اور اس میں ان دو یہودیوں کا ذکر کیا جنہوں نے زنا کیا تھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ان دونوں کو میدان کے قریب سنگسار کر دیا گیا۔ انہی سے ایک اور روایت ہے کہ: انہیں جنازگاہ کے قریب سنگسار کیا گیا۔ پھر احمد و حاکم کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے دروازے کے قریب یہودیوں کو سنگسار کرا دیا۔

پھر ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پانی لایا گیا تو آپ نے میدان میں وضو فرمایا۔ ان سب روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بلاط (میدان) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے پہلے موجود تھا۔

جو کچھ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بلاط مسجد کی مشرقی جانب جنازگاہ کی جانب تھا۔ ابن زبالہ و ابن شبہ کی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بلاط حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بنا کیونکہ دونوں کی روایت ہے کہ حضرت عثمان بن عبد الرحمٰن نے کہا تھا: مروان بن حکم نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے بلاط

بنوایا اور مروان نے اپنے والد حکم کی گذرگاہ میں مسجد تک پتھر لگا دیئے (بلاط بنایا) وہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے' انہیں ریح کی مرض تھی' پاؤں گھسیٹ کر چلتے تو مٹی سے اَٹ جاتے' اسی وجہ سے مروان نے راستے میں پتھر لگا دیئے چنانچہ حضرت معاویہ نے انہیں حکم دیا کہ اس کے علاوہ بھی مسجد کے قریب پتھر لگوا دیں چنانچہ انہوں نے لگوا دیئے اور پھر ارادہ کیا کہ بقیع زبیر کو بھی لگا دیں جس پر ابن زبیر درمیان میں آ گئے اور کہا: تم زبیر کا نام مٹانا چاہتے ہو؟ اب اسے بلاط معاویہ کہو گے؟ وہ کہتے ہیں کہ مروان نے وہ بلاط بنوایا اور جب حضرت عثمان بن عبید اللہ کے گھر کے برابر آئے تو انہوں نے ان کے گھر کے سامنے سفید زمین چھوڑ دی' اس پر عبد الرحمٰن بن عثمان نے کہا کہ اگر آپ اسے پتھر نہیں لگائیں گے تو میں اسے اپنے گھر میں شامل کرلوں گا چنانچہ مروان نے اس پر بھی پتھر لگوا دیئے۔

قاضی عیاض نے مسجد کے مغرب میں بلاط کا بیان کرنے پر بس کر دی چنانچہ کہا: بلاط وہ جگہ ہے جو مسجد اور مدینہ کے بازار میں پتھر سے بنائی گئی ہے۔انتھٰی۔

ابن شبہ کہتے ہیں کہ محمد بن یحییٰ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے اردگرد پتھر لگانے کا کام سب سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرایا تھا' اس کے لئے انہوں نے مروان بن حکم کو حکم دیا اور نگرانی کے لئے عبد الملک بن مروان تھے' انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے اردگرد پتھر لگایا جو جنازگاہ کی طرف کھلتا تھا۔

بلاط کی حد بندی

اس بلاط کی مغربی حد' مسجد سے خاتم الزوراء تک تھی جو دار عباس بن عبد المطلب کے پاس بازار میں تھا۔اس کی مشرقی حد دارِ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک تھی جو مسجد سے بقیع کے راستے پر تھا' یمانی (جنوبی) حد' دار عثمان بن عفان کے کونے تک تھی جو جنازگاہ کی طرف تھا اور شامی حد مسجد کی پچھلی طرف حضرت طلحہ کے باغ کے سامنے تک تھی اور وہ مغرب میں بھی دارِ ابراہیم بن ہشام کی حد تک تھی جو مصلاً پر جا کھلتی تھی۔

اس بلاط کے نیچے تین زیر زمین نالیاں تھیں جن میں بارش کا پانی پلٹ دیا جاتا تھا' ایک ان میں سے مصلّٰی کے نزدیک دارِ ابراہیم بن ہشام کے پاس تھی' دوسری باب الزوراء پر دارِ عباس بن عبد المطلب کے قریب بازار میں تھی اور تیسری دارِ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب تھی' یہ بنو جدیلہ میں بنت الحارث کے گھر کے قریب تھی۔اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ بلاط مغرب کی طرف مسجد اور اس کے اردگرد کے مکانوں کے درمیان تھا اور دوسرا بلاط آج کل باب الرحمہ سے پھیل کر صواغ تک اور پھر عطاروں کے بازار تک پہنچتا ہے اور پھر یونہی چلتے چلتے پہلے والے مدینہ کے بازار کی حد تک تھا' احجار الزیت اور مشہد مالک بن سنان کے پاس تک تھا' یہ بلاط کا آخری حصہ تھا اور مشہد مالک بن سنان اور اس کی طرف سامنے والے گھروں کے درمیان تھا اور اب تک وہ اسی جہت میں موجود ہے اور پھر باب السلام سے شروع ہونے والا بلاط مدرسۂ زمنیہ تک جا پہنچتا ہے اور شام کی جانب پھر کر اس بلاط سے جا ملتا تھا جو باب الرحمۃ سے ڈھلائی کا

کام کرنے والوں اور عطاروں کے بازار تک جا پہنچتا تھا اور اس کی یہ جانب وہ تھی جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس کے نزدیک پھل بیچنے والے ہوتے تھے۔

طبقات ابن سعد کے مطابق دارِ حکیم بن حزام کے ذکر میں ہے کہ وہ گھر بلاط فا کہہ کے پاس ڈھلائی کا کام کرنے والوں کی گلی کے نزدیک تھا پھر باب السلام سے شروع ہونے والا بلاط مدرسہ زمنیہ سے سیدھا جاتے ہوئے ''سویقہ'' نامی جگہ سے گزرتا تھا اور بابِ سویقہ (باب المدینہ) سے گزرتا ہوا مصلّٰے تک پہنچتا تھا اور اس قول کا بھی یہی معنٰی ہے: ''وہ مغرب میں بھی مصلّٰے کی طرف کھلنے والے دارِ ابراہیم بن ہشام کی حد تک چلا جاتا ہے۔''

پھر غربی بلاط کی یہ جانب ''خط البلاط الاعظم'' کہلاتی ہے اور وہ جو اس بلاط کی طرف باب السلام کا ارادہ لے کر چلنے والے کی داہنی طرف تھا' اسے ''میمنۃ البلاط الاعظم کہا جاتا تھا اور جو اس کی بائیں طرف تھا' اسے میسرۃ البلاط الاعظم کہتے تھے۔ رہا بلاطِ مشرقی تو قبلہ کی طرف سے اس کی حد ظاہر ہے' وہ اس گھر کے کنارے کے پاس تھا جہاں خادموں کے مشائخ رہتے تھے' یہ دارِ عثمان اور رباطِ مراغہ کے کنارے پر تھا اور مشرق سے یہ حد بقیع کی گلی سے شروع ہو کر رباط مغاربہ کے دروازے کے باہر تک جاتی تھی جب آخر میں ان گھروں سے پھرتی ہے جن کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے کہ وہ دار ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ پر ہیں اور رباط مغاربہ کے پاس ہیں اور شاید دارِ مغیرہ بن شعبہ وہی تھا کہ جو گھومتے وقت تمہارے سامنے آ جاتا تھا اور جب تم بقیع کی طرف جاتے وقت آنے جانے والے والوں کے لئے بنے بلاط کے سامنے ہوتے ہو تو تمہاری بائیں طرف ہوتا تھا' شاید یہ بلاط اس سے متصل تھا۔

ابن شبہ نے بنو عبد شمس کے گھروں کے بارے میں لکھا ہے: حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی بقیع میں موجود دارِ مغیرہ بن شعبہ میں رہائش کی تو مغیرہ نے دارِ عثمان بن عفان سے مقابلہ کیا جسے دارِ عمرو بن عثمان کہتے تھے اور جو آج کل دارِ مغیرہ بن شعبہ اور دارِ زید بن ثابت انصاری کے درمیان ہے۔ انتہٰی۔ چنانچہ وہ دارِ مغیرہ جس سے عثمان نے تبادلہ کیا یہاں مراد نہیں کیونکہ انہوں نے کہا تھا: ''وہ بقیع میں تھا'' اور یہاں بلاط کی حد بندی کے ذکر میں ہے کہ وہ بقیع کی گلی میں تھا اور پھر ہم محمد بن عقیل کے حجرہ کی دیوار گرنے کی اطلاع میں ان کا یہ قول بتا چکے: جب میں دارِ مغیرہ بن شعبہ کے قریب پہنچا تو مجھے ایسی ریح (خوش بو) آئی جس جیسی کبھی محسوس نہ کی تھی۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ دارِ مغیرہ مسجد کے قریب تھا اور پھر لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ وہ اس گھر کو حضرت عثمان کا بتاتے ہیں جو اس گھر کی مشرقی جانب تھا جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ شاید یہ دارِ مغیرہ تھا' اس کے اور اس کے درمیان چھت تھی اور شاید یہ حضرت عثمان کا تھا جس کے ساتھ حضرت مغیرہ نے بقیع والے گھر کا تبادلہ کیا اور اس کے بارے میں کہا کہ: آج کل یہ دارِ مغیرہ اور دارِ زید بن ثابت کے درمیان ہے۔'' لہٰذا حضرت زید بن ثابت کا گھر وہی ہوگا جو بقیع کی طرف جانے والے کی بائیں جانب اس سے مشرق میں بھی متصل تھا اور جو اس کی دائیں جانب رباط مغاربہ سے متصل تھے جو انصار میں سے آلِ حزم کے گھر تھے جبکہ ابن شبہ نے کہا کہ عتبہ بن غزوان (بنو نوفل بن عبد مناف کے حلیف) نے اپنا بقیع والا گھر آلِ حزم کے گھروں کے

مشرق میں لیا تھا۔

رہا شامی فرش (بلاط) تو اس کی جگہ ظاہر ہے کہ مسجد اور ان گھروں کے درمیان ہوگی جس کے بارے میں ہم بتا چکے کہ اس کی شامی جانب تھی لیکن اس کی جانب والے دروازے بند کیے گئے تو وہاں کافی گھر بن گئے جو مسجد کے ساتھ متصل تھے اور وہ جو ابن شبہ نے بتایا ہے کہ جو پانی مصلّٰی میں موجود نالی میں ڈالا جاتا تھا اور اس نالی میں ڈالا جاتا تھا جو دارِ عباس کے پاس تھی' وہ حطابین کے نزدیک جبانہ میں ربیع کی طرف نکل جاتا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس ربیع کی طرف بازارِ مدینہ کی شامی جانب بازارِ حطابین کے قریب' ثنیۃ الوداع کے قریب جا نکلتا تھا جیسے الجبانہ کی وضاحت میں آ رہا ہے اور ان کے قول : ''دوسری نالی دار بنت الحارث کے نزدیک' بنو جدیلہ میں حضرت انس بن مالک کے گھر کے نزدیک تھی۔'' میں میں نہیں سمجھ سکا کہ دارِ انس کہاں تھا' ہاں ان کے کنوئیں کے بیان میں جو بتایا جا رہا ہے کہ ان کے گھر ہی میں تھا تو اس سے اس کے مقام کا پتہ چلتا ہے' اس سے ثابت کیا جائے گا کہ ان کا یہ گھر اس مشہور کنوئیں کے پاس تھا جو آج کل رباطین کے نام سے معروف ہے اور شہر پناہ کی شامی جانب رومیہ نامی باغ کی پچھلی طرف تھا۔ رہا دارِ بنت الحارث تو مجھے اس کی جگہ معلوم نہ ہو سکی اور جو دارِ انس کے بارے میں ہم نے لکھا ہے' اس لحاظ سے وہ رومیہ نامی باغ والی جگہ یا اس کے اردگرد کہیں ہوگا پھر اس دارِ بنت الحارث کا ذکر کئی مقامات پر آتا ہے' حضور ﷺ آنے والے مہمانوں کو وہاں ٹھہرایا کرتے تھے پھر بنو قریظہ کے یہودی وہاں ٹھہرا رکھے تھے اور جب ان کے لئے بازار میں خندقیں (گڑھے) کھود دی گئیں تو انہیں قتل کر دیا گیا۔

ابن زبالہ کے مطابق محمد بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن خرم بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ قریش و انصار کے صحابہ کے گروہ کی طرف تشریف لائے تو وہ دار بنت الحارث میں موجود تھے' انہوں نے آپ کو دیکھا تو کھل کر بیٹھے اور آپ کو جگہ دی۔

بنت الحارث کا اصل نام ''رملہ'' تھا اور ان تینوں نالیوں میں اسے آج کل کسی کے بارے میں پتہ نہیں کہ کہاں تھیں۔

بہت سے بلاط پر مٹی چڑھ گئی اور اس مٹی سے صرف مسجد نبوی کے اردگرد کا حصہ اور والیان مدینہ اشراف لوگوں کی جانب کا کچھ حصہ بچا تھا' بلاط کی کچھ نالیاں تھیں جن میں پانی بھر جاتا تھا اور جب کثرت سے بارشیں ہوتیں تو ان نالیوں کے بھر جانے کی وجہ سے مسجد کے گرد پانی جمع ہو جاتا اور مسجد کے دروازوں کے آگے بڑے بڑے جوہڑ بن جاتے چنانچہ متولی شمس بن زمن نے وہ نالی کھودنے کی تیاری کی جو مسجد کی مشرقی جانب ہے اور پھر اس کے اردگرد کے حصے کا جائزہ لیا۔ اس دوران زیر زمین نالی دیکھی جو مسجد کے مشرق سے طہارت خانوں کی گلی کی طرف جاتی تھی' انہوں نے آگے دیکھا تو ''خوش الحسن'' تک جاتی تھی' دیکھا تو وہاں لوگوں نے اپنے گھر بنا لئے تھے' اس سے آگے تلاش کرنا مکان گرانے کے بغیر ممکن نہ تھا لہٰذا اسے وہیں چھوڑ دیا' یہی وہ نالی تھی جس کے بارے میں پہلے آ چکا کہ یہ بنو جدیلہ میں دارِ انس بن

مالک کے نزدیک نکلتی تھی۔

پھر متولی نے مسجد کے دروازوں کے نزدیک نالیوں کے لئے ایک نالی کھدوائی اور وہاں تک لے گئے جہاں چشمے کا پانی بہتا تھا۔ اس سے بہت فائدہ ہوا اور اس کے بعد مسجد کے دروازوں کے سامنے پانی جمع ہونا بند ہو گیا اور پہلے بلاط کو دیکھا تو وہ ڈھلائی کرنے والوں اور عطاروں کے بازار کی طرف کافی اونچا دکھائی دیا' یونہی شام کی طرف بھی تھا۔

رہے بلاط اعظم کے گردا گرد مکان (جو باب السلام سے شروع ہو کر مصلیٰ تک جاتے تھے) تو وہ بنوزریق کے گھروں کی قبلہ والی جانب تھے اور عنقریب ابوغسان کی روایت آ رہی ہے کہ مسجد نبوی کے اس حصے میں' جس کے پاس مروان کا گھر تھا' اور عید پڑھے جانے والے مصلیٰ کے درمیان' ایک ہزار ہاتھ کا فاصلہ تھا اور جب پیمائش کی گئی تو اتنی ہی تھی لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ بلاط مسجد مصلیٰ سے متصل نہیں تھا کیونکہ ابن شبہ نے لکھا ہے کہ بلاط کی انتہاء دار ابن ہشام تک تھی اور وہ گھر خود مسجد سے متصل نہ تھے۔

بلاطِ کے گرد گھروں کا بیان

اس بلاط (فرش والی جگہ) کے گرد' جو مصلیٰ سے متصل تھا' اس کی بائیں جانب پہلا گھر دارِ ابراہیم بن ہشام مخزومی تھا اور قبلہ کی جانب' اس کی دائیں طرف مغرب کی طرف مڑ کر دارِ سعد بن ابو وقاص تھا' درمیان میں راستہ تھا اور حضرت سعد کا یہ گھر تھا۔ ابن شبہ کہتے ہیں کہ یہ گھر وہی تھے جو دارِ جبی کی پچھلی جانب تھے اور اس کے اندر راستہ تھا۔

وہ کہتے ہیں' میں نے کسی سے سنا جو کہہ رہا تھا کہ یہ دونوں گھر حضرت سعد کا ایک گھر تھا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں دیا تھا' دار جبی اس وقت اس کا حصہ بنا تھا جب انہوں نے اس کا مال تقسیم کیا تھا' جس پر حضرت عثمان بن عفان نے دارِ جبی خرید لیا پھر یہ مکان عمرو بن عثمان کا ہو گیا' خاتون جبی نے عمرو کو دودھ پلایا ہوا تھا لہٰذا عمرو نے اسے ہبہ کیا تھا اور وہ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے چھت پر انوکھی آواز سنی تو اپنی لونڈی سے کہا' یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ چھت تسبیح بیان کر رہی ہے۔ جبی نے کہا کہ جب کبھی کوئی شے تسبیح بیان کرتی ہے تو سجدہ کرتی ہے' لہٰذا وہ چھت کے نیچے سے نکل گئی' مصلیٰ کا خیمہ ہلنے لگا پھر اس نے اسے حضرت عمر بن خطاب کے کسی لڑکے کے ہاتھ بیچ دیا' وہ کہتے ہیں' پھر میں نے سنا کہ حضرت عثمان نے وہ خود لے لیا تھا۔

پھر اس کے ساتھ ہی بلاط کی دائیں طرف حضرت سعد بن وقاص کا بھی گھر تھا' وہ رسول اللہ ﷺ کے غلام ابو رافع کا تھا جس کا تبادلہ انہوں نے بقال میں دو گھروں سے کر لیا' وہ دونوں حضرت سعد کے تھے۔

پھر بلاط کی بائیں جانب اسی گھر کے سامنے بھی حضرت سعد کا مکان تھا اور ان دونوں گھروں کے درمیان دس ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ حضرت سعد کے یہ مکان عطیہ کے تھے۔

ابن شبہ نے لکھا ہے: ان کے گھروں میں ایک اور گھر رہ گیا تھا۔ ابن شبہ نے کہا: حضرت سعد نے بھی مصلیٰ

میں ایک گھر لیا ہوا تھا' وہ دار عبدالحمید بن عبید کنانی اور اس گلی کے درمیان تھا جو بنو کعب میں سے حمارین کے پاس جاتی تھی اور انہوں نے کچھ ساتھیوں کو لے کر اپنے گھر کے قریب گلی میں دروازہ کھولا تھا جس سے وہ دو گھر دکھائی دیتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ عنقریب بنو کعب کے گھروں کا ذکر آ رہا ہے اور حمارین کا بیان بھی آ رہا ہے چنانچہ اس سارے معاملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حمارین کی گلی مصلّے والے گھروں کے قبلہ میں تھی اور ان گھروں کے قبلہ میں تھی جو زریق کے درمیان بلاط کے قبلہ میں تھے۔

پھر حضرت سعد کے گھر کے ساتھ ہی' جو بلاط کی دائیں جانب ابو رافع کا تھا' بنو عامر بن لؤی سے آلِ خرش کا گھر تھا' اسے دارِ نوفل بن مساحق بن عمرو عامری کہتے تھے اور اس کے پیچھے قبلہ کی جانب ایک یمنی شخص عروہ کی درس گاہ تھی' وہ وہاں تعلیم دیتا تھا اور اسی میں مسجد بنو زریق تھی جس کے پاس ہی دارِ رفاعہ بن رافع تھا اور یہ دارِ خراش وہی تھا جس کے بارے میں ابن شبہ نے کہا: ابو غسان نے بتایا' مجھے عبدالعزیز نے کہا کہ رافع بن مالک زرقی اُحد کے مقام پر قتل ہو گئے تو بنو زریق میں دفن کیے گئے۔ کہتے ہیں' کہا یہ جاتا ہے کہ آج ان کی قبر اس دارِ آلِ نوفل بن مساحق میں ہے جو رسۂ عروہ میں بنو زریق کے اندر ہے' یہ مکان حضرت عباس بن محمد کا ہو گیا تھا پھر داہنی طرف بھی دارِ آلِ خراش کے ساتھ ہی دارِ ربیع تھا جسے دارِ حفصہ کہتے تھے' یہ حضرت معاویہ بن ابو سفیان کی لونڈی تھیں' وہ چونکہ یہاں رہتی تھیں' اس لئے پہلے ہی اس کا نام یہ پڑ گیا تھا' یہ گھر حضور ﷺ کی طرف سے عثمان بن ابو العاص ثقفی کو ملا تھا' ان کے لڑکے سے حضرت معاویہ نے خرید لیا تھا۔ ساتھ ہی حضرت عثمان کا ایک اور مکان تھا جو گذشتہ دارِ آلِ خراش کے مکان کے پہلو میں تھا' کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عطیۂ ملنے پر بنایا تھا۔ پھر دونوں گھروں کی شامی جانب' بائیں طرف' ان دونوں کے سامنے دارِ نافع بن عتبہ بن ابو وقاص تھا جسے امیر المؤمنین کے غلام ربیع نے نافع کی اولاد سے خریدا تھا' اسے دار ربیع بھی کہتے تھے اس کی پچھلی طرف جسے دارِ مفصہ کہتے تھے قبلہ کی طرف اور قبلہ کی طرف سے دارِ حفصہ کے پیچھے عبد بن زمعہ کا گھر تھا چنانچہ ابن شبہ کہتے ہیں' عبد ابن زمعہ نے وہ گھر لیا جو عروہ کی درس گاہ میں اس کی شامی حد کی طرف تھا چنانچہ دارِ حفصہ' اس کے اور بلاط کے درمیان تھا۔ اس کا دروازہ عروہ کے مدرسہ سے مغربی جانب متصل تھا اور دار عبد بن زمعہ کی قبلہ والی جانب ابن شنو کا گھر تھا۔

ابن شبہ کہتے ہیں: عبدالرحمٰن بن مشنو نے اپنا وہ گھر لیا جو عروہ کی درس گاہ میں تھا جس کی شامی حد دار عبد بن زمعہ اور مشرقی اسحٰق اعرج کی درس گاہ تھی جس کا دروازہ عروہ کی درس گاہ ہی کی جانب تھا یعنی مغربی جانب' یہ ان کی طرف سے عطیہ تھا' پھر دار ابن مشنو کے قبلہ میں عمار بن یاسر کا گھر تھا کیونکہ یہ قبلہ کی طرف سے دارِ ابن مشنو کی حد تھا چنانچہ ابن شبہ لکھتے ہیں: عمار بن یاسر نے اپنا وہ گھر لیا جو بنو زریق میں تھا' یہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھروں میں سے ایک تھا' اس کا دروازہ حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کے سامنے تھا یعنی جو مشرق میں تھا' یہ انہیں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بطور عطیہ دیا تھا' اس کا ایک خوخہ تھا جو عروہ کی درس گاہ میں کھلتا تھا یعنی

مغرب میں اور یہ خود عمار کا تھا چنانچہ یہ تینوں گھر قبلہ کی طرف ایک صف میں واقع تھے اور اسی حفصہ کے گھر کی پچھلی طرف تھے اور اس گھر کے بھی پیچھے تھے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے' ان کے درمیان میں مغربی جانب عروہ کی درس گاہ اور مسجد بنو زریق تھی جبکہ مشرق میں دارِ عبد الرحمٰن بن حارث کی گلی تھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

پھر ابن شبہ نے کہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دارِ ارقم بن ابو الارقم مخزومی' بنو زریق کے گھروں میں دارِ ابنِ اُمِ کلاب کے پاس تھا جو مصلّٰی کی طرف کھلتا تھا' اُدھر ہی دارِ رفاعہ بن رافع انصاری تھا جو مسجد بنو زریق کے سامنے تھا۔

پھر دارِ ربیع (دارِ حفصہ) جو بلاط کی دائیں جانب تھا' کے ساتھ ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا پھر دائیں طرف دارِ عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام کی گلی تھی اور ان کا گھر وہی تھا جس کے بارے میں آ چکا کہ وہ مشرق میں دارِ عمار بن یاسر کے سامنے تھا' اس کے اور بلاط کے درمیان دو اور گھر تھے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے اور اس گلی کا ذکر بھی اس مقام پر ہوگا جہاں حضور ﷺ کے عید پڑھا کر واپس آنے کا ذکر ہوگا اور یونہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ گھر تھا چنانچہ ابن شبہ لکھتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ دوسی نے بلاط میں گھر لیا تھا جو اس گلی میں تھا جس میں دارِ عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام تھا اور بلاطِ اعظم کی لائن کے درمیان تھا چنانچہ ان کے لڑکے نے عمر بن بزیع کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

ابن شبہ نے جو کچھ ان گھروں کے بارے میں کہا اور جو کچھ آگے آ رہا ہے' اس میں غور وفکر کرنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدِ الرحمٰن بن حارث والی گلی' وہ پہلی گلی ہے کہ جب آج کل مسجد میں داخل ہونے کے لئے باب مدینہ سے داخل ہو گے تو سب سے پہلے تمہارے دائیں ہاتھ یہی گلی آئے گی پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ دارِ ہاشم اور دوسرا گھر جو اس کے ساتھ بائیں طرف سے متصل ہے اور تیسرے گھر کا کچھ حصہ' مدینہ کی حفاظتی دیوار کے باہر تھے اور یونہی دائیں طرف اس کے سامنے والے' سعد کے دونوں گھر اور آلِ خراش کے گھر کا کچھ حصہ بھی اس کے باہر ہی تھا۔

پھر بلاط کی دائیں طرف عبد الرحمٰن بن حارث کی گلی کے ساتھ ہی دارِ عبد اللہ بن عوف تھا پھر بائیں طرف ابو امیہ بن مغیرہ والی گلی تھی۔

بنو زھرہ کے مکانوں کا ذکر کرتے ہوئے ابن شبہ نے کہا تھا کہ عبد اللہ بن عوف بن عبد عوف نے بلاط میں گھر بنایا تھا جو دارِ عبد الرحمٰن والی گلی اور دار ابو امیہ والی گلی کے درمیان تھا' اسے دارِ طلحہ بن عبد اللہ بن عوف کہا جاتا تھا' یہ ان کے اولاد کو صدقہ کیا گیا تھا البتہ اس کا کچھ حصہ بکار بن عبد اللہ بن مصعب زبیری کو دیا گیا پھر اسی دارِ امیہ کے ساتھ ہی دارِ حویطب بن عبد العزّٰی تھا جو اس کے اور دارِ سعید بن عمرو بن نفیل کے درمیان تھا' دونوں کے دروازے دارِ ابو امیہ کے مشرقی جانب تھے اور مشرق ہی میں دارِ صہیب بن سنان تھا' یہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قبضے میں رہا۔ یہ سب گھر بنو زریق میں تھے۔

اب آیئے' بائیں طرف! ہم کہتے ہیں کہ بائیں طرف دارِ ابو ہریرہ اور اس سے پہلے والے کچھ حصے کے سامنے دارِ حویطب بن عبد العزّٰی تھا' یہ سابق گھر کے علاوہ تھا اور وہ بلاط میں نہیں تھا چنانچہ ابن شبہ بنو عامر بن لوی کے گھروں کا

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حویطب بن عبد العزّٰی نے اپنا وہ گھر لیا جو دار عامر بن ابو وقاص اور عتبہ بن ابو وقاص کے درمیان بلاط میں تھا جن میں سے ایک گھر بلاط کے خاتمہ پر' اس گلی کے سامنے جو آمنہ بنت سعد اور امیر المؤمنین کے غلام ربیع کے گھر کے درمیان تھا' جا کھلتا تھا' وہ انہوں نے اپنی اولاد کو دے رکھا تھا۔انتہٰی تاہم ابن شبہ نے مدینہ میں حضرت عتبہ بن ابو وقاص کے مکان کا ذکر نہیں کیا جبکہ مدینہ میں جا کر وہاں رہائش کرنے والے ان کے لڑکے حضرت نافع تھے اور ان کا گھر یہی تھا جس کا ابھی ذکر ہوا جو ربیع کا بن گیا تھا تو یہاں یہی مراد ہے۔

پھر ابن شبہ نے دارِ عامر بن ابو وقاص زھری کے بیان میں کہا: عامر بن ابو وقاص نے اپنا وہ گھر بنایا جو حلوہ کی گلی میں' دار حویطب بن عبد الغری اور اس گلی میں تھا جو دار آمنہ بنت سعد بن ابو سرح کی طرف جاتی تھی۔

اس سے واضح ہو گیا کہ حویطب کا یہ گھر دارِ ربیع کی مشرقی جانب بائیں ہاتھ کو تھا اور اس کی ایک طرف بلاط کا خاتمہ ہو جاتا تھا اور آج کل یہ وہی گلی ہے جو مدینہ کی حفاظتی دیوار اور اس کے سامنے والے گھروں کے سامنے ہے نیز حضرت مالک بن سنان کا مشہد بھی سامنے تھا جو مدینہ کے دروازے میں داخل ہونے والے کی بائیں طرف تھا اور پھر حضرت حویطب کے کچھ حصے میں پیچھے گھر تھا جو اس کی غربی جانب تھا اور جہاں بلاط ختم ہوتا تھا وہاں اس کا دروازہ کھلتا تھا اور شام کی جانب سے اس کی پچھلی طرف وہ گلی تھی جس میں آمنہ کا گھر تھا لہٰذا دارِ عامر بن ابو وقاص اس کی مشرقی جانب سے دار حویطب کی پچھلی طرف ہوا جبکہ حلوہ کی گلی ان دونوں کے مشرق میں ہوئی اور شاید اسی کو آج کل ''زقاق الطول' کہتے ہیں کیونکہ یہ مفہوم اسی پر سچا آتا ہے۔زقاقِ حلوہ کے بارے میں وضاحت' کنوؤں کے بیان میں آئے گی۔

پھر بائیں طرف ہی دار عبد اللہ بن مخرمہ تھا چنانچہ بنو عامر بن لوئی کے گھروں کے بیان میں لکھتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن مخرمہ نے اپنے اس گھر میں رہائش رکھی جو بلاط میں تھا' اس کا دروازہ دار عبد اللہ بن عوف کے دروازے کے سامنے تھا جس میں بنو نوفل بن مساحق بن عبد اللہ بن مخرمہ رہتے تھے' ان کے ہاتھ سے اس کا کچھ حصہ نکل گیا چنانچہ وہ امیر المؤمنین کے غلام عمر بن بزیع کے وارثوں کے قبضہ میں تھا۔

آیئے اب بائیں جانب کو لیں' ہم کہتے ہیں کہ پھر مشرقی جانب' داہنی طرف دار ابو امیہ کی گلی کی طرف خالد بن سعید الاکبر بن العاص کا گھر تھا جسے دارِ سعید بن عاص الاصغر بن سعید بن عاص کہتے تھے اور اسے دارِ ابن عتبہ بھی کہا جاتا تھا' اس کے وارث چچا خالد بن سعید کی طرف سے صرف عبد اللہ بن عقبہ تھے اور پھر بائیں طرف اس کے سامنے دارِ اُمّ خالد تھا جو دار خالد بن زبیر بن عوام کی آل کا تھا' وہ اپنی ماں اُم خالد بن سعید بن عاص کی طرف سے اس کے وارث تھے۔کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے عنایت ہوا تھا۔پھر دارِ خالد بن سعید کے ساتھ داہنی طرف دار ابی الجہم ملتا تھا اور اس کے ساتھ ہی دار نوفل بن عدی تھا' اور آگے دارِ آل المنکدر تیمی تھا چنانچہ ابن شبہ کہتے ہیں: ابو الجہم نے اپنے اس گھر میں رہائش کی جو دارِ سعید بن عاص (دارِ ابن عتبہ) اور دارِ نوفل بن عدی کے درمیان تھا' جس کا دروازہ بلاط کی طرف تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہی وہ گھر ہے جو اس روایت سے مراد ہے جسے مالک نے مؤطا میں مالک سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''ہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت اس وقت سن لیتے جب بلاط کے پاس دار ابوجہم کے قریب ہوتے۔'' اور یونہی موسیٰ بن عقبہ سے ہے کہ ''بنو قریظہ کے لوگ اس دارِ ابوجہم کے پاس قتل کر دیئے گئے جو بلاط میں تھا حالانکہ ان دنوں بلاط نہ تھا لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ ان کے خون احجارزیت تک پہنچ گئے جو بازار میں تھے۔

بنو اسد کے گھروں کے بارے میں ابن شبہ کہتے ہیں: نوفل بن عدی بن ابوحبیش نے دو گھر لئے' جن میں سے ایک رباع والوں کے نزدیک بلاط میں تھا' یہ دار منکدر تیمی عدوی اور دار ابوجہم عدوی کے درمیان تھا اور دوسرا گھر بنو زریق کے گھروں میں اس درس گاہ کے سامنے تھا جسے آل زیان کی درس گاہ کہتے ہیں' یہ گھر ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام کے گھر (جو بنوعبید بن عبد اللہ بن زبیر کے قبضہ میں آ گیا تھا) اور حمارین کے نزدیک والی گلی کی حد کے درمیان تھا' اِن دونوں کے پیچھے دارِ ہائی تھا جو آلِ جبر کے قبضہ میں تھا۔انتہٰی۔

ابن شبہ نے دوسرے گھر کے بارے میں جن امور کا ذکر کیا ہے وہ دار سعید کے پیچھے اردگرد ہی پائے جاتے تھے اور پھر جس گلی کا ذکر کیا ہے اور جو حمارین کے نزدیک تھی' یہ مغرب میں مصلّٰی تک پھیلی ہوئی تھی اور سعد بن ابو وقاص کے گھروں کے قبلہ میں تھی۔

ابن شبہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دارِ رویشد ثقفی' جسے ابن زیان کی کتاب میں ''قمقم'' کہا گیا ہے' وہی تھا جسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شراب میں جلا دیا تھا' یہ رویشد گدھا تھا اور اس کے مغرب میں قریب ہی دارِ علی بن عبد اللہ بن ابوفروہ تھا اور مشرقی جانب راستہ تھا' جو اس کے اور آل مصبح کے گھروں کے درمیان تھا' پھر اس کی دائیں جانب دار الاویسیین تھا جو خالد بن عبد اللہ اویسی کی رہائش گاہ تھا اور شامی جانب قبلہ میں آل مصبح کے گھر تھے جو اس کے اور دارِ موسیٰ بن عیسیٰ کے درمیان تھے۔ابن شبہ نے بنو عامر بن لوئی کے گھروں میں آل مصبح کے گھروں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ابن ام مکتوم نے گھر لیا' یہ ان گھروں میں شامل تھا جو مصبحین کے تھے' یہ دارِ آل زمعہ بن اسود اور قمقم کے مشرق کے درمیان تھے۔انتہٰی اور یہ امور بھی ان گھروں سے متعلق تھے جو بنو زریق میں گذر چکے۔

دار نوفل اولیٰ کے بارے میں ابن شبہ کے قول کہ: یہی مراد ہے کیونکہ یہی مکان تھا جو بلاط کی دائیں طرف تھا اور یہ رباع والوں کے نزدیک تھا'' کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا البتہ طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ دارِ حویطب بن عبد العزّٰی اصحاب مصاحف کے نزدیک بائیں جانب میں تھا کیونکہ انہوں نے وضاحت میں لکھا ہے: ''بلاط میں ان کا گھر ہے جو مصاحف (قرآن) والوں کے پاس ہے۔'' تو شاید رباع سے ان کی مراد مصاحف ہے۔کیونکہ قرآن کو ''ربعہ'' کہہ لیتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ بلاط کی یہ جانب جو دائیں اور بائیں تھی' اسے اسی نام سے پکارتے تھے لیکن ابن شبہ نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھروں کے بیان میں لکھا ہے: میں نے کسی کو بتاتے سنا کہ دارِ فضالہ

بن حکم بن ابو العاص' جو خراب شدہ بلاط میں تھا اور جو رباع والوں کے نزدیک تھا اور بنو جدیلہ کی طرف جانے والوں کی دا ہنی طرف تھا' یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مربد تھا (کھجوریں سکھانے کی جگہ) اور کہا جاتا ہے کہ یہ صدقہ کے مال سکھانے کی جگہ تھی۔ انتہی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصحاب رباع' بڑے بلاط میں نہ تھے کیونکہ اس میں بنو جدیلہ کی طرف جانے کا راستہ نہیں تھا' بنو جدیلہ کی طرف جانے کے لئے ایک اور بلاط سے ہو کر آتے تھے جو آج کل سوق المدینہ کی جگہ ہے اور پہلے گذر چکا کہ اسے موضع الفاکہہ (فروٹ منڈی) کہا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔

یہ وہ معلومات ہیں جو بلاط کے گرد گھروں کے بارے میں مجھے حاصل ہوئیں اور اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کیونکہ ہمارا مقصد صرف مسجد بنو زریق کے بارے میں کچھ بتانا تھا جس میں حضور ﷺ کے مصلّٰی کی طرف جانے اور وہاں سے واپس آنے کا ذکر ہے جیسے عنقریب آپ کو پتہ چل جائے گا۔

رہا وہ بلاط جو مغرب میں قدیم بازارِ مدینہ تک پھیلا ہوا تھا تو وہ دار عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاتمے تک تھا جیسے گذر چکا۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھروں کے بارے میں ابن شبہ نے لکھا کہ ان میں سے ایک زوراء میں تھا یعنی بازارِ مدینہ میں احجارِ زیت کے پاس جو انہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بطور جاگیر دیا تھا۔ ابن شبہ کہتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ بلاط میں دارِ طلحہ بن عمر اسی دارِ عباس کا مربد تھا جسے حضرت عمر نے اپنے کسی بیٹے کو بیچا تھا' اس کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ منصور ابو جعفر نے طلحہ بن عمر کے لڑکے سے اسے چالیس ہزار دینار کے بدلے میں خریدا تھا۔

پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک اور گھر کا ذکر کیا جو بلاط میں تو نہ تھا لیکن اس گھر کی شامی جانب تھا چنانچہ کہا: ان میں ایک وہ گھر تھا جو بنو زہرہ کے حلیف آل قارط کے گھر کے پہلو میں تھا' جو بنو ضمرہ کے پلاٹ اور اس گھر کے درمیان تھا' یہیں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہائش تھی' وہاں کھانا کھانے کی جگہ بنائی تھی جو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھلایا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دو گھر ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ آگے اس گھر کے ذکر میں اس کا ذکر آ رہا ہے جسے ہشام بن عبد الملک نے لیا تھا اور احجار الزیت کی وضاحت میں آنے والی بات سے پتہ چلتا ہے کہ بلاط کے خاتمہ پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر سیدنا مالک بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے شہادت کے قریب تھا جو اس کی مشرقی جانب تھی اور یہ بھی آ رہا ہے کہ وہ مسجد اصحاب عباء (پوشاک بیچنے والے) کے قریب دفن کئے گئے اور وہیں احجارِ زیت بھی تھا۔

فصل نمبر۳۶

بازارِ مدینہ‘ دارِ ہشام کا ذکر اور یہ کہ حضور علیہ السلام نے بازار بنوایا

حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ارادہ فرمایا کہ مدینہ میں بازار بنا دیں تو بنو قینقاع کے بازار کی طرف تشریف لے گئے‘ پھر بازارِ مدینہ کی جگہ پر واپس آئے اور پاؤں زمین پر مارتے ہوئے فرمایا: یہ تمہارا بازار ہو گا‘ تنگ نہیں ہو گا اور نہ ہی اس میں سے ٹیکس لیا جائے گا۔

ابن زبالہ کے مطابق یہ بازار بنو قینقاع میں تھا اور بعد میں اسے یہاں تبدیل کر دیا گیا۔

دورِ جاہلیت میں مدینہ کے کل بازار

ابن شبہ کے مطابق ابو غسان نے بتایا: مدینہ میں زبالہ والی جگہ بازار تھا جو اس طرف تھی جسے یثرب کہا جاتا تھا‘ ایک بازار بنو قینقاع میں جسر کی جگہ تھا‘ ایک عصبہ کے مقام پر صفاصف میں تھا‘ ایک بازار زقاق بن حبین کی جگہ میں لگتا تھا‘ یہ سب دورِ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی دور میں موجود تھے‘ اس جگہ کو مزاحم کہا جاتا تھا (بھیڑ کی جگہ)۔

حضرت صالح بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بقیع زبیر کی جگہ پر ایک قبہ بنایا اور فرمایا کہ یہ تمہارا بازار ہو گا‘ یہ سن کر حضرت کعب بن اشرف آگے بڑھا‘ اس میں داخل ہوا اور خیمہ کی رسّی کاٹ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا‘ کوئی بات نہیں‘ میں اسے ایسے مقام پر بنا دوں گا جو اس کے لئے اس سے زیادہ ناراضگی کا باعث ہو گا چنانچہ بازار مدینہ میں منتقل کر دیا اور فرمایا کہ ”تمہارا بازار یہ ہو گا اسے تنگ نہ کرنا اور یہاں ٹیکس نہیں ہو گا۔“

حضرت ابو اُسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں بازار کے لئے ایک جگہ دیکھ کر آیا ہوں تو کیا آپ اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟ چنانچہ اس جگہ پر تشریف لائے جہاں آج کل بازار ہے (یعنی ان کے دور میں) حضور ﷺ نے پاؤں مبارک زمین پر مارا اور فرمایا: تمہارا بازار یہ ہو گا‘ اسے گھٹایا نہیں جائے گا اور نہ ہی اس میں ٹیکس لگے گا۔

حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بنو ساعدہ کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا میں تمہارے پاس ایک ضروری کام کے لئے آیا ہوں‘ مجھے اپنی قبروں والی جگہ میں سے کچھ جگہ دیدو‘ میں بازار بنانا چاہتا ہوں‘ قبرستان کی جگہ دارِ ابن ابی ذئب سے دارِ زید بن ثابت تک تھی‘ کچھ نے دینے کو کہا اور کچھ نے انکار کیا‘ وہ کہنے لگے کہ یہ ہمارا قبرستان ہے اور ہماری عورتوں کے لئے نکلنے کی جگہ ہے پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی‘ آپ سے ملے اور جگہ دیدی‘ آپ نے بازار بنا دیا۔

میں کہتا ہوں‘ عنقریب آ رہا ہے کہ دارِ ابن ابی ذئب اور دارِ زید بن ثابت بازار کی مشرقی جانب تھے‘ پہلا تو

بازار کے درمیان شامی جانب تھا اور دوسرا قبلہ کی جانب لہٰذا وہ سارا قبرستان بازار نہ بنا بلکہ اس کچھ حصہ بازار کے لئے رکھا گیا اور بنو ساعدہ کے گھروں کا ذکر کرتے ہم بتا آئے ہیں کہ ابن زبالہ کے مطابق مدینہ کے بازار کی چوڑائی مصلّٰے سے جرار سعد تک تھی' یہ وہ جرار (کنواں) تھا جہاں آپ اپنی والدہ کی وفات کے بعد پانی پلاتے تھے اور ہم بتا چکے ہیں کہ مصلّٰی کی حد جہت قبلہ تھی اور جرار سعد کی حد شام کی طرف تھی چنانچہ جرار سعد ثنیۃ الوداع کے قریب بنتا تھا اور اب یہ بات میرے سامنے خوب کھل چکی ہے۔

ابن شبہ اور ابن زبالہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے بازاروں کی جگہیں الاٹ فرما دی تھیں۔

خالد بن الیاس عدوی کہتے ہیں کہ مدینہ میں ہمارے سامنے حضرت عمر بن عبد العزیز کا خط پڑھا گیا' آپ نے لکھا کہ بازار بطور صدقہ ہوتا ہے لہٰذا اس میں کسی سے کرایہ نہ لیا جائے۔

ابن ابی ذئب رضی اللہ تعالٰی عنہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دار المنبعث کے نزدیک ایک خیمے کے قریب سے گذرے تو پوچھا کہ یہ خیمہ کس کا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ بنو حارثہ کے ایک شخص کا ہے جو یہاں کھجوریں بیچتا تھا' فرمایا: اسے جلا دو چنانچہ اسے جلا دیا گیا۔ ابن ابی ذئب کہتے ہیں' مجھے پتہ چلا کہ وہ شخص محمد بن مسلمہ تھے۔

عبد العزیز بن سلیمان رضی اللہ تعالٰی عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ نے بازار میں لوہار کی بھٹی دیکھی تو اسے پاؤں کی ٹھوکر سے گرا دیا اور فرمایا: کیا تم رسول اللہ ﷺ کے بازار کو گھٹا رہے ہو؟

حضرت حبیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ بازار میں حضرت معمر کے دروازے سے گذرے تو وہاں ایک گھڑا رکھا تھا' آپ نے حکم دیا کہ یہاں سے اُٹھا لیا جائے' حضرت معمر ادھر گئے اور کہا کہ یہ ایک گھڑا ہے جس میں سے غلام پانی پلاتا ہے۔ بتاتے ہیں کہ آپ نے ننگا رکھنے سے منع کیا' تھوڑی دیر بعد وہاں سے گذرے تو اس پر سایہ کیا ہوا تھا' اس پر حضرت عمر نے گھڑا اور سایہ دونوں کو دور کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عبد اللہ بن محمد کہتے ہیں' کوئی سوار مدینہ کے بازار میں اُترتا تو اپنا کجاوہ رکھ دیتا' پھر وہ بازار میں پھرتا اور اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہتا' اس میں سے کوئی شے غائب نہ ہوتی۔

پھر محمد بن طلحہ نے بتایا کہ حضرت ابراہیم بن ہشام بن اسماعیل بن ہشام بن ولید بن مغیرہ نے ہشام بن عبد الملک کے دور میں (جب یہ ان کے دور میں والی مدینہ تھے) ایک گھر لیا جس کی وجہ سے مدینہ کے بازار میں تنگی آ گئی' بازار میں کھلنے والے گھروں کے اگلے حصے بند کرا دئے گئے اور پھر ہشام کو بازار کے بارے میں لکھا اور اس کی قدر بتائی جس پر ہشام نے انہیں لکھا کہ بازار کو کھلا رہنے دیا جائے' ابراہیم نے وہ گھر اہل مدینہ کی گلیوں میں بنایا تھا' ان گلیوں کا کچھ حصہ ان کے گھروں میں شامل ہو گیا تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ گلیاں اسی طرح جاری رہنی چاہئیں خواہ مکانوں کے اندر ہی کیوں نہ آ گئی ہوں۔

میں کہتا ہوں' ابو غسان نے بتایا کہ جس بات نے ہشام بن عبد الملک کو ابھارا کہ وہ اپنا وہ گھر بازار میں بنائیں' وہ یہ تھی کہ ابراہیم بن ہشام بن اسماعیل' ہشام بن عبد الملک کا خالو تھا اور اسی نے اسے والیٔ مدینہ بنایا تھا چنانچہ ابراہیم نے اسے لکھا اور بتایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ کے بازار میں دو گھر بنوائے' ایک کو دار القطران اور دوسرے کو دار النقصان کہا جاتا تھا' ان پر انہوں نے ٹیکس لگایا اور اشارہ دیا کہ وہ گھر بنائیں گے جس میں سے مدینہ کے بازار میں داخل ہوں' ہشام نے یہ بات قبول کر لی اور مکان بنا دیا اور اس کے ذریعے پورا بازار لے لیا۔ انتہی۔

اس کے بعد ابن زبالہ نے لکھا: انہوں نے پہلا گھر بنانا شروع کیا اور بلاط کے آخر سے شروع کیا جو زوراء میں دارِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب تھا اور حضرت مالک بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت گاہ کے قریب تھا لہٰذا یہ دیوار بازار کے مشرق میں ہوئی اور یہ پہلی دیوار تھی جو قبلہ کی جانب بنی اور جو آگے آ رہا ہے وہ بتاتا ہے کہ انہوں نے کام جاری رکھا اور شام کی طرف اسے کھینچ لے گیا' قبلہ کی طرف سے یہ دیوار کا ابتدائی حصہ نہیں تھا جو بازار کی ابتداء میں ہو بلکہ اس میں سے کچھ قبلہ کی طرف بقایا تھا جو مصلّٰے تک تھا۔

ابن زبالہ نے اس کے بعد لکھا کہ بلاط کے خاتمہ سے گھر کی ابتداء کی پھر اسے آگے تک لے گئے اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے گھر کا اگلا حصہ بند کر دیا یعنی جو بلاط کے خاتمہ اور دار نخلہ میں تھا' یہ آلِ شیبہ بن ربیعہ کا تھا' اسے دار النخلہ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں کھجوریں تھیں' اس کے بعد دارِ معمر عدوی تھا جس میں بازار والا بیٹھتا تھا پھر دارِ خالد بن عقبہ تھا جس کے صحن میں اصحابِ رقیق تھے۔

پھر بنو ساعدہ کے لئے راستہ رکھا جس کے آخر میں دروازہ لگایا' پھر ابن جحش کے گھر کا اگلا حصہ شروع کیا' پھر دارِ ابن ابی فروہ کا جو عمر بن طلحہ بن عبید اللہ کا تھا پھر دار ابن مسعود کا' پھر دارِ زید بن ثابت کا شروع کیا اور راستہ میں دروازہ لگا کر گذر گاہ بنائی پھر دارِ جبیر بن مطعم کا اگلا حصہ بنایا جس میں کپڑا فروش تھے پھر دارِ قارظیین' پھر دارِ عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اگلا حصہ بنایا یعنی دوسرا گھر جس میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رہائش رکھتے تھے اور بنو ضمرہ کے لئے دروازے والا راستہ بنایا پھر دار ابن ابی ذئب کا اگلا حصہ اور پھر دار آل شویفع بنوایا پھر صدقۃ الزبیر اور پھر بنو الدیل کے لئے دروازے والا راستہ بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ راستہ شام کی طرف ملنے والی اس مشرقی دیوار کی انتہاء پر تھا اور اس سے پہلے لکھے گئے سب راستے اسی دیوار میں تھے۔

پھر ابن زبالہ نے اس کا بیان کیا جو اس دیوار کے مغرب میں سامنے ابتداء ہی میں تھا اور پھر شام کی جانب تھا پھر اس کے بعد کہا: پھر دوسری طرف سے شروع کیا چنانچہ زوراء کی اگلی طرف پھر دار ابن نصلہ کنانی کا اگلا حصہ بنایا پھر طاقوں کو بناتے ہوئے بنو غفار کے [illegible] تک پہنچے اور بنو سلمہ کے لئے نکلنے کی جگہ یعنی ابنِ جبیر کی گلی کے لئے بڑا دروازہ لگوایا جس کو بند کیا جا سکے پھر دارِ نقصان اور دارِ نویرہ کی طرف چلے اور اسلم کی گلی کے لئے دروازہ لگایا پھر آگے چلتے گئے'

دارِ ابن ازھر، دارِ ابن شہاب اور دارِ نوفل بن حارث تک چلے گئے اور دارِ حجارہ سے آگے بڑھ گئے، یہ حضرت عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قبضے میں تھا اور جب دارِ حجارہ سے آگے نکلے تو ثنیہ پہاڑی کے سامنے عظیم دروازہ بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ اس ثنیہ سے مراد ثنیۃ الوداع پہاڑی ہے اور یہ دروازہ شامی جانب تھا جیسے ابن شبہ نے وضاحت کی اور پہلے بیان کے بعد کہا: اس کے لئے شام کی طرف دروازہ بنایا جو ثنیہ میں دارِ عمر بن عبد العزیز کے شامی کونے کے پیچھے تھا پھر اس کے اور دارِ عمر بن عبد العزیز کے درمیان تین ہاتھ کی چوڑائی رکھی پھر ایک اور دیوار اسی دیوار کے سامنے بنائی پھر اس کے اور تمام گھروں کے درمیان تین ہاتھ کی بنیاد کھینچی، اس گلی تک جسے زقاق ابن جبیر کہتے تھے اور اس پر دروازہ بنایا اور پھر اس گلی پر جو زقاق بنوضمرہ کہلاتی تھی اور دارِ آلِ ابی ذئب پر دروازہ لگایا پھر زوراء پر بلاط کے آخر میں دروازہ لگایا جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہاں دروازہ لگایا تھا لیکن ابن زبالہ نے اس پر بات نہیں کی۔

پھر ابن زبالہ نے باقی بچ جانے والی غربی اور مشرقی دو طرفوں کا ذکر کیا جو قبلہ کی طرف مصلّٰی تک جاتی ہیں چنانچہ اپنی بات کر کے کہا: پھر اسے مشرقی اور غربی دونوں پہلوؤں سے تعمیر کرتے ہوئے گھروں کے اگلے حصے بند کئے پھر بازار کی طرف شروع ہوئے اور اسے مشرقی جانب سے دارِ قطران کے اگلے حصے کو بند کیا پھر دارِ ابن جوان اور ان گھروں کو بند کیا اور غربی پہلو میں دارِ حجار کو جو کثیر بن صلت کا تھا اور اس سے پہلے ربیعہ بن دراج جمحی کے قبضے میں تھا پھر ربعہ کا اگلا حصہ بند کیا جس میں دارِ آلِ ابو عثمان تھا جو ازھر بن عبد عوف کے حلیف تھے پھر گلی کا سوراخ رکھا پھر دار التمارین کا اگلا حصہ بنایا، یہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا اور اس سے پہلے سعید بن عبد الرحمٰن بن یربوع کا تھا اور ابن ہشام جب دار التمارین تک پہنچے تو ٹھہر گئے اور اس کے لئے وہاں مصلّٰے کے سامنے بڑا دروازہ بنایا۔

اپنے گذشتہ قول: ''بلاط کے آخر میں زوراء پر دروازہ بنایا'' کے بعد لکھا: پھر دیوار بناتے بناتے قطران کے دوسرے غربی گھر کے طاقوں تک لے آئے اور وہاں سے مصلّٰے میں دارِ ابن سباع تک لے آئے جو آج کل خالصہ کے قبضے میں ہے اور مصلّٰے کے مقام پر دروازہ لگا دیا۔ پھر انہیں گھر بنا دیا اور اس میں تمام بازار بنائے، ابن ہشام نے اس سارے کام کے لئے حضرت سعد بن عبد الرحمٰن زرقی انصاری کو مقرر کیا تھا، مصلّٰے والے دروازے کے علاوہ سب تعمیر مکمل ہوگئی، ان کے دروازے شام سے بن کر آئے تھے اور ان میں سے اکثر بلقاء سے آئے تھے۔ انتہٰی۔

ابن نے اپنے گذشتہ کلام کے بعد لکھا کہ: انہوں نے بقیع زبیر میں تعمیر کی اور اس پر ڈاٹ لگائے اور ان کے ذریعے ان کے گھر بند کر دئے اور گلیاں بنائیں اور سوراخ رکھے جنہیں بند کیا جا سکے۔

میں کہتا ہوں مطلب یہ ہے کہ انہوں نے، بقیع زبیر کی کھلی جگہ پر بازار جیسا گھر بنایا۔ یہ وہم نہ کیا جائے کہ بقیع زبیر بھی شاید بازار ہی کا حصہ تھا۔

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ بازار والے گھر کے نیچے دوکانیں بنائیں اور کرائے کے لئے چوبارے بنائے جن میں رہائش کی جا سکے' ان کے دروازے بلقاء سے منگوائے جن میں سے کچھ آج بھی مدینہ منورہ میں موجود ہیں اور ان پر بلقاء لکھا ہوا ہے۔

اس دیوار کا گرایا جانا جو بازار کے مکان میں بنائی گئی

ابن زبالہ کہتے ہیں کہ ابھی لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ ہشام فوت ہو چکا ہے کہ اسی دوران ابن مکرم ثقفی شام سے ولید بن یزید کی چٹھی لے کر آئے کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ انہیں عطاء بخشش کی بشارت دی اور جب ثنیہ کے مقام پر پہنچا تو چلایا کہ ہشام بھینگا فوت ہو گیا ہے' یہ سن کر لوگ جھپٹے اور دیوار گرانا شروع کر دی اور بازار میں موجود چشمے کو توڑ دیا۔

ابن شبہ کی عبارت یوں ہے: وہ گھر ہشام بن عبد الملک کی حیاتی میں یونہی رہے' وہاں تاجر کام کرتے تھے جن سے کرایہ وصول کیا جاتا رہا' اسی اثناء میں ہشام فوت ہو گیا' ابن مکرم ثقفی اس کی موت کی خبر لے کر آیا اور جب وہ ثنیۃ الوداع پر پہنچا تو چلایا کہ بھینگا فوت ہو گیا ہے اور ولید بن یزید امیر المؤمنین بن گیا ہے اور جب وہ ہشام کے گھر میں داخل ہوا تو لوگوں نے چلا کر اسے کہا کہ اس گھر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اسے گرا دو' لوگوں نے اسے گرانا شروع کر دیا' دروازے اُٹھا کر لے گئے لکڑیاں اور کھجور کی ٹہنیاں لوٹ لیں' ابھی تین گھڑیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ وہ گھر گرا دیا گیا۔

اُمّ کلاب کا گھر

ابن زبالہ کے مطابق حضرت محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے شراب انڈیل دینے کا حکم فرمایا اُمِ کلاب کے گھر کے پاس بازار میں اس جگہ انڈیل دی گئی جہاں انڈیلی جاتی تھی اور آگے احجارِ زیت کے بیان میں ابن ابی فدیک کا یہ قول آ رہا ہے: میں نے احجارِ زیت دیکھے جو تین تھے اور ابن اُم کلاب کے گھر کے سامنے تھے آج کل اسے "بیت بنو اسد" کہا جاتا ہے۔ انتہی لیکن وہ بیت ابن اُمِ کلاب کا نہیں جس کا ذکر بنو زریق کے بیان میں آیا ہے اور یہی وہ بازار ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ بنو قریظہ کے قیدیوں کو مدینہ کے بازار میں لے گئے' وہاں ان کے لئے گڑھے کھودے اور پھر انہی میں ان کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ جو کچھ ہم نے بیان کر دیا اور جو زوراء کے تعارف میں آ رہا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ سوق المدینہ کا اگلا حصہ جو بلاط کے اخیر اور اس کے گرد کے پاس ہے' اسی کو "زوراء" کہا جاتا ہے۔

بطحاء

ابن شبہ کے ایک راوی کہتے ہیں کہ میں نے زوراء کے مقام پر بازار دیکھا تھا جسے "سوق الحرس" کہتے تھے

جس میں لوگ سیڑھی کے ذریعے اُترتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''الام'' میں دیکھا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ سوق المدینہ کا نام ''بطحاء'' تھا کیونکہ حضرت جعفر کے والد محمد رحمہ اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے' وہاں ایک بازار تھا جسے ''بطحاء'' کہتے تھے' بنوسلیم وہاں گھوڑے' اونٹ' بکریاں اور گھی وغیرہ بیچنے کے لئے لاتے' وہ لاتے تو لوگ خریدنے کے لئے آ جاتے' الحدیث۔

بقیع الخیل

ابن شبہ کے مطابق حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ بازارِ مدینہ کو ''بقیع الخیل'' کہا جاتا تھا۔ یہ حدیث ابن زبالہ کے حوالے سے وہاں گذر چکی ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ کے لئے اور یہاں سے وباء نکالنے کے لئے دعا فرمائی تھی۔ اسی میں ہے: پھر آپ ''بقیع الخیل'' (مال منڈی) کی طرف تشریف لے گئے اور قبلہ رُخ کھڑے ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دُعا یہ فرمائی کہ الٰہی! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت ڈال دے۔ الحدیث۔

بقیع کے بارے میں جو کچھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے احادیث کی چاروں کتابوں اور حاکم میں فرمایا ہے' یہ ہے کہ ''میں نے بقیع میں دیناروں کے اونٹ بیچ کر ان کی جگہ درہم لے لئے'' تو اس سے یہاں یہی بقیع مراد ہے اور جب بہت سے علماء سے یہ بات پوشیدہ رہی تو ان میں سے کسی نے کہا کہ یہاں مراد ''نقیع'' ہے یعنی بقیع کی چراگاہ۔ اس نے کہا کہ بیع کا تعلق تو چراگاہ ہی سے بن سکتا ہے بقیع سے نہیں' وہ تو دفن کرنے کی جگہ ہے البتہ علامہ نووی نے کہا کہ یوں نہیں بلکہ وہ بقیع الغرقد تھی اور اس وقت وہاں قبریں کچھ زیادہ نہ تھیں۔ انتھیٰ اور یہ بات کسی بھی مؤرخ نے نہیں کہی کہ بقیع الغرقد میں بازار بھی تھا حالانکہ انہوں نے دورِ جاہلیت اور دورِ اسلام میں مدینہ کے بازاروں کو محفوظ کر رکھا تھا تو ثابت ہوا کہ قابل بھروسہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے کر دیا اور یہاں بقیع اس مقام کو کہا جا رہا ہے جو بازارِ مدینہ میں سے مصلّٰے سے جا ملتا ہے اور اسے بقیع المصلّٰے بھی کہا جاتا ہے' اسی لئے احمد و طبرانی نے بحوالہ ابو بردہ بن نیار لکھا ہے کہ انہوں نے بتایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ بقیع المصلّٰے کی طرف نکلے' آپ نے کھانے میں ہاتھ ڈالا اور پھر واپس ہٹا لیا' دیکھا تو وہ صحیح نہیں تھا' اس میں کچھ ملا ہوا تھا' فرمایا: جو ہم سے کھوٹا برتے' ہمارا ساتھی نہیں۔ طبرانی نے ابو موسیٰ سے روایت کیا: میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چلا' ہم سوق البقیع پہنچے' آپ نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور کھانا نکالا الحدیث۔

چنانچہ آپ نے بقیع مصلّٰے کو ''سوق البقیع'' فرمایا۔

ابن زبالہ نے بھی سوق المدینہ کا ذکر کیا چنانچہ محمد بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میں نے عثمان بن عبد

الرحمٰن، اسماعیل بن امیہ بن عمرو بن سعید، محمد بن المنکدر اور زید بن حفصہ کو دیکھا جو بازار بننے سے پہلے اسی کھلی جگہ پر کھڑے تھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، میں نے عثمان بن عبد الرحمٰن سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے درمیان اختلاف سا پیدا ہو گیا ہے، ایک نے تو کہا کہ حضورﷺ وہاں دعا مانگ رہے تھے، ایک نے کہا کہ رسول اللہﷺ وہاں بات کر رہے تھے اور لوگ عید سے واپسی پر دیکھ رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عامر بن عبد اللہ بن زبیر بھوسہ بیچنے والوں کے پاس کھڑے دُعا کر رہے تھے۔ پھر مصلّٰے کے ذکر میں وہ کچھ آ رہا ہے جو امام شافعی نے اُم میں لکھا چنانچہ عبد الرحمٰن تیمی کے دادا کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریمﷺ کو دیکھا، آپ مصلّٰے سے عید پڑھ کر واپس تشریف لائے تو بازار کی نچلی طرف کھجوریں بیچنے والوں کے پاس تشریف لے گئے اور جب آپ مسجد مصلّٰے کے پاس پہنچے جو بازار میں اس گھر کی جگہ تھا، تو کھڑے ہو گئے اور اسلم کے کھلے مقام کی طرف متوجہ ہوئے، دُعا فرمائی اور واپس لوٹے۔

برکتہ السوق

میں کہتا ہوں یہ بات واضح ہے کہ "برکتہ السوق" فج اسلم کی شامی جانب تھا اور پھر اسلم کے گھروں کے بیان میں پتہ چلے گا کہ ان کے گھر ثنیہ پہاڑی کے شامی جانب تھے اور آج کل اس پہاڑی پر امیر مدینہ کا قلعہ ہے، پھر دار السوق کے بیان میں بھی گذر چکا کہ وہ مغربی جانب تھا، چنانچہ بتایا: "اسلم کی گلی کا دَروازہ بنایا" اور یوں "برکتہ السوق" وہی تہ خانہ ہوا جس میں سیڑھی سے اُترتے تھے، یہ اس قبر کے پاس تھا جو مدینہ کے چشمے کے پاس تھی اور یہ ثنیۃ الوداع کی طرف جانے والے کی بائیں طرف تھی اور پھر ابن زبالہ کی بات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چشمہ جاری کرنے والے ابراہیم بن ہشام تھے اور احجار الزیت کی وضاحت میں آ رہا ہے کہ نبی کریمﷺ نے زوراء کے قریب، احجار زیت کے پاس بارش کی دُعا فرمائی تھی۔ واللہ اعلم۔

ابن شبہ کے مطابق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ: رات اور دن گزرنے نہیں پائیں گے کہ اس بازار کے صحن میں کوئی نہ کوئی شخص دھنس جائے۔ ابن ابی فدیک کہتے ہیں، میں اپنے بڑوں سے سنتا رہا، واللہ اعلم وہ کہتے تھے: یہ معاملہ بیت البرادین (ٹھنڈے پانی والے) کے دروازے پر ہو گا۔ کہتے ہیں کہ یہ دارِ ابن مسعود کے صحن میں ہوا۔

حضرت عبید کہتے ہیں، میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ چلا اور جب ہم دارِ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس پہنچے تو کہنے لگے: اے ابو الحارث! مجھے میرے محبوبﷺ نے بتایا کہ اس ٹکڑے (بازار) کی بہت سی قسمیں، اللہ کی طرف نہیں اُٹھیں گی۔ میں نے پوچھا اے ابو ہریرہ! یہ کیونکر ممکن ہو گا؟ تو انہوں نے کہا، میں جھوٹ نہیں بولتا میں اس کا گواہ ہوں۔ میں نے کہا کہ پھر میں بھی گواہ ہوں۔

حضرت عبد الرحمٰن بن یعقوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بازار میں تشریف لائے تو گندم دیکھی جس میں کنکر بھی تھے' آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو اس کے درمیان میں تری محسوس کی' پوچھا: یہ کیا ہے؟ گندم والے نے عرض کی' میں بارش میں گھر گیا جس کی وجہ سے آپ یہ تری دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم نے اسے کھول کر سامنے کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیتے؟ جو دھوکے سے کام لے گا' وہ ہم میں شمار نہ ہو گا۔ بنیادی حدیث حضرت ابو داؤد وغیرہ نے ذکر کی' الفاظ یہ ہیں: نبی کریم ﷺ ایک آدمی کے ہاں سے گذرے' جو کھانے کی جنس بیچ رہا تھا' فرمایا: کیسے بیچ رہے ہو؟ اس نے بتایا تو آپ پر وحی (خفیہ) آ گئی کہ اس میں ہاتھ ڈال کر دیکھئے' آپ نے دیکھا تو اس میں تری تھی' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی دھوکا بازی کریگا' وہ ہم میں شمار نہ ہو گا۔

ابن المغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ بازار میں سے گذرے تو دیکھا کہ ایک شخص بازار میں مہنگے داموں کھانے کی چیز بیچ رہا تھا' فرمایا: تم ہمارے بازار میں دوسروں سے مہنگی بیچ رہے ہو؟ اس نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا' صبر سے کام لو اور آخرت کا خیال رکھو۔ انہوں نے عرض کی' ٹھیک ہے۔ فرمایا یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اس بازار میں سودا لانے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والے جیسا ہوتا ہے اور جو اس بازار میں مہنگائی کے لئے سودا روک رکھے گا' وہ کتاب اللہ کے مطابق بے دین ہو گا۔

میں کہتا ہوں کہ ان کے ''بسعر هوا رفع'' کہنے کا مقصد بیچی جانے والی چیز کو مہنگا کرنا ہے' اس کی دلیل حضرت عبد الرحمٰن بن حاطب کا یہ قول ہے: میرے والد اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاروبار میں شریک تھے' وہ ''عالیہ'' سے کھجوریں لے کر بازار آتے' اسی دوران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سے گذرے اور تھیلے کو پاؤں سے ٹھکور کر کہا: اے ابن ابی بلتعہ! مہنگا بیچو ورنہ بازار سے نکل جاؤ۔

ابن زبالہ کے مطابق حضرت قاسم بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے پاس گئے' وہ سوق المصلّٰی میں تھے اور ان کے سامنے دو تھیلے تھے جن میں میوہ تھیں' آپ نے بھاؤ پوچھا تو انہوں نے ایک درہم کے دو مُدّ بتائے۔ حضرت عمر نے کہا: مجھے بتایا گیا ہے کہ طائف سے ایک قافلہ آ رہا ہے جو میوہ لا رہے ہیں' وہ جب کل کو تمہارے پہلو میں مال رکھیں گے تو تمہارے بھاؤ کا جائزہ لیں گے پھر یا تو تم بھاؤ چڑھاؤ گے یا پھر اپنی کشمش (میوہ) گھر لے جانا ہو گا' وہاں لے جا کر اپنی مرضی کے مطابق بیچ لینا۔ حضرت عمر واپس آ گئے اور حساب لگایا اور پھر حاطب کے پاس اس کے گھر گئے اور کہا: جو کچھ میں نے تم سے کہا تھا وہ کوئی اچھی بات نہ تھی اور نہ ہی فیصلہ تھا' میں نے تو بھلائی کا ارادہ کیا تھا' اب جہاں چاہو' اسے بیچو۔

فصل نمبر ۳۷

مہاجر قبیلوں کے مکانات اور مدینہ کے گرد حفاظتی دیوار

بنو غفار کے گھر

حضرت عمر بن شبہ کہتے ہیں کہ بنو غفار اس مقام پر ٹھہرے جہاں رسول اللہ ﷺ نے انہیں زمین کا ٹکڑا دیا تھا' یہ ٹکڑا' دارِ کثیر بن صلت (جسے دار الحجارہ کہتے تھے) کے درمیان تھا' اسی خطہ میں مسجد بنی غفار بھی تھی' نبی کریم ﷺ جب ابو رھم بن حصین غفاری کے گھر سے نکلے تھے تو اس میں نماز بھی پڑھی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ اس دارِ کثیر بن صلت کا بیان وہاں گذر چکا جہاں بازار کے اس مغربی حصے کی بات کی تھی جو قبلہ کی طرف مصلّے کی شامی جانب تھا' رہی ابن حبین کی گلی تو یہ بھی بازار کے مغرب میں شامی جانب' امیر مدینہ کے قلعہ کے قریب تھی' ابن حبین' حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام تھے' رہا دارِ ابی بسرہ تو اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں' ظاہر یہ لگتا ہے کہ یہ کھجور والے بازار کی غربی جانب تھا اور رہا آلِ ماجشون کے گھر تو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ جلا دوں کی گلی میں تھے اور عنقریب بنو کعب کے گھروں کے ذکر میں آئے گا کہ وہ مصلّی کے سامنے تھے۔ واللہ اعلم۔

سباع بن عرفطہ غفاری نے مصلّے میں زمین کا ٹکڑا لیا ہوا تھا اور یہ وہی گھر تھا جسے دار عبد الملک بن مروان کہتے تھے اور جو مصلّے کے پاس تھا' اس کا اگلا حصہ حجاموں کے سامنے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ مصلّے کی شامی جانب تھا جو بازار کی طرف مغرب میں تھا کیونکہ ابن شبہ نے کہا: ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حجاموں کی جگہ پر مصلّی کے مقام پر ایک گھر لیا جسے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خرید کر مصلّے میں اضافہ کر دیا اور پھر ہشام بن عبد الملک کے بعد اپنے اس گھر میں داخل کر لیا جسے بازار میں شامل کیا اور گرا دیا۔

باقی بنو غفار اپنے محلّہ میں ٹھہرے جو جہینہ پہاڑ سے بطحان تک اور پھر دار کثیر بن صلت والے قلعے (بطحان میں) سے بنو غفار تک پھیلے تھے چنانچہ بنو غفار اپنے دارِ کثیر بن صلت والے ٹکڑے میں ٹھہرے جو جہینہ تک پھیلا تھا۔

میں کہتا ہوں: جبلِ جہینہ کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا' یا تو اس سے ان کا ارادہ وہ جگہ ہے جو سلع پہاڑ سے ملتی ہے اور مصلّے کے سامنے ہے' جہینہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہاں آباد تھے اور وہاں ایک ندی تھی جو بارش کے موقع پر بہتی تھی' یا پھر ان دو پہاڑوں میں سے ایک مراد لیا ہے جو مساجد فتح کے مغرب میں تھی اور رہا بطحان میں دارِ کثیر بن صلت تو انہوں نے ایک اور جگہ بات کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عدوۂ غربیہ میں وادیٔ بطحان کے کنارے پر تھا اور

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب عقبہ بن ابو معیط کو شراب کے جرم میں کوڑے لگائے تو انہوں نے حلف اُٹھایا تھا کہ جب تک ان دونوں کے درمیان وادی کا فاصلہ نہ ہوگا وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ چنانچہ کثیر بن صلت نے اپنے اس گھر کا تبادلہ دار ولید بن عقبہ سے کیا جو مصلّائے عید کے قبلہ کی جانب تھا جہاں آج کل امام نمازِ عید پڑھاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بنو لیث بن بکر کے گھر

بنو ابی عمرو بن نعیم بن مہان نے، بنو مبشر بن غفار کی شامی و غربی جانب رہائش رکھی تھی، ان کے ساتھ بنو خفاجہ بن غفار بھی تھے اور بنو لیث بن بکر، بنو مبشر بن غفار کی زمین سے بنو کعب بن عمرو بن خزاعہ تک کی زمین میں ٹھہرے تھے، یہ گھر غطفانیوں کے گھروں تک پھیلے تھے۔

میں کہتا ہوں: آگے بنو کعب کے گھروں کا ذکر آ رہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ بنو لیث کے گھر بنو مبشر کے خطّہ کے قبلہ کی جانب تھے اور بنو کعب کے شامی جانب لہٰذا بنو لیث کے گھروں کی جانب شمال مغربی بنے گی اور شاید ابن زبالہ نے دار التمارین اور راستے میں سوراخ سے قبل، مغرب کی طرف دارِ سوق کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ان کا مقصد بنو لیث اور ان کے شریک کار لوگوں کا راستہ بتانا ہے۔

ابن شبہ نے بنو مخزوم کے گھروں کے بارے میں کہا ہے کہ ابو شریح خزاعی (بنو مخزوم کے حلیف) نے گھر بنایا جس کے مغرب میں بطحان کی طرف راستہ ہے اور شامی جانب اس گلی کی جانب راستہ ہے جسے بنو لیث کی گلی کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بنو احمر بن یعمر بن لیث اپنی مسجد سے لے کر کھجوروں والوں تک کے بازار میں ٹھہرے (سوق التمارین میں) اور اپنے محلے کی مسجد بنائی جسے مسجد بنو احمر کہتے تھے۔

بنو عمر بن معمر بن لیث، اپنی مسجد، مسجد بنو کدل سے بطحان اور غفار کے بنو مبشر کے گھر تک، پھر زقاق جلا دین تک جس میں دار ماجشون تھا اور پھر دار ابو سبرہ بن خلف اور تمارین تک کے علاقے میں ٹھہرے۔

آل قسیط بن یعمر بن لیث، آل ثعلبہ بن عبید اللہ بن خراش کے گھروں سے بنو کعب کی شامی جانب کے درمیان سے لے کر نصر کے مدرسہ کی حد اس راستے تک کے علاقے میں ٹھہرے جو مصلّٰی کی طرف اور بطحان کی جانب جاتا تھا۔

بنو رجیل بن نعیم مصلّٰے کے پہلو میں ٹھہرے، دار کثیر بن صلت کی مغربی جانب، جو مصلّٰے کے قبلہ میں دارِ آل قلیع تک جو بطحان کی طرف تھا۔

بنو عتوارہ بن لیث (بنو عضیدہ) دار الولید بن عقبہ یمانی کی جانب بطحان میں حرہ تک اور پھر قاسم بن غنام کی

گلی تک' دار ولید بن عقبہ سے شروع ہو کر' اس علاقہ میں آباد ہوئے۔

بنو ضمرہ بن بکر کے مکانات

بنو غفار کو چھوڑ کر باقی بنو ضمرہ بن بکر اپنے محلے میں ٹھہرے جسے بنو ضمرہ کہتے تھے' یہ اس حصے کے مشرق میں تھا جو دار عبد الرحمٰن بن طلحہ بن عمر بن عبید اللہ بن معمر کے درمیان ثنیہ میں بنو دیل بن بکر کے محلے تک پھر سوق الغنم تک جو دار ابن ابی ذئب عامری کی طرف جا کھلتا تھا۔انہوں نے اپنے محلے میں مسجد بنائی۔

بنو الدّیل کے مکانات

بنو دیل بن بکر اپنے محلّہ میں ٹھہرے (یہ ضمرہ سے اس گھر تک کے درمیان تھا جسے دار الخرق کہتے تھے) اس حصے کی حد حضارمہ کی گلی تھی اور اس بڑے خطے کو بنو ضمرہ کا نام دیتے تھے' یہ مربد (کھجوریں سکھانے کی جگہ) ابو عمار بن عبیس (بنو دیل سے تعلق) میں پہاڑی تک تھا' اسے مستندر کہتے تھے جو دار الصلت بن نوفل نوفلی تک پھیلا ہوا تھا جو جبانہ میں موجود تھا۔

میں کہتا ہوں' وہ پہاڑی جسے مستندر کہتے تھے' یہ چھوٹا سا پہاڑ تھا جو پاک صحابی کے مشہد کے مشرق میں تھا اور حاج شامی کی منزل میں تھا کیونکہ یہ تعریف اسی پر سچی آتی ہے۔واللہ اعلم۔

ابو نمر بن عویف (بنو حارث بن عبد مناف بن کنانہ سے تعلق تھا) بنو لیث بن بکر کے پاس ٹھہرے چنانچہ انہوں نے دار ابو نمر نامی گھر بنا لیا اور یہ بنو احمر بن لیث کے خطہ میں تھا۔

افصٰی کے دونوں بیٹوں کے گھر

افصٰی کے دونوں بیٹوں اسلم اور مالک کے گھر' افصٰی بن حارثہ بن عمرو بن عامر کے دونوں بیٹے اسلم اور مالک دو جگہوں پر ٹھہرے چنانچہ مالک بن افصٰی اور اسلم کے بیٹے امیہ و سہم حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے غلام ابن حبین کی گلی والے شامی خطے کے درمیان ٹھہرے' اس نقصان کے کونے پر جو بازار میں تھا اور جہینہ کے خطے تک کے علاقے میں ٹھہرے جو عثعث پہاڑی کی شامی جانب تھا۔

میں کہتا ہوں' گذشتہ دار السوق کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ابن حبین کی گلی سوقِ مدینہ کے مغرب میں تھی اور عنقریب عثعث پہاڑی کے تعارف میں آ رہا ہے کہ یہ ایک پہاڑ کی طرف منسوب تھی جسے سلیع کہتے تھے' اس پر اسلم بن افصٰی کے گھر موجود تھے لہٰذا یہ وہی ثنیہ (پہاڑی) ہے جو چھوٹے سے اس پہاڑ پر ہے جس پر آج کل امیر مدینہ کا قلعہ موجود ہے اور اسلم کے گھروں سے مراد انہی لوگوں کا گھر ہے۔واللہ اعلم۔

سب بنو اسلم (یعنی آلِ برید بن خصیب اور آلِ سفیان) حضارمہ کی گلی سے لے کر قفلہ کی گلی تک کے حصے میں ٹھہرے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ خطہ بازارِ مدینہ کے آخر میں شمال مشرقی جانب تھا۔ آج کل حضارمہ کی گلی کی طرف ایک باغ ہے جو حضرمیہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور مدینہ کی حفاظتی دیوار کے شمال میں تھا اور قبلہ کی گلی کے رُخ پر تھا۔

ھذیل بن مدرکہ' اشجع کی ندی اور یحییٰ بن عبداللہ بن ابی مریم کے گھروں کے کونے کے درمیان ٹھہرے تھے اور یہ خطہ دارِ حرام بن مزیلہ بن اسد بن عبد العزّیٰ تک جاتا تھا اور یہ پہاڑی کے یمانی کنارے پر تھے یہاں یہ لوگ اور اسلم سب اکٹھے ہو جاتے تھے۔

مزینہ اور ان میں ٹھہرے لوگ

مزینہ اور ان لوگوں کا ٹھکانہ جو قیس میں سے عیلان بن مضر وہاں موجود تھے (بنو ھدیہ بن لاطم بن عثمان بن عمرو وہاں تھے مگر ان میں سے بنو عامر بن نور بن لاطم بن عثمان ہمراہ نہ تھے اور عثمان خودٗ انہیں مزینہ کہتے تھے' یہ ان کی ماں تھی) یہ لوگ قروی مطل کے گھر کے درمیان بطحان غربی میں تھے' یہ اس ابن ھبار اسوی کے مشرقی گھر کے کنارے پر تھے جو بنو سمعان نے لے لیا تھا جو بنو زریق کے خطے سے دار الطائی کے حلقے میں تھے جو بطحان مشرقی کا ایک پہلو تھا۔

ان کے ساتھ اس محلّہ میں بنو شیطان بن یربوع (بنو نصر بن معاویہ بن بکر بن ھوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس میں سے تھے) اور بنو سلیم بن منصور اور عدوان بن عمرو بن قیس آباد تھے اور اس مزینہ کے مشرقی حصے میں سلیم بن منصور کے لوگ دارِ خلدہ بن مخلا زرقی تک پھر دارِ اُم عمرو بنت عثمان بن عفان کے قریب نفیس بن محمد (بنو المعلی کا غلام' یہ انصار میں سے بنو زریق سے تعلق رکھتے تھے) کے گھروں تک آباد تھے' یہاں تم بنو بازن بن عدی بن نجار سے مل سکو گے تو یہ سب لوگ مزینہ کے ہمراہ تھے اور ان میں بعض' دوسروں میں شامل تھے' یہ سب اس لئے اکٹھے رہتے تھے کہ جنگل میں ان کے گھر اکٹھے تھے۔

میں کہتا ہوں' اس سے پتہ چلا کہ مزینہ اور ان کے ہمراہیوں کے گھر آج کل مصلائے عید کی عربی جانب بطحان کی مشرقی اونچی جگہ پر تھے اور ان گھروں کی قبلہ کی جانب تھے جو مصلّی میں تھے پھر بنو زریق کے قبلہ کی جانب بنو مازن بن نجار تک تھے۔

بنو سلیم میں سے بنو ذکوان' یہودیوں میں سے اہلِ راتج کے ہمراہ تھے اور یہ دارِ قدامہ کے درمیان سے جبانہ میں دارِ حسن بن زید تک تھے۔

میں کہتا ہوں کہ بنو جحج کے گھروں کے بارے میں ابن شبہ کے قول سے یہی دارِ قدامہ مراد ہے' انہوں نے لکھا: "قدامہ بن مظعون نے وہ گھر بنایا جس میں ذبح خانہ تھا جو بنو ضمرہ کی گلی کے اگلے حصہ پر تھا اور جب تم بنو ضمرہ کی طرف جا رہے ہو تو تمہاری داہنی جانب' دارِ آلِ ابی ذئب کے پیچھے تھا۔ واللہ اعلم۔

بنو اوس بن عثمان بن مزینہ سورین کی طرف آ ٹھہرے تھے یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی اُم کلثوم کے گھر کے درمیان جہاں سورین سے حمارین تک کا کنارہ تھا' اور اس گلی میں تھے جس میں آلِ عثمان کے غلام

یوسف کے بیٹوں کا محل تھا' یہ گلی سبزی فروش تک جاتی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سب امور بقیع کے قریب میں واقع تھے۔

بنو عامر بن ثور بن ثعلبہ بن عدبہ بن لاطم' اُم کلاب کے گھر کے نزدیک ٹھہرے' یہ گھر بنو زریق کے خطے میں تھا جو مصلّٰی کے سامنے کھلتا تھا' مدرا قیس طبیب کے گھر کی طرف اور دارِ عمرو بن عبد الرحمٰن بن عوف اور دارِ عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام بن عاص مخزومی کے سامنے تھا۔

میں کہتا ہوں مدرا قیس طبیب کے گھر کا ذکر بنو محارب بن فہر کے گھروں میں موجود ہے چنانچہ ابن شبہ کہتے ہیں معمر بن عبد اللہ بن عامر نے بنو زریق میں گھر بنایا' یہ دارِ مدرا قیس طبیب اور اُم حسان کے اس گھر کے درمیان میں تھا جو عمر بن عبد العزیز عمری نے لے لئے تھے' یہ مکان گذشتہ بتائے گئے ان گھروں کے قبلہ میں تھا جو بلاط کے قبلہ کی جانب داہنی طرف اور اس کی ساتھ والی جگہ میں بنا تھا اور شاید اُم حسان کا یہ گھر ہی آج کل دارِ حسان کے نام سے مشہور ہے' یہ ان گھروں کے قبلہ میں تھا جو بلاط کے ساتھ تھے۔ واللہ اعلم۔

جہینہ و بلی کے گھر

جہینہ بن زید بن سود بن حارث بن قضاعہ و بلی بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ' اسلم کے خطہ کے درمیان ٹھہرے جو اسلم اور جہینہ کے درمیان تھا اور اس دارِ حرام بن عثمان سلمی انصاری کے گھر تک جاتا تھا جو بنو سلمہ میں اس پہاڑ تک وسیع تھا جسے جبل جہینہ کہتے تھے اور یہ اس عشعث پہاڑی کی دائیں طرف تھا جس پر دارِ ابن ابی حکیم طبیب تھا۔

میں کہتا ہوں کہ دارِ حرام بن عثمان کا بنو سلمہ میں ذکر اس بات کی راہ پیدا کرتا ہے کہ جبلِ جہینہ سے مراد ان دو پہاڑوں میں سے ایک تھا جو فتح نامی مسجدوں کے مغرب میں تھے اور وہاں بنو سلمہ میں سے بنو حرام کے گھر تھے اور پہلے عشعث پہاڑی کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ اس پہاڑی کی طرف منسوب ہے جس پر یہ آج کل امیر مدینہ کا قلعہ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

قیس بن عیلان کے گھر

اشجع بن ریث بن غطفان بن سعد بن قیس اس گھاٹی میں اترے جسے شعب اشجع کہا جاتا تھا اور یہ اشجع کی ندی سے ثنیۃ الوداع کو جاتی ہوئی شعب سلع کے درمیان پہنچتی تھی۔ حضور ﷺ ان کی طرف کھجوروں بھرے اونٹ لے کر تشریف لے گئے جو ان میں تقسیم فرما دئے۔ اشجع قبیلہ نے بھی اپنے محلے میں مسجد بنائی ہوئی تھی۔

میں کہتا ہوں' ابن شبہ نے جو کچھ لکھا ہے' یا تو وہ سلع پہاڑ کی اس گھاٹی پر صادق آتا ہے جو اس کے مشرق میں ہے' اس لحاظ سے اشجع کے گھر اسلم کے اس خطے کے درمیان آتے ہیں جو عشعث پہاڑی کی شامی جانب اور سلع پہاڑ کے درمیان تھا اور یونہی ثنیۃ الوداع تک جاتا تھا' یا پھر سلع کی اس گھاٹی پر صادق آتا ہے جو اس کی شامی جانب تھا۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں: اشجع والے سات سو لوگ مسعود بن رخیلہ کی سربراہی میں آئے اور اپنی گھاٹی میں جا ٹھہرے، حضور ﷺ کھجوروں سے لدے اونٹ لے کر ان کی طرف نکلے اور جا کر فرمایا: اے اشجع کے گروہ! کیونکر یہاں آئے ہو؟ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! اس لئے حاضر ہو گئے ہیں کہ ہمارے شہر آپ کے قریب ہیں اور ہم آپ سے جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے، نہ ہی آپس میں لڑنا پسند کرتے ہیں کہ پہلے ہی بہت سے قتل ہو چکے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری:

اَوۡ جَآءُوۡكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ اَوۡ يُقَاتِلُوۡا قَوۡمَهُمۡ تا سَبِيۡلًا○

"یا تمہارے پاس یوں آئے کہ ان کے دلوں میں سکت نہ رہی کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں اور اللہ چاہتا تو ضرور انہیں تم پر قابو دیتا تو وہ ضرور تم سے لڑتے، پھر اگر وہ تم سے کنارہ کریں اور نہ لڑیں اور صلح کا پیام ڈالیں تو اللہ نے تمہیں ان پر کوئی راہ نہ رکھی۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ دینی کاموں میں اپنی رعیت کو جو ادب سکھاتے تھے، اس سلسلے میں ابن شبہ نے ایک واقعہ لکھا کہ "اشجع میں سے ایک شخص بقیلہ نامی غازی تھا (جنگجو) اس تک یہ بات پہنچی کہ جعدہ بن عبد اللہ اسلمی عورتوں سے باتیں کرتا ہے اور کچھ لڑکیاں سلع کی طرف نکل جاتی ہیں تو ان سے بھی باتیں کرتا ہے پھر کسی لڑکی کو باندھ کر اسے کہتا کہ اسی حالت میں کھڑی ہو جاؤ، وہ اسی وقت اُٹھتی اور گر جاتی اور بسا اوقات بے پردہ ہو جاتی چنانچہ اشجعی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ ہماری لڑکیاں سلع پہاڑ کی پچھلی طرف جاتی ہیں، ان میں سے کچھ بنو سعد بن بکر یا اسلم یا جہینہ یا غفار کی ہوتی ہیں جنہیں جعدہ نامی شخص باندھ دیتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ گر جائیں۔ اس کا تعلق بنو سلیم سے ہے، انہیں ایک سفید اور لمبے قد والا آدمی باندھتا ہے، یہ کوئی اچھا کام نہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جعدہ کو بلایا اور فرمایا: جیسے بتایا گیا ہے، وہ سفید اور لمبے قد کے تھے ہی، پھر اس سے پوچھا تو اس نے اقرار کر لیا چنانچہ آپ نے اسے باندھ کر سو کوڑے لگائے اور شام کی طرف جلا وطن کر دیا۔ آپ سے اس سلسلے میں درخواست کی گئی تو آپ نے اس شرط پر آنے کی اجازت دی کہ مدینہ میں داخل نہ ہوا کرے، پھر جمعہ پڑھنے کی اجازت دی اور آخر کار ایک جمعہ میں دو بار آنے کی اجازت دیدی۔

ابن اسحاق کے مطابق یہ شاعر ہوازن سے تعلق رکھتا تھا اور نام خیثمہ تھا۔

بنو جشم کے مکان

بنو جشم بن معاویہ بن بکر بن ھوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس اپنے اس محلے میں ٹھہرے جسے بنو جشم کا محلہ کہتے تھے۔ یہ محلہ اس گلی میں تھا جسے زقاق سفیان کہتے تھے، یہ اس بنیاد تک جاتا تھا جسے اساسِ اسماعیل بن الولید کہتے تھے، یہ خوخۃ الاعراب تک جاتا تھا اور وہ ذکوان کے گھروں تک پھیلا تھا جو مروان بن حکم کا غلام تھا۔

میں کہتا ہوں، جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، میں اس میں سے کسی چیز کو نہیں جانتا البتہ بنو جمح کے گھروں کے

بیان میں انہوں نے لکھا ہے کہ محمد بن حاطب نے وہ گھر بنایا جسے دارِ قدامہ کہتے تھے' یہ بنو زریق میں تھا' اس کے مشرق میں وہ گھر تھا جسے دار الاعراب کہتے تھے تو شاید خوخۃ الاعراب اور جو کچھ اس کے بارے میں لکھا گیا ہے' اسی طرف تھا۔ واللہ اعلم۔

پھر بنو مالک بن حماذ' بنو زنیم اور بنوسکین (جن کا تعلق خزارہ بن ظبیان بن بغیض بن ذئب ابن غطفان سے تھا) اس محلہ میں آباد ہوئے جسے بنو خزارہ کا محلہ کہتے تھے' یہ حمامِ صعبہ سے جبانہ میں لکڑہاروں کے بازار سوق الحطابین تک پھیلا ہوا تھا اور بنو عدی بن خزارہ کا کوئی فرد اس میں نہیں آیا تھا۔

میں کہتا ہوں' ہمیں اس کی جس جانب کا علم ہوا ہے وہ جبانہ میں سوق الحطابین تھا جو مسجد الرایہ اور ثنیۃ الوداع کے قریب تھا جیسے جبانہ کی وضاحت میں آ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

بنو کعب بن عمرو اور ان کے برادران بنو المصطلق

بنو کعب بن عمرو بن عدی بن عامر' بنو لیث بن بکر کے یمانی جانب دارِ شریح عدوی تک پھر بازار میں کھجوریں بیچنے والوں کی جگہ تک پھر جلادوں کی گلی تک جو دائیں بائیں جانب مصلّے کے پاس نکلتی ہے' پھر بطحان تک اور پھر کدام کی گلی تک کے علاقے میں آ ٹھہرے (کدام' جہاں زائد چیزیں پھینکی جائیں) پھر یہ گلی دارِ ابن ابی سلیم تک جاتی تھی جو مصلّٰی کی شامی جانب تک چلی جاتی تھی۔

بنو المصطلق بن سعد بن عمرو اور اس کا بھائی کعب بن عمرو (جو سیدہ جویریہ بنت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قبیلہ تھا' یہ حضور ﷺ کی زوجہ تھیں) بنو عضدہ کی پتھریلی زمین میں ٹھہرے' یہ دارِ عمر بن عبد العزیز کی طرف تھا اور وہ اس دار کی طرف تھا جسے دار الخرازین کہتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ وہ غربی پتھریلی جگہ میں تھا۔

نبی کریم ﷺ کے دور میں مدینہ منورہ کا پھیلاؤ

مہاجرین کے گھروں اور ان کے قبیلوں کے ٹھکانوں کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا' جو شخص اس میں غور کرے گا وہ مدینہ کی عمارتوں اور اس کی فراخی کو دیکھے گا اور یہ دیکھے گا کہ وہ گھر ایک دوسرے سے کس طرح ملے ہوئے تھے تو حیران رہ جائے گا' اب بھی ان عمارتوں کے نشانات باقی ہیں جو شہر کی عظمت بتا رہے ہیں اور مدینہ کا لفظ ان میں سے ہر شے پر بولا جاتا تھا پھر قباء کے تعارف میں آگے آ رہا ہے کہ وہ ایک عظیم شہر تھا جو مدینہ کے ساتھ متصل تھا' درمیان میں صرف کھجور کے درخت تھے لہٰذا مسجد نبوی کے علاوہ جمعہ کسی اور جگہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا اور اگر قباء وغیرہ شہر جو آج الگ تھلگ ہیں' حضور ﷺ کے زمانے میں بھی الگ ہوتے اور لوگوں کے قبیلے وہاں آباد ہوتے تو وہاں جمعہ قائم کرنا لازم ہو جاتا جہاں چالیس ہوتے کیونکہ یہ سب ایک شہر کے حکم میں شمار ہوتے۔

مدینہ منورہ کی شہر پناہ یعنی اس کے گرد حفاظتی دیوار

جب راتوں کو مدینہ شریف کے اردگرد خرابی ہونے لگی تو لوگوں نے اس کے گرد حفاظتی دیوار بنا دی۔ علامہ مجد فیروز آبادی کہتے ہیں کہ مدینہ شریف کے گرد حفاظتی دیوار سب سے پہلے عضد الدولہ بن بویہ نے ۳۶۰ھ کے بعد بنائی' یا دور طائع للہ بن مطیع للہ کا تھا پھر عرصہ کے بعد وہ گر گئی اور مدینہ میں خرابی کی وجہ سے اس میں خرابی پیدا ہوگئی تو اس کا نام ونشان نہ رہا۔

علامہ مطری نے مسجد جہینہ پر بات کرتے ہوئے کہا: جہینہ کی جانب مشہور تھی اور صاحب مدینہ وحفاظتی دیوار کی غربی جانب واقع تھی' یہ دیوار مدینہ اور جبل سلع کے درمیان تھی' اس کے پاس مدینہ کے دروازہ کے آثار ہیں جو جہینہ کی گلی میں دکھائی دیتے ہیں' یہ ۷۶۶ھ کی بات ہے۔

میں کہتا ہوں' ہم نے جہینہ والی جانب کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ اس کے خلاف ہے کیونکہ اگرچہ ہم نے وہ دروازہ نہیں دیکھا جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے لیکن ہم نے اس قدیم دیوار کے آثار سلع پہاڑ کی طرف دیکھے ہیں اور اسی قلعہ کے قریب دکھائی دیتے ہیں جن کا حال دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہینہ وغیرہ کے اکثر گھر جو قدیم ہیں' اسی کے اندر موجود تھے اور یہ مغرب کی طرف تھے اور مشرقی جانب بطحان کے کونے پر تھے کیونکہ علامہ اقشہری نے اپنے روضہ میں لکھا تھا کہ مدینہ' مکہ کے نصف سے کم تھا' یہ سخت اور کنکروں والی زمین پر تھا' یہاں کھجور کے بہت سے درخت تھے اور پانی بھی بہت تھا' اس کی کھیتیوں کو غلام پانی دیتے تھے' اس کے گرد حفاظتی دیوار تھی اور مسجد تقریباً درمیان میں تھی اور پھر مسجد کے علاوہ قبر انور کی پہچان کرائی پھر کہا: حضور ﷺ کا وہ مصلّٰی جس میں آپ عید پڑھتے تھے مدینہ کے مغرب میں دروازے کے اندر داخل تھا۔ انتھی تو مصلّٰی کا دروازے کے اندر ہونا ہماری بات کی شہادت دیتا ہے پھر ایسی ہی وضاحت امام ابوعبداللہ اسدی نے کی ہے کیونکہ انہوں نے ان مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو مدینہ کے باہر تھیں اور پھر ان مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو مدینہ میں تھیں چنانچہ لکھا: مصلّٰی رسول اللہ ﷺ مدینہ میں داخل تھا۔

آل زنگی کی طرف سے حفاظتی دیوار

علامہ مطری نے اس قدیم دیوار کے دروازے کا بیان کر کے لکھا ہے: ابن خلکان نے نقل کیا کہ یہ قدیم دیوار عضد الدولہ بن بویہ نے ۳۶۰ھ کے بعد طائع للہ ابن مطیع للہ کے دور میں بنائی تھی پھر عرصہ گذر جانے کی وجہ سے گر گئی اور مدینہ کے حالات کی خرابی کی وجہ سے خراب ہوگئی' صرف کچھ آثار باقی بچے تھے پھر جمال الدین محمد بن منصور (یعنی جواد اصفہانی نے جو بنو زنگی کے وزیر تھے) نے مسجد کے گرد ۵۴۰ھ کے آخر میں مضبوط دیوار بنوائی' پھر دیوار کے باہر لوگوں کی بھیڑ ہونے لگی' چنانچہ ایک خواب دیکھنے کی وجہ سے سلطان نور الدین محمود زنگی یہاں پہنچے۔ پھر مطری نے وہ واقعہ بیان کیا جسے ہم فصل نمبر ۲۹ کے آخر میں بتا چکے ہیں۔

پھر مطری نے کہا: جب وہ شام کی طرف روانہ ہوئے تو دیوار کے پیچھے سے کوئی چلایا جس کی بناء پر لوگوں نے

ان سے درخواست کی کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے دیوار بنا دیں چنانچہ انہوں نے آج دکھائی دینے والی دیوار بنانے کا حکم دیا چنانچہ ۵۵۸ھ میں دیوار بنا دی گئی اور انہوں نے اپنا نام باب بقیع پر لکھوا دیا جو اس کتاب کی تحریر کے وقت تک موجود ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب ہم یہ کتاب لکھ رہے تھے تو یہ باب بقیع پر موجود ہے' دروازے پر لوہے کی چادر کے اوپر یوں لکھا ہے:

”هذا ما امر بعمله العبد الفقير الى الله تعالى محمود زنكى بن اقسنقر غفر الله له سنة ثمان و خمس و خمس مائة.“

” یہ وہ دیوار ہے جسے بنانے کا حکم بارگاہِ الٰہی کے محتاج بندے محمود زنگی بن اقسنقر نے دیا' اللہ اس کی بخشش فرمائے' سال ۵۵۸ھ ہے۔“

علامہ بدر بن فرحون نے نور الدین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

”انہوں نے بعلبک کے گرد حفاظتی دیوار بنائی اور مدینہ کے گرد مکمل حفاظتی دیوار بنا دی اور وہ وہی ہے جو آج کل موجود ہے' ان کا نام بقیع کے دروازے پر لکھا ہوا ہے' رہی وہ دیوار جو مدینہ کے اندر ہے تو اسے وزیر جمال الدین محمد بن ابو منصورہ نے بنوایا تھا' یہ انصاف پسند بادشاہ کے والد زنگی کا وزیر تھا پھر اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے غازی بن زنگی نے اسے مضبوط کیا یعنی موجود ملک عادل کے بھائی نے۔“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انصاف پسند موجود بادشاہ نے موجود دیوار کو صرف مکمل کیا تھا اور یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ جواد نے بنائی تھی' بعید از قیاس ہے کیونکہ اگر یہ دیوار موجود ہوتی تو تب ہی اسے وہ مضبوط کرتا اور اس کے علاوہ کوئی اور دیوار نہ بنائی ہوتی اور ان دونوں دیواروں کی تعمیر کی مدت قریب قریب ہی تھی۔

جواد اصفہانی کے کارنامے

علامہ مجد کہتے ہیں: شیخ شہاب الدین عبد الرحمٰن بن ابو شامہ نے اپنی کتاب میں یوں لکھا: ”جواد نے سب سے فائدہ مند کام یہ کیا کہ مدینۃ النبی ﷺ کے گرد حفاظتی دیوار بنائی کیونکہ اس سے قبل اس کے گرد دیوار نہ تھی' چور لوٹ لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اہل مدینہ تنگدل ہو چکے تھے اور کئی نقصان کرا چکے تھے۔“

ابن الاثیر کہتے ہیں: میں نے مدینہ میں ایک جمعہ پڑھتا انسان دیکھا' فارغ ہوا تو جمال الدین پر رحم کھا کر اسے دُعا دی۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا' ہر اہلِ مدینہ پر لازم ہے کہ اس کے لئے دعا کرے کیونکہ ہم بہت نقصان اُٹھا چکے تھے اور تنگدل تھے' عربی لوگوں نے ہمارا جینا دو بھر کر رکھا تھا' نہ یہ تن کے کپڑے رہنے دیتے تھے اور نہ ہی کچھ کھانے کو' اس نے ہمارے گرد حفاظتی دیوار بنا دی اور ہمیں ارادۂ بد رکھنے والوں سے بچا لیا چنانچہ ہم بیفکر ہو گئے تو

اس کے لئے کیوں دعا نہ کریں؟

عقبہ کہتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ یہ دیوار جسے جمال الدین نے بنایا' یہ دوسری دیوار تھی اور وہ دیوار جسے ملک عادل نور الدین نے بنایا' تیسری تھی یعنی وقت کے لحاظ سے' بہرصورت بنانے والے کا نام دروازوں پر لکھا ہوا ہے' رہی پہلی دیوار جسے عضد الدولہ نے بنوایا تھا تو اس کا کوئی ایسا نشانی باقی نہ رہا جس سے کسی جگہ کا پتہ چل سکے۔انتہی۔

علامہ مجد نے اس کے بعد کہا: کہتے ہیں کہ مدینہ کے خطیب نے اپنے خطبہ میں کہا: ''اے اللہ! جس شخص نے تیرے نبی ﷺ کے حرم کی حفاظتی دیوار بنا کر حفاظت کی یعنی محمد بن علی بن ابومنصور' تو اس کی عزت کی حفاظت فرما: اور اگر اسے کوئی اور فضیلت حاصل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک کافی تھی چہ جائیکہ اس کی عطائیں تو شرق وغرب اور خشکی وتری تک پہنچنے والی ہیں۔''

بالخصوص اہلِ مدینہ پر اس کی عنایت ومہربانی نہایت وسیع تھی چنانچہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

موصل کے شیخ الشیوخ شیخ عمر تشائی کے ایک صوفی مرید نے مجھے بتایا کہ اس شیخ نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا: موصل میں وزیر کی بنائی مسجد کی طرف جاؤ اور وہاں بیٹھ جاؤ' کوئی شے تمہیں مل جائے تو میرے آنے تک اسے حفاظت سے رکھنا۔میں نے یونہی کیا' دیکھا تو بہت سارے اونٹ سوار کپڑے وغیرہ لادے آ رہے تھے' دیکھا تو جمال الدین شیخ ان کے ساتھ آ گئے' بہت سا ساز وسامان ساتھ تھا۔اٹھارہ ہزار دینار اور بہت سے اونٹ ہمراہ تھے اور مجھ سے کہا: یہ لو اور کھلے میدان کو چلے جاؤ اور یہ گٹھڑی اور یہ کتاب فلاں متولی کو دیدینا اور جب تمہارے پاس فلاں عربی آئے تو اسے یہ دوسری گٹھڑی دیکر یہ کتاب بھی دیدینا اور اس کے ساتھ چلے جانا اور جب وہ تمہیں فلاں عربی کے پاس پہنچا دیں تو اسے گٹھڑی اور کتاب دیدینا اور یونہی مدینہ طیبہ چلے جانا اور میرے فلاں وکیل کو یہ سامان دیدینا' پوشاکیں اور مال دینا جس پر مدینہ لکھا ہوا ہے' وہ اسے میری اس تحریر کے مطابق خرچ کر لیں گے پھر باقی مال لے لینا' جس پر مکہ لکھا ہوا ہے اسے مکہ لے جانا اور میرے وکیل کو دے دینا' وہ اسے میری دوسری تحریر کے مطابق صدقہ کر دے گا۔

ہم اسے لے کر وادی القریٰ کی طرف گئے تو دیکھا کہ بہت سے اونٹ کھانے پینے کا سامان لادے مدینہ کی طرف جا رہے تھے لیکن راستے کا خوف طاری تھا۔جب ہمیں دیکھا تو ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے چنانچہ ہم مکہ پہنچ گئے' وہاں گندم ایک دینار کی دو صاع مل رہی تھی اور صاع ان دنوں بغدادی پندرہ رطل کے برابر تھا۔جب ان لوگوں نے مال اور کھانے کی جنس دیکھی تو ایک دینار کی سات صاع خریدی چنانچہ اہلِ مدینہ نے ان کے لئے دعائیں کرنا شروع کر دیں۔

میں کہتا ہوں' پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ انہیں موت کے بعد مدینہ شریف کیسے لے جایا گیا اور کیسے وہاں انہیں اس تربت میں دفن کیا گیا جو مسجد کے قریب تھی۔

ان کے کارناموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے مسجد خیف نئے سرے سے بنائی' عرفات کا چشمہ جاری کر دیا' حجرہ مقدسہ کی دیوار بنائی اور مرمر لگایا' کعبہ کا دروازہ نیا بنایا اور جس تابوت میں انہیں اٹھایا گیا' وہ کعبہ کا پرانا دروازہ تھا۔

حفاظتی دیوار کے دروازے

آج کل مدینہ پاک کی حفاظتی دیوار کے چار دروازے ہیں، ان میں وہ دروازہ شامل نہیں جو امیر مدینہ کے قلعے کا ہے، جسے باب السر کہتے ہیں، یہ ایک عظیم دروازہ ہے جو لوہے سے بنا ہے۔ وہ چار دروازے یہ ہیں:

ا۔ ایک دروازہ وہ ہے جو مدینہ کے مغرب میں، مصلّٰی کی جانب الحاج المصری کے گھر کے قریب ہے، اسے "درب المصلّٰے" کہتے ہیں اور اسی کا نام "درب سویقہ" ہے، اس کا اور باب السلام کی چوکھٹ کا درمیانی فاصلہ چھ سو پینتالیس ہاتھ ہے، اس پر مضبوط دروازہ تھا جسے ان کی معزولی کے سال امیر کے ایک بیٹے ضغیم نے جلا دیا تھا چنانچہ امیر مدینہ نے اس باڑے کے دروازے کو لے لیا جسے امیر ضغیم نے بنایا تھا اور اس پر لگا دیا اور پھر پہلے کی طرح، دوسری آتشزدگی کے بعد، اسے نیا مضبوط دروازہ لگوا دیا۔

۲۔ دوسرا دروازہ بھی مغرب ہی کی طرف ہے جو امیر مدینہ کے قلعہ کے صحن میں ہے، اسے "درب صغیر" کہتے ہیں۔

۳۔ تیسرے دروازے کو درب کبیر کہتے ہیں اور درب شامی بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔ چوتھے دروازے کو درب بقیع کہتے ہیں جو مدینہ کی مشرقی جانب ہے، اس کا نام درب جمعہ ہے، اس پر بھی مضبوط دروازہ لگایا گیا ہے جو لوہے سے بنا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ نور الدین شہید کے دور سے چلا آ رہا ہے اس کے اور مشہور دروازے باب جبریل کی چوکھٹ کے درمیان چار سو تینتیس ہاتھ کا فاصلہ ہے۔

اس حفاظتی دیوار کے قبلہ میں ایک دروازے کی جگہ ہے جو آج کل بند ہے، اسے درب السوار قیہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہ اس حفاظتی دیوار کی تعمیر کا خیال کرتے چلے آئے ہیں اور جو حصہ کمزور ہو جاتا، اسے درست کرتے چلے آئے ہیں۔ علامہ زین مراغی کہتے ہیں کہ اسے ۷۵۵ھ میں نئے سرے سے بنایا گیا، یہ دور سلطان الناصر محمد بن قلاوون کی اولاد میں سے ایک شخص صالح کا تھا۔

علامہ بدر بن فرحون کہتے ہیں کہ امیر سعد بن ثابت بن حماد نے ۷۵۱ھ میں اس حفاظتی دیوار کے گرد خندق بنوانا شروع کی لیکن وہ مکمل نہ کرا سکے اور فوت ہو گئے، اسے ان کے بعد امیر فضل بن قاسم بن حماد نے اپنے دور خلافت میں مکمل کرایا۔ واللہ اعلم۔

بحمدہٖ تعالیٰ "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰے ﷺ" کی دوسری جلد مکمل ہوئی اور انشاء اللہ اس کی تیسری جلد شروع ہو رہی ہے۔ اس کی ابتداء میں پانچواں باب ہے جو نبی کریم ﷺ کے مصلّائے عید کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مکمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

اللہ کے فضل و کرم سے دوسری جلد کا ترجمہ ۲۶ جولائی ۲۰۰۷ھ بروز جمعرات بوقت دس بج کر چالیس منٹ پر دن کو مکمل ہوا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ناقص کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین۔